The ZAMANA, Jan. 1941. Rd. No. A 147

زمانہ

مرتبہٗ دیا نراین نگم، بی۔ اے

نمبر ۱	جنوری ۱۹۴۱ء	جلد ۷۶

فہرست

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا
(قیمت سات آنے)
جملہ حقوق محفوظ

فی پرچہ ۸ آنہ

زندگی کی ہر منزل میں صحیح رہنمائی کرنے والے قیمتی مضامین کا دلچسپ مرقع

رہنمائے زندگی

ہندوستان کا بہترین باتصویر پرشش ماہوار رسالہ

"رہنمائے زندگی" ہندوستان کے مہذب اور تعلیم یافتہ اصحاب کا رسالہ ہے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں پیدا کی گئی ہیں جو ایک قوم کو زندہ قوم اور ایک ملک کو خوشحال ملک بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ علمائے عالم کے روح افزا مضامین اور نامور شعرا کی ولولہ انگیز نظمیں، سبق آموز کہانیاں، کارٹون، جن کے مطالعہ سے ذہنی اور دماغی ترقی کے علاوہ معلومات میں زبردست اضافہ ہوتا ہے نیز انسان کی روزافزوں تمدنی اور معاشرتی ضروریات کا مسالہ فراہم کرنے کے علاوہ دستکاری، خانہ داری، بچوں کی پرورش اور حفظ صحت وغیرہ ضروری امور کی تعلیم بھی ملتی ہے

رسالہ کے ایڈیٹر مشہور مصنف اور تجربہ کار جرنلسٹ جناب رہنما صاحب سابق منیجنگ ایڈیٹر "کرانتی" ہیں۔ سالانہ چندہ، جس میں چار خاص نمبر بھی شامل ہیں صرف اڑھائی روپیہ ہے نمونے کے لیے پانچ آنے کے ٹکٹ آنے چاہیں جنوری ۱۹۴۰ء کا پرچہ نئے سال کا ایک تحفہ ہے۔

منیجر رہنمائے زندگی پوسٹ بکس نمبر ۲۶۳ ہسپتال روڈ لاہور

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کہانی کا ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زوردار بیان۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔

جس میں نوجوانوں کے قائد اعظم نے صادق جذبات اور ہمارے رہنماؤں کے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے ضخامت ۸۰۰ صفحے

قیمت مجلد کتاب چار روپیہ (للعہ)

میدان عمل

منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے اس میں ملک کی موجودہ جد و جہد اور بیجین روح کی جیتی جاگتی تصویروں، فطری عشق و محبت کے سادہ، دلکش بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے جو دلچسپ ہے ضخامت ۔۰۰ صفحے خوبصورت ٹائٹل قیمت مجلد صرف ڈھائی روپیہ (عہ۲)

ملنے کا پتہ: "زمانہ" بک ایجنسی کانپور

زمانہ جنوری ۱۹۴۱ء

۱

"SLOGANS"

مقولے

زندگی بغیر لٹریچر اور کونین کے موت ہے۔ یہ فقرہ کسی قدر مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے اور شہروں اور ان کے ایسے مضافات کے باشندوں کے نزدیک جہاں گندہ یا برساتی پانی کی نکاسی کا انتظام خوب ہے یہ فقرہ بالکل مضحکہ انگیز ہے لیکن سچ پوچھئے تو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک جبکہ یہ مقولہ دنیا کا عجیب ترین خط پیشانی بنا رہا۔ اسمیں کسی کو بھی کوئی مضحکہ انگیزی معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس اخبار کا نام پورٹو ویلھو مارکونی گرام PORTOVALUE MARCONIGRAM. تھا جسکے فائل اب مشکل سے ملتے ہیں۔ اس ہفتہ وار چو صفحے عجیب اخبار کا ایڈیٹر ان دو سو مزدوروں کی بچی کھچی جماعت میں سے ایک تھا جنھوں نے دریا برازیل کی وادی کے بالائی حصے میں مڈیرا مامورر ریلوے تعمیر کرائی تھی۔ ان لوگوں کا تعلق متمدن دنیا سے منقطع تھا اور دنیا کے نہایت ہی پسماندہ حصہ کے ہولناک جنگلوں میں کام کرتے تھے اور یہ عجیب و غریب سرخی والا اخبار ہی ان کے لئے سب کچھ تھا۔ جنوبی امریکہ عموماً کہا جاتا ہے کہ یہاں ریلیں بچھاتے ہوئے ہر جوڑ پر ایک جان ضائع ہوئی تھی۔ ریلوے کی تعمیر میں واقعی سخت محنت صرف ہوئی تھی۔ لیکن اس کا معاوضہ بھی خوب تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں یہ ریلوے دریائے مڈیرہ کے بالائی جنگلوں تک ربڑ نکالا جاتا تھا اور ربر اس زمانہ میں "سیاہ سونا" تھا یعنی سونے کے بھاؤ بکنے والی سیاہ چیز ان بچے کھچے مزدوروں میں سے ایک شخص نے لکھا ہے کہ جس ریلوے کی تعمیر میں وہ مددگار رہا۔ وہ پہلی ریلوے لائن تھی جو کونین کے بل بوتے پر بنائی گئی۔ اور یہ بات لفظی طور پر صحیح ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کے چاروں طرف ہلاکت بار ملیریائی مچھر کے دل بادل تھے۔ جسکی وجہ سے انسداد ملیریا کے لئے ہزاروں پونڈ کونین روزانہ خرچ ہوتی تھی۔ اس ریلوے کی تعمیر میں دس ہزار آدمی لگے ہوئے تھے جنمیں سے دو سو آدمیوں نے جو زیادہ تر امریکن انجینیر تھے مڈیرہ مامورر ایسوسی ایشن قائم کی تھی ان لوگوں کی

۲ پچھلے دنوں نیویارک کے عالمگیر میلہ میں پھر ملاقات ہوئی اور جسوقت ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ ان دنوں کونین ہی بیش قیمت چیز تھی جتنا پانی تو پرانے زمانہ کی یاد دلوں میں تازہ ہو گئی اور یہ زمانہ اس وقت سے بہت پہلے گذر رہا ہے جبکہ لیگ اقوام کے ملیریا کمیشن نے علاج ملیریا کے لئے کونین کی خوراک قائم کر دی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں اس ریلوے کے بعض کاریگر تیس گرین اور ایک بوتل اسکاچ کی خرچ کیا کرتے تھے مگر اب چاہے اسکاچ کے ساتھ استعمال کیجائے یا اس کے بغیر اب کونین کی اتنی مقدار استعمال نہیں کیجاتی ہوگی کیونکہ اس باب میں ماہرین جنیوا نے صاف کہدیا ہے کہ انسداد ملیریا کے لئے پانچ سات دن تک پندرہ بیس گرین کونین کھانا کافی ہے۔ ممکن ہے کہ مڈیرا مامورر ریلوے کے بنانیوالے سخت جان لوگوں کے نزدیک یہ خوراک معمولی ہو لیکن سائنس ماہرین جنیوا کی تائید کرتا ہے۔ لیگ اقوام کے ملیریا کمیشن کی رپورٹ بابت ۱۹۳۵ء کے صفحہ ۱۲۴ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کیونکہ کونین ایک بے ضرر چیز ہے اسلئے شفاخانہ کے ماتحت ملازم بھی اسے ڈاکٹر صاحب کی نگرانی کے بغیر دے سکتے ہیں مگر دوسرے مرکبات کیلئے ڈاکٹر کی نگرانی



مستورات کا حسن شباب

بے شمار مضامین

عورت کی تندرستی، جوانی اور خوبصورتی حاصل کرنے کیلئے مفید گر بتانیوالی

بیشمار نسخے

شاندار مضبوط جلد

مفید کتاب

فلسفۂ حسن (باتصویر)

ایک سو تصاویر



چوٹی سے ایڑی تک ہر ایک اعضاء کی خوبصورتی کا جدا جدا بیان اعضاء کو کیسے حسین اور سڈول بنایا جا سکتا ہے۔ اس کی مفید آسان فوری نتیجہ نکالنے والی ترکیبیں صحت قائم رکھنے والی ورزشیں۔ رنگت نکھارنے کے آسان طریقے۔ ہر قسم کی اشیاء مثلاً کریم۔ پاؤڈر۔ لپ اسٹک سرخی۔ بندی وغیرہ وغیرہ کے فرضی اور درست استعمال کے ڈھنگ جنکی بدولت ایک بے صورت بدصورت عورت صحیح معنوں میں حسین و جمیل دکھائی دینے لگتی ہے۔ ان اشیاء کے سہل اور اکسیر نسخے کوڑیاں خرچ کر کے گھر بیٹھے ان اشیاء سے بھی بڑھیا چیزیں بنانیکی ترکیبیں۔ غرضیکہ کتاب ہذا کی مدد سے ایک بیڈول اور بدصورت عورت ایک قلیل سے عرصہ میں سڈول اور خوبصورت بن سکتی ہے۔ جو اس قدرتی عطیہ سے مالا مال ہیں۔ وہ اپنی جوانی اور خوبصورتی کو دوبالا کر سکتی ہیں۔ نیز تا حیات تندرست توانا اور پرکشش بنی رہ سکتی ہیں کہ سب کچھ ایسے آسان پیرایہ میں درج ہے کہ معمولی پڑھی لکھی لڑکیاں بھی باآسانی فائدہ اٹھا سکتی ہیں



بڑھاپے میں جوانی حاصل کرنے کی خواہشمند اور جوان لڑکیوں کے لئے یکساں مفید۔ **قیمت صرف ایک روپیہ۔ ڈاک خرچ چھ آنے**

ملنے کا پتہ:-

بیوٹی پبلشنگ ہاؤس پرانی تحصیل روڈ (۲۶) لاہور



گروپ کل ہند اردو کانفرنس اندور

زمانہ

جلد ۷۶ — جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

اُردو ادب میں مزاح نگاری

(از قاضی حامد علی صاحب مجازی، بی۔ اے)

اُردو لٹریچر میں اعلیٰ ظریفانہ تحریروں کی بڑی کمی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک مزاح نگاری دیگر اصنافِ ادب کی طرح مستقل فن قرار نہیں پائی تھی۔ اور ہمارے شاعر ہجو کی حد سے آگے قدم نہ اُٹھا سکے۔ شاعری کی طرح افسانوں میں بھی اعلیٰ پایہ کی ظرافت نگاری موجود نہیں ہے۔ بلند پایہ مزاحیہ افسانے اور تحریریں ہر زبان میں وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو شاعری یا افسانہ نگاری کو حاصل ہے۔ اُردو لٹریچر میں ادنیٰ درجہ کا مذاق تو کافی موجود ہے اور اکثر باعثِ ننگ ہوجاتا ہے۔ مگر اُردو ادیبوں کے پیشِ نظر ظرافت یا مزاح کا صحیح مفہوم نہیں ہوتا اور وہ ایسی لغو باتوں کو بھی جن سے بے تحاشا ہنسی آجائے "ظرافت" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اُردو میں سنجیدہ ادبی۔ علمی۔ تاریخی و تحقیقی تحریروں کا مواد کافی ہے۔ مگر اس "ہجوم" میں چند ہی اہلِ قلم صحیح اور حقیقی مزاح نگار قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اس کمی کا ذمہ دار ادیبوں کا ماحول اور رفتارِ زمانہ ہے۔ قدیم اخلاقی تعلیم نے مصلحین اُردو کے مزاجوں میں اس قدر سنجیدگی پیدا کردی تھی کہ اُن کے نزدیک "ظرافت" "مسخرہ پن" کے مترادف تھی، اسی لئے ایک ذلیل چیز سمجھی جاتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب میں اس کا فقدان ہے۔

مرزا سودا نے شاعری میں مستقل فن کی حیثیت سے "ہجو" کی داغ بیل ڈالی اور اپنے خاص

رنگ میں ابتدا کرکے اُسے انتہا تک پہونچا دیا۔

"ہجو" (Satire) خالص مزاح نہیں ہے کیونکہ اس میں دوسرے کی تذلیل اور ایذا رسانی مقصود ہوتی ہے، اور یہی اُردو ادب کی مزاح نگاری کا بگڑا ہوا خاکہ ہے۔ سودا نے اپنی ہجوؤں میں میر ضاحک اور میر تقی میر کو تختۂ مشق بنایا اور خوب خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ سودا کی "ہجو" اُن کے دلی جذبات (رنج غصہ۔ تعصب وغیرہ) کا آئینہ ہوتی تھی۔ زور بیان میں اکثر رکیک اور ذلیل باتیں بھی کہہ جاتے تھے اور عامیانہ و سوقیانہ الفاظ تو وہ بیدھڑک استعمال کرتے تھے، اس لئے اُن کی ہجویں فن کی حیثیت سے بہت بلند پایہ قرار نہیں دی جاسکتیں، مگر چونکہ سودا ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہجو کی طرف باقاعدہ قدم اُٹھایا اور اُن سے پہلے کوئی معیار موجود نہ تھا اس لئے اُن پر کوئی حکم فیصل عائد نہیں ہوسکتا ہے۔ سودا کے بعد ہجو کے مردِ میدان سید انشا ہوئے۔ انھوں نے اس فن میں بہت زورِ طبع دکھایا، مگر لغویت اور بیہودہ گوئی کی حد سے آگے قدم نہ بڑھا سکے۔ انشا کے لئے ہجو کا مفہوم "گالیاں" دینا تھا۔ شاید ان کے زمانے میں اخلاقی ابتری انتہا کو پہونچ چکی تھی۔ لوگ بیہودہ گوئی ہی کو ظرافت سمجھتے تھے۔ اس کے بعد شاعروں نے ہجو کو مستقل فن بنانا ختم کردیا۔ البتہ اسی لغویت کی ایک دھندلی سی جھلک دہلی میں غالب کے زمانہ میں بھی نظر آتی ہے۔ جس زمانہ میں غالب اپنی جدت طبع سے "مشکل گوئی" کے ہاتھوں مجبور تھے حکیم آغا جان عیش نے جو اُن دنوں دلی کے سربرآوردہ شعرا میں شمار کئے جاتے تھے اور غالب سے چشمک رکھتے تھے ایک برائے نام مولوی کو شاعر بنایا تھا اور اُس کا تخلص "ہدہد" رکھا تھا۔ غرض صرف لغو گوئی اور ضمناً غالب کا دل دُکھانا تھا، انھیں کے ہمعصر ایک اور حضرت زاغ تھے۔

موجودہ زمانہ میں اکبر الہ آبادی کی شخصیت بہت وقیع ہوئی ہے، اُنھوں نے طنز (IRONY) کو نظم میں جگہ دی اور طنزیہ چٹکیوں (Sarcastic Remarks) سے قوم کی اصلاح کرنی چاہی، یہ عیب کو پہلے خوبی کہتے ہیں اور پھر اُس کی مذمت کرتے ہیں۔ اکبر نے اُردو ادب میں سب سے پہلے طنز نگاری کی طرف قدم اُٹھایا، اُن کی جدت طبع نے یہ ظاہر کردیا کہ وہ اپنی شوخ طبعی سے صرف اشعار میں دلکشی اور جاذبیت ہی پیدا نہیں کرسکتے بلکہ اُنھوں نے اس کو ایک مستقل فن قرار دے کر اس کی تکمیل کرلی ہے۔ اُن کی نکتہ رس طبیعت نے زمانہ کا رنگ پہچان لیا اور مسلمانوں کے مذہبی انحطاط کو روکنے، اقتصادی اور معاشرتی تخریب کی بیخ کنی کے لئے طنز (Irony) کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ انھوں نے سیاسی اور تمدنی کمزوریوں پر تمسخر کے رنگ میں چوٹیں کیں۔ اکبر کے بعد

اِس طرز کا کوئی پیرو نہ ہو سکا۔ البتہ مولوی علی حاتم صاحب بدایونی نے اس طرف کچھ میلان طبع دکھایا اور سیاسی میدان میں طنز نگاری سے جولانیِ طبع کے جوہر دکھائے۔

اکبر اکثر زیادہ صراحت سے کام نہیں لیتے ہیں، اشاروں اشاروں میں بہت سی باتیں کہہ جاتے ہیں، اور بعض جگہ اس کوشش میں کہ طنز ظاہر نہ ہونے پائے گھُٹ کر رہ جاتے ہیں۔ ظریف لکھنوی نے طنز نگاری میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ انھوں نے برجستگی اور صراحت سے طنز کو بہت لطیف بنا دیا طنز میں آدمی عموماً گھُٹ کے رہ جاتا ہے۔ ظریف نے یہ قید و بند اُٹھا دی۔ اُنھوں نے پہلی چوٹ شاعروں پر کی، اور اُن کی عشق بازی کی خوب مذمت کی۔ بعض اوقات طنز کے اندر محدود ہو جانے میں اُن کا مضمون مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ زیادہ کھُل کر چوٹ نہیں کر سکتے۔ ظریف نے اس کمی کو پُورا کر دیا۔ مگر یہ "چوٹیں" کبھی دلآزاری یا محض تفریحِ طبع کا ذریعہ نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان میں اصلاحی پہلو بدرجۂ اتم موجود ہوتا تھا۔

اکبر اور ظریف کے علاوہ اقبال کے یہاں بھی اکبری رنگ میں کلام موجود ہے جس میں اُنھوں نے سیاسی اور تمدنی پہلوؤں پر تمسخرانہ رنگ میں چوٹیں کی ہیں۔ اقبال کا منشا بھی اصلاح ہے وہ قومی تنزل کے اسباب کو لطیف طنز کے پیرایہ میں اس شگفتگی سے بیان کر دیتے ہیں کہ مردہ احساسات میں ایک چوٹ سی لگتی ہے اور ہر مسلمان حالتِ جمود سے گھبرا کر چونک پڑتا ہے۔

قدما اور متوسطین کی تحریریں بگڑے ہوئے ماحول اور فقدانِ معیار کے باعث انتہائی نقطہ پر پہونچ گئیں۔ کچھ روشن خیال لوگوں کی بے توجہی سے اس جذبہ کو نشو و نما پانے کا پورا موقع نہیں ملا بدقسمتی سے انشاؔ کی انتہا پسندی نے اُن کے تابعین کو بھی بھٹکا کر ہزلیات میں مشغول کر دیا۔

اُردو ادب کا یہ ابتدائی دور اہلِ ذوق کی بے توجہی اور اپنے انحطاط کے سبب یوں ہی ختم ہو گیا البتہ غالبؔ نے اپنے خطوط میں اپنے شستہ مذاق کا ثبوت دیا ہے۔ جس کی بدولت نثر میں لطیف مزاح نگاری کی داغ بیل پڑ گئی۔ افسوس ہے کہ اس "حیوان ظریف" کی ادبی زندگی کے بہ نسبت اس کی خانگی زندگی زیادہ تر ظرافت میں بسر ہوئی ورنہ غالبؔ بلند پایہ ظریفانہ ادب کے سرتاج ہوتے۔ بہرحال غالبؔ کے بعد سرسیدؔ نے اُردو کی ادبی فضا میں ہلچل ڈال دی، انھوں نے اس قدر مشکل اور اہم مطمحِ نظر نکال کر رکھ دیئے کہ اُن کے سامنے کسی کو ادبِ لطیف کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ آزادؔ کا علمی مذاق اُنھیں تک محدود رہا اور اُن کا طرزِ بیان اُردو ادب میں کوئی مستقل صورت اختیار نہ کر سکا۔ اس قحط الرجال میں موجودہ زمانہ کے چند بزرگ جو اس طرف توجہ کر رہے ہیں غنیمت ہے۔

انگریزی میں مزاح کے لئے دو لفظ ہیں HUMOUR اور WIT۔ WIT میں علمی لیاقت اور ذکاوت زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں ایک چبھتا ہوا جملہ ہوتا ہے جس کو ظرافت کہتے ہیں۔ HUMOUR میں واقعات اور الفاظ سے بحث ہوتی ہے، اس میں علمی قابلیت یا ذکاوت کا سوال پیدا نہیں ہوتا اُردو میں ان دونوں چیزوں کو ایک ہی لفظ ظرافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ WIT کے لئے خاص خاص الفاظ ضروری ہوتے ہیں، واقعات کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی، لیکن یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ اس قسم کے فقرے جو روزمرہ سوسائٹی میں اکثر تعلیم یافتہ طبقہ دوستانہ بے تکلفی میں ایک دوسرے سے بولتے ہیں اُس کو WIT کہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک اور چیز پیدا ہو جاتی ہے جس کو حاضر جوابی (REPARTEE) کہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص دوسرے پر کچھ مذاقیہ فقرے کہے اور دوسرا شخص اُس کا مذاقیہ فقرہ اُسی پر لوٹ دے۔ مثلاً ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ انگلستان کے سابق وزیر اعظم لائڈ جارج اپنی تقریر میں کہہ رہے تھے کہ میں آئرلینڈ اور ہندوستان وغیرہ سب کے لئے ہوم رول چاہتا ہوں۔ کنسرویٹو پارٹی کے ایک شخص نے اُن کی تقریر میں دخل دے کر پوچھا کہ "جہنم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"[1] تو اُنھوں نے اس کا فوراً جواب یہ دیا کہ "میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنے ملک کی وکالت کرے"[2]۔

مذاق کے مختلف پہلو ہوتے ہیں، مثلاً :-

تتلا کر بولنا،

غلط الفاظ کا استعمال کرنا۔

غلط ہجّے (Spelling) عبارت میں پیش کرنا۔

غلط وقفوں (Punctuation) سے عبارت میں مزاح پیدا کرنا۔

غلط الفاظ پر زور دینے سے مزاح پیدا کرنا۔

بعض لفظوں کے پہلے حروف بدلنے سے نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں، اور تحریر مزاح کی صورت اختیار کر لیتی ہے اس کو تحریف (Spoonerism) کہتے ہیں۔

ایک اور قسم طوالت بیان (Long Windedness) ہوتی ہے۔ یعنی کسی بات کو بہت طویل کرکے بیان کرنا۔ بعض وقت لوگ بیچ میں بہک جاتے ہیں اور پھر کوئی غیر مربوط بات شروع کر دیتے ہیں اور اس کو ادھورا چھوڑ کر دوبارہ پہلی بات لے لیتے ہیں۔ یہ طرز امریکہ میں شروع ہوا۔ اسی سلسلہ میں

---

[1] And what about hell.

[2] I like every body to stand for his Country.

Malicious Humour یا دل آزار مزاح کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جس چیز کو نہایت تقدس کی نظروں سے دیکھا جائے اس پر کوئی دل آزار فقرہ کس دیا جائے۔ جیسے اُردو اور فارسی شاعری میں "زاہد" کی گت بنائی جاتی ہے۔

مزاح کی ان تمام قسموں کو الفاظ سے واسطہ ہوتا ہے، یا یوں کہئیے کہ یہ سب Wit کی مختلف ذہنی صورتیں ہیں۔ لیکن واقعات کی ترتیب سے بھی مزاح پیدا ہوتا ہے، اس میں چست اور برجستہ جملے اور فقرے کم ہوتے ہیں اور واقعات کچھ اس طرح اُلٹ پھیر کے پیش کئے جاتے ہیں کہ مزاح پیدا ہو جاتا ہے طلسم ہوشربا اور عظیم بیگ کا مزاح واقعات کی ترتیب سے پیدا ہوتا ہے۔ شوکت تھانوی کا مزاح لغوتیوں (Absurdities) سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایسی باتیں پیش کرتے ہیں جن سے خود بخود مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔ فسانۂ آزاد میں خوجی کا جتنا مزاح ہے سب واقعات سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک اور قسم کا مزاح کریکٹر سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر شخص کی ذہنیت جداگانہ ہوتی ہے، کسی کے کریکٹر میں کوئی خاص خامی ہوتی ہے اور وہ دوسروں کے لئے تمسخر کا باعث ہو جاتی ہے۔ یہ مزاح انفرادی Individual اور قومی National دونوں طرح کا ہو سکتا ہے۔ انفرادی شخصیت سے مزاح پیدا کرنا ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے، اس لئے کہ ایک خاص ذات کے کریکٹر (کردار) کی خامیاں تلاش کرنا پڑتی ہیں، اور کوئی مصنف جب تک اُسے نفسیات پر کافی عبور نہ ہو کریکٹر کی خامی سے صحیح مذاق پیدا نہیں کر سکتا۔ البتہ National Character میں ذاتی مشاہدہ کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی مثلاً پٹھان "لڑاکو" اور شیخ "لسّان" ہوتے ہیں۔ ایسا مزاح Humour of Character کہلاتا ہے اہل آئرلینڈ اور اہل اسکاٹ لینڈ ایسے مزاح میں زیادہ تر تختۂ مشق بنائے جاتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک چیز اور آ جاتی ہے جس کو Humour of abnormal Character سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسے مزاح میں کسی ایک خاص کریکٹر کی معمولی سی خامی کو خواہ مخواہ اس قدر مبالغہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی واضح ہو چکا ہے۔ ہمارے ہاں مزاح کی شروعات غزل سے ہوئی، مگر یہ مزاح دلنواز نہیں بلکہ دل آزار یا Malicious Humour ہمارے یہاں دراصل مزاح یا Humour سے پہلے Satire یا تضحیک و طنز کا آغاز ہوا اور زاہد و متقی کو گالیاں دی گئیں۔ اس کے بعد Malicious Humour دل آزار مزاح ظہور میں آیا۔ یہ وہ شخص ادا کر سکتا ہے جو دنیا سے دل برداشتہ ہو۔ ہمارے ہاں وہ قسم کا مذاق تھا۔

اوّلاً تو یہی satire تضحیک و طنز یا مولویانہ مذاق" آخرالذکر مزاح متحدالتلفظ اور مختلف المعنی الفاظ سے پیدا ہوتا ہے۔اس مذاق کو جگت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ دوسری وہ جو ہمارے ہاں عموماً رائج ہے اور جس کو ضلع کہتے ہیں۔ضلع میں ایک لفظ جو کسی شخص کی زبان سے ادا ہو جائے اُس کی مناسبت سے دوسرا ذومعنی لفظ لاتے ہیں۔اور دوسرے معنیٰ سے مذاق پیدا کیا جاتا ہے، یہ ایک قسم کا ایہام ہے۔جگت میں یہ ہوتا ہے کہ ایک لفظ کے دو مفہوم ہوتے ہیں اور دوسرا مفہوم لے کر مذاق پیدا کیا جاتا ہے ۔ satire ہجو و تضحیک کے اُستاد سودا ہیں۔جگت سرشار کے ہاں بہت ہے۔ ضلع و جگت کی مثالیں لکھنؤ کے اساتذہ کے ہاں بہ کثرت موجود ہیں۔غلط الفاظ سے جو مزاح پیدا ہوتا ہے وہ بھی ہمارے یہاں ملتا ہے۔ہمارے ہاں ایک اور طریقہ یہ ہے کہ "گنواروں" کی زندگی دکھاتے ہیں اور اُن ہی کی زبان پیش کرتے ہیں۔ ایک اور مزاح کا طریقہ مولویانہ اُردو" ہے جس کا دوسرا نام "گلابی اُردو" بھی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اُردو ادب میں مزاح کوئی پرانی چیز نہیں ہے۔ پہلے ہجو satire تھی جسے سودا نے عروج کو پہونچایا، اور انشا نے اپنے لوگوں کو کھل کھلادیا۔مرزا غالب نے دل خوش کن مذاق (Pure Humour) شروع کیا اور اُس میں کمال دکھایا ہے۔غالب کو اپنے خلاف مذاق کرنے میں بھی باک نہیں تھا کیونکہ اُن کا منشا دل آزاری نہ تھا۔اِس کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں باقاعدہ مزاح پیدا کیا۔تیسرا شخص جو لطیفہ گوئی میں کمال رکھتا ہے آزاد ہے۔اُن کی زندگی حد درجہ ظرافت پسند واقع ہوئی تھی اور اُن کے مذاق میں بھی دل آزاری نہ تھی۔

موجودہ دور کے پہلے مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی (مرزا الم نشرح)، سید سجاد حسین ملا رموزی مسٹر رشید احمد صدیقی، مسٹر پطرس، شوکت تھانوی صاحب، حضرت کوئی" تمکین، میاں اسلم، میرولی اللہ، عظیم بیگ چغتائی، "سندباد جہازی"۔سید امتیاز علی تاج ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ (مرزا الم نشرح) کی تحریروں کا تعلق Wit سے ہے،اِن کے جملے برجستہ اور چُست ہوتے ہیں اور وہ ذکاوت سے مزاح پیدا کرتے ہیں، اُن کا خاص جوہر الفاظ سے مزاح پیدا کرنا ہے واقعیت کا پہلو کم ہوتا ہے، مگر غیر معمولی بات کو وہ ایسے چست جملوں میں ادا کر دیتے ہیں کہ مذاق پیدا ہو جاتا ہے طبیعت میں بلا کا زور ہے اور جو جملہ زبان سے نکلتا ہے وہ ایسا پھڑکتا ہوا اور مزاح میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے کہ سُننے والے کے دل میں ایک گدگدی کی لہر پیدا ہو جاتی ہے شوکت تھانوی عوام الناس کی Absurdities (لغویت اور طبیعت کی خست وغیرہ

کو پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ مذاقیہ جملے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کو خانگی زندگی سے زائد تعلق ہے اور اُن کی نظر "گھر" اور "گھروالی" تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ انھوں نے کچھ مضامین سیاسی اور اقتصادی حالت پر بھی لکھے ہیں مگر پارٹی بندی کی پست خیالی سے بچ نہ سکے۔ انھوں نے مزاح کا بنا راستہ قائم کیا ہے۔ یعنی وہ عام لغویت کو پیش کرتے ہیں مگر اس سے قطع نظر جہاں تک فن نگارش کا تعلق ہے اُن کے مضامین میں Wit اور ذکاوت کا پہلو زائد ہوتا ہے اور فقرے بھی بہت چُست کستے ہیں۔ آپ کا معرکۃ الآرا مضمون سودیشی ریل ہے جس میں پارٹی فیلنگ اور بے سروپا باتیں اور Absurdities کو مجتمع کر کے مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ شوکت صاحب عبارت آرائی کے ماہر ہیں۔

حضرت "کوئی" کے ہاں بھی مضحکہ انگیز صورت حالات سے مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں بذلہ سنجی اور Wit ذکاوت کے بجائے واقعات Situation کو زیادہ دخل ہے۔ یہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اس صورت سے مزاح پیدا کرتے ہیں کہ لطیف مزاح کے بجائے دیوار قہقہ کھڑی ہو جاتی ہے۔

"تمکین" نے شوکت کا چربہ اُتارا ہے۔ ان کے نزدیک بیہودہ گوئی اور رکیک خیالات کا پیش کرنا مزاح کے مترادف ہے۔ غیر اخلاقی واقعات کو پیش کر کے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ بذلہ سنجی اور ذکاوت کا ان کے ہاں نام و نشان بھی نہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے مگر اب وہ ایک عرصہ سے گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی صورت حالات (Situation.) سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ یہ واقعات کو پیش کرتے ہیں اور اس میں فطرت کے جوہر کو خواہ مخواہ بعید از قیاس اور لغو Absurd صورت میں پیش کرتے ہیں۔ انسانی کمزوری کے متلاشی رہتے ہیں اور اس کمزوری کو کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر کے چھپانا چاہتے ہیں، چنانچہ ایک لغویت کو چھپانے کے لئے وہ جتنی حماقتیں ممکن ہوتی ہیں کرتے ہیں اور اس صورت سے واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کریکٹر کا مزاح بھی پایا جاتا ہے یعنی واقعات کا عروج و زوال Climax اور Anti climax اس تسلسل اور گتھی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ کردار کی اصلی حالت نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ اس کی خامیوں سے مزاح پیدا ہو جاتا ہے اور اس صورت سے ایک دلچسپ قصہ کے طور پر مزاح نگاری کرتے ہیں۔ ان کے ہاں دلچسپ عبارت ضرور ہے مگر جملوں اور فقروں میں شوکت جیسی چستگی نہیں البتہ زبان میں صفائی بہت ہے

Ludicrous Situational

ان کے مزاح کا تمام تر دارومدار واقعات اور صورتِ حالات پر ہوتا ہے۔ افسانہ کا پلاٹ اس حسن وخوبی سے ترتیب دیتے ہیں کہ کردار کے افعال حرکات اور سکنات سے مزاح پیدا ہوجاتا ہے۔ آپ بہت زائد نویس اور زود نویس ہیں، اور مزاح نگاری کو مستقل پیشہ قرار دیدیا ہے۔ چغتائی کی دو کتابیں شریر بیوی اور فل بوٹ قابل ذکر ہیں۔ ان کو نفسیات میں بھی دخل ہے اور اس وجہ سے وہ کریکٹر کا بہترین مزاح پیش کردیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے نظریۂ معاشرت و مذہب کی تبلیغ بھی کرتے رہتے ہیں۔

سید احمد شاہ بخاری مصنف مضامین پطرس دورِ حاضرہ کے مشہور مزاح نگاروں میں سے ہیں ان کے ہاں مضحکہ انگیز پہلو (Ludicrous element) بہت کم ہے۔ بذلہ سنجی (Wit) وذکاوت کا غلبہ زائد ہے۔ بقول شخصے ان کو دُور کی سوجھتی ہے اور خوب سوجھتی ہے۔ وہ الفاظ کی ہم آہنگی فقروں کے ربط اور برجستہ جملوں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کا منشا سوسائٹی کی اصلی حالت پیش کرنا ہے۔ یہ چغتائی کی طرح اصلاح کا بیڑا نہیں اُٹھاتے اور نہ اپنے نظریوں کو "کردار" کے پردہ میں پیش کرتے ہیں۔ جو دیکھتے ہیں وہ من وعن مزاح کے رنگ میں بیان کردیتے ہیں۔

رشید احمد صاحب صدیقی کا مزاح نگاری میں خاص طرز طول عبارت (Long-windedness) ہے۔ وہ طول بیانی کے ذریعہ جگہ جگہ گریز کرکے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ رشید صاحب ہر بات کو بہت طول دیدیتے ہیں، اکثر بیچ میں بہک کر غیر مربوط باتیں پیش کرنا شروع کردیتے ہیں اور پھر اسی سلسلہ میں "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا" یا "آمدم برسرِ مطلب" کہہ کر پہلی بات کو از سرِ نو شروع کرکے مزاح پیدا کرتے ہیں۔

تاہم پروفیسر صاحب حقیقی مزاح نگار کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ اُن میں فطرت نے وہ تمام جوہر بدرجۂ اتم ودیعت کردیئے ہیں جو ایک مزاح نگار کے لئے ضروری ہیں۔ ان کا خاص جوہر ذکاوت (Wit) ہے۔ ان کا مضمون ایک خاص قسم کی سنجیدگی لئے ہوئے مزاحیہ تحریر کی صورت اختیار کرلیتا ہے، ان کے مضامین گہری نظر، دقیق خیالات وجذبات کی موشگافی سے پُر ہوتے ہیں۔ ان کے مزاح کا معیار بہت بلند اور وقیع ہے۔ عام فہم جملوں اور سوقیانہ فقروں سے بہت گریز کرتے ہیں۔

ذہانت اور جودتِ طبع نے مِلکر آپ کے مضامین پر وہ رنگ چڑھادیا ہے جو اپنی اُپج اور بلند پایگی کے لئے بے مثل ہے۔ ان کا مطمح نظر "اصلاح قوم" یا تبلیغ نہیں بلکہ انکا فن صرف فن کی خاطر ہے اور اس سے آگے کوئی مقصد نہیں، اور یہی اُن کی بڑی خوبی ہے۔

آپ کا طرزِ نگارش اور اسلوب بیان دلکش اچھوتا اور نرالا ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے ان کا مذاق عام فہم نہیں ہوتا، صرف تعلیم یافتہ طبقہ اور بالخصوص سوچنے اور سمجھنے والے اصحاب ان کے مزاح سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

مولوی چراغ حسن حسرت (سند باد جہازی) ایک انوکھے اور اچھوتے مزاح نگار ہیں۔ ان کا مقصد مزاحیہ عبارت میں صرف سیاسی اور سوشل حالت پیش کرنا ہے۔ ان کا خاص رنگ طنز نگاری ہے۔ یہ مزاح میں طنزیات کی آمیزش سے خوب خوب سیاسی اور سوشل حالتوں کا "کچا چٹھا" پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں Situation کو چنداں دخل نہیں ہے Wit سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ بہت ہی برجستہ ہوتے ہیں جو بعض اوقات "دکھتی رگ" پر نشتر کا کام کرتے ہیں۔ جملوں کی بندش میں ایسی پھبتیاں کستے ہیں کہ باید و شاید، مگر خوبی یہ ہے کہ اپنے طنز کو عُریاں نہیں ہونے دیتے

سید امتیاز علی تاج نے اولاً "چچا چھکن" کو خوب نوازا اور خانگی زندگی کے پردہ میں خوب خوب مزاح نگاری کی ان کا مزاح Situation سے پیدا ہوتا ہے، بذلہ سنجی اور ذکاوت کو کم دخل ہے، وہ ازدواجی زندگی اور کریکٹر کی خامیوں کو مجتمع کرکے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ لغویت (Absurdities.) بدرجۂ اتم موجود ہے اور انھی پیش پا افتادہ (Absurdities) سے فائدہ اُٹھا کر وہ مذاق پیدا کرتے ہیں۔ واقعہ خود ایسا ہوتا ہے جس میں "نمک مرچ" لگا کر وہ ہنستے ہنساتے ہیں۔ اب ایک عرصہ سے انھوں نے مزاح نگاری سے توجہ ہٹالی ہے۔ اگر اسی رنگ میں لکھے جاتے تو خوب لکھتے۔

میرو لی اللہ کے ہاں خاص بات مزاح نگاری کے ساتھ تنقید ہے۔ وہ سنجیدہ مضامین میں مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جو کچھ مزاح پیدا ہوتا ہے اُس کا ذکاوت سے زائد تعلق ہوتا ہے Wit کی سب خصوصیات اِن کے ہاں موجود ہیں، مگر بعض دفعہ تنقید نگاری کی دُھن میں وہ مزاح کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں۔ درحقیقت تنقید نگاری کے ساتھ مزاح کا امتزاج کرنا بہت مشکل ہے۔ اسلوبِ نگارش کچھ خشک سا ہے جس سے ایک "زندہ مسکراہٹ" کے بجائے افسردہ سی مسکراہٹ لبوں تک آ کر رہ جاتی ہے۔

میاں اسلم ایک کہنہ مشق ادیب ہیں اور مزاحیہ مضامین کی بہ نسبت علمی اور تاریخی مضامین بہتر لکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی فطرت خاص طور پر سنجیدہ واقع ہوئی ہے۔ اور ان میں مزاح کا اصلی جوہر مفقود ہے۔ رفتارِ زمانہ سے مجبور ہو کر انھوں نے "مزاحیے" لکھ ڈالا۔ ان کے مزاح میں وہی فرق ہے جو اکتسابی اور فطری ذوق میں ہوتا ہے، یہ خود ہنسنا نہیں جانتے ہیں بلکہ ہنسنا چاہتے ہیں، اور اسی

وجہ سے ان کا مزاح اصلی اور حقیقی نہیں ہوتا۔

مرزا جی میں انھوں نے Humour of Character کو پیش کیا ہے اور مرزا جی National Character تصور کر کے وہ تمام لغویات (Absurdities) جو ایک عقل سے بیگانہ شخص میں ہوسکتی ہیں پیش کر دی ہیں اور اس طرح مزاح پیدا کیا ہے۔ مگر یہ سعی کہاں تک کامیاب ہوئی ہے اس کا اندازہ اہل ذوق لگا سکتے ہیں۔

سید سجاد حیدر صاحب اُردو افسانہ نویسی کے ایک خاص رُکن ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے حسب موقعہ افسانوں میں مزاح کی بھی چاشنی دی ہے یہ ذکاوت اور علمیت سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور ان کا مذاق بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔ سوقیانہ مذاق سے انتہائی گریز کرتے ہیں۔ اس بارے میں ان کے مزاح کی خوبی یہ ہے کہ سُننے والے کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسّم رقص کر جاتا ہے۔ دل میں ایک خفیف خوشی وانبساط کی لہر اُٹھتی ہے' اور دماغ کو لطف اندوز کر کے دل کی گہرائیوں میں غائب ہو جاتی ہے۔

بقول مرزا الم نشرح خوش مذاقی کی جان مضمون کے چند فقرے ہوتے ہیں جو مضمون میں نگینوں کی طرح چمکتے ہیں۔ ہر چیز کی زیادتی ہمیشہ بُری ہوتی ہے۔ خوش مذاقی کے لئے دوسری چیز عبارت کی روانی اور الفاظ کی بندش ہے۔ پڑھنے والا پڑھے اور ساتھ ہی ساتھ دل میں خیال آتا رہے کہ اگر خدا نے مجھ کو لکھنے کی قوت دی ہوتی تو مَیں بھی یوں ہی لکھتا۔ غالب مرحوم نے اِس خوبی کی یوں تعریف کی ہے:۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا ۔۔۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نیں دولت کی زیادتی کو دولتمندی نہیں کہتا اور دولت کی کمی کو بھی مفلسی نہیں کہتا یہ دراصل ان دونوں کی حالتوں کا نام ہے جس کے دل میں ان قابلیتوں کی کمی ہے، جو واقعی زندگی کا شکوہ عطا کرتی ہیں۔ میں اس کو مفلسی مانتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ روپئے پیسے کی کمی مصیبت کا سامنا ہے، پیٹ کا دُکھ بڑا دکھ ہوتا ہے لیکن مجھے افلاس کی اصلی صورت وہاں نظر آتی ہے جہاں دل کے سچے جذبات کو اُبھرنے اور دُنیوی مناظر سے خوش ہونیکا موقع نہیں ملتا ہے۔ ایشور نے تمھیں پیدا کیا صبح چاند ستارے سب کے سب تمھارے غلام ہیں۔ دریا اور پہاڑ کے دامن تمھیں اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھا رہے ہیں۔ ہاتھ پاؤں کان ناک آنکھ جیسے اعضا اور دل ودماغ عطا ہوئے ہیں اگر تم اُنکے جائز استعمال سے قاصر ہو۔ ممکن ہے بنک میں تمھارے کروڑوں روپیے جمع ہوں لیکن اگر تمکو شانتی نصیب نہیں تو تم دولتمند نہیں مفلس ہو۔ تمھاری حالت قابل رحم ہے۔ سچی دولت وہ ہے جو دل کی قابلیتوں کو بڑھاتی جائے علم و عقل کو وسعت دے رحم، محبت جوش اور ہمدردی تمھارے حصے میں آئیں، انسانیت کا مقصد پورا ہو۔" (مہرشی شیوبرت لال ورمن)

آثارِ وقت

(از پنڈت آنند نراین مُلّا، ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی)

ہر اِک سِمت کالی گھٹا چھا رہی ہے پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے
بدلنے کو ہے پھر نظامِ زمانہ ہوا ختم وہ دَورِ شاہنشہانہ
لبِ دہر پر ہے نیا اِک فسانہ ترانے نئے زندگی گا رہی ہے
ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

خفا اِس تغیُّر پہ جو ہو رہے ہیں ابھی خوابِ غفلت میں وہ سو رہے ہیں
زمانے کی حالت پہ جو رو رہے ہیں زمانے کو اُن پر ہنسی آ رہی ہے
ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

اُدھر اہلِ دولت کا جھنڈا گڑا ہے اِدھر بے نواؤں کا ڈیرہ پڑا ہے
جہاں، دو قطاریں بنائے کھڑا ہے زمیں جیسے گردوں سے ٹکرا رہی ہے
ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

یہ جھگڑا نہیں سلطنت کا نہ یہ تفرقہ مذہب و قومیت کا
تصادم ہے یہ ذہنیت ذہنیت کا دلوں میں لڑائی لڑی جا رہی ہے
ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

ہر اک جہدِ ہستی میں یہ جلوہ گر ہے اِسی پر مدارِ اُمیدِ بشر ہے
کچھ ایسا جہانگیر اس کا اثر ہے کہ دُنیا سمٹتی چلی جا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

یہی چاہتے ہیں، جو ہیں اہلِ ثروت ہے مٹھی میں جن کی عنانِ حکومت
کسی طور ہاتھوں سے جائے نہ طاقت مگر پھر بھی طاقت چِھنی جا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

حکومت کا لیکن طریقہ نہ بدلا پڑا ہے ابھی تک نگاہوں پہ پردا
ہے انداز اب بھی وہی گفتگو کا وہی راگ گائے چلی جا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

کبھی بھر کے آنکھوں میں چنگاریاں یہ دیئے جا رہی ہے ہمیں دھمکیاں یہ
کبھی بن کے اِک مادرِ مہرباں یہ کِھلونوں سے بچّوں کو بہلا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

کبھی ناتوانوں کی دَمساز بن کر کبھی بے زبانوں کی آواز بن کر
کبھی خود مشیّت کی ہمراز بن کر ہمیں نیک و بد خوب سمجھا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

نہیں آتی جب کام تقریر کوئی نہیں ٹھیک پڑتا ہے جب تیر کوئی
نہیں بنتی جب اور تدبیر کوئی تو مذہب کے شعلوں کو بھڑکا رہی ہے

ہر اِک سِمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

مگر وقت سے کون جیتا ہے بازی کہیں موجِ طوفاں بھی روکے ہے رُکتی
تزلزل میں ہے قصرِ سرمایہ داری فصیل اِک نہ اِک ٹوٹتی جا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

منظّم ہیں اب فاقہ مستوں کے لشکر کڑے پڑ رہے ہیں غریبوں کے تیور
جو اُڑنے لگیں تھیں حکومت کی شہ پر اب ان چیونٹیوں کی قضا آ رہی ہے

ہر اِک سِمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

لئے دل میں اِک جذبۂ بے پناہی نگاہوں میں اِک جلوۂ صُبح گاہی
ہے پھر کارواں نوعِ اِنساں کا راہی مجھے اس کے قدموں کی چاپ آ رہی ہے

ہر اِک سِمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

مساواتِ انساں کے بُڈھے سپاہی ترے نام دنیا کی ہے تاجداری
عروسِ جہاں ہو چلی نیم راضی تری گرم نظروں سے شرما رہی ہے

ہر اِک سِمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

کلامِ حسرت

(از مولانا حسرت موہانی)

اُسی کا جلوہ ہر جانب عیاں ہے — نمودِ حُسنِ بے صورت کہاں ہے
ملی دل کو مُرادِ نامُرادی — ترے غم کی بدولت شادماں ہے
فقیرِ بے نوائے درگہِ عشق — امیرِ بے نیازِ دو جہاں ہے
نکلنے پائے کیونکر یاد اُن کی — درِ دل پر محبت پاسباں ہے
نہ چھوڑی تم نے حسرت عشق بازی — تمنا پیر ہو کر بھی جواں ہے

عیش میری شکستہ حالی کا — عکس ہے اُن کی بے ملالی کا
عہدِ عشرت بھی تیرے ساتھ وہ تھا — کیا زمانہ فراغ بالی کا
حسن تیرا با متزاجِ وفا — اِک نمونہ تھا بے مثالی کا
پھر وہ آمادۂ خرام ہیں سر — پھر ہے مشتاق پائمالی کا
مہرباں ہو کے پاس کچھ تو کرو — لبِ حسرت کی بے سوالی کا

سوزِ غم ہے یہ کچھ بخار نہیں — تم کو اس کا بھی اعتبار نہیں
کچھ بھی ہو تم سے، طعن یا دُشنام — ہم کو واللہ ناگوار نہیں
تھی کبھی یاد اُن کی وجہِ سکون — اب کسی حال میں قرار نہیں
حیف اُس دل کی بے ملالی پر — جو ترے درد کا شکار نہیں
سہل کہتا ہوں ممتنع حسرت — نغز گوئی مرا شعار نہیں

محبت نے اثر پیدا کیا یہ دلنشیں ہو کر — کہ لب تک شکوہ ہائے حُسن بھی آئے حسیں ہو کر
یاد اُن کی ہوئی وجہِ سکون ہجر میں حسرت — بُلبُل کے لئے یادِ بہار آئی قفس میں

شاہجہاں پور کے ہندو شعراء

(از حضرت کلیم اعظم گڈھی)

مجھے شاہجہاں پور کے ایک دوست کی عنایت سے دو تین قلمی تذکرے اور ایک مطبوعہ تاریخ شاہجہانپور کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کے فارسی گو ہندو شعراء کا کلام پڑھکر حیرت ہوئی۔ یہ اپنے فن کے اُستاد اس طرح دنیائے ادب میں گمنام ہیں کہ کوئی جانتا بھی نہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ ان پر اہل زبان ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ قلمی تذکروں کا یہ عالم ہے کہ کچھ اوراق کہیں کے کچھ اوراق کہیں کے موجود ہیں مولوی صبیح الدین میاں صاحب نے ایک تاریخ شاہجہانپور لکھی تھی جس میں اُنھوں نے نہایت فراخ دلی سے جو لوگ اُنھیں میسر آسکے ہیں جگہ دی ہے۔ مضمون لکھتے وقت ان کتابوں کا نوٹ پیش نظر تھا شاہجہانپور کے مایۂ ناز شاعر پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر سے بھی اس مضمون میں امداد ملی ہے۔ اب اتنی دردسری کے بعد اُن بزرگوں کے کلام سے لُطف اُٹھایئے جو اپنے وقت کے آفتاب ماہتاب تھے

(۱) مسرور

آپ کا اسم گرامی سب سکھ رائے تھا، کایستھوں کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ شاہجہانپور کے محلہ مسجد گنج میں مکان تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۱۴۲ھ میں ہوئی۔ جیسا پہلے دستور تھا کہ تعلیم کے لئے ایک مولوی صاحب مقرر کردیے جاتے تھے آپ نے بھی کتب متداولہ قصبہ کانٹ کے اُستادوں سے پڑھیں جو اس وقت ایک مردم خیز خطہ تھا۔

مسرور کو فارسی اور ہندی دونوں میں دستگاہ کامل تھی۔ مشہور ہے کہ ہندی زبان میں سات کتابیں لکھیں مگر آج دست بُرد زمانہ سے ایک کا بھی پتہ نہیں۔ ٹھیک نہیں کہا جاسکتا کہ فارسی میں کتنی کتابیں لکھیں مگر ترجمہ نوادر، دیوان فارسی، انشائے فارسی، افسانہ خوش سواد، بیاض مسرور آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی کتابیں ہیں جنھیں تذکرہ نگاروں نے خود دیکھا ہے مگر اب اُن کا بھی پتہ نہیں۔ اس امر میں سب متفق ہیں کہ شاہجہانپور میں شاعری کا رواج مسرور ہی کے دم سے ہوا۔ آپ نے ترسٹھ ۶۳ سال کی عمر پائی اور ۱۲۰۵ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کے پوتے مسرور تے یہ تاریخ وفات لکھی:-

مسرور گو رفت زیں جہاں گزراں   بر اہل سخن ہزار غم بر دل و جان

گفتیم دو تاریخ وفاتش اینک   افسوس سخنوران غم اہلِ جہاں

نمونۂ کلام اظہار بیتابی کے انداز کو ملاحظہ فرمائیے:-

تا خیالِ آتشیں روے مرا از تاب بُرد   پارۂ از بیقراری ہائے من سیماب برد

تپ دل کے دُور کرنے کے لئے نسخہ ملاحظہ فرمائیے:-

حلاوتِ سخن و ترشیِ جبینِ من   برائے دفع تپ دل سکنجبین من

معشوق کے فراق میں دکھنا بھی گناہ ہے، اس لئے کہ جو نگاہ اُس کے چہرے پر پڑ گئی اُسے دوسروں پر ڈالنا احترام دوست کے منافی ہے:-

بیا کہ بے رخ خوبت گذشت ماہے چند   ذخیرہ است بچشمِ من از نگاہے چند

اِس خیال کو کہ معشوق کے بغیر ہمارا وجود ناممکن ہے کس ندرت سے ظاہر فرمایا ہے

بدوری تو وجودم کجا نشاں دارد   مگر صحیفۂ من خط تو اماں دارد

سبحان اللہ اس خط توام نے تو اس شعر میں جان ڈال دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہانپور کو ابتدا ہی سے کبوتروں سے خاص تعلق ہے، مسرور کی تشبیہ ملاحظہ فرمائیے

تا بشوقِ قد و زلف تو بہ پرواز آمد   دل کبوتر شد و یک نیز گرہ باز آمد

(۲) دیوان دولت رائے مبتہج

آپ کا اسم گرامی دولت رائے مبتہج تخلص ہے، کتب متداولہ کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ آپ نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی اور شاعری کا ترکہ باپ سے پایا۔ کچھ فارسی غزلوں کی اصلاح اپنے پدر بزرگوار سے لی، اس کے بعد طبیعت خود استاد رہی۔ سن پیدائش آپ کا معلوم نہیں، سال وفات ۱۲۱۵ھ ہے۔ تاریخ وفات آپ کے فرزند مسرور نے کہی۔ مصرع تاریخ "شد ریختہ سال فوت آں پاک رواں" ہے۔

آپ کا دیوان مکمل ہو چکا تھا، مگر اب تو نمونۂ کلام پیش کرنے کے لئے بھی اشعار نہیں ملتے، چند شعر جو حاصل ہوئے بطور یادگار درج ہیں:-

در ہجر تو دیدہ ام پر آب است   دل خانہ بدوشش چوں حباب است

دوسرے مصرع میں دل خانہ بدوش کو دیکھئے اور ندرتِ تشبیہ کی داد دیجئے

روئے چو گلش بیاد دارم   ہر اشک بدیدہ ام گلاب است

اِس ندرت کو ملاحظہ فرمائیے کہ کس طرح اشک کو گلاب بنایا۔ سنا ہے نورجہاں نے اپنے حمام میں گلاب کے پھول کو پانی پر تیرتا دیکھا اور پانی میں خوشبو محسوس کی۔ اس طرح اس کا ذہن عرق گلاب کی طرف پہونچا یا

مبتہج کی اڑان کو دیکھیئے کہ گل عارضِ کی آنکھوں میں وہ اثر پیدا کیا کہ اشک گلاب ہوگیا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ

مبالغہ ملاحظہ ہو:-

امشب نگاہِ من رگِ یاقوت گشتہ است شاید کہ شد بہ لعل لبش چشم وا مرا

ذرا اس برات کو ملاحظہ فرمائیے:-

نوشہ من زبیدم اندر براتِ عشق او تارہائے اشک گلگونم بردیم سہرا است

اشک کے تار کو کسی نے سہرے سے تشبیہ نہیں دی تھی، یہ مبتہج صاحب کا کمال ہے کہ اُسے سہرے سے تشبیہ دے کر نباہ بھی دیا۔

جز عشق تو پرسان زدل زار کہ باشد جز درد و غمت محرم اسرار کہ باشد

جز فرقۂ طفلاں دلِ دیوانۂ مارا در کوچہ و بازار خریدار کہ باشد

اس خریدار کو ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے:-

مبتہج را بصد قدِ دستار گل رخاں سرفراز باید کرد

عمر بگذشت ہائے عبث درعا مرا آں بے وفا ندید زچشم وفا مرا

ندرت کی شوخی ملاحظہ ہو:-

نیست ایں رنگِ حنائے بر کفِ پائے کسے
تشنۂ خون منت اینجا کہ بر پائے کسے

(۳) سُرور

آپ کا اسمِ گرامی مہت پرشاد اور تخلص سرور ہے۔ آپ کے والد کا نام دولت رائے ہے جن کا تخلص مبتہج تھا۔ آپ کے دادا مسرور ایک بہترین شاعر گذرے ہیں۔ گویا شاعری کی دولت ورثہ میں ہاتھ آئی۔ علوم متداولہ اور فنِ شعر میں منشی عیوض رائے مسرت کے شاگرد تھے۔ طبیعت نہایت دراک پائی تھی۔ علاوہ شاعری کے آپ کو علمِ ریاضی میں ملکۂ تامہ تھا۔ اس فن میں آپ نے کئی کتابیں لکھیں، فنِ شعر میں منتخب البدائع مرتب ہوچکا تھا مگر اب اس کا کہیں پتہ نہیں۔ آپ نے شاہجہانپور پر بالخصوص اور تاریخ ادب پر بالعموم ایک تذکرہ مسمّٰی بہ شعرائے عجم و ہند لکھ کر جو احسان کیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو لوگ شعرائے شاہجہانپور سے ناواقف ہی رہتے۔ آپ کو تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی۔ چنانچہ آپ نے ہر ایک معصر کی تاریخ وفات لکھی، مگر افسوس ان کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں۔ آپ کے فارسی کلام کا مجموعہ دیوان فارسی ترتیب پاچکا تھا مگر اب اس کا بھی کہیں پتہ نہیں۔

نمونۂ کلام آپ نے اکثر اُستادوں کی طرحوں پر طبع آزمائی کی ہے، اسی سلسلے میں ایک غزل جس پر حافظ

اور حزیں وغیرہ نے غزلیں لکھی ہیں ناظرین کے سامنے پیش ہے سرور

سرور:۔ شب عید آمدہ مستاں در میخانہ زدند ماہ دیدند و نظر بر رخ پیمانہ زدند

حافظ:۔ دوش دیدم کہ ملایک در میخانہ زدند گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

دونوں اپنے اپنے رنگ میں فرد ہیں

سرور شعلۂ آتش گل سوخت دل بلبل را آتش شمع اگر در سر پروانہ زدند

حافظ آتش آں نیست کہ بر شعلۂ او خندد شمع آتش آنست کہ بر خرمن پروانہ زدند

حافظؒ نے پروانہ کے لئے جو رنگ اختیار کر لیا تھا، اس کے بعد اگر پروانہ کے قافیہ کے لئے کوئی اچھی صورت تھی تو یہی تھی جسے سرور نے اختیار کی۔

حافظ علیہ الرحمۃ نے ہفتاد و دو ملت کی جنگ دیکھکر فرمایا:۔

حافظ جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

سرور نے اس جنگ کے مٹانے کی تدبیر پیش کی ہے:۔

سرور:۔ تا محبت نہ زند آب کجا بنشیند آتش فتنہ کہ در کعبہ و بتخانہ زدند

حافظ علیہ الرحمۃ نے اپنے خاص رنگ میں دیوانہ کے قافیہ کو باندھا اور اس کے بعد کوئی جگہ نہ چھوڑی

حافظ:۔ آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

سرور غریب کی عالم بالا پر اڑان کہاں اس لئے اس زمین کی بادشاہت تو چھین ہی لی:۔

سرور:۔ ملک صحرا ہمہ از قبضۂ مجنوں گیرم کز جنوں سکہ بنام من دیوانہ زدند

آخر میں فرماتے ہیں:۔

اے سرور ایں غزلت طرح حزیں و حافظ کاں دو سلطان سخن نوبت شاہانہ زدند

اب ہم مختلف اشعار مختلف جگہوں سے پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

شب کہ در چشم خیال حسن آں گل پوش بود خون بلبل در رگ نارنگہ در جوش بود

رعایات قابل ملاحظہ ہیں۔

غالب کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

کند یکجا ہم یاران دور افتادہ را روزی لب دوست وزباں شامل بود بر وقت خوردنہا

(۴) منشی انت رام خاموش

اسم گرامی منشی انت رام خاموش تخلص قوم کایستھ محلہ مسجد گنج شاہجہانپور کے رہنے والے تھے۔

علوم متداولہ میں مہارت تامہ حاصل تھی، ابتدائے سن شعور میں ایک صوفی گنگا رام کی نظر توجہ پڑی اور اپنا بنا لیا، ایک طوائف پر دل آگیا تھا جس کا نام بیجا تھا۔ متوکل اور قانع تھے۔ بیجا کے مرنے پر فرمایا:-

ہوشِ من از سر بکارِ عشقِ بیجا رفتہ است　　خویش ازیں دیوانہ ہمہ بیجا رفتہ است

آپ کے کلام میں تصوف کی چاشنی زیادہ ہے۔ نمونۂ کلام:-

پرکارِ صفت در انتقال خویشم　　سرگشتہ تراز وصال خویشم
آئینۂ حیرت خیال خویشم　　خاموش زحسنِ ذو الجلال خویشم

زخاموشی بہ تنگ آمد دلم اے نالہ فریادے　　زسوزِ حسن خاکستر شدم اے گریہ امدادے

مست چشمِ پُرخمارِ یک پریزادے شدم　　پائے بندے صد جنوں از سرو آزادے شدم

انتہائے رشک ملاحظہ ہو:-

نالہ را بر سر بام تو رسیدن ندہم　　اشک را لذتِ راہِ تو چشیدن ندہم

(۵) فرحت

آپ کا اسم گرامی منشی رام کشن فرحت تخلص قوم کا یستھ مسرور کے شاگرد تھے۔ فارسی علم ادب میں مہارت تامہ تھی، شاعری کے لحاظ سے اپنے ہمعصر شعرا میں ممتاز تھے۔ آپ نے فارسی میں مثنوی مظہرِ عشق اور فنِ خطاطی میں دو کتابیں نیرنگ سودا اور اورنگ سودا لکھیں، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ۱۲۱۲ء میں انتقال کیا۔

نمونۂ کلام　ندرت تشبیہ ملاحظہ ہو:-

گلبن قامتش نگر، نرگس چشم مست ہم　　ساقی دہر را بکف شیشہ یکے و جام دو

صنعت مراعاۃ النظیر و حسن تعلیل ملاحظہ فرمائیے:-

نمی دانم کدامی خوش قدے جا کرد در گلشن　　کہ نخلِ بید مجنوں گشت شمشاد از طپیدنہا

غالب نے کہا ہے:-

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسی رنگ　　اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

فرحت صاحب اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:-

نہ ہستی من دیوانہ تا نشانے ہست　　صدائے سلسلہ و نالہ و فغانے ہست

(۶) لالہ مہتاب رائے رغبت

اسم گرامی لالہ مہتاب رائے تخلص رغبت، ناہنال میں پرورش و تعلیم پائی، اپنے ماموں مسرت کے شاگرد تھے، چونکہ ناہنالی اور دادیہالی دونوں خاندان تعلیم یافتہ تھے اس لئے جلد ہی تحصیل علم سے فراغت حاصل کرلی۔ تذکرۂ سرور میں ان کی انشا پردازی کی بہت تعریف لکھی ہے مگر آج تلاش کرنے پر بھی کسی کا پتہ نہیں صرف ایک شعر بطور یادگار دستیاب ہوا جو درج ہے ؎

نہ کنم گلہ پریشاں پئے ہیچ کار خود را
مگر آں دو زلف مشکیں کہ بساخت مار خود را

(۷) ساقی

اسم گرامی لالہ موتی لال ساقی تخلص، شاہجہانپور کے قدیمی باشندے قوم کالستھ محلہ تلیا گھورن میں مکان تھا۔ تذکرۂ سرور میں آپ کے حالات ملتے ہیں۔ علم اور کلام کے متعلق یہ تحریر ہے کہ "دریں ضعف پیری وکبرسنی نشہ جوانی اش ہمچناں باقی است در تمہید سخن و تسوید عبارت و ترمیم علم سیاق و سیاق ماہر کامل بود" جیسا پرانے تذکرہ نویسوں کا قاعدہ تھا سرور نے بھی بہت کم تاریخ پیدائش اور دوسرے حالات درج کئے ہیں چنانچہ اُن کی بھی تاریخ پیدائش و وفات لامعلوم ہے۔

نمونۂ کلام رشک کے انداز کو ملاحظہ فرمائیے:۔

میخواستم رسد بکعت پائے آں صنم	آں رنگِ پاں کہ برلبِ جاناں رسیدہ ماند

رقیب کو کلاغ کس بہتر انداز سے بنایا ہے:۔

کے رقیب آگہ کند ما را ز تشریفِ صنم	دوستاں بر شگون گیری کلاغِ دیگر است
ابر سے و ساغر برائے دیگراں آوردہ اند	از برائے مستیم ساقی ایاغِ دیگر است

التماس ملاحظہ کیجئے:۔

کن اسیرِ قفس چند روز اے صیاد	ز غنچہ تاکہ یہ گلزار رنگ و بو دارد
اثر کرد است شاید در دمن بر خاطرش ساقی	کہ عذر جور پیشیں را کنوں در ہر سخن دارد

(۸) نشاط

لالہ مہتاب چند نام اور نشاط تخلص تھا۔ ان کا حال بھی تذکرۂ سرور میں ہے تالیف تذکرہ کے وقت حیات تھے، مگر پھر بھی اُن کے متعلق کوئی معلومات نہیں، نہ سنِ پیدائش کا ذکر نہ سنِ وفات کا صرف اس سے

آتا پتہ چلتا ہے کہ رنگین خیال شاعر تھے۔

نمونۂ کلام

مارا شہید کرد و قضا را بہانہ ساخت — تیغ از میان کشید و ادا را بہانہ ساخت

جاں بہ تنگ آمدہ از درد گرفتاریِ دل — با اجل کاشکی رسد نوبت تیماریِ دل

ہمچو شاخیکہ ز بارِ ثمر افتد بہ زمیں — زلف افتادہ بہ پائے تو ز بسیاریِ دل

دوسرے شعر میں صنعتِ حسن التعلیل قابلِ ملاحظہ ہے۔

(۹) مسرت

اسمِ گرامی منشی عیوض رائے مسرت تخلص قوم کالیستھ محلہ مسجد گنج میں مکان تھا، ابتک اُسکی یادگار میں ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر موجود ہے، آپ کے والد کا نام لالہ لالچی مل تھا۔ شیخ احمد خاں مختار کے شاگرد تھے۔ عربی و فارسی کی تکمیل اُنھیں سے کی نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ آپ کی وجہ سے آپ کے اُستاد کا نام بھی روشن ہوا۔ آپ سے پہلے ایسا نازک خیال، نغز گفتار، پُرگو کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا ایک نہیں کئی دیوان ترتیب دیے، اُستادوں کے قصائد کی شرحیں لکھیں، چنانچہ حکیم قاآنی کے قصائد کی ایسی شرح لکھی کہ لوگ حیرت میں پڑ گئے، مثلاً شعر ذیل کی تشریح میں مختلف اسلوب سے مختلف معنی پیدا کردیے

در روشِ حسن و ناز ہست بسے خوش نما — غمزہ لطارز ستم عشوہ برنگِ جفا

امرائے دہلی اور لکھنؤ کی شان میں قصائد لکھے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کو مسرت کے ماہرِ فن ہونے کا اعتراف تھا۔ مسرت نے آزاد کے پاس نیازمندانہ عریضہ بھیجا جس میں حسب ذیل رُباعی تھی:۔

اے ذات تو مجمعِ صفاتِ معنیٰ — یعنی بصفاتِ خویش ذاتِ معنیٰ

صورت نگرفت دفترِ علم ہنوز — کز خامہ رقم زدی براتِ معنیٰ

آزاد نے جواب میں لکھا:۔

کرد ارشاد بہ اہلِ سخن استادِ سخن — بادشاہِ سخن است آنکہ دہد دادِ سخن

تو سخن سنجی و قدرِ تو سخنور داند — کیست سنجیدہ بامثالِ تو اُستادِ سخن

مسرت کے کلام میں شوخی و صفائی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، کلام پڑھتے جائیے اور لطف اُٹھاتے جائیے ثقالت نام کو نہ پائیں گے۔ ان کے کلام پر اہلِ زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ نواب جلال الدین مرزا مہدی علیخاں خلف نواب سعادت علی خاں مسرت کی قابلیت اور سخنوری کے بڑے قدرداں تھے۔ بارہا فنِ شعر اور

حل مطالب اشعار کے متعلق مسرت سے مشورہ کیا۔ میرزا نصیرالدین بھی اُن کے قدردانوں میں تھے چنانچہ اُنھیں اپنے علاقہ کا ضلعدار بنا دیا تھا۔ باوجود ان قدردانیوں کے تمام عمر فکر معاش میں سرگرداں رہے، کہیں چین سے بسر نہ ہوئی، مگر اس میں اُن کی نازک فراجی کا بھی قصور تھا۔ ایک امیر کو لکھتے ہیں:۔

گردشِ دوراں ز مقصودم جدا افگندہ است | دستگیرم شو کہ گردونم ز پا افگندہ است
از تو می باید کہ بازم جا دہی بر جائے خویش | از کجا نا سازیِ بختم کجا افگندہ است

ایک دوست کو اپنی بیکاری کی شکایت یوں لکھی ہے:۔

بشکستہ اند ہر سر مو از سرشت ما | خط شکستہ بود مگر سر نوشت ما
چیزے بجا نماند ز ما بر سر زمیں | بردایں فلک ز جا ہمہ از خوب زشت ما

آپ کی تصانیف کی تعداد اٹھائیس تک بتائی جاتی ہے۔ فارسی کے دیوان میں بیس ہزار اشعار تھے قصائد خاقانی، قصائد عرفی۔ قران السعدین۔ دیوان ناصر علی سرہندی۔ دیوان زلالی۔ مثنوی علامہ عبدالجلیل بلگرامی کی شرحیں لکھیں۔ بہار دانش کو منظوم کیا۔ آفتاب مسرت۔ دیوان مسرت۔ باغ سلطان عطا شاہ منظوم جس میں سات سو اشعار تھے، یہ سب لکھیں، مرتب کیں مگر دست بُرد زمانہ سے آج کسی کا پتہ نہیں۔

آپ میں برجستگی بے انتہا تھی، اکثر قلم برداشتہ ایسا لکھتے کہ لوگ سوچ کر بھی نہیں لکھ سکتے۔ آپ کے دوست غلام حسین نے آپ کے پاس چار عدد گنّے بھیجے۔ شکریہ میں لکھتے ہیں: "در شکر عنایت رباعی شیریں افزا کہ در خامہ تحریر وصفش نیشکری انگشت نما است ایں رباعی شکر ریز کہ بشیرہ جانش پرداختہ اند حلاوت افزائے کام و دہاں دعائے ثنا است ؎

اے نیشکرِ تو داد داد دلہا | شیرینیِ کام جاں از و شد پیدا
باللہ نہ خود شکر ز شیرینیِ خویش | با ہمچو نبات از نبا تست نما

زمانے نے اُن کی قدر نہ کی، مرزا عبداللہ خاں کے انتقال کے بعد برابر پریشان رہے۔ مزاج میں افلاس اور ناداری نے چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ مایوس ہو کر فرماتے ہیں:۔

قدر ہنر نماند مسرت دریں جہاں | بیزارم از ہنر چہ ہنر آرزو کنم

۱۲۳۶ھ میں انتقال فرمایا، اُن کے شاگرد سرور نے تاریخ لکھی:۔

کجا مسرتِ افصح سواد درد آمیز | سن ہزار و دو صد سی و شش وبال انگیز
بگذشت مسرت و غمش جاں گسل است | چوں او نہ دگر صاحب علم و عمل است
جستم چو سن وفاتش از ہاتف | گفتا کہ شہ سخنوراں بے بدل است
۱۲ ھ ۳۶

نمونۂ کلام مکمل غزل ملاحظہ فرمائیے:-

از پیر و جواں شور تو لائے تو برخاست — برخیز کہ عالم بہ تمنائے تو برخاست
من سوختم از سوزِ غمِ عشق تو اول — از خانۂ دل آتشِ سودائے تو برخاست
تسبیح بکف دارم و زنار بہ گردن — ایں سلسلہ از زلف چلیپائے تو برخاست
یک نیزہ بلند از سرِ عشاق رود خوں — ایں فتنہ کہ از قامتِ رعنائے تو برخاست
نالیدنِ دلہا عجبے نیست مسرت — سوزِ عجبے از دلِ شیدائے تو برخاست

ایک ہی مضمون کو مختلف شعرا نے کس انداز میں ادا کیا ہے، ملاحظہ ہو:-

مولانا رومی :- بے خطامی جست تیر از شست او — شستِ او شاگرد چشم مست او
غلام جیلانی رفعت :- کے تواں جست از صفائے شست او — قبضہ‌ی گیرد قضا از دست او
ہت پرشاد سرور :- ساقی آمد جام مے در دست او — جامِ مے مستِ نگاہِ مست او
مسرت :- تیر او نازد بخویش از شست او — شست او قربان ناز دست او

ایک مکمل غزل اور ملاحظہ فرمائیے :-

دل را بروں ز سینہ برائے تو می کنم — خالی ز غیر پردہ سرائے تو می کنم
خود را ز چشمِ غیر نہاں می کنم ز ناز — روزیکہ یاد شرم و حیائے تو می کنم
ایں موجِ خوں نمی شود از مشہدم بلند — دستے بلند بہر دعائے تو می کنم

آخری شعر میں جو ندرت مسرت نے پیدا کی ہے کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔

توکل الی اللہ کی تعلیم ملاحظہ ہو:- رباعی

ہر چند بیکسی، بہ کسے التجا مکن — حاجت روائے خود بخدا جز خدا مکن
حاجت روا است یا ز چہ حاجت بری بغیر — ایں ناروا بخویش مسرت روا مکن

کمر کی نزاکت کو تمام لوگوں نے باندھا ہے، مگر مسرت کا رنگ دیکھئے:-

قتد وقتِ تماشا اشتباہم — کمر یا سایۂ تارِ نگاہم

سبحان اللہ سایۂ تارِ نگاہ سے کمر کی تشبیہ بالکل اچھوتی ہے۔

مسرت مطلع کا بادشاہ ہے، ملاحظہ ہو:-

گردشِ چشمِ مست او رقص دہد پیالہ را — موئے کشاں ز جا برد زہد ہزار سالہ را

چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیے جو مطالب، ندرت تشبیہ اور حسنِ تعلیل میں بے مثل ہیں

فارغ از رسم و رہِ گبر و مسلماں کردی　　　اے جنوں گرد تو گردم کہ چہ احساں کردی

دگر یہ عرقم ددر سینہ داغ می سوزم　　　ستم کہ در دل و دریا چراغ می سوزم

بے ریاضت نتواں شہرۂ آفاق شدن　　　مہ چو لاغر شود انگشت نما می گردد

زلف را گفتم سیہ چونی بخود پیچید و گفت　　　ہر کہ با خورشید بنشیند سیہ رنگش شود

از حکایت منظوم :-

شاہ پرسید از حکیم ہوشمند　　　کز تو پرسم در جہاں آواز چند

گفت شاہا از ہمہ آواز ہا　　　چار آواز آمدہ از بس پسند

قلقل بانگ صراحی چرچر تیغ کباب　　　چم چم بوس و کنار و کشمکش شلوار بند

مسرت کے مشہور شاگرد سیو رام جوہر۔ مکھن لال بہجت بلگرامی۔ ہت - سرور۔ خلیفہ سمیع اللہ مولوی فخر الدین احمد دہلوی۔ حکیم محمد شاہ عالم لکھنوی ہیں۔ اولاد کا سلسلہ موجود ہے۔ اُن کی غزلیات اور شرح ناصر علی سرہندی ابتک موجود ہے، اگر اس کی طباعت کی طرف توجہ نہ کی گئی تو یہ بھی فنا ہو جائیگی، کیونکہ فارسی کا دور گزر گیا اب تو اس کے سمجھنے والے بھی کم ہیں۔ ایک وقت وہ ہوگا کہ ردی خانے میں ردیوں کے بھاؤ بیچ دی جائیں گی۔

(۱۰) محظوظ

آپ کا اسم گرامی لچھمی نراین عرفیت مادن لال اور محظوظ تخلص ہے۔ یہ مسرت کے صاحبزادے ہیں۔ تعلیم و تربیت باپ نے کی شاعری میں باپ کے شاگرد ہیں، تھوڑے دنوں تک سرکاری ملازمت بھی کی مگر جنون کی وجہ سے دست بردار ہونا پڑا، باپ کے علمی سرمایہ کو بھی جنون میں برباد کر دیا، کافی عمر پاکر مرے جنون مرتے وقت تک نہ گیا۔ ایک مکمل غزل ملاحظہ ہو:-

چشمش بقتل عاشقاں باشد نہ تنہا یک طرف　　　گیسو نگہ خنجر بکف مژگاں صف آرا یک طرف

بہر دل بیچارہ ام دارد نزاعے درمیاں　　　ہندوئے خالش یک طرف زلف چلیپا یک طرف

آں گلعذار سرو قد چوں شد بہ گلشن جلوہ گر　　　گل شد پشیماں یک طرف سرو قد آسا یک طرف

محظوظ از زلف و رخِ آں دلربا در حیرتم　　　شب جلوہ دارد یک طرف در جلوہ بیضا یک طرف

مردم و سوز غم عشقت زرفت از سینہ ام　　　کردہ ام از داغ دل شمع مزار خویش را

ہر کہ بجام دل کند بادۂ دل کشائے او　　　بر سر سنگ میزند جام جہاں نمائے او

راہِ کشمیر

(حضرت شادؔ عارفی)

ابر کے سقّوں نے دھویا جب رُخِ گردو غبار
لے چلا کشمیر کی جانب مجھے شوقِ بہار

آ کے اسٹیشن سے باہر، جائے پی کر گاؤں میں
چلد یا میں رات کے تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں

تھی ہوا ساکت، فضا خاموش لیکن دم بدم
بُوٹ کی چَرمَر سے پیدا ہو رہا تھا زیر و بم

ماہِ کامل کی شعاعیں تھیں بہ رُجحانِ عجیب
پڑ رہا تھا میرا سایہ میرے قدموں کے قریب

رازِ پستی و بلندی آئینہ پاتا تھا مَیں
آ رہا تھا جادۂ کشمیر اور جاتا تھا مَیں

صبحِ کاذب کہُر سا برسا گئی ہر چیز پہ
بھینی بھینی سی طراوت چھا گئی ہر چیز پہ

پیرِ سحر آئی دوشالا سر سے ڈھلکاتی ہوئی
عارضِ رنگینِ گل پر نُور پھیلاتی ہوئی

شمع کا فوری جلو میں، عود سلگائے ہوئے
سرخیاں لب پر، گلوری پان کی کھائے ہوئے

جب اُجالا ہو چکا، تاریکیاں جاتی رہیں
خندۂ گل کی صدائیں کان میں آتی رہیں

مور، اونچی ٹیکری پر، دُم کو کھولے رقص میں
اور سڑک کے دہنے بائیں کچھ ممولے رقص میں

سرو پر قمری کی تانیں، تار پر سِتا ما کی ریز
جنتِ گوشِ سماعت، روح پرور لطف خیز

اس توقع پر، نشانِ کشمیر کے آئیں نظر
میں نے دوڑایا نگاہوں کو بلندی پر، مگر

قلزمِ گل میں جہاں تک کام کرتی تھی نگاہ
دوڑتی جاتی تھی تا حدِّ نظر، پُر پیچ راہ

ایک ناگن تھی کہ گلزاروں میں بل کھاتی ہوئی
تلملاتی خاک پر، سبزہ پہ لہراتی ہوئی

موڑ پر رُکتی ہوئی، تھم تھم کے خم کھاتی ہوئی
رہرووں کو، گل بہ کفِ آئینہ دکھلاتی ہوئی

ابر کے سایوں میں چھپتی، دھوپ سے بچتی ہوئی
ٹھوکریں کھاتی، سنبھلتی، اینٹھتی، بچتی ہوئی

جھلملاتی، رینگتی، چڑھتی، مچلتی، کانپتی
دوڑتی، تھک کر ٹھہرتی، سانس لیتی، ہانپتی

پُل کے نیچے خندقوں کو جھانک کر ہٹتی ہوئی
اونچے اونچے سخت دِل ٹیلوں سے کچھ کٹتی ہوئی
چوٹیوں سے تنگ آجانے پہ سر دُھنتی ہوئی
ہر مسافر سے طوالت کے گِلے سُنتی ہوئی
کُنج سے مِلتی ہوئی، غاروں سے کتراتی ہوئی
پے بہ پے منزل بہ منزل۔ شان دکھلاتی ہوئی

عین ممکن ہے یہ ہو وہ راہِ گلزارِ خلیل
عہدِ حاضر نے سجائے جس پہ کھمبے۔ تار۔ میل
یا یہ وہ دلکش روش ہے کوہِ گردوں بوس پہ
مشتمل ہے جس کا اِک اِک دَور سَو سَو کوس پر
دھان کے کھیتوں کی یا وہ مینڈ ہے دیہات میں
دُوب نے چادر اُڑھا دی ہے جسے برسات میں
خشک ہو کر رہ گئی یا جوئے شیرِ بے عدیل
مصر کے دامن میں یا پایاب ہے دریائے نیل
کوہِ ہندوکش کی پگڈنڈی مگر آساں گزار
ڈھال خیبر کے درہ کا، جاں فزا و استوار
وادیوں میں چشمۂ حیواں "مگر ٹھہرا ہوا
سیب و خوبانی کا مسکن "تاک" کی عشرت سرا

صانعِ قدرت کی صنعت جادۂ کشمیر ہے
کہکشاں کا عکس "آڑی مانگ" کی تصویر ہے

غزل

(نواب محمد علی خاں عرف آغا علی خاں صاحب اسپشل مجسٹریٹ الہ آباد)

کتنا چھلکایا مری روح کے پیمانے کو
حسن آباد رکھے آپ کے میخانے کو
دیکھکر مست ہوئے بزم میں سب بادہ پرست
دستِ ساقی میں چھلکتے ہوئے پیمانے کو
رحم کر رحم، کہیں قیس کی وحشت کی طرح
پچھلی تاریخ نہ دُہرائے اُس افسانے کو
ذرّے ذرّے پہ اُبھر آئیں گے عبرت کے نقوش
غور سے دیکھے جو کوئی کسی ویرانے کو
بزم میں قلبِ شکستہ کی بڑھیگی رونق
حسن ہی جوڑے گا ٹوٹے ہوئے پیمانے کو
اُس کے ہر لفظ سے مِل جائیگا درسِ الفت
ہوش میں لائے تو کوئی ترے دیوانے کو
بے پئے لغزشِ مستانہ دکھانے کے لئے
ہاتھ سے چھوڑ دیا شوخ نے پیمانے کو
اُٹھیئے درپیش ہے اب آپکی عزت کا سوال
پابزنجیر لئے جاتے ہیں دیوانے کو
راستہ حسن کی منزل کا دکھانے کیلئے
عشق کی شمع نے روشن کیا تہخانے کو
اس قدر جوشِ محبت میں بڑھا لطفِ جنوں
عمر بھر ہوش نہ آیا ترے دیوانے کو
حسن نے آتشِ الفت کو جو روشن دیکھا
لے لیا گود میں جلتے ہوئے پروانے کو
تم کو مجبور نظر آئیگا حسنِ رنگیں
غور سے دیکھو تو پھر جا کے صنم خانے کو

تذکرہ آبِ حیات

جدید تحقیق و تنقید کی روشنی میں

(از مولوی مبشر علی صاحب ایم۔اے)

محمد حسین آزاد کا نام اُردو ادب میں "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" کے مصنف کی حیثیت سے زندہ ہے۔ اُن کی دوسری تصانیف اُن کے نام کی وجہ سے زندہ ہیں۔ موجودہ دَور تنقید کا دَور ہے، اور "آبِ حیات" پر جدید تحقیقات کی روشنی میں جو کچھ اعتراضات کئے گئے ہیں وہ ایک حد تک حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کے باوجود آبِ حیات کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا، جو اس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

یہ اُردو شعرا، کا صرف ایک تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ اس عہد کی جیتی جاگتی تصویر ہے، اس لئے اگر ہم اسے اُردو نظم کی پہلی تاریخ کہیں تو بجا ہے۔ اس سے قبل اُردو شعراء کے بہت سے تذکرے لکھے گئے جن میں عموماً شاعر کے نام اور ولدیت اور اُس کے کلام پر اچھا یا بُرا ہونے کا فیصلہ صادر کرنے پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ اُردو شعراء کا سب سے پہلا تذکرہ راقم کے خیال میں سراج الدین علی خاں کا ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے، اور آخری نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا "گلشنِ بیخار" ہے جو مطبوعہ صورت میں بھی دستیاب ہوتا ہے۔ یہ تذکرے فارسی میں لکھے جاتے تھے اور کلام کا نمونہ نہیں بلکہ خاصا انتخاب پیش کیا جاتا تھا۔ تنقید کا فن زمانۂ جدید کی پیداوار ہے اور ہمیں ان تذکروں کو جدید تنقید کی روشنی میں نہیں دیکھنا چاہیئے۔ ان میں تاریخی مواد، شاعر کے ماحول کی کیفیت، اس کی شاعری کی خاص خصوصیات، معاصرین پر اس کا اثر، ان باتوں پر کوئی توجہ نہ کی جاتی تھی "آبِ حیات" اُردو نظم کی پہلی تحقیقی و تنقیدی تاریخ ہے جس میں جدید اُصولوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اسی لئے اُردو ادب کی تاریخوں میں اس نے سنگِ راہ کا کام دیا ہے۔ آزاد کے بے نظیر اسلوبِ بیان نے آبِ حیات میں وہ خیالی طوطا مینا اُڑائے ہیں کہ بعض ناقدوں کے نزدیک "آبِ حیات" کا قصہ افسانہ ہو کر رہ گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں "آبِ حیات" پر مختلف زاویۂ خیال سے اعتراضات کئے گئے ہیں لیکن اُردو ادب کی ہر تاریخ لکھنے والا اس کا حوالہ ضرور دیتا ہے۔ حکیم عبدالحیٔ نے "آبِ حیات" کے جواب میں "گل رعنا" لکھی، لیکن وہ تردید کے جوش میں ایسی ایسی صولی باتوں کی تحقیق پر اُتر آئے جن کا بیان نہ کرنا ہی بہتر تھا۔ مثلاً ناسخ کے خانگی

حالات کے ضمن میں آزاد نے لکھا ہے کہ وہ خانگی زندگی کے جنجال سے بری تھے اور اُن کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ لیکن صاحبِ "گلِ رعنا" نے یہ ثابت کیا ہے کہ اُن کے لڑکے تھے۔ اسی طرح اشرف علی خاں فغاں کے بیان میں آزاد لکھتے ہیں کہ "شجاع الدولہ نے اختلاط میں اُن کے بدن کا کپڑا جلا دیا"۔ لیکن صاحبِ گلِ رعنا مُصر ہیں کہ کپڑا نہیں بلکہ ہاتھ جلا دیا۔ اسی طرح آزاد نے مرزا مظہر کے بیان میں آبخورہ کا جو واقعہ لکھا ہے، صاحب گلِ رعنا کو اُس سے اتفاق نہیں۔ بہرکیف یہ ایسی باتیں ہیں جو نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ آزاد کے پیشِ نظر آبحیات لکھتے وقت نُسّاخ، دیوان اور تذکرے تھے لیکن وہ چند ایسے تذکروں کا بھی ذکر کر گئے ہیں جو اُن کی نظر سے بالکل نہیں گزرے تھے۔ میر کا "نکات الشعراء" آزاد نے غالباً نہیں دیکھا تھا۔ "آبِ حیات" کا خاص تحقیقی ماخذ قدرت اللہ کا "مجموعۂ نغز" ہے چنانچہ "آبِ حیات" کی بیشتر تحقیقی غلطیاں وہ ہیں جو "مجموعۂ نغز" میں پائی جاتی تھیں۔

آبِ حیات کی خامیاں دو قسم کی ہیں یعنی تحقیقی اور تنقیدی۔ ہم ذیل میں ہر ایک پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔ تحقیقی خامیاں یہ ہیں:-

(۱) اردو کی ابتدا آزاد گنگا و جمنا کے دوآبہ میں مسلمانوں کی آمد کے وقت سے بتلاتے ہیں، یہ ایک حد تک درست بھی ہے۔ لیکن اُنھوں نے دکن میں اردو کی ابتدا و نشوونما کا ذکر محض ضمنی طور پر کیا ہے۔ غالباً انھیں اس کے متعلق زیادہ معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ دکنی شعرا میں صرف ولی کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ موجودہ تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو نے شمال میں پہلی مرتبہ ظہور کیا لیکن دکن میں اس نے شمال سے بہت پہلے ادبی و تصنیفی شکل اختیار کر لی تھی۔ آزاد غالباً نصرتی، سراج، عزلت، آزاد، عاجز وغیرہ سے واقف نہ تھے۔

(۲) آزاد "خالق باری" کا امیر خسرو کی تصنیف بتاتے ہیں۔ حال میں محمود شیرانی نے اپنے ایک مضمون میں ثابت کیا ہے کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں بلکہ کسی اور بزرگ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

(۳) اردو نثر کی ابتدا آزاد فضلی کی "دہ مجلس" سے بتاتے ہیں۔ جدید تحقیقات کی رو سے اردو کے ابتدائی فقرے صوفیائے کرام کے دہنِ مبارک سے ادا ہوئے۔ بعض کے اقوال کا مجموعہ بھی موجود ہے۔ بابا فرید شکر گنج پہلے صوفی ہیں جنھوں نے اردو نثر کے ابتدائی فقرے اپنے عقیدت مندوں سے گفتگو میں استعمال کئے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی "معراج العاشقین" اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔

(۴) آزاد نے آبِ حیات میں میر اثر، محمد حسین کلیم، قائم، یقین، ہدایت، حزیں، بیان اور بیدار جیسے کہنہ مشق شعرا کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک جگہ قائم کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے نیچے نہیں رکھ سکتے" لیکن معلوم نہیں ان کو شعرا کی فہرست میں کیوں نہیں شامل کیا گیا۔

(۵) ولی کو آزاد اردو شاعری کا باوا آدم تصور کرتے ہیں۔ "آبحیات" میں لکھا ہے "اردو میں ان کو وہ

رتبہ حاصل ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر کو، فارسی میں رودکی اور عربی میں مہلہل کو حاصل ہے۔" اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ولی سے بہت پہلے دکن میں اردو شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ شمال میں بھی امیر خسرو نے دوہروں کی شکل میں اشعار کہنا شروع کر دیے تھے۔ پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے۔ ایسی صورت میں ہم ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کیسے مان سکتے ہیں۔

آزاد کی دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ ولی کو گجرات کا رہنے والا بتاتے ہیں، مگر اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ ولی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔

(۶) اشرف علی خاں فغاں کو آزاد نے قزلباش خاں امید کا شاگرد بتایا ہے، میر تقی میر نے بھی "نکات الشعرا" میں فغاں کو امید کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن صاحب "گل رعنا" نے مصحفی کے تذکرے کے حوالے سے انھیں علی قلی ندیم کا شاگرد تسلیم کیا ہے۔

(۷) مرزا مظہر جانِ جاں[1] کے متعلق آزاد نے "آبحیات" میں لکھا ہے کہ اُن کے بعض واقعات کے متعلق "تہذیب آنکھ دکھاتی ہے"۔ آزاد کا خیال ہے کہ انھوں نے ایک دھوبن گھر میں ڈال لی تھی۔ آزاد نے عبدالحیٔ تاباں اور مرزا مظہر کے تعلقات کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا ہے۔ ہمیں کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی جو ان واقعات کی تصدیق کر سکے۔ اس لئے اس کو آزاد کی رنگیں بیانی کے سوائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

(۸) مرزا رفیع سودا کے متعلق آزاد "آبحیات" میں لکھتے ہیں "۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہونچے، نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی سے یا طنز سے کہا کہ مرزا تمھاری وہ رباعی ابتک میرے دل پر نقش ہے۔ یہ بپاس وضعداری پھر دربار میں نہ گئے۔"

شیخ چاند نے اس سلسلہ میں اپنی مشہور کتاب "سودا" میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے نہ کہ لکھنؤ میں۔ سب سے پہلے آصف الدولہ نے فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ کو دار السلطنت قرار دیا۔ لہذا سودا فیض آباد گئے تھے نہ کہ لکھنؤ۔ ان کے کلیات نظم میں متعدد قصیدے شجاع الدولہ کی شان میں ملتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نواب کی وفات تک فیض آباد میں رہے۔ آزاد نے سودا کے دہلی کے قدردانوں میں مہربان خاں رند کا نام لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ مہربان خاں رند فیض آباد میں دیوان تھے اور دہلی میں نہ رہتے تھے۔

(۹) میر تقی میر کے متعلق آزاد کا خیال ہے کہ وہ بہت نازک مزاج بلکہ ایک حد تک بد دماغ تھے، اور کسی کو

[1] مرزا کا پورا نام مرزا مظہر جانِ جاں تھا۔ جانجاناں غلط ہے۔ بیشتر اردو ادب کی تاریخوں میں جان جاناں لکھا ہے عوام میں بھی یہی مشہور ہے۔ لیکن یہ جانِ جاں کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ میر تقی میر نے "نکات الشعرا" میں جانِ جاں ہی لکھا ہے۔

خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آزاد نے میر صاحب کی اور خان آرزو کی کشیدگی کا ذکر چٹخارے لے لیکر بیان کیا ہے صاحب گلِ رعنا نے اس کشیدگی کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے اور ثبوت میں میر کی اُن سطور کو پیش کیا ہے جو اُنھوں نے خانِ آرزو کے متعلق "نکات الشعراء" میں لکھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب گلِ رعنا کی نظر میں غالباً "ذکرِ میر" نہ تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب اس سلسلہ میں "ذکرِ میر" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ ہمیں اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو اور میر صاحب کے تعلقات واقعی کشیدہ تھے آزاد نے "آبحیات" میں صحیح لکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ میر صاحب کا خیال تھا کہ "نکات الشعراء" ایک عام کتاب ہے، عوام کی نظر سے گذریگی اس لئے اُنھوں نے ذاتی تعلقات کو اس میں دخل نہیں دیا۔ "ذکرِ میر" ان کی خود نوشت سوانح عمری تھی، اس میں وہ دل کی بات نہ چھپا سکے اور اصل واقعات من وعن بیان کر دیئے۔

آزاد میر کے والد کا نام غلط بتاتے ہیں "ذکرِ میر" میں میر صاحب نے اپنے والد کا نام میر متقی لکھا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ نواب سعادت علی خاں سڑک پر معہ انشا کے گذرے۔ میر صاحب بھی ایک طرف سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ نواب کی طرف بالکل متوجہ نہ ہوئے۔ انشا نے نواب سے کہا کہ ابتک ان کی نازک مزاجی کی یہ حالت ہے۔ غالباً آج بھی فاقے سے ہونگے۔ اس پر نواب نے ان کو طلب کیا لیکن وہ نہیں گئے۔ انشا اس کے بعد خود آئے۔ نواب کی عطا کی ہوئی خلعت اور روپیہ وغیرہ میر صاحب کو مجبور کر کے دیا۔ کسی تذکرے میں اس کا حوالہ نہیں اور بقول صاحب گلِ رعنا یہ آزاد کی من گھڑت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح آزاد ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ نواب نے میر صاحب کی تنخواہ بند کر دی تھی۔ لیکن مرزا علی لطف مصنف "گلشن ہند" کا خیال ہے کہ ان کی تنخواہ بند نہیں ہوئی تھی اسی طرح نواب کی سواری کا گزرنا اور اُن کا میر صاحب سے یہ فرمانا کہ "تم اب ہمارے یہاں نہیں آتے" اور اس پر میر صاحب کا یہ جواب دینا کہ "راستہ میں بات چیت کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں" محض آزاد کی رنگین بیانی معلوم ہوتی ہے۔ کسی تذکرے میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔ میر صاحب کے مشہور تذکرے "نکات الشعراء" پر آزاد نے متعدد اعتراضات کئے ہیں۔ ہم یہاں صرف تحقیقی اعتراضات پر روشنی ڈالتے ہیں

سلہ نکات الشعراء ۱۱۶۵ھ کا ایک مختصر تذکرہ ہے، فارسی میں ریختہ گو شاعروں کے متعلق لکھا گیا ہے۔ ابتدا میں ہر شاعر کے متعلق چند سطور تعارف کے طور پر ملتے ہیں۔ شعراء کے کلام پر بے لاگ رائے دی گئی ہے۔ کسی کی بیجا طرفداری یا مخالفت نہیں کی گئی ہے۔ اشعار کے انتخاب میں فیاضی سے کام لیا گیا ہے جو اُس زمانہ کے تذکروں کا طرۂ امتیاز تھی جہاں اشعار دستیاب نہیں ہوئے ہیں مجبوری ظاہر کی گئی ہے۔ کل شعراء کی تعداد ۱۰۲ ہے۔ جن میں ۳۲ دکنی و گجراتی ہیں۔

آزاد لکھتے ہیں کہ (۱) میر صاحب نے "نکات الشعراء" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ اُردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعروں کا احوال ہوگا، لیکن کوئی غریب اعتراضات سے نہیں بچا۔" (۲) میر صاحب نے وَلی کے متعلق لکھا ہے کہ "ولے شاعریست از شیطان مشہورتر"۔ نکات الشعراء کے دیباچہ میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ اُردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے، اور اس میں ایک ہزار شاعروں کا احوال ہوگا۔ وَلی کے متعلق بھی آزاد کا یہ مشہور جملہ "نکات الشعراء" میں نظر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر سے "نکات الشعراء" بالکل نہیں گزری، اور انھوں نے خیالی طوطا مینا اُڑائے ہیں۔

(۱۰) خواجہ میر دَرد کے متعلق آزاد لکھتے ہیں کہ میر نے ان کو آدھا شاعر مانا ہے۔ لیکن "نکات الشعراء" میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔

(۱۱) اسی طرح میر سوز کو آزاد کے قول کے مطابق میر صاحب نے پاؤ شاعر مانا ہے۔ یہ درست نہیں۔ میر صاحب لکھتے ہیں کہ "ہرچند طرز علاحدہ دارد"۔

(۱۲) آزاد میر حسن کو جب تک وہ دہلی میں مقیم رہے اُن کے والد میر ضاحک اور خواجہ میر دَرد کا شاگرد بناتے ہیں۔ جب اودھ میں گئے تو سودا اور ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے۔ میر حسن اپنے تذکرے میں خود اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہیں۔

(۱۳) آزاد نے انشا کے مجنون ہونے اور وفات پانے کی بڑی دردناک تصویر کھینچی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آخر میں اُن کی تنخواہ بند ہوگئی تھی۔ صاحب "گل رعنا" انشا کے نواسے مرزا آوج کا حوالہ دیتے ہوئے اسکی تردید کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ انشا نہ مجنون ہوئے تھے اور نہ اُن کی تنخواہ بند کی گئی تھی۔ بہرکیف اس معاملہ میں نواسے کی رائے کو آزاد کی رائے پر ترجیح دی جائیگی۔

(۱۴) مومن جیسے اعلےٰ پایہ کے شاعر کو آزاد "آبحیات" کے دوسرے اڈیشن میں شامل کرتے ہیں۔

(۱۵) انشا اور مصحفی کے معرکوں کو آزاد نے ایک افسانہ بنا دیا ہے۔

آزاد کی تنقیدی خامیاں ہمارے خیال میں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) میر صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ شاعری کو صرف دلی والوں کا حق سمجھتے تھے، اور لکھنؤ والوں کو اپنا کلام نہیں سنایا کرتے تھے۔ وہ خواجہ حافظ اور سعدی کی شاعری کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ میر سوز کو میر صاحب کی وجہ سے اپنا تخلص مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ "ذکر میر" اور "نکات الشعراء" کے مطالعہ سے میر صاحب کے کردار پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ نیک منصف اور حقیقی شاعری کے قدردان تھے۔ انھوں نے اچھے اشعار پر داد دینے میں کبھی بخل نہیں کیا۔ دلی اور لکھنؤ میں امتیاز نہیں کیا بلکہ ہمیشہ کلام کی خوبی کو دیکھا۔ یہ ضرور ہے کہ

اُن کا معیار بلند تھا۔ اُنھوں نے اپنے معاصرین اور شاگردوں کے اچھے اشعار کی جا بجا تعریف کی ہے۔ وہ اساتذہ کی شاعری کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ کہنا بھی کہ وہ حافظ اور سعدی کی شاعری کو خاطر میں نہیں لاتے تھے میر صاحب پر سراسر بہتان ہے۔ وہ نازک مزاج ضرور تھے لیکن انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پاتا تھا۔ میر سوز نے یہ سمجھ کر کہ کہیں اُن کے اچھے اشعار بھی میر صاحب کی طرف منسوب نہ کئے جائیں سوز تخلص اختیار کیا۔ اس میں میر صاحب کا کیا قصور ہے۔

(۲) آزاد نے مرزا مظہر جانِ جاں کی شاعری کا اردو نظم میں صحیح درجہ متعین نہیں کیا۔ مظہر متقدمین میں پہلے شاعر تھے جنھوں نے ہندی دُہروں کو ترک کر کے عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کیا۔ اُردو شاعری کے نشو و نما میں اُن کا کارنامہ بہت اہم ہے۔

(۳) آزاد نے اپنے استاد کے ساتھ "آبِ حیات" میں جس عقیدتمندی کا اظہار کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے ذوق کی بیجا تعریف سے آزاد کی تنقید پر حرف آتا ہے، کیونکہ حقِ شاگردی کے جوش میں وہ حقیقت سے دُور جا پڑے ہیں۔

(۴) آزاد نے سب سے زیادہ بے انصافی ظفر کے ساتھ کی ہے، یعنی ان کا بیشتر کلام اُستاد ذوق کا بنایا ہے۔ جدید تنقید نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ظفر کے کلام کا رنگ ذوق کے کلام سے بالکل جدا ہے ظفر خود ایک قادر الکلام شاعر تھے اور ایک مخصوص رنگ کے مالک۔ یہ ضرور ہے کہ ذوق نے بحیثیت اُستاد اُن کی بعض غزلوں میں اصلاح ضرور دی ہوگی۔

(۵) آزاد نے انشا کو مصحفی پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔ انشا کی قادر الکلامی میں کلام نہیں لیکن آزاد کی تنقید سے مصحفی کی شاعرانہ عظمت پر اثر پڑتا ہے۔ مصحفی دورِ متوسطین کے ایک مشہور شاعر تھے اور اُن کے متعدد دیوان اُردو شاعری میں اُن کی جگہ ہمیشہ قائم رکھیں گے۔

"نکات الشعرا" میر کے عہد شباب کی تالیف ہے۔ تحقیق کا جہاں تک تعلق ہے میر صاحب نے کوشش کی ہے کہ کوئی بات سُنی سنائی اور محض قیاس کر کے نہ لکھی جائے۔ نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "نکات الشعرا اگرچہ شعرا کا تذکرہ ہے کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے۔ تاہم میر صاحب نے یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ تحقیق نہ ہو اس کو نہ لکھیں، یا (اگر کسی وجہ سے لکھیں تو) اس کو غیر محقق ہونا ظاہر کر دیں جن شعرا کا حال معلوم نہ تھا وہاں صاف لکھ دیا ہے کہ ان کا حال ہم کو معلوم نہیں۔ میر صاحب نے ہماری رائے میں کمال انصاف سے کام لیا ہے اپنی بے لاگ رائے دینے میں کبھی چوکے نہیں ہیں۔ اُنھوں نے تعلقات، دوستی، شاگردی غرض کسی چیز کا خیال نہیں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں اُن کی رائے جو اُنھوں نے تابت حاتم۔ یقین اور تاباں کے کلام پر دی ہے ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ میر سجاد حالانکہ ان کے سامنے کے صاحبزادے ہیں لیکن اُن کے اچھے اشعار پر میر صاحب داد دینے سے گریز نہیں کرتے۔ اُن کے اس شعر کی نکات الشعرا میں بہت تعریف کی ہے:-

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے　　　جو یہ کشتی تِری تو بس ڈوبی

ان خامیوں سے قطع نظر "آبِ حیات" میں چند خوبیاں ایسی ہیں جن سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اُردو کی ابتدا کے سلسلہ میں آزاد کے بیان کو (حالانکہ وہ مکمل نہیں ہے) ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہیگی۔ آزاد نے شعرا کے کلام کے انتخاب کا جو طریقہ پیش نظر رکھا تھا وہ بہت مناسب ہے۔ اُنھوں نے مختلف اشعار جگہ جگہ سے انتخاب نہیں کئے ہیں بلکہ چند مکمل غزلیں درج کر دی ہیں۔ اس سے شاعر کے کلام کے متعلق آسانی کے ساتھ رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ شاعر کے اچھے اشعار کے علاوہ اس کے پست اشعار بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ موجودہ نقاد اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ مکمل مضمون یا نظم تنقید کے آئینے کے سامنے لائی جائے تو اچھا ہے۔

بہرحال "آبِ حیات" اُردو نظم کی تاریخ ہے۔ اور تاریخ کا افسانہ کے پیرایہ میں بیان کرنا ناظرین کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ آزاد کے بے نظیر اسلوب نے واقعی تاریخ میں افسانہ کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ ہندی افادی مرحوم نے آزاد کے متعلق خوب لکھا ہے کہ "پروفیسر آزاد ہی صرف وہ انشا پرداز ہیں جنھیں اور کسی سہارے کی ضرورت نہیں"

غرض "آبِحیات" کی ادبی اور تنقیدی اہمیت مسلّمہ ہے۔ آزاد کی تنقید سے بیشتر اور تحقیق سے کم تر اتفاق کیا جائیگا۔ اور تمہید میں اُنھوں نے بھاشا کا جو اثر اُردو پر دکھایا ہے اور جو لسانیاتی بحث کی ہے وہ ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ ولی اور سودا کے متعلق اُن کی تنقید ان شعرا پر ریسرچ کرنے والوں کی رہنمائی کرے گی۔ بقول سر تیج بہادر سپرو یہ اُردو کی ایک کلاسیکل کتاب ہے جس کی ضرورت ہر زمانہ میں رہیگی خواہ دنیا کتنی ہی ترقی کر جائے۔ آئندہ آنیوالی نسلیں بھی اس کی اسی طرح قدر کرتی رہیں گی اور بقائے دوام کے دربار میں آزاد کی جگہ متعین کرنے کے لئے یہ کتاب کافی ہے۔

؟

پچھلی کل ہند اُردو کانفرنس کے خاص خاص اراکین بیگم اعزاز رسول صاحبہ صدر کمیٹی استقبالیہ اور سر شیخ عبدالقادر صاحب پریسیڈنٹ کانفرنس نے رسالہ "زمانہ" کی ادبی خدمات کا حوصلہ افزا الفاظ میں اعتراف کیا، اور اسکے مستقل معیار کو سراہا۔ آپ بھی اس ناچیز پرچے کی قدر کرتے ہیں لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اس کے توسیع اشاعت کی بھی کچھ کوشش فرمائیں اور اس طرح اس کے آئندہ بقا اور ترقی میں مدد دیں۔ عام طور پر دوستوں کو تکلیف دینا کوئی پسند نہیں کرتا لیکن اس وقت "زمانہ" کی آئندہ زندگی کا اسی پر انحصار ہے کہ اس کے قدردان اپنے علم دوست احباب سے اسکے خریداری کی سفارش کریں۔ اگر آپ چاہیں تو وہ ایک نئے خریدار ضرور دے سکتے ہیں۔ پھر کیا آپ اس طرف توجہ فرما کر اس علمی خدمت کو مزید سرگرمی سے جاری رکھنے میں ہماری امداد کریں گے؟

ایڈیٹر

ہم شکر گذار ہوں گے اگر آپ اپنے علم احباب کے نام نامی سے ہمکو مطلع کرنے کی تکلیف گوارا کریں تاکہ منیجر رسالہ ان حضرات کے نام ... نمونہ کا پرچہ بھیجکر ان سے خریداری کی تحریک کر سکے۔

حمدِ باری

(از سیّد قایم رضا صاحب نسیم)

کیا حمد ہو اس کی جو نہاں ہے نہ عیاں ہے　　اللہ رے جلوہ کہ جہاں دیکھو وہاں ہے
دم بھرتی ہے خود روح کہ وہ جانِ جہاں ہے　　کس جا سے ڈھونڈوں کہ بلا قید مکاں ہے
عارف کی حدِ عقل سے بالا وہ صمد ہے
محدود نہ ہونے کی یہ حد ہے کہ اَحَد ہے

تو مجمع اضداد ہے اے اوّل و آخر　　بے ہاتھ کے بے پاؤں کے ہر امر پہ قادر
سیکھا نہیں اک حرف، ہر اک علم سے ماہر　　بے گوش کے سامع تو بغیر آنکھ کے ناظر
بے پردہ ہے موجود، حجابوں میں نہاں ہے،
یاں بھی ہے وہاں بھی، نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے

ڈھونڈا جو بہت آب و ہوا آتش و گل میں　　کچھ کچھ نظر آیا نگہِ شوق کے تِل میں
پوشیدہ ہے کب شیخ کے کھوئے ہوئے دل میں　　روپوش ہے جلوہ رخِ عاصیِ خجل میں
زاہد کی نصیحت تھی کہ دیندار سے پوچھو
رحمت نے کہا، جاؤ گنہگار سے پوچھو

جو ڈھونڈے اُسے پانے کی اُمید بھی ہوگی　　دل سے ہو طلب، غیب سے تائید بھی ہوگی
ظلمت میں نظر بند نہ ہو، دید بھی ہوگی　　جو تجھ پہ ہو قربان اُسے عید بھی ہوگی
دل جس کا لیا، تو نے خدائی اسے دے دی
جو کھل کے ملا عقدہ کشائی اسے دے دی

چھپتا جو نہ تو تاک میں پودے نہ اُبھرتے　　یوں بلبلِ بیتاب بھی فریاد نہ کرتے
جھونکے بھی ہوا کے نفسِ سرد نہ بھرتے　　پھولوں میں نہ ہوتا تو ہزار اُن پہ نہ مرتے
ہر شے میں تری جلوہ نمائی نظر آئی
بت خانے میں دیکھا تو خدائی نظر آئی

ہندوستان کی صنعتی اور تجارتی جہالت

(از مسٹر جلالی شاہجہانپوری)

آبادی اور وسعت کے لحاظ سے ہندوستان کی حیثیت ایک مستقل براعظم سے کم نہیں لیکن جب اس چالیس کرور آبادی کے جنگل کو صنعتی تعلیم کے لحاظ سے دیکھا جاتا ہے تو اس سلسلہ میں اس کی حیثیت صفر سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی۔ مغربی دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے آزاد ملک کی صنعتی تعلیم پر آپ نظر ڈالیں تو وہاں تجارتی تعلیم کے سیکڑوں اسکول اور کالج ملیں گے۔ کیونکہ ان ملکوں نے آزادی کی فضا میں پرورش پانے کی وجہ سے اس حقیقت کو معلوم کر لیا ہے کہ صنعتی ترقی اور تجارتی تعلیم دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں غلام ہندوستان کی تجارتی تعلیم کا حال شنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں پورے ہندوستان میں کل چھبیس ۲۶ تعلیمی اداروں میں صنعتی اور تجارتی تعلیم کا انتظام تھا اور ان میں بھی حکومت کے اداروں کی تعداد صرف تین تھی، باقی تئیس ۲۳ جگہ پرائیویٹ تعلیم کا انتظام تھا۔ ایسی اہم اور ضروری تعلیم کے لئے ان پرائیویٹ مدرسوں کا جیسا انتظام اور معیار ہوگا اُس کو صنعتی تعلیم کے ماہرین اچھی طرح جان سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں اس تعداد میں خاص اضافہ ہوگیا یعنی چھبیس سے بڑھکر پانچسو چھتر صنعتی اسکول ہو گئے اور ان میں پڑھنے والوں کی تعداد ۱۷,۳۰۸ ہو گئی۔ لیکن ان تمام اسکولوں کا تعلق براہ راست حکومت سے نہیں تھا بلکہ یہ پبلک کی ذاتی ملکیت کی حیثیت سے چل رہے تھے، اور ان میں ایسے اسکول بھی شامل تھے جن کی نہ پبلک میں کوئی وقعت تھی اور نہ حکومت ہی ان کو قابل توجہ خیال کرتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ صرف شکم پروری کے ذریعوں میں شامل تھے۔ اور اس شمار میں بہت سے ایسے یتیم خانے اور انجمنیں بھی تھیں جو غریب اور یتیم بچوں کو معمولی صنعتی تعلیم دیتی تھیں اور بہت سے ایسے مدرسے بھی تھے جن میں صرف نجاری اور آہن گری وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چالیس کروڑ انسانوں کے جنگل میں پانچسو چھتر معمولی اسکول اور اُن میں ۱۷,۳۰۸ طلبا کا ہونا ملکی صنعت کی ترقی کا جیسا کچھ ضامن ہو سکتا ہے وہ اظہرمن الشمس ہے۔۔ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان اسکولوں اور

کالجوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جن میں موجودہ عہد کے تجارتی رنگ ڈھنگ اور اُصول و طریقے سکھائے جاتے ہوں۔

نفاذ اصلاحات سے کچھ پہلے سے سرکاری صنعتی اسکولوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے، لیکن ان میں ایسی معمولی صنعتوں کی تعلیم دی جاتی ہے جن سے ہندوستان کی صنعتی حالت قیامت تک بھی درست نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً جبکہ ان میں موجودہ دور کی تجارتی ضرورتوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں اور نہ اس کا علیحدہ طور پر بھی کوئی خاص انتظام ہے ایسی صورت میں ہندوستان کی صنعتی ترقی کا خیال ہی محال ہے۔

اس کے مقابلہ میں یورپ کی صنعتی اور تجارتی تعلیم اور اس کے اداروں کا حال سُنیئے جس سے آزادی کی دولت اور غلامی کی مصیبت کا فرق بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ جرمنی کی آبادی چھ کروڑ ۳۰ لاکھ ہے یعنی جرمنی کی پوری آبادی ہندوستان کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔ لیکن وہاں تیئیس یونیورسٹیاں ہیں جن کا جال پورے جرمنی میں پھیلا ہوا ہے اور ان میں طالب علموں کی کثیر تعداد صنعتی تحقیق اور فنی تکمیل میں شبانہ روز مشغول رہتی ہے۔ ہندوستان میں ٹکنیکل تعلیم کی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہزاروں لاکھوں تعلیم یافتہ اشخاص اس کے حصول کے شوق میں سرگرداں ہیں لیکن حکومت کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ مگر جرمنی میں ان یونیورسٹیوں کے ساتھ ساتھ ٹکنیکل کالجوں کا جال بھی پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ اِسی طرح تجارتی تعلیم کے لئے ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ایک کالج بھی ایسا نہیں ہے جہاں کاروباری پیچیدگیوں کی عملی تعلیم دی جاتی ہو۔ لیکن جرمنی میں ان کے انتظامات مکمل ہیں۔ برلن، کونگس برگ اور لائزک وغیرہ میں تجارتی تعلیم کے کئی مستقل کالج موجود ہیں جن میں صرف تجارتی تعلیم دی جاتی ہے اور دنیا کی صنعتی منڈیوں پر قبضہ کرنے کے وسائل و ذرائع سے پورے طور پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جرمنی دنیا کی صنعتی منڈیوں پر پورے طور سے قابض ہے۔

ترکی کی آبادی پچھلی مردم شماری کے اعتبار سے ایک کرور اسّی لاکھ ہے، یعنی ہندوستان کی آبادی کے بیسویں حصہ کے برابر ہے، سلطنت کا رقبہ بھی یو۔ پی اور بہار کے رقبہ سے بڑا نہیں، لیکن آزادی کا سایہ اُس کے سر پر موجود ہے، اس لئے اُس کی صنعتی ترقی اور معاشی خوشحالی میں کوئی چیز مانع نہیں سینتالیس زبردست صنعتی کالج حکومت کے خرچ اور اُس کی نگرانی میں کامیابی سے چل رہے ہیں اور ان کالجوں میں تعلیم پانے والوں کی تعداد ۴۸،۰۰۰ سے بھی کچھ زائد ہے۔ لیکن ہندوستان کے چالیس کرور کے جنگل میں سے صرف سترہ ہزار طلبا آج سے چند سال پہلے اس تعلیم میں مصروف تھے اور وہ بھی معمولی قسم

کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تجارتی تعلیم کا تو ذکر ہی فضول ہے ان سرکاری کالجوں کی تعداد کے علاوہ ٹرکی میں پبلک کے صنعتی کارخانوں کی تعداد بھی سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔ اگر سرکاری اداروں کی فہرست میں ان کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل صنعتی اداروں کی تعداد ایکسو پانچ تک ہو جاتی ہے۔ اور ان کارخانوں کو ہندوستان کے لاوارث کارخانوں کی طرح قیاس نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ان پر گورنمنٹ کی کڑی نگرانی ہوتی ہے اور گورنمنٹ ان کارخانوں کو ہر قسم کی امداد اور سہولت پہونچانا اپنا ملکی اور قومی فرض تصور کرتی ہے سرکاری معائنے ہوتے ہیں، حسابات اور کام کی باقاعدہ دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ دلچسپ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ تجارتی کالجوں کی تعداد صنعتی کارخانوں سے زیادہ ہی ہے یعنی جہاں صنعتی کالج سینتالیس ہیں وہاں تجارتی اڑتالیس ہیں۔ آج صنعتی اور تجارتی بازاروں میں ٹرکی صنعت کی مقبولیت انھیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔

روس کی صنعتی حالت جنگ عظیم سے پہلے بہت خستہ تھی، مگر اشتراکی انقلاب کے بعد جہاں ہر چیز کا نقشہ بدلا وہاں صنعتی انقلاب بھی ہوا آج روس کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں صنعتی اسکول اور کالج کھلے ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں صرف ایک شہر ماسکو میں دس ہزار سے زائد طلبا صنعتی تعلیم میں مصروف تھے مختلف یونیورسٹیوں میں صنعتی تعلیم پانے والوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔ اور ۱۹۳۸ء میں صنعتی اسکولوں اور کالجوں کے طلبار کی مجموعی تعداد ساڑھے پچپن لاکھ سے کچھ زائد تھی۔ تجارتی تعلیم اور اس کے اداروں پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جارہا ہے، یہی وجہ ہے کہ کل کا غریب روس آج اپنی خوشحالی کے اعتبار سے دنیا کے لئے باعث رشک بن رہا ہے۔

جاپان کی مجموعی آبادی چھ کروڑ ہے، لیکن اس کی حیرت انگیز صنعتی ترقی کو دیکھکر ہندوستان کی بے دست وپا مخلوق کی خستہ حالی پر دو آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔ ہندوستان کے مقابلہ میں اتنی سی مختصر آبادی میں بارہ ہزار دو سو تیرہ صنعتی اسکول موجود ہیں جن پر حکومت کا کروروں روپیہ صرف ہوتا ہے آخر اس بے دست وپائی کی کوئی حد بھی ہے۔ چالیس کرور کی آبادی میں سرکاری اور پرائیویٹ صنعتی اسکولوں میں تعلیم پانے والوں کی تعداد صرف ۱۰۷۳۰ ہے۔ صوبہ پنجاب ہندوستان کے دیگر صوبوں کے مقابلہ میں ایک صنعتی اور تجارتی صوبہ مانا گیا ہے لیکن اس کی ۱۹۲۶-۲۷ء کی صنعتی رپورٹ کے مطابق اس صوبہ میں بھی سرکاری اور پرائیویٹ صنعتی اسکولوں کی تعداد صرف ستر ہے، اور اس قسم کے اسکولوں میں زیادہ سے زیادہ آہنگری، نجاری اور اسی معیار کی صنعتی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مدبرین صنعتی اسکولوں اور حرفتی اداروں کے فروغ کے لئے حکومت پر زور ڈال رہے ہیں لیکن ملکی ضرورت کے لحاظ سے پچاس ہزار

صنعتی اسکول بھی ہندوستان کی صنعتی ترقی کے ضامن نہیں ہو سکتے ہیں جب تک صنعتی تعلیم کے ساتھ تجارتی تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہوتا اُس وقت تک ہندوستانی مصنوعات کا ترقی کی طرف قدم اُٹھانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے

فرض کیجئے کہ اربوں روپیئے سالانہ کا مال یہاں تیار ہونے لگے لیکن تجارتی واقفیت اور تجربہ کے قدم اپنی جگہ پر قائم رہے تو اس اربوں روپیئے کے مال کی کھپت کہاں ہوگی۔ ایک نوآموز کو مال کی تیاری سے پہلے اُس کی کھپت اور نکاسی کے عملی طریقوں سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ ہماری گزشتہ صنعتی ترقی کا راز بڑی حد تک تجارتی رنگ ڈھنگ اور اُسکی عملی تعلیم سے واقفیت پر مبنی تھا۔ صناعوں کی رہنمائی اور غیر ممالک سے تجارتی معاہدوں کی تکمیل حکومت کی سیاسی پالیسی کا سب سے اہم عنوان ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں قومی حکومت قائم ہو تو اس کے تمام کام صرف ہماری بہبودی اور بھلائی کے لئے ہوں، ورنہ موجودہ حالت میں سب سے پہلے انگلستان کے مفاد کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بہرحال ہندوستان موجودہ دور کے صنعتی مقابلہ میں اسی وقت پاؤں جما کر ٹھہر سکتا ہے۔ جب تجارتی کارخانوں کے علاوہ صنعتی تعلیم کا بھی معقول انتظام کیا جائے اور حکومت کی سرپرستی صرف ہندوستان کے مفاد کے پیش نظر ہو۔

تبرکاتِ احسن

(حضرت احسن مارہروی مرحوم)

میں بہرصورت تمہارا تابعِ ارشاد ہوں
خوش ہو تم ناشاد رکھنے سے تو میں بھی شاد ہوں

اختیار و جبر کا مجموعۂ اضداد ہوں
عادۃً پابند ہوں میں فطرتاً آزاد ہوں

ہو رہی ہیں پستیوں کی منزلیں اس طرح طے
نقشِ پا ہوں خاک ہوں پامال ہوں برباد ہوں

اِک بھری محفل میں کہتا تھا دلِ بے مُدعا
میں ہی اس ہستی میں ہم شکلِ عدم آباد ہوں

ذکر میری خود فراموشی کا اور اُن کی زباں
اپنی ہستی کیوں نہ میں بھولوں کہ اُنکو یاد ہوں

احسنِ دلگیر اپنا حالِ غم خود کیا کہے
ہر دہانِ زخم کہتا ہے لبِ فریاد ہوں

چاندنی رات کی گنگا

(از پراوپکار سنگھ سریواستو عرشی، ہندو یونیورسٹی بنارس)

اے لبِ خاموش سے کچھ گنگناتی نازنیں
چاندنی راتوں میں جاتی ہے کدھر کو اے حسیں

چادرِ آبِ رواں کو ناز سے ڈالے ہوئے
دوش پر سارے سنہرے بال تو کھولے ہوئے

جگمگاتی، مسکراتی، بات کرتی کس طرف
چاند سا لختِ جگر گودی کھلاتی کس طرف

او ہمالہ کی کھلائی، کوہساروں کی پلی
او سبک رفتار دوشیزہ، دولاری دیش کی

چند لمحوں کے لئے گنگا تو رک جانا ذرا
میری کچھ باتیں ہیں وہ ساحل سے کہہ جانا ذرا

ایک سودائی طبیعت، ایک آوارہ مزاج
گا رہا تھا گیت کچھ لے لے کے تیرے نام آج

اور کہہ دیتا کہ تیرے وعدۂ تسکیں کا پاس
رہ گیا ہے رفتہ رفتہ بن کے اک نازک سی آس

کاش تو ہی رہنمائے زیست بن جاتی مری
یاں ٹھہر، او شاہزادی کائناتِ حسن کی

ہم سے انسانوں کو اپنی آن کے تیور سکھا
کچھ تو جینے کے طریقے کچھ تو مرنے کی ادا

ہاں انھیں رعنائیوں میں ناز فرماتا تھا میں
حسن میں تحلیل ہو کر تیر سا جاتا تھا میں

مستیوں میں ان فضا کی رقص فرماتا ہوا
چھیڑتا جاتا تھا تجھکو اے مغنی ساحرہ

مسکرا دیتا تھا جب میں تو بجا جاتی تھی تو
دیکھ لیتا تھا اگر تو اور اٹھلاتی تھی تو

کیفیت بن کر کبھی عالم پہ چھا جاتا تھا میں
اور جی میں آ جاتا تو تیری روح بن جاتا تھا میں

اب تو اس دنیا میں ہیں محدود ہیں مجبور ہیں
تجھ سے یوں نزدیک ہیں گنگا مگر ہم دور ہیں

درد سے بیتاب ہے انساں بہت لاچار ہے
موت جس پر ناز کرتی ہے یہ وہ سنسار ہے

پھر بھی تیرے واسطے روئے بہت تڑپے تھے ہم
یاد ہے اوپر سے جب گنگا تجھے لائے تھے ہم

یاد ہے وہ روز جب تیری پشیمانی ہوئی
میرے رعبِ حسن کے آگے تو پانی ہو گئی

فخر کرتے ہیں کہ رکھتے ہیں دلِ درد آشنا
ورنہ کیا رکھا ہے ترتیبِ عناصر کے سوا

وہ نقابی رات اور سوئے فضائے پرضیا — حسن کی دنیا پہ جیسے پیار سا چھایا ہوا
ابتدا سے انتہا تک شوق بے پایاں ترا — میرے ہاتھوں میں نہیں ہے عالمِ امکاں ترا
تیرے پوشیدہ اشاروں کے سہارے پر چلوں — تو اگر چاہے تو میں زندہ رہوں ورنہ مروں
مجھ سے دیکھی اب نہیں جاتی ہیں یہ آزادیاں — حسن کے آغوش میں تیری ترنم سازیاں
جی میں آتا ہے کہ گنگا تیری موجوں کے تلے
قلب کی رفتار رُک جائے سکونِ دل ملے

"میں"

(از مسٹر شمبھو دیال نگم، شفق کانپوری)

(۱)
خزاں نے روند دیا جس کو وہ بہار ہوں میں — اُجڑ گیا ہے سنور کر جو وہ سنگار ہوں میں
اُتر گیا تری ترشی سے جو خمار ہوں میں — گراں زمیں کو جو معلوم ہو وہ بار ہوں میں

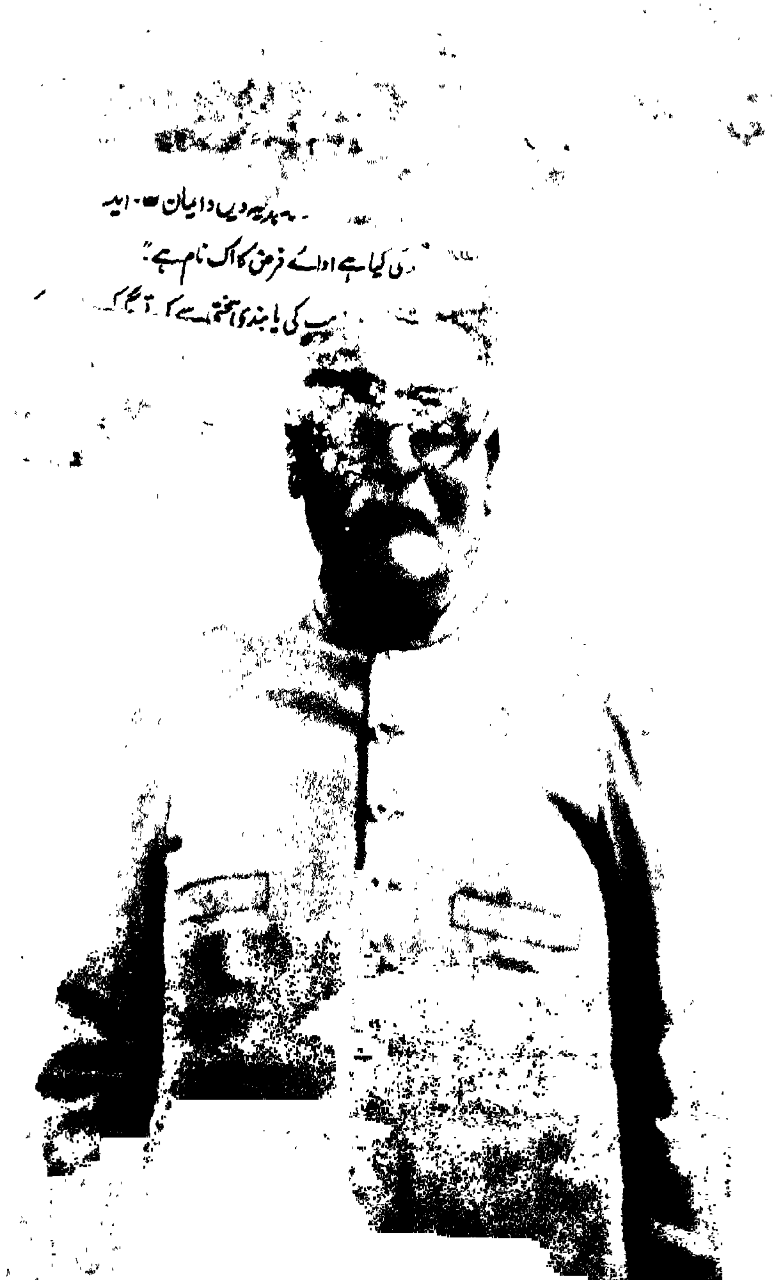
(۲)
قدم قدم پہ گماں ہو رہا ہے منزل کا — ہر ایک موج پہ دھوکا مجھے ہے ساحل کا
ہر ایک پردہ سمجھتا ہوں پردہ محمل کا — فریبِ حسن میں اُلجھی نظر کا تار ہوں میں

(۳)
خیال و خواب کی دنیا بسائی ہے میں نے — ہراس و یاس کی دولت کمائی ہے میں نے
خلش جگر میں تپش دل میں پائی ہے میں نے — کسی کے وعدۂ باطل کا انتظار ہوں میں

(۴)
اُمید و یاس کی پیچیدگی میں اُلجھا ہوں — خیالِ سود و زیاں کا شکار بیٹھا ہوں
عجیب حال ہے مرتا ہوں میں نہ جیتا ہوں — قرار جس کو نہ آئے وہ بے قرار ہوں میں

(۵)
بجھا رہی ہے چراغِ حیات بادِ غم — مٹا رہی ہے نشانِ نشاط یادِ غم
یہ ختم ہو نہیں سکتا کبھی سوادِ غم — اُجڑ گیا تری غفلت سے جو دیار ہوں میں

(۶)
مری طرف بھی نگاہِ کرم اُٹھا ساقی — مری وفاؤں کا کچھ تو ملے صلا ساقی
نہ مے ہو ڈھونڈ کے تلچھٹ ہی لا پلا ساقی — شفقؔ ہے نام، بہت کہنہ بادہ خوار ہوں میں



رائے بہادر شنکر دیال "نگار"

۱۸۶۹—۱۹۴۰

رائے بہادر شنکر دیال صاحب مرحوم

...فانی شاعری سے ... کا کلام ...

...معات الٰہی اور بے ثباتیِ دنیا وغیرہ کی تصویریں اس طرح ...

... تاریخ شہر لکھنؤ

... رائے بہادر شنکر دیال ... ولادت ہوئی جس روز سے یہ ... کے گھر میں دولت و اقبال کا ستارہ ... مولود مسعود زینت افزائے محفل ہستی ہوا شوکت و اجلال نے یہیں ڈیرے ڈال دیئے دولت و اقبال اس کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتے گئے۔ تعلیم کی ابتدا کی گئی، ذہن و ادراک کی روشنی پھیلنے لگی طبیعت میں گیرائی قدرت نے ودیعت رکھی تھی بہت کم زمانے میں سواد خوانی کی دولت سے مالا مال ہونا نصیب ہوا۔ فارسی و اردو کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بھی متوجہ کئے گئے۔ انٹرنس اور ایف اے کے امتحانات میں ایسی شاندار کامیابی حاصل کی کہ سرکاری وظیفے سے قدر شناسی کا ثبوت دیا گیا۔ بی۔ اے کی تعلیم کیننگ کالج لکھنؤ میں پائی، اور ۱۸۹۲ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے سند کامیابی حاصل کی جب ۱۸۹۲ء میں وکالت ہائی کورٹ کا امتحان دیا تو اکیسو آٹھ طلبہ شریک امتحان تھے جن میں صرف تین طلبہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اُن میں رائے بہادر صاحب موصوف بھی تھے۔ اِس امر سے اُن کی ذہانت کے جوہر کھلتے ہیں اور طبیعت کی گیرائی اُبھر اُبھر کر ظاہر ہوتی ہے۔ اسی سال وکالت شروع کر دی۔ ۱۸۹۷ء میں منصفی کا عہدہ قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ ڈسٹرکٹ و سیشن جج کے عہدۂ جلیلہ پر معزز و ممتاز ہوئے۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں رائے بہادر کا معزز خطاب تاج برطانیہ کی طرف سے) عطا ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں ججی کے عہدہ سے پنشن پائی، اور اسی سال ریاست جے پور کے جج مقرر ہوئے اور پانچ برس تک وہاں بھی داد انصاف گستری دی۔ کسی کے جاہ و دولت سے مرعوب ہونا آپ کی سرشت ہی میں نہ تھا۔ ہمیشہ فیصلے میں دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کر دکھاتے۔ بعض طبائع پر یہ انصاف گراں گذرتا۔ مگر آپ اس کی کچھ پروا نہ کرتے۔ قیام جے پور کے زمانے میں آپ نے شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ اُردو نظم میں کیا جو اہل طریقت و معرفت میں بہت مقبول ہوا۔

جناب موصوف ایک صافی نہاد صوفی مشرب، مرنجاں مرنج، باہمہ و بے ہمہ بزرگ تھے۔ صلح کل اُن کا مسلک تھا۔ ہر وقت وحدت الوجود کا کلمہ پڑھتے ہمہ اوست کا دم بھرتے۔ خدا کی تمام مخلوق سے یکساں لطف و کرم صدق و صفا سے پیش آتے۔ اُمرا کی تونگری اور فقرا کی بے زری اُن کے برتاؤ میں فرق نہ آنے دیتی، کم سخنی اُن کا شیوہ تھا، ضرورت سے زیادہ بات نہ کرتے، تواضع اُن کی سرشت اور اخوت اُن کی خو تھی۔ ساری عمر کسی سے اَن بن نہ ہوئی جس سے

ملتے دل سے ملتے۔ حاضر و غائب ایک حالت رہتی۔ اُن کی زبان پر وہی آتا جو اُن کے دل میں ہوتا۔ عجیب تعلق گُھلتی عارفانہ نکات کا سینہ پر سس جاتا۔ کسی سے اختلاف کرتے تو ایسے پیارے انداز اور ایسے شیریں الفاظ میں کہ سامع پر گراں نہ گزرتا اور بات دل میں اُتر جاتی۔ رقت قلب اور حق سرائی، حق پسندی، عزم و حیا، مہر و وفا، حلم و تحمل ہر وقت اُن کے جلو میں رہتے۔ فرض شناسی اُن کا خاص طرہ تھا۔ ایک انگریزی شعر بہت پڑھا کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ "زندگی فرض کی پابندی کا نام ہے" ... یہ کی پابندی اختم ... آگے ...

استواری طبع جناب موصوف پر ناز کرتی تھی، اپنے مذہب ... سے ... کسی مذہب کو بُرا نہ کہتے۔ بلکہ بانیانِ مذاہب کا زیادہ احترام کرتے۔ احسان کرنے سے محبت، اور احسان جتانے اور احسان اُٹھانے سے نفرت رکھتے تھے۔ پاسِ وضع کی حد یہ تھی کہ جج کے زمانے میں بھی چوڑی دار پاجامہ اور اچکن ہی زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ غرض جوانی اور بڑھاپا ایک ہی رنگ میں بسر کر دیا اور اپنے پاکیزہ عمل سے اس شعر کی شرح فرماتے رہے:-

یکرنگ تھے وہ ہم کہ دو رنگی نہ کی پسند   پہنا کفن تو جامۂ ہستی اُتار کے

انگریزی لباس کی طرف کبھی غلط انداز نظر بھی نہ ڈالی، فیشن پرستی کی وبا کو عذاب الٰہی سمجھتے تھے، چنانچہ "بادۂ عرفاں" میں بعض مقامات پر تہذیب قدیم کا ماتم کیا ہے اور تہذیب دورِ حاضرہ پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ ہندوستان کی کل قوموں کو اجزائے ہند سمجھتے اور اُن کے باہمی اختلافات و خانہ جنگی سے نہایت ملول رہتے اور فرماتے کہ افسوس ہمارے بزرگوں کی ساری کمائی بُری طرح لُٹ رہی ہے اور ہمارے بنائے کچھ نہیں بنتی۔ وطن پرستی کے بادۂ پُرجوش سے سرشار اور ہندوستان کی اگلی شان و شوکت اور پچھلی حکمت و روحانیت کے سوگوار تھے۔ بادۂ عرفاں میں یہ سب چیزیں ملتی ہیں۔ اُن کا حلقۂ احباب وسیع نہ تھا گنتی کے لوگوں سے ملتے مگر یہ ایسے ہی لوگ ہوتے جو حسد و ریاکاری سے دُور بھاگتے۔ یکرنگی جن کا شیوہ اور دین و دیانت جن کا طریقہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ادبی ذوق کی دولت سے بھی بہرہ یاب ہوتے

اب ہم رائے بہادر صاحب مرحوم کی تصانیف کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں:-

اُردو نظم میں تین کتابیں جناب مرحوم کی یادگار ہیں، اول گنجینۂ معرفت جو سری بھگوت گیتا سی جلیل القدر کتاب کا ترجمہ ہے اور بڑی عرقریزی سے کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ کرم سنیاس اور یوگ سنیاس وغیرہ وغیرہ ایسے دقیق مسائل ہیں کہ نثر ہی میں ان کا ترجمہ کرنا دشوار ہے نہ کہ نظم میں۔ جناب موصوف نے ان کا ترجمہ عام فہم زبان میں اس خوبی سے کیا ہے کہ منہ سے بے اختیار واہ نکل جاتی ہے۔ یہ اور ایسے ہی مقامات ویدانت فلاسفی کے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔ یہ وہی ارشادات ہیں جو مہابھارت میں ارجن نے سری کرشن جی کی زبان مبارک سے سنے ہیں۔ رائے بہادر صاحب نے پانچ برس کی ملازمت کے بعد بربنائے تندرستی استعفیٰ دیدیا اور ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک اپنے دولت خانہ

گوربچن جی میں نے سب سے اور دو کتابیں اور تصنیف فرمائیں "آدم مالا" اور "بادۂ عرفان"۔ ہم ان کتابوں پر رائے زنی کرنے سے پہلے کچھ کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں

آپ کے اشعار آپ کا آئینہ ہیں۔ آپ کے کلام میں آورد بہت زیادہ اور رنگینی بہت کم ہے۔ سارا کلام اخلاقی اور عرفانی شاعری سے مملو ہے اور ایک ایسا خزانہ ہے جس میں نہایت بیش بہا جواہر ریزے نظر آتے ہیں ذات و صفات الٰہی اور بے ثباتیِ دنیا وغیرہ کی تصویریں اس میں بکثرت ہیں۔ مذمتِ دنیا اور احساس فرائض آپ کے خاص موضوع ہیں۔

آدم مالا آپ کی دوسری تصنیف ایک طوالانی نظم ہے جسے آپ ہر روز پوجا کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ یہ نظم مذمتِ دنیا و ترکِ دنیا و حمد و ثنائے ذات و صفات الٰہی کا گنجینہ ہے۔ زبان کی سلاست مطالب کی متانت خیالات کی رفعت ہر آئینہ قابلِ داد ہے۔

جناب موصوف کی تیسری تصنیف "بادۂ عرفان" ہے، یہ آپ کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ بھی اخلاقیات اور عرفانیات کا آئینہ ہے۔ یہ کتاب گویا ایک میخانہ ہے جو حکمت و معرفت کے بادۂ سرجوش سے لبریز ہے

حبِ وطن کے متعلق بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کیا تھا یہ ہند پہلے جو ہے وطن ہمارا
دنیا کے باغ میں تھا یکتا چمن ہمارا

سب سے قدم ہمارا ہر علم میں تھا آگے
یکتا تھی اپنی صنعت یکتا سخن ہمارا

کوہِ ہمالیہ سے تا انتہائے لنکا
ہر جا رہا ہے جھنڈا سایہ فگن ہمارا

وہ فوج تھی ہماری جس سے زمیں تھی لرزاں
ہر ایک فیلِ جنگی تھا صف شکن ہمارا

ہیئت میں ہم تھے کامل حکمت میں ہم تھے یکتا
اک سکۂ رواں تھا ہر اک سخن ہمارا

متفرق غزلیات کا انتخاب یہ ہے:۔

الٰہی سلامت رہے میری پیری
یہی ہے مرے ساتھ جانے کے قابل

نہ بُلوا مجھے حشر کی انجمن میں
یہ مُنہ کب رہا ہے دکھانے کے قابل

درد ہوں سوز ہوں، فرقت ہوں تمنا میں ہوں
سو کھیڑے ہیں مرے ساتھ وہ تنہا میں ہوں

اپنی بیمار ہوں نہ چمن کی بہار ہوں
قسمت مری کہ گلشنِ ہستی کا خار ہوں

کیا پوچھتا ہے عشق کی مجبوریوں کا حال
بے اختیار گریۂ بے اختیار ہوں

کچھ سمجھ میں مری آتا نہیں ہوتا کیا ہے
قطرے قطرے کو ہے یہ زعم کہ دریا کیا ہے

یہ شعر عہدِ حاضرہ کی انانیت (خودی) کا مرقع ہے، اس لئے کہ بے کمالی پر نازِ کمال اس عہد کے برکات میں سے ہے

میری پستی میں ملی حد کی بلندی کو پناہ
میں وہ ذرہ ہوں کہ آگے مرے تارا کیا ہے

یہ شعر خاکی نہاد انسان کی رفعت و شان کا آئینہ ہے۔

ہے کچھ عجب چیز سہارا اُمید کا
آنکھوں سے اشک گرتے ہی کو تھے سنبھل گئے

نہ اک ذرّے کو بھی بے قدر جانو
یہ دنیا ایک موتی کی لڑی ہے

کیا جانے کیا کرے دل بے اختیار تو
تجھ کو جو ایک پل بھی خدا اختیار دے

موت بن جائیگی آخر ایک دن
زندگی ہے دشمنِ جانی مری

دشتِ محشر بن گیا باغ و بہار
رنگ یوں لائی پشیمانی مری

۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۲ء تک رائے بہادر صاحب شنکر بھون ہی میں رہے اور قریب قریب سارا وقت ریاضت و عبادت ہی میں بسر کیا۔ عبادت کی صبح تھی تو ریاضت کی شام۔ ریاضت کا دن تھا تو عبادت کی رات کبھی کبھی شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوتے تو گویا عبادت نظم میں ہونے لگتی۔ اس پر آدم مالا اور بادۂ عرفاں ایسے دو شاہد عادل گواہ ہیں۔ وفات سے چھ مہینے قبل بائیں ہاتھ میں درد پیدا ہوا جو برابر بڑھتا گیا۔ پندرہ دن کے بعد چکر بھی آنے لگے۔ ایک ہفتہ اسی حالت میں گذر گیا۔ پھر کوئی ایک ہفتہ سکون رہا۔ اب بخار بھی آنے لگا اور تپ بڑھتی ہی گئی۔ مرنے سے پندرہ دن پہلے جناب موصوف نے مندرجۂ ذیل شعر کہے اور یہی اُن کا آخری کلام ہے:-

درد سے پیدا ہوا یارب یہ کیسا انقلاب
جو بہارِ آستیں تھا ہے وہ بارِ آستیں

ہاتھ کا یہ درد میری جان لے کر جائے گا
اس کے ہاتھوں بن گیا ہے ہاتھ بارِ آستیں

ان اشعار کے بعد ہچکیاں آنے لگیں جن کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا اور یہ عالم ہو کے رہ گیا ؎

ہچکیوں نے کھو دیا لطفِ بیانِ دردِ دل
ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھدی داستانِ دردِ دل

ایسے با خدا بزرگ کی موت اہلِ نظر کے لئے سانحۂ عظیم ہے ؎

اِک فرد کی نہ ایک گھرانے کی موت ہے
اہلِ صفا کی موت زمانے کی موت ہے

آپ نے اپنی تمام زندگی عبادت ریاضت اور خدمتِ خلق میں بسر کی۔ خدائے عادل نے دنیا میں صلہ یہ دیا کہ چار فرزند سعید و رشید اُن کی یادگار ہیں۔ بڑے صاحبزادے بابو ترلوکی ناتھ صاحب ورما بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی، منصفی کے عہدے پر سرفراز ہیں۔ منجھلے صاحبزادے بابو تربھون ناتھ صاحب ورما ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی۔ وکالت کا کام سیکھ رہے ہیں۔ سنجھلے صاحبزادے بابو رجیندر ناتھ صاحب ورما بی۔ ایس۔ سی، ایل ایل۔ بی وکیل ہیں۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے بابو پرکاش ناتھ ورما ہیں جو ایم۔ اے فائنل میں پڑھتے ہیں۔

یہ بات بھی کہنے کے قابل ہے کہ جناب رائے بہادر صاحب مرحوم کی تمام مادی و روحانی ترقیاں اُنکی ذاتی سعیِ جمیل کا ثمرہ ہیں

مجھے بھی جناب موصوف سے نیاز حاصل تھا میں نے دو تاریخیں کہی ہیں جو ہدیۂ ناظرین کرام ہیں :-

قطعۂ تاریخ اُردو

شنکر دیال رائے بہادر کی موت نے چھایا ہے کائنات پہ بادل ملال کا
اہلِ صفا کی موت زمانے کی موت ہے غم سے عجیب حال ہے اہلِ کمال کا
کہتے ہیں اس کو عشق کہ جب کھل گئی زباں قصہ چھڑا خدا کے جمال و جلال کا
ہر لفظ اِک شبیہ صفاتِ الٰہ کی ہر شعر ایک آئینہ حق کے جمال کا
سمجھے جو ذرے ذرے کو قدرت کا آفتاب ملتا ہے آدمی کہیں ایسے خیال کا
تھا زندگی بھی ہجر کی مدت کا ایک نام جب آگئی اجل تو دن آیا وصال کا

آفت سرِ بساطِ جہاں پر گذر گئی
ماتم ہے اِک زمانے میں شنکر دیال کا

۱۳۵۹ ہجری = ۱۳۶۱

جامعۂ ملیہ کے قاعدے

یہ چھ قاعدوں کا ایک سٹ ہے جس میں (۱) آسان قاعدہ (۲) بچوں کا قاعدہ (۳) حرفوں کا قاعدہ (۴) مدرس کا قاعدہ نما (۵) اُردو سکھانے کا آسان قاعدہ یا طریقہ (۶) نئی کتاب (قاعدہ) ہیں ۔

پہلے قاعدہ میں بچوں کو آوازوں کے ذریعہ سے الفاظ سکھائے گئے ہیں، اور اشیاء کو دیکھکر آواز پیدا کرنے کے لئے بہت سی قلمی تصویریں حاشیہ پر درج کرکے ان کے سامنے اس چیز کا نام جلی حرفوں میں درج کردیا گیا ہے اور نام کا آخری حرف سکھایا گیا ہے ۔ لیکن اس کی بعض تصویریں بھدّی اور غلط ہوگئی ہیں ۔

دوسرے قاعدہ میں بھی تصویروں کے ذریعہ سے بول سکھائے گئے ہیں، اور چھوٹے چھوٹے لفظ ملاکر عجیب کہانیاں بنائی گئی ہیں ۔

تیسرے میں مختلف حرفوں اور پیشوں سے متعلق تصویریں دے کر لفظوں کی تعلیم دی گئی ہے ۔ اور پھر انہیں لفظوں کو الٹ پھیر کرکے مختلف جملے اور فقرے بنانا سکھایا گیا ہے ۔

چوتھے میں صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب نے جو قاعدہ مرتب کیا ہے اس میں استاد کو اس قاعدے کے سبق پڑھانے کے طریقے بتائے گئے ہیں ۔

پانچواں قاعدہ بھی استادوں کے لئے ہے جس میں بڑی عمر والوں کو تعلیم دینے کے طریقے بتائے گئے ہیں ۔

چھٹے میں بھی تصویروں کے ذریعہ سے بول سکھائے گئے ہیں ۔ لکھائی چھپائی اچھی قیمت ۱۱ روپیہ مکتبۂ جامعہ دہلی سے ملیگی

پیامِ سالِ نو

(از مسٹر منوہر لال کپور طالب چکوالی بی۔ اے (آنرز) ایل۔ ایل۔ بی)

گذشتہ سال کی ناکامیوں کا ذکر لاحاصل
شکستِ عزم کی بدنامیوں کا ذکر لاحاصل

گذشتہ سال کی کمزوریوں کا ذکر جانے دے
گذشتہ سال کی مجبوریوں کو منہ چڑانے دے

گذشتہ سال کی باتوں کا قصہ چھوڑنا ہوگا
تعلق سال بھر کا ہے مگر یہ توڑنا ہوگا

جو کل تک "حال" تھا ہے آج "ماضی" میں شمار اُسکا
ہوا ہے آج کا طالب جو کل تک تھا وقار اُسکا

فروغِ آفتابِ سالِ نو سے لے نئی ہمت
نئی ہمت سے پیدا کر نئی دُنیا نئی قسمت!

پیامِ سالِ نو ہے، کر نیا جوشِ عمل پیدا
پُرانی مشکلوں کا کر نئی ہمت سے حل پیدا!

تری تدبیر سے تقدیر کا پانسہ پلٹ جائے!
تعجب کیا تعصّب کی کڑی زنجیر کٹ جائے!

آزادی کا لمحہ

سُنو اے ساکنانِ خطۂ خاک
صدا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا ہے اک لمحہ بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

روحِ شادمانی

جوش ملیح آبادی

آزاد ہو روح، شادمانی ہے یہی
بشاش ہو قلب، کامرانی ہے یہی
کچھ بھی ہو، خراشِ قلب و نیشِ غم کو
محسوس نہ کر، کہ زندگانی ہے یہی

حجاباتِ نظر

افسانہ

از محترمہ فرحت ہاشمی صاحبہ (بدایونی)

(۱)

رابعہ نواز محسنم، سلام مسنون۔

اللہ رے۔ آج چار ہفتے ہونے آئے کہ صاحبِ فرش ہوگئی ہوں، تمھارے احساس نے کروٹ بھی نہ لی..... تمھارے دل میں ایک ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ تمھارے دماغ میں ایک خفیف ارتعاش بھی نہ ہوا۔ میرے زخمۂ ایثار نے تمھارے تارِ محبت پر ساز سے سوز پیدا نہیں کیا! —— ہاں تم! تم میری عیادت تک کو نہ آئے!

غم اور علالت دونوں نے اس درجہ اختر شماری میں محو کر دیا ہے کہ آنکھیں رات کے چین اور آرام کی نیند سے بیگانہ ہیں۔ ہر صبح نئی اُمیدیں لیکر آتی ہے..... مگر دن کے اختتام تک وہ سب ایک دُکھے دل کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ میرے خیالات کی دنیا اور میں، اُمیدیں اور یقین..... شاید اب میری مجبوریاں تم کو اپنی محبت کا واسطہ دے کر مجھ تک لے آئیں گی۔ اور خیال ہوتا تھا کہ آج تمھارا خط ضرور آئیگا! جو میرے لئے امن و سکون کا پیغام ہوگا —— نویدِ دید ہوگا!

مگر آہ تم کہ خواب میں بھی آنے سے گریزاں ہوتے تھے —— مگر نہ معلوم کیوں تم خواب میں بکھر جاتے تھے، اور —— پھر چشم زدن میں آنکھوں سے دُور..... بہت دُور۔

مجھے معلوم ہے کہ تم میری اس "شکایت" پر چیں بہ جبیں ہوگے اور طوعاً و کرہاً رسمی الفاظ لکھکر بھیجدوگے "مجھے سخت تردد ہے، اب طبیعت کیسی ہے۔ معاف کرنا مجھے صحیح وقت پر اطلاع نہ ملی، ورنہ ضرور آتا۔"

ممکن ہے تمھارے خیال میں الفاظ کے "جھوٹے نگینے" میری نظر کو دھوکا دے سکیں —— مگر یہ رسمی تحریر اطمینان بخش نہیں ہو سکتی، ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بلکہ نمکدان کا کام دے گی اور زخم دل میں اور ٹیسیں پیدا کریگی اب اگر کوئی خیال تسکین بخش ہو سکتا ہے تو یہی کہ جب اس درد کا درمان ہی نہیں تو کیوں نہ اس سے مانوس ہو جاؤں۔ آہ ؎

یوں بھی تکمیلِ غمِ عشق ہوا کرتی ہے
اُسکی قسمت میں ہوں میں، جو مری قسمت میں نہیں

سچ پوچھو تو شکایت کس سے کروں تم "اور" میں "یعنی اپنے آپ سے ذرا ایمان کی بھی کہنا، تم کو میرا دل دکھا کے میری حسرتیں پامال کر کے میرے چمنِ زندگی کو اُجاڑ کے کیا ملا ...... مگر آہ اگر تم دل (خدا نہ کرے) پھیر بھی دو تو میں تمہاری "نوازش ہائے پنہاں" کا احساس کرتے ہوئے تمہارے قدموں پر اُسے پھر نثار کر دوں ...

ایک عرصہ کے بعد آج تھوڑا سا سکون ہوا تھا، جی گھبرایا تم کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ ہاں دیکھو میری باتوں کا بُرا نہ ماننا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل میں کوئی سوءِ ظن پیدا نہ ہوگا۔ تم ہی سمجھو تمہارے سوا میرا کون ہے ـــ تم اس حد محبت کی سوچ ہو...... ہاں! ہاں تم میرے سب کچھ ہو۔ تم اپنے آپ کو میرا نہ سمجھو مگر دیکھو مجھے اپنا سمجھتے رہنا، میرے لئے یہی کافی ہے ......"

اس وقت نہ معلوم کیوں اس قدر بے اختیار جی ہو رہا ہے کہ تم میرے پاس ہوتے ......

تم کو یاد ہوگا پچھلی برسات میں جب میں اور تم دونوں ندی کنارے بیٹھے ہوئے تھے تو تم نے کہا تھا "اُس تبسم کی بہار ہی کیا جس میں اشکباری نہ ہو۔" کاش تم اس وقت ہوتے تو تم وہی بہار میری آنکھوں میں اور وہی تبسم میرے لبوں پر دیکھتے۔ لو تم ناراض ہو گئے، خط کو طول ہو گیا، اچھا تو میں یقین کر لوں کہ تم ضرور آؤ گے ....ہ

تھا ابھی جلوہ، ابھی پردہ ابھی کچھ بھی نہیں
آپ کی یہ حسرتِ دیدار جو چاہے کرے

تمہاری اور صرف تمہاری

حسرت مآب: رابعہ

(۲)

بہن نجمہ۔ پھلو، پھولو۔ خوش رہو۔

یہ جو تم نے میری مصیبتوں اور اندوہناکیوں پر اظہارِ ملال اور تاسّف کیا ہے، تو اچھا کیا، کاش یہ الفاظ صرف "دنیا" ہی کے الفاظ نہ ہوں، میری نظر کے لئے سراب نہ ہوں اور فی الحقیقت تمہاری ہمدردی کا چشمہ ہوں۔ مگر میرا اب کیا پوچھنا ـــ میں وہ تخمِ محبت ہوں جو بہار کی احسان مند ہی نہیں، ایسی ناکارہ ہوں کہ "موت" نے بھی مجھ سے منہ پھیر لیا۔ تم نے تسلّی دی ہے، خوشگوار اُمیدوں کا ایک حقیقت نما منظر میرے سامنے پیش کیا ہے۔ مگر.....

ہجوم یاس میں کوشش نہ کوئی کام آئی
تسلیوں نے کیا اور بے قرار مجھے

...... شاید تم نے اصلیت کو سمجھنے سے گریز کیا (اس وجہ سے کہ واقعات ہی پیچیدہ ہیں) تم اپنے

...نیت حیات ...... جمیل تم کو سمجھ سکتی ہو، اس کی ہستی کو سمجھنا کہیں آسان ہے، لیکن تم ......
...ا ہستی کو کیا جانو۔ وہ عوام کی ہستی سے بہت بلند ہے، اس کی اہمیتیں، اس کے جذبات کا عمق
...س کے دل کی کیفیات، اس کے احساسات کی رفعت کا تعلق اس دنیائے آب و گل سے نہیں
...یاری نجمہ ...... کی محبت اِس دنیا کی محبت جیسی نہیں۔ اُن کا تخیل محدود نہیں، اُن کے عناصر
...ر بھی محبت۔ سوز، غم اور عشق نہیں میں خود بھی اکثر اُن کی ہستی کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہوں۔ جو کچھ
تم نے مجھ سے دریافت کیا ہے، اُس کا جواب تو مجھے خود بھی نہیں آتا، میں تو خود اسی معمہ کے حل
کی فکر میں ہوں ؎

لفظ و معنیٰ جس کو چھو سکتے نہیں ○○ مرا افسانہ آغاز ہے

تم نے لکھا ہے کہ تم مسوری جا رہی ہو، اچھا جاؤ، بہار کے دن بہار میں گزارو، تمھیں ایک میری
...ونس تھیں، میری بدنصیبی اسے بھی نہ دیکھ سکی، جو تسلی دل حزیں کو تم سے مل جاتی تھی اب وہ بھی
...سہی ...... خیر۔ ہاں تو میں تم کو مبارکباد پیش کرتی ہوں، مگر اس آواز میں سوز بھی ہے
خوشی بھی ہے غم بھی ہے۔ اب یہ تم خود سمجھ سکتی ہو کہ کس کا وفور زیادہ ہے۔ ہاں دیکھو میری
ایک التجا تم کو ضرور ماننا ہوگی۔ تم وہاں کی رنگین بہاروں اور رومانی فضاؤں میں میرے تلخ واقعات
کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دینا۔ مصیبت میں میں کسی کو شریک نہیں دیکھ سکتی۔ یہ تو مجھے اکیلے ہی پسند ہے
تمھاری خوشگوار ساعتیں اس بار کی متحمل نہ ہو سکیں گی۔

ہاں گھبرانا نہیں، ابھی مروں گی نہیں، مجھے یقین ہے کہ تمھاری واپسی پر پھر یہی تلخ نغمہ چھیڑونگی
نجمہ! غم اور زیست ایک دوسرے کے لئے لازم ہیں، زندگی کا وجود غم سے ہے ......
غم زندگی کا ایک اہم عنصر ہے ...... اور اسی کی دنیائے دل میں کارفرمائی ہے۔
تمھاری "رابعہ"

(۳)

رابعہ نواز ......
سرتاج من سلام قبول کیجئے۔

خراب افسردگی شوق ناتمام مری ○○ بہار ہستی ناقص مرے فسانہ کی

عقل کام نہیں کرتی کہ کیا جواب لکھوں، ہاں "شاہد" نے مجھ سے سچ کہا تھا، کاش اس کے الفاظ
پہلے ہی میرے کانوں تک پہنچ جاتے۔ تم کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے، وہاں سے مجھے ایک خط

بھی لکھا تھا جو ایک کی لاپرواہی سے مجھ تک نہ آسکا اور واپس آکر حسرت طلب ہو گئے۔ خیر مجھے معاف کرنا، نہ معلوم کیوں ——— شاید اس دل کی بے قراری اور تلاطم جذبات نے مجھے تمھاری تحریک کے باوجود کرنے سے باز رکھا۔ یہ جو تم نے مجھ سے یوں استفسار کیا ہے تو اس کا جواب تم اپنے ہی ضمیر میں تلاش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تمھارا ضمیر خود تم کو مجھ سے بہتر جواب دے سکے گا۔
——— اور اس کا فیصلہ بھی تم ہی پر رکھتی ہوں ……… !

تمھیں کیا معلوم کہ میں نے تم کو کھو کر کیا کھو دیا ——— وہی اور بالکل "وہی" جو چاند گہن کے بعد اور پھول مرجھانے کے بعد ——— نہیں! میں نے غلطی کی۔ میں نے اس سے بھی زیادہ کھو دیا!

دنیا انسان کی مجبوریوں کے تسلسل کا نام ہے، اور اس رباب حیات کا نغمہ جاں نواز نہیں جاں کاہ ہے، آہ اب اس شکستہ تار پر یادِ رفتہ کی مضراب نہ لگاؤ……… !
آہ، اُس تارہ کی کیا قسمت جو رات بھر دیدۂ بیدار کی طرح ضیا پاشی کے جلوؤں کا منظر رہا ——— اور بقا اور فنا کے ایک نحیف خطِ درمیانی پر آکر ڈوب گیا ——— ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا۔

غم نصیب کا پرسانِ حال کون ہے ؟

سراپا آرزو ہوں، درد ہوں، داغ تمنا ہوں
مجھے دنیا سے کیا مطلب، کہ میں آپ اپنی دنیا ہوں

"رابعہ"

(۴)

………رابعہ نواز !

اگر مجھے کوئی تم پر نظری حق ہے اور مجھے تم سے کسی سوال کے دریافت کرنے کا مجاز ہے تو میں تم سے اتنا ضرور پوچھوں گی کہ آخر میرا کیا قصور تھا، جو تم نے خط بھیجکر بھولے ہوئے قصہ کو پھر یاد دلایا! ذرا غور کرنا، تم کو اس سے کیا فائدہ ملا ——— وہ زخم جو اب مندمل ہو رہا تھا تم نے اسے نشتر کے اشارہ سے پھر ہرا کر دیا۔ آج پھر مجھے زخم دل کی ٹیس میں وہ لذت مل گئی جس سے دنوں سے کم آشنا ہو رہی تھی……… ……… ایک عرصہ تک میری سعی اور صلہ میں یوں ہی کشمکش رہی۔ خاموش اور ساکت بیٹھی اپنی کوششوں کی شکست دیکھا کی۔ اپنے احساسات کا مدوجزر دیکھا کی ——— میری کھوئی کائنات مجھے دوبارہ مل گئی۔ اور یہ سیلاب اشک نہ جانے کیوں اُمڈا چلا آرہا ہے۔ قطرات ٹپک رہے ہیں اور میں روک نہیں سکتی۔ آہ ——— آہ! نہیں آنسو سمجھکر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم پیام دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

مجھے میری قدری کی جھلی پہنیا دی گئی ——— آہ تمہارا خط!
مگر میں یہ کوشش کرونگی کہ تم کو آئندہ خط لکھنے کے خیال کی بھی جرأت نہ کروں۔ اس
خیال سے بھی ایسی ہی ناآشنا رہونگی، جس طرح میرے دلِ محزوں سے آرام ناواقف ہے۔
دیکھو ——— خدارا مجھ پر رحم کرو۔ اس مزید تلطف سے دبی ہوئی آگ کو نہ بھڑکاؤ۔ مجھے
یاد نہ کرو...... مجھے دوبارہ خط نہ لکھنا ——— تم سمجھ گئے..... غالباً مان بھی جاؤ گے۔

"رابعہ"

(۵)

پیاری نجمہ!
وائے مجبوری کہ تم اس وقت موجود نہیں، ورنہ تمہارے گلے میں باہیں ڈال کر چپکے سے ایک
راز کی بات کہتی..... ایسا راز جو تمہارے "جمیل" سے بھی پوشیدہ ہے۔
دیکھو نجمہ تم کو معلوم ہے کہ میرا ارادہ تھا کہ میں اب کبھی بھی اُن سے نہ ملونگی ———
کیوں، تم جانتی ہو، اس لئے کہ میرا خیال تھا کہ اُنھوں نے فریب کیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کی
ذات فریب سے بری ہے۔ میں نے خود ہی اپنے آپ کو فریب دیا..... میرے وہم غلط کار نے مجھے
دھوکا دیا، کل کی بات ہے "وہ" واپس آئے ——— میرے کمرے میں داخل ہوئے ——— بخار چڑھا ہوا تھا
چہرہ نڈھال تھا اور حالت سے عجب سراسیمگی عیاں تھی ——— ہاں تو "وہ" آئے، میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر
کھڑے ہوگئے۔ اِن کمبخت آنسوؤں کا بُرا ہو کہ زبان تو بند ہوگئی اور خود ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ مجھے یوں
روتا دیکھکر بولے "رابعہ..... آخر یہ کیوں..... کیا تم مجھ سے ناراض ہو..... نہیں تم ناراض کیوں
ہوتیں.... بولو.... بتاؤ" اُن کا ہاتھ بخار میں جل رہا تھا، اُن کے ہاتھ کی گرمی سے ایسا معلوم ہوا گویا
ایک بجلی میرے بدن میں سرایت کر گئی، اور تمام جسم میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔ میں نے پوچھا "کیا
آپ واقعی بیمار تھے؟" بولے "اگر تم یقین لاسکو تو باور کرو، میں پہونچنے کے بعد ایسا بخار میں
بیہوش ہوا کہ ڈاکٹر نے گفت و شنید بھی منع کردی اور جو خطوط تمہارے مجھ تک گئے وہ ملازم ہی
تک رہے اور میں کیفیت سے آگاہ نہ ہوسکا ——— ایک ہفتہ بعد وہ خطوط مجھے ملے، علالت
سے دماغ ایسا مختل ہوچکا تھا کہ بمشکل تمہارے خطوط کا مفہوم لے سکا، اور اس پر بھی اس آخری
خط کو تو سمجھ ہی نہ سکا۔ اب اس خط کو لیتا آیا ہوں، تم پڑھو، پڑھکر سناؤ..... مجھے خود بتاؤ کہ آخر
مجھ سے یہ ناراضگی کا کیا باعث..... بتاؤ، جلد بتاؤ۔ ورنہ میرا دماغ اور بھی مختل ہوجائیگا"

تمھیں بتاؤں کہ میں اُن کے استفسار پر کس قدر خجل اور نادم ہوگئی ...... میں نے وہ قصور کیا ہے جو شاید "وہ" تو معاف کردیں مگر کوئی اور (غالباً تم بھی) معاف نہ کرسکتا۔

میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں، دل میں ایک خوشی کی لہر پیدا ہوئی ...... میری آواز بھرّا گئی میں نے ہر چند چاہا کہ دل کو قابو میں لاسکوں ...... مگر تم جانتی ہو کہ یہ میرے بس سے باہر تھا میں نے مسکرا کر اُن کے زانو پر خط بچھاتے ہوئے کہا "کیا تم اپنی رابعہ کے اس حماقت کو معاف کردو گے"..... سچ جانیئے میرے وہم نے مجھے دھوکا دیا، میری غلط فہمی ......!"

میں نے دیکھا کہ اُن کے ہونٹوں پر بھی تبسم رقص کرنے لگا اور بولے" رابعہ ... کیا یہی تبسم ہے جس کا ذکر تم نے پہلے خط میں کیا تھا..." اُن کی نظریں بتا رہی تھیں کہ انھوں نے مجھے معاف کردیا۔

پیاری نجمہ، میں جانتی ہوں کہ تم اپنے دل میں کس قدر مجھ پر ملامت کروگی، اور غالباً زبان سے بھی کیا کیا کچھ کہہ ڈالوگی ——— میں اُس سے بھی زائد سننے کے لائق ہوں۔ مگر یہ سمجھ لینا کہ اگر تم نے اپنے "جمیل" سے اشارتاً بھی اس کے متعلق کچھ کہا تو ایسی چٹکی لونگی جو یاد رہے۔ اچھا میں نے تم کو بہت دیر تک میاں "جمیل" کے جمال سے دور رکھا.... سمجھ گئیں اپنے میاں جمیل سے نہ کہنا ورنہ ایسی دُکھتی رگ پکڑی ہو کہ یاد رہے۔

اپنی ہستی کے جو انوار سے بیگانہ رہے وہ فقط چند "حجابات" کا دیوانہ رہے

تمھاری رابعہ

رونقِ لالہ زار

(از مس کے۔ احمد شجاع عصمت)

رونقِ لالہ زار کیا کہیئے ہے گلوں پر بہار کیا کہیئے
غنچۂ و گل پہ پھٹ پڑا ہے شباب جوش پر ہے بہار کیا کہیئے
اُٹھ گیا ہے حجاب بلبل و گل لذّتِ شوقِ یار کیا کہیئے
چشمِ بلبل کے سُرخ ڈوروں پر ہے بلا کا خمار کیا کہیئے
مسکراتا ہے غنچۂ نوخیز پھول ہے مشکبار کیا کہیئے
آج یادِ انیس لے عصمت
آتی ہے بار بار کیا کہیئے

قیودِ علائق

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔اے)

بشر تو ہے بستۂ علائق یہ سہہ رہا ہے کہاں کی قیدیں
کڑی جو ہیں اِس زمیں کی قیدیں تو سخت ہیں آسماں کی قیدیں

کہیں جو ثقلِ زمیں سے ہٹتا تو اہلِ حکمت یہ کیا نہ کرتا
یہ اُڑ کے عرشِ بریں پہ جاتا، اگر نہ ہوتیں مکاں کی قیدیں

زمیں کو تا سطحِ مہ اُٹھاتا، جو مستقر مہر میں یہ پاتا
کبھی نہ اِن پستیوں کا مارا یہ جھیلتا اِس جہاں کی قیدیں

نفس نفس میں جو اُلجھنیں ہیں، قدم قدم پر ہیں سخت پھندے
زمیں کی قیدیں زماں کی قیدیں کہیں یہ ہیں سو مکاں کی قیدیں

ہوا ہے مجروح آہ کیا کیا، ہمارا ذوقِ نجات اِن سے
ارے یہ خود اپنے خوں کے چسکے، ارے یہ حفظِ نہاں کی قیدیں

کہاں ہیں مدہوش اہلِ ظلمت، عذابِ زندانیت یہ کیوں ہے
بتاتے کچھ اہلِ راز ہم کو، مگر ہیں اُن پر زباں کی قیدیں

رُباعی

بیٹھے ہو اُداس اہلِ ظلمت! صد حیف!! خود ہو گئے وقفِ یاس اہلِ ظلمت! صد حیف!!
ظلمت کے آگے آبِ حیواں بھی ہے ہو حامیِ ناسپاس اہلِ ظلمت! صد حیف!!

مدہوش

عراقی کی ایک غزل

اور اُس کا ہندوستانی ترجمہ

(از سید مقبول حسین، احمد پوری، بی۔اے)

بہ شرارہ قلندر بہ زن اُزحریف مائی	جو گی کی جیون جوالا سے بار لے دل کا دیپک بھائی
کہ نماند بیش مارا سرِ زہد و پارسائی	پوجا پاٹ سے اپنی طبیعت، گیانی اب تو بہت اُکتائی
نہ یم اہلِ زہد و تقویٰ بمن آر ساغرِ مے	تپسی بھگت نہیں ہم کوئی، بھر دے پریم کے رس کا پیالہ
کہ بہ صدق توبہ کردم زعبادتِ ریائی	تج کے دکھاوے کی سب باتیں پریم سے ہم نے لگن لگائی
تو مرا شراب درده کہ ز توبہ توبہ کردم	مجھکو پریم کی مدرا لا دے، توبہ سے بھی توبہ کر لی
زصلاحِ خود ندیدم ہمہ لافِ خود نمائی	اپنے مُنہ سے اپنی بڑائی، پر یمی مجھکو راس نہ آئی
چو ز بادہ مست گشتم چہ کلیسا و چہ کعبہ	مست ہوئے جب پریم سے گیانی، کعبہ اور کیلاش برابر
چو بترکِ خود گرفتم چہ وصال و چہ جدائی	تج کے خودی بیراگ لیا تو ایک ہوئے سنجوگ جدائی
بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم	گئے جُوا گھر ہم تو دیکھا ایک سے ایک بھگت تھا بیٹھا
چو بصومعہ گزشتم ہمہ یافتم دغائی	مٹھ کے رستے آن پڑے تو کرنے لگا ہر ڈھیٹھ ڈھٹائی
بطوافِ کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندادند	گئے جو کعبے کے درشن کو، روک لیا بھیتر جانے سے
کہ بروں تو خود کہ باشی کہ درونِ کعبہ آئی	کہا ہٹو اور دُور کھڑے ہو، یہاں تمھاری نہیں سمائی
در دیر می زدم سر زِ دروں ندا بر آمد	گئے شِوالے بُت پوجن کو، بھیتر سے یہ کہا کسی نے
کہ بیا بیا عراقی تو ز خاصگانِ مائی	آؤ عراقی آؤ آؤ، تم نے محبت خوب نبھائی

تنقید کتب

تاریخ گولکنڈہ[1]

دکن میں سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد اس کے کھنڈروں سے پانچ نئی سلطنتیں گولکنڈہ، احمد نگر بیجاپور، بیدر اور ایلچ پور۔ قطب شاہی، نظام شاہی، عادل شاہی، برید شاہی، اور عماد شاہی کے نام سے قائم ہوگئی تھیں۔ ان میں احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں خاص طور پر اہمیت رکھتی تھیں۔ چنانچہ اس کتاب میں مولانا عبدالمجید صاحب صدیقی، ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ نے سلطنت گولکنڈہ کی مفصل تاریخ لکھی ہے۔ اس میں پانچ حصے اور چوبیس باب ہیں۔ پہلے حصہ میں سلطنت گولکنڈہ کی بنیاد، دوسرے میں استحکام تیسرے میں عروج، چوتھے میں زوال اور پانچویں میں ریاست کے تمدنی حالات دیے ہیں۔ گولکنڈہ کا آخری بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ ہے جسے عرف عام میں تاناشاہ کہتے ہیں۔ مغل مورخین نے اس کی شخصیت اور کیرکٹر کو بہت مذموم رنگ میں پیش کیا ہے۔ [illegible] فاضل مصنف نے مستند حوالوں سے کام لیکر مغل مورخین کے تمام الزامات دفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا حال کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، اور شاہان قطب شاہی کی تصویریں بھی دی گئی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کتاب کا پانچواں حصہ جس میں گولکنڈہ کے تمدن سے بحث کی گئی ہے [illegible] قابل قدر ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ، جلد انگریزی۔

کتب سلسلۂ یوسفیہ

عام خیال ہے کہ اردو نظم کی ابتدا ولی دکنی سے ہوئی، لیکن جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ولی دکنی سے بھی پہلے دکن میں بہت سے بلند پایہ شاعر گذرے ہیں، اگرچہ ان کی زبان اس قدر صاف نہیں تھی جتنی کہ ولی کی ہے۔ اس کے علاوہ پرانے دکنی شاعروں کی توجہ زیادہ تر مثنویوں کی طرف رہتی تھی، غزل بھی کہتے ہونگے مگر کم۔ نظم اردو کو زیادہ تر ترقی کا موقعہ سلاطین عادل شاہیہ و قطب شاہیہ کے عہد میں ملا، جو خود بھی شعر کہتے تھے اور شاعروں کی سرپرستی و قدر افزائی کرتے تھے۔

مدتوں سے ان پرانے دکنی شاعروں کی تصانیف گمنامی میں پڑی تھیں، لیکن [illegible] میں ستی کا ...

---

[1] قیمت [illegible] روپیہ۔ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

حیدرآباد میں ولی دکنی کی جو دو صد سالہ برسی منائی گئی اور اُس کی نمائش میں بہت سے پُرانی تحریرات ایسی فراہم ہو گئیں جو پرانے دکنی شاعروں کی تصانیف تھیں یا ان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس نایاب موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جشن یادگار ولی کے صدر نواب سالار جنگ صاحب بہادر نے تحریک کی کہ اس جشن کی مستقل یادگار میں ولی کے معاصرین اور ان سے پہلے کے شاعروں اور مصنفوں کی اُردو کتابیں مرتب اور شائع کی جائیں۔

چنانچہ چھ سات اہل علم اور محققین کا ایک بورڈ سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج حیدرآباد کی صدارت میں قائم ہو گیا، اور مختلف اصحاب نے مختلف دکنی شاعروں اور مصنفوں کی تصانیف کی ترتیب کا کام اپنے ذمہ لیا جس کا نتیجہ "کتب سلسلۂ یوسفیہ" کی صورت میں برآمد ہوا جس میں سے اس وقت پانچ کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں اس سلسلے کی پہلی کتاب

۱۔ پھول بن

ہے، جو دکنی اُردو کی مثنوی ہے جسے ۱۰۶۶ھ میں گولکنڈہ کے شاعر ابن نشاطی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں لکھا تھا۔ یہ مثنوی چند قصوں کا مجموعہ ہے، جس میں من براد رہمایوں فال کا قصہ اصل اور باقی حصے ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان قصوں کی نوعیت ویسی ہی ہے جیسے "گل بکاؤلی" "باغ وبہار" وغیرہ کی۔ لیکن جس زبان میں یہ مثنوی لکھی گئی وہ اُس زمانہ کی فصیح ترین زبان تھی۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

اول میں حمد رب العالمیں کا ۔۔۔ دل و جان سوں لکھوں جاں آفریں کا
خداوند تجھے ہے ہمیشہ خدائی ۔۔۔ ہمیشہ تجھکوں ساجے کبریائی
ازل کوں نیں سمجھ تیرا ابتدا ۔۔۔ ابد کوں فہم میں تیرا نہایت

مولوی عبدالقادر سروری صاحب کی کوششیں قابل تحسین و داد ہیں جنھوں نے کافی مطالعہ، تحقیق و تدقیق کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے حتیٰ کہ تلاش و تجسس میں انھوں نے فرانسیسی محقق موسیو گارساں دتاسی، اور انگریز محقق اسٹوارٹ کی تحریروں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں "پھول بن" اور اس کے مصنف پر ایک مبسوط اور فاضلانہ مقدمہ ہے، دوسرے حصہ میں اصل مثنوی ہے جو اپنے دو سو صفحوں تک چلی گئی ہے۔ فٹ نوٹوں میں جا بجا ان نسخوں کے حوالے دیئے گئے ہیں جن سے متن کی صحت کی گئی ہے سلطان عبداللہ قطب شاہ اور مثنوی کے مصنف ابن نشاطی کی تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں جو تاریخی حیثیت سے بہت دلچسپ ہیں

۲۔ کلام الملوک

دکن کی مشہور سلطنت بہمنیہ اور اس کے انتشار کے بعد عادل شاہی، قطب شاہی وغیرہ سلطنتیں

دکن میں [illegible] ہوئیں اُن کے سلاطین علم و ادب کے قدر دان ہونے کے علاوہ خود بھی شاعر و ادیب تھے، مگر ان کا کلام گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ آپ میر سعادت علی رضوی صاحب ایم۔ اے نے بڑی تلاش و تجسس سے ان کا فارسی کلام مرتب کر کے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ کلام الملوک [illegible] نام سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب گویا دکن کے شاعر بادشاہوں کا تذکرہ ہے جس میں سلطان محمد ثانی بہمنی، سلطان سکندر بہمنی، فیروز شاہ بہمنی، سلطان یوسف عادل شاہ، اسمٰعیل عادل شاہ، ابراہیم عادل شاہ، سلطان جمشید قلی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ کے مختصر حالات اور اُن کے فارسی کلام کے نمونے درج ہیں۔ اس میں سلاطین دکن کی تصویریں اور اُن کے شجرے بھی دیدیئے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے اس کتاب کو تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ہفت بند کاشی کے نمونہ پر گولکنڈہ کے بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جو بند لکھے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ تیسری کتاب طوطی نامہ ہے۔

۳ - طوطی نامہ ۔

جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ کے شاعر ملا غواصی کی تصنیف ہے اور ۱۰۴۹ھ میں لکھی گئی تھی اسے [illegible] نے تحقیق و تدقیق کے بعد مرتب کر کے پبلک کے سامنے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس [illegible] میں ایک چالاک طوطے کی زبانی بہت سی مختصر کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ اصل کتاب سنسکرت زبان میں [illegible] (طوطے کی بیان کردہ ستر کہانیاں) تھی، اس کی باون کہانیوں کا مولانا ضیاءالدین نخشبی نے ۷۳۰ھ ہجری [illegible] مرحوم نے اس کتاب کا مثنوی کی بحر میں [illegible] زبان میں ترجمہ کیا لیکن صرف پینتالیس کہانیاں رکھیں۔ اُردو زبان میں یہ کتاب [illegible] سے پہلے ہی سے موجود ہے۔ طوطی نامہ کی نظم کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:۔

چہ آیا عمل دلیں اقبال کا ۔۔۔ ہوا شاد سینا مرے حال کا

[illegible] کی پاتی پھر ۔۔۔ [illegible] دولت ایک مُکھ دکھلائی پھر

مرے بخت کا ایک تارا [illegible] ۔۔۔ کیا زمانا مری سیر دی

کتاب میں [illegible] قطب شاہ اور ملا غواصی کی تصویریں بھی شامل ہیں اور مرتب صاحب کا مقدمہ قابل دید ہے۔

۴ - قصۂ بے نظیر

یہ مثنوی [illegible] کی تصنیف ہے جسے سلطان محمد عادل شاہ [illegible] کے زمانے میں [illegible] نے مثنوی کی صورت میں لکھا تھا۔ [illegible] کے سفر اور [illegible] کی سیر و سیاحت کے قصوں کی وضع کا ایک بے سر و پا قصہ [illegible] مشہور تھا۔ جسے

مصنّف نے نظم کر دیا۔ اب بہت کچھ ریسرچ کے بعد مولوی عبد القادر سروری ایم۔ اے۔ ایل ایل بی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ مقدمہ میں مصنّف کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے کلام پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ مثنوی کا [illegible] حسب ذیل ہے:۔

ثنا بول اول تو سبحان کا | جو خلاق ہے جن و انسان کا

بشر کو اپس قدرتِ پاک سوں | بنایا اگن جل پون خاک سوں
(اپنی) (سے) | (آگ پانی ہوا)

اپس ہات سوں راست کر اس شتاب | دھریا مہربانی سوں آدم خطاب
(دیا)

۵۔ سیف الملوک و بدیع الجمال

یہ ایک دلچسپ قصہ ہے جس میں سیر و سیاحت اور گل بکاؤلی کی وضع کے عناصر موجود ہیں۔ ۱۰۳۵ھ میں مُلا غواصی نے مثنوی کی بحر میں لکھا تھا، جسے اب میر سعادت علی صاحب رضوی نے مرتب کر کے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اِن پانچوں کتابوں کی لکھائی اور چھپائی میں خاص اہتمام کیا گیا ہے، کاغذ بھی عمدہ اور قیمتی لگایا گیا ہے۔ پانچوں کتابیں بڑی تقطیع کی ہیں اور خاصی ضخامت رکھتی ہیں۔ شائقین سب دس کتاب گھر [illegible] سید [illegible] سے طلب کریں۔

گرام سُدھار

ترقی دیہات کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن [illegible] کی کتاب بھی اسی طرز کی ایک کتاب ہے جس میں مختلف عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً کسان کا گھر، کسان [illegible] کسان اور ساہوکار، کسان اور حکومت گاؤں میں [illegible] کسان کو کیا کرنا چاہیے۔ حکومت اور کسان کے تعلقات کے سلسلے میں بہت سی مفید باتیں لکھی گئی ہیں۔ اگرچہ فاضل مصنف کا طرز بیان سہل اور عام فہم ہے مگر بعض بعض جگہ کسی قدر اُلجھ گیا ہے امید ہے کہ پروفیسر عبد الشکور صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی، بریلی کالج جو اس کتاب کے مصنف ہیں، آئندہ اڈیشن میں انھیں صاف کر دیں گے۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت صرف چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ مہتمم اسلامیہ گرلس ہائی اسکول بریلی۔

ضروری باتیں

اِس چھوٹے سے رسالے میں مولوی عبد الشکور صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی، بریلی کالج نے کسانوں کے فائدے کے لئے صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کے تمام جغرافیائی اور تاریخی و اقتصادی حالات عام فہم زبان میں مختصراً بیان کر دیئے ہیں اور دو نقشے بھی دیئے ہیں۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، حجم سولہ جزو۔ قیمت [illegible] ملنے کا پتہ [illegible] ہائی اسکول بریلی۔

عصمت کی کہانی

اِس چھوٹے سے پمفلٹ میں دہلی کے مشہور زنانہ رسالہ "عصمت" کی اٹھائیس سالہ تاریخ بیان کی گئی ہے۔
لکھائی چھپائی کاغذ [illegible] صفحہ۔ قیمت۔ آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ [illegible] دہلی

لطفِ سخن

شمیم۔ خواجہ عبداللطیف صاحب بھیروی

وہ آئے تو دنیا ہی دل کی بدل دی — گئے تو پھرے گھر میں ویرانیاں ہیں
یہ طوفانِ جلوہ، یہ جذبِ تجلّے — نہ جوشش نظر ہے نہ حیرانیاں ہیں
وہ قاتلِ نفس پہ پشیماں ادھر ہیں — ادھر میرے در پے گراں جانیاں ہیں
شمیم اس جوانی میں پینے سے توبہ — بد اندیشیاں ہیں یہ نادانیاں ہیں

صابر۔ مسٹر اے بی۔ فلپس اکبرآبادی

ناخدا اپنے سفینے کا اگر دل ہو جائے — موجِ طوفاں جو اُٹھے دامنِ ساحل ہو جائے
[illegible] دل ہو جائے — او ستمگار مرا دل جو ترا دل ہو جائے
آشنا اپنی [illegible] دل ہو جائے — خود بخود اُٹھ کے الگ پردۂ حائل ہو جائے
ذرے سب حسن کی گرد [illegible] — جس کو دامن میں اُٹھا لوں وہ مراحل ہو جائے
شوق میں صورتِ تسکیں ہے [illegible] — [illegible] جو اندازۂ منزل ہو جائے
حسرتیں جمع ہوں میری تو بنے اُن کی شبیہ — اُن کے جلوے [illegible]
جب پریشان خیالات کی تصویروں کو — اِک قرینے سے سجا دیجئے محفل ہو جائے
ایک آشوبِ مسلسل ہے یہ دنیا ساری — صبر فطرت میں نہ شامل ہو تو مشکل ہو جائے

[illegible] سید محمد عسکری طباطبائی، بی اے جنت شہر

ہو دل تو دردِ مجسم، نظر گلا نہ کرے — کسی غریب پہ یوں آ بنے، خدا نہ کرے
وہ دل کہ [illegible] دل مرا کہا نہ کرے — مجھے کسی سے کسی کی غرض، خدا نہ کرے
جنونِ عشق کی معصوم حسرتیں، توبہ! — وہ منتیں کریں، دل عرضِ مدعا نہ کرے
نگاہِ ناز [illegible] سلسلہ جنباں — تو کون ہوگا جو تجدیدِ مدعا نہ کرے
کسی کے [illegible] کی سحر ہو جائے — خدا کرے کہ مری زندگی وفا نہ کرے
شبِ فراق [illegible] گئے — کسی کا کوئی محبت میں آسرا نہ کرے

ظفر۔ جناب شیخ محمد یوسف صاحب، بی۔ اے۔

وہ یاد آگئے تو قیامت ہی ڈھا گئے
ہم زندگی میں موت کا احساں اٹھا گئے

جن کو نہ تھیں قبول [illegible] عالم کی وسعتیں
لو! وہ سمٹ کے میری نگاہوں میں آگئے

ممنون ہوں کہ عہدِ جنوں میں مرے لئے
تم میرے ساتھ ساتھ، جہاں بھی گیا، گئے

اللہ رے اہتمام کہ ہلنے دیئے نہ لب
وہ رازِ عشق چاکِ گریباں سے پا گئے

کچھ مسکرا کے، کچھ نگہِ شرمگیں کے ساتھ
اپنا بنا گئے، مجھے اپنا بنا گئے

گیسو کھلے تو کھول دیا عقدۂ حیات
نظریں ملیں تو رازِ دو عالم بتا گئے

یہ دن شباب کے ہیں ظفر، دن شباب کے
وہ آج آگئے تو یہ سمجھیں گے آ گئے

فطرت۔ جناب ایم۔ عبدالعزیز صاحب۔ راولپنڈی

دفعتہً چاک ہر اک پردۂ حائل ہونا
تیری محفل کا مرے شوق کی منزل ہونا

رنگِ غم کا مرے ہر اشک میں شامل ہونا
بننا قطروں کا گہر، اور ترے قابل ہونا

حسن کی کم نگہی پر بھی ہے یہ عشق کا حال
دل کے ہر داغ [illegible]

کتنی احساس فزا تھی تری محفل کی فضا
ذرے ذرے [illegible] دل ہونا

رفتہ رفتہ ترے چہرے سے سرکنا پردہ
ہوتے ہی [illegible] کا مہ کامل ہونا

جز کے دل میں ہے نہاں کل کی تمنا [illegible]
[illegible] خورشید سے واصل ہونا

[illegible]۔ جناب فطرت واسطی۔ فیض آباد

آتا ہوں تیرے دیر کا ارماں لیئے ہوئے
عزمِ نظر ہے، ذوقِ بہاراں لئے ہوئے

لو دے رہے ہیں داغ بھی دل میں خدا گواہ
تاریکیاں ہیں بزمِ چراغاں لئے ہوئے

میں بے سکت ہوں پھر بھی مری عظمتیں نہ پوچھ
ہر ہر قدم ہے گردشِ دوراں لئے ہوئے

کاظمی۔ جناب سید فضل الحسن شفقت کاظمی

(۱)

عجب اک رنگِ مایوسی مرے رخ سے جھلکتا ہے
نگاہِ یار کو بھی جس کے تقاضے سے سکتا ہے

نہیں بدلی ہے اب تک انتظارِ شوق کی حالت
ہجومِ نامرادی میں بھی تیری راہ تکتا ہے

کبھی روشن کیا تھا جس کو تیری خوش جمالی نے
وہ شعلہ آج بھی اپنے کلیجے میں بھڑکتا ہے

وہ جب اپنے کسی پابند کو آزاد کرتے ہیں
خدا جانے کہ پہروں تک دل اپنا کیوں دھڑکتا ہے

کہوں کیا اُس نگاہِ سحر زا کی کارفرمائی
کہ اب دل کی جگہ پر ایک [illegible]

شب کو تو بیٹھے ہو سُنیں رو دادِ غمِ اپنی | اگر وہ کاظمی کہہ
دامنِ ضبطِ محبت ہاتھ سے جانے لگا | (۲) پھر ترے روزِ جدائی
اے مری رسوائیوں سے تھی بہت تجھ کو خوشی | ہر زباں پر تذکرہ ہے شباب
حسن کی حسرت نگاہی نے لئے کیا کیا قدم | اُٹھ کے اُس محفل سے جب مجبور میں جانے
شوق کی مایوسیاں آخر کو آڑے آگئیں | وہ تو وہ اب غیر بھی مجھ پر ترس کھانے لگا
کاظمی پاکر مجھے مجبورِ آئینِ وفا | اور بھی وہ شوخ مشقِ ناز فرمانے لگا

گوہر۔ جناب ڈگمبر پرشاد صاحب دہلی

ہنستے ہوئے بہار کی صورت گزر گئے | دامن ہمارا پھولوں سے آ کر وہ بھر گئے
دل لے کے کیا غرض انھیں کیوں ہم کلام ہوں | جو وار کرنے والے تھے وہ وار کر گئے
بدلی سی چھا گئی دلِ امیدوار پر | گیسو جو رخ پہ آپ کے کھل کر بکھر گئے
مایوس کو خبر نہیں گوہر بہار کی | جھونکے نسیم کے کدھر آئے کدھر گئے

مسیح۔ جناب مسیح الدین صاحب بمبئی

... وہ کے ... انتظار کیوں؟ | مٹ مٹ کے بن رہا ہے دلِ بیقرار کیوں؟
کیفِ نظر پیامبر ... ہے! | لذت فزائے غم ہوا ہر بہار کیوں؟
غارت گر شباب ... | ... ہی ہے پھر مجھے فصلِ بہار کیوں؟
گم کردۂ فریب ہے ارمانِ ... | ... کیوں؟
کیا آگئے بہار کے دن آج کل مسیح | پھر سوئے دشت جاتے ہو دیوانہ وار کیوں؟

... جناب جگدیش پرشاد ناشر۔ مراد آبادی۔ ایم اے۔

نہ پونچھو تم شبِ غم میرے آنسو اپنے داماں سے | حیا کا خون کھنچتا ہے محبت کے رگِ جاں سے
نظامِ کائنات ... برہم ہونے والا ہے | جبینِ ناز پر ہیں آج گیسو کچھ پریشاں سے
خزاں کا خوف ... آشیاں ... صیاد کا کھٹکا | یہی پابندیاں ہیں تو قفس اچھا گلستاں سے
کہیں ایسے دیار ... آزاد ہوتے ہیں | ... ان کو ان ان سے
... جاتا ہے ... حسرت | ... ہوگیا دشوار ملنا ایک ان ان سے

... ۔ حضرت ... نگاہی ... بدایونی

... ہے مجھ سے | وہ ... ہیں

[illegible] — [illegible]

[illegible] کے [illegible] سے بولے — نگاہِ محبت کے قابل نہیں ہے
[illegible] عشق جفا میں — ستم سے کسی وقت غافل نہیں ہے
[illegible] وقت کاٹیں — یہ محفل تمھاری وہ محفل نہیں ہے
[illegible]ت کا مدعی ہے نظامی — گدا اگر نہیں ہے وہ سائل نہیں ہے

وجد - جناب سکندر علی صاحب ساد دکن

دردِ دل کو باعثِ آرامِ جاں سمجھا تھا میں — برقِ گلشن کو چراغِ آشیاں سمجھا تھا میں
یاس کی شدت نے دنیا ہی بدل ڈالی مری — عیش کو اب تک نصیبِ دشمناں سمجھا تھا میں
دل بہا اشکوں میں کیا اس کی خبر تک بھی نہیں — خون کے قطرے کو بحرِ بیکراں سمجھا تھا میں
یاد ہیں وہ دن چڑھا تھا نشۂ رنگِ بہار — بیخودی یہ تھی قفس کو گلستاں سمجھا تھا میں
قافلہ ہے اور نہ وہ محمل نہ وہ محمل نشیں — وجد اگردِ کارواں کو کارواں سمجھا تھا میں

مائل - جناب ایشور چند سیٹھ غازی آباد

میں اک مایوس ہستی ہوں بنا کام تمنا ہوں — زمانے سے نرالی اپنی [illegible]
میں اک اعجاز حسن و عشق کا اسکو سمجھتا ہوں — وہ ہیں میری تمنا اور [illegible]تا ہوں
دلِ بیتاب میں اب اور گنجائش کہاں باقی — تمہاری یاد [illegible] تمہارا درد رکھتا ہوں
خدا کیواسطے اس کو بھی اب لے لیجئے مجھ سے — جو اتنا [illegible] معروف تمنا ہوں
مجھے کس بزم میں [illegible] ہوں نہ خود بھی بیٹھ سکتا ہوں

(۲)

جلوے ترے اس دل میں اے کاش نہاں ہوتے — ہم کس لیئے راتوں میں معروفِ فغاں ہوتے
جب لطف سمجھتا میں اس طرح اگر ملتے — میں اُن میں چھپا ہوتا وہ مجھ میں نہاں ہوتے
اے کاش جھلک اُٹھتی آرائشِ جزو و کل — میں تم سے عیاں ہوتا تم مجھ سے عیاں ہوتے
شاید کہ پہونچ جاتا منزل پہ کبھی اپنی — ذرّے مری ہستی کے گر ریگِ رواں ہوتے
اک کعبہ سمجھتا ہوں ہر نقشِ قدم اُن کا — پھر اُس پہ یہ خواہش ہے کچھ اور نشاں ہوتے
تم خود نہ دکھا دیتے جلووں کو اگر اپنے — وہ لاکھ چھپانے پر تم سے نہ نہاں ہوتے
اچھا ہوا محشر میں تم دور رہے مجھ سے — میں چپ نہ کبھی رہتا یوں [illegible] ہوتے
تم چاہے جہاں رہتے ہاں چاندنی راتوں میں — خاموش اندھیری میں مائل کے یہاں ہوتے

THE ZAMANA, FEB. 1941 REGD No. A

زمانہ

مرتبہ:۔ دیا نراین نگم

نمبر ۲	فروری ۱۹۴۱ء	جلد ۷۶

فہرست مضامین

تصویر۔ پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا



ت دھارا فارمیسی کے

سالانہ
بیسویں جلسہ

خوشی میں

مارچ

ی آخری رعایت یعنی

ت دھارا اور اسکے ۲۲ مرکبات امرت کایا کلپ ۳/۴ قیمت پر اور

ام ادویات و طبی کتب نصف قیمت پر دی جاوینگی

صاحب اس رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں بہت جلد ایک کارڈ لکھکر

رعایتی فہرست

جسمیں سب باتیں مفصل لکھدی ہیں ابھی کارڈ لکھدیں ایسی رعایت پھر کبھی ہوگی یاد رہے

پتہ:۔ امرت دھارا نمبر ۱۴ لاہور

منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

No 327

STATISTICS

اعداد و شمار

ایک امریکن اخبار والے کو اس قسم کے اعداد و شمار جمع کرنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے جنھیں دیکھکر بعض تو حیرت زدہ ہوکر رہجاتے ہیں اور بعض لطف اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ شخص مذکور لکھتا ہے۔

نہر پنامہ کھودنے میں جتنی مٹی نکالی گئی ہے اسی سے ایک دیوار اتنی اونچی اور اتنی چوڑی بن سکتی ہے جتنی کہ چین کی قدیم دیوار اعظم ہے اور یہ دیوار اتنی لمبی ہوگی کہ سان فرانسسکو سے شروع ہوکر نیویارک جاکر ختم ہوگی اس مٹی کا اگر ایک پرامڈ بھی بنایا جائے تو وہ چار ہزار دو سو فٹ یعنی ۴/۵ میل اونچا ہوگا۔ اور اس کی بلندی کے آگے یادگار واشنگٹن اور وہائٹ ہاؤس، دفتر خارجیہ، جنگ بحریات اور خزانہ کی تمام عمارتیں پہنچ جائینگی۔ اسی سلسلے میں شخص مذکور لکھتا ہے کہ چھ سال کے اندر نہر پنامہ پر کام کرنیوالوں میں پندرہ ہزار پونڈ کونین مفت تقسیم کیجا چکی ہے جسکا اوسط دو ہزار پونڈ سالانہ بیٹھتا ہے اس میں مبالغہ نہیں ہوسکتا کیونکہ جنرل گورگاس جو پناما میں ریاستہائے میں محکمہ حفظان صحت کے انچارج تھے کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میں وہ نہر پنامہ کھودنے والے مزدوروں کو کونین کی چالیس ہزار خوراکیں روزانہ تقسیم کیا کرتے تھے اور اسی کے طفیل اہل امریکہ کو نہر مذکور کے تعمیر کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ کیونکہ اس کے قبل کہ اتنا بڑا کام مچھروں کی وجہ سے پاک کیا جا سکے۔ کونین ہی نے ملیریا کو قابو میں رکھا تھا۔ اس زمانہ سے اب تک بہت سے گرم ملکوں میں کونین بڑے بڑے کاموں کی تکمیل میں مدد دے چکی ہے۔ کیوں کہ یہ قدیم اکسیر انسداد و دفعیہ ملیریا کے لئے دنیا بھر میں مسلمہ دوا ہے۔ حتیٰ کہ مجلس اقوام نے بھی سرکاری طور پر اس دوا کی تعریف کی ہے۔ جنیوا کے لیگ اقوام ملیریا کمیشن نے جس میں علاج و انسداد ملیریا کے بڑے بڑے ماہرین شامل ہیں، کونین کے ذریعہ سے مختصر علاج تجویز کیا ہے۔ جس میں صرف پانچ سات روز تک پندرہ بیس گرین تک کونین روزانہ کھانی پڑتی ہے۔ جو ملیریا کے اکثر مریضوں کو یقیناً اچھا کر دیگی لیکن جیسا کہ جنرل گورگاس نے پنامہ میں کیا تھا۔ علاج سے ملیریا کی انسداد بہتر ہے جس کے لئے چھ گرین کونین روزانہ استعمال کرنا چاہیئے۔ لیگ اقوام کے ملیریا کمیشن نے اپنی رپورٹ بابتہ ۱۹۲۷ء کے صفحہ ۱۴۴ پر زور دیا ہے کہ بے ضرر ہونیکی وجہ کونین کو اسپتال کا ماتحت عملہ بھی ڈاکٹر صاحب کی نگرانی کے بغیر کھلا سکتا ہے۔ مگر دوسرے مرکبات کے لئے ڈاکٹر صاحب کی نگرانی کی ضرورت ہے۔



بجھی ہوئی جوانی کا جذبہ پر کیف ہیجان
معجون شباب آور (رجسٹرڈ)

نادر نایاب، شاہنشاہ، معرکۃ الآرا، سرتاج حکمی علاج، گوہر نایاب، کمزوروں کا سہارا، طاقت کا بیمہ، شستہ دوا کون سا لفظ باقی ہے، جو نامردی کے مایوس مریضوں نے

معجون شباب آور کی تعریف میں استعمال نہیں کیا

کثرت جماع، افسوسناک غلط کاریوں ضعیفی اور از حد دماغی محنت سے

یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے

ہزاروں عقلمند اصحاب جو روپے کو روپیہ سمجھتے ہیں، اور اسے برباد کرنا نہیں چاہتے، جو وقت کو قیمتی سمجھتے ہیں، اور جلد اچھا ہونا چاہتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ علاج پیچیدہ ہے، جو بازاری دوا خانوں اور ایسے دوا خانوں سے، جہاں اچھا مال تیار کرنیکی نسبت، روپیہ حاصل کرنے پر زیادہ توجہ کیجاتی ہے، پرہیز کرتے ہیں ہمدرد کی مشہور عالم معجون شباب آور استعمال فرماتے ہیں

معجون شباب آور سے پر کیف ہیجان، اور جوانی کا جذبہ پورے جوش کے ساتھ ابل پڑتا ہے

اس کی ایک ایک رتی موتیوں سے تولنے کے قابل ہے۔

اگر خاص لخاص امرا، اور رؤسا کے لائق، قوت باہ کو چوبالا کرنیوالی، بڑے بڑے نشہ زوروں کو مات کرنیوالی، برقی قوت پیدا کرنے والی جادو اثر دوا کی ضرورت ہے۔ تو معجون شباب آور ابھی منگائیے قیمت ۵ تولے کی شیشی پانچ روپیہ۔ نمونے کی شیشی ایک روپیہ

نوٹ:۔ کانپور میں آپ کو یہ معجون اور اسکے علاوہ اور دوسری پیٹنٹ دوائیں ایجنسی ہمدرد دواخانہ واقع نیا چوک کانپور سے مل سکتی ہیں

ہمدرد کر دواخانہ یونانی دہلی۔

ہاف ٹون عکسی تصاویر

ملک معظم جارج پنجم۔ شہنشاہ جارج ششم مع ملکہ الزبتھ۔ سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم۔ لارڈ اروِن، لارڈ لنلتھگو۔ سر ربندر ناتھ ٹیگور۔ سر صاحب جی مہاراج۔ سر علی امام۔ سر سی۔ وی۔ رمن۔ مسٹر سچدانند سنہا، سوامی دیو دیکانند مولانا محمد علی۔ سالشور چند ودیا ساگر۔ سوامی شردھانند۔ ٹیپو سلطان۔ شہنشاہ اکبر۔ شہنشاہ حبش۔ نادر شاہ۔ شیواجی سورداس۔ عبدالرحیم خانخاناں۔ راجہ مان سنگھ۔ رام داس گرو۔ وقت نزع۔ غسل کی تیاری۔ شیر محمد قوال لیلیٰ مجنون بھکارنی۔ ہمدردی مسیح اور کانٹوں کا تاج۔ ذبح عظیم۔ عشق و زندگی۔ تجلی۔ ہڑتالی مزدور۔ کثرت میں وحدت ماگھ، پھاگن وغیرہ موسمی تصاویر۔ قیمت فی تصویر ـ ۳ ر

منگانے والے حضرات ایک دو تصویریں نہ منگائیں محصول ڈاک علاوہ

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

زمانہ

جلد ۷۶ — فروری سنہ ۱۹۴۱ء — نمبر ۲

چاند بی بی

(از ڈاکٹر ایم۔ حفیظ سید، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی، ڈی، لٹ)

چاند بی بی حسین نظام شاہ والیِ احمد نگر کی بیٹی تھی،[1] (۱۵۵۴-۱۵۶۵) تاریخی حیثیت سے وہ سب سے پہلے جنگ تالی کوٹ کے موقع پر نمایاں ہوئی ہے۔ سلاطین بہمنیہ اور وجے نگر کے ہندو راجاؤں کے درمیان آپس میں ہمیشہ سے نزاع چلی آتی تھی۔ سلطنت کے حصّے بخرے ہو جانے کے بعد جو ریاستیں قائم ہوئیں وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں اس قدر مصروف تھیں کہ وہ اپنے موروثی قدیمی دشمنوں کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکیں۔ ان کی اِن خانہ جنگیوں کی وجہ سے وجے نگر کے ہندو راجہ کبھی ایک فریق کی اور کبھی دوسرے کی مدد کرتے اور اِن لڑائیوں سے پُوری طرح فائدہ اُٹھاتے تھے۔ غرض تقریباً سنہ ۱۵۶۲ء میں وجے نگر کے حکمران رام راجہ کا طرزِ عمل اپنے مسلمان ہمسایوں کے ساتھ[2] اِس قدر توہین آمیز اور ناقابلِ برداشت ہو گیا کہ مسلمانوں نے باہمی اختلافات کو پسِ پُشت ڈال کر اس کو سزا دینے کے لئے ایک سیاسی اتحاد قائم کرنے کا تہیہ کر لیا جس کو مستحکم کرنے کے لئے انھوں نے آپس میں رشتۂ ازدواج قائم کرنا چاہا۔ اِس لئے حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے کر دی اور سون پور کا قلعہ جہیز میں دیدیا۔ اور عادل شاہ کی بہن ہدیہ سلطانہ کی شادی حسین نظام شاہ کے بڑے بیٹے مرتضےٰ سے ہوئی۔ یہ دونوں شادیاں

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۲۰

[2] تاریخ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۲۵

بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔

چاند بی بی کی شادی کے بعد کے حالاتِ زندگی ۱۵۸۰ء تک معلوم نہیں ہیں۔ کزن (Cousen) کا قول ہے کہ نکاح کے بعد ہی وہ اپنے شوہر کے معاملات میں دلچسپی لینے لگی اور بعینہٖ گھر کی طرح میدانِ جنگ میں بھی شوہر کی رفاقت کا حق ادا کرتی رہی۔ علی عادل شاہ کے ساتھ اکثر لڑائیوں میں شرکت کرکے وہ فنونِ جنگ سے بخوبی واقف ہوگئی۔ چنانچہ اس کے شوہر علی کے انتقال کے بعد عادل شاہی حکومت پوشیدہ طور سے اُسی کی ہدایات پر عمل پیرا تھی۔

علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد کامل خاں نے (جو تمام امرا میں ایک ممتاز شخصیت رکھتا تھا) عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور چاند بی بی کو نابالغ بادشاہ ابراہیم ثانی کا سرپرست مقرر کردیا۔ ابراہیم کی عمر اس وقت مشکل سے دس سال تھی، کچھ عرصہ تک کامل خاں نے سلطنت کا کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ لیکن بعد میں وہ مطلق العنان بن بیٹھا۔ اور چاند بی بی کے ساتھ اس کا برتاؤ اچھا نہ رہا۔ کیونکہ اب وہ اس کے ساتھ اُس عزت و وقار سے پیش نہ آتا تھا جس کی وہ مستحق تھی چاند بی بی اپنی ہمت و حوصلہ کے باعث بادشاہ کے قائم مقام کی خودرائی کو کسی طرح گوارا نہ کرسکتی تھی، اس لئے اس نے کامل خاں کو حکومت سے برطرف کردینے کا ارادہ کرلیا، اور کامل خاں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کشور خاں سے جو دربار کا ایک معزز اور با اثر امیر تھا مدد طلب کی۔[1] یہاں پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ کشور خاں خود بھی ملکہ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ملکہ کی سرپرستی اور اُس کی خوشنودی میں اُس کیلئے ترقی کے دروازے کھلتے تھے۔

بہرحال جب کامل خاں کو کشور خاں کی سازش اور اِن ارادوں کا علم ہوا تو اُس نے ملکہ کو ان تمام واقعات سے آگاہ کرکے اپنا پُشت پناہ بنانا چاہا۔ لیکن جب چاند بی بی کے مقربین سے یہ معلوم ہوا کہ کشور خاں کے تمام منصوبے چاند بی بی کی ایما پر منحصر ہیں تو اُس کے ہوش و حواس جاتے رہے اور پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ دارالخلافت سے بھاگ نکلا، لیکن کشور خاں کے آدمیوں نے تعاقب کرکے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔[2]

کشور خاں کی اس کارگزاری کے صلہ میں ملکہ نے اُس کی قائم مقامی کے مطالبہ کی پُرزور تائید کی اُسی کی سرپرستی میں سلطنت کے کل انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور نہایت اطمینان سے مطلق العنہ

---

[1] کہا جاتا ہے کہ چاند بی بی نے کشور خاں کے پاس ایک زنانہ لباس چوڑی سے روئی اور ایک چرخہ بھیجا تھا کہ وہ یا تو کامل خاں کو برطرف کرنے میں مدد دے ورنہ زنانہ لباس پہن کر چرخہ کاتے۔ بساتین السلاطین صفحہ ۱۵۲

[2] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۴۲-۱۴۶ بساتین السلاطین صفحہ ۱۵۳-۱۵۶

ہو کر حکومت شروع کر دی لیکن اس سے کاروبار سلطنت میں کوئی ترقی نہ ہوئی کیونکہ اب چاند بی بی اور دربار کے امراء کو ایک مجہول بادشاہ کے بجائے ایک جابر اور ظالم بادشاہ سے سابقہ پڑا۔ اسی زمانہ میں نظام شاہی فوج سلطنت عادل شاہی کے کچھ سرحدی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھی۔ کشور خاں نے عین الملک گیلانی کو حملہ آوروں کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ حملہ آور مغلوب و پسپا ہو کر بھاگ گئے، اُن کا ڈیرہ، خیمہ، ہاتھی اور توپ خانہ سب مال غنیمت میں شامل کر لیا گیا۔ عین الملک نہایت مسرت اور شادمانی سے فاتحانہ طور پر دارالسلطنت واپس آیا۔ چاند بی بی بہت مسرور ہوئی، اس فتح کی خوشی میں خوب جشن منائے گئے۔ کشور خاں نے ملک کے ایما سے افسران متعلقہ کو امتیازات اور انعامات عطا کئے۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد کشور خاں نے افسرانِ ماتحت کے نام یہ فرمان جاری کیا کہ حال کی جنگ میں جو ہاتھی بطور مال غنیمت ہاتھ آئے ہیں وہ سلطنت کے فیل خانہ میں واپس کر دیئے جائیں یہ فرمان چاند بی بی کے مشورہ کے بغیر جاری کیا گیا تھا[1]۔ ماتحت اُمراء اس سے بہت ناراض ہوئے۔ چنانچہ اُن میں ایک قسم کی شورش اور ہیجان پیدا ہو گیا۔ غالباً یہ واقعہ چاند بی بی کے خلاف مزاج ہوا کہ اس کے اختیارات اس بیدردی سے ٹھکرا دیئے جائیں۔ کچھ امیروں نے چاہا کہ چاند بی بی کے حضور میں باریابی پا کر کشور خاں کی معزولی کی رائے دیں اور انتظام سلطنت کے لئے بنکاپور سے مصطفیٰ خاں کو بلانے کی تجویز پیش کریں۔ بعض لوگوں نے اظہار ناراضی کے لئے وجے نگر ہجرت کرنا چاہا تاکہ چاند بی بی اس سے متاثر ہو کر خود ہی کشور خاں کو معزول کر دے[2]۔

مگر جب کشور خاں کو اِن شورش پسند امراء کے ارادوں کا علم ہوا تو اُس نے اس کے دفعیہ کے لئے نہایت چالاکی سے مصطفیٰ خاں کو جسے وہ اپنا حریف سمجھتا تھا قتل کرا دیا۔ اسی مصطفیٰ خاں کے طرفدار دربار کے شورش پسند امراء تھے۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ کشور خاں نے مصطفیٰ خاں کے قتل ہو جانے کی اطلاع اس وقت تک چاند بی بی کو نہ ہونے دی ہو جس وقت تک کہ اس کے ارادے ناتمام ہوں۔ چاند بی بی چاہتی تھی کہ کشور خاں امور سلطنت اور تمام ملکی معاملات میں اس سے صلاح و مشورہ کرے، لیکن کشور خاں ہر شخصی اثر سے بے نیاز ہو کر مطلق العنان حکومت چاہتا تھا۔ چاند بی بی نے مصطفیٰ خاں کے قتل کی خبر سُن کر کھلے الفاظ میں سخت ناپسندیدگی کا اظہار

[1] بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۱ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدار المہام کو کوئی حکم صادر کرنے سے پہلے بیوہ ملکہ سے مشورہ کرنا پڑتا تھا۔

[2] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۴۷-۱۴۶ - بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۱

اظہار کرتے ہوئے کشور خاں کی سختی سے نہمائش کی۔ انھیں وجوہ سے چاند بی بی نے کشور خاں کو تخت سے اُتار دینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اور دارالسلطنت کے اُن تمام اُمرا کی ہمدردی حاصل کرلی جو کشور خاں سے ناخوش تھے۔ کشور خاں چاند بی بی کو دامِ فریب میں لانا چاہتا تھا، اس لئے ہر ممکن طریقہ سے اپنے دلی جذبات پوشیدہ رکھتے ہوئے وہ ملکہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا رہا۔ ایسی حالت میں ملکہ کو بھی شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ کشور خاں نے اپنی حکمت عملی سے پوشیدہ طور پر نوعمر بادشاہ سے کہدیا کہ ملکہ اپنے بھائی سے خفیہ مل گئی ہے اور اُسے بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیئے مدعو کررہی ہے۔ اِس طرح سے اس نے بادشاہ کو دھوکا دیکر دشمن سے سازش کرنے کے الزام میں چاند بی بی کی گرفتاری کے لئے فرمان پر دستخط کرالیئے۔ چنانچہ ملکہ نہایت ذلت اور رسوائی کے ساتھ محل سے نکال دی گئی اور قلعہ میں ایک قیدی کی حیثیت سے رکھی گئی۔ اس چالاکی اور فریب کی وجہ سے کشور خاں ایک حد تک محفوظ ہو کر مطلق العنان حکومت کرنے لگا۔[۵۱]

کشور خاں کے اس فعل سے دارالسلطنت کا ہر متنفس کھلے الفاظ میں ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار صاف صاف کرنے لگا۔ حتیٰ کہ جب اس کی سواری نکلتی تو لوگ "مصطفےٰ خاں کا قاتل اور چاند بی بی کا قید کرنے والا" کہہ کر اُسے لائق تعزیر ٹھہراتے تھے۔ اور حبشی اُمرا نے تو اخلاص خاں کی سرکردگی میں کشور خاں کو تخت سے اُتار دینے کا پکا ارادہ کرلیا۔ انھوں نے کشور خاں کے بھائی اور بیٹے کو شاہ دُرگ میں قید کرکے بیجاپور کا رُخ کیا تاکہ اُس کی سرکوبی کریں۔ لیکن جیسے ہی اس کو اِن واقعات کی خبر مل گئی وہ دارالسلطنت سے بھاگ نکلا۔ پہلے احمد نگر اور پھر گولکنڈا پہنچا۔ جہاں مناسب طریقہ سے اپنے انجام کو پہونچا، اور مصطفےٰ خاں کے حامیوں اور طرفداروں نے اُسے قتل کرڈالا۔[۵۲]

اخلاص خاں نے برسرِ حکومت ہوتے ہی چاند بی بی کو رہا کردیا اور دارالخلافہ میں نہایت احترام کے ساتھ اس کا پُرجوش خیرمقدم کیا گیا۔ اب چاند بی بی دوبارہ نوعمر بادشاہ کی سرپرست اور اتالیق مقرر ہوئی۔[۵۳] غالباً حبشیوں کا عروج اس کے لئے باعثِ تکلیف تھا، اِس لیئے کچھ عرصہ بعد اُس نے اخلاص خاں کو حکومت سے معزول کردیا اور تمام سلطنت کی دیکھ بھال اور اس کا انتظام ابوالحسن کے سپرد کردیا۔[۵۴] لیکن عجیب وغریب اتفاقات اور غیر متوقع واقعات کی وجہ سے (جو تواریخ دکن میں

۵۱ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۴۶-۱۴۷ بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۵-۱۶۶

۵۲ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۴۹-۱۵۰ بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۸-۱۶۷

۵۳ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۵۰ بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۹ ۵۴ بساتین السلاطین صفحہ ۱۸۱-۱۶۹

بکثرت موجود ہیں) اخلاص خاں پھر اپنے حصول مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ حامد خاں اور دلاور خاں کے روش پر دش اُس نے قائم مقام کے دل پر اپنی وفاداری کا سکہ بٹھا دیا۔ قائم مقام کی فرمانبرداری اور اطاعت کے ساتھ ساتھ یہ امورِ سلطنت میں بھی اُس کی مدد کرنے لگا۔ اِن تینوں سرداروں نے مل کر بہت جلد ابوالحسن کو قید کرکے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔[1]

اخلاص خاں نے اپنے متقدمین کے مقابلہ میں کچھ بہتر حکومت نہ کی، اس نے حامد خاں اور دلاور خاں کی مدد سے اپنا ایک گروہ علٰحدہ بنالیا اور روزمرّہ کے مُلکی معاملات سے دلچسپی نہ رکھتے ہوئے اور اُن سے بے نیاز ہوکر اپنے ذاتی مفاد کے لئے انتظام حکومت آپس میں تقسیم کرلیا۔ اسی اثنا میں احمد نگر اور گولکنڈہ کی ہمسایہ ریاستوں نے عادل شاہی سلطنت پر غاصبانہ حملہ کیا کہ ممکن ہے کچھ مقبوضات ہاتھ آجائیں۔ لیکن ان کو دلاور خاں نے شکست فاش دی۔ اس غیر متوقع فتح سے دلاور خاں کی ہمت اور بڑھ گئی۔ حکمرانی کی ہوس میں پھنس کر اُس نے حکمت عملی سے اپنے دونوں ساتھیوں کو گرفتار کرلیا۔ اور چاند بی بی کے تمام اختیارات سلب کرلیے۔ فرشتہ کا قول ہے کہ "چاند بی بی کے اختیارات اس قدر محدود ہوگئے تھے کہ کوئی درباری اُس کے احکام کی پروا نہ کرتا تھا۔" دلاور خاں نے آٹھ سال تک مطلق العنان ہوکر آزادانہ حکومت کی۔ اِس امر کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اس اثنا میں اُس نے مُلک کی فلاح و بہبودی کے لئے حتی الامکان کسی قسم کی کوئی کوشش سے دریغ نہ کیا۔[2]

دلاور خاں نے بیجاپور اور احمد نگر کے تعلقات استوار کرنے کے لئے اُسی پُرانے طریقے کی بنا پر آپس میں رشتۂ ازدواج قائم کرنا چاہا۔ اُس نے احمد نگر اور مرتضیٰ نظام شاہ نے اُس کے جواب میں بیجاپور اپنے اپنے سفیر روانہ کئے۔ اس طرح سے دلاور خاں کے لڑکے میراں حسین کی شادی بہت شان و شوکت سے شاہ احمد نگر کی بہن خدیجہ سلطان سے ہوگئی۔ چاند بی بی بھی شہزادی کے ہمراہ اپنے بھائی سے ملنے آگئی۔ غالباً چاند بی بی کے احمد نگر چلے آنے کی وجہ یہ تھی کہ بیجاپور میں اب اُس کا اقتدار ختم ہوچکا تھا اور وہاں اُسے کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا۔ دلاور خاں کی قائم مقامی میں گزشتہ عظمت و حکومت بالکل باقی نہ رہی تھی اور امورِ مملکت اور سلطنت کے معاملات میں اسے کسی قسم کا کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔[3]

احمد نگر اب بالکل تبدیل ہوگیا، معلوم ہوتا ہے کہ چاند بی بی اپنے بھتیجے میراں حسین نظام شاہ کے دورِ حکومت ہی میں گوشہ نشین ہوگئی تھی۔ میراں حسین کے مختصر عہد حکومت کے بعد احمد نگر میں شورش پھیلی

---

[1] بساتین السلاطین ص۱۸۱-۱۷۹

[2] فرشتہ جلد سوم ص۱۵۱-۱۵۰ بساتین السلاطین ص۱۹۱-۱۷۹

[3] فرشتہ جلد سوم ص۲۶۳-۱۵۰ بساتین السلاطین ص۱۹۳-۱۹۱

اُسی میں بادشاہ مارا گیا - ایک مہدوی امیر جمال خاں نامی اسماعیل نظام شاہ کو تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہوگیا اور بیجاپور سے برسرپیکار رہا۔ آخر کار آپس میں صلح ہوگئی اور یہ طے پایا کہ چاند بی بی بیجاپور بھیجدی جائے۔ لیکن تاریخ سے کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ بیجاپور گئی ہو۔

جمال خاں کے انتقال کے بعد اسماعیل کے باپ برہان نظام شاہ اول نے اپنے بیٹے اسماعیل کو تخت سے اُتار دیا اور خود چار ماہ سولہ دن حکومت کرکے مئی ۱۵۹۵ء میں راہی ملک عدم ہوا۔ اُس کی وفات کے بعد اس کا دوسرا بیٹا ابراہیم تخت نشین ہوا، اس نے اپنے باپ کے اتالیق میاں منجو کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد ابراہیم بیجاپوریوں کے خلاف ایک جنگ میں کام آیا اور سلطنت میں بدامنی پھیل گئی۔

اس بدامنی سے فائدہ اُٹھاکر مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے اُمیدوار تخت سلطنت کے لئے کھڑے کر دیئے۔ حبشیوں نے چاند بی بی کی حمایت کی جو سابق بادشاہ کی چچی تھی۔ اور یہ تجویز پیش کی کہ اس کی قائم مقامی میں بادشاہ سابق کے اکلوتے شیر خوار بچے بہادر کو بادشاہ بنایا جائے۔ لیکن میاں منجو جو اس وقت معاملات کی ترجمانی میں سرگروہ تھے احمد کے طرفدار تھے جو بادشاہ طاہر کا بیٹا بنایا جاتا تھا۔ (فرشتہ کا قول ہے کہ اس سے قبل یہ لڑکا دولت آباد میں قید تھا) میاں منجو اس لڑکے کو شاہی خاندان کا ایک فرد بتاتے ہوئے اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ اگست ۱۵۹۵ء میں اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔ بہادر نامی شیر خوار دعویدار اپنی چچی کے پاس سے علحدہ کرکے قلعہ جاؤنہ بھیج دیا گیا۔[۳] اگرچہ عام طور سے یہ بات پہلے ہی سے مشہور تھی کہ احمد شاہی خاندان سے نہیں ہے لیکن اب واضح طور سے ثابت ہوگیا۔ اخلاص خاں کو جب ان واقعات کا علم ہوا تو اُسے نہایت افسوس ہوا کہ اس نے ایسے شخص کی تخت نشینی کے لئے کیوں اپنی رضامندی کا اظہار کیا اب اس نے بالکل علحدہ ایک تیسرے شخص مطیع کو تخت سلطنت کا مدعی بنایا۔ اس موقع پر میاں منجو نے مغلوں کو اپنی امداد کے لئے طلب کیا۔ یہ میاں منجو کی ناقابل تلافی غلطی تھی۔[۴]

شہزادہ مراد نے جو دکن پر حملہ کرنے کے لئے موقع کا منتظر تھا نہایت خوشی سے میاں منجو کی دعوت قبول کی۔ اور خانخاناں اور راجہ علی خاں والی خاندیش کے ہمراہ مغلوں اور راجپوتوں

۱؎ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۲۹۶

۲؎ اس سے تائید ہوتی ہے کہ چاند بی بی بیجاپور نہیں گئی۔　صفحہ ۱۹۱۔

۳؎ برہان　J. A.　جلد سوم صفحہ ۲۹۵　فرشتہ جلد سوم صفحہ ۲۹۳　گرگل جلد اول صفحہ ۲۳۲۔

۴؎ برہان　فرشتہ جلد سوم صفحہ ۲۹۶

کی ایک کثیر فوج لے کر دسمبر ۱۵۹۵ء میں احمد نگر کے قریب پہونچا۔ میاں منجو جو اس درمیان میں حبشیوں پر فوقیت حاصل کر چکے تھے اور اپنے حسب منشا تمام معاملات بھی تقریباً طے کر چکے تھے، مغلوں سے گفتگو کر کے بہت متاسف اور نادم ہوئے۔ لیکن اب ان کی ندامت بعد از وقت تھی۔ پھر بھی میاں منجو نے دارالسلطنت کی حفاظت کے لئے تیاری کی، رسد کا انتظام کر کے انصار خاں کو دارالخلافہ میں اپنا نائب اور چاند بی بی کو قائم مقام کر کے انسا کی راہ لی تاکہ بیجاپور اور گولکنڈہ سے فوجی امداد طلب کرے۔ اپنے ساتھ اس نے نوعمر بادشاہ کو بھی لے لیا[۵۱]۔ میاں منجو کے روانہ ہوتے ہی چاند بی بی نے فوج کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی، اور انصار خاں کو قتل کرا دیا۔ رعایا کی وحشت اور خوف وہراس کو دور کرنے کے لئے خود قلعہ کے برج پر چڑھ گئی، چتر شاہی اس کے سر پر رکھا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آفتاب اپنی تابانی کے عالم میں تمام دنیا کو منور کر رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی تمام امراء، سردار، شہر کی ادنی و اعلی کل رعایا نے صدائے قومی بلند کی، اور اس کی توقیر و تعظیم کا اظہار کیا[۵۲] ہی نہیں بلکہ عملی طور سے تمام اہل شہر متفق ہو کر اس کی مدد کے لئے دل و جان سے تیار ہو گئے۔ اور ہر شخص اس کی حمایت اور طرفداری میں رطب اللسان تھا۔

غرض اس طرح سے چاند بی بی نے بہادر شاہ کو جو جاؤنہ میں مقید[۵۳] تھا احمد نگر کا بادشاہ بنا دیا۔

چاند بی بی حبشیوں سے سلسلۂ مراسلت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے اہنگ خاں کو قلعہ کی فوری مدد کے لئے طلب کیا۔ آہنگ خاں نے زبردستی راستہ نکالنا چاہا، لیکن مغلوں نے اُسے پسپا کر دیا اور شکست فاش دی۔ ابہنگ خاں اندھیری رات میں چند چیدہ اور تجربہ کار سواروں کو ہمراہ لے کر قلعہ میں داخل ہو گیا۔ اِس تھوڑی سی مدد نے اہل قلعہ میں ایک تازہ روح پھونک دی اُن کی ہمت اس قدر بلند اور حوصلہ اس قدر بڑھ گیا کہ وہ محاصرہ کا سختی سے مقابلہ کرتے رہے۔

دو ماہ کے طویل اور خاموش محاصرے کے بعد ۲۔ مارچ ۱۵۹۶ء میں مغلوں نے قلعہ کی دیوار میں رخنہ اندازی شروع کر دی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ یہ دیکھکر اور اس سے خوفزدہ ہو کر مخصوص افسران نے بھاگنے کا مصمم ارادہ کر لیا[۵۴]۔ لیکن برخلاف اس کے چاند بی بی نے نہایت مردانگی سے زرہ پہن، نقاب ڈال، برہنہ شمشیر ہاتھ میں لیکر رخنہ اندازی کی حفاظت کے لئے وہاں آموجود ہوئی۔ اِس دلیری اور مردانگی نے اہل قلعہ کے حوصلوں اور اُن کی ہمتوں کو اور بڑھا دیا

۵۱ برہان کہتا ہے کہ احمد خود بھاگ گیا اور میاں منجو نے بھی یہی کیا، دیکھو اکبرنامہ E. D. IV صفحہ ۹۳

۵۲ برہان I. A جلد سوم صفحہ ۲۹۹

۵۳ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۲۹۸ سے ۲۹۷ برہان جلد سوم صفحہ ۲۹

۵۴ برہان کے خیال سے یہ غلط ہے، اس میں شک نہیں کہ افسران خوفزدہ ضرور ہو گئے تھے مگر وہ مدافعت پر تیار تھے اور چاند بی بی کے شریف ہونے سے بہت کچھ ان کی ہمت افزائی ہو گئی تھی۔ برہان I. A جلد سوم صفحہ ۳۲۹ - ۳۳۰

اور سب کے سب متفق ہوکر اس کی مدد کرنے اور اس کا ساتھ دینے کے لئے ہر ممکن طریقہ سے آمادہ ہوگئے۔ اس موقعہ پر یہ بتلا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ چاند بی بی اپنے ہمراہ تھوڑا سا زہر بھی لائی تھی کہ اگر خدانخواستہ قلعہ ہاتھ سے جاتا رہا تو وہ زہر کھاکر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلے گی۔[۵]

آخر کار دن کے آخری چار گھنٹوں میں غروب آفتاب تک برابر لڑائی ہوتی رہی اور غنیم کو بغیر کسی نتیجہ پر پہونچے ہوئے پسپا ہونا پڑا۔ لیکن پھر بھی چاند بی بی اپنی جگہ سے نہ ہٹی اور اپنی موجودگی میں معماروں کو بلاکر راتوں رات قلعہ کی دیوار پتھر سے تیار کرادی۔ اس طرح سے رخنے بند کردئے گئے اس کے بعد چاند بی بی فوجی رسالوں کو ضروری ہدایات کرکے اپنے جائے قیام پر واپس آئی۔

دوسرے دن غنیم نے پھر حملہ کیا لیکن ناکام رہا۔ محصورین نے نہایت بہادری سے اُس کا مقابلہ کیا۔ مغل فوجیں رسد کی کمی کی وجہ سے پریشان تھیں اور محصورین سے کافی نقصان اور تکلیف برداشت کرچکی تھیں۔ اس لئے مغلوں نے نظام شاہی افسروں کو ورغلانا اور برانگیختہ کرنا چاہا۔ لیکن چاند بی بی کی عدیم المثال شخصیت کی وجہ سے ان کی کوششیں بے اثر اور ناکام ثابت ہوئیں۔ اسی اثنا میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی متحدہ فوجیں احمد نگر کی مدد کے لئے آرہی ہیں۔ بالآخر مجبور ہوکر مغلوں نے صلح کے لئے گفت وشنید کی۔ صلح کا پیغام کیا آیا گویا محصورین کی منہ مانگی مراد برآئی۔ صلح کے شرائط میں مغلوں نے برار کا صوبہ بھی طلب کیا، پہلے تو چاند بی بی نے اس شرط کے ماننے سے صاف انکار کردیا، لیکن پھر غور وخوض کے بعد آمادہ ہوگئی، کہ ممکن ہے متحدہ کمک جو احمد نگر کی مدد کے لئے آرہی ہے پسپا ہوجائے اور پھر یہ شرائط بھی ہاتھ نہ آئیں۔ اس لیے اُس نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور ۲۳۔ مارچ ۱۵۹۶ء کو صلح نامہ پر بادشاہ کی جانب سے دستخط کردیئے اور مغل واپس گئے۔[۶]

مغلوں کی واپسی کے بعد میاں منجو کو یہ امید تھی کہ ان کا آوردہ احمد بادشاہ تسلیم کرلیا جائیگا لیکن اہنگ خاں اور چاند بی بی کے موافق دوسرے اُمراء نے اِس سے انکار کردیا، قلعہ کے دروازے بند کردیئے اور فوج کا ایک دستہ بہادر شاہ کی حفاظت اور اس کو قلعہ چونہ سے لانے کے لیے روانہ کیا۔ اس فعل سے احمد نگر میں ایک زبردست خانہ جنگی کے ہونے کا پھر احتمال تھا۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ نے جسے چاند بی بی نے بحیثیت ایک شخص ثالث کے مدعو کیا تھا معاملات

---

[۵] برہان صفحہ ۳۴۲-۳۴۹ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۰۱-۳۰۲

[۶] برہان صفحہ ۳۴۶-۳۴۷ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۰۲-۳۰۳ اکبرنامہ III E.D. صفحہ ۹۴

کو نہایت حسن و خوبی سے رفع دفع کر دیا۔ ابراہیم نے یہ معلوم کر کے کہ احمد نظام شاہی خاندان سے نہیں ہے اُسے ایک جاگیر دے کر علیحدہ کر دیا۔ اور میاں منجو کو اس کی حمایت اور پشت پناہی سے باز رکھا۔ مزید احتیاط کے لئے اس نے میاں منجو کو اپنے اراکین سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس حکمت عملی سے چاند بی بی اپنے دلی مقاصد میں کامیاب ہوئی۔ بہادر شاہ اس کے قبضہ میں آگیا اور احمد نگر کا بادشاہ مقرر ہوا۔ چاند بی بی نے اپنے مشیر خاص محمد خاں کو پیشوا مقرر کیا۔ محمد خاں نے اپنے مخصوص دوستوں اور رفیقوں کو ترقیاں دے کر اور جدید واقعات و حوادث میں اقتدار حاصل کرنے والے اور حصہ لینے والوں کی حق تلفیاں کر کے اپنے کو بہت جلد بدنام کر لیا۔ اس شورش اور فتنہ و فساد کو دفع کرنے کے لئے اس نے حبشیوں کے سردار اہنگ خاں کو قید کر لیا۔

محمد خاں نے مطلق العنان ہو کر چاند بی بی کو بالکل فراموش کر دیا۔ چاند بی بی نے اپنی حق تلفی کا احساس کر کے ابراہیم عادل شاہ کو اپنی مدد کے لئے بلایا تاکہ محمد خاں معزول کر دیا جائے۔ ابراہیم عادل شاہ نے سہیل خاں کو چاند بی بی کے احکام کی پوری طور سے تعمیل کرنے کے لئے احمد نگر بھیجا[۵۵]۔

محمد خاں آسانی سے مغصوب تخت کو دینے والا کب تھا۔ اس نے شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے۔ سہیل خاں چار ماہ تک احمد نگر کا محاصرہ کئے پڑا رہا۔ آخر کار مجبور ہو کر محمد خاں نے مغلوں سے کمک طلب کی اور خانخاناں کو برار سے اپنی مدد کے لئے اس شرط پر بلایا کہ وہ آئندہ سے مغلوں کا باج گزار رہیگا۔ اہل قلعہ کو جب اس سازش کا حال معلوم ہوا تو وہ محمد خاں کو گرفتار کر کے ملکہ کے پاس لے آئے۔ محمد خاں قید کر دیا گیا اور ملکہ نے اہنگ خاں کو قید سے رہا کر کے ملکی معاملات کی دیکھ بھال کے لئے محمد خاں کی جگہ پر مقرر کیا، اور بیجاپوریوں کو اپنے ملک واپس جانے کی اجازت دیدی[۵۶]۔

چاند بی بی صرف احمد نگر پر اپنا سکہ بیٹھانے سے مطمئن نہ تھی بلکہ وہ ان مغلوں کی بھی سرکوبی چاہتی تھی جنھوں نے احمد نگر کی بدامنی سے فائدہ اُٹھا کر برار کے باہر بیٹھری پر قبضہ کرنے کا ارادہ ظاہر کر کے صلح نامہ کی عہد شکنی کا ثبوت دیا تھا۔ ملکہ نے سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کو مغلوں کی اس غارت گری سے مطلع کیا چنانچہ اس خبر کے پاتے ہی ابراہیم عادل شاہ نے سہیل خاں کو برار کی جانب مغلوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے بھی گولکنڈہ سے ایک فوج

---

[۵۵] فرشتہ جلد سوم ص ۳۰۶

[۵۶] فرشتہ جلد سوم ص ۳۰۵ - ۳۰۶

بیجاپوریوں کی مدد کے لئے بھیجی۔ دونوں فوجیں نظام شاہی لشکر کے ساتھ برار کی طرف بڑھیں اور شہر سونپت کے قریب خیمہ زن ہوکر نبرد آزما ہوئیں۔

اس جنگ میں پہلے تو مغل پسپا ہوئے لیکن اپنی خوش قسمتی سے آخرکار فتحیاب ہوگئے۔ اس کے بعد مغل فوجوں میں آپس میں کچھ جھگڑا ہوگیا، خان خاناں واپس بلا لیا گیا، غالباً اسی وجہ سے نظام شاہی سلطنت مغلوں کے فوری حملہ سے محفوظ رہی[۱]۔

جنگ سونپت کے بعد دونوں متحدہ فوجیں اپنی اپنی جگہ واپس گئیں۔ ابہنگ خاں احمدنگر کے وزیر نے دارالسلطنت کی طرف مراجعت کی۔ محمد خاں کی طرح وہ بھی چاند بی بی کی بیخ کنی کے لئے بادشاہ اور ملکہ کو اپنے قبضہ میں لانے کی ترکیب کرنے لگا۔ تاکہ بادشاہ کے سرپرست اور اتالیق کی حیثیت سے اسے تمام اُمورِ سلطنت پر اختیار و اقتدار حاصل ہوجائے۔ چاند بی بی نے اُس کے ارادوں کو محسوس کرکے حکم دیا کہ قلعہ میں رہنے کے بجائے شہر میں رہ کر حکومت کرے اور قلعہ کا دروازہ اس کے لئے بند کرا دیا۔ کچھ عرصہ کی خاموشی کے بعد ابہنگ خاں نے قلعہ پر یکایک حملہ کردیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اس آپس کی خانہ جنگی کو دُور کرنے کے لئے مصالحت کرانی چاہی، لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ ابہنگ خاں قلعہ پر برابر حملے کرتا رہا اور خانخاناں کی دکن میں عدم موجودگی سے بیجا فائدہ اُٹھا کر مغلوں کی اُن حدود سلطنت پر قبضہ کرلیا[۲]۔

شہنشاہ اکبر احمدنگر فتح کرنے پر تلا ہُوا تھا، اُس نے شہزادہ دانیال اور خانخاناں کو احمدنگر روانہ کیا، کیونکہ شہزادہ مراد اس وقت مرچکا تھا، اور خود برہان پور کی طرف بڑھا[۳]۔

ابہنگ خاں نے مغلوں کی آمد کی خبر سُن کر محاصرہ اُٹھا لیا اور ان کے مقابلہ کے لئے بڑھا۔ شہزادہ دانیال نے جاسوسوں سے ابہنگ خاں کی نقل و حرکت کا حال معلوم کرکے اُسے دامِ فریب میں رکھا اس طرح سے دھوکا کھا جانے پر ابہنگ خاں جھنجھلایا اور اُس نے اپنا بہت سا سامان آگ کی نذر کردیا۔ پھر احمدنگر واپس آکر چاند بی بی کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔ چاند بی بی نے پیغام صلح کو نامنظور کرکے سخت غلطی کی، کیونکہ ابہنگ خاں جونار بھاگ گیا اور مغلوں کے لئے راستہ بالکل صاف ہوگیا۔ اپریل سنہ ۱۶۰۰ء میں مغلوں نے احمدنگر کا محاصرہ کرکے سرنگ لگانی شروع کردی[۴]۔

---

[۱] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۰۹-۳۰۴ دیکھو اکبرنامہ E. D. VI صفحہ ۹۶-۹۵ اور Smith صفحہ ۲۷۰

[۲] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۱۰

[۳] اکبرنامہ E. D. VI صفحہ ۱۰۰-۹۹ جلد اول صفحہ ۳۲۶

[۴] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۱۲-۳۱۱

چاند بی بی نے مشورہ کے لئے حامد خاں خواجہ سرا کو بلایا۔ یہ قلعہ کا سربرآوردہ افسر تھا اور اس جنگ میں مر مٹنے کے لئے تیار تھا۔ چاند بی بی نے دیکھا کہ اس محاصرے کا مقابلہ ناممکن ہے، تو اس نے مغلوں سے مصالحت کرنی چاہی[1] تاکہ وہ قلعہ سے محاصرہ اُٹھا لیں اور چاند بی بی نوعمر بادشاہ کے ساتھ جونا چلی جائے۔ اس ارادہ سے باخبر ہوکر حامد خاں نے تمام شہر میں چاند بی بی کے مغلوں سے مل جانے کی خبر مشہور کردی۔ ہر شخص ایک دوسرے سے سرگوشی کرنے لگا کہ چاند بی بی کے تمام سردار شہنشاہی فوج سے مل گئے[2]۔ اس سے دکنی فوجوں میں شبہات پیدا ہوگئے۔ اور غصہ کی آگ بھڑکنے لگی کیونکہ حامد خاں نے عام رعایا اور تمام لوگوں کو بہت بُری طرح سے برانگیختہ کردیا تھا۔ لوگ غصّہ کی حالت میں سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے حامد خاں کی رہنمائی میں محل پر حملہ آور ہوئے۔ ملکہ کو دیوانِ عام میں نہ پاکر سب لوگ محل کے اندر جہاں ملکہ موجود تھی پہونچ گئے۔ اس منظر کے دیکھتے ہی چاند بی بی اپنا انجام سمجھ گئی۔ اُس نے نہایت دلیری سے ان کا مقابلہ کیا اور اُن کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہا، لیکن جوشِ غضب میں لوگوں کی عقلوں پر پردے پڑگئے اور کسی نے اُس کی ایک نہ سُنی، برابر یورش کرتے رہے۔ حامد خاں نے ملکہ پر پہلا وار کیا[3]، پھر وہ بہت جلد زخموں سے چور ہوکر گر پڑی اور اُس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

اس طرح چاند بی بی کی موت انہیں لوگوں کے ہاتھ ہوئی جن کی فلاح و بہبود کے لئے اُس نے ہر امکانی کوشش کی۔ اِس طرح سے ہندوستان کی اِس بہادر، دلیر اور شریف عورت کا خاتمہ ہوا۔

یہ واقعہ غالباً مئی ۱۶۰۰ء کا ہے، چار ماہ چار دن کے محاصرے کے بعد اختتام اگست میں احمد نگر فتح ہوکر دوسروں کے قبضے میں چلا گیا[4]۔

---

[1] ابو الفضل اس کی تائید کرتا ہے "چاند بی بی صلح رکھنا چاہتی تھی ....." اکبر نامہ E. D. VI صفحہ ۱۰۰-۹۹

[2] اکبر نامہ E. D. VI صفحہ ۱۰۰-۹۹

[3] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۱۲[?]

[4] آئین جلد اول صفحہ ۳۳۵ Smith صفحہ ۳۷۵

دو پھول

(از پنڈت آنند نراین ملا، ایم اے، ایل ایل بی)

صبح کو ایک ہی کیاری میں دو گلاب پھول رہے تھے
ایک ہی ڈالی کی پینگوں پر جھولا جھول رہے تھے
ایک ہی رات کے پردہ میں اُترا تھا ہرا دوپٹا
ایک ہی شبنم کی برکھا نے دھویا گورا پنڈا
کلی پنے سے بڑے ہوئے تھے دونوں سنگ ہی سنگ
ایک ہی سورج کی کرنوں نے دیا تھا روپ اور رنگ
ایک ہی مٹی اور پانی سے نازک جسم بنا تھا
ایک ہوا کی گود میں جیون کا سپنا دیکھا تھا
آئی ٹہلنے باغ میں اِک چنچل مدھ ماتی نار
ایک کو اُس نے توڑا اور بالوں کا کیا سنگھار
ڈالی سے بھی سوا لگا کچھ سر پر پھول وہ پیارا
جیسے بادل چیر کے ہنس دے کوئی روشن تارا
جیسے کالی پلکوں پر آنسو کا موتی چمکے
جیسے پربت کی چوٹی پر برف کی چاندی دمکے
جیسے ساگر کے جل تھل پر کوئی ٹاپو اُبھرے
جیسے شیش پہ شنکر کے گنگا کی دھارا اُترے

۲

دوسرا پھول لگے لگے ڈالی ہی پر کمھلایا
ترس ترس کر ملکے ملکے سارا روپ گنوایا

گرم اور تیز ہوا کے جھونکوں کی وہ تاب نہ لایا
سوکھ کے آخر ڈالی پر سے ٹوٹ کے خاک پہ آیا
خاک میں مل کر خاک ہوئیں وہ نازک پنکھڑیاں بھی
جن کو دیکھکر جلتی تھیں اِندر اسن کی پریاں بھی
اور تو اور اُسی کیاری کی آنکھوں میں وہ کھٹکا
دُور اُسے لے جاکر مالی نے گھورے پر پٹکا
پھیر یہ کیسا بھاگ کا ہے، کیسی یہ جگ کی ریت
ایک نظر کا نور بڑھائے، ایک جگر کی ٹیس
ایک کو اپنائے اور ایک کو آنکھ دکھائے باغ
ایک کو گھر دیا کہے اور ایک کو کُل کا داغ
ایک کا ہو ہر کنج میں چرچا، ایک کو جائیں بھول
ایک کسی کے سر کا زیور، ایک کے سر پہ دھول
دو گلاب کے پھول

چادر کی بھیک

(جوش ملیح آبادی)

معاذاللہ اس شدت کی سردی — نہیں چڑھتا کسی صورت سے پارا
ترشح ہو رہا ہے ہلکا ہلکا — دھوئیں میں گم ہے دریا کا کنارا
صدا یہ دے رہی ہے ایک بڑھیا — کہ بابا میں بہت ہوں بے سہارا
ہوائیں چل رہی ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی — اڑھادو کوئی اِک چادر خدارا
مدد میں کر سکوں اَے جوش کیونکر — کہ خود گردش میں ہے میرا ستارا
فقط ملتی سی اِس بڑھیا کو چادر
خدایا!! داورا!! پروردگارا!!!

کلامِ حسرت

(حضرت مولانا حسرت موہانی)

سامنا اُن کے حُسنِ طلعت کا
سبب اچھا ہے میری حیرت کا

ختم کرتے ہو کیوں عطا پہ جفا
کچھ تو موقع رہے شکایت کا

یاد اُس بے خبر کی پھر آئی
پھر اُٹھا دل میں درد شدّت کا

ہو نہ جائے ہجوم شوق میں گم
خوفِ ناصح تری ملامت کا

ہو جو حاصل تری محبت میں
نام راحت ہے اُس مصیبت کا

کیا کریں ہے خلاف رسمِ وفا
شکوہ اُس یارِ بے مروت کا

جانِ حسُنِ کلام ہے لاریب
سخنِ دل شکار حسرت کا

مصیبت بھی راحت فضا ہو گئی ہے
تری آرزو رہنما ہو گئی ہے

یہ وہ راستا ہے دیارِ وفا کا
جہاں بادِ صرصر صبا ہو گئی ہے

مَیں درماندہ اُس بارگاہِ عطا کا
گنہگار ہوں اِک خطا ہو گئی ہے

ترے رتبہ دانِ محبت کی حالت
ترے شوق میں کیا سے کیا ہو گئی ہے

پہنچ جائیں گے انتہا کو بھی حسرت
جب اِس راہ کی ابتدا ہو گئی ہے

ترے غم کی ناشادیاں چاہتا ہوں
محبت کی بربادیاں چاہتا ہوں

مَیں اِس قید کی سرفرازی پہ نازاں
تمنّا کی آزادیاں چاہتا ہوں

مَیں ویرانۂ دل میں اُس نورِ جاں کے
تصوّر کی آبادیاں چاہتا ہوں

روٹھنے پر بھی مجھے بھول نہ جانے والے
اے بدورانِ سفر خواب میں آنے والے

لیکے آغوشِ محبت میں بہ اصرارِ خطا
ہم بھی ہیں آج اُنھیں رو رو کے رُلانیوالے

یہ بھی اِک چھیڑ تھی شاید پئے تنبیہِ وفا
ورنہ تم یوں تو نہ تھے میرے ستانے والے

نگہِ دوست ہے محجوب تو ہم بھی حسرت
لب تک اب شکوۂ حرماں نہیں لانیوالے

شاہجہاں پور کے ہندو شعراؔ

(۲)

(از حضرت کلیمؔ اعظم گڈھی)

(۱۱) جوہر

آپ کا اسم مبارک منشی سیو رام تخلص جوہر ہے، مسرت کے شاگرد رشید، آپ ایک معزز کالیستھ گھرانے کے فرد تھے، آپ کا مکان اورنگ محلہ شاہجہانپور میں تھا۔ تصنیف اور تالیف کے بعید شائق تھے سب ذیل کتابیں آپ کی تصنیفات و تالیفات میں کہی جاتی ہیں، دلیل الترکیب، جواہر الترکیب املائے جوہری۔ جواہر التعلیم۔ جواہر الترکیب کی ابتدا اور خاتمہ پر کچھ اشعار ہیں انھیں میں سے نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے

بعدِ فنِ نحو خواں فن معانی و بیاں — تا شوی بالغ بہر یک طرز لے عالی مقام
طالباں را حق زنظم کامیاب فیض کن — تا دعائے شاں مرا از رحمت سازد بکام
سال ہجرت یک ہزار و دو صد و نوزدہ سنی پنج — عہد ظل اللہ اکبر شاہ کردم اختتام

(۱۲) ہری رام خورم

آپ کا ہری رام نام اور خورم تخلص تھا، محلہ گاڑی پورہ شاہجہانپور میں رہتے تھے۔ سرور کے شاگرد تھے آبائی پیشہ طبابت تھا اور یہی گزر اوقات کا ذریعہ تھا۔

(نمونۂ کلام)

الٰہی گوہرِ گوشِ جہاں کن داستانم را — بہ بحر لفظ و معنی آشنا گرداں زبانم را

آں لب جاں بخش را آلودۂ صہبا مکن — خونِ مشتاقانِ خود بر گردنِ مینا مکن

(۱۳) فرحت

آپ کا نام رائے کشن سہائے قوم کالیستھ محلہ حسین پورہ میں رہتے تھے، قدیمی وطن بدایوں تھا۔ آپ کے خاندانی لوگ اکثر جلیل القدر عہدے پر ممتاز ہوتے چلے آئے۔ چنانچہ ان کے والد رائے سنگھ دہان بن کو مراد آباد، بریلی، شاہجہانپور کی تحصیلداری سپرد تھی، بعد وفات اُن کی جگہ پر اُن کے لڑکے کو تفویض ہوئی آپ نے محمدی اور بہرائچ کی چکلہ داری بھی کی۔ یہ غلام حسین ایسے یگانۂ روزگار شاعر کے شاگرد تھے۔ آپکی

نوٹ اس سلسلے کا پہلا مضمون زمانہ جنوری ۱۹۴۱ء میں درج ہو چکا ہے۔ (ا۔ ن)

تصانیف میں بہت سی کتابیں تھیں مگر کسی کا پتہ نہیں، قصۂ لیلاوتی کو نظم کیا، ایک لغت نادر اور عجیب الفاظ پر مشتمل تیار کی جس کا نام تالیف فرحتی رکھا محاورات عجیبہ کو اکٹھا کر کے ایک کتاب تالیف فرمائی اس کا نام رسالہ بدیع الانتشار رکھا، افسانۂ گل بکاؤلی کو مثنوی میر حسن کے طرز پر نظم کیا اور اس کا نام سوز عشق رکھا ایک دیوان اردو اور فارسی کا مرتب کیا جس کا نام دیوان رعنا رکھا۔ ایک مختصر تاریخ سلاطین چغتائیہ سے لیکر انگریزی عہد تک کی لکھی، اس کا نام آئین انگریزی رکھا۔ غرض تصنیف و تالیف کا بے حد شوق تھا۔ خاندانی سلسلہ ابتک قائم ہے جو خوشحال بھی ہے۔ مگر سوائے آئین انگریزی کے اور کسی کا پتہ نہیں، اُسی سے اُن کے اُردو کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

ہر اک ذرہ اس سے ہوا تابدار — اسی سے یہ ذرہ ہوا آبدار
شفق کا بنا کر کے رنگِ عجیب — کیا دامنِ آسماں کے نصیب
ہر اک شاخ گل اس گلستان کی — ہوئی ذکر خواں اس کے احسان کی
ولیکن بشر کی یہ طاقت کہاں — کہ کھولے وہ اس کی ثنا میں زباں
اسی رہ میں پائے خرد لنگ ہے — سخن کا یہاں قافیہ تنگ ہے
ملک ذکر میں اُس کے خاموش ہیں — فلک بھی تو از حد فراموش ہیں

یہ منزل تو فرحت سمجھ کر کے دور
درازی کو کوتاہ کر اب ضرور

(۱۴) حقیر

آپ کا اسم گرامی منشی سوہن لال حقیر تخلص عالی خاندان کایستھ کے فرد محلہ مظفر گنج میں رہتے تھے اپنے دادا دولہ رائے عرف بابا امرداس جو ایک بزرگ صوفی تھے اُن کے ہم مشرب تھے فارسی میں دستگاہ کامل تھی۔ آپ جس طرح اچھی نظمیں لکھ لیتے تھے اُسی طرح نثر کا بھی ایک خاص رنگ تھا۔ عربی کی تعلیم مولوی غلام محی الدین خاں سے حاصل کی اور قرآن پاک کو باترجمہ و باتفسیر پڑھا۔ چنانچہ مرتے دم تک تلاوت ناغہ نہ ہوئی۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے خود طبیعت ہی اُستاد تھی۔ صوفیانہ رنگ ورثہ میں ملا تھا، ایسی گودوں میں پلے تھے جہاں سوائے تصوف کے اور کسی چیز کا چرچا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ان کے والد بزرگوار ہزاری لال بھی ایک باکمال صوفی تھے۔ آپ کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ آپ کا دیوان فارسی طبع ہو چکا ہے جو اول تا آخر صوفیانہ اشعار کا مجموعہ ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

رباعی

اے تو مبوسی میانِ ما و نیں — نام مرگ از مثنوی باشی خریں

مرگ روز عید وصل است اے حقیر کوز قید آزاد سازد بالیقیں

آنانکہ خود نماز ادا رو برو کنند از آبِ چشم مردمک آسا وضو کنند
شب شد سحر حقیر چو در انتظار یار چوں صبح شد ز بادِ صبا گفتگو کنند

رباعی

چیست ہستی بودن اندر ما و من ما و من را داں عدوے را ہزن
چوں من و تو محو شد از دل حقیر رستگار و مکت گردد بے سخن

حقیرم، خاکسارم، ریگ خشکم، لیک در معنی تیمم مے کند تسنیم از موج سراب ما

ایک مکمل غزل ملاحظہ ہو:-

لذتِ بیخودی اندر دلِ ہشیار کجاست لن ترانی بہ لبِ یار ز انکار کجاست
رُخ سوے خار مغیلاں کند ایں ناقہ وجرس نالہ از شور کہ ایں راہ رہِ یار کجاست
بود اندر عدم ایں کون و مکاں بہ چہ صفت غیر خود رفتہ دگر کاشفِ اسرار کجاست
ہر کہ شد محو بدیدار زباں گنگ شود قوتِ ناطقہ در نرگسِ بیمار کجاست
بے تصادم نجہد یک شرر از آہن و سنگ تا نہ کوبی در دل جلوۂ انوار کجاست
خستۂ خنجر و پیکان و سناں بہ شدنی است آنکہ در سینہ اگل می خلد از خار کجاست
ایں خمار از قدح پیر مغاں می خیزد کز خمار ہر سند کہ خمار کجاست

الحذر بیحد و حد ہر دو برون ست حقیر
غیر او را ہبرِ منزل دلدار کجاست

اُردو کا کلام باوجود تلاش نہ مل سکا، ایک شعر تاریخ صبح میں نظر سے گزرا وہ یہ ہے۔

میں اپنے جرم کے صدقے مراد بر آئی طلب کیا مجھے سرکار نے سزا کے لئے

(۱۵) جویا

منشی ہرنراین صاحب نام جویا تخلص شاہجہانپور وطن، صدر قانون گوئی کے عہدہ پر ممتاز تھے حقیر کے فارسی دیوان کی تاریخ لکھی ہے، اسی سے اُن کے فارسی کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے، اور کچھ حالات معلوم نہیں ہوئے، قطعۂ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حقیر کے شاگرد تھے :-

زباغ اوم استادم شگفتہ — گل معنی اسرار نہفتہ
فرو رفتہ بہ بحر معنوی اوست — در یکتائے معنی ہائے سُفتہ
چناں توضیح معنی کرد در وے — کہ شد کشاف اسرار نہفتہ
بمنزل نارسد جویا بآساں — غبار و خار راہ اوم رُفتہ
بروے سال جبتش کلک جویا — زباغ حمد گل بشگفت گفتہ

(دیگر)

نسخۂ بے مثال حمد و ثنا — پُر ز توحید اوم سرتا پا
گلشن حمد تازہ و سیراب — معنی و لفظ بود گل آسا
یعنی دیوان بے نظیر حقیر — پاک از وصف خال و زلف دوتا
سالک طالبان حق صادق — بہر شعراست رہبر یکتا
طبع گردید اندریں ایام — روے بنمود ہمچو شمس سما
بہر تاریخ طبع گفت سروش — بے سخن لانظیر گو جویا

موجودہ دور میں بھگوتی سہائے بیدار جن کی عمر تقریبًا پچاس سال ہے ایک معزز کایستھ خاندان کے فرد ہیں، آپ بہترین مقرر ہیں کونسل کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ اُردو کا کلام پاکیزہ ہوتا ہے۔

رامیشور پرشاد عرف گوپالی بابو جوج تخلص فرماتے ہیں اور ظریف لکھنوی کے شاگرد ہیں، عمر تقریبًا چالیس سال ہے، کلام ظرافت کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔

مہاراج سنگھ صاحب خاکی آپ مختار عدالت ہیں، عمر تقریبًا پچاس سال۔

شکتی پرشاد صاحب وثیقہ نویس عمر تقریبًا ستر سال، فارسی کلام عمدہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جو شعراء ہیں وہ ابھی نوخیز ہیں، مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں، رنگ کلام سے پتہ چلتا ہے کہ جلد ہی کامیاب شاعر ہو جائیں گے۔

یہاں کے مایۂ ناز شاعر جناب پنڈت جگموہن ناتھ رینہ ہیں جو صاحب دیوان ہیں۔

(۱۶) شوق

اسم گرامی پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق تخلص، والد کا نام پنڈت وشیشور ناتھ رینہ کاشمیری النسل ہیں سنہ ۱۸۶۲ء میں بمقام اندور پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کا تعلق جاورہ ریاست سے تین پشت سے تھا۔ نواب غفور خاں صاحب مہاراجہ ہلکر کے سپہ سالار تھے، جب اُن کو اپنا علاقہ الگ ملا تو انھوں نے جاورہ کو اپنا

دارالحکومت بنایا اور شوق صاحب کے جد امجد پنڈت شیو ناتھ صاحب کو دیوانِ ریاست مقرر کیا۔ آپ کے دادا پنڈت ہرنراین صاحب اندور میں ایجنٹ گورنر جنرل سنٹرل انڈیا کے یہاں ریاست جاورہ کے وکیل تھے، آپ کے والد بھی دادا کے بعد اسی عہدہ پر فائز رہے۔

شوق صاحب بتلاش روزگار شمالی ہندوستان کی طرف تشریف لائے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں پروونشیل ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ چنانچہ تیرہ ضلعوں میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز رہ کر ۱۹۲۰ء میں پنشن لے کر اپنے لڑکے چندر موہن ناتھ کے یہاں چلے آئے اور شاہجہانپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

آپ کو شاعری کا شوق ہوا تو ۱۸۸۴ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک آمیر مینائی سے مشورہ سخن کرتے رہے اس وقت کا کل کلام دیمک کے مطالعہ میں چلا گیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۵ء تک ملازمت کے تنگ و دو میں شاعری ترک رہی۔ سنہ ۱۹۱۶ء سے نوح ناروی کو کلام دکھانے لگے، اُن کے بعد تاباں بدایونی شاگرد منیر سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔

اتنے اُستادوں کی آنکھیں دیکھنے کے بعد کلام جس پایہ کا ہو سکتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، نمونۂ کلام سے ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے۔

باوجود پیرانہ سالی اس وقت آپ انجمن ترقی اُردو شاہجہانپور کے صدر ہیں آپ کے دولت خانہ پر ماہانہ مشاعرہ ہوا کرتا ہے، جملہ انتظامات نہایت فراخ دلی سے فرماتے ہیں، آپ کا دم یہاں غنیمت ہے نہایت خلیق اور منکسر المزاج آدمی ہیں۔ آپ کا ایک دیوان پیامِ شوق طبع ہو کر مقبولِ خلائق ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام۔ صوفیانہ کلام کا رنگ:۔

صفحۂ دل مرا آئینۂ رمزِ توحید
رازِ کونین خلاصہ مرے افسانے کا

حریفِ جلوۂ کثرت نہ تھا گو پردۂ وحدت
فریبِ حُسن سے لازم تھا لیکن باخبر ہونا

وحدت و کثرت کے جلوے ہیں عیاں دل کے قریب
ضو فشاں ہے نقشِ اصلی نقشِ باطل کے قریب

حدِ احساسِ گنہ پردۂ رحمت میں نہیں
جو گناہوں میں مزا ہے وہ ندامت میں نہیں

ہر شئے میں تیرا نقشہ ہر گل میں تیرا جلوہ
ان آنکھوں کے کھلتے ہی کیا کیا نظر آتا ہے

نابود نمود ہیں اے شوق زمانے کی
جو کچھ نظر آتا ہے دھوکا نظر آتا ہے

سلاستِ زبان و روزمرہ ملاحظہ ہو:۔

کر کے قول و قرار کیا کہنا
او فراموش کار کیا کہنا

کام بگڑے تو ہی بناتا ہے
اے مرے کردگار کیا کہنا

دن کو تارے دکھا دیئے تونے　　اے شبِ انتظار کیا کہنا

چار پھولوں کو نہ ترسائیے گا　　قبر پر میری اگر آئیے گا

دیجئے مجھ کو نہ گیسو کی قسم　　کچھ کہوں گا تو بگڑ جائیے گا

پھر یہ بہکی ہوئی باتیں کیسی　　کیا زباں دیکے بدل جائیے گا

تنِ بیجاں میں اب رہا کیا ہے　　دیکھئے مرضیِ خدا کیا ہے

معاملہ بندی اور رندی و شوخی کا رنگ دیکھئے :-

آنکھوں آنکھوں میں وہ کیا کچھ کہہ گئے　　لب پہ آتے ہی گلا جاتا رہا

ناتوانی تجھے اب کوئی کہاں تک روئے　　ضعف سے نالۂ بیتاب بھی لرزاں نکلا

ذرا بیت خانہ ہو کر میں ابھی آتا ہوں لے ساقی　　مرے حصے کی جو کچھ ہو وہ پیمانے میں رکھ دینا

ازل سے پہلے گر حسنِ ازل ملتا تو میں کہتا　　ذرا سی وحشتِ دل اور دیوانے میں رکھ دینا

دل کی بیتابی و حسرت کا کھنچا ہو نقشہ　　رنگ اڑتا ہوا تصویر کا بہزاد رہے

کچھ باقی ہے آنکھوں میں سرورِ مے رنگیں　　تو چاہے تو ساقی انھیں میخانہ بنا دے

وہ کون سی صورت تھی کیا تجھ سے کہیں اے دل　　جس رخ سے اسے دیکھا تصویر نظر آئی

خدائی کا ہے دعویٰ ان بتوں کو دیکھئے کیا ہو　　ادھر ایک سجدہ آؤ پھر امتحاں کرلیں

خود ہوئے آکر اسیرِ دامِ عشق　　دشمنِ جاں قوتِ پرواز ہے

۱۹۲۳ء کی ایک مکمل غزل ملاحظہ فرمائیے :-

رنج و الم میں جوش تھا اشکوں کے تار کو　　کیا روک لیتے گریۂ بے اختیار کو

حق نے دیا ہے اوج یہ مجھ خاکسار کو　　رشکِ فلک بنا دیا مشتِ غبار کو

وہ آرہے ہیں دیکھنا ہے وقتِ امتحاں　　گھبرا کے کھو نہ بیٹھنا صبر و قرار کو

لے شوقِ دید صبر و تحمل سے کام اگر　　بے پردہ خود نقاب کرے حسنِ یار کو

محشر میں ہے پکار تمھاری اٹھو چلو　　اے سونے والے قبر کے چھوڑو مزار کو

یادِ وطن کی طرح رہی بیکسی بھی ساتھ　　چھوڑا نہ تا بمرگ غریب الدیار کو

چلنے لگے عدم سے تو کچھ آگیا خیال　　لے آئے ساتھ ہستیِ ناپائیدار کو

دیکھیں نظر بھی پڑتی ہے اس پر کسی کی شوق
آئے ہیں لے کے ہم دلِ امیدوار کو

جذباتِ مدہوش

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم-اے)

سوختۂ غم

کبھی وہ دن تھا بزمِ دل میں اپنے شمع جلتی تھی	عروسِ آرزو پہلو میں رہ رہ کر مچلتی تھی
ارے وہ عشق کی گرمی ارے وہ حسن کی تابش	کہ شرحِ آرزو کرتے زبانِ خامہ جلتی تھی
نہ اب وہ آرزو باقی نہ شمعِ انجمن باقی	دھواں بھی تو نہیں اٹھتا جہاں پر آگ جلتی تھی
کہاں وہ خاک و خاکستر میں گرمی لیکن اب بھی تو	نکلتی ہے وہ آہِ شعلہ افشاں جو نکلتی تھی

ہمارے عشق پر مدہوش آتی ہے مثل صادق
کہ بل رسی میں رہ جائیں گے گو ہر چند جلتی ہے

گلکاریِ عشق

فلک پہ حسن کے ہے کس شفق کی تابانی	فروغِ حسن میں جس سے ہوئی فراوانی
وہ رنگ اس پہ جمایا جمانے والوں نے	خود اپنے خون سے ہولی رچانے والوں نے
وہی جو روئیں تو روتے ہیں خون کے آنسو	لہو کے گھونٹ جو پیتے ہیں تھوکتے ہیں لہو
وہ جو کئے گئے عاشق کے نام سے موسوم	وہ زندہ دل کہ جو جیتے ہی جی ہوئے مرحوم
انھیں نے حسن کی غمگینیاں مٹائی ہیں	انھیں نے حسن کی رنگینیاں بڑھائی ہیں
جگر کے خون سے اپنے بنا کے غازۂ حسن	فسردہ ہو کے نکھاری بہارِ تازۂ حسن

انھیں کے زمرہ میں مدہوش اک خزیں میں ہوں
کہ بزمِ شوق کا اک حاشیہ نشیں میں ہوں

ثوابِ عشق

جبتک میں آگ خانۂ دل کو لگا نہ دوں	جبتک میں بوند بوند لہو کی جلا نہ دوں
جبتک ہر ایک ذرّۂ دل خاک ہو نہ جائے	جبتک وہ میرے حال پہ خود ہی ترس کھائے
اُس وقت تک وصال کی حسرت حرام ہے	ہر آرزو و شوق تمنائے خام ہے

چھلکا کرے یہ نازِ مئے عشوہ و ادا
مہکا نہ دوں میں اور تو پینے کا کیا مزا

دل کی ملا نہ دوں مئے احمر تو حق گواہ
اُس وقت تک شراب یہ پینی ہے اک گناہ

یہ بوالہوس بھی آج تو دامن رچائے ہیں
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں آئے ہیں

وہ بھی کرم کے جوش میں کچھ دیکھتا نہیں
اندوہگیں ہے اور بھی اب عاشقِ حزیں

مدہوش کہہ رہا ہے، جُھکا کر سرِ نیاز
ہاں اے حضور! عشق و ہوس میں ہو امتیاز

غمِ عشق

شیشۂ دل کو کسی سنگ سے ٹکراؤں کہیں
خود کو بھی پاؤں نہ اس طرح سے کھو جاؤں کہیں

ہیں غمِ عشق پہ چرکے غمِ دوراں کے لگے
اور چرکے نہ غمِ عشق کے اب کھاؤں کہیں

کھُل گیا سارا بھرم عشق کی سرمستی کا
دل مگر کہتا ہے اب بھی اُسے بھر پاؤں کہیں

حسن کا ساز تو ہوتا ہے بڑا خواب آور
اس کو اس ساز میں لے جا کے سُلا آؤں کہیں

آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی ہے شبِ غم کتنی
تھپکیاں اب بھی نہ دے حسن تو مر جاؤں کہیں

رشک آتا ہے مجھے اُن پہ جو ہیں اہلِ جمود
دل کو پھینک آؤں کہیں عشق کو ٹھکراؤں کہیں

سانس لیتا ہوں تو آتا ہے کلیجا منھ کو
ایسے جینے سے تو مدہوش میں مر جاؤں کہیں

بے زبانیِ عشق

عشق کی رَو میں کچھ اِس طرح سے بہہ جاتے ہیں
جو کہ کہنا نہ ہمیں چاہیئے کہہ جاتے ہیں

اور جب کہنے کی ہو بات تو اُن کے آگے
دل کو ہم تھام کے خاموش سے رہ جاتے ہیں

ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رُکتے رُکتے
حسن توفیق جو دیتا ہے تو کہہ جاتے ہیں

جس نے کی سب پہ گرانی تھی بقولِ شاعر
ناتواں عشق کے اُس بار کو سہہ جاتے ہیں

بات پردہ کی ہے جو حضرتِ مدہوش اُسے
پردۂ شعر میں کس لطف سے کہہ جاتے ہیں

امید و یاس

اُمید بن کے محبت میں ناخدا آئی
مگر کبھی تو نہ کمبخت پار اُتار آئی

کشاں کشاں لیے جاتی ہے پھر بٹھانے کو
جہاں سے یاس ہمیں بارہا اُٹھا لائی

ہوائے کوچۂ جاناں نہ آئی راس اُسے ہزار بار ہمیں لے گئی نہ بر آئی
میں کیا کہوں کہ یہ ناداں کی دوستی کیا تھی جو راہِ دوست میں اِک زندگی گنوا آئی
خود اپنے درد میں عزلت نشین کیا مدہوش
جو کام آئی تو کچھ یاسِ بے نوا آئی

عالمِ سکوت

زبانِ شعر سے اب کس طرح بنیں کاشف کہ اپنے حال سے اب خود نہیں ہیں ہم واقف
کہیں خوشی نہیں حاصل ہمیں تو لغو ہے یہ کہیں ہمارا نہیں درد اُنھیں تو لغو ہے یہ
کہیں اگر کہ انھیں درد ہے تو یہ بھی غلط کہیں ہمارا ہی دل سرد ہے تو یہ بھی غلط
بجا ہے گر یہ کہیں گرم جوشیاں بھی نہیں کہ مر رہے ہیں مگر کہتے الاماں بھی نہیں
تڑپ رہے ہیں مگر آہ کی نہیں طاقت فلک شگاف فغاں کی بھی پر نہیں ہے سکت
غلط ہے گر یہ کہیں آہ میں اثر ہی نہیں یہ واقعہ بھی ہے رونے کو اب جگر ہی نہیں
نہ اب تمنا ہے جینے کی کچھ نہ مرنے کی ادائے فرض میں کوشش ہے سانس بھرنے کی
نہ اعترافِ محبت اُنھیں نہ ہے انکار
نہ اضطراب ہے مدہوش ہم کو اب نہ قرار

کیفِ غم

مَیں اپنے ہی رَو میں بہا جا رہا ہوں حوادث سے کہہ دو کہ خود آ رہا ہوں
اُسے ہے تکلف، تامّل، توقف، تو سوئے اجل خود بڑھا جا رہا ہوں
مصیبت کو ٹھکرا کے، لبیک کہہ کر بڑھا وا میں دل کو دیے جا رہا ہوں
شہیدِ وفا کہہ کے کس حوصلے سے مَیں بہکے ہوئے دل کو بہکا رہا ہوں
میں پتھر سے دل اپنا ٹکرا چکا ہوں میں پتھر سے دل اپنا ٹکرا رہا ہوں
خود اپنے ہی خونِ جگر سے بنا کر میں زخموں پہ مرہم لگا تا رہا ہوں
فریبِ وفا کے وہ کھائے ہیں دھوکے حسینوں سے بھی اب میں گھبرا رہا ہوں
مجھے حسن نے اتنا بھرما دیا ہے کہ میں خود بھی اب دل کو بھرما رہا ہوں
مٹانے کی کیجیے نہ زحمت گوارا کہ مَیں خود ہی مٹتا چلا جا رہا ہوں
نہ روکیں مجھے ہوشمندانِ عالم اگر سوئے صحرا چلا جا رہا ہوں

ہے کوشش کہ پیدا کروں روئے خنداں
مگر غم کی صورت بنا جا رہا ہوں

تماشا سمجھتا تھا میں درد دل کو
تماشا میں بنتا چلا جا رہا ہوں

بڑا غم ہے اس زندگی کی بھنور میں
بہت ڈوبتا اور اُبھرتا رہا ہوں

نہ اب ڈوب کر میں اُبھر پاؤں شاید
کہ اب ڈوبتا ہی چلا جا رہا ہوں

بنائے غم عشق تو کیا مٹاتا
میں اپنی ہی ہستی مٹاتا رہا ہوں

نہ گرنے دیا بارِ غم میں نے ہرگز
خود اپنا لہو میں گراتا رہا ہوں

غمِ عشق کا بار بردار ہوں میں
میں ہی ناتواں بار اُٹھاتا رہا ہوں

فریب وفا مرتے مرتے بھی کھایا
وہ آئے ہیں اُس وقت جب جا رہا ہوں

بڑی کوششیں ہیں کہ ٹھہرا ہوں میں
مگر اب تو گرتا چلا جا رہا ہوں

میں کرتا ہوں جتنی ہی دل کی جمعیت
پریشان خاطر ہوا جا رہا ہوں

عزیزوں طبیبوں نے سمجھا نہ سمجھے
یہ میں جانتا ہوں کہ میں جا رہا ہوں

نہیں شعر خوانی یہ ہے دل کا رونا
اجی آپ سمجھے کہ میں گا رہا ہوں

یہی ضبط کے چند ٹکڑے تھے باقی
انھیں بھی میں کھوتا چلا جا رہا ہوں

مرے صبر کی دھجیاں ڈھونڈھ لاؤ
میں گھبرا گیا ہوں میں گھبرا رہا ہوں

قسم ہے وفا کی وفا تم نہ کرنا
یہی اِک قسم میں دلاتا رہا ہوں

طرحدار مدہوش ہے عشق میرا
بڑی شان سے درد اُٹھاتا رہا ہوں

ناصح

شعر گوئی میں کروں ترک' یہ ارشاد ہوا
پرسش حال کو جب حضرت ناصح آئے

اُن کا کہنا تھا کہ یہ فن ہے تضیع اوقات
اُن کو سمجھائے تو کیا خاک کوئی سمجھائے

عشق وہ چیز ہے جس کا ہے سمجھنا دشوار
تاب کچھ لائے تو کچھ ہم سے نکتے لائے

عمر بھر ہم تو اسی درد کا رونا روئے
حسن ظن آپ کا یہ سمجھے کہ نغمے گائے

درد مندانِ محبت کا سمجھنا نہیں کھیل
تھا یہ دعوے کہ میرا درد بٹانے آئے

شکر صد شکر مرے حال پہ چھوڑا مجھکو
دردِ سر دور ہوا بعد کو وہ بھی آئے

رازِ دل چاہا کہ کہہ جائیں سو کہتے نہ بنا
ولولے دل میں اُٹھے پر نہ زباں تک آئے

عشق اندھا ہی نہیں گنگ بھی ہے اے مدہوش
بات کہنے کو یہ توفیق کہاں سے لائے

ہندوستان کا قدیم علم صنعت

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بی اے، ایل ایل بی)

قدیم سنسکرت ادب میں صنعت کے مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں، لیکن ان کا بیشتر حصہ غیر ملکی حملہ آوروں کی تباہ کاری اور زمانہ کی لاأبالیوں کی نذر ہو گیا۔ مگر چند تصانیف ابتک نیپال گجرات، اڑلیسہ اور ٹراونکور میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان میں سے (۱) واستو ودّیا (वास्तु विद्या) (۲) میمتم (मयमतम्) (۳) منشیالے چندرکا (मनुष्यालय-चन्द्रिका) (۴) شلپ رتنم اور (۵) سمرانگن سوتر دھارم (समरांगन सूत्रधारम्) یہ پانچ کتابیں ٹراونکور سے شائع ہو چکی ہیں۔ اڑلیسہ کے پرانے قلمی نسخوں میں (۱) بھون پرویش (भुवन प्रवेश) (۲) شلپ سداجے (शिल्प सदाजप) اور (۳) شلپ شاستر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نیپال سے ابھی تک صرف ایک کتاب پرتی مالکشنم (प्रतिमा लक्षणम्) ہی شائع ہوئی ہے گجرات میں (۱) اپراجت (अपराजित) اور گرہ وستوسار (गृह वस्तु सार) کے علاوہ اور بھی کئی معرکۃ الآرا تصانیف موجود ہیں۔

پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے اپنی (मध्य कालीन भारतीय संस्कृति) ازمنہ وسطیٰ میں ہندی تمدن نامی شہرہ آفاق تصنیف میں علم صنعت سے متعلق حسب ذیل کتابوں کا حوالہ دیا ہے

(۱) واستوسوکھیہ (वास्तु सौख्य)
(۲) اپراجت واستوشاستر (अपराजित वास्तु शास्त्र)
(۳) پرسادانوکیرتن (प्रसादानु कीर्तन)
(۴) چکرشاستر
(۵) چترپٹ
(۶) جلارگل (जलार्गल)
(۷) پکشی منشیالے لکشن (पक्षि मनुष्यालय लक्षण)
(۸) رتھ لکشن
(۹) ومان ودّیا (विमान विद्या)
(۱۰) ومان لکشن (विमान लक्षण)
(۱۱) وشوکرمیہ (विश्वकर्मीय)
(۱۲) کوتک لکشن
(۱۳) مورتی لکشن
(۱۴) پرتیما درویا دیوچن (प्रतिमा द्रव्यादिवचन)
(۱۵) سکلادھیکار (सकलाधिकार)
(۱۶) سارس سوتیہ (सारस्वतीय)
(۱۷) شلپ شاستر
(۱۸) وشوکرم پرکاش (विश्वकर्म प्रकाश)
(۱۹) وشوکرمیہ شلپ (विश्वकर्मीय शिल्प)

ویدوں کے زمانہ میں شلپ یا صنعت کے معنی گانے بجانے اور ناچنے کے تھے، لیکن والمیک کی رامائن میں شلپ (صنعت) اور کلا (فن) کا استعمال مختلف معنوں میں ہوا ہے۔ اس عہد کے صناع جیسا کہ والمیکی رامائن کے بال کانڈ اور ایودھیا کانڈ میں مذکور ہے یگیہ کی ویدی (چبوترہ) اور سٹرکیں بنانے کا کام کرتے تھے۔ اس طرح بہت سے کاریگروں کا شمار صناعوں میں ہونے لگا۔ استادودیا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معمار، بڑھئی، بت ساز اور کمہار بھی اسی زمرہ میں شامل تھے برہم ویورت پران (ब्रह्म वैवर्त पुराण) میں وشوکرما کے اُن نو لڑکوں کو بھی یہی نام دیے گئے ہیں (۱) مالی (۲) آہن گر (۳) شنکھ کا کام کرنے والا (۴) نورباف (۵) کمہار (۶) کسیرا۔ (۷) درودگر (۸) مصور، اور (۹) زرکار یا سنار۔

مہابھارت میں ایک ہزار صنعتوں کا ذکر آیا ہے، اور ان سب کی ابتدا وشوکرما سے مانی گئی ہے اگنی پران سے بھی مہابھارت کے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ بعض علما، کے نزدیک شلپ شاستر کے حسب ذیل دس شعبے ہیں:-

(۱) کاشتکاری یا कृषि शास्त्र (۶) نیتر شاستر یا آلات سازی

(۲) جل شاستر یا پانی کا علم مثلاً تیراکی وغیرہ (۷) ومان شاستر یا ہوائی جہاز بنانا

(۳) کھنی شاستر یا کان کنی (۸) واستو شاستر یا صنعت تعمیر

(۴) نوکا شاستر یا ناؤ وغیرہ کا بنانا۔ (۹) پراکار شاستر یا شبیہ سازی (प्राकार शास्त्र)

(۵) رتھ شاستر (۱۰) نگر رچنا شاستر یا شہر بسانا،

متسیہ (मतस्य) پران میں واستو شاستر کے جن اٹھارہ مصنفین کے نام درج ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) بھرگو (۷) نگن جت (नग्न जित) (۱۳) شوٗنک

(۲) اَتری (अत्रि) (۸) وشالاکش (۱۴) گرگ

(۳) وشسٹ (۹) پورندر (۱۵) واسدیو

(۴) وشوکرما (۱۰) برہما (۱۶) انرودھ

(۵) مئے (मय) (۱۱) کمار (۱۷) شکر

(۶) نارد (۱۲) نندیش (۱۸) برہسپتی

اِن سب میں وشوکرما کا پایہ بہت بلند ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ پرانوں میں بار بار اس کا ذکر آتا ہے۔ لیکن یہ وہ وشوکرما نہیں ہے جس کے بارے میں بہت سی کہاوتیں مشہور ہیں۔ برہمنوں میں وشوکرما

سے خلاق عالم مراد لی گئی ہے۔ مگر گپت خاندان کے عہد حکومت میں اسی نام کا شلپ شاستر کا ایک زبردست مصنف بھی ہوا ہے جو اپنے وقت کا ایک لاثانی کاریگر تھا۔ غالباً اسی وجہ سے آج تک اس کی پوجا ہوتی ہے اور ہر سال ہندو کاریگر و صنّاع وشوکرما کی پوجا کے دن اس کے آگے سر نیاز خم کرتے ہیں۔

پرانوں سے پتہ چلتا ہے کہ وشوکرما پربھاس (प्रभास) کا لڑکا تھا اور محلات، باغات، زیورات، تالاب اور کنوئیں وغیرہ بنانے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ علم صنعت کی مان سار (मानसार) نامی مشہور کتاب میں لکھا ہے کہ خلاقِ عالم برہما کے چاروں منھ سے چار صنّاع پیدا ہوئے، ان میں سے پہلا وشوکرما تھا جو دیوتاؤں کا کاریگر تھا۔ ناٹیہ شاستر میں درج ہے کہ برہما جی نے وشوکرما سے ایک ناٹیہ شالا یا اسٹیج بنانے کی فرمائش کی، اور اس نے قلیل عرصے میں ایک عالی شان اسٹیج بنا کر کھڑا کر دیا۔ رامائن میں تحریر ہے کہ اسی وشوکرما نے راکششوں کے لئے سونے کی لنکا تعمیر کی تھی، اور اسی نے اگست، ستوریہ اور کبیر کے لئے محلات بنائے تھے۔ برہما جی کے ہوائی جہاز "پشپک" کی تعمیر بھی اسی کے ذہن رسا کا نتیجہ تھا۔ اسکند پران کے بیان کے مطابق اس نے ہمالیہ کے اشارہ پر ایک وسیع و عریض میٹنگ ہال تعمیر کیا تھا۔ اور اسے دیوتاؤں، موروں، گھوڑوں اور ہرنوں کے منھ بولتے مجسموں سے آراستہ کیا تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ گپتا عہد سے بہت پہلے رامائن کے واقعات ظہور پذیر ہونے سے قبل ایک اور کاریگر بھی ایسا ہوا ہے جس کا نام وشوکرما تھا۔

وشوکرما محض ایک کاریگر یا صنّاع ہی کی حیثیت سے مشہور نہیں، بلکہ علم صنعت کے مختلف موضوعات پر بہت کا اہم تصانیف کا مصنف بھی مانا جاتا ہے۔ اس کی تصنیفات میں سے وشوکرم پرکاش (विश्वक र्म प्रकाश) اور وشوکرمی یم شلپ شاستر (विश्वकामि यम शिल्प शास्त्र) یہ دو کتابیں تو آج تک ملتی ہیں۔ وشوکرم پرکاش کے اختتام پر وشوکرما کو ہر فن مولا اور عالم متبحر بتا کر مہاتما کے مقدس خطاب سے یاد کیا گیا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی وشوکرما ہے جس نے گپت راجاؤں کے عہد حکومت میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔

شلپ شاستر کے مطالعہ سے اہل ہند کی کاریگری کے اعلیٰ معیار پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ہندی فن کار کے نزدیک دل کی دنیا کو اجاگر کرنا ہی حسن کاری کی بہترین دلیل ہے اور چونکہ دلی جذبات و احساسات شدت ہی سے ظاہر ہوتے ہیں اس لئے اس نے ہمیشہ اپنی تخلیق کے چہروں پر گہری نظر رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی کوششیں جتنی حسین و لطیف ہیں اس کی مثال دنیا کے پردے پر ملنی مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے قدیم صنّاعوں نے خیالات کی بہتی ہوئی رَو کو بڑے حسن و خوبی کے ساتھ رنگ و سنگ کے حلقہ میں جذب کر لیا ہے۔

شکر نیتی (शुक्र नीति) میں لکھا ہے کہ ہر کامیاب مجسمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ سکونِ قلب اور

نشاط روح کا محرک ہو، اور اس کے نظارہ سے یوگ بھگتی اور خود شناسی کی ترغیب ملتی ہو۔ چنانچہ گپت حکمرانوں کے عہد زریں کے حسین بت اس نوع کی صناعی کے نادر نمونے ہیں۔

شنکر آچاریہ نے مورتیوں کی تین قسمیں گنائی ہیں:-

(۱) ساتوک یا سکون آفریں (۲) راجسیک یا شکیتہ، اور (۳) تامسیک یا اشتعال انگیز۔

ان میں پہلی قسم کی مورتیاں بہترین اور مقدس مانی گئی ہیں۔

ساتوک مورتیوں کا یوگ مدرا (دھیان کی حالت) میں ہونا ضروری ہے۔ ان کی بیٹھک سیدھی ہونی چاہیئے ہاتھوں سے بے خوفی کا اظہار ہوتا ہو اور دیوتا پوجا کرتے دکھائے گئے ہوں۔ اس طرح کی مورتیوں کی خصوصیات یہ ہیں:-

(۱) یوگ مدرا:۔ عالم محویت اور نگاہیں ناک کی نوک پر جمی ہوئی۔

(۲) سوئستھ۔ یہ سیدھی بیٹھی ہوئی

(۳) ورابھے کر:۔ نڈرپن کا بردان دینے والے ہاتھ، اور

(۴) دیو میندر:۔ پوجا کرنے والے دیوتاؤں کی موجودگی۔

مورتیوں کی خوبصورتی برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ صناع تناسب اعضا اور شاستروں میں بتائی ہوئی ناپ تول کا خیال رکھے۔ برہمانان کلش کے مطابق بھونڈی اور غیر متناسب مورتیاں ممنوع ہیں، اور تباہی و بربادی کا باعث سمجھی جاتی ہیں۔ شکرنیتی میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ شنکھ، پدم، دھوج، وجر، چکر، سواستک، کنڈل، کلش، چندر، چھتر، شری وتس، انکش، ترشول، جوگی مالا اور وسودھا، دیوتاؤں کے مجسموں کا ضروری جزو ہیں۔ شاستروں کے نزدیک صناع بھی شاعر ہی کا ہم پلہ ہوتا ہے کیونکہ شعر کی روح بھی وہی رس ہے جو صناع کی تخلیق کی جان ہے۔

رباعیاتِ مدہوش

(۱)

فانی ہے جہاں بے حس فانی کیا ہے
شبنم نے غریب درفشانی کیا ہے
پھولوں کی ہنسی نے بو شادمانی کیا ہے
پانی کا آبلہ ہے جوانی کیا ہے

(۲)

شبنم ہے سرشتہ وہ جوانی کیا ہے
فانی ہے جہاں تو زندگانی کیا ہے
اس زور سے سر پٹک کے رونے والے
یہ چشم تری تو بھی سرگرانی کیا ہے

مدہوش

خلشِ غم

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔ اے، ایل ایل بی)

اے میرے غمِ پنہاں!
اِس دورِ حماقت میں تیری نہیں شنوائی
اِنسان کے دل میں ہے پتھر نے جگہ پائی
اے میرے غمِ پنہاں!

معلوم ہے یہ مجھکو،
ہیں آگ لگانے کی گلشن میں ترے گھاتیں
دن رات سُنا کرتا ہوں شعلہ نوا باتیں
معلوم ہے یہ مجھکو

یہ دل جو سلامت ہے،
یہ آگ ترے گلشن تک راہ نہ پائے گی
ہو کچھ بھی ترے دامن تک آنچ نہ آئے گی
یہ دل جو سلامت ہے

اے میرے حسیں مہماں!
دیکھوں تو کہاں تک ہے یہ شورشِ ویرانی
اشکوں کے تسلسل سے پہونچاؤنگا میں پانی
اے میرے حسیں مہماں!

مشکل ہے جلا پانا
یہ گل پلا ہے جو آغوشِ محبت میں
مانا کہ بڑی تیزی ہے آگ کی خصلت میں
مشکل ہے جلا پانا

راتوں کو اکیلے میں
چشمک سے ستاروں کی کچھ شہ جو میں پاؤنگا
یہ درد بھری باتیں تاروں کو سناؤں گا
راتوں کو اکیلے میں

اِس طرح مرے ہمدم
معلوم خدا کو بھی ہوجائیں گی سب گھاتیں
جب گیت میں تاروں کے ڈھل جائینگی یہ باتیں
اِس طرح مرے ہمدم!

اُس وقت کہیں گے سب

یارب یہ نئی گردش کیسی ہے ستاروں میں
کچھ بوئے خزاں آتی ہے اپنی بہاروں میں
اُس وقت کہیں گے سب

گھبرائیں نہ دل والے

گردش سے ستاروں کی، تقدیر کو بدلوں گا
گر بن نہ پڑا یہ بھی، تدبیر کو بدلوں گا
گھبرائیں نہ دل والے

نزدیک ہیں اب وہ دن

جب تیری جھلک پاؤنگا روح میں انساں کی
اُس وقت کہوں گا میں مشکل تری آساں کی
نزدیک ہیں اب وہ دن

ہمت کی ضرورت ہے،

دیکھوں تو کہاں تک سب شور مچاتے ہیں
عاشق ترے پتھر میں بھی آگ لگاتے ہیں
ہمت کی ضرورت ہے!

غزل

(سید مقبول حسین احمدپوری، بی اے)

غم نہیں اب جو نگاہوں میں وہ غمخوار نہیں
ایک حسرت ہے مگر اتنی دل آزار نہیں

دل ہوا شامِ غریبی سے کچھ ایسا مانوس
دُوریِ صبحِ وطن جی کو مرے بار نہیں

یادِ احباب بھی یہ کہکے ہوئی رُخصت بدوش
لیجئے آپ سے اب کوئی سروکار نہیں

اُن گلوں پر مجھے رہ رہ کے ترس آتا ہے
جن کے پہلو میں تہ برگ کوئی خار نہیں

ذرے ذرے کی زباں پر ہے محبت کا پیام
آپ کا دل ہی مگر محرمِ اسرار نہیں

آبروئے عشق کی پہلی سی کہاں اب اے دوست
ہو گئے سیکڑوں منصور کہیں دار نہیں

جن پہ پڑتی ہے وہی خوب سمجھ سکتے ہیں
جُز خدا کوئی مصیبت میں مددگار نہیں

دَوڑ جاتی ہیں لبوں پر متبسم لہریں
کچھ اشارے ہیں کنائے ہیں یہ اشعار نہیں

ہیں کوئی حضرتِ مقبول بھی اُن لوگوں میں
جن میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

نہر سوئز اور نپولین

(از مولانا محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔اے)

آجکل جبکہ نہر سوئز پر قبضہ کرنے کے لئے محوری طاقتیں خصوصاً اطالیہ بیقرار ہو رہا ہے اور اسی وجہ سے مصر اور یونان میں ان کے دریا بہہ رہے ہیں، یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جو اہمیت اس وقت نہر سوئز کو حاصل ہے، وہی اہمیت اس کے محل وقوع کو اُس وقت بھی حاصل تھی جب موجودہ نہر عالم وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس و برطانیہ برسر جنگ تھے اور نپولین بوناپارٹ فرانس کا کمانڈر انچیف تھا۔ فرانس کا خاندان شاہی انقلاب سیاسی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ اور فرانس کی عنان حکومت ڈائرکٹروں کے ایک بورڈ یا مجلس کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت بھی انگلستان کو سمندروں پر پورا اقتدار حاصل تھا اور اس کے خلاف فرانسیسیوں کے جذبات نفرت و حقارت انتہائی جوش پر تھے، اور خود نپولین بوناپارٹ بھی انگلینڈ کی دشمنی میں سب سے آگے تھا۔

جب نپولین سرزمین اطالیہ کو پامال کر کے پیرس واپس آیا تو ڈائرکٹروں نے اُسے اُس فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا جو فرانس کے مغربی ساحل پر انگلینڈ پر حملہ کرنے کی غرض سے جمع کی گئی تھی۔ لیکن نپولین ڈائرکٹروں سے بھی زیادہ ہوشیار تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جب تک انگلستان کا سمندروں پر قبضہ ہے اس وقت تک اس کو کسی بیرونی دشمن کا کوئی خوف ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ یہ سوچ سمجھ کر اس نے ڈائرکٹروں سے کہا سنا اور ایک دوسری سپاہ کی کمان حاصل کر لی، جو مصر پر حملہ کر کے انگلستان کو نقصان پہونچانے والی تھی۔

اِن دنوں بھی مصر کو ہندوستان کا مغربی دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ نپولین نے مصر پر حملہ کر کے اس کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اور دوسرے فرانسیسی جنرل دیساے کو مصر کا بالائی حصہ زیر کرنے کے لئے مقرر کر دیا لیکن ابھی اس کارنامہ کی تکمیل باقی رہ گئی تھی۔ کیونکہ جب تک خاکنائے سوئز پر قبضہ نہ کر لیا جائے اُس وقت تک بحیرۂ روم و بحیرۂ احمر کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں کہ نپولین نے اکتوبر ۱۷۹۸ء ہی میں خاکنائے سوئز فتح کر کے بحیرۂ احمر کی بندرگاہوں تک پہونچنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن چند در چند وجوہ سے اس کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا

بہر حال کافی غور و خوض کے بعد نپولین نے خاکنائے سوئز پر قبضہ کرنے کا مکمل و مفصل نقشہ مرتب کر لیا اور جنرل بون (Bon) کو سات سو سپاہیوں کا دستہ، پچاس گھوڑے اور دو توپیں دیکر سوئز کی طرف پیش قدمی

کرنے پر مامور کیا۔ چنانچہ جنرل بون ۲۔ دسمبر ۱۷۹۸ء کو قاہرہ سے روانہ ہوکر، دسمبر کو منزل مقصود تک پہنچ گیا اور چونکہ اس فرانسیسی دستہ سے کسی نے مزاحمت نہیں کی اس لئے سویز پر آسانی سے قبضہ کرلیا گیا۔

۲۴۔ دسمبر کو خود نپولین بندرگاہ سویز کا معائنہ کرنے روانہ ہوا۔ اور اُس نے پایۂ تخت قاہرہ اور گرد و نواح کا چارج جنرل کلیبر کو دیدیا۔ اس سفر میں بہت سے ماہرین اور خاص خاص لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ (جن میں ریاضی انجینری، کیمیا، طب وغیرہ ہر فن کے ماہر تھے) ان کے علاوہ بہت سے بااثر تُرک بھی نپولین نے اپنے ساتھ لئے اور حفاظت کی غرض سے ۳۰۰ سو سوار ۲۰۰ سو پیادہ رہنما بھی پورے سازوسامان کے ہمراہ تھے اور بہت سے تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ بھی ساتھ تھے۔ سب سے زیادہ عجیب چیز جو اس کاروان کے ساتھ تھی وہ ایک گاڑی تھی جس میں چھ گھوڑے جوتے جاتے تھے، حالانکہ ریگستان میں اس کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اور نہ اس گاڑی سے کام لیا گیا کیونکہ نپولین ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہوکر سفر کرتا تھا۔

اس شاندار قافلہ نے پہلی شب برکتہ الحاجی نامی جھیل کے کنارے بسر کی، اور دوسری رات شجرۃ الحمر تک پہونچ گئے کہتے ہیں کہ رات میں اس قدر شدت کی سردی تھی کہ کسی کی پلک تک نہ جھپک سکی۔ بہت سے لوگوں نے شجرۃ الحمر (سُرخ درخت) کو کاٹ کر جلانا چاہا۔ لیکن نپولین نے منع کردیا، کیونکہ اس علاقہ میں اس کے سوا دُور دُور تک کوئی درخت نہیں تھا۔ اور یہ درخت مسافروں کی رہنمائی کا کام دیتا تھا۔ اس جگہ بہت سے اونٹوں اور گھوڑوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے بھی پڑے تھے۔ بعض ستم ظریفوں نے انھیں جمع کرکے آگ لگادی۔ لیکن جب ہڈیوں کے جلنے کی بُو سے دماغ پھٹنے لگا تو اپنی حرکت پر شرمندہ ہوئے اور آگ بُجھا کر خیموں میں جا لیٹے۔ اور سردی میں کروٹیں لے لے کر رات کاٹی۔

ایک تاجر کو جو اس قافلہ میں تھا یہ بات دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ نپولین جو اتنا بڑا آدمی اور اتنا مشہور جنرل ہے اپنے ساتھ صرف تین خدمتگار لایا ہے۔ جب اس شخص سے ضبط نہ ہوسکا تو اس نے نپولین کے ترجمان محمد آلیاس سے کہا کہ "جناب! میں ایک معمولی سا دُکاندار ہوں مگر میرے ساتھ گیارہ نوکر ہیں، لیکن نپولین بوناپارٹ جو اتنا بڑا جنرل اور تمام مُلک کا مالک ہے صرف تین نوکر ساتھ رکھتا ہے۔ واقعی مصر کے سلاطین اتنی سادہ اور سخت زندگی بسر نہیں کرسکتے تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ مغلوب ہوگئے۔"

دوسرے روز یعنی ۲۸۔ دسمبر کو یہ قافلہ صبح کو تین بجے بیدار ہوا، نپولین بھی ابھی تک قافلہ کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا تھا، لیکن وہ سویز پہونچنے کے لئے صد درجہ بیقرار ہورہا تھا، چنانچہ وہ چند رہنماؤں کو ساتھ لیکر یلغار کرتا ہوا چل کھڑا ہوا۔ اور مارا مارا اُسی روز شام کو سویز پہونچ گیا، باقی قافلہ حسب معمول خراماں خراماں اگلے روز سویز پہونچا۔

نپولین کی عادت تھی کہ وہ کبھی آرام کی پروا نہ کرتا تھا، بلکہ ہمیشہ نئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، چنانچہ اگلے روز یعنی ۲۹ دسمبر کو ان فرانسیسی جہازوں کے کپتانوں کو جو اس وقت سویز میں لنگر انداز تھے اور دوسرے معززین کو طلب کرکے ان سے تمام ضروری حالات معلوم کرلئے اور بندر سویز کی تجارتی اہمیت سے بھی بخوبی واقفیت حاصل کرلی۔

نپولین کے قیام مصر کے متعلق ایک عرب شیخ عبدالرحمٰن نامی نے بہت سے واقعات قلمبند کئے ہیں وہ نپولین اور اُس کے سپاہیوں کی سادہ اور سخت زندگی دیکھکر انگشت بدنداں تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ نپولین اپنے ساتھ کاغذ میں لپیٹ کر صرف تین چوزوں کے کباب لے گیا ہے، نہ اس شخص کے پاس کوئی خیمہ ہے نہ باورچی اور نہ بستر۔ اس کا ہر سپاہی اپنے ساتھ نوک سنگین پر صرف ایک ڈبل روٹی رکھتا ہے اور اسی میں سے ایک ٹکڑا کاٹ کر روز کھالیتا ہے۔ ان کے گلوں میں چھوٹی چھوٹی چرمی چھاگلیں پڑی رہتی ہیں، اور انھیں میں سے یہ لوگ پانی پیتے رہتے ہیں۔" بہرحال یہ واقعہ ہے کہ نپولین اور اس کے سپاہی بڑی سخت اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔

۲۹ دسمبر کا دن مقام "بیرالموسیٰ" کی زیارت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ جزیرہ نمائے سینا کی سڑک پر سویز سے تین میل کے فاصلہ پر پانچ کنوئیں ہیں جو حضرت موسیٰ سے منسوب ہیں۔ اس سفر میں نپولین کے ساتھ اس کے تمام جنرل اور دوسرے فوجی افسران بھی تھے اور رسالہ کا بھی بہت بڑا حصہ ہمراہ تھا۔ اثنائے سفر میں بحیرۂ احمر کی ایک کھاڑی پڑتی تھی جسے کشتیوں میں پار کرکے دو بجے دن کو یہ لوگ منزل مقصود پر پہونچے۔ موسیٰ کے کنوؤں کی زیارت کرنے کے بعد بیر تباہ کی بھی زیارت کی گئی اور یہ پارٹی مات کو واپس آگئی۔ واپسی کے وقت جوار بھاٹے کے اُترتے ہوئے پانی کی وجہ سے سخت پریشانی ہوئی، اور اسی کے ساتھ بعض لوگ راستہ بھول گئے اور ایک جگہ ایک دلدل میں پھنس گئے۔ جنرل کفاریلی کی جو اس فوجی دستہ کا کمان افسر تھا ایک ٹانگ نقلی تھی، کیونکہ اس کی اصلی ٹانگ دریائے رائن کی ایک جنگ کے نذر ہوگئی تھی۔ جب جنرل مذکور کا گھوڑا دلدل میں پھنس گیا تو وہ دھنستا چلا گیا اور قریب تھا کہ خود جنرل کفاریلی بھی دلدل میں پھنس جائے کہ اتنے میں ایک بہادر سپاہی نے اپنی جان پر کھیل کر جنرل کو موت کے منہ سے نکال لیا۔

دوسرے روز نپولین نے کاروباری لوگوں اور تاجروں سے صلاح مشورہ کیا۔ قلعہ بندیوں کی داغ بیل کے نقشوں کا بھی معائنہ کیا جو بندرگاہ سویز کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا جانا تجویز ہوئی تھیں۔

۳۰ دسمبر کو اتوار کے روز یہ مہم سویز سے واپس ہوئی اور اُسی روز رات کو قادشرود کے بڑاؤ تک پہونچ گئی لیکن سویز سے واپس ہونے کے پہلے نپولین نے اپنے بعض جرنیلوں، رہنماؤں اور پروفیسروں کی

مدد سے قدیم نہر سوئز کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ یہ قدیم نہر بحیرۂ احمر اور بحیرۂ روم کے درمیان نہیں تھی جیسے کہ اب ہے۔ بلکہ بحیرۂ احمر سے دریائے نیل کو ملاتی تھی۔ مثل مشہور ہے کہ "جوئندہ یابندہ" اس بارے میں نپولین کی کوشش کامیاب ہوئی اور اس کو پرانی نہر کا سراغ مل گیا جو اب ریت سے اٹی ہوئی خشک پڑی تھی۔ چار میل تک انھوں نے اس قدیم نہر کو مٹی ہوئی سی حالت میں دیکھا، لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے نہر کی حالت کسی قدر درست نظر آنے لگی، لیکن چار یا پانچ میل اور آگے بڑھے تو نہر کے نشانات بالکل غائب ہو گئے نپولین کو اس قدیم نہر سے اس قدر دلچسپی ہو گئی کہ وہ اس کے کھوج میں بڑھتا چلا گیا اور اپنے ہمراہیوں سے بھی چھوٹ گیا۔ اور صرف چند رفیقوں کے ساتھ ایک لامعلوم مقام میں کھڑا رہ گیا۔ لیکن تھوڑی ہی سی جدوجہد کے بعد اُسے راستہ مل گیا اور وہ اپنی جماعت کے ساتھ ۳۰۔ دسمبر کی شام کو خیر و عافیت کے ساتھ عاد شرود پہونچ گیا۔ یہاں پہونچکر مہم کے دو حصے ہو گئے، جن میں سے ایک سیدھا قاہرہ کی جانب اور دوسرا جس کے ساتھ خود نپولین تھا بلبیس کی طرف روانہ ہوا۔ ۳۱۔ دسمبر کی رات اثنا راہ میں بسر کی، اور یکم جنوری کی شب کو وہ بلبیس پہونچ گیا۔ جہاں جنرل رینیر (Rayner) مع اپنی فوج کے پہلے سے موجود تھا۔ لوروز کے دن تمام وقت نپولین نے قلعہ بندیوں کی دیکھ بھال میں صرف کیا جن کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ فوج کا جائزہ لیا اور گرد و نواح کے مقامات کی بھی جانچ پڑتال کی اور اس کے بعد ۳۔ جنوری کو بلبیس سے روانہ ہو کر ۶۔ جنوری کو پھر قاہرہ پہونچ گیا۔ یہاں سے اُس نے پروفیسروں اور انجنیروں کی ایک پارٹی اس غرض سے بھیجنے کا ارادہ کیا کہ جس قدیم نہر سوئز کا وہ سرسری معائنہ کر آیا ہے، اُس کی پوری طور پر پیمایش کریں اور یہ بھی دیکھیں کہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر کے پانی کی سطحوں میں کتنا فرق ہے۔

موسیو لیپیری اور موسیو سینٹ جینیس (M.Lepere & M.Saint Genis) نامی دو مشہور فرانسیسی انجنیر اپنے ساتھ ایک فوجی دستہ لیکر جس کی کمان جنرل جیونو (Junot) کے ہاتھ میں تھی، قاہرہ سے روانہ ہوئے اور ۱۵۔ جنوری ۱۷۹۹ء کو سوئز پہونچ گئے۔ ضروری انتظامات کے بعد انھوں نے ۱۳۔ جنوری سے نہر سوئز کا سراغ لگانا شروع کر دیا اور تلاش و تجسس کے بعد قدیم نہر کا سراغ لگا لیا۔ کنارے کنارے پندرہ بیس میل تک چل کر نہر کی گہرائی چار میٹر سے سات میٹر تک (میٹر = ۳۹٫۳۷ انچ) اور چوڑائی پچیس سے تیس میٹر تک پائی گئی لیکن کھاری جھیلوں[1] تک پہونچکر نہر کے سب نشانات غائب ہو گئے تھے، اور جھیلوں کے اس پار اس کا کہیں نام و نشان بھی باقی نہ تھا۔ اس مہم میں سب سے بڑی دقت جو پیش آئی یہ تھی کہ لوگوں کو پینے کا پانی نہیں ملا۔ چنانچہ جب میٹھے پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو مہم کو مجبوراً واپس آنا پڑا۔ اثنا راہ میں عرب قزاقوں نے

[1] نہر سوئز کے راستہ میں چار جھیلیں پڑتی ہیں، تساح، منزلہ اور دو کھاری جھیلیں جنھیں انگریزی میں Great & little Bitter lakes کہتے ہیں۔

ان پر حملہ پہ مار اگر اس کا مقابلہ کیا گیا۔ اسی طرح یہ لوگ لڑتے بھڑتے ۱۰ فروری ۱۷۹۹ء کو قاہرہ پہونچے، اس کے بعد سروے کی تکمیل کے لئے مہم بھیجنے کا پھر ارادہ ہوا۔ لیکن اسی اثنا میں ملک شام کی مہم پیش آگئی۔ جس کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

نپولین کے بعد ستمبر ۱۷۹۹ء میں جنرل کلیبر نے تیسری اور نومبر میں چوتھی مہم بھیجی۔ موسیو لیپیرے انجنیر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ۲۴ ستمبر کو قاہرہ سے روانہ ہوکر مصروف تحقیقات ہوا۔ اور اس نے معلوم کیا کہ بحیرۂ احمر کی سطح بحیرۂ روم کی سطح سے دس میٹر کے قریب بلند ہے۔ ۱۸۴۷ء میں موسیو تالابوت اور ۱۸۵۴ء میں موسیو فرڈیننڈ نے تحقیقات کی۔ ۱۸۵۹ء میں نہر کی کھدائی شروع ہوئی اور ۱۸۶۹ء میں موجودہ نہر سوئز تیار ہوگئی۔

گیتانجلی

(از پنڈت اندرجیت شرما۔ ماچھرہ ضلع میرٹھ)

دی مجھے تو نے حیاتِ جاوداں — تھی اسی میں مستتر مرضی تری
جسمِ خاکی کو بنا کر بار بار — بخشتا رہتا ہے تازہ زندگی
گھومتا ہے وادی و کہسار میں — ہاتھ میں چھوٹی سی لیکر بانسری
گونجتی ہے اس کے نغموں سے فضا — دل لبھاتی ہیں نوائیں رس بھری
تیرے چھونے سے ملا لطفِ دوام — قلب کو حاصل ہے روحانی خوشی
ہے مسرت خیز جذبہ کس قدر — پا نہیں سکتا خوشی کی حد کوئی
نعمتیں ہیں تیری بیحد بے شمار — بارشیں ہوتی ہیں جن کی ہر گھڑی
سیکڑوں پھر بھی گذر جاتے ہیں سال — نعمتوں میں آ نہیں سکتی کمی
ہے مگر اُن کے لئے خالی جگہ

ایک خواب

(از چودھری برجھان شنکر، ایم۔ اے۔ ایل ایل، بی)

کل جا رہا تھا خواب میں اُس سرزمین پر — آزادیوں کے حسن کی جو جلوہ گاہ تھی
مَیں انتہائے شوق میں مصروفِ سیر تھا — اتنے میں اِک فقیر نے گھبرا کے آہ کی

آواز اِس طرح سے لبوں سے جُدا ہوئی — دیتی ہوں جیسے خون رگیں اضطراب کی
اُٹھتی ہے جیسے موج چٹانوں کو توڑ کر — جیسے تڑپ کے روح چلے انقلاب کی

مڑ کر نظر جو کی تو نہ مجھ سے رہا گیا — دامن فقیر کا درم و زر سے بھر دیا
لیکن یہ بات اُس کو گوارا نہ ہو سکی — کہنے لگا کہ "آپ کے احساں کا شکریا"

آزاد سرزمین کے فقیروں کو بھی جنھیں — ہر صبح و شام بھیک کے ٹکڑوں سے کام ہے
دُکھ درد سہہ کے جان کا دینا بُرا نہیں — لیکن غلام قوم کا پیسہ حرام ہے

رُباعیات

جب درد سے ہمکنار ہو جاتا ہے — انساں ایماں شعار ہو جاتا ہے
آنکھیں کھلتی بھی ہیں تو ظالم اُس دن — جب تیر جگر کے پار ہو جاتا ہے

ایضاً

بد عہد کا اعتبار کرنا ہوگا — اس جبر کو اختیار کرنا ہوگا
مانا کہ حیات و موت یکساں ہیں مگر — کچھ دن ابھی انتظار کرنا ہوگا

سرفراز محل

(از شیخ تصدق حسین لکھنوی، بی۔ اے، ایل ایل۔ بی)

حسینی خانم نام، ملیح آباد کی رہنے والی تھیں، چہرہ کتابی رنگ سانولا نمکین آنکھیں رسیلی اور بڑی بڑی، قد لانبا، جسم گداز اور ہاتھ پیر گول تھے۔ غازی الدین حیدر شاہ اودھ کی نظروں میں سماگئیں انھوں نے موصوفہ سے نکاح کرکے سرفراز محل کا خطاب دیکر عزت افزائی فرمائی۔

سرفراز محل ہنگامۂ غدر تک پنج محلہ واقع مچھی بھون میں رہتی تھیں، جب ۱۸۵۷ء میں مچھی بھون پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا تو شہر میں کرایہ کا مکان لیکر سکونت اختیار کی۔ اس کے بعد اکبری دروازہ کے قریب محمود نگر کی چڑھائی پر ایک رفیع الشان مکان بنواکر وہیں بفراغت زندگی بسر کرنے لگیں۔

اُن کے کوئی اولاد نہ ہوئی، ۲۸۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو تقریبًا ستر برس کی عمر میں اپنے مکان مسکونہ میں انتقال کیا امام باڑہ نجف اشرف میں دفن ہوئیں، میر مونس نے چہلم کی مجلس پڑھی۔

امام باڑہ شاہ نجف میں داخل ہوتے وقت اُن کی قبر بائیں جانب گوشہ میں ملتی ہے جس پر لکڑی کا کٹہرا لگا ہوا ہے کہتے ہیں کہ اُن کے انتقال پر بعض لوگ اُن کے قیمتی جواہرات اور دیگر بیش قیمت اشیا، کھانے کے بہانہ سے خوانوں میں ڈھو کرلے گئے۔

سرفراز محل کا وثیقہ شاہ غازی الدین حیدر نے بروئے عہد نامہ ۱۷۔ اگست ۱۸۲۵ء ایک ہزار روپیہ ماہوار مقرر کیا تھا، اُن کے ملازمین ومتوسلین کے لئے بھی چھ سو انچاس (۶۴۹) روپیہ ماہوار وثیقہ کے علاوہ مقرر کئے تھے۔ وثیقہ کی ایک تہائی تین سو تینتیس (۳۳۳/۵/۴) روپیہ پانچ آنہ چار پائی کے لئے موصوفہ کو اختیار دیا تھا کہ جس کے حق میں چاہیں منتقل کردیں۔ مگر اُن کی وفات پر باقی ماندہ دو ثلث میں سے نصف کربلائے معلّٰی اور نجف اشرف بھیجا جائیگا جس کا ثواب بادشاہ کو ہوگا۔ چنانچہ بتاریخ ۴۔ اپریل ۱۸۶۱ء بیگم نے بابت ایک ثلث ایک وصیت نامہ تحریر کرکے چیف کمشنر مسٹر آر۔ ایچ۔ ڈیوس (R.H. Davis) کو برائے تصدیق بھیج دیا۔ جس کی رُو سے صرف تیئس (۲۳/۵/۴) روپیہ پانچ آنہ چار پائی اپنی قبر کے مصارف کے لئے رکھے، باقی رقم وثیقہ مختلف اشخاص کے نام جاری کرنے کی ہدایت تھی جن میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے رقم وثیقہ بالمعاوضہ خریدی تھی۔ اِس وصیت نامہ میں جو بارہ (۱۲) اشخاص وثیقہ یابندگان نامزد کئے گئے تھے اُن میں سے دو (۲) لاولد

وفات پاگئے لہٰذا بتاریخ ۱۴ جولائی ۱۹۰۶ء متونیان کے بجائے دیگر اشخاص کے نام درج کرائے گئے، اور محمد امین خاں متولی کے دس روپیہ ماہوار اور ہادی علی خاں متولی کے پندرہ روپیہ ماہوار بموجب وصیت نامہ مقرر کئے۔ یہ دونوں متولیان حنفی المذہب تھے۔ بیگم بھی ابتدا میں سُنی المذہب تھیں مگر بعد میں بادشاہ کی صحبت میں امامیہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ سرفراز محل کے ایک بھائی نواب علی محمد خاں عرف لعل خاں تھے، جن کے تین بیٹے امجد علی خاں، اکبر علی خاں اور احمد علی خاں تھے۔ اکبر علی خاں کے بیٹے افسر علی خاں تھے جنھوں نے تھوڑا عرصہ گزرا انتقال کیا۔

بعد رحلت سرفراز محل جن اشخاص کے نام وثیقہ جاری ہوا اُن میں سے خاص خاص آدمیوں کے اسماء درج ذیل ہیں:-

منشی کالکا پرشاد خریدار وثیقہ ایکسو پانچ روپیہ، داروغہ عاشق عسکری خریدار وثیقہ سینتالیس روپیہ

امجد علی خاں بھتیجہ سرفراز محل اکیس روپیہ، اکبر علی خاں بھتیجہ سرفراز محل سترہ روپیہ ماہوار

میاں شوکت علی خاں ناظر ڈیوڑھی خود تیس روپیہ ماہوار

اس وثیقہ کی تقسیم میجر ہارس فورڈ Major Horsford، افسر کچہری وثیقہ نے کی۔ املاک سرفراز محل واقع محمود نگر لکھنؤ کھُد کر بک چکی ہے اب صرف تھوڑا سا حصّہ باقی رہ گیا ہے۔

سرفراز محل (ثانی)

یہ بیگم کسی بادشاہ کی بیوی نہ تھیں مگر چونکہ یہ خطاب بھی ایک تاجدار اودھ کا بخشا ہوا ہے اس لئے ان بیگم کا تذکرہ بھی مختصر الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

بعد انتقال غازی الدین حیدر اُن کے فرزند دلبند شاہ نصیر الدین حیدر نے یہ خطاب اپنے وزیر اعظم نواب روشن الدولہ کی ایک بیوی کو دیا تھا۔ شروع زمانۂ وزارت میں شاہ موصوف روشن الدولہ پر بہت مہربان تھے، اکثر اُن کی کوٹھی میں تشریف لے جاتے تھے۔ روشن الدولہ باہر کی نشست اُن کے خلاف مزاج سمجھکر اُن کو زنانخانے میں لے جاتے تھے جہاں ارباب نشاط کی صحبت گرم رہتی تھی اور روشن الدولہ کی بیوی بھی ہنسی مذاق، دلچسپ قصّوں اور گرما گرم فقروں سے بادشاہ کے دل کو بہلائے رہتی تھیں۔ ان مسماۃ کا نام حسینی اور دوسرا نام محبوبن تھا۔ پہلے طوائف کا پیشہ کرتی تھیں مگر روشن الدولہ نے ان کو گھر بٹھا لیا تھا۔ روشن الدولہ کے بیٹے مرزا محمد حسن خاں انھیں بی حسینی کے بطن سے تھے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر بی حسینی کو سرفراز محل کا خطاب عطا فرمایا۔ اور اُن کے پسر محمد حسن خاں کو لشکر سلطانی کا جرنیل مقرر کیا۔ جرنیل کی شادی نواب معتمد الدولہ آغا میر کی کدو کاوش سے شہزادہ سلیمان شکوہ کی ایک بیٹی سے ہوئی، جن کی ایک دختر نواب،

سلطان رقیہ بیگم شاہ نصیر الدین حیدر کو پیشتر ہی سے منسوب تھیں، اِس طور پر جرنیل محمد حسن خاں بادشاہ کے ہمزلف ہو گئے۔ گو شہزادہ سلیمان شکوہ کو یہ نسبت کسی طرح منظور نہ تھی مگر معتمد الدولہ کے دبدبہ اور جبروت سے بے بس ہو گئے۔ شروع زمانۂ حکومت حضرت محمد علی شاہ میں روشن الدولہ معزول ہوئے، اور اُن کی کل املاک محاسبہ میں ضبط کی گئی جس پر کئی لاکھ روپیہ عملۂ شاہی کی نذر کر کے کانپور چلے گئے وہاں جرنیل باپ سے دس لاکھ روپے لیکر اُن سے جُدا ہو گئے۔ روشن الدولہ تو گھر سے خرچ کرتے کرتے بالکل تہیدست ہو گئے اور آخر میں تنگی ترشی سے زندگی بسر کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے مگر جرنیل بہت چلن سے زندگی بسر کرتے رہے۔

انوارِ لطیف

(حضرت لطیف انور)

کسی کی ناشنوائی کا کیا ملال کہ ہوں
فریب خوردۂ تاثیر نالۂ موزوں

خفا نہ ہو جو ترے غم کی داد دے نہ سکوں
شریکِ دل ہے بہر رنگ زندگی کا خوں

نہ مسکرا مرے دامانِ چاک پر اتنا
نہیں ہے فصلِ گل و لالہ تک نمودِ جنوں

وہی ہے کشمکشِ حُسن و عشق کا عالم
نہ کامیاب ہوا میری آرزو کا فسوں

اگرچہ شغلِ محبت ہے رنگ آمیزی
مرے خیال میں ہستی ہے ایک نقشِ زبوں

نگاہیں جم کے نہ رہ جائیں نیستی کی طرف
پیامِ زحمتِ ہستی ہوئی تلاشِ سکوں

خلوص ہی نہ ہو بُنیاد آدمیت کی
مَیں سوچتا ہوں زمانے میں ہو سکے گا یُوں

قریب ختم ہو بختی ہے راہِ بے منزل
دلِ فسردہ کو اندیشۂ ملال ہے کیوں؟

بُرا نہ مان تقاضائے ذوق ہے ساقی
کہ میکدے میں ابھی او رتشنہ کام رہوں

کسی نے داد نہ دی میرے ظرف کی انور
مگر یہ طعن، کہ بیگانۂ محبت ہوں!

سکونِ زیست

(از مسٹر یوسف ظفر۔ لاہور)

مذاقِ زیست سے عاری نہیں مری ہستی غمِ جہاں میں بھی دل کا خیال رکھتا ہوں
میں شوخ و سرد ہوں سرما کی دوپہر کی طرح غرورِ عشق و دلِ پائمال رکھتا ہوں
کیئے ہوئے ہوں محبت کے ہاتھ پر بیعت نظر میں دوست کا حُسن و جمال رکھتا ہوں
سُنا بھی سکتا ہوں شعر و شراب کی باتیں میں جانتا ہوں سخن کی مجال رکھتا ہوں
مذاقِ زیست کے باوصف بھی گدا ہوں میں
سکونِ زیست کو دستِ سوال رکھتا ہوں

سکونِ زیست میسر ہو کس طرح مجھ کو نہ جانے کیوں مری ہر شئے بدلتی جاتی ہے
جو کل تلک تھی خیالوں کے جام و مینا میں وہ آگ اب مرے سینے میں ڈھلتی جاتی ہے
بھلا رہا ہوں کسی کے فریبِ رنگیں کو سمجھ رہا ہوں کہ حسرت نکلتی جاتی ہے
کمال ہے کہ بعنوانِ دشمنِ الفت خود اپنے غم سے طبیعت بہلتی جاتی ہے
ستاتی جاتی ہے مجھکو اُدھر تری الفت
ادھر حیات مری ہاتھ ملتی جاتی ہے

درست ہے کہ ترا اس میں کچھ قصور نہیں عجب ہے کیا کہ تجھے میرا غم ستاتا ہو
تمام رات چھلکتے ہوں آنکھ میں آنسو تمام رات تصوّر دیئے جلاتا ہو
عجب نہیں ہے کہ دیتا ہو جب کوئی دستک معاً خیال مرا تیرے دل میں آتا ہو
سحر کو دیکھتی ہو جب اُٹھا کے آئینہ تو تیرے سامنے اِک دوست مُسکراتا ہو
مگر نہ جانے تجھے یہ خیال ہے کہ نہیں
کہ وہ بھی یونہی نہ فرقت کے دُکھ اُٹھاتا ہو

میں اب نہ آؤنگا در پر پُکارنے تجھکو مرے ندیم عبث میرا انتظار نہ کر
مٹا دے حرفِ غلط کی طرح مجھے دل سے مرے خیال سے تو دل کو سوگوار نہ کر

سُنا نہ رات کو اپنا فسانۂ اُلفت — سکوتِ شب کی نگاہوں میں تجھکو خوار نہ کر
یہ جان میں ہی نہیں تیرے عشق کے قابل — مرے گناہِ محبت کا اعتبار نہ کر

خزاں نصیب ہوں رہنے دے میری دلجوئی
بہار تو ہی تو ہے، تو غمِ بہار نہ کر

تجھے بھلانے کو فطرت میں کھو گیا ہوں میں — کسی طرح نہ ہو دل کو سکوں تو کیا حاصل
نظر میں ہونگے ستارے، نہ کہکشاں ہوگی — اُداس چاند کو دیکھا کروں تو کیا حاصل
نہ دے شفق مجھے غم میں صلاح مایوسی — کروں میں اُس کی طرح دل کا خوں تو کیا حاصل
زمانہ میری محبت پہ مسکراتا ہے — مَیں دل کا راز اگر کھول دوں تو کیا حاصل

تو ہی بتا کہ یہ کب تک رہے گی بیتابی
تمام عمر جو بیکل رہوں تو کیا حاصل

سیرِ گل

(از شایق ہندو)

وہ پھر رہے ہیں باغ میں مثالِ موجِ رنگ و بُو — جِلَو میں غمزہ و اَدا کا قافلہ لئے ہوئے
پیامِ جنگ دے رہی ہیں شوخیاں بہار کو — گُلِ اَدا ہیں دعوتِ مقابلہ لئے ہوئے
قدم قدم پہ نقشِ پا نے جڑ دیئے ہیں آئینے — رَوِش رَوِش ہے کہکشاں کا سلسلہ لئے ہوئے
نظر نظر ہے دے رہی ہزار درسِ معرفت — اَدا اَدا ہے جنتِ مطالعہ لئے ہوئے
تمام گُل ہیں منتظر نگاہِ انتخاب کے — دلوں میں قربتِ گلُو کا ولولہ لئے ہوئے

چمن کو لوٹنے چلے ہیں اس پہ یہ دلاوری
حنائے کف ہے ساتھ ساتھ مشعلہ لئے ہوئے

مَیں کیا ہوں؟

(از مولانا محمد یعقوب خاں کلامؔ، بی۔ اے)

مَیں ازل کی ابتدا ہوں، مَیں ابد کی انتہا ہوں
جو خودی ہوئی تو بندہ، نہ خودی ہوئی خدا ہوں

مَیں دعاؤں کا اثر ہوں، میں دلوں کا مدعا ہوں
جو غرض سے بے غرض ہوں، تو خدا ہی جانے کیا ہوں

مرا قطرہ لاکھ دریا، مرا ذرہ لاکھ صحرا
مرا قلب لاکھ دنیا، میں وہ شانِ کبریا ہوں

مرا سر ہے میری مسجد، میرا دل ہے میرا مندر
مرے سجدوں میں خدا ہے، مَیں بُتِ خدا نما ہوں

یہ زمین و آسماں ہیں، میری پستی و بلندی
کبھی عرش پر مکیں ہوں، کبھی خاک پر گرا ہوں

کبھی خلقِ مصطفےٰ ہوں کبھی زورِ مرتضیٰ ہوں
کبھی خاک و خوں میں کھیلوں، تو شہیدِ کربلا ہوں

ہے کلامؔ جب سے حاصل مجھے بیعتِ مغانہ
کرے خم طواف جس کا، میں وہ رندِ پارسا ہوں

(۲)

اگر داغِ دل کی تجلّی دکھادوں
نئے سے نیا طورِ سینا بنا دوں

اگر مَیں کبھی آپ بیتی سنا دوں
زمانے کو ماضی کے قصّے بھلا دوں

اُٹھیں خاک سے میری منصور لاکھوں
جو تجھ پر فدا ہو کے خود کو مٹا دوں

علاجِ تپِ ہجر کردے جو کوئی
دُعا دوں، دُعا دوں، میں دل سے دُعا دوں

ذرا ناز سے آپ دو گام ٹہلیں
ابھی چٹکیوں میں قیامت بلا دوں

جوانی سے اُلجھا ہے بچپن کسی کا
چل اے دل تجھے بھی تماشا دکھا دوں

اشاروں میں بولی وہ چشمِ سخن گو
کلامؔ آج کیا کوئی ساغر پلا دوں

تصحیح زمانہ جنوری [illegible] میں صفحہ ۵۳ پر مدہوش صاحب کی رُباعی غلط چھپ گئی ہے، اصل رباعی درج ذیل ہے ناظرین درست کرلیں؟۔

بیٹھے ہو اُداس اہلِ ظلمت صد حیف
ہوتے ہو نراس اہلِ ظلمت صد حیف
ظلمات کے آگے آبِ حیواں بھی ہے
ہو عاصیِ یاس اہلِ ظلمت صد حیف

تنقیدِ کتب

پیامِ شوق

نظامی پریس بدایوں نے پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق پنشنر ڈپٹی کلکٹر کی غزلوں کا ایک دلپذیر مجموعہ شائع کیا ہے۔ شروع میں حضرت نظامی بدایونی کا دیباچہ، پنڈت منوہر لال صاحب زتشی، ڈاکٹر سید محمد حفیظ اور پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کی تنقیدیں بھی شامل ہیں۔ جن میں جناب شوق کے محاسنِ کلام پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

جناب شوق کو حضرت امیر مینائی کی شاگردی کا فخر حاصل ہے، گو امیر کی وفات کے بعد آپ نے دیگر حضرات سے بھی مشورۂ سخن کیا۔ لیکن آپ نے زیادہ تر اثر امیر مینائی اور منیر شکوہ آبادی کا قبول کیا۔ بہرحال یہ مجموعۂ کلام نصف صدی سے زیادہ عرصہ کی مشقِ سخن کا نتیجہ ہے جس میں ہر قسم کے خوش بو اور رنگین گل و غنچے نظر آتے ہیں رکیک اور مبتذل باتوں سے شوق کا کلام بالکل پاک ہے۔ جناب شوق کی زبان بھی شستہ اور ٹکسالی ہے۔ پنڈت جی نے اصولِ فن کو بھی کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

جہاں تک ہم نے جناب شوق کے اس مجموعۂ کلام کو نقادانہ نظر سے دیکھا ہے ہمیں جذبات عالیہ کی فراوانی نظر آئی، دو چار شعر ملاحظہ ہوں:-

ایک جویائے حق کے نزدیک دنیا کا ذرہ ذرہ معشوق حقیقی کا جلوہ گاہِ ناز ہوتا ہے، چنانچہ جناب شوق فرماتے ہیں:-

کسی کا جلوہ گہِ ناز جب نظر آیا — سرِ نیاز زمیں پر جھکا دیا میں نے

عاشق کا دل کبھی امیدوں اور تمناؤں کا گہوارہ ہوتا ہے اور کبھی یاس و حرماں کی جولانگاہ۔ شوق نے اسی بات کو کس قدر موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے:-

یاس و حرمان و تمنا، حسرت و رنج و الم — شوق سے سنیئے کہ سب کچھ دل کے افسانہ میں ہے

کعبہ و بتخانہ سمجھنے والوں کے نزدیک اینٹ پتھر کے گھروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہی سمجھ کر شوق نے کہا ہے:-

رہا جب تک تو ں دیر و حرم میں — سمجھ آئی کہ بہکایا گیا ہوں

اصلی چیز دھیان گیان ہے، اور گیان دھیان کا میخانہ وہ میخانہ ہے جس کے ایک ہی جرعہ میں سرشار ہو کر

انسان اس اعلیٰ مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں بس وہی وہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ یا جلوۂ حقیقت شوقؔ کا شعر سنیئے:-

کہاں سے شوقؔ، شوقِ دید لایا ہے کہاں مجھکو کجا بتخانہ و کعبہ! کجا مخانہ و ساقی

اس شعر میں دیکھئے "تصویر" کا لفظ کس حسین پہلو سے استعمال کیا گیا ہے:-

وہ کون سی صورت تھی، کیا تجھ سے کہیں اے دل جس رُخ سے اُسے دیکھا تصویر نظر آئی

یہ شعر کتنا پُر از سوز و گداز ہے:-

علاج دردِ جگر چارہ ساز رہنے دے مزا اسی میں ہے سوز و گداز رہنے دے

میر تقی میرؔ کے رنگ میں کیا پیارا شعر کہا ہے:-

رفتہ رفتہ تا درِ جاناں بیٹھتے اُٹھتے یوں پہونچے ٹھوکریں کھاتے گرتے پڑتے، صبح سے تا شام چلے

بعض اشعار کی برجستگی ملاحظہ ہو:-

بُتکدہ چھوڑنے والے تو نہ تھے خیر ملتی ہے تو جنت ہی سہی

جاتے کعبہ میں بُت پرستی کو یہ بھی اک فرض تھا ادا کرتے

اس دیوان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر غزل کے ساتھ اس کا سنِ تصنیف بھی درج ہے اور جناب شوقؔ کا فوٹو بھی دیدیا گیا ہے۔ قیمت سوا روپیہ، ملنے کا پتہ:- نظامی پریس بدایوں۔

URDU PROSE
Under the influence of Sir Sayyed.
اُردو نثر پر سرسیّد کا اثر[۱]

سلیس اُردو کی نثر نگاری کے میدان میں سب سے پہلا قدم مرزا غالبؔ نے اپنے خطوط میں اُٹھایا تھا جس میں اُنھوں نے ایسا اسلوب بیان اختیار کیا گویا آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ اسی داغ بیل پر سرسیّد احمد خاں اور اُن کے احباب مثلاً شبلیؔ، حالیؔ، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، ذکاء اللہ نے اُردو نثر کو مستقل ادب کی صورت دیدی۔ اس کتاب میں جو انگریزی زبان میں ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عبداللہ ایم۔ اے کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے یہی بات دکھائی گئی ہے کہ اُردو نثر نے کن کن اہل قلم کی امداد سے موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ فاضل مصنف نے اُردو لٹریچر کے ہر شعبہ پر نہایت قابلیت سے جداگانہ بحث کی ہے۔ شروع میں ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کا تمہیدی مضمون بھی خاص قابلیت سے لکھا گیا ہے۔ چھپائی، کاغذ، جلد سب قابلِ قدر ہے

[۱] قیمت ساڑھے تین روپیہ، ملنے کا پتہ:- شیخ مبارک علی بک سیلر و پبلشر، اندرون لوہاری دروازہ لاہور



NIZAMI PRESS, BUDAUN.

مضامین محمد علی حصہ دوم[1]

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے ادبی، تاریخی، سیاسی و اصلاحی مضامین کا ایک مجموعہ جامعۂ ملیہ دہلی کی کوششوں سے اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے، جس پر 'زمانہ' میں تنقید کی جا چکی ہے۔ اب پروفیسر محمد سرور صاحب نے مولانا مرحوم کے ۳۴ مختلف ادبی، تاریخی، سیاسی و اصلاحی مضامین کا دوسرا حصہ مرتب کیا ہے۔ اس کا پہلا باب سب سے زیادہ اہم ہے جس میں تیرہ مضامین درج ہیں۔ ان مضامین میں ہندو مسلم مناقشات کے اسباب و محرکات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ سیاسی مضامین اکثر ایسے ہیں جن میں کانگریس پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ دراصل یہ مضامین اس وقت کے ہیں جب مولانا مرحوم اور اُن کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔ اسی وجہ سے بعض مضامین میں فرقہ وارانہ جذبات کا رنگ جھلکتا ہے۔ سات مضامین کا تعلق حجاز، افغانستان اور چین سے ہے۔ اور پانچ مضمون علامہ سر محمد اقبال مرحوم اور ان کی شاعری کے متعلق ہیں۔ ہر مضمون مولانا نے اپنے مخصوص انداز بیان میں لکھا ہے۔

ان تمام مضامین سے ہندوستان کی موجودہ سیاسیات پر بہت کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ مولانا محمد علی کے خیالات میں وقتاً فوقتاً کیا کیا تغیر و تبدل ہوئے۔ اس طرح یہ مضامین نہ صرف موجودہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ خود مولانا کے کیرکٹر کو بھی روشنی میں لاتے ہیں۔ لکھائی۔ چھپائی۔ کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۴۰۳ صفحات

اسلامی نظام تعلیم[2]

سید ریاست علی ندوی رفیق دار المصنفین نے اس کتاب میں فن تعلیم کے متعلق مختلف مسلمان علماء کے نظریئے اور متفرق خیالات اور اسلامی بزرگوں کے تعلیمی واقعات جمع کر دیئے ہیں جن سے ناظرین یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلامی عروج کے زمانہ میں مسلمانوں کی تعلیم کا نصب العین کیا تھا۔ کس طرح اخلاق و سیرت کی تعمیر کی جاتی تھی، نصاب کیا تھا، درس کیونکر دیئے جاتے تھے، استادوں کے کیا فرائض تھے، اور انہوں نے اپنے وقت میں قدیم طریقۂ تعلیم کی خامیوں کی اصلاح کی کیا کیا کوششیں کی تھیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اسلامی زمانہ کے اسکولوں وغیرہ پر بھی بہت کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرض اُردو زبان میں یہ اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس جوبلی کے موقعہ پر لکھی گئی تھی۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب نفیس۔ ضخامت بڑی تقطیع کے ۲۷۵ صفحات

---

[1] قیمت ڈھائی روپیہ ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعۂ ملیہ دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ۔ لاہور۔ بمبئی۔ [2] ملنے کا پتہ دار المصنفین اعظم گڑھ

شمس المعارف حصہ چہارم[1]

مولوی منظور الحق صاحب تکلیم بی بی پور ضلع اعظم گڈھ نے اس کتاب میں بڑی تلاش و تجسس سے اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواری شریف کے خطوط فراہم کرکے یکجا کر دیئے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ اس کتاب کا چوتھا حصہ ہے خطوط کیا ہیں تصوف کے نکات اور رشد و ہدایت کے رموز کا خزانہ ہیں۔ سالکین راہ طریقت کو اس کتاب میں بہت سے قابل قدر نکتے ملیں گے۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۲۲ صفحات اسکی ضخامت ہے۔

حسین ابن علی[2]

اس کتاب میں حضرت نگہت شاہجہانپوری نے کربلا کے تاریخی واقعات مختلف مستند حوالوں سے درج کئے ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حضرت امام حسین کی سیرت پر بھی اصولی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ چونکہ کتاب کا اسلوب بیان فلسفیانہ ہے اس لئے اس کی زبان بھی اسی رنگ کی ہے۔ بہر حال اہل ذوق اس سے بہت کچھ اخلاقی باتیں حاصل کر سکتے ہیں۔

زباندانی[3]

آجکل کوشش یہ ہو رہی ہے کہ اُردو زبان کو فروغ دیکر اس کو ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان قرار دیا جائے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اُردو زبان اب بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یو۔ پی۔ کے علاوہ دوسرے صوبوں کی زبان اور محاورے مختلف ہیں۔ اس افراط و تفریط کو دُور کرنے اور اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے کے لئے مولوی فضل الٰہی صاحب عارف نے یہ کتاب لکھکر اس بات کی کوشش کی ہے کہ تمام ہندوستانیوں کو اگر "اہل زبان" نہیں تو "زباندان" تو بنا ہی دیا جائے اس کتاب میں تین باب ہیں، جن میں پہلا اور تیسرا باب خاص طور سے قابل مطالعہ ہے پہلے باب میں اُردو گرامر کے چند ضروری قاعدے درباره جمع، تذکیر و تانیث، تلفظ، املا وغیرہ بتائے گئے ہیں، دوسرے باب میں مختلف قسم کے اسماء سے بحث کی گئی ہے۔ اور چیزوں کے ناموں کی فہرست دی گئی ہے۔ تیسرے باب میں اچھی اُردو کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ عورتوں کی زبان کی مثالیں بھی دی ہیں، اور اُردو میں جو نئے لفظ داخل ہو گئے ہیں اُن سے بھی بحث کی گئی ہے، جو الفاظ انگریزی زبان سے آئے ہیں انھیں انگریزی میں لکھکر سامنے ترجمہ لکھکر تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ غرض یہ کتاب طالب علموں، نوخیز ادیبوں اور یو۔ پی سے باہر کے باشندوں کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ عمدہ ضخامت ۲۰۰ صفحات

---

[1] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ ماسٹر عبدالسلام عثمانی دیوریا۔ گورکھپور۔ یا مولوی منظور الحق تکلیم پنشن ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہانپور

[2] ضخامت پانچ جزو۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ کشمیری بازار لاہور۔

[3] ملنے کا پتہ:۔ اُردو اکیڈیمی پنجاب۔ لوہاری دروازہ لاہور۔

آسان اُردو

انجمن ترقی اُردو حیدر آباد دکن نے ناخواندہ بالغوں کو صاف اور سلیس اُردو سکھانے کے لئے چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور سبق آموز کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا ہے۔ چنانچہ "آسان اُردو" اس سلسلہ کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں عربی، فارسی یا سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کے استعمال سے قطعی پرہیز کیا گیا ہے۔ مختلف دلچسپ اور سبق آموز موضوعات پر مضامین لکھے گئے ہیں۔ تاریخی حصہ میں مشہور بزرگوں کی سوانح عمریاں ہیں جیسے اناتنک، تلسی داس، خواجہ غریب نواز وغیرہ۔ سماجی حصہ میں دلچسپ اصلاحی کہانیاں ہیں۔ علمی حصہ میں چھوٹے چھوٹے سائنٹیفک مضامین ہیں۔ جیسے بجلی، لاسلکی، ریل گاڑی وغیرہ چوتھے حصہ میں مشہور اُردو شاعروں کی نظمیں، غزلیں اور رباعیاں درج ہیں۔ غرض کتاب محنت سے مرتب کی گئی ہے۔ اس کا حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۶۱ صفحات۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ: معتمد صاحب انجمن ترقی اُردو۔ بجارہ روڈ حیدر آباد دکن۔

فہم انسانی

یہ کتاب انگلستان کے نامور فلسفی ڈیوڈ ہیوم کی مشہور و معروف کتاب Human Understanding کا ترجمہ ہے۔ مولوی عبدالباری پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ایک طبعزاد تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے شروع میں ہیوم کی سوانح عمری بھی دیدی ہے اور اس کے فلسفہ پر مفصل بحث کرکے یہ بھی دکھادیا ہے کہ اس کا ماحصل کیا ہے۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ ترجمہ میں اگر کوئی نقص ہے تو یہ کہ اسمیں اکثر ثقیل اصطلاحیں جیسے التصاق۔ عوامل۔ معلولات بستقیم الخطین، وغیرہ) استعمال کی گئی ہیں۔ اسلئے عبارت اکثر دقیق ہوگئی ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ ہے۔ ضخامت بڑی تقطیع کے تقریباً دوسو صفحات۔ ملنے کا پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

سرودِ جاوید

اُردو زبان میں پنڈت دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" اور میر حسن دہلوی کی "سحر البیان" اپنا جواب نہیں رکھتیں صنائع بدائع شعری اور حسن اختصار میں جس طرح "گلزار نسیم" پر آج تک کوئی اُردو مثنوی سبقت نہیں لیجاسکی اسی طرح سلاست بیان اور منظر کشی میں مثنوی "سحر البیان" اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ کتاب بھی مثنوی سحر البیان کا ایک تازہ ایڈیشن ہے جسے مولوی محمد شمس الحسن صاحب شمس قریشی بریلوی نے بڑی محنت کے ساتھ اڈیٹ کرکے "سرود جاوید" کے نام سے شائع کیا ہے۔ شروع میں شمس صاحب نے ایک بسیط مقدمہ لکھکر مثنوی پر مفصل تنقید کی ہے، اور محاسن کے ساتھ ساتھ معائب پر بھی روشنی ڈال کر فن تنقید کا حق

ادا کیا ہے۔ مقدمہ میں اُردو مثنوی کی تدریجی ترقی پر بھی قابل قدر بحث کی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ معمولی حجم ۴۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (ملنے کا پتہ:۔ اورنٹیل بک ڈپو۔ بریلی)

عصرِ نو

یہ مولوی محمد صادق صاحب ضیا اکبرآبادی کی ایک مسلسل اور سبق آموز نظم ہے۔ جس میں موجودہ زمانہ کی تمام خصوصیات پر عمدگی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اور لطف یہ ہے کہ کسی شعر میں محاسنِ فن کا دامن نہیں چھوڑا گیا ہے۔ غرض یہ نظم قابل تعریف اور خیالات بہت بلند و پاکیزہ ہیں۔

شروع میں مسٹر انور مختار بی۔ اے، ایل ایل، بی۔ نے تقریباً ایک جزو کا مقدمہ لکھکر اس کے محاسن پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ اوسط۔ ضخامت تین جزو قیمت تین آنہ ملنے کا پتہ۔ منیجر رسالہ شاعر آگرہ

سلسلۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

پچھلے دنوں مختلف صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے ہندوستان سے بے علمی و جہالت دُور کرنے کی جو مبارک کوشش شروع کی تھی، اُس کے ضمن میں جامعہ ملیہ دہلی نے سہل و سلیس ہندوستانی زبان میں دلچسپ اور مفید عام کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا ہے جس میں دو ڈھائی درجن کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں ہمارے پاس بھی ریویو کے لئے آئی ہیں اور ہم ان کو سرسری نظر سے دیکھکر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ملک سے ناخواندگی دُور کرنے میں یہ کتابیں واقعی مفید ثابت ہونگی۔ کیونکہ ایک تو ان کی زبان بہت سلیس ہے، دوسرے ان میں پڑھنے والوں کی تدریجی تعلیم کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً اُردو قاعدہ کو مبتدیوں کے لئے تین حصوں میں تقسیم کرکے صاحبزادہ محمد سعید الظفر صاحب سابق وزیر تعلیم ریاست بھوپال نے اس عمدگی سے مرتب کیا ہے کہ ایک اَن پڑھ شخص کو بہت جلد اُردو لکھنا پڑھنا آسکتا ہے، اور اگر کوئی شخص محبت اور توجہ کے ساتھ یہ تینوں قاعدے پڑھکر ان کے ہدایات پر عمل کرے تو تقریباً ایک مہینہ میں اُردو لکھنے پڑھنے کے لائق ہو جائیگا۔ اس کے بعد آسان زبان میں چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور سبق آموز قصے کہانیوں کی کتابیں ہیں۔ چوتھے حصے میں محمد صاحب کی مختصر سوانح عمری ہے۔ پانچویں میں آسان قومی نظمیں ہیں اسی طرح کسی میں میونسپلٹی کا ذکر کیا گیا ہے۔ کسی میں خط و کتابت کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ چند میں رہنمایان اسلام کی سوانحعمریاں درج ہیں۔ اور چند میں فسانہ عجائب، چہار درویش وغیرہ جیسے مشہور قصوں کے خلاصے پیش کئے گئے ہیں۔ ایک چھوٹی سی کتاب میں ضلع کے انتظامات سمجھائے گئے ہیں۔ اور ہندوستان کا مختصر جغرافیہ بھی بتایا گیا ہے اسی سلسلہ میں ایشیا یورپ اور دنیا کے نقشے بھی چھاپے گئے ہیں جس میں جغرافیہ سے متعلق تمام ضروری باتیں بتا دی گئی ہیں۔ ان سب باتوں کے لکھنے میں اختصار سے کام لیا گیا ہے چنانچہ کسی کتاب کی ضخامت ڈیڑھ جزو سے زیادہ نہیں ہونے پائی۔ ہمارے نزدیک یہ چھوٹی چھوٹی کتابیں بہت مفید اور پُر از معلومات ہیں جن سے بچے اور بالغ اَن پڑھ دونوں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ انکی لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی عمدہ ہے۔ ہر کتاب کی قیمت صرف ایک آنہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعۂ ملیہ۔ دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی۔

رفتارِ زمانہ

(یورپ)

جنگِ یورپ کے شعلے چاروں طرف بھڑک رہے ہیں، یورپ میں تو لڑائی کی تباہ کاریاں ہو ہی رہی ہیں پچھلے دو مہینوں سے افریقہ کے مختلف اطالوی مقبوضات میں بھی خوب گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ برطانیہ کی فوجیں بہادری کی داد دے رہی ہیں اور اٹلی پر ضرب پر ضرب لگا رہی ہیں۔ مشرقِ قریب کے حالات بھی تشویش انگیز ہو رہے ہیں اور امریکہ میں بھی جنگ کی صدائیں گونجنے لگی ہیں۔ یوں تو امریکہ ابھی تک میدانِ جنگ سے الگ تھلگ ہی ہے لیکن وہ برطانیہ اور یونان کی براہ راست مدد کر رہا ہے، اس لئے اسکو بھی بالواسطہ جنگ میں شریک سمجھنا چاہیئے۔ خصوصاً اب جب اس نے برطانیہ کو ہر قسم کی مدد دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔

یورپ میں اس وقت تین جگہ جنگ ہو رہی ہے، برطانیہ و جرمنی کے درمیان ہوائی و بحری جنگ جاری ہے بحیرۂ روم میں بھی ہوائی و بحری لڑائیاں ہو رہی ہیں، تیسرے البانیہ میں اٹلی اور برطانیہ و یونان کے مابین معرکے ہو رہے ہیں اور عنقریب ان کا دائرہ وسیع ہو کر بلقانی ریاستوں میں ایک چوتھا میدانِ جنگ قائم ہونیوالا ہے برطانیہ و جرمنی میں خشکی کی لڑائیاں بند ہیں لیکن فریقین وقتاً فوقتاً ایک دوسرے پر حملے کرتے رہتے ہیں فرانسیسی ساحل سے جرمنی کی دُور مار توپیں انگلینڈ پر اور انگلینڈ کے ساحلی توپخانے فرانس و بلجیم کے جرمن علاقوں میں گولہ باری کرتے رہتے ہیں۔ ہوائی حملے ایک دوسرے پر سختی سے جاری ہیں۔ مگر جرمن ہوائی حملوں کی اب پہلی سی شدت نہیں رہی۔ چنانچہ پچھلے پانچ ماہ کے ہوائی حملوں کے نقصانات کی تفصیل یہ ہے:۔

نام ماہ	کل حادثات	مقتولین کی تعداد
ستمبر ۴۰ء	۱۷۵۶۹	۶۹۵۴
اکتوبر ۴۰ء	۱۵۰۲۹	۶۳۳۴
نومبر ۴۰ء	۱۱۵۴۲	۴۵۸۸
دسمبر ۴۰ء	۸۰۳۷	۳۴۹۳
جنوری ۴۱ء	۳۵۱۴	۱۵۰۲

ہوائی حملوں کے شروع ہونے پر اوّل دو مہینوں کے نقصانات میں مقتولین کا اوسط ۷۰ ہزار سالانہ تھا مگر مندرجہ بالا پانچ مہینوں کا اوسط بیس ہزار سال کا رہا۔ البتہ اس دوران میں ویلز اور اسکاٹ لینڈ کے بعض

مقامات پر بھی حملے ہوئے ہیں۔

برطانوی ہوائی جہازوں نے جرمنی، بلجیم، ہالینڈ اور فرانس کے جرمن علاقوں میں فوجی اہمیت کے بہت سے مقامات مثلاً بندرگاہوں، کارخانوں، ریلوے اسٹیشنوں کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ چنانچہ جرمنی میں برطانیہ کے ہوائی جہازوں کا خوف پیدا ہوگیا ہے اور وہاں ان حملوں کے خلاف حفاظتی کارروائیاں اختیار کی گئی ہیں۔ انگلستان کے نقصانات کے متعلق جرمن ریڈیو میں بہت ہی مبالغہ آمیز بیانات شائع ہوتے ہیں لیکن جہاں تک اہل برطانیہ کی ہمت اور حوصلہ اور برٹش گورنمنٹ کی اولو العزمی کا تعلق ہے، ان نقصانات کا اثر چنداں محسوس نہیں ہورہا ہے۔ سب سے زیادہ نقصان شہر لندن کا ہوا ہے لیکن عوام لندن پہلے سے بھی زیادہ فتح حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ اور تمام برطانیہ پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ آخر تک لڑنے پر مستعد ہے۔

بحری جنگ کی حالت اس سے مختلف ہے، کیونکہ اس وقت تک جرمنی کے پاس کوئی جنگی بیڑہ نہیں ہے اور برطانیہ کا بحری بیڑہ بدستور سمندروں پر قابض ہے، اور جو برطانوی جہاز برطانیہ کو آتے یا برطانیہ سے جاتے ہیں ان کے کاروانوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ مگر جرمنی ہوائی جہازوں اور آبدوز کشتیوں سے کام لے رہا ہے اور کبھی اس کے "پاکٹ جنگی جہاز" بھی کھلے سمندروں میں اتحادی جہازوں پر گولہ باری کرکے یا تارپیڈو مار کر نقصان پہونچا دیتے ہیں۔ یہ نقصانات حال میں کسی قدر زیادہ ہوئے ہیں لیکن ان نقصانات کی ہمت و استقلال کے ساتھ تلافی کی جارہی ہے۔ امریکہ مدد دے رہا ہے اور خود انگلستان میں بھی رات دن نئے جہاز بن رہے ہیں، دشمن کے جہاز بھی انگلستان کے ہاتھ آتے رہتے ہیں۔ بہر حال اس وقت تک فریقین کے جتنے جہاز سمندر کی تہہ میں پہونچ گئے ہیں اُن کا وزن لکھوکھاٹن تک پہونچتا ہے۔

بحیرۂ روم میں برطانوی بیڑے کو نقصان پہونچانے اور برطانوی جہازوں کی آمد و رفت روکنے کیلئے جرمنی نے اطالوی جزیرۂ سسلی میں اپنا ہوائی اڈّہ قائم کرلیا ہے، جہاں سے جرمن ہوائی جہازوں نے برطانوی جہازوں کے ایک کاروان پر جو جنگی جہازوں کی حفاظت میں جارہا تھا حملہ کیا، اور چند جہازوں کو جن میں ایک جنگی جہاز اور ایک طیارہ بردار جہاز ساؤتھمپٹن نامی تھا غرق کردیا۔ مگر باربردار جہازوں کے قافلہ کو برطانوی جہازوں نے بچالیا، اور وہ مع تمام ضروری اور بیش قیمت سامان کے یونانی بندرگاہوں میں خیر و عافیت کے ساتھ پہونچ گئے

اس وقت جنوب مشرقی یورپ میں جنگ کا ایک نیا محاذ پیدا ہونے کا پورا سامان ہوگیا ہے۔ رومانیہ میں تو ہٹلر نے اپنا قبضہ کر ہی رکھا ہے اور اسکی فوج بھی وہاں بہت کافی تعداد میں موجود ہے۔ مگر اس وقت اس نے

اس نے بلغاریہ پر اپنا اقتدار پورے طور پر قائم کرلیا ہے چنانچہ ابھی تک بلغاریہ کی سرحد پر جرمن فوجیں جمع تھیں مگر ہفتہ عشرہ سے برابر یہ خبریں آرہی ہیں کہ جرمن کثیر تعداد میں بلغاریہ میں داخل ہوگئے ہیں۔ اور اب یوگوسلاویہ کو بھی جس پر جرمن نظام قبول کرنے کے لئے مجبور کیا جارہا ہے۔ یوگوسلاویہ کی سرحد ایک طرف جرمنی اور دوسری طرف البانیہ میں اٹلی سے ملی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ دونوں طرف سے محوری طاقتوں کی گرفت میں پھنسا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں ہٹلر نے یوگوسلاویہ کے وزیراعظم اور وزیر خارجیہ کو جرمنی میں طلب کرکے اس بات پر زور ڈالا تھا کہ وہ یورپ میں نیا نظام قائم کرنے میں جرمنی کا ساتھ دے۔ اور وہ علاقے جو ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد ہنگری اور بلغاریہ سے چھین کر اُسے دیدیئے گئے تھے ان دونوں ملکوں کو واپس کردے اور ان کے عوض اسکو شہر سقوطری مع مفصلات (جس کے اہل مانٹی نیگرو عرصے سے خواہشمند ہیں) اور البانیہ میں جھیل اوخیدہ کا علاقہ جس میں شہر کورٹزا وغیرہ شامل ہیں اور جو فی الحال یونانیوں کے قبضہ میں ہیں دیدیئے جائیں گے اور اسے بندرگاہ سالونیکا استعمال کرنیکا اختیار بھی رہے گا۔ ان وعدوں کا کیا حشر ہوگا یہ تو آئندہ واقعات ہی بتلائیں گے لیکن اسوقت بلقانی ریاستوں کی پالیسی ظاہر ہے تاہم اسوقت تک ترکی مضبوطی سے برطانیہ کا ساتھ دے رہا ہے اور یوگوسلاویہ نے بھی پانچ لاکھ نئی فوج تیار کیلی ہے ترکی کا خیال ہے کہ یوگوسلاویہ اسی کے ساتھ رہیگا اسوقت بلغاریہ میں جرمنی کا جو فوجی اجتماع ہوا اسکا منزل مقصود یونان ہی ہے پہلے یہ خیال تھا کہ روس بلغاریہ کو جرمنی کے اثر میں آنے نہ دیگا لیکن اُس نے عجیب پیچیدہ رویہ اختیار کر رکھا ہے اور اس کی پالیسی ایک ناقابل حل معمہ بن گئی ہے ترکی کے متعلق بھی یہی خیال تھا کہ وہ بلغاریہ میں جرمن فوجوں کا داخل ہونا پسند نہ کریگا لیکن پچھلے دنوں ترکی اور بلغاریہ کے درمیان ایک غیر جارحانہ معاہدہ ہوچکا ہے جسکی رو سے فریقین نے ایک دوسرے پر کسی حالت میں حملہ نہ کرنیکا قول و قرار کرلیا ہے۔ اس کے معنے یہی ہوسکتے ہیں کہ ترکی یونان کے لئے جنگ میں شامل ہوکر اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالے گا اور اس وقت تک لڑائی سے بچا رہیگا جب تک خود اُس کے حدود پر حملہ نہ ہو لیکن اس معاہدہ کے باوجود ترکی کی طرف سے بار بار اس بات کا اعلان ہوا ہے کہ برطانیہ کے ساتھ وہ اپنے دوستانہ معاہدہ پر مضبوطی سے قائم ہے گا۔

برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ایڈن اور برطانوی فوج کے افسر اعلیٰ سر جان ڈِل ۲۷ فروری کو انقرہ جاکر دو گھنٹہ تک پریسیڈنٹ ترکی سے آئندہ انتظامات کے متعلق مفصل بات چیت کرچکے ہیں اور یہ خبر اطمینان بخش ہے کہ تمام مسئلے فریقین نے اتفاق رائے سے باہم طے کرلئے ہیں جہانتک بلغاریہ کا تعلق ہے برطانیہ نے اس سے سیاسی تعلقات منقطع کرلئے ہیں اور صوفیہ کا برطانوی سفارت خانہ بھی بند ہوچکا ہے۔ لندن میں بلغاریہ کے سفیر نے اپنے عہدے سے استعفےٰ دیدیا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ اُس نے اپنی گورنمنٹ کی موجودہ پالیسی پسند نہیں کی بہرحال اب رومانیہ اور بلغاریہ دونوں برطانیہ کے لئے دشمن ملک ہیں۔

البانیہ میں یونان اور اٹلی میں برابر لڑائی جاری ہے اور اٹلی کو ہر جگہ شکست ہورہی ہے حتیٰ کہ البانیہ کے ایک تہائی حصہ پر یونانی قبضہ ہوگیا ہے۔ ایک طرف بندرگاہ ویلونا اور دوسری طرف دراز و بھی خطرے میں پڑگئے تھا۔

ئہ اسکے بعد روس نے بلغاریہ میں جرمن فوجوں کے داخلہ [illegible] گم کرا [illegible]

اگر یونانیوں کا ان دونوں بندرگاہوں پر قبضہ ہوگیا تو گویا تمام البانیہ اٹلی کے ہاتھ سے نکل جائیگا۔ مسولینی نے اپنی پچھلی تقریر میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اٹلی آٹھ ماہ سے نہیں بلکہ پچھلے چھ سال سے لڑ رہا ہے اسی وجہ سے اسے اس جنگ میں پوری ہمت اور طاقت سے لڑنے کے باوجود نقصان اُٹھانا پڑا ہے ابتک صرف البانیہ میں اٹلی کے ایک لاکھ ۲۲ ہزار آدمی ضائع ہو چکے ہیں، جن میں سے ہزارہا مارے گئے، ہزارہا زخمی ہوئے اور ہزارہا لاپتہ ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو یونانیوں نے قید کر لئے ہیں۔ اب خبر ہے کہ ہٹلر اپنی پوری طاقت سے یونان پر حملہ کرنے والا ہے۔ وہ اپنی تازہ ترین تقریر میں بھی کہہ چکا ہے کہ اس وقت وہ اٹلی کی مدد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا۔ موسم بھی تبدیل ہو رہا ہے اور بارش اور برفباری ختم ہو گئی ہے چنانچہ تازہ دم جرمن فوجیں یونان میں گھمسان کی لڑائی کرنے والی ہیں۔

افریقہ افریقہ میں چار جگہ لڑائی ہو رہی ہے، لیبیا، اریٹیریا، حبش، مشرقی افریقہ۔ شروع شروع میں اٹلی کو کچھ فتوحات حاصل ہوئیں۔ چنانچہ ایک طرف تو اٹلی کی فوج لیبیا سے چلکر تقریباً ستر اسی میل تک مصر میں داخل ہوگئی دوسری طرف اس نے اریٹیریا سے بڑھکر سوڈان پر حملہ کیا اور کسلا وہ لے لیا اور برطانوی صومالی پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس کے علاوہ حبش کی طرف سے کینیا پر حملہ کرکے مویالا اور گردونواح کا علاقہ بھی اٹلی نے لے لیا تھا۔ لیکن جب آسٹریلیا۔ جنوبی افریقہ۔ نیوزیلینڈ اور ہندوستان سے برٹش فوجیں پورے ساز و سامان کے ساتھ کثیر تعداد میں پہونچ گئیں تو لڑائی کا پانسہ ایک دم سے پلٹ گیا۔ اور برٹش فوج نے جو ابتک محض مدافعت کر رہی تھی طاقتور حملے کرنے شروع کر دیئے اور چند ہی روز میں دشمن کو نہ صرف اپنے علاقوں سے نکال باہر کر دیا بلکہ دشمن کا کثیر علاقہ بھی فتح کر لیا۔ کتنی تیزی سے یہ فتوحات حاصل ہوئیں اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۱۱۔ دسمبر کو سیدی برانی فتح ہوا جہاں سے بھاگ کر اطالوی فوجوں نے سلوم میں مورچے جمائے۔ مگر برٹش فوج نے یہاں بھی دشمن کے پاؤں جمنے نہ دیئے اور ۱۶۔ دسمبر ۱۹۴۰ء کو یہ مقام چھین لیا جس سے مصر کی سرزمین دشمن کے قدموں سے پاک ہوگئی۔ سلوم کے بعد پیش قدمی کرکے برطانوی فوجوں نے سرحدی قلعہ قپازو فتح کرلیا جس سے گویا جنگ دشمن کے علاقہ میں پہونچ گئی۔ قپازو فتح کرنے کے دو ہفتے بعد ۵۔ جنوری ۱۹۴۱ء کو باردیہ فتح ہوا۔ اس کے بعد ۲۲۔ جنوری کو طبروق، ۳۰ جنوری کو درنہ اور ۳۔ فروری کو بندرگاہ اپولونیہ فتح ہوا۔ اس کے بعد بارقہ کا نمبر آیا اور ۶۔ فروری کو بنغازی فتح ہو جانے سے لیبیا کا پورا صوبہ سائرینائیقہ برطانیہ کے قبضہ میں آگیا۔ اب لیبیا میں صرف ایک اہم مقام طرابلس باقی رہ گیا ہے جو غالباً جلد ہی برطانیہ کے ہاتھ آجائے گا۔ ان فتوحات سے برطانوی فوجوں کے حوصلے بڑھ گئے اور اطالوی فوجوں کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں برطانوی فوجوں کا دباؤ پڑتا گیا اطالوی فوجیں سوڈان کے مقبوضہ مقامات کو خالی کرکے حبش و اریٹیریا

کی طرف فرار ہونے لگیں۔ اب یہ حال ہے کہ سوڈان سے سیکڑوں میل کے فاصلہ پر اطالوی فوجوں سے اریٹریا اور حبش میں مقابلہ ہو رہا ہے اور اطالوی فوجیں اب تک برابر ہتھیار ڈالتی چلی جاتی ہیں کسالہ کے گرد و نواح کا علاقہ دوبارہ فتح کر لیا گیا ہے اور اطالوی صومالی میں برطانوی فوجیں شہر پر شہر فتح کرتی چلی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ اس وقت اطالوی صومالی کے دارالحکومت مغادیشیو پر بھی برطانوی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ ان لڑائیوں میں اٹلی کے بڑے بڑے فوجی دستے صاف ہو گئے، چنانچہ خود مسولینی نے اپنی تازہ تقریر میں ان نقصانات کو تسلیم کیا ہے اس وقت تک اٹلی کے ایک لاکھ سے زائد سپاہی برٹش فوج کے ہاتھوں قید ہو چکے ہیں، جن میں سے ہزارہا آدمی ہندوستان بھی بھیجے گئے ہیں۔

حبش کے سابق شہنشاہ بھی اپنے ملک میں داخل ہو گئے ہیں اور ان کے بہت سے ساتھی اور جاں باز وطن پرست حبشی ان کے ساتھ اٹلی سے برسر جنگ ہیں، انھیں بھی برطانیہ کی مدد سے جگہ جگہ فتوحات ہو رہی ہیں۔ افریقہ میں اٹلی کی فوج کچھ ایسی گھر گئی ہے کہ اب اسے نہ مدد پہونچ سکتی ہے نہ رسد۔ اس کا نتیجہ تو یہی ہونا چاہیے کہ افریقہ میں اٹلی کی سلطنت بالکل ہی ختم ہو جائے اس وقت اسے اگر کچھ امید ہو سکتی ہے تو جرمنی سے چنانچہ حال میں ہٹلر اور مسولینی سے ملاقات ہو چکی ہے اور ہٹلر نے دوستی کا حق ادا کرنے کا اعلان کیا ہے اس نے عنقریب ہی انگلستان پر حملہ کی بھی دھمکی دی ہے اور ڈبکی کشتیوں سے اسکی بحری طاقت کو ضرب کاری لگانے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ ایک طرف فرانس و اسپین کی مدد سے وہ برطانیہ کی سمندری طاقت کو زک پہونچائے دوسری طرف امریکہ کی امداد میں فرق ڈالے۔ ادھر انگلستان کے لئے مشرق اقصیٰ میں مزید مشکلات پیدا کرنے کی غرض سے جرمنی جاپان کو لڑائی میں گھسیٹ رہا ہے۔ جاپان کی نیت تو ہالینڈ اور فرانس کی شکست ہی کے بعد سے بگڑ چکی تھی چنانچہ اس نے کسی نہ کسی بہانہ سے ہند چینی اور ہالینڈ کے جزائر شرق الہند پر قبضہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ نانکن میں ایک نام نہاد "قومی حکومت" قائم کرکے اس نے جنوب کی طرف اپنی فوجیں بڑھانا شروع کر دیں، اور اسی اثنا میں چین کے جزیرہ ہینان پر قبضہ کر لیا جو ہند چینی سے بہت قریب ہے۔ اور ہند چینی کی گورنمنٹ کو اس بہانہ سے دھمکانا شروع کر دیا کہ ہند چینی کے راستہ سے جیانگ کائی شیک کو مدد پہونچتی ہے۔ ہند چینی کی اب وہ پوزیشن نہیں رہی کہ جاپان کا مقابلہ کر سکے۔ جرمنی نے بھی فرانسیسی حکومت کو دبا کر جاپان کو ہند چینی کی ریاست ٹانکن میں فوجیں اتارنے، بحری اور ہوائی اڈے قائم کرنے اور بندرگاہوں اور ریلوے سے کام لینے کی رعایتیں دلا دیں۔ ادھر جاپان نے سیام کو بھڑکا کر ہند چینی سے لڑوا دیا اور جب بعض مقامات میں سیام کو کامیابی ہوئی تو جاپان نے التوائے جنگ کی تحریک پیش کرکے صلح کی تجویز پیش کی جسے فریقین نے منظور کر لیا۔ اس شاطرانہ چال سے جاپان نے مشرقی ایشیا میں

اپنی بالادستی قبول کرالی۔ اس وقت ہندچینی اور سیام کے نمایندوں کے درمیان ٹوکیو میں کانفرنس ہو رہی ہے سیام نے جاپان کی تجویز کردہ سب شرطیں مان لیں۔ لیکن ہندچینی کو بعض باتوں کے متعلق عذر ہے جس پر جاپان زبردستی سے کام لینے کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس وقت لاکھوں جاپانی سپاہ ہندچینی اور اس کے آس پاس جمع ہے اور جاپانی جنگی بیڑہ ہندچینی اور سیام کے سمندروں میں گشت کر رہا ہے۔ اس فوجی نقل و حرکت سے سنگاپور جزائر فلپائن، برطانوی و امریکن مقبوضات کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے امریکہ اور برطانیہ کو بحرالکاہل میں بہت سی تازہ دم فوج اور سامان جنگ بھیجکر اپنی طاقت بڑھانا پڑی۔ اسٹریلیا کی فوج بھی ملایا کے مختلف مقامات میں تعینات ہوئی ہے اور امریکن جنگی بیڑہ بحرالکاہل میں آگیا ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ کئی سو امریکن اور برطانوی ہوائی جہاز سنگاپور پہونچ گئے ہیں بہر حال مشرقی ایشیا میں بھی جنگ کے شعلے بھڑک جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے سنگاپور کے قریب سمندری جنگ کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور کسی دن کسی بات پر یہاں بھی جنگ چھڑ جانے کا پورا سامان اکٹھا ہو گیا ہے۔ درحقیقت برٹش گورنمنٹ نے مسٹر چرچل اور مسٹر ایڈن کی رہنمائی میں جاپان کی ریشہ دوانیوں کا پوری طرح مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس نے عرصہ تک جاپان کے ساتھ جو نرمی کی پالیسی برتی اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلا۔ مگر اب جبکہ برطانوی وزرا نے اپنی سلطنت کے مفاد کی حفاظت کرنیکا قطعی ارادہ کر لیا ہے جاپان کچھ شش و پنج میں پڑ گیا ہے۔ جاپانی وزرا نے حال میں امریکہ کے وسوسوں کو بھی باطل قرار دیا اور وزیر خارجہ نے فریقین جنگ کے درمیان صلح کرانے کی آمادگی ظاہر کی حالانکہ جب برطانیہ کی طرف سے اس کو کورا جواب مل گیا اور ہٹلر نے بھی اس تجویز کو ناپسند کیا تو وزیر موصوف نے اپنے بیان کی تاویلیں کرنا شروع کر دیں۔ ان تاویلات کے مطابق جاپان نے اہل امریکہ و برطانیہ کو جو مشرق بعید کے متعلق تردد کا اظہار کرتے ہیں، صرف اس بات کی یاد دہانی کی ہے کہ اس وقت نہ صرف مشرق بعید میں ہلچل ہے بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی خونریز لڑائی ہو رہی ہے۔

مختلف محاذ جنگ پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد سب سے ضروری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سال ۱۹۴۱ء میں جنگ کا کیا نقشہ رہیگا۔ یوں تو ہٹلر برابر دھمکیاں دئیے جا رہا ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ اس کو عنقریب ہی کچھ نہ کچھ کارنمایاں دکھانا چاہیئے لیکن یہ بات بھی روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ برطانیہ کی حالت اس وقت جون ۱۹۴۰ء اور اکتوبر اور نومبر اور دسمبر ۱۹۴۰ء سے کہیں زیادہ مضبوط ہے اور امریکہ بھی اس وقت برطانیہ کو ہر ممکن امداد دینے کو کمربستہ ہو گیا ہے۔ اس وقت ستر فیصدی سے زیادہ باشندگان امریکہ اس بات پر تلے نظر آتے ہیں کہ جس طرح سے ہو سکے ہٹلر کو برطانیہ پر غالب آنے کا موقعہ نہ دیا جائے امریکن سینٹ

کے سامنے ان دنوں جنگی جہاز اور دیگر سامان انگلستان کو مستعار دینے کی جو تجویز پیش تھی وہ بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد جاری کثرت رائے سے پاس ہو گئی ہے اور اب جلد ہی پریسیڈنٹ روزولٹ کو اسکے متعلق ضروری قانونی اختیارات مل جائیں گے۔ امریکہ میں رات دن بڑے زور شور جنگی سامان تیار ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت پہلے سے چوگنے بیچ گنے مزدور کام کر رہے ہیں اور عنقریب ہی لاکھوں آدمی اور کام کرنے لگیں گے اب سب باتوں سے ظاہر ہے کہ ہٹلر کی دھمکیوں کے باوجود حالات برطانیہ کے موافق ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں دونوں ملکوں کی طاقتوں کا موازنہ کرتے ہوئے نیویارک ٹائمز پوسٹ کے جنگی نامہ نگار نے ذیل کی باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

اس وقت تک جرمنی کی بحری طاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ مگر برطانیہ کی سمندری طاقت بہت بڑھ گئی ہے، اور تمام سمندری راستوں سے برطانوی جہاز برابر آ جا رہے ہیں

اس سال سامان رسد کے متعلق بھی برطانیہ کو کوئی تشویش نہیں ہے۔ اٹلی مشرقی بحیرۂ روم سے بالکل بیدخل ہو گیا ہے۔ خود برطانیہ میں برٹش فوج کی طاقت پہلے سے دوچند ہو گئی ہے۔ برطانیہ کے سمندری اڈے اپنی جگہ پر برابر قائم ہیں مگر دشمن کے پچاس فیصدی سمندری اڈے تباہ و برباد ہو چکے ہیں، ہوائی طاقت بھی پہلے سے دوگنی ہو گئی ہے۔ برطانوی ناکہ بندی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اور گو ہٹلر اور مسولینی دونوں عرصۂ دراز تک لڑائی جاری رہنے کا دعویٰ کر رہے ہیں لیکن جہاں تک حالات سے معلوم ہو رہا ہے عجب نہیں کہ اس سال (۱۹۴۱ء) کے آخر تک ان دونوں کو تیل و پٹرول کی بہم رسانی میں زیادہ کمی محسوس ہونے لگے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بلغاریہ کو بالکل دبا دینے کے بعد جرمنی یونان کو صلح کرنے پر مجبور کرے لیکن امید ہے کہ اتنی فتوحات حاصل کرنے کے بعد یونان خودکشی کے لئے تیار نہ ہوگا۔ ترکی اور برطانیہ کا کامل سمجھوتہ ہو چکا ہے اور ان سطروں کے لکھتے وقت جو خبریں آئی ہیں اُن سے یہی پایا جاتا ہے کہ عصمت پاشا اور مسٹر ایڈن وزیر خارجہ برطانیہ نے تمام مسائل پر اتفاق رائے کے ساتھ غور کرکے آئندہ واقعات کے مقابلہ کی تیاریاں کر لی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ابھی تک جرمن فوجوں کو شکست سے سامنا نہیں ہوا ہے لیکن جب تک برطانیہ کے دم میں دم ہے اس کے مقاصد پورے ہوتے نظر نہیں آتے۔

ہندوستان

ہندوستان کے حالات ہماری نظر میں بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ پچھلے دو ماہ کے دوران میں بھی صاحب وزیر ہند کی کئی تقریریں ہوئیں، پارلیمنٹ میں بھی مختلف موقعوں پر سوال جواب ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ان سب میں مسٹر ایمری ایک ہی راگ الاپتے ہیں اور ہندوستان کے اندرونی اختلافات کا ذکر کرکے بار بار ۔ اگست ۴۰ء۔ نومبر ۱۹۴۰ء کے اعلانات کا حوالہ دیتے رہتے ہیں گویا یہ اعلانات برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کے متعلق آخری الفاظ ہیں جنہیں ایک لفظ یا ایک نقطہ کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی

مسٹر [illegible] نے اس بارے میں جو پوزیشن اختیار کرلی ہے اس سے ملک میں عام بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے کیونکہ رسمی باتوں کے علاوہ انھوں نے ابھی تک ہندوستانی جذبات کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا کسی موقعہ پر کوئی ثبوت نہیں دیا ہے۔ حال میں انھوں نے افریقہ کی فتوحات میں ہندوستانی سپاہیوں کی بہادری اور دلاوری کی بڑی تعریف کی ہے اسی کے ساتھ اگر وہ اپنے ہموطنوں سے ہندوستانیوں کے ساتھ موجودہ سے بہتر سلوک کرنے کی بھی اپیل کرتے یا دوران جنگ ان کو انگریز سپاہیوں کے برابر تنخواہ و الاؤنس دینے کی راہ نکالتے تو اہل ہند انکی قدردانی کے واقعی تہ دل سے شکر گذار ہوتے ہم انکی تقریروں کو بھی اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ ۲۰ فروری کو جب ایک ممبر پارلیمنٹ نے ان سے یہ کہا کہ پنجابی سپاہیوں کی بہادری اور صوبہ پنجاب کی وفاداری کے لحاظ سے کم از کم پنجاب کو حکومت کا حق دیدیا جائے تو مسٹر امیری نے اسکا یہ جواب دیا کہ پنجاب کو حکومت خود اختیاری حاصل ہے۔ ایک اور تقریر کے دوران میں ملک کے مختلف اجزا اور صوبوں کی آبادی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے نادانستہ طور پر ایک طرف کسی قدر مبالغہ آمیز اور دوسری طرف واقعی تعداد سے تخفیف کرکے جو تعداد بتائی اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ عموماً انکی تقریریں پروپیگنڈا کی حیثیت رکھتی ہیں جنکا مقصد یہاں کی گتھیاں سلجھانا نہیں بلکہ انگلستان اور دیگر ملکوں میں ہندوستانی مسئلہ کے حل کی ساری ذمہ داری اہل ہندوستانیوں کے سر تھوپنا ہے یہی وجہ ہے کہ انکے طرز عمل سے کوئی طبقہ خوش اور مطمئن نہیں ہے چنانچہ مسٹر چندوارکر موجودہ پریسیڈنٹ نیشنل لبرل فیڈریشن نے ۹ فروری کو مدراس کے ایک جلسہ عام میں اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ وہ ان لوگوں کی نکتہ چینی نہیں کرسکتے ہیں جو مسٹر امیری کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے ساتھ سچائی نہیں برت رہے ہیں۔ مسٹر چندوارکر اور لبرل خیالات کے سب اصحاب اس جنگ میں برطانیہ کے پورے حامی و مددگار ہیں

نوآبادیوں کے طرز حکومت کا بار بار ذکر بھی اب پرانی بات ہوگئی۔ اسی لئے اس جلسہ میں رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری نے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ ہندوستان کو پرانے قسم کا ڈومینین اسٹیٹس درکار نہیں ہے بلکہ اسکی وہی حیثیت تسلیم ہونا چاہیئے جو جنگ کے بعد کناڈا افریقہ اور آئرلینڈ کو حاصل ہو۔ یہ ایک خاص نکتہ ہے جو مدبران ملک کو خاص طور پر اپنے نگاہ کے سامنے رکھنا چاہیئے مگر مصیبت یہ ہے کہ اسوقت ایک طرف مہاتما گاندھی عدم تشدد کے اصول پر حد سے زیادہ زور دے رہے ہیں دوسری طرف مسٹر جناح پاکستان کے سامنے کسی بات کو خاطر میں نہیں لارہے ہیں مہاتما جی کی ہدایت کے بموجب انفرادی سول نافرمانی کی اسکیم اپنی پوری رفتار سے جاری ہے اور اسوقت ہزارہا آدمی جنگ کے خلاف معمولی نعرے لگانے پر گرفتار ہوکر جیل جارہے ہیں۔ انہیں پانچ صوبوں کے وزیر اعظم اور انکے بائیس تئیس ساتھی وزیروں کے علاوہ ملک کے بعض بڑے بڑے لیڈران بھی شامل ہیں۔ مسٹر جناح کئی کانفرنسوں میں پاکستان پر زوردار تقریریں کرچکے ہیں۔ اگر انکی بات قول فیصل سمجھی جائے تو مسلمانوں کی زندگی اسی پر منحصر ہے کہ ملک کے دو ٹکڑے کردیئے جائیں حال میں انھوں نے لاہور کے کئی جلسوں میں اسی قسم کی تقریریں کی ہیں ایسے برعکس مسٹر شیام پرشاد مکرجی پریسیڈنٹ ہندو مہاسبھا کہتے ہیں کہ جبتک ہندوؤں کے دم میں دم ہے ملک کے دو علحدہ علحدہ ٹکڑے ہونے نہ پائیں گے مقبول سر سکندر حیات اس قسم کے خیالات عوام ملک کی زندگی کو زہر آلود بنا رہے ہیں لیکن یہ بات ضرور قابل اطمینان ہے کہ شیعہ، مومن اور احراری جماعتیں پاکستان کی حامی نہیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے بالآخر انکی تکلیفیں گھٹنے کے بجائے الٹی بڑھ جائینگی۔ گذشتہ ماہ کچھ ہوا اسوقت لیڈروں کی باہمی مخالفت سے کچھ ضعابت کم ہوگئی ہے چنانچہ سندھ کی حکومت میں مولانا آزاد نے ہندو مسلمانوں کا جو سمجھوتہ کرایا تھا مسٹر جناح نے اسکو کالعدم کردیا اور اسی طرح مردم شماری میں ہر طرف عجیب طوفان بدتمیزی برپا رہا۔

عرض حال — پچھلے حادثہ میں جن ہمدردان قدیم نے میرے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے انکا شکریہ میں بذریعہ خطوط ادا کررہا ہوں۔ میرے ذاتی حالات ابھی تک پورے طور پر معمول پر نہیں آئے ہیں اور شاید اب مشکل ہی سے وہ اطمینان قلب نصیب ہو جو پہلے تقویت کا باعث تھا۔ بہرحال صبر و شکر کے سوا چارہ نہیں۔ ان دنوں زمانہ کی اشاعت میں خلاف توقع جو بے ترتیبی ہو رہی ہے اسکے لئے بھی خواستگار معافی ہوں۔ (ایڈیٹر)

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم، بی-اے،

نمبر ۳	مارچ سنہ ۱۹۴۱ع	جلد ۷۶

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا
(قیمت ...)

شاعر اور افسانہ نگار ہے۔

امتیاز علی تاج — ... دیات سے ...

ادبی نقد نظر سے دیات کو ...

کر دیات کے نقد نظر سے ... کی ہے ...

ہے مصنف سے روشناس ہو جاتا ہے

اختر شیرانی ...

اچھے بھی انہیں دیا ...

افسانوں کے حق ...

افسانہ نگاروں کی صف اول میں ...

... اس دور کے ...

سلیس

بیان

انداز پر ایک بے نظیر کتاب

نے ہماری تحریک ...

ملیریا

شہر ایکرون کی اونچی سڑکوں سے جیسے وہ خوشنما بلند پبلک عمارتیں ہیں سواری موڑتے گذرتے ہوئے شاید ہی کسی کو یہ خیال آتا ہو کہ آج ربڑ کا [illegible] جنگلوں کے بیچ میں پیدا ہوتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے [illegible] پیدا ہو جاتا یا [illegible] میں جو کچھ ہوتا ہے اسکا اثر خوشحال شہر پر پڑتا ہے۔ ایکرون امریکہ کا سب سے زیادہ ٹائر بنانیوالا مرکز ہے شاید تمام دنیا کا بھی ہو۔ کارخانوں کا سلسلہ میلوں تک چلا گیا ہے۔ اگر ربڑ کی پیداوار ختم ہو جائے یا جو لوگ ربڑ کی کاشت کرتے ہیں ملیریا کام نہ کر سکیں تو ایکرون کا خاتمہ ہو جائے اور ربڑ کی کاشت کرنیوالے جو مزدوروں کی کم [illegible] ملیریا [illegible] کیونکہ فیل ہو سکتی ہیں۔

ربڑ صرف انہیں مقامات پر پیدا ہوتا ہے جہاں مردوں اور عورتوں کا خوشحال رہنا ایک مسلسل جنگ ہے زیادہ بیماریوں کے خلاف ان بیماریوں میں ملیریا سب سے اہم ہے کیونکہ ربڑ گرم اور زیادہ بارش والے ملک میں ہی پیدا ہوتا ہے اور ایسے حالات مچھروں کی پیدائش کیلئے بہت موزوں ہیں لیکن ان لوگوں خصوصاً بچوں کیلئے نہایت خوفناک ہے جن کو وہاں رہنا پڑتا ہے۔ شہر ایکرون کے زیادہ منافع میں سے کونین کے لئے ایک رقم نکال لی جاتی ہے کہ تا کہ ربڑ کے مزدور صاحب فراش نہ ہوں بلکہ کام کرتے رہیں اس بات کا احساس بہت کم [illegible] کام کرنیوالے مزدوروں کو اور شاید اس سے بھی کم موٹر والوں کو اس بات کا احساس ہے لیکن یہ چیز بہت ضروری ہے اور مجموعی طور پر [illegible] خاصی رقم ہوتی ہے مجلس عالمی اقوام کے ملیریا کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ملیریا والے علاقوں کے باشندوں کو ملیریا کے تمام [illegible] گرین کونین روزانہ ملیریا کے [illegible] کے لئے استعمال کرنا چاہیے اور ملیریا کے حملے کی صورت میں پندرہ سے بیس گرین روزانہ [illegible] استعمال کرنا چاہیے۔ ملیریا کمیشن کی رپورٹ کے صفحہ ۱۲۲ پر [illegible] [illegible] لکھا ہے [illegible] کے استعمال کرتے وقت [illegible]

[illegible]

[illegible] بہ نسبت اس کے کہ [illegible] ملیریا [illegible] ایک [illegible] معلوم ہے [illegible]

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید بے مثل کتابیں

محمد بہادر شاہ ظفر خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ از منشی محمد امیر احمد علوی بی۔ اے۔ اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ قیمت عہ/

طریق دولتمندی۔ دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کتاب میں دولت حاصل کرنے کے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں قیمت صرف ۸/

فلسفۂ جنگ۔ ایک مشہور و معروف روسی تصنیف جس میں فلسفۂ جنگ پر عالمانہ تنقید ڈالی گئی ہے قیمت [illegible]

میدانِ عمل۔ منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبۂ جامعہ نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اسمیں ملک کی موجودہ بیداری و بیچین روح کی جیتی جاگتی تصویریں۔ فطری عشق و محبت کے سادہ، دلکش اور بناوٹ سے پاک قصے ملیں گے۔ بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے صفحات پانسو۔ کتابت اعلیٰ۔ کاغذ نفیس۔ روشن طباعت۔ خوبصورت اور مضبوط جلد دیدہ زیب جیکٹ کر

قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ عا

خیالات مہاتما گاندھی۔ یہ وہ لاجواب کتاب ہے جسمیں مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے گاندھی جی کے مذہبی۔ سماجی اور سیاسی خیالات شرح و بسط کے ساتھ درج کر کے دنیا پر احسان عظیم کیا ہے۔ قیمت حصۂ اول عہ حصۂ دوم عہ

مثنوی سحر۔ یعنی شکنتلا اور دشینت کا اردو ترجمہ حضرت سحر شکامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز۔ دوسرا ایڈیشن جس کی مصنف نے نظر ثانی کی ہے۔ قیمت ۸/

معاہدۂ عمرانی۔ از ژاں ژاک روسو مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ) ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ (ہائیڈلبرگ) حریت۔ اخوت اور مساوات جس کا روحانی پیام دنیا کو اسلام نے پہنچایا تھا اس کی سیاسی تبلیغ یورپ میں روسو کے معاہدۂ عمرانی نے کی۔ روسو کا کمال یہ ہے کہ اس نے سیاست مدن کے دقیق مسائل باتوں باتوں میں سمجھا دیے ہیں اس کی یہ کتاب جو معنوی حیثیت سے فلسفۂ سیاست کی اہم کتاب ہے زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے سب سے سہل ہے۔ قیمت مجلد عہ

سلومی۔ آسکر وائلڈ کے مشہور ڈراما سلومی کا اردو ترجمہ ہے جس کو جناب [illegible] نے محنت سے اردو میں ترجمہ کیا ہے

قیمت صرف ۸/

ملنے کا پتہ۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

... سے زیادہ ... ادویہ

غیر مفید ثابت کرنے والے کو مبلغ ۵۰۰ روپیہ انعام

اکسیر سٹیریا ہماری اس لاثانی دوائی کے استعمال سے ہزارہا مایوس مریضہ شفا پا چکی ہیں۔ عورت صحیح معنوں میں تندرست ہو کر اولاد پیدا کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ قیمت دوائی برائے ایک ماہ پانچ روپیہ ۵؎

اکسیر درد گردہ درد گردہ کے لئے خواہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو جادو کا اثر رکھتی ہے اس کی [illegible] کرنا فضول ہے۔ صرف تین خوراک اس موذی مرض کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ [illegible]

قیمت دوائی دس روپیہ ۱۰؎

اکسیر بواسیر اس دوائی میں چند ایک جڑی بوٹیاں ایسی پڑتی ہیں جو خاص موسم میں بہت کم مقدار میں ملتی ہیں اس لئے چند ایک مریضوں کے لئے ہی دوائی تیار ہو سکتی ہے اور کئی مریضوں کو صاف انکار کرنا پڑتا ہے۔ یہ دوائی دونوں قسم کی بواسیر کے لئے امرت کا کام کرتی ہے۔ سیروں خون جاتا ہو چند ہی خوراک میں بند کرتی ہے۔ قیمت برائے ایک ماہ پانچ روپیہ ۵؎

بے بی پلز بچوں کے تقریباً تمام امراض کیلئے لاثانی گولیاں۔ یہ گولیاں دانہ مونگ کے برابر ہوتی ہیں اسلئے بچہ آسانی سے کھا سکتا ہے۔ ان کے روزانہ استعمال سے بچے کبھی زرد رنگ کے دست وغیرہ ہرگز نہیں ہوتے۔ دانت بلا تکلیف نکل آتے ہیں۔ یہ گولیاں تندرستی کی حالت میں بھی بچے کو ۵ سال کی عمر تک دینی از حد مفید ہیں۔ ان سے غذا اچھی طرح ہضم ہو کر مصفا خون تیار ہوتا ہے بھوک خوب بڑھتی ہے بچہ تمام موذی امراض سے محفوظ رہتا ہے۔ ننھے بچوں کو دن میں ۳ بار ایک ایک گولی ہمراہ شیر مادر دیں قیمت گولیاں برائے چھ ماہ صرف پانچ روپیہ ۵؎ اس سے کم مقدار میں طلب نہ کریں۔

الشوری تحفہ اس دوائی کی تعریف کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ سورج کو چراغ دکھانا یہ دوائی ہماری [illegible] بلکہ ایک بوٹی کا پھل ہے یہ پھل ہم نے ہزارہا بار آزمایا ہے جن عورتوں کے ہمیشہ لڑکیاں ہی ہوتی [illegible] گھر [illegible] ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ دوائی اگر فائدہ نہ کرے تو قدرت کو غلط کہا جا سکتا ہے یہ دوائی [illegible] کے اندر استعمال کی جا سکتی ہے بعد میں فضول ہے مزید یہ کہ صرف ایک ہی بار چاند کے اتوار کو کھائی جاتی ہے زیادہ قیمت فضول ہے ہزارہا بندگان خدا اس سے فائدہ اٹھا چکے ہیں آپ بھی اس الشوری نعمت سے فائدہ اٹھا کر [illegible] جا سکتے ہیں یہ دوائی بچوں کے ضائع جانے کو بھی روکتی ہے۔ قیمت پھل ۵ روپے علاوہ ڈاک خرچ

ٹانک درجہ دوم (برائے موسم گرما) ہماری اس نایاب دوائی نے بے حد شہرت حاصل کی ہے [illegible] تمام رگ پٹھوں میں نئی زندگی اور بجلی کی لہر بھر دیتی ہے [illegible] کر دو چھوری خوراکیں [illegible] کھا لیتی [illegible] سیروں دودھ اور گھی ہضم کر کے چہرے کا رنگ [illegible] دوائی برائے ایک ماہ چھ روپیہ ۶؎

نوٹ:۔ محصول ڈاک بذمہ مریض ہوگا۔ جواب طلب خطوط کیلئے ٹکٹ [illegible]

ملنے کا پتہ:۔ [illegible]

زمانہ

جلد ۷۶ — مارچ سنہ ۱۹۴۱ء — نمبر ۳

اردو ہندی کا قضیہ

(از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی بی۔اے، او۔بی۔ای، وزیر ریاست کشمیر)

مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔اے، ایل ایل۔بی۔ نے اپنے ایک مضمون میں جو دسمبر سنہ ۴۰ء کے "زمانہ" میں "صحتِ الفاظ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے" مجھے مخاطب کیا ہے، اور چند امور کی بابت جن کا تعلق زبان سے ہے استفسار کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ عربی اور فارسی الفاظ کی صحت اور ان کے اعراب کا تعین ہمیں انھیں زبانوں کے اصول کے مطابق کرنا چاہیئے، خود ہمیں تغیر و تبدل کا اختیار نہیں ہے۔

میں مرزا صاحب موصوف اور دیگر حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ میری یہ عرضداشت عام نہیں تھی بلکہ شعر و شاعری سے متعلق تھی جس میں ایک صاحب نے "ضرورت شعری" کا عذر پیش کیا تھا اور اس کی بنا پر خیام (بے تشدید) اور تجزیّہ (بے مشدد) کو صحیح قرار دیا تھا اور جواز میں تنور کی مثال پیش کی تھی جو دراصل بتشدید نون ہے مگر عام طور پر اہل ایران بلا تشدید استعمال کرتے ہیں میری گزارش یہ تھی کہ فارسی یا عربی میں چند الفاظ کی بنا پر جو مستثنیات کا حکم رکھتے ہیں یہ امر بیجا نہیں کہ ہم ان الفاظ کو نمونہ بنا کر ہر لفظ میں توڑ مروڑ شروع کر دیں۔

اول تو میری بحث شعر و شاعری (وہ بھی غزل) کی زبان تک محدود تھی، دوم جو کچھ میں نے عرض کیا تھا وہ فارسی زبان میں اہل زبان کے معمولات کے خلاف تھا۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ الفاظ زیرِ بحث اضافت کے ساتھ [illegible] گئے تھے۔ یعنی (مرزا صاحب کا تلازمہ قائم رکھتے ہوئے) فارسی

ہائیکورٹ کی مہر ثبت تھی۔ "تجزیۂ بہار" بسمل خیام

جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے آتشؔ کا قول آج بھی ماننے کے قابل ہے کہ کسی زبان کا لفظ ہو جس ہیئت جس تلفظ اور جس لہجے کے ساتھ اُردو میں داخل ہو گیا اُسی طرح درست ہے مثلاً "گرم گرم روٹی لاؤ" گرم کی ر جو ساکن تھی متحرک ہو گئی، اس کے خلاف بولئے تو مُلّائیت کا الزام عائد ہو۔ مگر "دلِ گرم" میں اگر وہی ر متحرک بولئے تو نرے جاہل سمجھے جائیے۔ ایسے الفاظ کی ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے جو شکل معنی یا تلفظ کے اعتبار سے عربی، فارسی یا ترکی میں کچھ تھے اور اُردو میں کچھ ہو گئے۔ مثلاً مجاز۔ عرصہ۔ خاطر۔ صحنک۔ مشروع۔ تہذیب۔ گلبدن نقش۔ بیگم۔ کچھ اکتوبر۔ اپریل۔ مئی۔ لالٹین۔ کارتوس[1] وغیرہ ہی پر موقوف نہیں۔ اسی طرح ہندو بھائیوں کی یہ شکایت غلط ہے کہ مسلمانوں نے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کو مسخ کیا ہے اور عربی و فارسی زبانوں کے الفاظ پر یہ عمل نہیں کیا۔ آتشؔ نے المضاعف کو المضاف بنا دیا اور نہ معلوم کتنی مثالیں ملیں گی۔

دراصل یہی سلوک ہندی والے عربی اور فارسی الفاظ سے کرتے رہے ہیں، اب ستھرمیں گھنگنیاں بھر لی ہیں: چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) تیں تو تورے دامنواں (دامن) لاگی مہاراج
رام جھروکے بیٹھکے سب کا مُجرا لیت
جیسی جس کی چاکری ویسا اُسکو دیت

(مجرا اور چاکری کا بدل ہندی میں نہیں تھا لہٰذا وہ الفاظ بجنسہ لے لئے)

(۲) نرم کلیاں (نرم کلائیاں)

(۳) شام گھونگھٹ پٹ کھولے جوراجوری (زورا زوری)

(۴) باجوبند (بازوبند) کُھل کُھل جائے۔

(۵) اُردو میں "ننگا مادر زاد" تھا، ہندی میں "مادر جاد" مفلس ہو گیا۔

جناب مرزا صاحب اگر اس روشنی میں اپنے ہندو احباب کے اعتراضات پر غور فرمائیں گے تو وہ بالکل بے بنیاد ثابت ہونگے۔ اگر یہ حضرات ہندی یا سنسکرت بولنا چاہتے ہیں تو شوق سے وچار۔ ویش۔ ووَاہ۔ وغیرہ بولیں۔ اُردو میں یہ الفاظ سمجھ کر (خالی بجا پیش) دیس بیاہ

---

[1] مرزا صاحب موصوف نے کارتوس کو کارٹرج کا مہند قرار دیا ہے حالانکہ یہ فرانسیسی لفظ کارٹوش کا مہند ہے۔ آزر

غیرہ ہیں۔ گرام گاؤں۔ جل پانی۔ پربت پہاڑ۔ سب ہندی ہیں، مگر اُردو نے گرام۔ جل، پربت چھوڑ دیا اور اُن کے مرادفات کو لے لیا، سوائے چند مخصوص حالتوں کے۔

آخر میں مرزا صاحب موصوف نے اُردو، ہندی، اور ہندوستانی کا سوال بھی چھیڑا ہے

میری رائے ہمیشہ سے یہ ہے کہ زبانیں دو ہی ہیں اُردو اور ہندی، ہندوستانی کوئی الگ زبان نہیں بلکہ ایک زمانے میں اُردو ہی کو ہندوستانی کہتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اُردو اور ہندی کو سمو کر ایک تیسری زبان بنانے کی کوشش کی ہے جو آدھا تیتر آدھا بٹیر کی مصداق ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال مرزا صاحب کے دوست کا وہ خط ہے جو انھوں نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔ اس میں ایک طرف تو نیائے۔ سنگ۔ پرنتو۔ بکش۔ شبد۔ نیم اور پالن ہیں جن کی اُردو میں گنجائش نہیں اور دوسری طرف خوب۔ حال۔ حفاظت۔ اصل اور درستی ہیں جو ہندی سے میل نہیں کھاتے حالانکہ اِسی عبارت کو ہندی الفاظ قائم رکھتے ہوئے اور جو عربی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں نکالکر بھی سلیس اُردو میں لکھ سکتے ہیں، مثلاً:-

(نام نہاد ہندوستانی)	(اُردو)
خوب نیائے کرتے ہو	اچھی اُلٹی گنگا بہائی
سنگ لائے	ساتھ لائے
پرنتو	پر (لیکن) پھر بھی
بکش کی	پرچک لی
حال تک	اب تک
درستی کرلی	ٹھیک کر لیا
حفاظت رکھی ہے	دیکھ بھال رکھی ہے
اُسی نیم کا پالن کرتے ہیں	اُسی ڈھرے پر چلتے ہیں۔

اُردو ہندی سے نکلی ہے اور وہی اُردو دلکش ہوگی جس میں فارسی اور عربی الفاظ کا میل کم ہو اُسی کے ساتھ اس میں اور دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرنے کی بھی صلاحیت ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ اُردو نے اپنا ایک مزاج قائم کرلیا ہے اور جب تک وہ ترکیب پیدا نہ ہوگی زبان مزا نہ دے گی۔

اُردو کے لئے عربی اور فارسی سے کہیں بڑھ چڑھکر ہندی جاننا ضروری ہے، مگر بدقسمتی سے سیاسی کشاکش نے اُردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ دونوں زبانیں خراب ہو رہی ہیں۔

میرے نزدیک ہر ہندوستانی کا فرض ہونا چاہیئے کہ دونوں زبانیں سیکھے اور اُن کے ادب سے واقف ہو، ممکن ہے کہ اس طرح وہ سادہ اور عام فہم زبان وجود میں آئے جس کے لئے ہم آپ کوشاں ہیں اور جس کو سارے ہندوستان کی متفقہ زبان بنانا چاہتے ہیں۔ مگر بُرا ہو تعصب اور خودغرضی کا کہ ایک گروہ نے پہلے سے یہ جی میں ٹھان لی ہے کہ یہ زبان اُردو ہوگی جس میں بڑا حصہ عربی اور فارسی الفاظ کا ہوگا، اور دوسرے نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہندی ہوگی مگر سیاسی مصالح کی بنا پر نام ہندوستانی تجویز کیا ہے، کیونکہ خالص ہندی میں یہ دم نہیں اور ہندوستانی کے پردے میں فارسی اور عربی کے الفاظ خارج کرکے سنسکرت کے الفاظ داخل کئے جاسکتے ہیں۔ اصل لڑائی دو کلچروں یا تہذیبوں کا سوتیا ڈاہ ہے جو ایک دوسرے کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتیں۔ ایک مرجائے تو دوسرے کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے، چاہے کانی ہی ہو کے کیوں نہ جیئے۔

بحث کا ایک اور پہلو بھی ہے، میرے لڑکپن تک لکھنؤ میں اُردو کا کوئی شاعر مستند نہیں مانا جاتا تھا اگر ہندی میں بھی موزوں نہ کرسکے۔ بچوں کو پہیلیاں اور مکرنیاں بجھائی جاتی تھیں جو عموماً ہندی میں ہوتی تھیں۔ عورتوں کو بلا مبالغہ ہزاروں کہاوتیں ہندی کی یاد ہوتی تھیں۔ بچے سُنتے تھے اور خودبخود ہندی سے آشنا ہو جاتے تھے۔

انگریزی تعلیم کا چرچا شروع ہوا، وہ صحبتیں افسانہ ہوگئیں اور زبان سے بیگانگی برتی جانے لگی حتیٰ کہ سوچتے بھی انگریزی میں تھے۔ زمانے نے پھر پلٹا کھایا۔ اب جو اپنی زبان کی طرف متوجہ ہوئے تو بالکل کورے تھے! خانہ پُری کو انگریزی کے بنے تکے ترجمے کئے یا مصری اخباروں سے فارسی اور عربی کے جُملے مستعار لیئے۔ اُردو ہندی کا قضیہ اس جہالت کا جس کو خود فریبی نے فارسی دانی کا ذوق سمجھا، پردہ پوش ہوگیا۔ غالب پرستی کا رواج بھی اسی بنا پر ہوا۔ کیونکہ خالص ٹکسالی زبان پر عبور ہونا اور اُس کی نزاکتیں سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ آ ہی نہیں سکتی جب تک اُن لوگوں کی آغوش میں تربیت نہ پائی ہو جن کے نام پر زبان کا سکہ چلتا ہے۔

بالکل یہی حشر ہندی کا ہندوؤں کے ہاتھوں ہوا، اس کی بھی گھلاوٹ اور شیرینی تشریف لے گئی اور اُنکی جگہ بھدے اور بھجر سنسکرت شبدوں نے لیلی، جن کا ماخذ کوئی نہ کوئی انگریزی سنسکرت ڈکشنری ہوتی ہے۔

آئیے ہم سب ہندوستانی اُردو اور ہندی دونوں زبانیں پڑھیں اور اپنے بچوں کو پڑھوائیں، دونوں زبانوں کو اپنی زبان سمجھیں اور ایکدوسرے کا گلا گھونٹنے کے بجائے دونوں کو اپنی اپنی جگہ مالا مال کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے بزرگ بھی کرتے رہے اور اسی نے ان دونوں زبانوں کو اتنا دلکش بنادیا تھا مگر اب کیا حالت ہے؟ گریبان میں منہ ڈالکر اپنے دل سے پوچھیئے۔

بسنت

(سید محمود مخمور رضوی اکبر آبادی، بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

بہارِ نو کی آمد کی چلو تیاریاں دیکھیں　　　نئی رت کی زمانے پر مسرت باریاں دیکھیں
چلو نیرنگِ قدرت کی طرب آثاریاں دیکھیں　　　پھر اس عالم میں اپنی روح کی بیداریاں دیکھیں
دلِ مسرور میں اک موج سی اٹھتی ہے تھم تھم کر
چلو رنج و تعب قربان کر دیں لطفِ موسم پر

اسی موسم کا ہے عالم میں سامانِ پزیرائی　　　کہ ذرّے ذرّے سے پیدا ہے درسِ ناشکیبائی
سنبھل اے دل کہ پھر برپا ہوا طوفان برنائی　　　تکلف برطرف جوشِ جنوں نے تیری بن آئی
مرا چاکِ گریباں تیرا ممنونِ صد احساں ہے
خوشا یہ دن کہ تو ہے اور دامانِ بہاراں ہے

چمن میں رنگ و بو کی انبساط افزائیاں دیکھو　　　گلوں کی نکہتیں سونگھو چمن آرائیاں دیکھو
شبابِ نو رسیدہ کی نئی انگڑائیاں دیکھو　　　بسنتی ساریوں میں حسن کی رعنائیاں دیکھو
زمستاں نے چھپا رکھے تھے جلوے کامرانی کے
بہار آئی تو چونکے نیند سے فتنے جوانی کے

قیامت ہے گلابی سردیوں کا دل فزا موسم　　　دلوں میں جوش اٹھتا ہے کبھی بیحد کبھی پیہم
اُدھر وہ چاند سا مکھڑا، جوانی کا اُدھر عالم　　　وہ دزدیدہ نظر کی ہر بہانے پرسشِ کم کم
بسنتی ناز اگر ایسی لگاوٹ سے لبھائے گا
تو میرا حوصلہ بھی بڑھ کے تارے توڑ لائے گا

ہوا میں امتزاجِ کیف و بوئے روحِ مینا ہے　　　نویدِ مے گساری ہر نفس لبریزِ صہبا ہے
دلوں میں شدتِ جوشِ طرب سے حشر برپا ہے　　　لنڈھاؤ، چور ہو، بہکو، الاپو، سب گوارا ہے
نکالو ولولے جی بھر کے موسم کی اجازت ہے
جو جھجکے کافرِ نعمت نہیں مردودِ فطرت ہے

فضا معمورِ نکہت ہے نفس میں نشہ ہے شامل   نہیں شورش خرد کی بیخودی کی راہ میں حائل
بدن کا آج ایک ایک رونگٹا ہے رقص پر مائل   رہے قابو طبیعت پر یہ مشکل ہے بہت مشکل
وفورِ کیف سے ہر ولولہ شاداب ہوتا ہے
ہوا چھو کر نکلتی ہے تو دل بیتاب ہوتا ہے

مزاجِ شوق گرمایا دلوں میں تقویت آئی   رگوں میں خون دوڑا آرزو پر تازگی چھائی
نویدِ زندگی کیسا نشاطِ زندگی لائی   کہ فرطِ زندگی سے خود تماشا ہے تماشائی
زمیں والے بہک کر حریت کی گت بجاتے ہیں
اسی سازِ طرب سے عرش والے سُر ملاتے ہیں

نیا انداز ہے قدرت کے لطفِ بے محابا میں   بپا ہے بزمِ عشرت جلوتِ چشمِ تماشا میں
لبِ ساحل بسنتی عکس لہراتا ہے دریا میں   زمیں نے پھاگ کھیلا ہے چمن میں دشت و صحرا میں
نگاہیں لوٹ ہیں رُت کی جوانی کی گھلاوٹ پر
نئی سرسوں کے دھانی پن بسنتی مسکراہٹ پر

متاعِ ہوش بیچو، عقل کھو دو، وار دو تن من   یہ موقع ہے بہارِ فتنہ گر کا لوٹ لو جوبن
نہ آئے گی نظر پھر سال بھر یہ حیلہ جو پُرفن   جوانی کا بہانہ ہے، مچل کر تھام لو دامن
غنیمت ہے اسی حیلے کوئی حسرت نکل جاتی
دل آ جائے تو آ جائے جوانی پھر نہیں آتی

زمیں پر مسکراہٹ سی ہے سبزے کی لطافت سے   نگاہیں کھلکھلا اٹھتی ہیں سرسوں کی طراوت سے
بہا جاتا ہے دل گویا لپٹ کر موجِ نکہت سے   شعورِ زندگانی چونک اٹھا ہے جوشِ وحشت سے
پیامِ زیست لائی ہے جنوں کی کار فرمائی
نئے انداز سے میرے وطن میں یہ بہار آئی

شاعر

انسان و خداوند کے مابین ہے شاعر   اک جنس درخشندہ و پائندہ و بیدار
ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت   فطرت جسے کرتی ہے عطا جذبۂ خود دار
جبریل کی پرواز، پیمبر کی رسائی
قرآن کی عظمت، دلِ فرعون کا انکار   (اقبالؔ)

اُردو زبان اور صحّتِ الفاظ

(از منشی شیام موہن لال صاحب جگر بریلوی، بی - اے)

جب اُردو کا خاکہ تیار ہوا اور روز بروز اُس کی دلفریباں طبیعتوں کو اپنی طرف مائل کرنے لگیں تو اُس کی ادبی حیثیت کی بھی بنائیں قائم ہو چلیں۔ کئی ابتدائی دور گذر جانے کے بعد اُردو کے ایسے ایسے شیدائی پیدا ہوئے جنھوں نے ایک طرف اس کے خدوخال کو سنوارا اور رنگ وروپ کو نکھارا اور دوسری طرف اس میں وہ وہ باب کھولے جو رفتہ رفتہ وسیع میدانوں میں تبدیل ہو گئے۔ سودا۔ میر۔ آنندرام مخلص سرب سُکھ دیوانہ وغیرہم وہ بزرگ تھے جنھوں نے اُردو کی دلآویزیوں میں چار چاند لگا دیے۔ اور اُس کی محبت کو دُور دُور تک عام کر دیا۔ ان کے بعد آنے والوں نے انھیں سے اپنے چراغ جلائے اور اُردو کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ اس تمام خدمت گزاری وسرگرمی کے طفیل مذاق میں صحت اور صفائی بھی پیدا ہوتی گئی جو تمام تر فارسی کا قالب بنکر ادبی معیار کے نام سے مشہور ہو گئی۔ متقدمین نے جو ذخیرۂ تصنیفات ترکہ میں چھوڑا اُس میں اُن کے جانشینوں کو ایک بڑا انبار سقیم وغیر معتدل نظر آیا اس انبار میں کچھ قدیم الفاظ اور ترکیبیں تھیں اور کچھ معنوی بے عنوانیاں، ان لوگوں نے اس کی اصلاح شروع کی، صدہا ہندی الفاظ کو داخل متروکات کیا۔ جس پر کچھ زمانہ ہوا اِسی رسالہ میں کچھ عرض کر چکا ہوں یہاں صرف اتنا عرض کر دینا مناسب مقام ہے کہ بہت سے متروکات ابتک اساتذہ استعمال کرتے چلے آتے ہیں۔ اِس لئے کہ اول تو ان الفاظ نے اپنا خاص محل ومصرف پیدا کر لیا ہے دوسرے کسی لفظ یا ترکیب کا بہت دنوں تک استعمال نہ ہونا یا کسی خاص شخص کا اُسے متروک کر دینا اُس کے ترک کی کافی وجہ نہیں۔ بہت سے الفاظ کو غیر معتبر اور غلط بتایا گیا لیکن یہ سب بظاہر اُردو سے وابستگی کا نتیجہ تھا سیاسی، تمدنی، یا مذہبی اغراض ومقاصد پر مبنی نہ تھا، بلکہ اس زبان میں ابھی یہ صلاحیت واہمیت ہی پیدا نہ ہوئی تھی، کہ اس کو کسی قومی یا سیاسی ادارے کی حیثیت سے دیکھا جاتا۔ یہ تمام تر کوشش وکاوش اس لئے تھی کہ بھاشا اور عربی فارسی کی قیدوں سے آزاد ہو کر اُردو اپنی علحدہ ہستی قائم کر لے اس مقصد کے لئے اُردو جس زبان سے مراد تھی وہ سید انشا کی ذیل کی عبارت سے کافی طور پر محقق

ومتعین ہو جاتی ہے:-

"مخفی نماند کہ ہر لفظ کہ در اُردو مشہور شد عربی باشد یا فارسی یا ترکی یا سُریانی یا پنجابی یا پوربی از روئے اصل غلط باشد یا صحیح آں لفظ لفظ اُردو ست اگر موافق اصل مستعمل است ہم صحیح و اگر خلاف اصل است ہم صحیح، صحت و غلطی آں موقوف بر استعمال پذیرفتن در اُردو است۔ زیرا کہ ہرچہ خلاف اُردو است غلط است گو در اصل صحیح باشد، و ہرچہ موافق اُردو است صحیح باشد گو در اصل صحت نداشتہ باشد"[1]

اُردو الفاظ کی یہی خصوصیت اس زبان کو ایک طرف عربی فارسی سے اور دوسری طرف بھاشا سے ممیز کرتی ہے۔ اور اس کو ایک مستقل زبان کی نوعیت عطا کرتی ہے۔ عربی فارسی کے بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو اُردو میں آکر اپنی ماخذ زبانوں سے بالکل مختلف مفہوم ادا کرتے ہیں، اسی طرح ان دونوں زبانوں کے باہمی امتزاج سے، نیز ہندی اور عربی فارسی کے پیوند سے صدہا الفاظ ایسے وضع ہو کر رائج ہو گئے جو اپنی اصل زبانوں سے بالکل انوکھی چیز ہیں، اور اُن کے صرفی و نحوی قواعد سے آزاد، جیسے جمعدار کہ اصل میں جامہ دار تھا، یا افراتفری کہ اصل میں افراط و تفریط تھا، یا ہندی میں بکل۔ چلپن۔ لہو وغیرہ، ایسے بدلے کہ اب اُن کی اصل کا پتہ لگانا بھی دشوار ہے۔ اس عمل کے لئے نہ کوئی خاص قاعدہ مقرر تھا نہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت زبان کے بنانے والے جمہور ہوتے ہیں جو اپنی طبعی مناسبت اور لب و لہجہ کی سہولت کے لحاظ سے موقع و محل کے مطابق الفاظ تلاش کرتے ہیں۔ اگر مروجہ لفظوں نے اُن کی ضرورت پوری نہ کی تو وہ انہیں میں سے کسی کو توڑ مروڑ کر ایک نیا لفظ ڈھال لیتے ہیں، یا کوئی بالکل نیا لفظ گڑھ لیتے ہیں جس کی مثال آگے آئیگی۔ شاعر اور ادیب اس ذخیرے کو سانچے میں ڈھالتے اور مستقل حیثیت دیتے ہیں، اس کا تجزیہ کرکے اصول و قواعد مرتب کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے قواعد وضوابط منضبط ہو جائیں اُس کے بعد اُن کے مطابق زبان گڑھی جائے۔ ابتدا میں اسی قسم کے سیکڑوں لفظوں اور ترکیبوں نے اُردو کے ذاتی وجود کی بنائیں قائم کیں اور اُس کی انفرادی زندگی کے قیام و ارتقا میں امداد دی۔ جب زباندان ظہور میں آئے اُنھوں نے اس تمام ذخیرے کو ایک خاص معیار پر جانچا اور پرکھا۔ اور اس معیار کے اجزا کو قواعد فن یا اُصول فصاحت و بلاغت کا نام دیا۔ یہ تمام سرمایہ اس کسوٹی پر پورا نہیں اُتر سکتا تھا اس لئے بہت سا حصہ متروکات کی ذیل میں آگیا اور بہت سا مستعملات میں رہا۔ آخرالذکر حصہ میں سے چند ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں جنکی

[1] دریائے لطافت صفحہ ۱۴۲

ساخت میں دو زبانیں شامل ہیں:۔

گلچھرے ۔ گلچلا ۔ جیب کترہ ۔ گلے باز ۔ شوربے چٹ ۔ منہ زور ۔ جوشیلا ۔ دل لگی ۔
اگن بوٹ ۔ ڈھلمل یقین ۔ ایماندار ۔ لمبر دار ۔ درشنی جوان ۔ مکر گدا ۔ ڈنڈا کش ۔ کاپی نگار
چھاپہ خانہ ۔ ڈولی بردار ۔ سمجھ دار ۔ چوکیدار ۔ تھانہ دار ۔ گاڑی بان ۔ رتھ بان ۔ بوباس غل غپاڑہ
جگت باز ۔ پنشندار ۔ چٹھی رساں ۔ چھت گیری ۔ جگت اُستاد ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ "جگت اُستاد"
کے اُصول پر امیر مینائی نے "جگت آشنا" لکھا۔[1]

ان لفظوں نے اُردو کی مستقل ہستی ہی قائم نہیں کی بلکہ ان میں جو اشتقاقی و اختراعی اصول جاری و ساری ہیں اُن سے اُس کی ترقی کا میدان بہت وسیع ہو گیا، اور یہی ان الفاظ کی سب سے بڑی خصوصیت و غایت ہے۔ اگر ان اصولوں کی پیروی سلیقہ اور تمیز کے ساتھ کی جائے تو اُردو ادبی تفریح کی چہار دیواری سے نکل کر واقعی ایک قومی زبان بن جائے اور اس کی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ حایل نہ ہو۔ بعض ادیبوں کو اس کا احساس ہے، لیکن اکثریت اُن حضرات کی ہے جنھوں نے زبان کے اشتقاقی و اختراعی راستوں کو بند کر کے اُصول و قواعد کو اس قدر تنگ اور محدود کر دیا ہے کہ زبان کے بنیادی سرمایہ میں اضافہ ہونا تو درکنار خود وہ سرمایہ ہی نابود ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس سختی سے زبان کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ وہ جنس جو ایک زمانہ میں نہایت پسندیدہ اور ہر دلعزیز تھی اب قابل نفرت ہو گئی۔ جب زبان سے وہ ذخیرہ نکل گیا جس پر اُس کی مستقل حیات وبقا کا دارومدار تھا تو یہ کمی اور کمزوری پورا کرنے کے لئے عربی فارسی کی عجیب الخلقت ترکیبیں جا و بیجا طور پر ٹھونسی جانے لگیں۔ لیکن زبان کے وارث یعنی جمہور کے قوائے ذہنی کب ان شکنجوں میں جکڑے جا سکتے تھے اور کب ان کی طبیعتیں نفسیاتی اُصول کے خلاف "مقیاس الحرارت" "قرطاس ابیض" "مقاطعۂ جوعی" "طیارہ" وغیرہ کی متحمل ہو سکتی تھیں۔ وہ تو برابر تھرمامیٹر، وہائٹ پیپر، بھوک ہڑتال اور ہوائی جہاز ہی بولتے اور لکھتے ہیں اور بولتے اور لکھتے رہیں گے۔ پھر اگر اُردو لکھنؤ کے گلی کوچوں دلّی کی گلیوں، یا چند علما کی درسگاہوں یا شاعروں اور ادیبوں کے حلقۂ تلمذ، یا ارباب فن کے ایوان ادب تک ہی محدود رہتی یا صرف پامال و ہوسکارانہ حسن و عشق کی داستان سرائی تک اس کا عمل و تصرف رہتا یا محض تفنن و تفریح ہی کا مشغلہ بنی رہتی تو ضرور یہ پابندیاں اُصول و فن کے نام سے عائد کی جاتی ہیں نبھ سکتی تھیں۔ مگر زمانہ نے کروٹ لی اور ایسی کروٹ لی

[1] مرقع ادب صفحہ ۳۲

کہ ساری دنیا کی کایا پلٹ ہو گئی۔ ایسا انقلاب آیا کہ زمین و آسمان بدل گئے۔ معجزات سائنس نے تمام عالم کو حیرت میں ڈال دیا۔ دنیا کے کاروبار، مقاصد و مشاغل میں بھی عظیم تغیر پیدا کر دیا۔ نئی نئی ایجادات و اختراعات نے انسانی بستی میں چکا چوند کر دی۔ ہر مقام کے سیاسی و معاشرتی نصب العین میں بھی حیرت انگیز تغیرات رونما ہوئے۔ ضعیف اور بے بس ہندوستان اس عالمگیر اور طوفانی ہنگامہ سے کب بچ سکتا تھا۔ اس پاک سرزمین کا وہ معصوم باشندہ بھی جو کسی زمانے میں عبادت و گوشہ نشینی کو معراج حیات و مقصود زندگی جانتا تھا اپنے پرانے معتقدات سے بغاوت کر اٹھا، اور زمانہ کے متواتر تلخ تجربوں نے اس پر ثابت کر دیا کہ خلوت پسندی و تنہا نشینی کی میعاد ختم ہو گئی۔ اس کی زندگی اب تمام دنیا کی مجموعی زندگی کا مستقل جزو بنکر ہی قائم رہ سکتی ہے اور دنیا کی مجموعی زندگی ہزاروں قسم کی سرگرمیوں پر مشتمل ہے، ان تمام سرگرمیوں میں نہ سہی چند در چند ایسی ضرور ہیں جن میں استقلال و خلوص کے ساتھ حصہ لئے بغیر ہندیوں کو چارہ نہیں۔ ایسی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے لازم ہے کہ زبان کو بھی لا محدود وسعت دی جائے، اس لئے کہ کوئی قوم اپنی مکمل زبان کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ یہاں کسی ایک زبان کا مقتضیات وقت کے مطابق مکمل ہونا درکنار ابھی یہی نہیں معلوم ہے کہ کونسی زبان اس سخت کشمکش اور آزمایش کے وقت ہمارا ساتھ دے سکے گی۔ بہرحال کوئی زبان بھی ہو زمانے کے ساتھ ساتھ اُسے چلنا پڑیگا اور انگریزی سے بھی اُسے مدد لینا ہو گی۔ جمہور اپنی روز افزوں ضرورتوں کے مطابق ہر صنعت و حرفت فن اور مشغلہ میں صدہا الفاظ مروجہ زبانوں سے گڑھتے چلے جاتے ہیں جن کا سکہ بازاروں، کارخانوں ملوں، کلبوں، تفریح گاہوں اور اخباروں میں رواں ہے۔ مثال کے طور پر ایک لفظ "رتیائی" پیش کرتا ہوں جو کانپور کے ملوں میں کام کرنے والوں نے Night shift کے لئے گڑھا اور خوب گڑھا ہے۔ اسی قبیل سے "ہوائی جہاز" بھی ہے اور مچھر دانی بھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ رتیائی سے بہتر Night shift کے لئے کوئی دوسرا لفظ عربی فارسی کے قاعدوں سے وضع نہیں کیا جا سکتا اگر اس میں شک ہو تو کسی عربی فارسی کے عالم کا امتحان لے لیا جائے۔

کسی زمانے میں اساتذہ اپنے خلوت خانوں میں بیٹھے بیٹھے زبان پر احکام صادر کیا کرتے تھے اُن کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد اِن احکام کی پابندی پر جان دیتے تھے۔ اُس وقت اُردو کی غرض و غایت ایک تفریحی مشغلے سے زیادہ نہ تھی، اب ملک کو ایسی زبان کی ضرورت ہے جو اس سرزمین کی گوناگوں خصوصیتوں کو محفوظ و قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ زمانے کے مطابق ہر قسم کی

ترقی کا آسان وسیلہ بن سکے۔ ظاہر ہے کہ وہ قانون زبان جو خلوت خانوں میں بیٹھکر مرتّب کیا گیا تھا اس قسم کی زبان کا ساتھ نہیں دے سکتا، اور تنگ اور سخت بندشوں میں رہ کر کوئی زبان وہ خدمت انجام نہیں دے سکتی جس کی اب ہمارے ملک کو ضرورت ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کا اب یہ فرض ہے کہ زبان کی جکڑ بندیوں کو ڈھیلا کریں، نئے الفاظ اور ترکیبوں کا جو سرمایہ داخل ہو رہا ہے اُس کو قومی ضروریات کا مفید ثمرہ اور ارتقائے قومی کا لسانی وسیلہ سمجھیں، ادب میں اُس کی صحیح جگہ متعین کریں، ادب و شعر کو جمہور کی عام بول چال اور گھریلو زندگیوں کے مطابق بناکر ہر دلعزیز بنائیں جس سے شعر و ادب عوام کی رہنے بسنے کی سب حالتوں کی اصلاح کا ذریعہ بن سکیں، اُن کی سماجی دلچسپیوں کو بہتر بنا سکیں، ان میں کشمکش حیات کے مردانہ مقابلہ کی قوت پیدا کریں۔ زندگی کے مقاصد سے خبردار بنائیں، مختصر یہ کہ جو تمام ملکی و قومی زندگی کو بہ حیثیت مجموعی بلند کر کے مضبوط ہموار اور پاکیزہ بنائیں۔ یہ تمام مقاصد آسان اور گھریلو زبان کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے، اور یقیناً اس زبان سے یہ مہم سر نہیں ہو سکتی جو بات بات پر زبان کاٹے اور قدم قدم پر بیڑیاں ڈالے اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ اگر ہر شخص کی بولی زبان میں داخل کر لی جائے تو زبان چوں چوں کا مُرَبّہ بن کر رہ جائے۔ اس کا سب سے پہلا جواب یہ ہے کہ اُردو متعدد زبانوں کا مرکب ہونے کے باعث چوں چوں کا مربّہ تو ہے ہی بنکر کیا رہ جائیگی۔ دوسرے یہ کہ ہم کو ضرورت ایسی ہی زبان کی ہے جو تمام بولیوں کی قایم مقام ہو اور جو دیہاتوں میں بسنے والے کسانوں کے لئے بہ نسبت شہریوں کے زیادہ سود مند ہو۔ چند شہر والے اپنے مرصّع کمروں میں آرام سے بیٹھکر غالب۔ آتش، داغ وغیرہم کے دیوانوں کا لطف حاصل کیا کریں لیکن عوام کو اس سے کیا فائدہ ہے۔

ان تمام باتوں کے باوصف میرا یہ بھی مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ ہر غلط سلط لفظ کو جو عوام میں رائج ہو زبان کا معتبر جزو مان لیا جائے، یا ادب کی حدود ہی مٹا دی جائیں، صرف ضرورت یہ ہے کہ ان حدود کو وسیع کر دیا جائے جو بہت سے پُرانے قواعد توڑے بغیر ناممکن ہے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ہمارے اربابِ فن بہت سے پُرانے سکّوں کو جو صدیوں سے رائج ہیں نام نہاد قواعد و ضوابط کی گرفت میں لاکر زبان کے خزانے سے خارج کر رہے ہیں اور عجیب عجیب ہیئت کی ترکیبیں اُن کی جگہ لے رہی ہیں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ یہ کیوں ہو رہا ہے اس پر مفصل بحث ہندی، اُردو ہندوستانی کے عنوان سے اِسی رسالہ میں اپریل سنہ ۱۹۳۵ء میں کی جا چکی ہے۔ آگے چلکر کچھ ایسے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں جو متقدمین کے عہد سے اب تک زبان کا ٹکسالی سکّہ بنے ہوئے ہیں

مگر عربی فارسی کے دلدادہ صرف ونحو کے قواعد یا لغت کے ماتحت ان کو اُردو سے خارج کر دینے پر مُصر ہیں، اور چاہتے ہیں کہ یہ زبان ہماری مرضی کے مطابق رواج پائے، یہ ممکن ہے یا نہیں، ملکی ضروریات ثابت کر رہی ہیں۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ ان ضوابط و قواعد نے ان اساتذہ فن کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ ضرور دے دیا ہے جسے وہ معیار کے نام سے استعمال کر کے دور دُور تک اپنا رعب بٹھائے ہوئے ہیں اور جس تصنیف اور مصنف کو چاہتے ہیں مجروح و مضروب کر دیتے ہیں۔

قانونِ قدرت کی راہیں انسانی تصرفات سے باہر ہیں، اور جب کسی سرزمین میں انقلاب آتا ہے تو وہاں کی قوم نیا جنم لیتی ہے، پُرانے اداروں میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور زبان بھی پُرانی بندشوں سے آزاد ہو جاتی ہے، اور نئی نئی ضروریات، نئے نئے مشاغل و مقاصد کے پُورا کرنے کے لئے نیا چولا بدلنا شروع کر دیتی ہے۔ اس بارے میں اجارہ دارانِ فن کے لئے ایران کی مثال بہت سبق آموز ہے ایران میں آجکل جو زبان رائج ہے اُس کو وہاں کی پُرانی زبان سے کوئی علاقہ نہیں۔ اگر اب سے پچاس برس ہی پہلے کے ادبا و شعرا وہاں آج نمودار ہو جائیں تو نہ اُن کی بولی کوئی سمجھے نہ وہ کسی کی اب جو زبان وہاں رائج ہے اُس میں ہزارہا لفظ ایسے ہیں جو اپنے پُرانے لغوی یا اصطلاحی معنی کی حدود سے آزاد ہو کر نئے نئے مطالب و مفہوم ادا کرتے ہیں اور ہزاروں لفظ نئے ایسے وضع ہو گئے ہیں جو نہ پُرانے لغات میں ملتے ہیں نہ پُرانی صرف ونحو کے قاعدوں میں آتے ہیں۔ ان سب کو جدید فارسی کا نام دیا جاتا ہے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا اب میں وہ الفاظ پیش کرتا ہوں جو اب تک شاعروں اور انشا پردازوں کا دستور العمل بنے ہوئے ہیں اور جن کا قلع قمع کر دینے کے لئے اہل فن ہر وقت شمشیر بکف بیٹھے رہتے ہیں۔ ان الفاظ کو دو ذیلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) وہ الفاظ جو عربی فارسی میں کچھ معنی رکھتے ہیں اور اُردو میں کچھ اور، لیکن اب ان کا استعمال عربی یا فارسی معنی کے خلاف غلط بتایا جاتا ہے۔

(۲) وہ الفاظ اور ترکیبیں جو اپنی ساخت میں غلط بتائی جاتی ہیں۔

۱۔ وہ الفاظ جو عربی فارسی میں کچھ معنی رکھتے ہیں اور اُردو میں کچھ اور، لیکن اب ان کا استعمال عربی یا فارسی معنی کے خلاف غلط بتایا جاتا ہے:۔

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اُردو معنی	سند
دِقت	باریکی	مشکل	"یہاں سے اُس نے مصر کا رُخ کیا..... جو بے دقت اُسکے قبضہ میں آگیا۔ (محمد حسین آزاد۔ سکندر اعظم) ع "بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس" اکبر الہ آبادی

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اُردو معنی	سند
			اُن میں اور شعر میں حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہے، زیادہ دقت اس لئے ہوتی ہے۔" (شعر العجم حصہ ۴)
اوقات	جمع وقت	حیثیت	"میں تو غریب آدمی ہوں ٹکے کی اوقات" (جام سرشار ۲۹۱)
عرصہ	میدان	مدت	"اور عرصۂ دراز کے بعد ان کی زبان کو ادبی شان نصیب ہوئی" (تنقیدات عبدالحق ۴۲) کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیئے ہوئے (غالب) ع توان بہ عرصۂ چل روز یا دو ماہ رسید (نعمت خاں عالی)
سرپرست	خادم	مربی	"یہ بھی تجویز ہے کہ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک رسالہ اُردوئے معلیٰ کے نام سے جاری کیا جائے۔" (تنقیدات عبدالحق) "اور کتاب کو اُردو کے سب سے بڑے سرپرست اعلیٰ حضرت... کی طرف نسبت دیکر نظام اُردو کے نام سے موسوم کر دیا۔" نظام اُردو صفحہ ب از آرزو لکھنوی
معافی	صیغہ اسم فاعل بمعنی عفو کنندہ	چھما	"طمع کے بعد معافی مانگنا یہ اور ستم ہے" نوٹ:- قابل معافی اور طالب معافی عام طور پر رائج ہیں۔
فرصت	نوبت	آرام پانا	"ہر خط میں آلام و امراض گوناگوں کا رونا اور قلتِ فرصت کا رونا ہے" (تنقیدات عبدالحق) "فرصتِ ناز بھی پہروں نہیں ملتی افسوس وہ ہے مصروف سمجھائے فراواں کوئی (داغ)
مضطر	بے اختیار۔ بیچارہ	بے قرار	"اُس کی چتون پھرتے ہی محفل میں ہلچل پڑ گئی مضطرب کو مضطرب مضطر کو مضطر لے چلا (داغ) ع۔ ساتھ اپنے اُنھیں لے کے گئی بانوئے مضطر" (انیس) مضطر ہوں چین آئے پہ آتا نہیں مجھے رونے میں منہ تیرا نظر آتا نہیں مجھے (انیس) ع۔ دیکھتے جاؤ ہمارے دلِ مضطر کے مزے (داغ)
فضا	فراخی زمین و کشادگی صحن	بہار۔ حالت	اک داغ رہ گیا ہے سو وہ بھی مٹا مٹا دل میں بہارِ عشق کی اب وہ فضا نہیں (داغ) ع سُنا جو کرتے تھے وہ باغ پُر فضا ہے یہ (چکبست) ع۔ ازل میں تھی جو فضا اُس کا یادگار ہے یہ (چکبست) "شاید آپ کو میں نے لفظ فضا کی تحقیق لکھدی تھی، اگر اُردو کے معنی لئے جائیں تو بہار کے ہو سکتے ہیں" شوق قدوائی مرقع ادب صفحہ ۹۱

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اُردو معنی	سند
محرم	واقف کار	انگیا	کسی کی محرم آبِ رواں کی یاد آئی حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا
مشکور	شکر کیا گیا، ستودہ	شکر کرنیوالا	ایک نے مجمعِ سادات میں بڑھکر یہ کہا گرچہ اس لطف کے مشکور ہیں ہم خاک نشیں (شبلی) "نہ یہ کہ سارا پنجاب خاص اُردو کی واقفیت کے لئے ان کا مشکور ہو۔" (منشورات از کیفی دہلوی) ع نہ ہو مشکور کیوں پیر بندہ لطفِ کبریائی کا (ذکی تلمیذ غالب) "مدت کے بعد نامہ سعادت آیا ممنون و مشکور کیا" (امیر مینائی مرقع ادب ص۴۲)
منت	احسان کردن	خوشامد	اُس نے مانی نہ کوئی میری بات منتیں کر کے بات بھی کھوئی (داغ)
تکلیف	کار فرمودن	دُکھ	شبِ فراق کی تکلیف سے یقین آیا مقابل اس کے جہنم میں عیش ہوتا ہے (داغ)
خاطر	دل	آؤبھگت مدارات	"وہ جوہری بچہ ڈٹا ہوا ہے اور بڑی خاطریں ہو رہی ہیں" (جام سرشار ص۳۶) "اُن کی خاطرداری اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔" (محمد حسین آزاد۔ سکندرِ اعظم) ع "نانا کی طرح خاطرِ اُمّت تھی زیادہ" (انیس)
مرتبہ	درجہ و رتبہ	بار، دفعہ	اُردو میں اس کا استعمال دفعہ کے معنی میں عام ہے اور اب فارسی میں بھی اس معنی میں عام ہوگیا ہے۔ جیسے ذیل میں "از ان جملہ نہ سال و ہشت ماہ مرتبۂ اول حکومت نمود و بعد از ان پانزدہ سال در کابل و قندھار مرتبۂ ثانی ...." (از زینت الزماں ذکر جلوس ہمایوں)
غصہ	اندوہ	غیظ، کرودھ	قلزم کے بدن میں لگ گئی آگ منہ پہ غصہ سے آ گئے جھاگ (منشی جوالا پرشاد برق) غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے (آتش)
روزگار	زمانہ	روزی	"ایک لڑکی چھ مہینے کی گود میں، ابھی تک کوئی صورت روزگار نہیں اور نہ کہیں سے اُمید ہے۔" (شریف زادہ از مرزا رسوا لکھنوی)

میں نے صرف چند الفاظ مثال کے طور پر پیش کئے ہیں اور جن مقامات پر خط کھینچ دیئے ہیں اُن سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ اور اسی قبیل کے دیگر الفاظ اپنے اُردو مفہوم میں صرف مفرد استعمال نہیں ہوتے بلکہ تراکیب فارسی کے ساتھ بھی ان کا استعمال جائز ہے۔

۲۔ وہ الفاظ اور ترکیبیں جو اپنی ساخت میں غلط بتائی جاتی ہیں۔

لفظ	کیفیت	سند
مُنشّی	نشہ سے بنایا گیا یعنی نشہ کرنیوالی چیز	"مس کو کسی منشّی دَوا سے بیہوش کرکے بھگالے گیا" (جام سرشار صـ۲۳۹)
نشیلی	نشہ سے رسیلی کے انداز پر بنایا گیا	ع ۔ یوں نشیلی ایسی متوالی نہیں (داغ)
زہریلی	زہر سے رسیلی کے انداز پر بنایا گیا	"معشوق کی آنکھ کو زہریلی شعرائے فارس نے بھی کہا ہے" (شوق قدوائی مرقع ادب صـ۹۵)
عادی	عادت سے بنایا گیا	ع ہم جو عادی ہو گئے دشنام کے (داغ) ع قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی (چکبست) تیغ ابرو کی زباں عادی ہوئی بات سیدھی بھی جو کی ٹیڑھی ہوئی (خواجہ وزیر)
سوائے	اصل لفظ سوا ہے	"سوائے وہی ڈینگ اور کوئی بات نہیں" (جام سرشار صـ۵۲) کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے (غالب) "اُن سب نسخوں میں سوائے ایک کے یہ شعر یوں لکھا ہے" (تنقیدات عبدالحق صـ۲)
بہتات	عربی فارسی میں کوئی لفظ نہیں	دل ہمارا موردِ آفات ہے رنج کی بہتات ہی بہتات ہے (داغ) گوناگوں تتلیوں کی بہتات کب ہوتی ہے جب ہو خوب برسات (صفی لکھنوی)
بدحواسی	فارسی میں بے حواسی مستعمل ہے	کیا کہوں وجہ بدحواسی کی ہوش پرّاں ہیں رنگ محفل سے (داغ) ع سمجھ لیا ہے ستمگر نے بدحواس مجھے (داغ) بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے (سرور جہان آبادی)

لفظ	کیفیت	سند
		"شیریں کہ ان کی بدحواسی اور غم و غصہ اور رنگ چہرہ کے پرواز پر بغور نظر ڈال رہی تھی" (جام سرشار صا۴۱-۴۰)
تلاشی متلاشی	ترکی لفظ تلاش سے بنے ہیں	نکلا ہے تلاشی سے فقط اک درم داغ یاروں کو مرے دل پہ ہزاروں کا بھرم تھا (داغ) ع جلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہے چشمِ شوق (داغ) شب کو خیال رہتا ہے اک رشکِ حور کا ظلمت میں دل مرا متلاشی ہے نور کا (آتش)
بادشاہت	یہ لفظ جاہت کے طریقہ پر بنا ہے	"یہ بہار دیکھ کر اپنے رفقا سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا میں اسی عیش و عشرت کا نام بادشاہت ہے" (محمد حسین آزاد۔ سکندر اعظم)
رہائش	فارسی حاصل مصدروں کے انداز پر رہنا سے بنا۔	آشنا کی دریائے لطافت میں صا۱۳ پر اور رسالہ صبح اُمید میں جس کے ایڈیٹر حضرت چکبست تھے صفحہ ۳ و ۱۳ پر استعمال ہوا ہے۔
قدیمی	اصل لفظ قدیم ہے	"میں ہوں آپ کا قدیمی دعاگو" (امیر فقیر مرقع ادب صا۲۴)
صافی	اصل لفظ صاف ہے	آسودہ باد خاطر غالب کہ خوے اوست آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را (غالب) آبِ صافی بنکے شکل ابر تر ہے برستا قطرہ قطرہ خاک پر
بہبودی	اصل لفظ بہبود ہے	"لیکن زبان کی بہبودی اُن کی یا کسی کی خوشنودی پر فوقیت چاہتی ہے۔" (منشورات از کیفی دہلوی صا۲)
شروعات	شروع سے بنا یا گیا	"یہاں سے اُردو کی تنسیق و تنظیم شروع ہوئی جو اُنیسویں صدی عیسوی کی شروعات تک برابر جاری رہی۔" (منشورات از کیفی دہلوی صا۶)
تبادلہ	عربی فارسی میں کوئی لفظ نہیں	"تبادلۂ خیالات کے بعد اُنھوں نے مجھی کو اس کام کیلئے تجویز کیا (نظام اُردو از آرزو لکھنوی صہ ح) (نوٹ۔ یہاں تبادلہ ترکیب اضافی کے ساتھ ہے۔)
سہ کرر	مکرر کی مثال پر بنایا گیا	"نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک قافیہ کو مکرر سہ کرر باندھنا پڑتا ہے" (شعر الہند صا۲۰۹ از عبدالسلام ندوی)
بلا	بے اور لا دونوں بمعنی نہیں ہیں اور دونوں دو زبانوں کے جزو ہیں اسلئے بلا غلط کہا جاتا ہے	"اُردو کی اصل وہی زبان مانی جا سکتی ہے جس کے الفاظ سے بلا شرکت غیرے کوئی ایسا جملہ بن جائے جسے اردو کہہ سکیں" (نظام اُردو از آرزو لکھنوی صا۹)

لفظ	کیفیت	سند
		ع "بلا وقت میں بن جاؤں تری ساس" (اکبر الہ آبادی)
لاچار	لاعربی اور چار فارسی۔ اسلئے غلط کہا جاتا ہے۔	قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا ذوق ع۔ اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے (چکبست)
ازحد	بمعنی ازحد زیاد	"اس رنگ کو لیلےٰ کے باپ نے گوارا نہ کیا قیس کو ازحد رنج ہوا" (شریف زادہ مرزا رسوا صہ۵۹) بہت نادم خجل ازحد نہایت منفعل ہوگے اگر منہ ڈال کر دیکھو گے تم اپنے گریباں میں حکیم محمد انور گرچہ ازحد ہوں گنہگار مسلمان تو ہوں پیچھے پیچھے مرے دوزخ میں بھی جنت آئی (داغ)
بُوباس	ایک لفظ فارسی ایک ہندی	بو باس غیر ہے تیرے پھولوں کے ہار میں (داغ) (نوٹ۔ اضافت کے ساتھ بو باس ہے)
پھبتی نما	ایک لفظ ہندی ایک فارسی	"جدید لیکن پھبتی نما تشبیہیں بھی اس رنگ کا ایک لازمی جزو ہیں" (شعر الہند صہ۳۰۲)
سمجھدار	"	"سمجھدار آدمی سے زیادہ کہنا دیوانہ پن ہے" (منشورات از کیفی دہلوی صہ۲۲۹)
تابعدار	تابع کے ساتھ دار زائد ہے	ع غمخوار باپوں کی رہیں ماؤں کی تابعدار تم (حالی)
ڈھلمل یقین	ایک لفظ ہندی ایک عربی	"بلکہ عمل سے بھی ضعیف الاعتقاد اور ڈھلمل یقین ہیں" (منشورات از کیفی دہلوی صہ۱۶۲)
فوق البھڑک	ایضاً	وہ مس فوق البھڑک لباس زیب تن کئے اتراتی پھرتی تھی (جام سرشار صہ۲۳۹)
لگاوٹ باز	ایضاً	"انکھڑیاں لگاوٹ باز" جام سرشار صہ۲۳۹
گراں ڈیل	ایضاً	"وہ جلے گرانڈیل اژدہوں کی طرح منہ کھول کر" (جام سرشار صہ۲۱۶)
بےساختہ پن	ایضاً	زیور کی نہیں حاجت ہرگز بھی حسینوں کو معشوق وہ ہے جس میں بیساختہ پن ہوگا (داغ)
گل تکیہ	گل مخفف گال ہندی اور تکیہ عربی	وہ گل تکیہ مرے مرقد میں رکھنا معطر ہو جو زلف مشکبو سے (داغ)

لفظ	کیفیت	سند
دیوانہ پن	ایک جزو فارسی ایک ہندی	وہ رہگذر وہ کوچہ وہ در مجھ سے کب چھٹا کچھ ہوش کا لگاؤ بھی دیوانہ پن میں ہے (داغ)
لاُابالی پن	ایک جزو عربی ایک ہندی	"مگر اُن کی بے پروائی اور لاُابالی پن سے کچھ بعید نہیں" مرقع ادب صہ ۳۲
دانہ پانی	ایک جزو فارسی ایک ہندی	قفس ہی میں جائیں گے ہم گلستاں سے ہمارا یہاں دانہ پانی نہیں ہے (داغ)
غلطی	اصل لفظ غلط ہے	غلطیہائے مضامیں مت پوچھ لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں (غالب)
طرفدار	بمعنی جانب دار استعمال ہوتا ہے ایک لفظ عربی ایک فارسی ہے	دل روزِ حشر اُس کا طرفدار ہوگیا بگڑا مرا معاملہ جھوٹے گواہ سے (داغ) ع طرفداری قیامت میں کریگا پاسباں میری (داغ) ہم تو دیوانے ہیں مجنوں کی کہے جائیں گے ہیں حسیں آپ طرفداری لیلےٰ کیجئے یہاں طرفداری بہ ترکیب اضافی ہے (محوی لکھنوی)
پاٹ دار	ایک جزو ہندی ایک فارسی	اے ہمصفیر میری فغاں کا ہے رنگ اور آواز پاٹ دار کہاں عندلیب کی (داغ)

"قریب المرگ" کو اس لئے غلط بتایا جاتا ہے کہ قریب عربی ہے اور مرگ فارسی، اور عربی قاعدہ سے دونوں کا پیوند لگایا گیا۔ اگر اس لفظ کو زبان سے خارج کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ کسی کے اختیار کی بات نہیں تو حدِ امکان اور حور وغلمان وغیرہ کو بھی نکالا جائے، ان میں بھی ایسا ہی نقص ہے لفظ تو ہیں عربی اور جوڑ فارسی اضافت وعطف سے لگایا گیا ہے، لیکن ان کو کوئی نہیں نکال سکتا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ایسے الفاظ اور ترکیبوں کو عربی فارسی قاعدے سے جانچا ہی کیوں جائے۔ انہیں عربی فارسی کا ایسا پیوندی جزو کیئے جو اردو ہے ورنہ اگر ایسے الفاظ کو غلط ہی کہہ دیا جائیگا تو بہت سا سرمایہ ایسا خارج ہو جائیگا جس کی جگہ کوئی دوسری چیز پُر نہ کرسکے گی۔ اور خارج کہاں سے ہو جائیگا صرف علما و بلغا کی تحریرات سے جمہور تو اسی لفظ سے اپنا کام نکالیں گے جو موقع او محل کے مطابق ہوگا۔ اور ان الفاظ نے اپنا خاص محل ومصرف زبان میں پیدا کر لیا ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا۔ اُردو تو اُردو فارسی میں بھی ایسے الفاظ اور ترکیبیں ملتی ہیں جن کا ایک جزو عربی ایک فارسی ہے، مثلاً خیمہ گاہ۔ ارادت کیش۔ عقیدتمند۔ یہی نہیں بلکہ فارسی نے بہت سے ہندی الفاظ کو بھی اپنا لیا، مثلاً بادلہ پوش۔ چہرہ بند۔ جھگڑ۔ گلاب۔ فارسی جو

ایک اجنبی زبان تھی اُس نے ہندی کے ساتھ یہ سلوک کیا، اور اُردو کے ٹھیکہ دار اپنی ہی زبان کے الفاظ کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں اضافی و عطفی تراکیب کے متعلق بھی کچھ ضمناً عرض کرنا مقتضائے مقام ہے۔ اُردو میں اضافت کے لئے "کا" "کے"، "کی" ہیں اور عطف کے لئے "اور" اور فارسی میں یہ کام زیر زبر پیش اور واؤ سے لیا جاتا ہے۔ فارسی میں اضافی و عطفی تراکیب سے دو اغراض پورے ہوتے ہیں، ایک تو کلام میں کسی قدر اختصار ہو جاتا ہے اور دوسرے ترکیب میں چستی آجاتی ہے، اس کے لئے اب تک یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ہندی لفظ کے ساتھ فارسی اضافت یا عطف نہ آنا چاہیئے۔ مثلاً "موسم برسات" یا "رنگ و روپ" کہنا صحیح نہیں، لیکن زبان کی روز افزوں ترقی واضح کر رہی ہے کہ اُسے اس قید سے بھی آزاد کرنا ہوگا اور اس کے ادب کو زندگی کی نئی روشوں کے سانچے میں ڈھلنا ہوگا۔ اور ضروریات جو ترکیبیں اختراع کرنے پر مجبور کر رہی ہیں وہ ارباب فن کے غم و غصہ کے برخلاف ادبی جزو بن کر رہیں گی۔ کس کی مجال ہے جو ذیل کی ترکیبوں کو اور ایسی ترکیبیں صدہا ہیں، جمہور تو دُور تعلیم یافتہ طبقہ ہی کے استعمال سے روک سکے۔

ممبران لیگ۔ کارکنان کانفرنس۔ ممبران بورڈ۔ جلسۂ بورڈ۔ مالکانِ مل۔ افراد کمیٹی۔ طلبائے کالج۔ کاریگران مل۔ افسران محکمہ۔ لیڈران ملک و قوم وغیرہ وغیرہ۔ جب فارسی، عربی اور عربی عربی الفاظ فارسی کی اضافی و عطفی تراکیب کے ساتھ رواج پاکر مستند ہو گئے، جیسے حدِ امکان اور حور و غلمان اور ہندی فارسی الفاظ میں بھی افصح الفصحا داغ نے اضافت لگانے میں تعصب نہیں برتا جیسے "بو باسِ غیر" تو انگریزی اور ہندی لفظوں کے ساتھ کیوں تعصب برتا جائے۔ دورِ حاضرہ کے وسیع النظر ادیبوں اور شاعروں نے اس کا احساس بھی کر لیا ہے اور اس کی مثالیں بھی پیش کر دی ہیں، حضرت عزیز لکھنوی مرحوم فرماتے ہیں:۔

کنارا کیجئے گا صحبتِ رندانِ کالج سے ۔۔۔ غضب ہی ڈھائیں گے اے شیخ یہ پتلون میں انگریزی

اکبر الٰہ آبادی کے یہاں اس قسم کی مثالیں متعدد ملتی ہیں۔

اِسی سلسلہ میں ایک بات اور یاد آگئی وہ بھی عرض کر دوں، اُردو میں عربی فارسی کے بہت سے ایسے لفظ مستعمل ہیں جن کے اول میں حروف متحرک ہیں، جیسے کَلِمہ۔ صَدَقہ۔ اَرَنی حَرَکت۔ بَرَکت وغیرہ۔ نثر میں تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ الفاظ صحتِ حرکت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں یا نہیں، مگر نظم میں جہاں ایسا کوئی لفظ حرف دوم کے سکون کے ساتھ آیا کہ ارباب فن نے فوراً فتویٰ لگا دیا غلط غلط۔ اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ فارسی میں بھی یہ پابندی توڑ دی گئی ہے مثلاً

موسیٰ ازیں جامِ تہی دیدوست شیشہ بکہٗ پایٔہ ارنی شکست

چناں باد شمشیر دستے فشاند کہ در خرمن عمر برکت نماند (قدسی)

صائبا خجلت سائل بزمینم در کرد بے دری کرد بمن آنچہ بقاروں زر کرد (صائب)

زبس خوشش حرکت دشیریں ادا بود کہ گرمیداد تیزی خوشنما بود (ملا فوقی)

اوپر کے شعروں میں ارنی، برکت، خجلت، حرکت بہ سکون حروف دوم آئے ہیں۔ اُردو کے شعرانے بھی یہ تصرف جائز رکھا ہے، میر کو تو یہ کہے ہوئے زمانہ گزر گیا:۔

"خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ زاہد"

لیکن ناواقفان اُصول زبان مدعیانِ فن بنکر عام رواج کے خلاف احکام صادر کرتے ہیں۔ اب اُن سے کیا کہا جائے، سوا اس کے کہ اُردو کے اساتذہ کے یہاں سے شہادتیں پیش کر کے اُن کی مزید تشفی کر دی جائے۔

اشکِ خجلت کسی عیکش کے جو دوزخ میں گریں اوس پڑ جائے دہکتے ہوئے انگاروں پر (داغ)

تعلیم کا شور ایسا تہذیب کا غل اتنا برکت جو نہیں ہوتی نیت کی خرابی ہے (اکبر الہ آبادی)

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت بڑھا جانبِ بوقبیس ابر رحمت (حالی)

ع سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار (انیس)

ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہ بحر و بر شفقت کی اُس کے حال پہ ہر دم رہے نظر (انیس)

شاعری میں اِن قیدوں میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا ہے، مثلاً حروف علت کا دبنا، تعقید، ترکیب اضافی و عطفی میں اعلان نون، یائے مشدد کا آنا، وغیرہ وغیرہ۔ جس پر کبھی کسی دوسری فرصت میں کچھ عرض کیا جائے گا۔

کلامِ مدہوش

(از پروفیسر ستت پرشاد مدہوش ایم۔اے)

زندگی کا ترانہ

پڑے غم جو تجھ پر اُٹھاتا چلا جا غمِ عشق کھا اور کھاتا چلا جا
تڑپتا ہوا تلملاتا چلا جا رہِ زیست کو جگمگاتا چلا جا
یہی زندگی کا مری ہے ترانہ
یہی زندگی کا مری ہے فسانہ

نہ کر غم سے خالی تو دل کا پیالہ بنا لختِ لختِ جگر کو نوالہ
لہو سے رچا زندگی کا شوالہ جلا خون اور کر دے اِس میں اُجالا
یہی زندگی کا مری ہے ترانہ
یہی زندگی کا مری ہے فسانہ

مِٹا دردِ دل، دردِ دل کو بڑھا کر جما نقشِ ہستی، تو ہستی مٹا کر
جو مرنا ہے تو مر قیامت اُٹھا کر تو دنیا سے جا ایک دنیا بنا کر
یہی زندگی کا مری ہے ترانہ
یہی زندگی کا مری ہے فسانہ

مجھے خستہ دیکھا تو کوئی پکارا ٹھہر جا ٹھہر جا!! ٹھہر جا!!! خدارا!
نہ ٹھہرا نہ ٹھہرا میں ہمت نہ ہارا میں تھا عشق کی شیر مردی کا مارا
یہی زندگی کا مری ہے ترانہ
یہی زندگی کا مری ہے فسانہ

جلنا ہے ابھی اور

رکھ حسن کے شعلوں سے نہ ٹھنڈک کی اُمید قلبِ شرر افشاں! تجھے جلنا ہے ابھی اور
ان عشق کے شعلوں ہی میں جل بھُن لِ کمبخت اے شعلہ بداماں! تجھے جلنا ہے ابھی اور

چمکی نہیں قسمت ابھی برگشتہ ہے تقدیر — ہاں اے دلِ سوزاں! تجھے جلنا ہے ابھی اور
تو سوز سے زنجیرِ تمنا ہی گلا دے — موقوف بہ حرماں! تجھے جلنا ہے ابھی اور
یہ چھوٹی ہمت نہیں اچھی، نہ ہو بزدل — جلنے سے گریزاں! تجھے جلنا ہے ابھی اور
آرام پسندوں کی ہے تقلید بری چیز — ہو اس پہ ہی نازاں تجھے جلنا ہے ابھی اور
جیتے ہیں اسی طرح سے جانبازِ محبت — رہ اس پہ ہی خنداں تجھے جلنا ہے ابھی اور
اپنے کو جلا حسن پر آئے نہ مگر آنچ — اے اس کے نگہباں! تجھے جلنا ہے ابھی اور
کچھ غم نہیں جلنا جو پڑے تا دمِ آخر — اے موت کے مہماں! تجھے جلنا ہے ابھی اور

جلنا ہے بہر کیف تجھے مر کے بھی مدہوش
اے سوختہ ساماں تجھے جلنا ہے ابھی اور

غمِ بیکسی

بہانہ نکالا بہت کچھ خوشی کا — نہ آئی ہنسی تھا وہ غم بیکسی کا
مری زندگی بھی عجب زندگی تھی — نہ تھا ایک بھی جس میں لمحہ خوشی کا
ہر اک سانس میں منھ کو آیا کلیجہ — جیئے پر نہ آیا مزہ زندگی کا
جو مٹنا بھی چاہا تو ہم مٹ نہ پائے — گلہ ہے اگر کچھ تو ہم کو اسی کا
زمانے کے غم کو غمِ عشق دیکر — طریقہ نکالا نیا غم کشی کا
ہے گو ٹمٹمائی ہوئی شمعِ ہستی — ابھی ہے مگر حوصلہ زندگی کا

بتائیں یہ ہم رازِ مدہوش کس کو
کہ احسان ہم پر بڑا ہے کسی کا

قطعہ

ناکامِ عشق رہ کے ہوس میں جو پڑ گئے — شل ہو کے رہ گئیں رگیں عیش و نشاط کی
ہم نے بغیرِ عشق نہ نعمت کوئی چکھی — یہ طنطنہ رہا کہ یہی احتیاط کی

فرطِ خوشی سے ڈر ہے نہ ٹوٹے ربابِ دل
کتنی تنی ہوئی ہیں رگیں انبساط کی

صحیح اردو

(از سید محمد اظہار الحسن صاحب بی۔ اے، ایل ایل بی)

کہتے ہیں خواجہ آتش کے مطلع

دختر رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے   مَیں جہانگیر ہوں وہ نورجہاں بیگم ہے

پرکسی نے اعتراض کیا کہ ہمدم کے ساتھ بیگم کا قافیہ غلط ہے کیونکہ اصلی لفظ ترکی میں بگم ہے۔ آتش مرحوم نے جواب دیا "میں نے اُردو میں شعر کہا ہے، ترکی میں کہوں گا تو بگم لکھدوں گا"۔ سید انشا نے بھی اپنی مشہور تصنیف 'دریائے لطافت' میں صحیح اُردو کا معیار یہ بتایا ہے:۔

"چھپا نہ رہے[1] کہ ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہوتا ہے وہ عربی ہوگا یا فارسی یا ترکی یا سُریانی یا پنجابی یا پوربی اصل کے اعتبار سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے مطابق استعمال ہوتا ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح ہے۔ کیونکہ اس کی صحت اور غلطی اُردو میں استعمال ہونے پر موقوف ہے۔ جو کچھ اُردو کے خلاف ہے غلط ہے خواہ در اصل صحیح ہی کیوں نہ ہو، اور جو اُردو کے مطابق ہے صحیح ہے خواہ در اصل ٹھیک نہ ہو۔"

اسی کسوٹی پر غلط العام فصیح ہو جاتا ہے۔ اس لئے صحیح اُردو کے جانچنے کے لئے ایرانی ہائی کورٹ کی نظیروں کی ضرورت نہیں، اس کی سند اہل زبان کا روزمرہ ہے۔ قانون داں اصحاب جانتے ہیں کہ اکثر ہندوستانی مقدمات کے طے کرنے میں انگریزی عدالتوں کے فیصلوں سے بھی مدد لی جایا کرتی ہے۔ چونکہ برطانوی ہندوستان کے اکثر قانون انگلستان کے نمونہ پر بنائے گئے ہیں، اس لئے انگلستان کی عدالتوں کی رائے پر استدلال کرنا ایک حد تک جائز ہے، لیکن اگر خود مقامی ہائی کورٹ کی نظیر کسی مسئلہ پر موجود ہو تو پھر انگریزی عدالتوں کے فیصلے قابل پابندی نہیں رہتے۔ بالکل یہی اُصول زبان کے معاملہ میں کام کرتا ہے۔ اگر اُردو کے اہل زبان کسی لفظ کو ایک خاص صورت یا معنی میں استعمال کرتے ہیں تو وہ مستند ہے ایرانی یا عربی اساتذہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر کسی خاص لفظ کے بارے میں اُردو کے

[1] فاضل مضمون نگار نے اس ترجمہ کے ساتھ اصل عبارت بھی حاشیہ میں لکھدی ہے، چونکہ یہ عبارت اسی پرچے میں ایک دوسرے مضمون میں آ گئی ہے اس لئے اس کو یہاں پر دوبارہ درج نہیں کیا گیا۔ (ا- ن)

اہلِ زبان اصلی زبان کے اساتذہ ست اختلاف نہیں رکھتے تو پھر مؤخرالذکر سے سند حاصل کرنے میں کیا مضائقہ۔

ہر زندہ زبان دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپناتی رہتی ہے۔ اور اگر یہ سلسلہ بند ہو جائے تو پھر زبان کی زندگی معدوم۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ الفاظ بجنسہٖ شامل کر لئے جاتے ہیں، لیکن اکثر ان میں تراش خراش کر کے اپنی پسند کے مطابق بنا لیا جاتا ہے۔ اب اگر اس قسم کے الفاظ کو کوئی شخص ان کی اصلی صورت میں استعمال کرتا ہے تو وہ دراصل غلط زبان بولتا ہے۔

آجکل بعض اُردو لکھنے اور بولنے والے اکثر الفاظ کو اُن کے اصلی تلفظ سے ادا کرنا پسند کرتے ہیں خواہ وہ تلفظ اُردو میں رائج ہو یا نہ ہو۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان لفظوں کو بدلی ہوئی شکل میں استعمال کرنے سے ان کی اصلی زبان کی واقفیت پر حرف آتا ہے، لیکن یہ غلط فہمی ہے جس سے صرف اُنکی اُردودانی کی قلعی کھلتی ہے اور کچھ نہیں۔ اور یہ کچھ عربی، فارسی یا سنسکرت ہی کے الفاظ پر منحصر نہیں انگریزی جاننے والے ادیب انگریزی لفظوں کو بھی اُن کی اصلی شکل میں لکھتے اور بولتے ہیں۔ رپورٹ کو اُردو میں 'رپٹ' بنایا گیا تھا، اکبر الہ آبادی کہہ گئے ہیں:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں ۔۔۔ کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

سکریٹری کو غالب 'سکتر' کہا کرتے تھے، آج ہر وہ شخص جو انگریزی جانتا ہے رپٹ اور سکتر کو گنواری زبان سمجھتا ہے، حالانکہ سکتر اور رپٹ انگریزی لفظ نہیں رہے تھے اُردو ہو گئے تھے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ بھی خیال ہو کہ اُردو میں خود اپنے لفظ تو ہیں نہیں دوسری زبانوں سے مانگے ہوئے لفظ ہیں، مانگی ہوئی چیز پر تصرف کا کیا حق، لیکن یہ صحیح نہیں جب ہم دوسری زبان کے الفاظ اُردو تحریر یا تقریر میں استعمال کرتے ہیں تو در اصل ہم انھیں اصلی زبان کے الفاظ کی حیثیت سے کام میں نہیں لاتے بلکہ ہم انھیں اُردو کا جزو سمجھکر لکھتے اور بولتے ہیں۔ اسی نکتہ کو فراموش کر دینے سے یہ ساری خرابی پیدا ہوتی ہے اور صحت الفاظ کی دُھن اکثر زبان کو بگاڑنے کا سبب بن جاتی ہے۔

فارسی جدید میں ہزاروں انگریزی اور فرانسیسی الفاظ داخل ہو گئے ہیں، لیکن فارسی والوں نے ان کی صورت کو بدل دیا ہے۔ ڈاکٹر کی جگہ دکتور اسٹیشن کے لئے استاسیون اور ٹیلیگراف کے بجائے تلغراف وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح اُردو میں ہاسپٹل کو ہوتل، لینٹرن کو لالٹین اور سپٹمبر کو ستمبر کہتے ہیں

ؔ اُردو مصنفین کی بے راہ روی کی ایک مثال حال ہی میں ایک نو طبع کتاب میں دیکھنے میں آئی جس کے قابل مصنف نے اپنے نام نامی کے ساتھ پروفیسر کی جگہ ایرانی طرز پر "پروفیسور" لکھنا پسند کیا ہے۔ اسی طرح ایڈیٹر کی جگہ مختلف اصطلاحیں استعمال ہو رہی ہیں۔ حال میں ایک رسالہ میں ایڈیٹر کی جگہ لفظ "ناظر" چھپا ہے۔ (ا-ز)

گاؤں کو گرام، بسیوا کو ویشیا کہنا بھی اسی طرح غلط ہے جیسے لالٹین کو لینٹرن کہنا۔ شکر گزار کے معنی میں مشکور اور اطاعت کرنے والے کے لئے تابعدار اُردو لفظ ہیں، گو اصل میں ان کے معنی بالکل برعکس تھے۔ عربی میں اصل جڑ کو کہتے ہیں اس کی جمع اُصول ہے۔ اُردو میں اصل حقیقت کے معنی میں بولا جاتا ہے اُصول کو جمع سے واحد بنا لیا گیا اور معنی بالکل بدل دیئے گئے۔ صلوٰۃ جیسے پاکیزہ لفظ کی جمع اُردو میں صلوٰتیں بنائی گئی اور معنی میں زمین و آسمان کا فرق کر دیا گیا ہے۔ حور عربی میں جمع ہے اُردو میں واحد اور اس واحد کی جمع حوریں لکھتے ہیں۔ خاطر، عرصہ، اثر اور اسی طرح بیسیوں لفظ ہیں جن کے معنی بدل دیئے گئے ہیں۔ اب اگر عربی قواعد سے ان الفاظ پر قیاس کیا جائے تو اُردو کا ستیاناس ہو جائے۔

لیکن اس کے باوجود اُردو کا عربی اور فارسی سے جو گہرا اور فطری تعلق ہے اُس سے کون آنکھیں بند کر سکتا ہے۔ ہندی کے حامیوں کا اُردو پر یہ "الزام" یقیناً صحیح ہے کہ عربی فارسی جانے بغیر اُردو نہیں آ سکتی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عربی فارسی کی مدد کے بغیر صحیح اُردو بولنا اور لکھنا ناممکن ہے۔ اس میں شک ہو تو جناب آرزو لکھنوی کی خالص اُردو کی کلیات "سُریلی بانسری" اور سید ابوالقاسم کے وہ مضامین جو "ہندستانی" اور "ساقی" میں شائع ہوتے رہے ہیں دیکھئے۔ اُردو کی بنیاد ہندی پر رکھی گئی ہے۔ اس کے فعل، ضمیریں، اضافتیں، حروف ربط سب ہندی ہیں صرف اسماء اور صفات میں عربی اور فارسی کو دخل ہے، اور ان میں بھی ہندی الفاظ کی تعداد کچھ کم نہیں۔ پھر بھی یہ غلط نہیں کہ غالب اور اقبال کے کلام اور انیس و دبیر کے مرثیوں کو سمجھنے کے لئے عربی اور فارسی کی تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے۔ اُردو کے جو ادیب عربی فارسی نہیں جانتے انھیں اپنی پوزیشن کے بارے میں تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ اُردو میں اُن کا وہی درجہ ہے جو انگریزی میں لاطینی نہ جاننے والے اہل قلم کا۔

یہ بات کہ عربی فارسی جانے بغیر اُردو نہیں آ سکتی بجائے خود کچھ قابل اعتراض بھی نہیں۔ عربی فارسی ہی پر کیا موقوف ہے، کیا آجکل کوئی شخص جو انگریزی نہ جانتا ہو ہندی اور اُردو کے روزانہ اخبارات کی زبان کو پورے طور پر سمجھ سکتا ہے۔ کیا ادبی ہندی سے لُطف اندوز ہونے کے لئے سنسکرت کی اسی قدر واقفیت ضروری نہیں جتنی اُردو کے لئے فارسی کی۔

ہاں صحت زبان اور فصاحت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ فارسی اور عربی ہی کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو   رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

اس شعر میں ایک لفظ بھی فارسی عربی کا نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس کی لطافت اور فصاحت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ "تحتِ قدمِ والدہ فردوسِ بریں ہے" سے "کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے" یقیناً زیادہ فصیح ہے۔ داغ کے بے مثل قبول عام کا راز اس کی زبان کی سادگی ہے سہل ممتنع کلام میں ہمیشہ نازک اور سبک الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ آج بھی مشاعروں میں زبان کے شعر بہت مقبول ہوتے ہیں اور یقیناً زبان کے شعر عربی فارسی کے نامانوس الفاظ کا بوجھ برداشت نہیں کرتے۔

تعصب اور ہٹ دھرمی کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں، نہ خلوص اور دیانت کسی ایک جماعت کا اجارہ ہے۔ جس طرح ہندی کے بعض رسالوں میں اُردو کلام شائع ہوتا رہتا ہے اور ہندی کے بعض مشہور ادیب اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں اسی طرح اُردو والوں میں بھی ہندی کے پریمی موجود ہیں۔ عظمت اللہ خاں مرحوم، آرزو لکھنوی، اور ساغر نظامی کا کلام اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اُردو کے اکثر رسالوں میں ہندی گیت شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان نیک نیت بزرگوں کی کوششوں کو سراہنا ہمارا فرض ہے۔

لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے، اُردو اور ہندی دو مستقل اور علٰحدہ علٰحدہ زبانیں ہیں، ممکن ہے کبھی یہ ایک بھی رہی ہوں یا ان کا مخرج ایک ہو، مگر اب تو مدت سے ان کے راستے علٰحدہ علٰحدہ ہوگئے ہیں۔ اُردو ہندی کو ملا کر ہندوستانی بنانے کی کوشش کرنے سے کیا فائدہ؟ زبان کے معاملہ میں کسی کی حکومت نہیں چلتی۔ رام رنگی اور پھلپلاں جیسے رنگین لفظ حکومت کے بل پر رواج نہ پاسکے زبان خود بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ بدلتی ہے تو اتنی بدل جاتی ہے کہ پہچان نہیں پڑتی۔ چاسر کی انگریزی برنارڈ شا کے عہد میں بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ نصرتی اور بحری کی اُردو سمجھنے کے لئے فرہنگ کی ضرورت ہے اور وہ بھی نہیں ملتی۔ ہندی اور اُردو مل کر ہندوستانی تو کیا بنے گی، ہاں اُردو اور ہندی دونوں کی مٹی پلید ہو جائے گی۔ ہندوستانی بجائے خود کوئی زبان نہیں، اس کو زیادہ سے زیادہ بولی کہہ سکتے ہیں۔ غالب اور اقبال چکبست اور سرشار نے جس زبان میں لکھا ہے وہ اُردو ہے، ہندوستانی نہیں اور یقیناً غالب و اقبال، چکبست و سرشار کو اُردو والے نہیں چھوڑ سکتے۔ ٹھیک یہی بات ہندی والے کہہ سکتے ہیں اور بالکل بجا طور پر۔ آج کل اکثر یونیورسٹیوں میں اُردو اور ہندی میں ایم۔اے تک تعلیم ہوتی ہے۔ ہندوستانی کے باضابطہ اور مستقل زبان ہونے کے دعویدار کیا ایم۔اے کے لئے ہندوستانی کا کورس تجویز کرسکتے ہیں۔ یقیناً جن کتابوں کا نام لیا جائیگا وہ اُردو ہونگی یا ہندی

رہ گیا آسان الفاظ کا استعمال، یہ موقع اور محل پر منحصر ہے" کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں"

کہنے والا

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے　　شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

بھی کہتا ہے۔ اور پھر آسان زبان کا معیار ہی کیا ہے۔ دلّی کے ریڈیو اسٹیشن سے جس زبان میں براڈ کاسٹ ہوتا ہے اُس سے ہندی والے بھی ناراض ہیں اور اُردو والے بھی۔ راج نیتی اور سیاست تو ایک طرف، بعض لوگ "تو" اور" کی جگہ "تتھا" "مگر" کے بجائے "پرنتو" لکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آسان زبان اسی کا نام ہے۔ 'ہندوستانی' کے سایہ کے پیچھے دوڑنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں کو اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے کا موقعہ دیا جائے۔

اس سلسلہ میں مجھے ایک بات اور کہنی ہے۔ اگر زبان کو وسعت دینا منظور ہے تو بعض پرانے قاعدوں میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ فارسی اور ہندی الفاظ کو مرکب نہیں کیا جا سکتا، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں، ٹھیکیدار، ڈاک خانہ، گاڑی بان، اُگالدان اُردو میں پہلے سے مستعمل ہیں، سنسنی خیز ابھی دیکھتے ہی دیکھتے اُردو میں گھُل مِل گیا۔ مرزا غالب چھ ماہی لکھ گئے تھے، ہندستانی اکیڈمی نے تماہی بنایا اور قبول ہو گیا۔ مجھے تو کتب خانہ کے مقابلہ میں کتاب گھر بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ٹکٹ لگے ہوئے لفافہ کو ٹکٹ چسپاں یا ٹکٹ زدہ کہنا بھی خوبصورت ترکیب ہے۔

فارسی اور ہندی لفظوں کے درمیان فارسی عطف و اضافت کا استعمال غلط سمجھا جاتا ہے، میرے نزدیک اس کے رواج دینے کی ضرورت ہے۔ اُردو کی غالباً سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے فارسی حرف عطف "و" "اور" سے مختصر بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ ہندی اتھوا ہندوستانی کے حامی تو سرے سے فارسی اضافت کے استعمال ہی کے خلاف ہیں، لیکن میری سمجھ میں ان کا اعتراض نہیں آتا۔ فارسی اضافت کے استعمال سے عبارت میں اختصار بھی پیدا ہوتا ہے اور چستی بھی۔ پھر کیوں نہ ہندی لفظوں کے ساتھ بھی اس کا استعمال جائز قرار دیا جائے!

انتظار

اونچی دیواروں کے اندر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے　　بیٹھے ہیں مقفّل کچھ انسان، انساں جو نہیں اک گنتی ہیں
اِن کے بھی کبھی دن آئیں گے، اِن پر بھی کریگی لطف کبھی　　وہ اندھی پریاں جو قسمت کا تانا بانا بنتی ہیں
جاگے گی کبھی سوئی قسمت، ٹوٹے گا کبھی قفلِ زنداں
کچھ بیکس روحیں آس لگائے، عمر کی گھڑیاں گنتی ہیں

(ریشما)　　[illegible]

ابرِ نو بہار

(از حضرت سرشار کسمنڈوی)

مبارک مے پرستوں کو بہارِ نو بہار آئی — فضائے میکدہ بدلی، ہوائے خوشگوار آئی
نشیمن کیا، قفس پر بھی تباہی بار بار آئی — جب آئی آگ برساتی ہوئی موجِ بہار آئی
نئی رنگینیوں میں ڈوب کر صبحِ بہار آئی — دُلھن کے بھیس میں دوشیزۂ لیل و نہار آئی
کچھ اس انداز سے روپوش ہیں ڈھونڈے نہیں ملتے — محبّت طور کی چوٹی پہ بھی اُن کو پکار آئی
خدا جانے اسے کس بات سے ایذا پہونچتی ہے — تری محفل سے جب آئی تمنّا بے قرار آئی
کشش ایسی کہاں کی مل گئی اِن چند تنکوں کو — کہ ہر بجلی نشیمن کی طرف بے اختیار آئی
وہ آئیں یا نہ آئیں کچھ نہ کچھ اب ہونے والا ہے — جوابِ صبحِ محشر یعنی شامِ انتظار آئی
اِسے کیا علم اِس مدّت میں دُنیا کس قدر بدلی — پھر آئی اور بل کھاتی ہوئی موجِ بہار آئی
مرے دل کی زیارت کو وہ ظالم ایک بار آیا — مگر دُنیا کی ہر تازہ قیامت بار بار آئی
پلٹنا ہو گیا دشوار مجھکو کوئے جاناں سے — محبّت اپنے سر کا بوجھ گر پڑ کر اُتار آئی
چمن سے اور کون آتا قفس تک مجھکو پہونچانے — فقط اِک درد میں ڈوبی ہوئی صوتِ ہزار آئی
حقارت سے نہ دیکھو میرے چاکِ جیب و داماں کو — انھیں دو راستوں سے جب کبھی آئی بہار آئی

وفا کا قحط ہے سرشار انسانوں کی بستی میں
خدا جانے طبیعت کیوں مری دیوانہ وار آئی

بیداری

رہگذارِ کہکشاں پر تھک کے تارے سو گئے — اوڑھ کر اک نور کی چادر ستارے سو گئے
رات کی آغوش میں گردش کے مارے سو گئے — سارا عالم سو رہا ہے ایک میں بیدار ہوں

میں ربابِ زندگی کا اک لرزتا تار ہوں

(ایشیا) (شور علیگ)

زبان

(از مسٹر ح۔ق۔ "ایک گمنام شیدائے ادب")

ہم ناظرین زمانہ کی توجہ چند ایسے لسانیاتی اُصول کی طرف منعطف کرنا چاہتے ہیں جو نئے نہیں ہیں مگر جن کو بھول جانے یا نظرانداز کر دینے سے اکثر مسائل متنازعہ فیہ پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ اصول یاد رہیں تو جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں وہ خارج از امکان ہو جائیں۔

زبان سے میرا مطلب اتنا سا ہے کہ کسی خاص ملک کی وہ الگ الگ آوازیں جو مل ملاکر کسی ایک چیز کو بتاتی ہیں اور جنھیں اُس ملک کے رہنے والے آپس کے سمجھوتے کے سبب کہنے والے کے منہ سے نکلتے ہی جھٹ سے سمجھ لیتے ہیں۔

پہلے پہل جب کسی ملک میں کوئی زبان پیدا ہوتی ہے تو جو چیزیں وہاں کے بسنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں، وہ اُنھیں کے نام گھڑ لیتے ہیں۔ ان ناموں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دکھائی دینے والی چیزوں کے نام نہیں ہوتے بلکہ اُن باتوں کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں جو اُن پر بیتتی رہتی ہیں اور جنھیں آنکھ دیکھ، ناک سونگھ اور زبان چکھ نہیں سکتی، اور کان سُن اور ہاتھ چھو نہیں سکتے۔

مگر دنیا کی کوئی چیز سدا ایک سی نہیں رہتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدلتی رہتی ہے۔ کسی ملک کی ایک پشت نے کسی ایک چیز کو سمجھانے کے لئے جس طرح کی آوازیں اکٹھا بول کر سمجھایا تھا انھیں اُس کے پیچھے آنے والی پشتوں نے کچھ نہ کچھ ضرور بدل دیا۔ اس طرح یہ آوازیں بدلیں اور بدلتی رہیں۔ یہاں تک کہ دس بیس پشتوں میں ان ناموں کی ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ اگر پہلی پُشت اپنی قبروں سے اُٹھ کر دسویں یا بیسویں پُشت والوں میں آ بیٹھے تو ان کی بات تک نہ سمجھے اور اس کایا پلٹ کو دیکھکر بھوچکّا رہ جائے۔

پہلی پشت کے بعد کی پشتیں اتنے ہی پر بس کرتیں تو کوئی بات نہ تھی، وہ تو جیسے جیسے اُن کی عقل بڑھتی یا نئی چیزوں کی ضرورت پڑتی گئی، نئی چیزیں بناتی اور اُن کے نام رکھتی گئیں۔ اور اگر پہلی پشت نے پچاس نام بنائے اور رکھے تھے تو دسویں بیسویں تک ان ناموں کی گنتی ہزاروں تک پہنچ گئی۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ہر پشت نے جو نام گھڑے اُن پر وہی بیتی جو اُن سے پہلے کے ناموں

بیتی تھی۔ کہنا یہ ہے کہ وہ بھی گھستے گھساتے اور گول سڈول ہوتے رہے۔ جیسے کے تیسے وہ بھی نہ رہنے پائے۔ اور رہنے کیسے پاتے۔ کیا وہ باتیں کہیں چلی گئی تھیں جنھوں نے پہلے کے ناموں کو بگاڑا تھا، وہ تو وہاں کی وہیں تھیں، پھر ان ناموں پر بپتا کیوں نہ پڑتی۔

جب تک یہ حال رہا ہر نام کا رنگ ڈھنگ دیسی رہا، مگر دنیا ہر وقت آگے ہی بڑھتی رہتی ہے اس لئے کبھی بنج بیوہار کے سبب کبھی لوبھ لالچ میں پڑکر، لڑائی میں ہار جیت کے سبب دو ملکوں کے رہنے والے ایک جگہ اکٹھا ہو گئے، آپس کا میل جول رنگ لایا، بدیسیوں کے کچھ نام بیوپار نے اور کچھ میل جول نے دیسیوں کے ناموں میں ملا اور بڑھا دیے۔ دھیرے دھیرے بدیسیوں اور دیسیوں میں بہت پریم کی پینگیں یہاں تک بڑھیں کہ دونوں ایک ہو گئے، اور اپنے پرائے کا جھگڑا چُک گیا۔

دیسیوں نے جو نئے نام گھڑے اُن کے جوڑ جوڑ سے دیسی روپ جھلکتا تھا اور جھلک رہا تھا، کیونکہ وہ دیس سے بچ کر کہاں جاتے۔ دیسی اونچے سے اونچے اُڑ کر بھی دیس سے باہر نہ جا سکتے تھے، اس لئے وہ تو ہر طرح دیسی ہی رہے۔ وہ نہ بدیسی مسالے سے بنائے گئے تھے اور نہ اُن میں بدیسی بوباس تھی۔ جس دھرتی ماتا نے اُنھیں جنم دیا تھا اُسی کے گُن اُن میں تھے۔ پر بدیسی ناموں پر بپتا پڑی، کبھی تو دیسی اُنھیں ٹھیک ٹھیک بول نہ سکے اور کبھی کوئی سیدھا سیدھا نام بن بگاڑے بولنے بھی لگے تو جیسے دیسی کی صورت دھیرے دھیرے بدل گئی تھی اُن کی بھی بدلی۔ ایسا ہی سمجھو کہ جو ہندوستانی لندن میں رہ پڑے ہیں، وہ وہاں رہتے رہتے اب نہیں تو دو چار پُشتوں میں کالے سے گورے ہو ہی جائیں گے گورے چٹے نہ ہوئے تو وہ رنگ روپ جو آج ہے وہ تو باقی نہیں رہ سکتا ہے۔

جب یہ بات ہے تو بدیسی ناموں کا کس طرح بولنا ٹھیک ہوگا۔ اس کا جواب اُوپر دیا جا چکا ہے پر گتھم میں کہنا اچھا نہیں، کھلم کھلا یہ بات ہے کہ جب دیسیوں نے بدیسی ناموں کو لیا ہے اُس وقت اُنھوں نے انھیں کیوں کر بولا۔ اگر بدیسیوں کی طرح تو جب تک ان پر دیسی رنگ نہیں چڑھا اُن کو بدیسیوں کی طرح بولنا ہی ٹھیک ہوگا۔ لیکن جب ان پر دیسی رنگ چڑھ گیا تو پھر لکیر نہ پیٹنی چاہیئے وہ تو ہمارے ہو چکے ہمیں بدیسیوں کا منھ نہ تکنا چاہیئے۔ جو کچھ اپنوں نے کیا ہے اُسے آنکھوں سے لگانا اور سر پر رکھنا چاہیئے۔ اور اگر دیسی کسی نام کو بدیسیوں سے لیتے ہی بگاڑ کر بولنے لگے تو ہمیں کبھی بدیسیوں کو نہ پیٹنا چاہیئے۔ ہماری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ سیدھی سچی بات یہی ہے۔ ہندوستان کی زبانوں کو چھوڑ کر اور دیسوں کی زبانوں پر سوچ بچار کرنے سے ہم نے جو کچھ کہا ہے اُس میں کھوٹ

نہ دکھائی دے گی۔

آپ اس کو تو اب مان گئے ہوں گے کہ ایک ہی دیس کی زبان کال کے چکر میں پھنس کر اپنے لفظوں کی صورت بدل دیتی ہے، مگر ہمیں ڈر ہے کہ آپ کہیں اسے بے پر کی نہ سمجھیں اس لئے آج کل کی زبان کی اُتپت کے لئے "شبد ساگر" میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک یونہیں سا نقشہ بنا کر دکھایا جاتا ہے:۔

قدیم زبان (نامعلوم)
|
ویدک سنسکرت
|
دور اول کی پراکرت　　سنسکرت
|
پالی = قدیم ماگدھی یا ماگدھی نرکت
|
دور دوم کی پراکرت = شورسینی۔ مہاراشٹری۔ ماگدھی۔ اردھ ماگدھی
|
اپبھرنش
|
موجودہ زبانیں

اسے دیکھ کر آپ یہ اچھی طرح جان اور مان گئے ہونگے کہ ہماری ہندی، سنسکرت یا پراکرت سے کایا پلٹ کر بنی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ اسی دیس کی ایک پرانی زبان نے اس کو جنم دیا ہے، آپ اس کو زبان کا بننا سمجھیں یا بگڑنا، اس جھگڑے میں ہم کبھی نہیں پڑنے کے، پر یہ کہے بنا نہ رہیں گے کہ کال کے چکر میں پھنس کر سنسکرت یا پراکرت کا جس سے بھی ہندی نکلی ہو (کیونکہ ہم اس جھگڑے کو بھی پنڈتوں ہی کے لئے چھوڑتے ہیں کہ سنسکرت اور پراکرت میں پہلے کون تھا، اور سنسکرت سے پراکرت نکلی ہے یا پراکرت سے سنسکرت یا سنسکرت اور پراکرت کبھی الگ الگ تھیں) اس کا اب سنسکرت یا پراکرت کی طرف رُخ کرنا، اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ سنسکرت یا پراکرت کے لفظ چاہے بن کر چاہے بگڑ کر جیسے بھی آج دکھائی دیتے ہیں ویسے ہی ٹھیٹ ہندی کے لفظ ہیں، سنسکرت تک اُن کی اُتپت پہنچا کر ہندی لفظ کی جگہ سنسکرت کا لفظ بولنا یا لکھنا ٹھیک نہیں۔ یہ کرنا ہے تو پھر تھوڑے ہی سے لفظوں کے ساتھ ایسا کیوں کیا جائے، ہندی کے سبھی لفظوں کو اسی طرح کیوں نہ بدل دیا جائے، یا یوں کہئے کہ ہندی کی جگہ سنسکرت ہی کیوں نہ بولی اور لکھی جائے۔ یہ بھی کر لیا

لہ ادبی سنسکرت مدھیہ دیش میں پیدا ہوئی تھی اور ادبی شورسینی بھی وہیں کی بول چال سے پیدا ہوئی اس لئے ضروری تھا کہ اس پر سنسکرت کا بہت اثر پڑے۔ (شبد ساگر)

لہ ہماری آج کی ہندی اگر سنسکرت کہی جائے تو نامناسب نہیں (شبد ساگر)

تو کیا ہوگا، جیسے پہلے سنسکرت بدل کر ہندی ہوگئی تھی ویسے ہی پھر جی کر مر جائے گی اور کوئی اور زبان ہندی کی طرح جنم لے گی۔ کیونکہ کال کا چکر تو دنیا سے اُٹھ نہ جائے گا۔ جیسے اُس نے اگلے زمانے کی سنسکرت کو توڑ مروڑ کر آج کل کی ہندی بنا دیا ویسے ہی اگر سنسکرت پھر جی اُٹھی تو وہ اُسے ہزار دو ہزار برس میں پیس پاس کر رکھ دیگا۔ اور اس کی صورت پھر کچھ ویسی ہی ہو جائیگی جیسی کہ آجکل ہندی کی ہے۔ یہ کہنا کہ اردو والے بھی تو عربی فارسی کے لفظ اُنھیں زبانوں کے لغات سے ٹھیک کرتے ہیں کچھ ایسی ہی بات ہے، مارون گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ کیونکہ ہم اس کو مان چکے ہیں کہ ان زبانوں کے لفظوں کو ہم نے جس طرح لیا اور بولا اُن کا ویسے ہی بولنا ٹھیک ہے اور ہمیں اُنھیں اپنے لغات سے ٹھیک کرنا چاہیئے۔ دوسرے یہ بات ہے کہ یہ تو بدیسی شبد ہیں کسی دیسی بھاشا کا رُوپانتر کب ہوا تھا جو اُن کے دیسی ہونے کے سبب اُن کو اپنی اصل سے ملانے کا حق نہ رہے۔

لگے ہاتھوں ایک بات اور کہنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ لفظ پہلے پہل ایک آدمی بناتا ہے اور سماج کے سامنے اس لئے لاتا ہے کہ وہ اسے مان لے۔ اگر سماج نے اُسے مان لیا اور بولنے لگا تو جانو وہ جی گیا اور نہ مانا تو مر گیا۔ اس میں اُن تھوڑے سے آدمیوں کی کچھ نہیں چلتی جنھیں ادیب یا ساہتیا چار کہتے ہیں۔ یہ لوگ تو بس اتنا کرتے ہیں کہ بول چال کے جو لفظ اُنھیں پسند نہ آئے اُن کا لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا۔ کسی نئے لفظ کے لئے جب تک وہ زبان کی خراد پر نہ چڑھ لے یہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے اور نہ کسی کو اس کا حق ہے کہ لفظ بنتے ہی پکار اُٹھے کہ ادیب یا ساہتیا چار یہ اسے نہیں بولتے یا پسند نہیں کرتے یہ بات تو ناموں کی بات رہی، اب ہم زبان کے قاعدے قانون کا حال بھی کچھ لکھنا چاہتے ہیں کسی زبان کے قاعدے قانون کبھی اُس کے ناموں کی طرح نہیں گھڑے جاتے۔ وہ تو جس گھڑی سے کسی دیس کا ایک رہنے والا اُسی دیس کے دوسرے رہنے والے کو اپنے من کی بات سمجھانے کے لئے ناموں کو جس طرح بولتا اور آگے پیچھے رکھتا ہے اور دوسرے دیسی انھیں اسی طرح بولنے اور آگے پیچھے رکھنے لگتے ہیں اُسی گھڑی وہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ پہلے پہل تو کوئی ادھر دھیان نہیں دیتا پھر کبھی نہ کبھی کوئی دیسی بدیسی انھیں سوچ بچار کر لکھ ڈالتا ہے، اور یوں یہ قاعدے نکل آتے ہیں قانون بنانے والوں کی یہی ریت رسم ہے۔ ایک دن ایک وکیل صاحب کو ہم نے کہتے سنا تھا کہ ہر دیس کا قانون چار چیزوں سے بنا ہے جن میں سے ایک کو رسم و رواج کہتے ہیں۔ جب دیس کا راجہ اس رسم و رواج کو ٹھیک سمجھ کر اس پر اپنی چھاپ لگا دیتا ہے اور اُسے اس لئے لکھکر رکھ دیتا ہے

کہ جھگڑے ٹنٹے چکانے کے لئے لوگ اس کا سہارا لیں تو وہ قانون بن جاتا اور کہلاتا ہے. کہنا یہ ہے کہ زبان کے قواعد تو زبان کے ساتھ ہی ساتھ جنم لیتے ہیں پر اُنھیں پہچاننے اور ماننے میں دیر لگتی ہے.

اس طرح جو قانون بنتا ہے وہ دیسی اور اصلی ہوتا ہے، اور جب تک زبان میں بدیسی نام نہیں آتے اُس وقت تک دیس کی زبان سے جو قاعدے قانون لئے گئے ہیں، اُنھیں کو جانکر دیسی بدیسی جسے ضرورت ہو زبان ٹھیک ٹھیک بول اور لکھ سکتا ہے. مگر جب بدیسی نام زبان میں مل جاتے ہیں تو وہ چاہتے ہیں کہ انھیں بدیسی قاعدوں ہی کے ساتھ برتا جائے. اب یہ دیسیوں کی مرضی ہے کہ وہ اُن کی بات مانیں یا نہ مانیں. مان لیجئے کہ دیسیوں نے اُن کا کہنا مانا تو پھر اُنھیں دیسی ہی قاعدوں کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے اور جو دیسیوں نے اُن کے کہے پر کان دھرے تو پھر جیسے دیسی ناموں میں بدیسی نام آملے تھے ویسے ہی یہ بھی گھُل مل جاتے ہیں. دیسی قاعدوں کے گھُٹنے سے تھوڑے سے بدیسی قاعدے بھی گھُٹنا جوڑکر بیٹھ جاتے ہیں، اور اصلی قاعدوں کے ساتھ نقلی (ہم ان بدیسیوں کو نقلی کہیں گے اس لئے کہ وہ بدیسی ہیں) قاعدے بھی آملتے ہیں، اسے بھی آپ کوئی نئی بات نہ سمجھیں، دیس دیس کے قانون یونہیں بنتے ہیں. جب تک کسی دیس میں اُس کے رہنے والے بستے ہیں سارے قانون کی جڑ اُنھیں کے رسم ورواج ہوتے ہیں، مگر جب پردیسی آکر اُس دیس کی پرجا میں مل جاتے ہیں تو پھر قانون میں کچھ نہ کچھ اُن کی رعایت کرنی ہی پڑتی ہے.

رہی یہ بات کہ زبان کے قاعدے بدلتے ہیں یا نہیں، اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ ناموں کی کایا پلٹ ہوتی رہتی ہے، جیسے ناموں کی کایا پلٹ ہوتی ہے ویسے ہی زبان کے بولنے والے اُنھیں اپنی بات سمجھانے کو آگے پیچھے رکھنے کی ریت کو بھی بدل دیتے ہیں، اس لئے زبان کے قواعد بھی بدلتے ہیں کسی دیس کی زبان بولنی ہوگی تو اُس دیس کی زبان کے قواعد بھی سیکھنے ہی ہوں گے، اور وہ بدیسی قواعد بھی آنے ہی چاہیئے جن کو اُس نے اپنا لیا ہے. یہ ہم کیوں کریں کہ تھوڑے سے بدیسیوں کے لئے اُن کی سب باتیں سیکھیں. اور زبانوں کے لئے تو ہم کچھ نہ کہیں گے پر اُردو کے قواعد کی کتابوں کا حال ہم جانتے ہیں. پلاٹس صاحب نے جو قواعد اُردو انگریزی میں لکھی ہے اُس میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، ان کی کتاب کا نام ہے A Grammar of the Hindustani or Urdu Language.

آپ چاہیں تو دیکھ لیں اور بیچ سے بچ کر آپ ہی یہ بھی فیصلہ کرلیں کہ یہ اس زبان کو کتنا ٹھیک ٹھیک لکھنا اور بولنا سکھاتی ہے.

دہلی اور لکھنؤ والوں میں چوٹیں چلتی ہی رہتی ہیں۔ کوئی تیس چالیس برس ہوئے جب لاہور کا اخبار وطن زوروں پر تھا، اُس وقت بھی کسی وجہ سے آپس میں چشمک ہو گئی تھی، دلی کے ایک حامی نے ایک شعر لکھا تھا:۔

سکھائی گرچہ دلی نے زباں احسان پورب کو تفاوت ہے مگر اہل زباں میں اور زباں داں میں

ہم نے اس شعر کو محض اس واسطے لکھا ہے کہ ناظرین کی توجہ جناب احسان صاحب کی تقسیم کی طرف منعطف کر کے یہ بتائیں کہ کسی زبان کے بولنے والوں میں دو گروہ ہوتے ہیں۔ ان دونوں لفظوں کی تعریف کی ضرورت نہیں، جو اردو کی تاریخ سے واقف ہیں وہ خود بخود سمجھ لیں گے کہ دونوں کے مدلول میں کیا فرق ہے۔ اہل زبان ہوں یا زبان داں اگر وہ اپنی مادری زبان کما حقہ جانتے ہیں اور اُن کے اظہار خیالات بلند کا وہ سچا اور صحیح آلہ ہے تو اپنے ملک کے لٹریچر میں اُن کا رتبہ مسلم ہے اگر وہ بدیسی زبانیں نہیں جانتے تو پروا نہیں۔ ملٹن اور شیکسپیر اگر آج زندہ ہیں اور آیندہ زندہ ہیں گے تو لاطینی علم و فضل کی بدولت نہیں، بلکہ مادری زبان پر کامل قدرت رکھنے کے صدقہ میں۔

محسوسات ماہر

(از حضرت ماہر القادری)

اُن شوخ نگاہوں کے پرستار ہمیں تھے سر تا بہ قدم حسرت دیدار ہمیں تھے
تیرے لئے ہر لطف سے بیزار ہمیں تھے سوئی ہوئی مخلوق تھی بیدار ہمیں تھے
شایان مقام رسن و دار ہمیں تھے معراج محبت کے طلبگار ہمیں تھے
اُس نرگس بیمار کے بیمار ہمیں تھے میخانۂ فردوس کے میخوار ہمیں تھے
ہم پر ہی رہی حسن کی ہر گرم نگاہی کیا جرم محبت کے گنہگار ہمیں تھے
جب حسن و محبت کے تعلق پہ نظر کی محسوس ہوا پردۂ اسرار ہمیں تھے
جس بار امانت کو اُٹھایا نہ کسی نے اُس بار امانت کے خریدار ہمیں تھے
ڈھونڈا تو وہ کچھ دُور نہ تھے حد طلب سے دیکھا تو سر رہگذر یار ہمیں تھے
فریاد ہے اے خالق تقدیر دو عالم کیا تہمت ہستی کے سزاوار ہمیں تھے

ماہر ستم دہر کی رُوداد نہ پوچھو
ہر چیز تھی معصوم گنہگار ہمیں تھے

"خواب آور غزل خوانی"

(پنڈت آنند نراین مُلّا ایم۔ اے، ایل ایل بی)

جھجک اظہارِ ارماں کی بہ آسانی نہیں جاتی
خود اپنے شوق کی دل سے پشیمانی نہیں جاتی

تڑپ شیشہ کے ٹکڑے بھی اُڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

اُفق پر نُور رہ جاتا ہے سورج ڈوبنے پر بھی
کہ دل بجھکر بھی نظروں کی درخشانی نہیں جاتی

سوئے دل آکے وہ چشمِ کرم بھی کیا بنائے گی
شعاعِ مہر سے صحرا کی ویرانی نہیں جاتی

کسی کے لطفِ بے پایاں نے کچھ یوں سوئے دل دیکھا
کہ اب ناکردہ جرموں کی پشیمانی نہیں جاتی

یہ بزمِ دیر و کعبہ ہے نہیں کچھ صحنِ میخانہ
ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی

نظر جس کی طرف کرکے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اس دل کی پریشانی نہیں جاتی

نظر جھوٹی، شباب اندھا، وہ حُسنِ نقشِ فانی ہے
حقیقت ہے تو ہو لیکن ابھی مانی نہیں جاتی

نہ پوچھو تجرباتِ زندگانی چوٹ لگتی ہے
نظر اب دوست اور دشمن کی پہچانی نہیں جاتی

نہ سمجھو ضبطِ گریہ سے خطا پر ہیں نہیں نادم
کہ آنسو پونچھ لینے سے پشیمانی نہیں جاتی

صدائے جنگ ہر جانب سے آتی ہے مگر مُلّا
تری اب تک وہ خواب آور غزل خوانی نہیں جاتی

"توہینِ دوستی"

سمجھ رہا ہوں میں خوب اسکو بھلا کہاں تو کہاں میں مفلس
مجھے کچھ اسکا گلہ نہیں ہے کہ فرق یہ تو نصیب کا ہے

زباں سے مُلّا کو دوست کہکر مگر نہ توہینِ دوستی کر
ذرا خیالوں کا جائزہ لے کہیں گزر بھی غریب کا ہے

نہیں وہ تیرے کرم کے شایاں تو کیوں اسے دے حسین دھوکے
کہ وہ سمجھ بوجھ کر ہے ناداں، ہنوز امکاں فریب کا ہے

(بسمل)

الہام پارے

(از حضرت سیماب اکبرآبادی)

بلند اپنا عزم کلیسانہ کردے — وہ پھر چھپ گئے ہیں پھر افسانہ کردے
عطا سوزِ دل بے حجابانہ کردے — حریفِ روایاتِ پروانہ کردے
بہارِ تبسّم، وقارِ تکلم — جسے چاہے، جب چاہے دیوانہ کردے
مری تشنہ کامی بے انتہا کا — کوئی ہے جو محدود پیمانہ کردے؟
اگر بت شکن ہے، اگر خود شکن ہے — تو مسمارِ دل کا خود ہی خانہ کردے
جبیں کو بنا خوگرِ سجدہ لیکن — قیودِ تعیّن سے بیگانہ کردے
ہے لعنت وہ دستورِ سرمایہ داری — جو ذہنیتوں کو غلامانہ کردے
تخیّل جو ویرانیوں پر ہو مائل — تو ذرّوں کو بکھرا کے ویرانہ کردے
تصوّر جو رنگینیوں کا ہو حامل — تو پھولوں کو پھیلا کے گل خانہ کردے

وہی اصل میں ترک ہے ماسوا کا — جو بیگانگی سے بھی بیگانہ کردے
بناتا ہے اِک دل، تپش آزمودہ — فراہم کوئی خاک پروانہ کردے
بہار آئے اب کے جنوں خیز ایسی — جو دیوانہ سازوں کو دیوانہ کردے
مرے دل کے تقدیسہ ٹکڑوں کو یارب — چراغ گذرگاہِ بُت خانہ کردے
گوارا نہ کر حبس رازِ محبت — چھپانا ہے مشکل تو افسانہ کردے
ہے مختارِ کل میری خانہ خرابی — جہاں چاہے تعمیر کاشانہ کردے
وہ کرتے ہیں پرسش کچھ ایسی نظر سے — جو دیوانے کو اور دیوانہ کردے

کرے کیا جو سیماب دل کو نہ اپنے
نثارِ اداہائے ترکانہ کردے

سنسکرت ادب اور ہندی فن تصویر

(از مسٹر جگیسور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے، ایل ایل، بی)

سنسکرت ادب کی پرانی تصانیف میں ایسے بہت سے حوالے ملتے ہیں جن سے ہندی فن تصویر کی قدامت کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بھاس سنسکرت کا وہ پہلا ناٹک نویس ہے جس کی تصنیفات دستبرد زمانہ سے ہنوز محفوظ ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے سُوپن واسودتا میں کئی بار ولس راج اودین اور واسودتا کی تصویروں کا ذکر آیا ہے۔ بھاس کے بہت دنوں بعد کالیداس کے ناٹکوں کا آفتاب شہرت طلوع ہوا۔ لیکن اس درمیانی زمانہ کی کیفیت ابھی تک پردۂ خفا میں چھپی ہوئی ہے۔ مگر کالیداس کے کئی ناٹکوں میں بھی مصوری کا تذکرہ موجود ہے۔

وکرم اُروشی (विक्रमोर्वशीय) نامی ناٹک میں جب پُرودا (पुरुरवा) اُروشی کے غم فراق سے مضطرب ہو کر دل بہلانے کی تدبیر دریافت کرتا ہے تو ودوشک یہ دو صورتیں بیان کرتا ہے:

"स्वप्न समागमकारिणीं निद्रां सेवतां भवान् अथवा तत्र भवत्या उर्वश्याः प्रतिकृतिं चित्रफलके ऽभिलिख्य आलोकयन्नात्मानं विनोदयतु।"

یعنی "یا تو خواب میں اُروشی سے ملیئے یا لوح پر اُس کی تصویر اتار کر دلِ بیتاب کی تسکین کا سامان فراہم کیجئے۔"

کالیداس کے دوسرے ناٹک مالوکا گنی متر کی شروعات ہی ایک تصویر سے ہوتی ہے اگنی متر تصویروں کے مرقع میں مالوکا کی شبیہ جمیل دیکھتے ہی دل دے بیٹھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناٹک میں دو اور تصویروں کا بھی ذکر ہے۔ شکنتلا میں بھی ہم مہجور جمال دشینت کو شکنتلا کی تصویر بناتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ تصویر تو اس درجہ جامع اور مکمل بتائی جاتی ہے کہ پیکرِ تصویر کے پھول سے رخسار پر بھونرا مستانہ وار منڈلاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ساتویں صدی کی مشہور منظوم تصنیف کادمبری مصنفہ بان بھٹ سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس زمانہ کے شہزادوں کو علم سیاست اور فنونِ جنگ کی تربیت کے ساتھ ساتھ

تصویر کشی کی بھی مشق کرائی جاتی تھی۔ اور یہ تلوار کے دھنی بڑے چابکدست مصور ہوتے تھے۔ امن وچین کے دنوں میں شہزادے اس دلچسپ مشغلہ سے اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ ان دنوں اس فنِ لطیف کی قدردانی کا یہ عالم تھا کہ اس زمانہ کی شہزادیاں اور دیگر مستورات اس فن میں مہارت تامہ رکھتی تھیں۔

بانَ بھٹ کے قول کے مطابق ویشمپاین اپنے زمانہ کے سب سے بڑے ماہرِ فن تھے۔ ایک مقام پر شاعر نے چندراپیڑا (चन्द्रापीड) کے بارے میں لکھا ہے کہ चित्रकर्मणि परम कौशलमवाप) وہ تصویر بنانے میں بہت ہوشیار ہوگیا ہے۔

اُتر رام چرت (उत्तररामचरित) نامی بھوبھوتی کے بہترین ناٹک میں بیس بائیس تصویروں کا حوالہ موجود ہے۔ لکشمن جی رام اور سیتا کو مختلف تصویریں دکھاتے ہوئے جب پرشرام کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو سیتا جی کے منہ سے بیساختہ یہی نکلتا ہے کہ " कम्पिता स्मि " (میں تو کانپ گئی) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پرشرام کی تصویر بلاشبہ اُن کے ڈیل ڈول کے مطابق بھیانک بنی ہوگی۔ اور اُسے دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں میں وہ سماں پھر گیا ہوگا جب رامچندر کے شِو دھنش توڑ ڈالنے پر غم و غصہ سے بدحواس پرشرام نے راجہ جنک کی سبھا میں قدم رکھا تھا۔

شورپ نکھا (शूर्पणखा) کی تصویر دیکھکر بھی سیتا جی پر بعینہٖ یہی کیفیت طاری ہوگئی تھی اِس ناٹک میں بھوبھوتی نے مناظر قدرت کی حسین تصویروں کا نہایت دلکش انداز میں چربہ اُتارا ہے ایک تصویر کو سامنے رکھکر بھوبھوتی لکھتا ہے کہ:۔

"حسنِ فطرت کا کتنا حسین نظارہ ہے بَنَّوبن کے سامنے ایک طرف کوہساروں کی آغوش میں مچلتا ہوا جھرنا بہہ رہا ہے۔ کناروں پر ہرے ہرے پیڑوں کے جھُنڈ لہرا رہے ہیں، بان پرستھیوں کے دم سے آشرم کی پُرسکون فضائیں جھلملانے لگی ہیں۔"

ایک دوسری تصویر کو لفظی جامہ پہناتے میں بھی شاعر بے مثال نے کمال کر دیا ہے۔ یہ پرسن ونٹر[1] پربت (प्रस्रवण पर्वत) تکلف و تصنع سے عاری حسنِ ذاتی کی روشن تصویر ہے۔ مصوّر نے ایک شَیل[2] بنایا ہے، پہاڑ کی گپھا بھی نمایاں ہے۔ اس کے قریب ہی گوداوری ندی پیڑوں کے جھُرمٹ سے نکل کر موجیں مار رہی ہے۔ گھنے درختوں سے چھایا ہوا کہسار نیلا نیلا دکھائی دیتا ہے۔ پہاڑ پر بادل بکھرے ہوئے ہیں اس لئے اس کا رنگ بھی آسمانی سا ہوگیا ہے۔

مُدرا راکشس نامی ناٹک میں بھی تصویروں کا ذکر موجود ہے۔ ایک موقع پر غور و فکر کے سمندر میں ڈوبا ہوا

لہ ایک پہاڑ کا نام ٹہ یعنی پہاڑ

راکشس کہتا ہے کہ جس طرح لٹکانے کے لئے دیوار نہ ہونے سے بہترین تصویر بھی بیکار ہوتی ہے اسی طرح میری انتہائی کوشش بھی سہارے کے بغیر لاحاصل ہے۔

اس سے ثابت ہے کہ "راکشس" کے عہدِ تصنیف میں تصویروں کا رواج عام ہو چکا تھا، اور تصویر بنانے کے لئے کاغذ وغیرہ کا بھی استعمال ہونے لگا تھا۔

اُوپر جن ناٹکوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سب کے سب قدیم ہندُستانی اسٹیج کے لئے لکھے گئے تھے اور ایسے تاریخی ثبوت بھی بکثرت موجود ہیں جو ان کی عام نمایش پر دلالت کرتے ہیں۔ پس سنسکرت ناٹکوں کے بنیادی اُصولوں کے پیش نظر بلاخوفِ تردید یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ان ناٹکوں میں جن تصاویر کا ذکر ہے وہ برابر اسٹیج پر لائی جاتی تھیں اور ناٹک کے پہلو بہ پہلو ان کی بھی نمود و نمایش کا اہتمام ہوتا تھا۔ جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ بھاس سے لیکر سنسکرت ادب کے دور المتاخرین تک اعلیٰ پایہ کی مصوری کا فقدان نہ تھا۔

غالباً یہیں سے سنسکرت علم و ادب کی طرح فنِ تصویر کے زمانۂ ادبار و انحطاط کا بھی آغاز ہوتا ہے پھر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس فنِ لطیف کو زندہ رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ کوششیں ضرور ہوتی رہی ہونگی۔

رنگ و نغمہ

(از سیدہ سردار بیگم اختر حیدرآبادی)

عالمِ رنگ و نغمہ میں کیف بہت سہی مگر　　بیخودِ سیرِ کائنات! اپنی طرف بھی اک نظر
اُن کی بھی آنکھ ہوگئی جوشِ الم سے آج تر　　مَیں نے اُٹھائی کیوں نگاہ عالمِ درد میں اُدھر
شکلِ حسیں دکھائے جا، پردۂ درمیاں اُٹھا　　شوق مرا ہے پارسا، عشق مرا ہے معتبر
یوں نہ پہونچ سکے گا تو اُس کی حریمِ ناز میں　　عشق کی تیغ تیز نے، عقل سے پہلے جنگ کر
تیرے تیز شوق کو ایک زمانہ چاہیئے!　　تیرا الہوا بھی ہے سرد، میری نوا ہے گرم تر
آہ شرابِ شوق کا کیف بہت عجیب ہے　　وہ ہیں کہ مجھ سے بے نیاز، اور میں اُن سے بیخبر

تیری نوا نے کر دیا، سینۂ گل کو چاک چاک
اختر خوشنوا خموش! اختر خوشنوا ٹھہر!!

شامِ شب افروز

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی اے ایل ایل بی)

ہونے لگے رہ رہ کے سرِ عرش اُتارے روئے گلِ خورشید پہ صدقے گئے تارے
باہم گل و بلبل میں ہوئے طُرفہ اشارے سمٹے ہوئے غنچے نہ کھِلے شرم کے مارے
اُڑنے لگے شبنم کے جھلکتے ہوئے موتی
سبزے پہ تھے قطرے کے ڈھلکتے ہوئے موتی

لاتی تھی جوئے شیر مسی اپنی دھڑی سے رِلتی تھی گلے صبح قیامت کی گھڑی سے
شعلوں کی سی بارش جو تھی پانی کی جھڑی سے گل آگ کے جھڑنے لگے پھولوں کی چھڑی سے
تھا خاک کا انبار سرِ دامنِ ہستی
دم بھر میں ہوا نذرِ خزاں گلشنِ ہستی

آمادہ بہ شوخی جو ہوا باغ میں آئی مُنھ چوم لیا گُل کا جہاں آنکھ مِلائی
کھول اُٹھے حباب آگ جو پانی میں لگائی دی قطرۂ ناچیز کو دریا نے دُہائی
لَو دیتے تھے گل اوس سی سبزہ پہ پڑی تھی
جُھلسا ہوا منکا تھا جو موتی کی لڑی تھی

تپتی ہوئی کرنیں تھیں کہ جلتے ہوئے بھالے کالے کی طرح لیتی تھی ہر موج سنبھالے
گرداب کے حلقے تھے کہ خورشید کے ہالے پڑ جاتے تھے امواج کے ہر گام پہ چھالے
شبنم کے لباسوں میں حسیں کانپ رہے تھے
دریا میں سمندر بھی پڑے ہانپ رہے تھے

پھر مشعلِ خورشیدِ فلک گل ہوئی بارے پیشِ نگہِ شوق ہیں دلچسپ نظارے
سرچشمۂ مہتاب میں غلطاں ہیں ستارے پرواز میں جگنو ہیں کہ پرّاں ہیں غبارے
ہر موجِ رواں بادہ بلب بط بکنارے
ایں شامِ شب افروز بہ از صبحِ بہارے

دو بچے

ایک قصہ

(از سید علی عباس حسینی ایم۔اے)

نواب صاحب پوتڑوں کے رئیس تھے، باپ دادا لاکھوں کے جاگیردار رہ چکے تھے، وہ بات تو اب نہ تھی مگر مٹنے مٹانے پر بھی بہت کچھ تھا۔ اس لئے رکھ رکھاؤ آن بان وہی تھی، نوکر۔ چاکر۔ ماما دائیاں، خواصیں، مہریاں، سب ہی تھیں۔ محل بھی ایک نہیں کئی تھے۔ لیکن بچہ صرف ایک ہی تھا، دو برس کی جان، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔ بڑے اللہ آمین سے پالا جا رہا تھا۔ جہاں بیگم صاحبہ کی گود سے اترا اناؤں، دائیوں، کھلائیوں کے "حصار" میں گھر گیا۔ ہر وقت یہی خیال کہ کمرے سے باہر نکلتے وقت گرمیوں میں تیز دھوپ سے سنولا نہ جائے۔ اور جاڑوں میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا "نزلے کی تحریک" نہ پیدا کردے۔ اناؤں اور کھلائیوں پر بھی تاکید تھی کہ ہر وقت صاف ستھری رہیں، ایسا نہ ہو کہ بچے کے مزاج میں گندگی کے برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔ ہر وقت یہ قدغن کہ مٹی دھول میں کھیلنے نہ پائے، اگر ننھے ننھے صندل کے پاؤں سے چلایا بھی جائے تو وہ بھی اندر کمرے کے قالین پر یا مسہری کے مخملی گدّوں پر!

بچہ خوش قسمت تھا کہ وہ ان بندشوں پر بھی لُدپُد لُدپُد چلنے بھی لگا، اور تتلا کے چھوٹے چھوٹے فقرے بولنے بھی لگا۔ اس کی بھولی بھولی صورت اور اس کا یہ تتلانا اتنا پیارا معلوم ہوتا کہ ہر وقت بیگم صاحبہ اور نواب صاحب کو "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، خدا نظر بد سے بچائے" کہنا پڑتا۔ نہ جانے کتنی دفعہ "ناد علی" "حرز ین" "جوشنین" اور نہ جانے کون کون سی دعائیں پڑھ کر دم کی جاتیں۔ اور نئے نئے تعویذ اور نقوش ملّاؤں اور سیانوں کے پاس سے منگوا کر پہنانا پڑتے تھے۔

ایسے موقعوں پر نواب اور بیگم ایک دوسرے کو دیکھکر بڑی محبت سے کہتے تھے۔

"ماشاء اللہ بڑا ذہین ہوگا!"

"اللہ اس پر حضرت عباس کے علم کا سایہ رکھے۔ یہ جوان ہو کر تجارت ۔۔ بڑھائیگا"

اور نواب صاحب اپنے قیامت ڈھانے والے واقعات مسکرا مسکرا کر یاد کرنے لگتے تھے!

غرض ننھے نواب پر ماں باپ جان چھڑکتے اور ہر وقت اس بچے کی صفائی، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، ہر امر کا خاص اہتمام رکھتے تھے ــــــــــ

کہ ایک دن محل میں بجائے بڑھی مہترانی کے اس کی پوتی آئی! یہی کوئی چھ سات برس کے سن کی، میلے کپڑے پہنے، ایک چھوٹی سی کوڑا اٹھانے کی بالٹی لئے ہوئے۔ دادی بیمار پڑ گئی تھی اس لئے ساٹھ برس کی بڑھی کے کام کی ذمہ داری اس ننھی سی جان پر آپڑی تھی۔ ڈرتی، سہمتی جھجکتی، گھبراتی آئی۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے فرائض ادا کرنے میں منہمک ہو گئی۔

ننھے نواب نے آج پہلی دفعہ اپنے سن سے نسبتہً قریب تر عمر کی ایک لڑکی دیکھی، اناّ کی گود سے اتر کر فرش کے کنارے تک لدپھد کرتے آئے۔ دونوں بچوں نے ایک دوسرے پر سر سے پاؤں تک نظریں ڈالیں۔ چھوٹی مترانی کی آنکھوں سے اِس صاف ستھرے بچے کو گود میں اٹھالینے اور پھول سا منہ چوم لینے کی بے چین خواہش ظاہر تھی۔ ننھے نواب کے ہاں تعجب تھا، اتنے چھوٹے سے بھی لوگ ہوتے ہیں، جن کے بال انھیں کی طرح سیاہ، جن کے ہاتھ پاؤں انھیں کی طرح چھوٹے چھوٹے۔ مگر جو بالٹی سے کھیل سکتے ہیں۔ گھر کی سب سے زیادہ دلچسپ چیز کوڑا، جس میں تنکے بھی ہیں، کاغذ بھی اور رسیوں کے ٹکڑے بھی، یوں سمیٹ کر لے جا سکتے ہیں! دوستی کرنے کے لئے مسکرائے۔ انا نے جو یہ تیور دیکھے ڈانٹا "نواب اُدھر کہاں جا رہے ہو، مہترانی ہے، گندی! چھی، چھی، چھی!"

ننھے نواب نے کچھ جواب نہ دیا، وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور چھوٹی مہترانی کو بغور دیکھتے رہے جب وہ کوڑا لے کر باہر چلی گئی تو انا سے پلٹ کر بولے "مہہ تلانی، تلی گئی!"

وہ بولی "ہاں، نواب وہ موئی دفان ہوئی! لو تم اپنے کھلونے کھیلو، اس گندی چھوکری کی فکر نہ کرو!"

دوسرے دن ننھے نواب کمرے کے فرش پر اپنی گڑیا سے دوسری دایہ کی نگرانی میں منہمک تھے کہ پھر چھوٹی مہترانی آئی، ان کا گلاب سا چہرا خوشی سے بالکل بیر بہوٹی کے رنگ کا ہو گیا۔ وہ ایک مرتبہ ننھے ننھے ہاتھوں سے تالی بجا کر بولے "مہہ تلانی، میلی (میری) مہہ تلانی آگئی!"

پھر بیگم صاحبہ کے پاس دوڑ کر خوش خبری سنائی "امی! امی۔ مہہ تلانی آگئی!"

انھوں نے اس گلنار چہرے کو چوم کر کہا "امی تیرے صدقے! لیکن بیٹے مہترانی کے آنے پر

نی کیوں خوشی ہے؟ وہ تو گندی، میلی، کالی اور خراب ہے!........"

بچے نے گھبرا کر کہا "کھر آپ، نہیں بیلی۔ مہ تلائی —— اٹی! —— بہت اتھی!"

وہ بولیں "وہ موئی کیا اچھی ہوگی! وہ البتہ اچھی ہوگی جسے میں بہو بنا کر لاؤں گی!

چاند سی ہوگی، چاند سی!"

ننھے نے کہا "تاند سی؟ تندا ماموں سی!"

وہ کلیجے سے چمٹا کر بولیں "چندا ماموں سے بھی کہیں زیادہ اچھی!"

تیسرے دن ننھے نواب نے قیامت ڈھا دی!

چھوٹی مہترانی آئی، اُس نے کمرے کے سامنے جھاڑو دی، حسرت بھری نگاہوں سے اس پھول کو دیکھا جس کی وجہ سے کمرہ گلدان بنا ہوا تھا اور چھوٹی بالٹی میں جھک کر کوڑا رکھنے لگی۔ ننھے نواب پہلے تو اس کی حرکتیں تعجب سے دیکھتے رہے، پھر ایک بار لُدبُھد دوڑے اور اُنھوں نے اپنی دونوں باہیں مہترانی کی گردن میں ڈال دیں! —— بس گھر بھر میں زلزلہ آگیا۔

انائیں، دائیاں، مہریاں، خواصیں، مامائیں، سب ایک ساتھ دوڑیں۔ خود بیگم صاحبہ مسہری سے اُتر کر ننھے کی طرف لپکیں۔ نواب صاحب نے پیچوان ہاتھ سے پھینکی اور "ارے ارے! توبہ! توبہ!" کہتے ہوئے اسی طرف چلے۔

بیچاری چھوٹی مہترانی عجیب مخمصے میں پھنس گئی۔ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی کہ کہیں ننھے نواب گر نہ پڑیں۔ ہاتھ سے چھو نہیں سکتی، اس لئے کہ بچہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے 'اچھوت' ہونے سے واقف تھی۔ غرض وہ بالکل بُت بنی بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ بڑی انا نے بڑھ کر ننھے کے ہاتھ اس کے گلے سے الگ کئے اور اسے گود میں لیتے ہی مہترانی کو ایک لات جمائی۔

"مالزادی، نواب کو سر سے پاؤں تک نجس کر دیا!"

دوسری ماما دائیوں نے بھی گالیوں کی ایک باڑھ ماری اور جوتیوں سے تواضع کی، بیگم صاحبہ کی طرف سے بھی خطابوں کی بارش ہوئی۔ اور چھوٹی مہترانی روتی، بسورتی، بلکتی سسکتی بالٹی سمیت باہر بھاگ گئی۔

بیگم صاحبہ بولیں "اس قطامہ سے کہہ دو کہ اگر آج سے محل میں قدم رکھا تو کتوں سے بوٹیاں نچوا دوں گی! کمینی!"

نواب صاحب بولے "ارے بھئی، ننھے کے سارے کپڑے اتار کر پھینک دو اور اسے خوب نہلا کر دوسرے کپڑے پہناؤ۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "اور دیکھو بینڈے میں ملنے کے لئے صابون کی ایک نئی ٹکی اور آدھ پاؤ بیسن نکال لو!"

بوڑھی انّا نے کہا "سرکار قربان جاؤں! تھوڑا ماش اور کڑوا تیل بھی صدقے کے لئے ایک ٹوکری میں نہ رکھ لاؤں؟"

بیگم نے کہا "ہاں ہاں! ضرور، اور اسی ٹوکری میں ایک نیا روپیہ اور چاندی کی چوٹی بھی رکھ دینا بلا گلے ہی سے چمٹ گئی تھی! خدا نے بڑا فضل کیا جو میر العل بال بال بچ گیا!"

ننھے نواب یہ سارا ہنگامہ ایک فلسفی کی متانت سے دیکھا کئے، پھر انھوں نے اپنے باپ کی طرف پلٹ کر اپنے نزدیک سب سے اہم خبر سنائی:۔

"میلی مہ تلانی بھاگ گئی!"

انکشاف

(از مسٹر ڈی۔ پی۔ بھٹناگر کشتہ)

فروغِ صبح ہوں میں، تیرگیِ شام ہوں میں
ہے سب سفید و سیہ جس سے وہ نظام ہوں میں

جوابِ پا کے مخاطب سے، شاد کام ہوں میں
کلیم طور نہیں، خود سے ہم کلام ہوں میں

نفس نفس سے مرے مدعا ٹپکتا ہے
دیا ہے جو مری ہستی نے وہ پیام ہوں میں

مرے وجود سے بزم دوام روشن ہے
جو تا سحر نہ بجھے وہ چراغ شام ہوں میں

کدھر خیال ہے، کچھ ہے خیال میرا بھی
ذرا سنو تو سہی، تم سے ہم کلام ہوں میں

مرے خمار کی عظمت سپردِ خاک ہوئی
جو گر کے اٹھنے نہ پائے وہ دُرد جام ہوں میں

ازل ابد ہیں ورق دو مرے فسانے کے
کوئی سُنے تو بھے قصۂ دوام ہوں میں

مری نگاہ بھی مجھ پر کبھی نہیں اٹھتی
مرا وجود ہی کیا ہے، برائے نام ہوں میں

بنا چمن میں کبھی آشیاں کی رکھی تھی
اِسی خطا پہ بس اب تک اسیرِ دام ہوں میں

ہے فرطِ شوق میں یہ امتیاز بھی مشکل
پیامبر ہوں ترا، یا ترا پیام ہوں میں

سخن شناس مری قدر کیا کریں کشتہ
ادیب ہوں نہ کوئی صاحبِ کلام ہوں میں

اے بادِ بہاری

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔اے، ایل ایل۔ بی)

دیکھی نہیں جاتی ترے گلزار کی خواری مرجھائے ہوئے نخل ہیں اُجڑی ہوئی کیاری
دل توڑ نہ دے بلبلِ مایوس کی زاری اس باغ میں کب آئیگی پھر تیری سواری

اے بادِ بہاری!

اغیار کے گلشن سے محبت ہے تجھے کیوں؟ کانٹوں میں اُلجھ رہنے کی عادت ہے تجھے کیوں؟
کیوں اپنے ندیموں سے یہ وحشت ہے تجھے کیوں؟ پھولوں سے خدارا یہ عداوت ہے تجھے کیوں؟

اے بادِ بہاری!

کچھ یاد تو آتا ہے، کبھی تیرے کرم سے واقف بھی نہ تھے ہم خلشِ بیم و اَلم سے
تھی کونسی برکت جو نہ تھی تیرے قدم سے کترا کے خزاں دُور نکل جاتی تھی، ہم سے

اے بادِ بہاری!

کیا خوب وہ دن تھے کہ ترا ہم پہ کرم تھا اُجڑا ہوا اپنا یہ چمن رشکِ اِرم تھا
شمشیر و عَلم بس میں تھے قابو میں قلم تھا تب ہم میں بھی اِک آن تھی تب ہم میں بھی دم تھا

اے بادِ بہاری!

کیا بات ہے کشمیر سے تا راس کماری گلزار پہ غم ایک زمانے سے ہے طاری
رُخسار پہ پھولوں کے نہیں رنگ کی دھاری کیا یاد بھی آتی نہیں اب تجھکو ہماری؟

اے بادِ بہاری!

قطعات

یونہی آساں کٹ نہیں سکتی زندگانی کا سلسلہ ہے دراز
جس کو کہتے ہیں لوگ شادی و غم ہیں اسی راہ کے نشیب و فراز

پیکرِ انساں کی ہر بلندی دیکھ کہیں رُکتی نہیں بشر کی نگاہ
آسماں پر یہ کہکشاں کا نشاں ہے اسی کارواں کی گردِ راہ

(ایشیا) محترمہ سلمیٰ لاہور

سر شاہ محمد سلیمان مرحوم

(از حضرت نظام الدین حسین نظامی بدایونی، ایڈیٹر ذو القرنین)

کچھ غرض ہاں عشق والفت سے نہیں   موت کو بس اک بہانہ چاہیئے
زندگانی ہے فقط نقش بر آب   اتنی سی مدت میں کیا کیا چاہیئے

یہ دو شعر شاہ مرحوم کے والد ماجد حضرت فدائی مرحوم کے دیوان سے لئے گئے ہیں۔ جن کو سر شاہ مرحوم اکثر مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ دوسرے شعر کے اخیر مصرع کو اُن کی زبان سے سُن کر غالباً ۱۹۲۹ء میں میں نے اُن سے کہا تھا کہ ابھی تو آپ کو بہت کچھ کام کرنا ہیں، اگر آپ کو اپنے لئے نہیں تو ہمیں آپ کی ذات سے بہت کچھ چاہیئے۔ زندگی ضرور فانی ہے اور شاعر نے اس کو صحیح طور پہ نقش بر آب لکھا ہے لیکن مولانا حالی صاحب کی یہ رُباعی بھی آپ نے سنی ہے:-

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو   ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا   ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

یہ سُن کر فرمانے لگے کہ یہ بھی سچ ہے اور وہ بھی سچ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان مرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ابھی تو ہمیں آپ سے بہت کام لینا ہے اور آپ عرصہ تک زندہ رہیں گے۔ جب ملازمت کی حالت میں آپ نے قومی خدمت انجام دینے کی ہمت کی ہے، تو جب آپ ملازمت سے سُبکدوش ہو کر ریٹائر ہونگے تو خدا جانے آپ کی ذات سے ملک و قوم کو کیا کیا فائدے پہونچیں گے۔

کسے خبر تھی کہ سر شاہ مرحوم ریٹائر ہونے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں گے، اور ہماری آئندہ توقعات جو ان کی ذات سے وابستہ تھیں پُوری نہ ہونگی۔ ابھی اُن کی عمر پچپن ۵۵ سال سے زیادہ نہ ہوئی تھی کہ وہ ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔

سر شاہ مرحوم کی ابتدائی تعلیم جونپور میں ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی۔ اے پاس کیا اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ سرکاری وظیفہ سے ولایت بھیجے گئے۔ ۱۹۱۰ء میں بیرسٹری پاس کی ۱۹۱۱ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی، کچھ دنوں تک جونپور میں اور پھر ۱۹۱۳ء میں الہ آباد ہائیکورٹ

میں کام شروع کیا، بیرسٹری خوب چلی، اور کیوں نہ چلتی، آپ کے والد شاہ محمد عثمان بھی جونپور کے نامور وکیلوں میں تھے اور آپ کے دادا شاہ خادم علی مرحوم و مغفور نے ۱۸۵۷ء سے پہلے وکالت میں جو فروغ حاصل کیا تھا وہ عرصہ تک اس نواح میں لوگوں کے زبان زد رہا۔ خلاصہ یہ کہ آپ کی پرفطری ذہانت اور قابلیت نے خاندانی فضا میں مل کر آپ کو پانچ چھ سال کی مدت ہی میں اس وقت کے پُرانے مشہور قانون پیشہ اصحاب کا ہم پلّہ بنا دیا تھا۔

۱۹۲۰ء میں ہائی کورٹ کی ججی خالی ہونے پر آپ بار سے نکل کر بنچ میں گئے۔ جج کی حیثیت سے قانون میں ایسی ایسی موشگافیاں کیں کہ آپ کی قانونی قابلیت کی نہ صرف اس صوبہ میں بلکہ تمام ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ ۱۹۳۲ء میں ہائیکورٹ کے مستقل چیف جسٹس مقرر ہوئے۔

نیا آئین جاری ہونے پر ۱۹۳۷ء میں دہلی میں فیڈرل کورٹ قائم ہوئی اور حکومت نے ہندوستان کی اس سب سے بڑی عدالت کی ججی کے لئے آپ کا انتخاب کیا۔ ابھی اس عہدہ پر مقرر ہوئے تین برس کچھ مہینہ کی مدت ہوئی تھی کہ دہلی میں آپ کو ایک معمولی مرض لاحق ہوا جو آخر مرض الموت ثابت ہوا۔ اور ۱۲۔ مارچ یوم چہارشنبہ آدھی رات کے وقت آپ نے وفات پائی۔ بیماری کی خبر وفات سے تین چار روز پہلے مشتہر ہوئی تھی، جس نے تمام ہندوستان میں تشویش پیدا کر دی تھی۔ آپ کی تجہیز و تکفین دہلی میں عمل میں آئی۔ جنازے کی نماز سلطان علاؤالدین خلجی کی تاریخی مسجد کے صحن میں پڑھی گئی۔ دہلی کے علما، مشائخ اور عمائد اور مرکزی اسمبلی کے باہر کے ارکین شریک نماز تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار کے پاس صرف دو سو قدم کے فاصلہ پر سپرد خاک کئے گئے۔

دنیا ان کو فیڈرل کورٹ کے مرحوم جج کی حیثیت سے ہی نہیں روئے گی بلکہ ان کی ذات میں وہ خوبیاں تھیں کہ جو ہمیں آٹھ آٹھ آنسو رلائیں گی۔ وہ نہ صرف اعلیٰ درجہ کے مقنن تھے بلکہ ماہر فن تعلیم بھی تھے۔ تعلیم کے میدان میں پبلک طور پر ان کی قابلیت کا سب سے پہلا مظاہرہ بدایوں میں ۱۹۲۴ء میں ہوا تھا جب کہ انھوں نے صوبہ کی مسلم تعلیمی کانفرنس کی صدارت فرمائی تھی اور اپنا پر از معلومات خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔

۱۹۲۸ء میں اجمیر کے اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اس کے بعد ہی رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد جب مسلم یونیورسٹی کی کشتی ڈگمگا رہی تھی تو آپ نے اس کی ناخدائی کی ذمہ داری قبول کر کے تمام قوم کو ممنون منت بنایا۔ اور دوبارہ ۱۹۳۰ء میں آپ کا انتخاب اتفاق رائے سے وائس چانسلری کے عہدہ پر ہوا جس کی میعاد آئندہ مہینہ میں ختم ہونے والی تھی

یونیورسٹی کے بہی خواہ کئی مہینہ سے آپ سے التجا کر رہے تھے کہ آپ کم سے کم ایک ٹرم وایس چانسلری کا عہدہ پھر قبول کرلیں تاکہ آپ کے زیر نظر اسکیمیں بار آور ہوسکیں، لیکن آپ اس بار گراں کے اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ اور وفات سے پانچ روز پہلے آپ نے بیماری کی حالت ہی میں کورٹ کے ممبروں کے نام یہ پیام بھیجا تھا کہ "میں نے وایس چانسلری کا عہدہ صرف ایک میعاد کے لئے قبول کیا تھا اس لئے میرا یہ مصمم ارادہ رہا اور ہے کہ آئندہ دوسری میعاد کے لئے وایس چانسلری قبول نہ کروں گا"۔

اس پیام کا حال جب ۹۔ مارچ کو علی گڑھ میں معلوم ہوا تو بھی بعض ممبران یہ خیال کرتے تھے کہ ابھی سر شاہ سے التجا کرنے کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ لیکن ۱۳ کو مشیت نے اس اُمید کو ہمیشہ کے لئے منقطع کردیا۔ آپ کی وفات کی خبر سُن کر یونیورسٹی کے در و دیوار پر مایوسی چھا گئی، تعزیت کے ریزولیوشن پاس ہوگئے، یونیورسٹی ایک دن کے لئے بند کردی گئی۔

ماہر فن تعلیم کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی کے معاملات کو آپ نے جس طرح سدھارا وہ ہمیشہ یادگار رہیگا۔ ان مصروفیتوں کے باوجود آپ نے سائینس اور ریاضی کے شعبہ جات میں بھی اپنی ذہانت اور قابلیت کی بدولت خاص شہرت حاصل کی تھی۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں آپ نے اینسٹائن کے نظریۂ اضافیت Relativity کے غلط ہونے کا اعلان کیا تھا۔ دنیا اس اعلان سے حیرت میں پڑ گئی تھی۔ مگر سنہ ۱۹۳۶ء اور سنہ ۱۹۳۷ء میں پروفیسر میچلوف نے سائبیریا میں تحقیقات کرکے بتادیا کہ سر شاہ کا نظریہ بالکل صحیح ہے آپ کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ سائنس اور ریاضی سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ کو علم ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ بیرسٹری کی حالت میں مقدمات کی پیروی کرنے کے لئے آپ جہاں جاتے اُردو ادب بالخصوص نظم کی کتابیں خریدتے، اس کے علاوہ دوستوں سے بھی فرمائش کرتے رہتے تھے کہ اُردو نظم کی جدید یا قدیم جو کتاب بھی مل جائے وہ ان کے لئے خرید لی جائے۔ کئی سال کی کوششوں سے انھوں نے اُردو ادب کا ایک اچھا خاصہ کتب خانہ جمع کرلیا تھا۔ صرف جمع کرکے اس کو الماریوں کی زینت نہیں بنا دیا تھا بلکہ اس کو پڑھتے بھی تھے۔ اس مطالعہ کا یہ اثر ہوا کہ آپ نے سنہ ۱۹۲۲ء میں قصائد ذوق کی از سر نو ترتیب کی ضرورت محسوس کی، جس کی وجہ آپ نے اس کے دیباچہ میں یہ بتائی کہ "نوجوانانِ قوم کو جو اکثر اُردو ادب سے ناآشنا ہوتے ہیں یہ موقعہ ہاتھ آئیگا کہ اُردو شاعری کے ایک اُستاد کے کلام کو نئے لباس میں ملبوس دیکھکر اس کے مطالعہ کی طرف مائل ہوں"۔

اس کے بعد انتخاب غزلیات ذوق اور انتخاب مثنویات میر معہ تمہید اور مقدمہ کے شائع کیا۔ آپ کا ارادہ تھا کہ سلسلۂ کلام اساتذہ اُردو کی اشاعت کو جاری رکھیں گے۔ لیکن عدیم الفرصتی کے سبب سنہ ۱۹۳۰ء

کے بعد کوئی کتاب اس سلسلہ کی ترتیب نہ دے سکے۔

بہر حال قانون، سائنس، ریاضی کے مذاق کے ساتھ ساتھ اُردو ادب سے دلچسپی ان کی ذات میں جمع ہو جانے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ قدرت نے ان کی ذات واحد میں ان اوصاف کو ایک جگہ جمع کر کے ان کی غیر معمولی ترقی کا یقین دلایا تھا۔ جو سچ ہو کر رہا۔ باوجود اس ترقی اور اقبال کے ان کا اخلاق اعلیٰ درجہ کا تھا، اور اُن کے والد ماجد کے سوانح نگار نے جو الفاظ شاہ محمد عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق کے متعلق لکھے ہیں وہی ورثہ میں سر شاہ کو ملے تھے: "وہ بڑے متواضع، سیر چشم، اقربا پرور، دوست پرست اور سخی تھے۔ اخلاق کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ ہر طبقہ کا ہر شخص یہ سمجھے کہ التفات و مروت کی نظر سب سے زیادہ مجھ پر ہے۔"

کل ہی کی بات ہے کہ بدایوں کے ایک غیر مسلم وکیل صاحب سے سر شاہ کے اخلاق کے متعلق گفتگو کرنے کا موقعہ ملا، وہ یہی کہتے تھے کہ "سر شاہ سب سے زیادہ مجھ پر مہربان تھے، اور اُن کے انتقال سے میں یتیم ہو گیا ہوں، وہ تو نہیں مرے میرے باپ مر گئے۔"

اس اخلاق اور خوبیوں کا انسان آسمان کی سیکڑوں گردشوں، زمانہ کی ہزاروں کروٹوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ ان کی مغفرت کرے، اور آئندہ نسلوں کو اُن کے کارناموں کے دیکھنے اور سمجھنے کے لئے بصارت اور بصیرت عطا فرمائے۔ میں نے فوری حیثیت سے چند سطوروں میں اُن کے بعض حالات اور اوصاف لکھکر اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اُمید ہے کہ ملک کے قابل اور تعلیم یافتہ جماعت میں سے کوئی شخص اُن کی مبسوط سوانح عمری لکھکر ایک قومی ضرورت کو پُورا کرے گا۔

۱۲۔ مارچ کو سر شاہ مرحوم کی وفات حسرت آیات کی خبر سُنتے ہی ایک قطعۂ تعزیت بھی موزوں ہوا تھا جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

ہند کی اعلیٰ عدالت میں پڑا کہرام ہے ۔۔۔ سر سلیماں سا مقنن اس کو خالی کر گیا
آج دنیائے ادب بھی ہو رہی ہے سوگوار ۔۔۔ اس کا حامی اس کا محسن ہو گیا اُس سے جُدا
ماہر سائنس تھا اُس کی نئی تحقیق تھی ۔۔۔ قابلیت کا ہے اس کی آج شہرہ جا بجا
اس کی کشتی جب بھنور میں آگئی تھی یک بیک ۔۔۔ مسلموں کی جامعہ کا وہ بنا تھا ناخدا
جامعہ کی اس نے جو خدمات کی تھیں بے غرض ۔۔۔ قابل تعریف بے شک اس کا یہ ایثار تھا
اب اُٹھایا جائیگا مجھ سے نہ یہ بار گراں ۔۔۔ مرنے سے پہلے یہی پیغام تھا مجھکو دیا

جامعہ کے چھوڑنے سے قبل دنیا چھوڑ دی | تھی مشیت ہی یہی پورا نہ ہو یہ مدعا
وہ ہوا نظروں سے اوجھل کارنامے چھوڑ کر | اس کے زندہ رہنے کا دیتے ہیں گے وہ پتا
کیوں سلیماں کی فنا پر روتے ہیں اہل جہاں | صفحۂ عالم پہ اس کی ثبت ہے مُہر بقا
یہ تو سب سچ ہے مگر میں اپنے دل کو کیا کروں | حال اس کا غیر ہے اب میں اسے سمجھاؤں کیا
فرض ہے بیگم سلیماں سے کروں میں تعزیت | اُن پہ یہ بپتا پڑی ہے راج ان کا لُٹ گیا
اب تو بچے سامنے اُن کے ہیں اُن کی زندگی | ہے نظامی کی دُعا دیکھیں اُنھیں پھولا پھلا

(۲)

(از خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر "البشیر")

ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان جج فیڈرل کورٹ اور وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی وجاہت اور قابلیت کے ساتھ نہایت با اخلاق، فیاض اور مہمان نواز بزرگ تھے۔ سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ ان میں غرور اور تکبر نام کو بھی نہ تھا۔ غریب سے غریب شخص سے بھی اخلاق و جانفشانی کے ساتھ ملتے تھے اور اپنے ملنے والوں کے ساتھ بلا خیال پوزیشن مساویانہ برتاؤ کرتے تھے۔ ان کو قانون و تعلیم سے خاص دلچسپی اور شغف تھا۔ بیرسٹری کرنے کے بعد کئی سال تک اُنھوں نے کسی قسم کے قومی کام میں حصہ نہیں لیا اس زمانہ میں میں نے اُن سے یہ شکایت کی کہ آپ قومی کاموں میں حصہ کیوں نہیں لیتے تو مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ جو نوجوان اپنی حیثیت درست کرنے کے قبل قومی کاموں میں حصہ لیتے ہیں اُن کی ذات سے قوم کو نقصان زیادہ پہونچتا ہے اور نفع کم۔ لہٰذا میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ جب میری مالی حالت درست ہو جائیگی اور مجھ کو دنیا کا تجربہ بھی ہو جائے گا تو قومی کاموں میں حصہ لوں گا۔ چنانچہ سب سے پہلے اُنھوں نے قومی کاموں میں اس وقت دلچسپی کا اظہار کیا جب الہ آباد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ میں نے خود بھی آنکھ سے دیکھا کہ وہ مثل ملازموں اور مزدوروں کے ہر چھوٹا بڑا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ مرحوم کی علمی اور قانونی قابلیت مسلمہ ہے۔ اِن کا خاندان سلطنت مغلیہ میں نہایت باعزت اور باوقار رہا۔ سلطنت مغلیہ کے ختم ہونے کے بعد ان کے خاندان کے بہت سے افراد انگریزی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر سرفراز تھے، اور جہاں جو شخص رہا وہ پبلک کی نظروں میں معزز اور بااثر ہو کر رہا۔

علمی قابلیت بھی اس خاندان کی خصوصیات میں سے تھی۔ لہٰذا علمی قابلیت مرحوم کو وراثت میں ملی تھی۔

تنقید کتب

باقیات بجنوری[1]

مشہور غالب پرست ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے نام نامی سے اُردو ادب کے قدردان بخوبی واقف ہیں۔ اس وقت ہندوستان کے سخن فہم طبقہ کی غالب پرستی میں ان کی جگر کاری کا بہت بڑا حصہ ہے افسوس ڈاکٹر صاحب کی عمر نے وفا نہ کی اور بے وقت موت نے انھیں اُردو سے اس قدر جلد چھین لیا تاہم انکی بہت سی قابل قدر چیزیں عام قدردانی کی مستحق ہیں۔ ہم کو جامعہ ملیہ دہلی کا شکرگذار ہونا چاہیئے جس نے آپ کے ادبی و تنقیدی مضامین، خطوط اور نظموں کا ایک مجموعہ "باقیات بجنوری" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا سب سے پہلا مضمون فخر ہندوستان ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کی گیتا نجلی پر ایک فاضلانہ تنقید ہے جس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے وہی ڈھنگ اور وہی اسلوب تنقید اختیار کیا ہے جو دیوان غالب کے مقدمہ میں اختیار کیا تھا۔ دوسرا مضمون وضع اصطلاحات پر ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ غیر زبان کی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت غیر مانوس اور ثقیل عربی یا سنسکرت لفظوں یا ترکیبوں کی ٹھونس ٹھانس نہ کرنا چاہیئے۔ اگر عمدگی سے ہوسکے تو فارسی سے کام لیا جائے ورنہ اصلی زبان کی اصطلاح ہی استعمال کی جائے۔ اس سلسلہ میں آپ نے چند نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ تیسرا مضمون لکھنؤ کی سیر ہے جو بہت دلچسپ و سبق آموز ہے اس میں لکھنؤ اور لکھنؤ والوں پر خاصی تنقید کی گئی ہے۔ اس کے بعد مرحوم کے چند خطوط بھی دیئے گئے ہیں جن میں فلسفیانہ استدلال اور حکیمانہ باتوں سے کام لیا گیا ہے۔ آخر میں پرانی چال کی نظمیں ہیں جن میں کوئی خاص بات نہیں لیکن نثر کے مضامین اور خطوط گراں قدر انشا پردازی کا قابل تقلید نمونہ ہیں۔ بہر حال جامعہ ملیہ نے یہ مجموعہ شائع کر کے بعض ادبی جواہرات کو کتابی صورت میں محفوظ کر دیا ہے۔

گلبانگ حیات

یہ نظر فریب اور دلآویز کتاب خان بہادر خواجہ محمد مسیح پال تخلص امین حزین سیالکوٹی کے پسندیدہ

[1] چھپائی ٹائپ کاغذ عمدہ جلد نظر فریب ضخامت ۲۴۲ صفحات۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ) ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

[2] تنقید کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔ (اڈیٹر)

کلام کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ آمین صاحب ایک پُرگو اور کہنہ مشق شاعر ہیں، اور ملک کے اکثر رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے نام کے ساتھ الفاظ "مسیح" اور "پال" سے یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ آپ عیسائی ہیں بلکہ آپ کشمیری مسلمان ہیں۔ آمین صاحب شروع شروع میں مولانا ظفر علی خاں یا مولانا محمد علی مرحوم کے رنگ سے متاثر تھے لیکن بعد میں جب خیالات و جذبات کے اندر زیادہ پختگی اور سنجیدگی پیدا ہوئی تو آپ نے ڈاکٹر اقبال کا رنگ اختیار کیا۔ بہر حال آپ کا کلام عموماً حکیمانہ اور جوشِ عمل سے معمور ہوتا ہے، مثلاً آپ فرماتے ہیں:۔

زندگی نام ہے ماحول پہ چھا جانے کا ۔۔۔ بزم کو بادۂ کردار سے گرمانے کا
ظرف عالی ہے تو اے رندِ خراباتِ عمل ۔۔۔ خم بہ آغوش ہے قطرہ ترے میخانے کا

اس مجموعہ میں بعض نظمیں بہت گرانبہا ہیں اور قطعات بھی اچھے اور سبق آموز ہیں غزلوں کا بھی کافی حصہ ہے۔ جن میں گو شوکتِ الفاظ سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن وہ برجستگی اور وہ رنگینی نہیں ہے جو شاعری کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئیے بعض بعض جگہ ہندی الفاظ کھپانے کی بھی کوشش کی گئی ہے، مثلاً :۔

جی کا وظیفہ تیری تمنّا ۔۔۔ نینوں کا کاجل نورِ تجلّے

اس شعر میں "جی" "نینوں" اور "کاجل" استعمال کئے گئے ہیں مگر "وظیفہ" اور "نورِ تجلّی" کے ساتھ جوڑ ٹھیک نہیں بیٹھ سکا۔ اور "نینوں کا کاجل" میں "دو کا" بُری طرح سے متصل آگئے ہیں۔

سُکھی خود تھی اور ساک سینوں کا سُکھ تھی ۔۔۔ پتی، ساس اور بھائی بھینوں کا سُکھ تھی
بَہو کیا تھی گھر بھر کے نینوں کا سُکھ تھی ۔۔۔ رہا جب نہ تک اُس کا مسکن حویلی
ہو بیٹیوں کا اب اللہ بیلی!

اس بند میں بھی ہندی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، مگر "ساک سینوں" عام فہم نہیں ہے۔ ممکن ہے پنجاب کا کوئی محاورہ ہو اور "بھینوں" (یعنی بہنوں) تو بالکل ہی ٹکسال باہر ہے۔ غالباً "سینوں" اور "نینوں" سے جوڑ ملانے کے لئے تصرف سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن ذوقِ سلیم کے نزدیک یہ تصرف بیجا ہے۔ اس کے علاوہ جدید شاعری میں لفظ "تک" بھی متروک ہے۔ ایک تازہ غزل کا شعر ہے:۔

محمل کی اوٹ میں لبِ لیلیٰ شفق فروش ۔۔۔ دشتِ جنوں میں قیس ہے غوغا لئے ہوئے

پہلے مصرعہ میں "لبِ لیلیٰ شفق فروش" کی حسین ترکیب داد سے باہر ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں قیس کے "غوغا لئے ہوئے" نے تمام مزا کرکرا کر دیا۔ شروع میں سر عبد القادر کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں حضرت آمین حزیں کے سوانح حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے[1]

---

[1] لکھائی چھپائی اچھی کاغذ عمدہ حجم ۲۰۴ صفحات قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ: اُردو اکیڈمی پنجاب دہلی دروازہ لاہور

علمی خبریں اور نوٹ

چھ سال ہوئے کہ زمانہ بابت اپریل ۱۹۳۵ء میں مرحوم منشی پریم چند جی نے "اردو۔ہندی۔ہندستانی" کے عنوان سے ایک اہم مضمون لکھکر اُردو ادیبوں کی توجہ اس ضروری مسئلہ پر مبذول کی تھی۔ چنانچہ اب تک زمانہ میں تقریباً تیس مضامین چھپ چکے ہیں جن میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر اظہار خیالات کیا گیا ہے۔ زمانہ جون جولائی ۱۹۳۵ء میں مسٹر حامد اللہ افسر و مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ہندی اُردو کے تصفیہ کے متعلق قابل غور مضامین لکھے۔ زمانہ نومبر ۱۹۳۵ء میں پنڈت منوہر لال صاحب زتشی کا مضمون شائع ہوا۔ جنوری ۱۹۳۶ء میں مسٹر ریاض الدین احمد خاں بی۔اے نے اُردو زبان اور رسم الخط پر اظہار خیالات فرمایا۔ فروری ۱۹۳۶ء میں مسٹر سلیم جعفر کا مضمون "ہماری قومی زبان" چھپا۔ مئی ۱۹۳۶ء میں مسٹر بیتاب بریلوی نے "اُردو یا ہندی" پر مضمون لکھا۔ فروری ۱۹۳۷ء میں مسٹر سلیم جعفر نے ہندی رسم الخط کے ارتقا پر ایک محققانہ مضمون لکھا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسٹر بابو دیال جین نے "ہماری قومی زبان" اور اپریل ۱۹۳۸ء کے زمانہ میں حضرت جگر بریلوی نے ہندو ادیبوں کی حق تلفی کی شکایت کرکے ایک دُکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی۔

اس کے بعد اس مسئلے پر حضرت سہیل اور کئی صاحبوں کے اہم مضامین شائع ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں "حق پرست" نے اُردو۔ہندی۔ہندستانی کے مسئلہ پر ہندو قوم پرستوں کے نقطۂ خیال کی مزید وضاحت کی۔ مسٹر سہیل نے اپریل ۱۹۳۹ء میں عام سیاسی نقطۂ خیال سے بحث کی۔ اسی نمبر میں حق پرست کا اس مسئلہ پر ایک دوسرا مضمون شائع ہوا۔ اس کے بعد جون۔جولائی ۱۹۳۹ء میں ایک گمنام ادیب اور مسٹر منوہر لال طالب کے مضامین درج ہوئے۔ اگست و نومبر ۱۹۳۹ء میں "حق پسند" صاحب نے اپنے خیالات اور عقائد کی مزید تشریح کی اور اپنے معترضین کے اعتراضات کے جواب دیئے۔ فروری ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے ایک عام اور مشترکہ زبان کے تمام پہلوؤں پر اصولی حیثیت سے بحث کرکے اُردو کو ملک کے بڑے حصہ کی عام زبان بنانے کی تدبیریں بتائیں۔ ڈاکٹر موہن سنگھ کی تجویزیں دُور رس اور دیرپا نتائج پیدا کرنے والی ہیں جن پر ہمارے نامور ادیب حضرت آنند لکھنوی عرصہ سے عملدرآمد کر رہے ہیں۔ حضرت آنند نے جس کامیابی سے عام ہندستانی زبان میں شاعری کا حق ادا کیا ہے اس کا نمونہ ان کے نوطبع مجموعۂ کلام "سنہری بانسری" وغیرہ میں موجود ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ملک میں جابجا اُن کے طرز کی پیروی ہو رہی ہے۔ چنانچہ عظمت اللہ صاحب مرحوم نے اسی زبان میں کئی مشہور نظمیں لکھیں آج بھی مقبول حسین صاحب احمد پوری اکثر نظمیں اسی عام فہم زبان میں لکھتے ہیں اور حال ہی میں "دو پھول"

کے عنوان سے پنڈت آنند نراین ملا کی ایک دلکش نظم زمانہ میں شائع ہو چکی ہے - یہ نظمیں اردو ہندی دونوں حروف میں چھپ سکتی ہیں اور چھپی بھی ہیں - ہم نہیں کہتے کہ علمی مباحث کے لئے دونوں زبانوں کا فرق آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے - لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ روزمرہ ضروریات کے لئے دونوں زبانیں ایک دوسرے کے بہت قریب لائی جا سکتی ہیں - اور اردو کو سہل سلیس اور عام فہم بنا کر اس میں خالص ہندوستانی عنصر کو زیادہ سے زیادہ داخل کر کے ہم اس کی توسیع و ترقی میں بہت کچھ اضافہ کر سکتے ہیں - محاورات اور املا دونوں میں ہم کو عوام کی ضروریات کا پورا لحاظ رکھنا ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم اردو کو عام پسند اور ہر دلعزیز نہ بنا سکیں گے ۔ بہر حال اسی بحث کی ایک دوسری کڑی صحت الفاظ کا مباحثہ ہے جو مرزا عظیم بیگ چغتائی نے زمانہ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء میں شروع کیا - ہمارا خیال تھا کہ کل ہند اردو کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں جو دسمبر سنہ ۴۱ء کی آخری تاریخوں میں کانپور میں ہوا اس مسئلہ پر پوری طور سے غور کیا جائے گا لیکن معمولی ریزولیوشنوں کے سوائے کانفرنس نے کسی خاص مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں دی - چغتائی صاحب نے اردو ادیبوں سے عموماً اور جناب اثر لکھنوی سے خصوصاً اس گتھی کو سلجھانے کی اپیل کی تھی - خوشی کی بات ہے کہ مکرمی اثر صاحب کے علاوہ اور کئی صاحب تحقیق ادیبوں نے بھی اس مسئلہ پر اظہار خیالات فرمایا ہے - چنانچہ اس ماہ کے پرچے میں اس کے متعلق کئی قابل قدر اور قابل غور مضامین درج کئے گئے ہیں - بعض اہل الرائے احباب اور محققین نے اس سلسلے میں ایڈیٹر کے نام خاص خطوط بھی لکھے ہیں - مثلاً مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی ۲۹ - جنوری سنہ ۴۲ء کے خط میں ادب اردو کے ایک دیرینہ خادم کی حیثیت سے تحریر فرماتے ہیں : -

"عربی - فارسی - انگریزی وغیرہ کے جو الفاظ اردو میں مل جل گئے ہیں وہ اردو زبان کا جزو بن گئے ہیں، ان کی صحت و غلطی کے باب میں تو اردو ہی کا محاورہ اردو ہی کی قواعد معیار کا کام دیں گے "لالٹین" بولتے وقت انگریزی کے تلفظ کی پابندی غلط ہی نہیں بلکہ مضحکہ انگیز ہوگی -

البتہ جن الفاظ کی حیثیت اردو میں ابھی صرف مہمان کی ہے، اور وہ اردو زبان کا جزو نہیں بنے ہیں ان میں ترین احتیاط یہی ہے کہ خود انھیں کی زبان کا تلفظ وغیرہ ملحوظ رکھا جائے - گو اُن کے اردو استعمال کو بھی غلط قرار دینا مشکل ہی ہے -

باقی عام فہم اردو الفاظ کو چھوڑ کر خواہ مخواہ عربی الفاظ لانے کا طریقہ بھی صحیح نہیں - مثلاً "چندہ" کے بجائے "بدل اشتراک" یا "فہرست" کے بجائے "فہرس" وغیرہ - البتہ "ہوائی جہاز" (Airship) اور "طیارہ" (Airoplane) مختلف چیزیں ہیں، اس لئے "طیارہ" لانے میں مضائقہ نہیں - گو یہاں بھی عام فہم لفظ "ہوائی کشتی" کا چل سکتا ہے" - اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ -

میری تو عرصہ سے تجویز ہے کہ اُردو ہندی تضیہ کو چکانے کے لئے ایک کل ہند و ' ہند کمیٹی بنا دی جائے جس کا ایک ممبر بھی مسلمان نہ ہو اور تصفیہ اسی پر چھوڑ دیا جائے . چند نام بھی ایسی کمیٹی کے لئے میرے ذہن میں ہیں :-

(۱) سر تیج بہادر سپرو (الہ آباد) (۴) منشی دیا نرائن نگم (کانپور)

(۲) پنڈت برج موہن ناتھ کیفی (دہلی) (۵) پنڈت انند نرائن ملّا (لکھنؤ)

(۳) راجہ محبوب پرشاد (حیدر آباد دکن) (۶) پنڈت امرناتھ ساحر (دہلی)

یہ چند نام محض نمونہ کے طور پر ہیں ۔ (رائے زادہ گوبند پرشاد (بھوپال)، ڈاکٹر تارا چند (الہ آباد) وغیرہ اور حضرات بھی بہ آسانی مل سکتے ہیں ۔

ایک اور قابل مضمون نگار لکھتے ہیں کہ چغتائی صاحب نے یقیناً دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے ۔ ان کے مضمون کی ہر سطر میں ان کا خلوص جھلک رہا ہے ۔ یوں بھی اُردو دنیا میں ان کی جو پوزیشن ہے اس کی وجہ سے ان کے خیالات احترام کے مستحق ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ ارباب فن ان کے پیش کئے ہوئے مسائل پر غور کریں گے اور ان کو حل کرنے کی کوشش کریں گے ۔"

عجب لطف کی بات ہے کہ عوام کی روزمرہ ضروریات اس اہم اور نازک مسئلہ کو جو ہمارے لئے اتنا دشوار بن گیا ہے ایک حد تک خود بخود حل کر رہی ہیں ۔ چنانچہ موجودہ جنگ کے سلسلے میں غیر ملکی ریڈیو کے روزمرہ اعلانات میں کتنے ہی لفظوں کے مقبول عام ترجمے ہو گئے ہیں ۔ ہمارے قواعد داں بزرگ کچھ ہی کہیں مگر ان میں سے اکثر ترجمے عام زبان کے جزو بن جائیں گے ، بالکل اسی طرح جس طرح Positive اور Negative برقی لہر کے لئے خود برقی کارخانوں کے کاریگروں نے گرم اور ٹھنڈے تار کی اصطلاح وضع کر لی ۔ اگر اس اصول کو مدنظر رکھکر ہم اُردو زبان کی توسیع و ترقی کی کوشش کریں تو شاید یہ مسئلہ ایسا مشکل نہ رہے ۔

۱۳-۱۲ مارچ کی درمیانی رات کو چند روز کی علالت کے بعد آنریبل جسٹس سر شاہ سلیمان صاحب جج فیڈرل کورٹ کی صرف ۵۵ سال کی عمر میں وفات ملک کے علاوہ اردو ادب کے لئے بھی ایک سانحۂ عظیم ہے پچھلے بیس سال کے اندر آپ نے اپنی غیر معمولی قابلیت ، جودت طبع اور محنت شاقہ کی بدولت ملک میں ایک خاص پوزیشن حاصل کر لی تھی آپ الہ آباد یونیورسٹی کے ایک بہترین گریجویٹ اور ہر حیثیت سے صوبۂ متحدہ کے علمی و ادبی حلقوں کے رکن اعظم تھے آپ کی قانونی نکتہ دانی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ آپ ۱۹۲۰ء میں صرف ۳۴ سال کی عمر میں الہ آباد ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں قائم مقام اور ۱۹۳۲ء میں مستقل چیف جسٹس مقرر ہوئے ۔ آپ کی نکتہ سنجی اور معاملہ فہمی کا سب سے نمایاں اظہار مقدمہ سازش میرٹھ کی اپیل کے وقت ہوا جس کا فیصلہ آپ نے صرف نو دن میں سنا دیا تھا ۔ عدالت سشن میں مقدمہ

مقدمہ برسوں چلا تھا لیکن اپیل میں آپ نے مہینوں کا کام دنوں میں کر ڈالا اور گورنمنٹ ایڈوکیٹ وکلا اور ملزمان سب آپکی نکتہ رسی اور تجربہ کاری پر عش عش کرتے رہ گئے۔ پیشاور فائرنگ کی تحقیقاتی کمیٹی میں بھی آپ نے ملک کی اہم خدمت انجام دی، اور گو گورنمنٹ نے آپکی رپورٹ شائع نہیں کی لیکن کہا جاتا ہے کہ آپ نے معاملات کی تہ پر پہونچکر پوری روشنی سے کل واقعات گورنمنٹ کے سامنے کھولکر رکھدیئے تھے۔ ہندوستان اور انگلستان کے فوجی مصارف کی جانچ کمیٹی میں بھی آپ نے خاص قابلیت سے کام کیا۔ اس کے بعد جب فیڈرل کورٹ قائم ہوئی تو آپ اُس کے جج مقرر ہوئے۔ اسی اثنا میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بھی آپ نے قوم کی بہترین خدمت انجام دی۔

انتظامی قابلیت اور قانونی فضیلت کے علاوہ آپ کو علم ریاضی میں بھی خاص ملکہ تھا، چنانچہ اس مد میں دنیا کے ماہرین سائنس نے آپ کی علمی تحقیقات کی داد دی ہے۔ آپ کو طبعیات اور ریاضیات دونوں میں یدطولیٰ حاصل تھا قانونی مسائل پر غور و فکر کے بعد جو وقت بچتا تھا وہ آپ طبعیات کے بعض اہم مسائل کی تحقیق و تفتیش میں صرف کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے دنیا کے نامور ماہر سائنس پروفیسر آئنسٹین کے نظریۂ اضافیت کی نکتہ چینی کر کے ایک نیا نظریہ پیش کیا جسکی صحت ماسکو کے مشہور و معروف ماہر علم نجوم پروفیسر Michailor نے تسلیم کی۔ ان ادق اور خشک علوم کے ساتھ ساتھ آپ اُردو ادب کے بھی سچے قدردان اور مستقل خدمتگذار تھے۔ آپ کے والد ماجد کو شاعری سے خاص ذوق تھا، آپ کو بھی شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ آپ نے قصائد ذوق، مثنویات میر وغیرہ کے خاص اڈیشن مرتب کئے، اور اُردو ادیبوں اور شاعروں کی ہمیشہ دل کھولکر قدر افزائی کی۔ جب کبھی کوئی نامور انشاپرداز یا شاعر الہ آباد میں آتا تو آپ نے اسکی عزت افزائی کرنا ہمیشہ اپنا فرض منصبی سمجھا۔ درحقیقت آپ کا اخلاق اتنا وسیع تھا کہ ہر کس و ناکس کے ساتھ خندہ پیشانی، شگفتہ مزاجی اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ایڈیٹر زمانہ پر بھی آپ کی خاص نظر عنایت تھی اور زمانہ کی ترقی و استقلال کے سلسلے میں آپ کی ذات گرامی سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ آپ نے بارہا اس کے متعلق ہر ممکن و مناسب کوشش کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ افسوس یہ تمام اُمیدیں اب خاک میں مل گئیں۔ مگر سر شاہ سلیمان کی ناوقت وفات سے ملک نہ صرف ایک فخر زمانہ محسن ادب بلکہ ایک بہترین جج ایک اعلیٰ ترین ماہر سائنس اور ایک بے لوث رہنما کی خدمات سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ کمی مدتوں میں بھی پوری نہ ہو سکے گی۔ ملک کی اس سے زیادہ کیا بدنصیبی ہو سکتی ہے کہ سر شاہ سلیمان جیسے نیک نفس اور اُولوالعزم قدردان علوم و فنون اس قدر جلد داغ مفارقت دے جائیں۔ اس سانحۂ عظیم میں ہم اُن کے اہل خاندان اور اعزا کے شریک غم ہیں، اُن کا نقصان ملک اور قوم کا نقصان ہے لیکن انسان مجبور و لاچار ہے اور مشیت ایزدی میں چون و چرا کی مجال نہیں۔ افسوس، صد افسوس۔

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم

جلد ۷۶	اپریل سنہ ۱۹۴۱ع	نمبر ۴

فہرست

سے شائع ہوا

ے دوایات کو شیشوں میں تیار کرنے والا

ہمدرد دواخانہ

...کو موٹا تازہ تندرست اور توانا کرتا ہے ...کی ۵۰ سال کی آزمودہ دوا ...کٹ۔ کھانسی۔ دمہ ...ہیضہ ...انگر ...اور ...قیمت بارہ آنہ ۱۲ر

...کا مباکشا سو ...قوت۔ طاقت چستی اور فرحت لاتا ہے اور بھوک بڑھاتا ہے۔

قیمت:۔ خورد بوتل ایک روپیہ۔ کلاں دو روپے

نئی مطبوعات

...ت میں ...مفت طلب فرمائیے ...ادبی سر...

اقتصادی ہند

...ایم۔ اے (ماہر اقتصادیات) ...

سوانح حیات

میزینی	۱۲ ...
گیریبالڈی	۱۲ ...
کارل مارکس	۴ ...
لینن	۴ ...
مسولینی	...
داستان ...	

...ادب میں قابل قدر اضافہ ہندوستان ...
...چند صاحب ایم۔ اے ...
...صاحب ...
...صاحب۔ عائشہ خاتون ...
...مجلد قیمت ...

پیش لفظ

ایسے بہت کم ماہرین ہیں جو اپنی فنی خصوصیت سے عمدگی کے ساتھ کام لے سکتے ہوں یعنی اُسے دلچسپ اور جاذبِ توجہ داستان کی طرح پیش کر سکتے ہوں۔ اگر کوئی صاحب کیڑوں کے علم کے ماہر ہیں تو عوام انھیں دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ ایک زاہد گوشہ نشین عینک لگائے ہوئے خوردبین کی نلی میں انہماک کے ساتھ دیکھ رہا ہے اسی طرح خوردبین سے کیڑوں کو بغور دیکھنے والوں میں قابل ترین شخص بالٹی مور کی جان ہاپکنس یونیورسٹی کے پال ہیگنز صاحب ہیں اگرچہ وہ اپنی تحقیقاتوں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں لیکن وہ بہت جلد ایک کتاب کی وجہ سے جس کا نام ہے "پسّو اور لیسو یا کیڑوں کی دنیا میں کون کیا ہے؟" لکھے پڑھے عوام میں مشہور ہونے والے ہیں جو بالٹی مور میں چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں کیڑوں کی عجیب و غریب دنیا کی سیر کرائی گئی ہے۔ اور واقعی امریکہ میں شائع ہونے والی تمام کتابوں میں یہ ایک نہایت پُرلطف اور دلچسپ سائنٹفک کتاب ہے لیکن پروفیسر ہیگنز کا عزیز ترین کیڑا پسّو ہے اور وہ اپنی کتاب کو مندرجہ ذیل مہملیات سے شروع کرتے ہیں۔

"بڑے پسوؤں کے چھوٹے پسو ہیں جو انکی پشت میں کاٹتے رہتے ہیں اور چھوٹے پسوؤں کے ان سے بھی چھوٹے پسو ہیں، یہی سلسلہ بے انت چلا گیا ہے۔"

لیکن در حقیقت یہ کیڑوں اور اُن کے متعلق اور زیادہ چھوٹے خوردبینی کیڑوں کے متعلق کوئی مہمل بات نہیں۔ یہ کیڑے فوجوں سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ انسان کے خون میں داخل ہو کر اسطرح چکر کاٹنے کا زبردست شوق رکھتے ہیں جیسے جھونپڑیوں میں مچھلی۔ یہ انسان کی بڑی آنت میں گھسے رہتے ہیں یا انسان کے پھیپھڑوں کے نقصانات کی تلافی کرنے کے بارہ میں پروفیسر ہیگنز کچھ نہیں کہتے بلکہ یہ کام انھوں نے دانشمندی سے طبیبوں کیلئے چھوڑ دیا ہے لیکن ملیریا کے کیڑوں کے بارہ میں انھوں نے علاج ضرور تجویز کیا ہے کیونکہ یہ بیماری ابھی تک سب سے زیادہ پھیلنے والی بیماری ہے اور جس قدر اتلاف جان اس سے ہوتا ہے اسقدر دوسری بیماری سے نہیں ہوتا۔ پروفیسر صاحب نے بالکل صحیح کہا ہے کہ کوئین نے بڑے بڑے کام سے پہلے ہندوستان میں بیشمار چھوٹے چھوٹے کاموں میں ملیریا کی انسداد کی ہے اسی اثنا میں اچھا کیا [illegible] [illegible] کی اس سے خوفناک شاعری ملیریا کی روک تھام کیلئے فضل پر چھڑکی گئی [illegible] سازش [illegible] [illegible] [illegible] ساتھ [illegible] کوئین دیا [illegible]

[illegible]

بک ایجنسی کی قابل دید بے [illegible] مائیں

بہادر شاہ ظفر۔ خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر مفصل تبصرہ۔ از منشی محمد امیر احمد علوی بی۔ اے۔ اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ قیمت ۱۲؍

مثنوی سحر یعنی شکنتلا اور دشینت کا اردو ترجمہ۔ حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز۔ دوسرا ایڈیشن جسکی مصنف نے نظر ثانی کی ہے قیمت ۸؍

طریق دولتمندی۔ دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کتاب میں دولت حاصل کرنیکے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں قیمت صرف ۸؍

میدان عمل۔ منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبۂ جامعہ نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اسمیں ملک کی موجودہ بیداری بے چین روح کی جیتی جاگتی تصویریں فطری عشق و محبت کے سادہ، دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے۔ بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے۔ صفحات پانسو۔ کتابت اعلیٰ۔ کاغذ نفیس روشن طباعت خوبصورت اور مضبوط جلد دیدہ زیب گرد پوش

قیمت صرف دو روپیہ ۸ آنہ ۲؍۸

معاہدۂ عمرانی۔ از ژان ژاک روسو۔ مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب بی۔ اے (علیگ) ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی (ہائیڈلبرگ) حریت۔ اخوت اور مساوات جس کا روحانی پیام دنیا کو اسلام نے پہونچایا تھا اس کی سیاسی تبلیغ یورپ میں روسو کے معاہدۂ عمرانی نے کی۔ روسو کا کمال یہ ہے کہ اس نے سیاست مدن کے دقیق مسائل باتوں باتوں میں سمجھا دیے ہیں۔ اس کی یہ کتاب جو معنوی حیثیت سے فلسفۂ سیاست کی اہم کتاب ہے۔ زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے سہل ہے۔ قیمت مجلد ۲؍۱

سلومی۔ آسکر وائلڈ کے مشہور ڈرامہ "سلومی" کا ترجمہ ہے۔ جس کو جناب مجنوں نے نہایت محنت سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت صرف ۸؍

خیالات مہاتما گاندھی۔ یہ وہ لاجواب کتاب ہے جس میں مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے گاندھی جی کے مذہبی، سماجی اور سیاسی خیالات شرح و بسط کے ساتھ درج کر کے دنیا پر احسان عظیم کیا ہے۔

قیمت حصہ اول ۱۲؍ حصہ دوم ۱۲؍

فلسفۂ جنگ۔ ایک مشہور و معروف روسی تصنیف کے تحت میں فلسفۂ جنگ [illegible] نظر ڈالی گئی ہے۔

ملنے کا پتہ۔ زمانہ بک ایجنسی

زمانہ بک ڈپو ... [illegible]

انقلاب فرانس۔ فرانس کی تحریک آزادی اور اس انقلاب کی تاریخ میں ہمارے لئے بہت سے سبق ہیں جامعہ ملیہ کے ایک لائق فرزند مولوی عبدالقادر صاحب بی۔ اے نے انقلاب پر اس کتاب میں ایک غائر نظر ڈالی ہے ... ... قیمت عہ

یورپ کی حکومتیں۔ اس کتاب میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کے نظام حکومت کا بیان ہے

دیوان غالب۔ دیوان غالب کا وہ مشہور و معروف نسخہ جو جرمنی میں خاص اہتمام سے چھپوایا گیا ہے مکمل دیوان مع دیباچہ مصنف کی سہ رنگی تصویر جو جرمن ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ نہایت نفیس جلد سنہرا کام۔ قیمت قسم اول ۱۲؍

معاہدۂ عمرانی ترجمہ از ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ) ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی (ہائیڈل برگ) اس کتاب میں سیاست مدن کے دقیق مسائل باتوں باتوں میں سمجھا دیئے ہیں اس کی یہ کتاب جو معنوی حیثیت سے فلسفۂ سیاست کی اہم کتاب ہے زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے سب سے سہل ہے۔ قیمت مجلد عہ

ترقی ادب ... [illegible] ... کے خطوط ... [illegible]

دنیا کی کہانی۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں ہزاروں برس کی تاریخ اس انداز سے لکھی ہے کہ پڑھنے والا بادشاہوں کی لڑائیاں اور تاریخوں کے گورکھ دھندوں میں پڑے بغیر وہ سب کچھ سمجھ جاتا ہے جو تاریخ کا اصل مفہوم ہے۔ لکھائی چھپائی وغیرہ عمدہ قیمت ۸؍

دیوان شیدا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ۔ یہ بھی دیوان غالب کی طرح نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہے اور بالکل ویسا ہی خوبصورت اور خوشنما ہے جیسا دیوان غالب۔ قیمت ۲؍

کلام جوہر حضرت مولانا محمد علی مرحوم کا مکمل مجموعۂ کلام جسے مولانا عبدالماجد دریابادی نے خاص کاوش سے مرتب فرمایا ہے پڑھیئے اور پاکیزہ مذاق کا لطف اٹھائیے قیمت صرف ۸؍

خیالستان۔ سید سجاد حیدر یلدرم۔ یہ مختصر مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اب تک اس کے گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور اب بارھواں ایڈیشن مکتبۂ جامعہ نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے قیمت مجلد ۸؍

تراجم اکابر ... [illegible] ...

یادگار پریم چند

مشہور رسالہ "زمانہ" کانپور

کا

"پریم چند نمبر"

جسمیں

منشی پریم چند کے پرانے دوستوں اور اردو کے بہترین انشا پردازوں اور شاعروں کے چونتیس مضامین نثر اور تیرہ نظمیں ہیں

منشی پریم چند کی زندگی اور ادبی کارناموں کا ایک جامع اور مکمل مرقع پیش کیا گیا ہے

منشی جی کی تصانیف کی فہرست، اُن کا عکس تحریر اور مختلف اوقات کی آٹھ ہاف ٹون تصاویر بھی ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں

حجم خالص مضامین ۲۵٦ صفحات
تصاویر و ٹائیٹل علاوہ

قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ عہ
محصول علاوہ

المشتہر

منیجر "زمانہ" کانپور

دفتر ہذا میں کئی سال کے پرانے فائل موجود ہیں زمانہ کے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ اڑتیس ۳۸ سال سے اردو زبان و ادب کی کس قدر انہماک اور سرگرمی سے خدمت کر رہا ہے اس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

زمانہ کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں خریداروں سے حسب ذیل رعایت کی جائے گی۔

(۱) تیرہ ۱۳ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے — ۳۲ روپیہ
(۲) چار سال کے خریدار سے فی فائل — تین روپیہ
(۳) ایک سال کے خریدار سے — عہ محصول علاوہ

نوٹ ۱۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہیئے۔ فائل ۱۹۲۰ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں۔ ۱۹۳۴ء میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے سے مل سکتے ہیں۔

منیجر "زمانہ" کانپور سے طلب فرمائیے

واردات

منشی پریم چند مرحوم کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ جو نہایت محدود تعداد میں شائع ہوا ہے شائقین جلد طلب فرمائیں، قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ زمانہ بک ایجنسی

زمانہ

جلد ۶۷ — اپریل ۱۹۴۱ء — نمبر ۴

اُردو ۔ ہندی ۔ ہندوستانی

(از نواب محمود علی خاں عرف آغا علی خاں رئیس الہ آباد)

زمانہ کے انقلابی دَور نے جہاں ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا کی وہاں ماحولی کشمکش بھی پیدا کردی ہے۔

پانی کے بہاؤ کو جب کسی مضبوط پتھریلے پشتے سے روک دیا جائے تو جب وہ پتھر سے ٹکرا کر واپس ہوتا ہے تو ردعمل کے ساتھ اندرونی کشمکش میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی حالت اس وقت ہندوستان کی دو بڑی قوموں کی ہوگئی ہے۔ سلطنت سے ٹکرانے کے بعد اندرونی کشمکش کا پیدا ہونا ایک فطری چیز بنی ہوئی اور اگر دیانتداری سے روکی نہ گئی تو اور بڑھتی جائیگی۔ اس مختصر مضمون میں میں صرف اُردو زبان کے مسئلہ پر ناظرین کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان کے اُردو رسالوں میں آج کل "اُردو ہندی اور ہندوستانی" پر مضامین نکل رہے ہیں اور ہر مضمون نگار اپنے نقطۂ نظر سے پوری قوت اپنی تائید میں صرف کر رہا ہے، مگر اس کی کوشش نہیں کی جاتی کہ جس منزل پر کوئی صورت بھی اختلاف کی پیدا ہوگئی ہو اس کو رفع کرنے کی سعی کی جائے۔ اس بحث کے چند مسائل ایسے ہیں جن میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، مثلاً اُردو دو بڑی قوموں کے میل جول [illegible] خیال کی وجہ سے ہندوستان میں پیدا ہوئی، یہیں اس کی نشو و نما [illegible] ترقی اور تربیت میں [illegible]

نہیں وابستہ بڑی حد تک ہندو صاحبان کا بھی ضرور ہے۔ متقدمین کے علاوہ اس وقت بھی باوجود ایک بہت بڑے طوفان کے منشی دیانراین صاحب نگم کی طرح بہت بڑی تعداد ہندو صاحبان کی اُردو کی خدمت کو اپنا ضروری فریضہ بنائے ہوئے ہے اور اُن پر کوئی اثر خلاف فطرت طوفان کا نہیں پڑا۔

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بالقابہ کا یہ ارشاد سنہرے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے کہ "اُردو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ متروکہ ہے جو ناقابل تقسیم بھی ہے۔" ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے الہ آباد کے یوم اُردو کے جلسے میں جو تقریر فرمائی ہے اُس میں بہت صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں کی تاریخ میں یہ ایک معجزہ سے کم نہیں ہے کہ اُردو نے ہندوستان میں بغیر سلطنت یا کسی قوت کی امداد کے خود ترقی کی ہے۔

مگر باوجود ان سب مسلمہ باتوں کے چند صاحب الرائے ہندو صاحبان کو اُردو ادب سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں، اس لئے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ آیا وہ شکایتیں صحیح ہیں یا محض وقتی جذبات سے متاثر ہو کر کی گئی ہیں۔

گاندھی جی کے علاوہ جنھوں نے اپنی لاعلمی سے اُردو کو قرآن کی زبان بھی فرمایا ہے۔ غور کرنے سے نیچے لکھی ہوئی تین شکایتیں ایسی ہیں جن پر بحث کرنا ہے:-

۱- اُردو کو ہندوستانی فطرت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے،

۲- اُردو ادب میں ہندو کلچر، تہذیب اور معاشرت نہیں ہے اور اگر ہے تو بہت کم۔

۳- بلا ضرورت عربی اور فارسی کے الفاظ اُردو میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔

پہلی شکایت چونکہ ایک ذمہ دار ہستی کے قلم سے نکلی ہے اس لئے اس کا لکھنا ضروری تھا، اور اگر وہ خود اپنی اس تحریر میں اس کی تفصیل نہ لکھ دیتے تو یہ سمجھا جاتا کہ انھوں نے وقتی جوش سے متاثر ہو کر خلاف فطرت یہ جملہ لکھ دیا ہے، مگر چونکہ تفصیل میں اُنھوں نے اس کی تشریح شکایت ۲-۳ کے رنگ میں کی ہے اس لئے اُصولاً ۱ اور ۲-۳ کی شکایتیں ایک ہی سمجھی جانا چاہئیں، کیونکہ جو واقعات اُوپر لکھے گئے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے (اُردو کو ہندوستانی فطرت سے لگاؤ نہیں ہے) کا قول (خود خلاف فطرت ہے)

میری رائے میں یہ شکایت ہندو صاحبان کی صحیح ہے، اور اُردو کے شعراء اور مصنفین کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اس طرف توجہ کرنی چاہیے، اور اس لئے بھی کہ بہترین شاعری اور ہر قسم

کے جذبات اور مناظر کی صحیح ترجمانی وہ ہے جو ماحول کو دیکھکر اور اُس سے متاثر ہو کر کی جائے، کیا کوئل کی مستانہ آوازیں یا جذبات کو اُبھارنے والی غم انگیز پپیہے کی فریادیں شاعر کو دعوتِ نظم نہیں دیتیں اسی طرح برسات کا موسم اور اس زمانے کے مناظر، یا ہمالیہ کے بعض حصے اتنی کشش نہیں رکھتے کہ ان کی طرف توجہ کی جائے۔ اسی طرح کرشن جی کا نغمۂ محبت یا ہندو مخدرات کی شوہر پرستی سے ایک بہترین درس نہیں ملتا ہے؟

یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب وزیر کشمیر نے کرشن جی پر ایک بہترین نظم لکھی ہے، اور اسی طرح سے اکثر مسلمان شعرا اس غلطی کا اعتراف کر رہے ہیں مگر مجموعی حیثیت سے ہم اس کمی کو پورا نہیں کر رہے ہیں جو فطرتاً اور انصافاً ہم کو کرنی چاہیئے۔

معاف کیا جائے اگر میں یہ عرض کروں کہ مسلمان شعرا اور مصنفین سے زیادہ ہندو شعرا اور مصنفین قابل الزام ہیں جنھوں نے ایسے فطری جذبات کو کیوں دبایا اور کس لئے اس طرف توجہ نہ کی جو ان کے لئے نہ محض ایک فطری چیز تھی بلکہ ایک فرض کی حیثیت بھی بعض چیزوں میں رکھتی تھی

تیسری شکایت میں یا تو غلط فہمی ہوئی ہے یا غلط فہمی پیدا کرائی گئی ہے۔ اُردو ادب کے جتنے فطری شاعر ہیں یا اچھے مصنف ہیں اُنھوں نے عربی کے الفاظ یا فارسی ترکیبیں کبھی بلا ضرورت استعمال نہیں کی ہیں، اور جن حضرات نے بلا ضرورت استعمال کی ہیں اُنھوں نے اُردو کی خدمت نہیں کی بلکہ اس کو نقصان پہونچایا ہے۔ ہم کو ایسے حضرات سے کوئی سروکار نہیں ہے، اور نہ اُن کی تصانیف نے کوئی خاص درجہ اُردو ادب میں حاصل کیا ہے۔ آپ خود غور فرمائیے کہ اُردو ایک لشکری زبان ہے، اس کے اجزا ترکیبی ایسے ہیں جس کی تعمیر مختلف زبانوں اور محاوروں سے ہوئی ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بلا وجہ اور بلا ضرورت عربی۔ فارسی۔ انگریزی اور سنسکرت کے ایسے الفاظ ٹھونسے جائیں جو نہ محض ثقیل ہوں بلکہ اُردو کی دلکشی اور شیرینیت کو ختم کر دیں، اور نہ ایسے الفاظ اُردو سے نکالے جائیں جن کا وجود نہ محض ضروری ہے بلکہ اُن کی ادبی صلاحیت اور موسیقیت اُردو کو بلند کرتی جاتی ہے۔ مثلاً انگریزی کے الفاظ اسٹیشن، کانگریس وغیرہ کو نکال کر اس کی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ خواہ کتنی ہی تلاش سے آپ رکھیں تو نہ محض اس کا صحیح مفہوم پیدا نہ ہوگا بلکہ ایک عجیب و غریب گمراہی میں آپ ہندوستان کو مبتلا کر دیں گے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ تھرمامیٹر کا ترجمہ آلہ مقیاس الحرارت کر دیں، مگر اس کا خیال رہے کہ اُردو ادب کے دائرہ کو کم کرنے کے علاوہ آپ کو اس سے مانوس کرنے کے لئے ایک نسل کی ضرورت ہوگی

فارسی اور عربی کے بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جن کو اُردو سے نکالنا اس کی دلکشی اور موسیقیت کو ختم کر دینا ہے۔

ہندوستان کے شیکسپیر جناب میر انیس صاحب مرحوم کے دو مصرعوں سے آپ میرا مفہوم اچھی طرح سے سمجھ لیں گے کہ باوجود اوس اور شبنم ہم معنی الفاظ ہونے کے جہاں شبنم کے لفظ کی ضرورت ہے وہاں اوس نظم کیا جائے تو نہ محض نظم کی موسیقیت ختم ہو جائیگی بلکہ یہ معلوم ہو گا کہ اس کے جسد میں ایک پھوڑا نکل آیا ہے۔

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

اسی طرح ہندی کے اکثر ایسے الفاظ ہیں جو فارسی اور عربی کے ہم معنی الفاظ سے زیادہ دلکش اور موسیقیت پیدا کرنے والے ہیں، مثلاً پریم، سندر، رس کی بوندیں وغیرہ۔ اُردو زبان کی خوبیوں میں اضافہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ایسے الفاظ کا اضافہ کیا جائے، جو کانوں اور آنکھوں کو بھلے معلوم ہوں۔ یا بحالت مجبوری کسی قسم کے سائینس یا فلسفہ کا ایسے الفاظ میں ترجمہ کیا جائے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں مستعمل نہیں ہیں مگر الفاظ ایسے ہوں جو ثقیل اور غیر مانوس نہ ہوں۔ اور ایسے الفاظ نکالنے چاہئیں جو ثقیل اور غیر مانوس ہوں، یہی ایک ایسا معیار ہے جسے شاعروں مصنفوں اور ترجمہ کرنے والوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

اسی کے ساتھ ساتھ میں بہت ادب سے ہندوستان کے سچے بہی خواہ اور منصف مزاج ہندو صاحبان سے یہ عرض کرونگا کہ اس زبان اور ادب کو محض ہندو مسلم اتحاد کا ایک خاص ذریعہ سمجھیں جو کہ ان کے بزرگوں نے صدہا برس کی محنت سے سرسبز و شاداب کیا ہے اور اپنے جواہر افکار سے اسکے خزانہ کو مالا مال کیا ہے اسلیے وہ اُن ہندو صاحبان کے ہاتھوں سے تباہ و برباد ہونے سے بچائیں جو وقتی جذبات سے مغلوب ہو چکے ہیں۔

ہر منصف مزاج شخص جب ٹھنڈے دل سے تاریخ کے اوراق اُلٹے گا تو دیکھے گا کہ مسلمان حکمرانوں نے اُردو کی حمایت کبھی نہیں کی، حکومت کی زبان فارسی تھی اور جو کچھ امداد ہوتی رہی وہ عربی اور فارسی کی ہوتی رہی۔ اُردو ماحولی ضرورت اور محض میل جول سے پیدا ہوئی ہے، اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں کی سچی محبت اور صحیح تربیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس میں غیر معمولی دلفریبی پیدا ہو گئی ہے۔

جو حضرات سیاسی ردعمل سے مغلوب ہو چکے ہیں وہ یہ نہیں خیال فرماتے کہ اس زبان کو تمام ہندوستانی آبادی کے منہ اور زبان میں زبردستی ٹھونسنا جو بقول آنریبل مسٹر جسٹس تیج نرائن ملّا کے لوہے کے چنے ہیں خلاف فطرت ہے بلکہ نامناسب بھی ہے۔ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندو صاحبان دیوبانی زبان میں کسی اپنے ہمسایہ بھائی سے بات چیت کریں تو وہ رستم اور اسفندیار کی زبان میں جواب دے۔ ایسی حالت میں ہندوستانی زندگی اور اس کے کاروبار میں جو ابتری پیدا ہوگی وہ ظاہر ہے یہ ممکن ہے کہ جیسے ہندوستان کا ایک جاہل قلی جب لندن یا پیرس جاتا ہے تو اشاروں سے یا ٹوٹی پھوٹی انگریزی یا فرانسیسی زبان میں ڈبل روٹی اور مکھن تو مانگ لیتا ہے مگر اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا، ویسی ہی ہندوستان کی حالت ہو جائے گی کہ یہاں کے کاروبار سیاست تہذیب اور شائستگی میں بجائے ہم آہنگی کے مشکلات اور اختلافات کا اضافہ ہوتا جائیگا اور یہ بات ہندوستان کے سچے بہی خواہوں کے لئے ناقابل برداشت ہو جائیگی۔

یہ ممکن ہے کہ میری رائے سے بعض حضرات اتفاق نہ کریں مگر میری اتنی استدعا ضرور ہے کہ اسی اسپرٹ میں ان مسائل پر مضامین لکھے جائیں جن میں کہ میں نے لکھا ہے۔

انسان کی کم مائیگی

انسان گردوپیش کی دنیا میں ایک ناچیز مخلوق ہے، یہ زمین جس پر وہ سکونت پذیر ہے ایک بہت بڑا کرہ ہے جس کا محیط تقریباً ۲۵ ہزار میل ہے مگر پھر بھی اس آفتاب سے جو ہمیں روشنی دیتا ہے کہیں چھوٹا ہے۔ آفتاب حجامت کے اعتبار سے زمین سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے۔ مگر ہمارا یہ عظیم الشان آفتاب بھی ایک چھوٹے سے نقطے یا کائنات کے اتھاہ سمندر میں ایک قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کھرب ستارے ایسے ہیں جو بجائے خود آفتاب ہیں۔ ان میں سے کچھ ہمارے آفتاب سے چھوٹے اور کچھ اس سے کئی گنا بڑے ہیں۔ ان ہی سے ہمارا کہکشانی نظام بنتا ہے جس کی حدبندی کہکشاں کرتی ہے۔ روشنی کو ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سکنڈ کی زبردست رفتار سے آفتاب سے چلکر زمین تک پہونچنے میں ۸ منٹ لگتے ہیں لیکن قریب ترین ستارے بھی اتنے دور ہیں کہ ان سے روشنی کو زمین تک پہنچنے میں چند منٹ، چند گھنٹے، چند دن، چند ہفتے یا مہینے نہیں بلکہ سوا چار سال اور بعض حالتوں میں تو اس سے بھی زیادہ عرصہ لگتا ہے یہ تو قریب ترین ستاروں کا ذکر ہے۔ کہکشاں کا قطر اتنا بڑا ہے کہ روشنی کو باوجود اس شدید تیز رفتاری کے اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچنے میں دو لاکھ ہزار سال لگ جاتے ہیں اور ہمارے اس عظیم الشان کہکشانی نظام کے اس طرح کروڑوں اور کہکشانی نظام ہیں جو کوہ دکسن کی ۱۰۰ انچ قطر کی دوربین کی مدد سے مشاہدے میں آئے ہیں۔ ان سحابیوں کا فاصلہ ناقابل تصور ہے۔ انہیں سے بعض دور دراز سحابیوں سے روشنی کو باوجود اتنا تیز رفتار ہونے کے زمین تک پہونچنے کیلئے چوبیس کروڑ سال چاہیے

سرشاہ سلیمان مرحوم

پیرِ مغاں سے ایک سوال

(از منشی تلوک چند محروم بی۔ اے)

کل میکدے میں پوچھا پیرِ مغاں سے میں نے
بت خانہ اور مسجد نزدیک ہے یہاں سے

گلبانگ میکشوں کی، رندوں کا شور و غوغا
ہے گونجتا فضا میں ٹکرا کے آسماں سے

مسجد کے سجدہ آرا، بت خانہ کے پجاری
ہوتے نہیں ہیں برہم غوغائے آسماں سے

ہو جاتے ہیں پہ لیکن باہم چھری کٹاری
ناقوس کی صدا سے آوازۂ اذاں سے

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"
یہ خود سُنا ہے میں نے اقبالِ خوش بیاں سے

یہ لوگ اِس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں
یہ سہو ہو گئی ہے فطرت کے ترجماں سے

روداد سُن کے میری وہ پیر مرد بولا
آئینِ وعظ و حکمت ہے دور اِس مکاں سے

کہتا ہوں تجھ سے لیکن رندوں کا ایک نکتہ
جو سربسر ہے عاری آرائشِ بیاں سے

دل میں ہو یا عمل میں ایماں ہے امنِ عالم
یکسر فساد، اگر ہو ظاہر فقط زباں سے

شاعرانہ شکریہ

پچھلے دسمبر میں محروم صاحب کے صاحبزادہ حضرت آزاد کی شادی کے موقع پر ملک کے کئی نامور شاعروں نے سہرے لکھکر ہمارے محترم دوست[1] کی خدمت میں بھیجے تو انھوں نے ان دوستوں کے لطف کے شکریہ میں ذیل کے اشعار لکھے۔

افقر نے سخن کو منور کیا
کہ بزمِ سخن کو منور دیا

کیا جوش نے شاعری کو بلند
کہ بخشا اُسے عرش سا ارجمند

ہے آزاد محروم کی یادگار
جو ہے شاعری کے چمن کی بہار

خدا اُن پہ برسائے رحمت کا مینہ
یہ برسائیں حسنِ طبیعت کا مینہ

[1] والد گرامی حضرت منور لکھنوی

میر کا کلام[1]

(۴)

(میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

مطبوعہ کلیات میر میں کتابت کی ہزارہا غلطیاں ہیں۔ ہمارے مکرم و نامور دوست میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی نے ان غلطیوں کی جو تصحیح کی ہے وہ کسی نسخے کو سامنے رکھکر نہیں کی گئی ہے بلکہ موصوف نے محض اپنے ذوق سلیم کی رہنمائی سے اور میر کے انداز سخن کو ملحوظ رکھکر مطبوعہ اشعار کو صحیح پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ (ا-ز)

ایک کہتا ہوں میں تو منہ پہ رقیب ۔ تیری لستی سے سو ستاتے ہیں
(پشتی — سُناتے)

نوٹ: پشتی بمعنی حمایت ۔ پُر چک

آتا ہے دل میں چال بد اپنا بھلا کہوں ۔ پھر آپ آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں
(حال بد)

یری سمجھے تجھے وہم و گماں سے ۔ کہاں تک اور ہم اب دل جلاویں
(پری — دل جلاویں)

پھرے ہے شیخ مجلس ہی میں قصاں ۔ ادھر آ نکلے تو ہم بھی نچاویں
(نچاویں)

نظر اے ابر ابمت آ بہاوا ۔ کہیں میری بھی آنکھیں ڈبڈباویں
(مبادا)

قدم بوسی تلک مختار ہیں غیر ۔ زیادہ لگ چلیں تو سر میں کھاویں
(جوتی)

مثال سایہ محبت میں چال اپنا ہوں ۔ تمھارے ساتھ گرفتار حال اپنا ہوں
(مثال سایہ — پامال)

یہ بے قراریاں نہ کبھو اُن نے دیکھیاں ۔ جانکاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں
(دیکھیاں)

او ریہ خرام ناز سے خوباں کے ہنستیں ۔ ٹھوکر سے یہ اُٹھاتے ہیں آفات کے تئیں
(زمین)

خرکے بے سلوک ہم اب تیری دیکھکر ۔ کرتے ہیں یاد پچھلی ملاقات کے تئیں
(آخر کے سلوک — تیرے)

چونیہ دیا گئی جاری گلشن میں ایک مدت ۔ سایہ میں ہر شجر کے ہم روز رو چلے ہیں
(سوکھ گئی — جس شجر کے)

پچھتا لگئے نہ کیونکر جی اس طرح سے دیکر ۔ یہ گوہر گرامی ہم مفت کھو چلے ہیں
(پچھتائیے)

---

[1] اس سلسلہ کے پہلے مضامین زمانہ بابت جون جولائی و دسمبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ (ا-ز)

شکوہ کروں ہولی بخت کا آئنے نہ ہو غضب تباں
مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں

بس فقط ہے سادگی تم پہ بلائے جاں ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں

کوئی تو زمزمہ کرے میرؔ آسا دل خراش
یوں تو قفس میں اور گرفتار ہیں بہت

مسجد سے میکدے پہ کاش ابر روز برسے
واں رو سفیدیاں ہیں یاں روسیاہیاں ہیں

جسکی نظر پڑے ہیں اون نے مجھے بھی دیکھا
جب سے وہ شوخ آنکھیں میں نے سراہیاں ہیں

جہاں کی مضطلی میں مست طالع ہیں نظر آتے
نہ تھا اس دور میں آیا جسے ہشیار کہتے ہیں

معاذ اللہ دخل کفر ہوا اسلام میں کیوں ہے
غلط اور پوچ نامعقول بعضے یار کہتے ہیں

سمجھا تنگ نہ اپنی تو سود و زیاں کو میں
مانا کیا خدا کی طرح ان بتاں کو میں

ان لوگوں کو تو گرد نہ پھر سب ہیں لباسی
سو گز بھی جو یہ پھاڑیں تو اک گز بھی نہ ڈاریں

نوٹ:۔ یہ لوگ لباسی ہیں یعنی دیکھنے کے امیر ہیں۔ دل کے ایسے کنجوس ہیں کہ سو گز بھی اتاریں تو ایک گز نہ واریں۔ خیرات نہ کریں۔

ناچار ہو رخصت جو منگا بھیجے تو بولا
میں کیا کروں جو میرؔ جی جاتے ہیں سدھاریں

برا کہنا بھی میرا خوش نہ آتا اوس کو تو ورنہ
تسلی دل ناشاد ہوتا ایک گالی میں

مرے استاد کو فردوس میں اعلیٰ ہے جا گہ
پڑھایا کچھ نہ غیر از عشق مجھکو خرد سالی میں

یہ غلط کہ میں چاہوں قدح شراب تجھ بن
نہ گلے سے میرے اترا کبھو قطرہ آب تجھ بن

نہیں چلتے جی تو ممکن ہمیں تجھ بغیر سونا
مگر آنکھ مر کے کیجئے تو خاک خواب تجھ بن

تکلیف باغ کنی کی تجھ خوش دہاں کے تئیں
دیتا ہے آگ رنگ ترا گلستاں کے تئیں

مرے ہو چکے خشک مژگاں کے سب
لہو اب جگر میں مگر کچھ نہیں

فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیر بیاباں کو
نکال سر سے میرے جائے مو خار مغیلاں کو

بہائے سہل پر دیتے ہیں کس محبوب کو کف سے
قلم اس جرم پر کرتا ہے دست گلفروشاں کو

چاہوں تو بھر کے کولی اٹھا لوں ابھی تمھیں
کیسے ہی بھاری ہو مرے آگے تو پھول ہو

نوٹ:۔ کولے میں بھر لینا یعنی گود میں اٹھا لینا

سرمہ جو نور بخشے ہے آنکھوں کی خلق کی
شاید کی راہِ یار کی ہے خال وھول ہو
شاید کہ راہِ یار کی ہے خاک وھول ہو

دل لے کے لونڈے دلی کی کب کا پچا گئے
دل لے کے لونڈے دلی کے کب کا پچا گئے
اب ان سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

شوق ہی شوق ہے نہیں معلوم
اوسے کیا دل نہاد ہے ہم کو
اوس سے

برد نہ اتنی بھی کی سحنت ناموافق نے
بحت
کہ مدعی سے اوسے ایک دن لڑائی ہو
کہ اوس سے مدعی سے

مزے کو عشق کی ذلت کے جانتا ہے وہی
کسی کی جتنی کھبولات مُکّی کھائی ہو
حسیں نے

گر سایہ لے گرا تو دلِ مضطرب کو میر
ساتھ
آرام کر چکا ترے مشتِ غبار کو
آ چکا

ہے فراق ہی میں خیر، نہ کر آرزوئے وصل
مل بیٹھے جو اسے تو شکوہ دراز ہو
مل بیٹھے جو اس سے

دامن کشاں ہے جاگہ طپش پہ طپش ہے دفن
دامن کشاں ہی جاکہ
زنہار کوئی صدمہ سے زیر و زبر نہ ہو

حیران ہیں کہ ایسی یہ مشہد ہے کون سی
مجھ سے خراب حال کہ جس کو خبر نہ ہو

ہم سے تم کو ضد سی پڑی ہے خواہ نخواہ رُلاتے ہو
آنکھ اُٹھا کر جب دیکھے ہیں اور دن میں ہنستے جاتے ہو
آنکھ اُٹھا کر جب دیکھو ہو اور بھی ہنستے جاتے ہو

بکھری رہی ہیں منھ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
بکھر رہی ہیں
کیونکہ چھپے بیخوابی امشب جب ایسی رات کے ماتے ہو
کیونکہ چھپے بے خوابی شب جب ایسے رات کے ماتے ہو

سرو تہ و بالا ہوتا ہے درہم و برہم شاخ گل
تار سے قد کش ہوکے چمن پہ ایک بلا تم لاتے ہو
ناز سے

راحت پہونچی تک تم سے تو رنج اُٹھا یار و تک
راحت پہونچی تک
دیر تلک
سر سہلاتے ہو جو کبھو تو بھیجا بھی کھا جاتے ہو

جن نے تم کو نہ دیکھا ہووے اُسے آنکھیں مار دم
اوس کے
ایک نگاہ مفیتن کر تم سو فتنے اُٹھاتے ہو
مفتن سو سو فتنے

ہوکے گدائے کوئے محبت روز صدا یہ نکالی ہے
زرور
اب تو میر جی راتوں کو تم ہر در پہ چلاتے ہو

عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب
کرے تدبیر جو درد دوا رکھتا ہو
کرے تدبیر جو یہ درد

اسے تشبیہ تو دیتے ہیں یہ شاعر لیک
اس سے تشبیہ تو دیتے ہیں یہ شاعر لیکن
سبب کچھ اوس ذقن آگے جو مزار رکھتا ہو
سبب

مت پوچھ کچھ اپنی باتیں کہیئے تو تم کو ندامت ہو
مت پوچھو
قد قامت یہ کچھ ہے تمھارا لیکن قہر قیامت ہو
یہ کچھ ہے

ربط اخلاص اے دیدۂ دل بھی دنیا میں ہوتا ہے ایک ہی
ربط اخلاص اسے دیدہ و دل دنیا میں ایک ہی ہوتا ہے
لگ پڑتی ہے جیسے تیسے تم بھی کوئی ملامت ہو
لگ پڑے ہو جیس سے تیس سے تم بھی کوئی بلا لت ہو

چاہ کا دعویٰ سب کرتے ہیں ملیے کیونکر بے آثار　　　اشک کی سرخی زردی منہ کی عشق کی کچھ علامت ہو
مانیے　　　کچھ تو

مل بیٹھیے اوس نالے کے سی کوئی گھڑی جو زاہد تو　　　جتنے بال ہیں سارے سر میں ویسی ہی اسکی حجامت ہو
مل بیٹھے اوس نالہ کش سے　　　جتنے بال ہیں تیرے سر میں ویسی ہی تیری حجامت ہو

کس مدت سے دوری میں ہیں تیری خاک رہ سے برابر ہوں　　　کریئے رنجہ قدم تک مجھ تک جو کچھ پاس قدامت ہو
ٹک

منہ اوس کے تیغ ستم کی سیدھا جانا ٹھہرا ہے　　　جینا پھر کچھ دار و مدار اس طور میں ہو یا مت ہو
منہ پر اوس کی تیغ ستم کے

شیخ جی آؤ مصلے گرو جام کرو　　　جنس تقویٰ کے تئیں صرف مئے جام کرو
گرو دام کرو　　　مے و جام کرو

مقصود درد دل ہے نہ اسلام ہے نہ کفر　　　پھر ہو گلی میں سبحہ و زنار کیوں نہ ہو
پھر ہر گلے میں

زیادہ حد سے تھی تابوت میر پر کثرت　　　ہوا نہ وقت مساعد یہ تاز کرنے کو
نماز

دل خراشی و جگر چاکی و سینہ کاوی　　　اپنے ناحق میں ہیں سب اور ہنر مت پوچھو
ناخنوں میں مرے کیا کیا ہیں ہنر مت پوچھو

جوں توں حال دل ایک بار تو میں عرض کیا　　　میر صاحب جی بس اب بار دگر مت پوچھو
جوں توں کچھ　اک بار

دل ہی سارے تھی یہ اک وقت میں جو کر گداز　　　شکل شیشہ کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ
دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کر کے گداز

مرجاؤ کوئی پروا نہیں ہے　　　کہتا ہے مغرور اللہ اللہ
کتنا ہے

کہتے ہیں تو اوس کے منہ لگے گا　　　یوں ہی یارب جو ہے یہ افواہ
یوں ہی ہو

ہے ماسوا کیا جو میر کہیے　　　آگاہ ساری اسے ہیں آگاہ
آگاہ سارے اس سے ہیں آگاہ

دلی میں اکی آکر اون یاروں کو نہ دیکھا　　　کچھ دیکھیے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے
کچھ وے گئے

قامت خمیدہ اوسکی جیسی کمال تھی لیکن　　　قربان گہ وفا میں مانند تیر آئے
قامت خمیدہ اوس کے جیسے کماں تھے لیکن

نوٹ: یہ اوس کے عاشقان خمیدہ قامت اگرچہ کمان کی طرح جھکے ہوئے تھے مگر قربان گاہ وفا میں جب آئے تو تیر کی طرح سیدھے ۔ یہ اشارہ ہے امام حسین کے اک عاشق جاں باز حضرت حبیب ابن مظاہر کی طرف جو بہت ضعیف ہو چکے تھے مگر میدان کربلا میں جب نبرد آزما ہوئے تو جوانوں کی طرح سینہ تانے

صورتگر ازل کا کیا ہاتھ تھا کہے تو　　　کھنچے وہ تیغ ابرو فولاد کے قلم سے
کھنچی

کڑھیے نہ روئیے تو اوقات کیونکہ گزرے　　　رہتا ہے مشغلہ سا بار غم و الم سے
بارے

بات احتیاط سے کر ضائع نہ کر نفس کو گئی دل ہے مانند شیشہ دم سے

بالیدگی دل سے

دل درد ہو میر صاحب اوس بدمعاش کو تم خاطر تو جمع کرو ٹک تول سے قسم سے

دل دو ہو

ہدف اُس کا ہوئی مدت ہوئی سینے کو پر ابتک گھٹا نکلے ہے لخت دل مرا تیروں کے بھالوں سے

ہوئے گتھا نکلے ہے تیروں کی بھالوں سے

نوٹ:- سینے کو اوسکا ہدف ہوئے مدت ہو چکی مگر ابتک میرا لخت دل اوس کے تیروں کی بھالوں سے گتھا ہوا نکلتا ہے۔

ہوا پیرانہ سر عاشق ہوا زاہد مضحکہ سب کا کہن سالی میں ملتا ہے کوئی بھی خرد سالوں سے

ہو

نوٹ:- ہو یعنی ہوکر- پیرانہ سری میں عاشق ہوکر زاہد مضحکہ بن گیا۔

دی میگسار ظرف جنھیں خم کشتی کی تھی پھر کر نگاہ تو نے جو کی وہ ہیں جھک گئے

دے میگسار ظرف جنھیں خم کشتی کا تھا پھر کر نگاہ تو نے جو کی وہ ل ہی جھک گئے

تو ہے کس نا جیئے سے اے دیار عشق کیا جانوں ترے باشندگاں ہم کاش سارے بے وفا ہوتے

ناحیہ جائیں

سرمایۂ صداقت دیدار کی خواہش ہے دل کی تو سمجھ لیجیے گر چشم کہا مانے

سرمایۂ صد آفت

ایسی تقریب اوس گلی میں ہے منتیں ہیں شکستہ پائی کی

اسی رہے

لے ہی جاتی ہے زر گل کو اُڑا صبح کے بھی باد ہادی چور ہے

صبح کی بھی باد بادی چور ہے

دل کھچے جاتے ہیں سارے اُس طرف کیوں کی کہنے حق ہمارے اُور ہے

کیونکر کہیے حق ہماری اُو۔ ہے

کل میر نے کیا کیا کی مے کے لئے بیتابی آخر کو گرو رکھا سجادۂ صحرائی

سجادۂ محرابی

جاگا ہے کہیں وہ بھی شب مرتکب ہے ہو یہ بات سجھاتی ہے اون آنکھوں کی بیخوابی

مرتکب نے ہو سُجھاتی ہے

ماہ وشاں کل جو انکو ٹھونیہ جلوں میں ہے خاک سے آج اونکی ہر صحن میں مہتابی

تھے ماہ وشاں کل جو ان کوٹھوں پہ چلن میں

(باقی)

سماج کا شکار

(پنڈت آنند نراین مُلّا، ایم۔اے، ایل ایل۔بی)

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں ؟

اِک سال سے ہر روز وہ مزدور کا بیٹا
آتا تھا اِدھر، شام ہو دن ہو کہ سویرا
دو روز سے لیکن اُسے میں نے نہیں دیکھا
معلوم نہیں اس کو یکایک یہ ہوا کیا ؟

اب تک اُسے آنے سے کبھی روک نہ پائے
تپتی ہوئی گرمی کے برستے ہوئے شعلے
سردی کی ہواؤں کے وہ اڑتے ہوئے تیرے
برسات کی جھڑیاں ہی نہ بجلی ہی نہ اولے
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں ؟

دروازے سے کچھ دور جو اُس پار گلی کے
اِک پیڑ ہے پیپل کا اُسی پیڑ کے نیچے
میں نے تو ہمیشہ اُسے پایا یہیں بیٹھے
کچھ چپ سا کچھ آزردہ سا کھویا ہوا جیسے

جی کی نہ کبھی اُس نے کسی کو بھی بتائی
سب چھوٹے بڑے اُسکو سمجھتے رہے خبطی
مانی نہ بُری اُس نے کوئی بات بھی کڑوی
سب ہنستے تھے جب اس پہ تو ہنس دیتا تھا وہ بھی
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں ؟

دن آیا تھا پرسوں جو مری سالگرہ کا
معلوم نہیں کس نے اُسے جا کے بتایا
جاتی تھی شوالے کو میں جب کرنے کو پوجا
اُس نے مجھے لاکر دیا اِک پھولوں کا مالا

میں بڑھ گئی جلدی سے لیا میں نے نہ مالا
کچھ اُس نے کہا اور نہ کچھ میں نے ہی پوچھا
مجھکو یہ گوارا نہ تھا شاید وہ یہ سمجھا
پلٹی تو مجھے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں ؟

دربان نے کیا جانئے کیا دُور سے دیکھا
اور جا کے پتا جی سے نہ معلوم کہا کیا ؟
غصے میں گئے، منھ پہ جو آیا وہ سنایا
چُپ چاپ وہ سُنتا رہا کچھ منھ سے نہ بولا

کی میں نے شکایت، کہیں وہ یہ تو نہ سمجھا
خود اُس نے کوئی عذر کیا اور نہ شکوہ
پرنام پتا جی کو کیا اور سدھارا
اور جب کا گیا پھر وہ پلٹ ہی کے نہ آیا

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں ؟

کیا دے گئی دھوکا اُسے سچ مچ یہ رُکھائی
نادان تھا کیسا کہ نہ سمجھا میرے جی کی
یہ شرم بھی جھوٹی ہے یہ تہذیب بھی جھوٹی
اے کاش کہ ہوتی نہ مہاجن کی میں بیٹی

جنگل میں دبائے ہے یہ خونخوار سماج آج
قیدی ہے بشر اور ہے دیوار سماج آج
قربانی کی ہم بھیڑیں ہیں تلوار سماج آج

جینے نہیں دیتی ہے یہ مُردار سماج آج
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں؟

اک بار وہ پھر آئے تو کیا کیا نہ کروں گی
سچ کہتی ہوں دنیا کی میں پروا نہ کروں گی
رسوا ہوں تو ہوں شوق کو رُسوا نہ کروں گی
کھاتی ہوں قسم اب کبھی ایسا نہ کروں گی

جاں ہوتی ہے پیاری مجھے اِس کا تو یقیں ہے
دنیا بھی جوانی کی نگاہوں میں حسیں ہے
لیکن وہ جہاں رہتا تھا روتا یہ وہیں ہے
جو دل میں مرے شک ہے کہیں سچ تو نہیں ہے
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں؟

غزل

(پنڈت انند نراین مُلا۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

ارماں کو چھپانے سے مصیبت میں ہے جاں اور
شعلے کو دباتے ہیں تو اُٹھتا ہے دُھواں اور

اس رنج کی دنیا میں بنانا ہے جہاں اور
ساقی ارے ساقی مرے اِک رطلِ گراں اور

خود تو نے بڑھائی ہے یہ تفریقِ جہاں اور
تو ایک، مگر رُوپ یہاں اور وہاں اور

کیسی یہ غلط ربطیِ دنیائے محبت
چاہو جسے جتنا ہی بنے دشمنِ جاں اور

اتنا بھی مرے عہدِ وفا پر نہ کرو شک
ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں کہ ہے رسمِ جہاں اور

دل میں کوئی غنچہ کبھی کِھلتے نہیں دیکھا
اس باغ میں کیا آکے بنے گی خزاں اور

کچھ دُور پہ ملتی ہیں حدیں ارض و سما کی
صحرائے طلب میں نہیں منزل کا نشاں اور

اب کوئی صدا میری صدا پر نہیں دیتا
آوازِ طرب اور تھی آوازِ فغاں اور

اک آہ اور اِک اشک پہ ہے قصۂ دل ختم
رکھتی نہیں الفاظ محبت کی زباں اور

مُلّاؔ وہی تم، اور وہی اب تک سرِ الفت
جیسے کبھی دنیا میں نہ تھا کوئی جواں اور

میری شاعری اور تنقیدِ حیات کی کوشش

(از مسٹر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔اے)

زندگی کی ضرورتیں اتنی اہم ہیں، اور بسا اوقات شعر و شاعری سے اتنی غیر متعلق معلوم ہوتی ہیں کہ ایک ادیب جو نرا ادیب نہیں ہے، کبھی کبھی ادب پرستی کی دلفریبیوں سے ڈر جاتا ہے۔ ایک بار روس کے لوگوں میں لینن نے مشہور جرمن موسیقی کار بیتھوون کی ایک ترتیب نغمات (Symphony) سن کر اپنے کو وجد کرتے ہوئے پایا تو چونک کر بول اٹھا کہ موجودہ زمانہ سر ہلانے کا نہیں بلکہ سر توڑنے بھی سرکوبی کا ہے۔ فنون لطیفہ کے ضرورت سے ذرا زیادہ لطیف ہوجانے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے، مشہور جرمن مفکر اور شاعر گیٹے نے اسی حقیقت سے متاثر ہوکر کہا تھا کہ کلاسیکیت (یعنی واقعیت اور عقلیت) صحت ہے اور رومانیت بیماری۔ اردو غزل گوئی کی تاریخ میں میر کا بلند ترین مرتبہ مسلم ہے لیکن اگر صحت بخش خارجیت اور واقعیت ایک حد تک لکھنؤ کی غزل گوئی کے عناصر نہ ہوتے تو زندگی کے متعلق آتش کے سات آٹھ سو جواہر پارے ہمیں کہاں نصیب ہوتے۔ لیلیٰ، شیریں، یوسف، اور ایاز کس قسم کے معشوق تھے، اس کے متعلق ہماری آپ کی جو رائے ہو لیکن مجنوں کا جو تصور ہمارے ذہنوں میں ایک زندہ روایت کی حیثیت سے محفوظ ہے وہ کہاں تک صحیح، صحت بخش اور متوازن ہے۔ کیا اس کا تصور انتہا پسندی اور بے اعتدالی کے عیب سے معرّا ہے؟ کیا بہترین عاشق کی آزمائشوں، اور ایثار اور صحیح عشقیہ زندگی کی وہی تصویر ہے جو مجنوں کا نام آتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے؟ انتہا پسندی میں مجنوں سے بھی آگے بڑھ جانے کا جو دعویٰ اس مصرع

"مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا"

میں کیا گیا ہے، وہ کہاں تک عشق کے سچے معیار کا ترجمان ہوسکتا ہے؟ یہ سوال قابل غور ہے۔ کیا واقعی شدتِ عشق کی اس شکل کے علاوہ جو مجنوں کے تصور سے پیدا ہوتی ہے تیز اور شدید عشق کا ہم تصور ہی نہیں کرسکتے؟ کیا توازن اور اعتدال کمزوری کے مرادف ہیں؟ اگر ادب کا زندگی کے اہم سوالات سے تعلق ہے تو ہمیں شاعری سے عشق مجازی (عشقِ حقیقی بھی در اصل عشق

مجازی ہی کا نام ہے) کو مٹانا تو نہ ہوگا کیونکہ زندگی میں عشق یعنی شدید مگر لطیف شہوانی محرکات کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن عشقیہ محرکات اور تصورات اور ان کے وجدانی اور جمالیاتی کیفیات میں انقلاب کی ضرورت ہے۔ اب تک عموماً عشق کا جو تصور ہمارے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے اور جو عشقیہ شاعری یہ دونوں ابتک مرغوب مقبول ہے نئی تہذیب اور نئی زندگی میں یعنی آنے والے جگ میں بہت کچھ بدل جائیں گے۔ عشقیہ زندگی اور عشقیہ شاعری نئی طرح سنواری اور نکھاری جائیں گی حسن کی فطرت اور حسن کے کردار کا بدل جانا بھی یقینی ہے۔ ہر شخص کو آزاد ہونے دیجئے، دولت کی پیداوار اور تقسیم پر مرد و عورت سب کا برابر حق ہونے دیجئے، پھر حسن اور عشق کی دنیا نہ بدل جائے تو کہیئے گا۔

میری غزل گوئی بھی عام اُردو غزل گوئی کی طرح ایک معنی میں غیر متوازن ضرور ہے میری زندگی میں عشق کا عنصر انتہائی اور بے اعتدلانہ طور پر تیز رہا ہے یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں شہوانی اور رومانی محرکات کو بہت زیادہ جگہ ملی ہے۔ انھیں محرکات کے بننے بگڑنے میں ساری عمر کٹ گئی

لطف و ستم، وفا جفا، یاس و امید، قرب بُعد عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں

لیکن جب زندگی اور عشقیہ شاعری کی اس کشاکش سے چونکا ہوں تو اپنے وجدان کی بچی ہوئی طاقت کو حیات اور کائنات کے مسائل پر روشنی ڈالنے میں صرف کرتا رہا۔ ان غیر عشقیہ اشعار میں کچھ اشعار آج پیش کر رہا ہوں۔ ہر شعر کے نیچے کچھ نثر کی عبارت بھی آپ کو ملے گی جن سے ان اشعار کی شان نزول اور ان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑے گی۔ میں نے ان اشعار میں نہ رسمی اور روایتی اخلاقیات کے فرسودہ افسانے دہرائے ہیں اور نہ بادہ و ساغر، ہوش و مستی اور عقل و جنون کو رسمی اور روایتی تصوف و عرفانیات کے سہارے درک اور عمل کے لئے کشف و کرامات کا ذریعہ بنایا ہے۔ میرے یہاں آپ کو رسمی فلسفہ نہ ملے گا۔ یہ اشعار ادراک اور استدلال کی انفرادی کوشش کے نتائج ہیں۔ البتہ میں نے کئی ایسے مفکروں اور مصنفوں کے بیانات کو اپنے ذاتی احساسات کی آواز باز گشت پایا۔ جن کے خیالات اُردو شاعری کے لئے نئے ہیں، اس لئے میرے بعض اشعار میں آپ کو ان خیالات کا عکس ملے گا۔ دنیا اور زندگی کو یا ان کے بعض پہلوؤں کو اپنے طور پر دماغی کاوش سے سمجھکر نتائج مرتب کرنا اور اپنی کائنات خیال کو واقعیت اصلیت اور عقلیت کے مطابق تعمیر کرنا اپنے اور سماج دونوں کے لئے کارآمد ہے۔ اُردو کے اکثر شعراء حسن اور عشق کے متعلق فلسفیانہ باتیں کہنے میں واقعیت اصلیت کا سر رشتہ چھوڑ دیتے ہیں، مگر اُردو غزل کو نئے

فلسفۂ حیات و کائنات کے ساتھ ساتھ نئے فلسفۂ حسن و عشق کی بھی ضرورت ہے۔ میں نے ان اشعار میں حسن و عشق کے متعلق اپنے نظریئے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ عام طور پر دنیا اور زندگی پر حکم لگایا ہے۔

میری شاعری کی عمر پچیس برس کی ہے، لیکن ادھر تین چار سال سے کسی حد تک ماضی کا بوجھ اپنی زندگی اور شاعری سے ہلکا کرنا بھی میرا کام رہا ہے۔ عشقیہ شاعری ابھی تک چھوڑی نہیں ہے، لیکن عشقیہ احساسات و محرکات کو گہرائی اور وسعت دیتے اور دنیا میں ان کی صحیح جگہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ انگریزی شاعر و نقاد میتھیو آرنلڈ نے شاعری کا مقصد تنقیدِ حیات بتایا ہے۔ اس تنقیدِ حیات سے اس کا مطلب زندگی کی وہ ترجمانی ہے جس سے درکِ عمل اور جذبات سب کو رچایا اور سنوارا جا سکتا ہے چیزوں کی صحیح قدر و قیمت کا احساس ہو سکتا ہے اور فنونِ لطیفہ زندگی کے معاون بن سکتے ہیں۔

عشقیہ شاعری بھی تنقیدِ حیات کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ محض معاملہ بندی یا اظہارِ خواہشات اور جذبات کی عکاسی تک محدود نہ ہو۔ میں نے عشقیہ اشعار میں تنقیدِ حیات کی جو کوششیں کی ہیں انھیں بھی کبھی ناظرینِ "زمانہ" کے سامنے پیش کروں گا۔ آج حسن و عشق کے کبھی ختم نہ ہونے والے افسانے کو چھوڑ کر براہِ راست حیات و کائنات پر اپنے غور و فکر کے نتیجے پیش کر رہا ہوں۔ ابتدا ہی سے شعراءِ اُردو غزل میں حسن و عشق کے مضامین کے علاوہ حیات و کائنات کے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتے رہے ہیں۔ لیکن عموماً ان کی آوازیں کچھ فرار[1] اور بے بسی پیدا کرنے والی بے نیازی کی آوازیں تھیں یا فرسودہ تصوف یا مجہولیت یا تلاشِ سکون کی آوازیں تھیں۔ میں نے ان کی آوازوں کی یہ عام خصوصیت بتلائی ہے، ورنہ کبھی کبھی اور کہیں کہیں ہمارے شعراء حقائق اور واقعیت سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔ کائنات سے ہم آہنگی یا مخالف قوتوں کے مقابلے کا خیال ان کے تصور میں نہ تھا۔ کائنات کا تصور بھی ان کے لئے ایک نہ بدلنے والا تصور تھا۔ فلسفۂ ارتقا اور فلسفۂ تاریخ سے یا تو وہ واقف ہی نہ تھے یا انھیں اس کا بہت ہی کمزور اور غیر مکمل احساس تھا۔ ادراک کی اہمیت وہ سمجھتے تھے لیکن چونکہ وہ حیات و کائنات کو ساکن اور ناقابلِ تبدیل سمجھتے تھے اس لئے وہ ادراک کے آفاقی اور عالمگیر عملی پہلو کو اُجاگر نہیں کر سکتے تھے۔ جمہوریت کی طاقت اور اس کے امکانات کا بھی انھیں احساس نہ تھا۔ سماجی علوم[2] بھی اس زمانہ میں مفقود تھے اور ان علوم کو حاصل کئے بغیر اجتماعی زندگی اور کائنات پر حکم لگانا بڑے سے بڑے قادر الکلام شاعر کے لئے بھی ناممکن ہے

[1] Escapism, Defeatism, Indifferentism, Mysticism, Passivism, Quietism.
[2] Social Sciences

میرے اشعار میں بہت سے شعر ایسے بھی ملیں گے جن میں حیات و کائنات کا متحرک تصور (Dynamic Idea) کارفرما ہے۔ شاید یہ تصورات انفرادیت زدہ نظر نہ آئیں۔

۱۔ حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

والدِ مرحوم سے اکثر سُنا کرتا تھا "کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد" نہ جانے کیوں بچپن ہی سے اس مصرع کی سلاست اور روانی کے احساس کے ساتھ ہی ساتھ اس خیال سے اختلاف کا جذبہ بھی میرے اندر بھڑک اُٹھتا تھا۔ کئی برس بعد جب میں نے انگریزی مصنف رابرٹ لوئی اسٹیونسن کا یہ بیان دیکھا کہ خواہ مرنے میں پانچ منٹ ہی باقی ہوں لیکن نیا کام اور اپنی زندگی کا شاہکار شروع کر دو تو میرے اختلاف کو مزید تقویت ملی۔ یونانی شاعر کا یہ خیال کہ

One crowded hour of glorious life
Is worth an age without a name.

بھی میرے احساسات کے مطابق تھا۔ مندرجہ بالا شعر کے دوسرے مصرع میں کارِ جہاں کے دو معنی ہیں ایک تو خارجی اور مخصوص کام، دوسرے قوت ارادی کا برتنا، یعنی ایک کام اور ایک کام کرنا۔ دم واپسیں تک کام کرنا اور کام کرتے کرتے مرنا" بھی کارِ جہاں ہے۔ علاوہ خارجی حصولِ کار کے۔

۲۔ دم لے رہی تھیں حُسن کی جب سحر کاریاں اُن وقفہ ہائے کفر کو ایماں بنا دیا

کفر و ایمان کے الفاظ کافی فرسودہ ہیں، حسنِ کائنات و حیات کا زندہ احساس کفر ہے یعنی وہ لطیف رنگین نازک اور شدید دہریت اور مادیت ہے جسے لوگوں نے (کم از کم میں نے) کفر کہا ہے یونانی Paganism بھی کفر ہے، لیکن اس حسن کا عکس تاریخ انسانی کے بعض دوروں میں شعور انسانی کے آئینہ میں دکھائی نہ دیا یہی وقفہ ہائے کفر ہیں، یعنی وہ وقفے ہیں جب حُسن کی سحر کاریاں گویا دم لیتی تھیں۔ انھیں وقفوں میں آسمانی خدا کا محدود اور غلط تصور وحدت اور ایمان کے نام سے مرتب ہوا۔ عبرانیت اور رہبانیت اور زہد خشک (Puritanism) کا دور ایمان اور مذہب کے نام پر قائم رہا۔ جب حسن سحر کار کا تھرتھراتا ہوا عکس پھر تاریخ کے آئینے میں پڑا تو ایک زندہ دہریت یعنی کفر کا نیا جنم (Pagan Renaissance) شروع ہوا دنیا میں ایک مرتبہ پھر فلسفۂ دہریت (Historical and Material Dialecticism) جگمگا اُٹھا۔ اسی حقیقت کی طرف اس مختصر شعر میں اشارہ ہے۔

۳۔ تجھے دنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش تجھے دنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

لہ جناب عبرت گورکھپوری

مارکس کا مشہور قول ہے کہ صدیوں تک فلسفہ کی یہ اُدھیڑبن رہی ہے کہ دنیا کو سمجھ لیا جائے مگر اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کو بدل دیا جائے۔

۴۔ نہ ہے وہ ربط پسند اور نہ احتراز پسند ابھی سمجھتے نہیں تم مزاج دنیا کو
۵۔ نہ کیوں محال ہو یہ احتیاط نازک بھی کہ ترک کیجئے دنیا ملا کے دنیا کو
۶۔ کھیلنا موج حوادث سے کچھ آسان نہیں کام ہر اک کا نہیں خواہش دنیا کرنا

اِن تینوں اشعار کا موضوع ایک ہی مرکزی مسئلہ ہے، اصل سوال نہ دنیا پرستی ہے نہ ترکِ دنیا بلکہ دنیا سے صحیح تعلق پیدا کرنا ہے، یعنی عنصری دنیا سے (جس کے علاوہ میرے خیال میں کوئی اور دنیا نہیں) ہم آہنگ ہونے کا نازک مسئلہ ہے۔ اس سے صحت بخش اور حیات آور ربط پیدا کرنے کے لئے اِن گتھیوں کے سلجھانے اور اس غلط نفسانی دباؤ[لہ] کے مٹانے کی ضرورت ہے جو پُرانی تہذیب مذہب اور سماج کے غلط احکام نے ہمارے اندر پیدا کر دئیے ہیں۔ دنیا سے اُسی کھُلے اور آزاد ربط کو پیدا کرکے فطرت کے مطابق دنیا کو اپنانا اور اپنے آپ کو اس مادّی دنیا کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ یعنی دنیا کو ملا کر "ترک دنیا" کرنا چاہیئے۔ اسی میل اور اسی ترک کے لطیف اور نازک توازن سے ہم دنیا کو بھی حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی اُجاگر کر سکتے ہیں۔ اسی فطری سپردگی سے جبر و اختیار کے مسائل سلجھ سکتے ہیں اور دنیا پرستی اور ترک دنیا دونوں کو غلط طور پر برتنے کی پشیمانی سے بچ سکتے ہیں۔ داخلی اور خارجی زندگی میں زندہ ہم آہنگی ایک نازک توازن چاہتی ہے، جس کے بغیر نہ ہم کو دنیا کا رس ہی مل سکتا ہے اور نہ حسن۔

۷۔ ہے ابھی جوہرِ ہستی کو نمایاں ہونا ذرے ذرے کو ہے آئینۂ انساں ہونا
سر بسر جسم کے امکان میں ہے جاں ہونا رگِ ہستی کو نہ آیا ابھی لرزاں ہونا
ابھی فطرت سے ہونا ہے نمایاں شانِ انسانی ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

ان تینوں اشعار میں خصوصاً پہلے اور تیسرے شعر میں ایک ہی فلسفیانہ حقیقت اور مقصد کی طرف اشارہ ہے۔ انسان منازلِ ارتقا کی چوٹی پر ہے۔ تمام نظام شمسی کو حسن انسانی کا آئینہ دار اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو انسانیت سے ہم آہنگ ہونا ہے۔ ابھی تک انسان اور کائنات میں تصادم رہا ہے بڑی دقتوں سے کچھ ہم آہنگی پیدا ہو رہی ہے یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ارتقا کا تصور صرف انسان ہی کے لئے ہے۔ در اصل پورا نظام شمسی نباتات اور حیوانات سب کے سب انسانیت سے مانوس اور

[لہ] Complexes, Inhibitions and Repressions.

ہم آہنگ ہو رہے ہیں، ساز ہستی زیادہ منظم ہوتا جارہا ہے اور کائنات کا ارتقا انسان کے لامتناہی ارتقا کی پیروی کر رہا ہے۔ کاروان افلاک کے سفر کی ہر منزل میں اس بڑھتی ہوئی ہم آہنگی کا جائزہ لیا جاتا ہے اور جب یہ ہم آہنگی مکمل ہو جائیگی جبر و اختیار کے مسائل خود بخود سلجھ جائیں گے، کائنات اور حیات کے راگ بے سرے نہ ہوں گے اور نوائے زندگی گویا اپنی آواز پا جائے گی۔ اسی ہم آہنگی کو ہم نجات عالم کا پیام کہہ سکتے ہیں۔ یہ خارجی اور داخلی ظاہری اور غیبی دونوں طرح سے پیدا ہوتی جارہی ہے۔ اسی کے عدم تکمیل سے انسان کو ہر چیز میں کمی محسوس ہوتی ہے۔

دوسرے شعر میں خود انسان کے اندر اپنے آپ سے ہم آہنگی کی جو کمی ہے، اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مادہ یا جسم کی لطافت اسی کی ایک ارتقائی منزل کا نام ہے لیکن مادہ کی جسامت اور اس کی پاکیزہ کثافت اور روحانیت کو ہم آہنگ ہونا ہے۔ جسم اور جان کو ایک ہونا ہے رگ ہستی کو اس انداز سے لرزاں ہونا ہے کہ جسم اور جان ایک ہو جائیں۔

جس طرح انسان کائنات کا نمونہ اور تصویر اور کائنات انسان کا نمونہ اور تصویر ہے (Microcosm & Macrocosm.) اسی طرح جسم جان کی تصویر ہے اور جان جسم کی تصویر ان تصویروں کی باہم مشابہت رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے۔ لیکن ابھی جمال ہمنشیں در من اثر کرد میں کچھ وقفہ ہے۔ اسی سے ابھی ہر چیز میں کمی محسوس ہوتی ہے۔

ہے یہی میکدۂ دہر میں اعلیٰ ظرفی　　　دل کو پیمانۂ ہر ساغر و مینا کرنا

ایک پیالۂ شراب سے بھی دل کا پیمانہ بھر جائے یعنی دل سیر ہو جائے، اور بوتل، صراحی یا قرابہ بھی انڈیل دیں تو بھی پیمانۂ دل میں سما جائے۔ اس شعر میں قناعت یا مجہولیت کی ترغیب نہیں دی گئی ہے بلکہ اعلیٰ ظرفی کے اس نازک پہلو کی طرف اشارہ ہے جو بدلتی ہوئی دنیا کی ہر حالت سے دل کو ہم آہنگ اور ہمت اور اُمنگ کی شراب سے دل کو لبالب رکھتا ہے۔ اسی کی بدولت نہ کمی سے دل بیٹھ جاتا ہے اور نہ افراط سے سر پھرنے پاتا ہے۔ اسی تناسب میں اعلیٰ کردار کا راز چھپا ہوا ہے۔ یہ زندہ بے نیازی یہ محبت اور خلوص سے بھری ہوئی استغنا، یہ بلند نظری وہ قبولیت اور سپردگی عطا کرتی ہے جو دنیا کو اپنا سکے اور جو دنیا کا ہو سکے۔ بقول سودا:۔

پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے　　　کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

یا بہ قول غالب:۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر　　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

۱۰۔ خلد بریں میں آج تک گونج رہی ہے یہ صدا — آؤ عذاب ہی سہیں کیا ہے دھرا نجات میں

اس شعر کو آپ خواہ اہرمن خواہ آدم سے منسوب کرسکتے ہیں "کیا ہے دھرا نجات میں"۔ نجات اور خلد کا روایتی تصور، مجہولیت زدہ ہے۔ عذاب مشکلوں اور آزمائشوں کا نام ہے۔ کیوں نہ زندگی کا ثبوت دے کر نار جہنم پر بھی فتح حاصل کریں۔ یہ نعرہ ہے جو آج تک خلد بریں میں بھی ساونتوں کی للکار کی طرح گونج رہا ہے۔ اسی سلسلے میں میرا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:۔

جنت کے مکینوں کو بھی تم رشک میں لائے — اے اہل جہنم تمھیں جلنا نہیں آیا

۱۱۔ چھیڑنے والے چھیڑ کر ساز طرب سنا گئے — نغمۂ درد بھی نہیں پردۂ کائنات میں

ایک چیز مردہ بے حسی ہوتی ہے اور ایک زندہ بے حسی یعنی عمل اور احساس کا ایک ہونا زندہ بے حسی ہے زندگی غم اور خوشی دونوں سے بالا تر چیز ہے جو لوگ ساز ہستی کو چھیڑ کر خوشی کے نغمے سن رہے ہیں وہ دھوکے میں ہیں۔ کیونکہ خوشی کے نغمے درکنار اس میں اصلی درد و غم کے نغمے بھی نہیں ہیں۔ زندگی محض زندگی ہے ہستی محض ہستی ہے۔ اصلیت یا واقعیت رجائیت اور قنوطیت کی تردید کرتی ہے۔ برنرڈ شا کا قول ہے کہ احمق ہی کو خوشی حاصل کرنے کی تمنا ہوتی ہے، اس قول میں اس قدر اضافہ اور کردیجئے کہ احمق ہی کو غم بھی ہوتا ہے۔ سائنس نے بھی ایک معرّا کائنات A Neutral Universe کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۱۲۔ ہر اک کے ہاتھ فقط غفلتیں تھیں ہوش نما — ہر اک کو اپنے سے بیگانہ وار جینا تھا

عمر رفتہ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ تمام سانحات اور احساسات جن میں چند لمحوں تک شدید واقعیت نظر آتی تھی، ایک خواب غفلت تھے۔ حال کی روشنی میں گذرا ہوا زمانہ ایک ہوش نما غفلت معلوم ہوتا ہے۔ اور مستقبل میں حال کی بھی یہی مصیبت ہوگی۔ شیکسپیر کا قول ہے:۔

We are such stuff as dreams are made on

And our little life is rounded with a sleep.

ہم سب اپنے آپ سے غافل یا بیگانہ وار جی رہے ہیں اور یہ ہندی مصرع بھی جو غالباً کبیر کا ہے، اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے "بیتی جائے عمر دھوکے ماں" غالباً جگر مراد آبادی کا شعر ہے

ہر رات ہوئی صبح کو اک خواب فراموش — دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

۱۳۔ تمام جوش جنوں ہے تمام زنداں ہے — کسے وہ جبر کرے کس کو اختیار کرے

زندگی تمام جوش جنوں اور وجود تمام زندان، نہ آزادی کا جوش ہی دبائے دبتا ہے نہ زنداں کی دیواریں

رہی ٹوٹتی رہیں۔ فطرت بھی اس تصادم میں کیسے جبر بنالے اور کیسے اختیار۔ جبر اور اختیار کا مسئلہ عبرانیت (Hebraism.) کے (Dualism.) کی وجہ سے بہت پیچیدہ ہوگیا ہے۔ ہندو فلسفہ اس مسئلہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا کیونکہ وہ کائنات سے ہم آہنگی ہی کو نجات کا ذریعہ مانتا ہے۔ یورپ کے مشہور فلسفی اسپینوزا بھی اسی ہم آہنگی پر زور دیتا ہے اور مارکس کے نظریہ کے مطابق بھی اس علم کا نام آزادی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ہم تمام دنیا کے وجود سے بندھے ہوئے ہیں "Freedom is the Knowledge that we are bound." اور جب جزو کا کل سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہی اس کا آزادی حاصل کرنا ہے، تو پھر ہم یہاں تک محسوس کر سکتے ہیں کہ "آؤ عذاب ہی سہیں کیا ہے دھرا نجات میں" ایک فرضی خدا کو ایک ماننے کی تعلیم ہندو فلسفہ کی تعلیم نہیں ہے بلکہ تمام کائنات کے وجود کو ایک ماننا اور اس سے ہم آہنگ ہونا ہی وحدت کی تعلیم ہے۔ شعر نمبر ۷ اور ۹ پر پھر نظر کر لیجئے، خدا پر ایمان لانے سے زیادہ مشکل کام۔ دنیا پر ایمان لانا ہے۔ اسی اتصال اور اتحاد میں جبر اور اختیار کی یہ گتھی بھی سلجھ جاتی ہے۔ زمین اور آسمان یا دنیا اور جنت دو چیزیں اور دو مقامات نہیں ہیں بس، ان کو دو ماننے سے تمام جوشِ جنون ہے تمام زندان ہے والا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، جیسا میرے اس شعر سے ظاہر ہے:-

جہانیوں پہ درِ خلد کھُل کے بند ہوئے　　　نہ جب نجات ہوئی تھی نہ اب نجات ہوئی

اس عنصری دنیا کے سوا کوئی اور دنیا نہیں ہے، اس لئے اس کے مقصد سے اپنی زندگی کا مقصد وابستہ کر دیجئے تو یہ تعلیم راضی بہ رضا والی مجہولیت آموز تعلیم نہ رہیگی۔

۱۴۔ ہزار فتنۂ بیدار خواب رنگیں میں　　　چمن میں غنچہ و گل رنگ لائے ہیں کیا کیا

چمن میں غنچہ و گل گویا ایک خواب رنگین میں محو ہیں، مگر رنگین خواب میں ہزاروں فتنے جاگ رہے ہیں اور اس کی فتنہ خیزیوں سے "چمن میں غنچہ و گل رنگ لائے ہیں کیا کیا" زندگی بجائے خود ایک خواب رنگین ہے لیکن اس میں وہ فتنہ خیزیاں ہیں کہ ہر وجود انقلابات کا مرکز اور مخزن ہے۔ زندگی کے ممکنات اور واقعات دونوں کتنے رنگا رنگ ہیں

"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں"

۱۵۔ کھلا ہے ہوش میں آکر فریبِ بادہ کشی　　　سیاہ کاروں کے دامن کو داغ بھی نہ ملا

"میرا سیر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا" غالب کو یہ شکایت اس لئے پیدا ہوئی کہ "دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک" لیکن یہاں تو شراب میں ڈوبے رہنے کے بعد بھی یہ راز کھلا کہ بادہ کشی فریب تھی

"سیاہ کاروں کے دامن کو داغ بھی نہ ملا" داغ شراب میں بھی اگر اصلیت کی شان آجائے، اگر اس میں حیات کا رنگ آجائے تو سیاہ کار کیوں چھپائیں۔ گناہ کی ستم ظریفی اس کا Negation ہے "گناہ ہے" کے معنی ہوئے "گناہ نہیں ہے"۔ گناہگاری سعی لاحاصل ہو کر رہ جاتی ہے۔ شراب بھی پی گر کورے کے کورے رہے، ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میکدہ سے پی کر بھی بیرنگ واپس آئے۔ یعنی غالب کی اصطلاح میں دریائے معاصی میں ڈوبے بھی اور سر دامن بھی تر نہ ہوا۔ نشۂ مے اور داغ مے آئی گئی بات تھی۔ کفر آسانی سے کفر نہیں ہوتا۔ دہریت اور مادیت بڑی تقدیر سے اپنی پوری اصلیت کے ساتھ ہاتھ آتی ہیں۔ یہ مہا جوگ ہے، کیونکہ بھبھوت بدن سے دھل اٹھتا ہے۔ زندگی کے لئے عناصر کو جذب کرنا بڑا نازک کام ہے۔

(۱۶) قفس سے چھٹکے وطن کا سراغ بھی نہ ملا وہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

تکلیف اور بدنصیبی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ ہے کہ یہ جزو زندگی بن جاتی ہیں۔ نشاط زندگی سے مغائرت پیدا ہو جاتی ہے۔ طائر قید قفس سے چھٹکر صحن چمن میں آ پہونچا۔ اس کے وطن یعنی چمن پر بہار چھائی پڑ رہی ہے، چنانچہ طائر اپنے باغ کو پہچانتا ہوا بھی کہہ اٹھتا ہے کہ میں کہاں آ گیا۔ یہ اجنبیت جان لیوا ہے" وہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا" مفلسی اور غلامی خوش حالی اور آزادی سے مستفید اور خوش ہونے کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہنے دیتی اور مفلسوں اور غلاموں کو خوش حالی اور آزادی دلفریب نظر آتی ہوئی بھی غیر نظر آتی ہے۔ ان کی زندگی بیمار زندگی یا حیات مرگ نما بن جاتی ہے۔ انقلاب کے پیچیدہ اور اہم مسائل میں ایک مسئلہ مزاجوں میں وہ صلاحیت پیدا کرنا بھی ہے جس سے لوگوں میں وہ قبولیت پیدا ہو جائے کہ وہ زندگی کا خیر مقدم کر سکیں۔

(۱۷) زندگی کو ہے عبث فکر سکوں، دریا کی سنتے ہیں عمر رواں کٹ گئی بہتے بہتے

(۱۸) پوچھئے ان سے کہ ثابت قدمی، کام آئی ہوئے گمراہ جو منزل ہی پہ رہتے رہتے

رجعت پسندی کے یہ کرشمے ہیں کہ کوئی زمانۂ حال کو وید و قرآن کی طرف کو موڑنا چاہتا ہے۔ کوئی ابتدائے عالم اور دور بربریت کو واپس جا کر چاہتا ہے کہ دنیا اخیر تک وہیں ٹھہری رہے۔ لیکن دنیا کی نمود رنگ تغیر ہی سے ہوئی ہے، آگے بڑھو یا وقت کے سیلاب میں مٹ جاؤ۔ خارجی زندگی کیا مذہب ایمان کلچر مزاج روح پوری ہستی کی خیر اسی میں ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں تبدیلی ہوتی رہے میرا ایک دوسرا شعر ہے:۔

اگر دوام ہے آدم کی روح کو بھی نصیب تو پھر زمانہ کرے زحمت ترقی کیوں

یہاں آدم سے مراد اس فرضی شخص سے ہے جس کے بارے میں مذہب نے یہ خیال پھیلا رکھا ہے کہ سب انسان اس کی اولاد ہیں۔ اگر انکی روحوں کو بھی دوام اور سلامتی ہے، تو پھر ترقی کی زحمت ہی کیوں کیجائے

(۲۰) آہ وہ شدتِ حیات جو نہ عمل میں جگمگائے رنگِ نشاط و کیفِ غمِ عشق کے ترجماں نہیں

حیات کی شدید ترین شکل عشق ہے جو شہوانی اور رومانی ہو کر آدمی کو ان تاب شکن اور صبر آزما آزمائشوں میں ڈال دیتا ہے کہ زندگی مدّتوں مفلوج اور مجہول ہو جاتی ہے لیکن یہ داخلی نشاط و غم یہ کیف و اثر شہوانی ہوں یا کچھ اور عشق کی سچی اور مکمل ترجمانی نہیں ہیں۔ کیونکہ عشق کا اثر تو یہ ہونا چاہیئے کہ حیات انسانی گہری بلند اور وسیع ہو کر عملی طور پر دنیا کو بدل دے۔ عشق کے ہاتھ میں ایک تعمیری پروگرام ایک بار آور اور خارجیت ہونا چاہیئے لیکن شاید عشق کے داخلی سوز و گداز اور اس کی ظاہری مجہولی تاریخ کے گہوارۂ عمل ہیں۔ دنیا کا مزاج بدلتے اور ہمدردی اور لطافت پیدا کرنے میں تمدن کے تمام شعبوں میں رومانی عشق کے محرکات اپنا کام کرتے رہے ہیں جیسا میرے اس شعر سے نمایاں ہے:۔

تاریخ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات مجبور اتنی عشق کی بیچارگی نہیں

لیکن اس سوز و گداز کی بے اعتدالی سے بے خبر نہ رہنا چاہیئے اور عشق کو پیغامِ عمل کے ٹھوک مناسب وقفوں سے ملتے رہنا چاہیئے جیسا اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے

جو ہیں ہماری رگوں میں لرزاں جو ہیں ہمارے دلوں میں روشن
ہمارے کاموں میں بھی وہ شعلے دہکتے ہوں گے، لپکتے ہوں گے

تہذیبِ نفس اور اخلاقی ارتقا کے یہ تمام اہم مسائل اور نتائج اس شعر میں ملحوظ رکھے گئے ہیں:۔

اس بلندی پہ عشق کو لے جا ہیں جہاں ایک خواہش اور عمل

جب بزمِ لاہوت Divine Comedy میں ہیروئن یعنی بی اٹرس ہیرو یعنی ڈانٹی کو عالمِ قدس کی ساتویں یا سب سے اونچی چڑھائی پر لے جاتی ہے تو اس مقام پر خواہش اور عمل (Will & desire) ایک نظر آتے ہیں۔ میرے لئے یہ تخیل ابھی تک ایک دھندلے احساس ایک غیر مستقل پرواز سے زیادہ نہیں ہے۔ اس منزل کے قریب نئی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آدمی آسانی سے یہ بات قبول نہیں کرتا کہ اسکی کمزوریوں سے اسے آزاد کیا جائے۔ یہ نیا احساس زندگی موت کا احساس معلوم ہوتا ہے یعنی یہ نیا جنم موت معلوم ہوتا ہے خواہش اور لذت کو عمل بنتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ یہی زندہ بے حسی شدتِ حیات کی غرض و غایت ہے۔ اسی زندہ بے حسی کا ذکر میں کرچکا ہوں یعنی یہی وہ مقام ہے جہاں ایک خواہش اور عمل، وہ عمل جس کے اجزائے ترکیبی اور جس کے عناصر خواہش یا مادی لذت یا عشق نہیں بانجھ اور بے برکت اور ضرر رساں چیز ہے خواہ وہ کتنا ہی کارِ خیر اور خدمتِ مذہب کا رنگ پکڑے، بے عشق کے خیر بھی شر کے بمنزلہ ہے۔

(باقی آئندہ)

پت جھڑ[لہ]

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔اے، ایل ایل بی)

بولے آندھی بھوت کی بولی — کھیلے دھول بھیانک ہولی
ناچ رہی ہے ناچ نرالے — جیسے بھوانی گھونگھٹ ڈالے
لئے بونڈلے اپنی جھاڑن — جھاڑ رہے ہیں سب بستی بن
مست بنے کھاتے ہیں چکر — آندھی جھکڑ دھڑک دھڑک کر
پت جھڑ میں یہ ہوا کے جھونکے — گھٹتے ہوکر بن میں بھونکے
رہی نہ پیہو پیہو، کو، ہو، — پیڑ یہ کرتی آندھی ہو ہو
وہ پتی جو شاخ پہ جھولی — ٹوٹ کے بکھری رستہ بھولی
کلی سے جو پنکھڑی تھی پھوٹی — ٹوٹ کے ٹکی دیس سے چھوٹی
ساری دنیا کھوئی کھوئی — جیسے بھیانک سپنا کوئی
نیند میں لے لے کر خراٹا — آہیں بھرتا ہے سناٹا
سب کے من میں چھائی اداسی — لیکن آتما پیاسی پیاسی
رویاں رویاں نیند سموئے — پریم نہ پت جھڑ میں بھی سوئے
کہتے یہ سناٹے بن کے — پریم کی پیاس میں سکھ جیون کے
ملے کہیں، دل کرے اشارا — درشن کو مکھ پیارا پیارا
پت جھڑ کی یہ ہوا جو سنکی — بکھر گئیں آشائیں من کی
بھڑک رہی ہے جیون جوالا — اوم اوم جپتے سب مالا
نہیں کسی کے دھیان میں آتا — تو کس سوچ میں اے جگ داتا
کیا یہ پریم کی سب تیاری — آتی جیسے بسنت بہاری
سب کے جیون الجھے الجھے — یہ الجھاؤ تجھی سے سلجھے

لہ یہ نظم لکھنؤ یونیورسٹی کے پچھلے سالانہ مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔

پریم کے بھید کو تو ہی جانے — اِس کے سپنے بڑے سہانے
کوِتی کی بانی سوئی سوئی — آتما سناٹے میں کھوئی
موہن مالے آنکھ پروئے — آنکھ نہ سوئے کھُل کھُل روئے

پلک اوٹ سے کہتے آنسو
ہے اِس رُوپ میں بھی تو ہی تو

جمالِ منتظر

(از حضرت اعجاز صدیقی)

صرف اِک التفات سے کاوشِ اٹھی گئی — شکریہ نگاہِ حُسن، عشق کی بے کلی گئی
ایک لطیف سی ضیا روح میں پھیلتی گئی — جب حرمِ جمال تک میری نظر کبھی گئی
حجلۂ غم میں رات بھر کھیل کے چاندنی گئی — آگیا سر پہ آفتاب پھر بھی نہ تیرگی گئی
جذبۂ تہ نشین عشق لاکھ رہا دبا دبا — شوخ نگاہ حُسن کی پھر بھی اُبھارتی گئی
دستِ ہوس یہ کیا کیا، کیوں اسے تو نے چھو لیا — حُسن کی دلکشی گئی، پھول کی تازگی گئی
وقت گذاریوں کا شغل چاہیئے دہر میں کوئی — غم میں بھی بیت جائیگی، جائے اگر خوشی گئی
ایک ہی لے میں سیکڑوں ساز تھے نغمہ آفریں — جب کبھی گوشِ ہوش سے دل کی صدا سُنی گئی
میں نے خودی کی سرحدیں پائیں خدا سے دور تر — تیری نظر اگر اُٹھی تا حدِ بیخودی گئی
اب نہ وہ ذوق و شوق ہے اور نہ اُمید و آرزو — بندہ نوازیوں کے ساتھ عادتِ بندگی گئی
لیجیئے کس سے انتقام، شوق نے کی نہ روک تھام — یاد تو اُن کی آئی تھی، آ کے مگر چلی گئی

اُن کا جمالِ منتظر، دل میں ہوا تھا جلوہ گر
پھر بھی نگاہِ بے خبر وقت پہ چوک ہی گئی

سر سلیمان اُردو ادب کی دنیا میں

(از جناب نظامی بدایونی ایڈیٹر "ذوالقرنین")

مرحوم سے میری پہلی ملاقات مارچ سنہ ۱۹۲۴ء میں ہوئی جبکہ وہ صوبہ کی مسلم تعلیمی کانفرنس کی صدارت کے لئے بدایوں تشریف لائے تھے۔ اُس وقت تک میرے مرتبہ دیوان غالب کے پانچ ایڈیشن شرح کے ساتھ چھوٹی تقطیع پر نکل چکے تھے اور ایک نسخہ معرّیٰ فرہنگ کے ساتھ جس میں مرزا غالب کی خود نوشتہ سوانح عمری شامل ہے بڑی تقطیع پر شائع ہو چکا تھا۔ اس ملاقات میں معلوم ہوا کہ مرزا غالب کے دیوان کے وہ سب نسخے جو نظامی پریس بدایوں نے شائع کئے تھے اُن کی نظر سے گذر چکے تھے، اور اس لئے میں معنوی طور پر اُن کے لئے اجنبی نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس پہلی ملاقات میں دیر تک مرزا غالب کی شاعری کا تذکرہ رہا۔ سر شاہ نے اسی سلسلہ میں ذوق کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیا اور فرمایا کہ نظامی پریس نے غالب کے تو کئی ایڈیشن چھاپے اور ذوق ایسے اُستاد کو کیوں فراموش کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کو ذوق کے کلام سے ذوق ہے تو آپ نظامی پریس کی اس کمی کو پورا کر دیں۔ مجھے اس ملاقات میں اثبات یا نفی میں اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن پانچ مہینہ کے بعد دوسری دفعہ جب میں مرحوم سے الہ آباد میں ملا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قصائد ذوق کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ میز پر رکھا ہوا ہے۔ مجھ سے فرمایا کہ لیجئے آپ کی فرمایش پوری ہو گئی' اور کہا کہ خدا سے دعا کیجئے کہ میں نے اُردو ادب کی جو خدمت شروع کی ہے اُس کا سلسلہ جاری رہے، اور ساتھ ہی دوسرے کمرے میں لے جا کر اُردو نظم و نثر کا کتب خانہ بھی دکھایا۔ فرمایا کہ جس وقت سے میں نے بیرسٹری شروع کی اور مقدمات کی پیروی کے سلسلہ میں الہ آباد سے باہر جانے کا اتفاق ہوا تو ہر جگہ سے میں نے اُردو نظم کی کتابیں خریدنا شروع کیں، رفتہ رفتہ یہ ذخیرہ جمع ہو گیا جو آپ کے سامنے ہے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے اس کتب خانہ میں نظم کی چھوٹی سے چھوٹی کتاب بھی موجود تھی۔ نثر کی کتابیں وہی تھیں جو کسی دوست نے ہدیتًا بھیجی تھیں یا خاص خاص مستند مصنفوں کی آپ نے خرید کی تھیں۔ فرمایا کہ اُردو نظم کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو کے مستند شعرا کے کلام کو نئی ترتیب، اچھی طباعت اور صحت

کے ساتھ شائع کرنا اُردو ادب کی ایک ایسی خدمت ہوگی جس سے ہمارے نوجوانانِ قوم کو جو اکثر ادب اُردو سے نا آشنا ہوتے ہیں اُس کے مطالعہ کی ترغیب پیدا ہوگی۔ غرض استاد ذوق کے قصائد کا یہ مجموعہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں ایک دیباچہ اور فرہنگ کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوگیا

اس مجموعہ میں مرحوم نے قصائد کے ساتھ ذوق کے قطعات۔ مثنویات۔ رباعیات اور مسدس کو بھی شامل کر دیا ہے جس کے ساتھ ایک بسیط دیباچہ شامل ہے۔ اس دیباچہ میں قصائدِ ذوق پر مختصر تنقید کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں نظم میں بالخصوص قصائد میں اُردو شعرا جس مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور جس کو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے اس اعتراض کو یہ کہہ کر غلط بتایا ہے کہ:۔

مبالغہ صرف ایک جامۂ زریں ہے جس میں اصل خیال آراستہ کیا جاتا ہے، غرض صرف اعلیٰ مشابہت سے ہے۔ مبالغہ خوبیِ کلام ہے نہ کہ نقص"

مجموعۂ قصائد کی اشاعت کے ایک سال کے بعد اُنھوں نے یہ خیال کیا کہ قصائد کے ساتھ اُستاد ذوق کی دیگر اصناف سخن کا مجموعہ تو شائع ہوگیا ہے، صرف غزلیات باقی رہ گئیں۔ اگر مکمل غزلیات نہیں تو کم سے کم اُن کا انتخاب شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ اس انتخاب کو مرتب کرکے ستمبر ۱۹۲۵ء میں میرے پاس بھیجدیا۔ انتخاب کا کام فی الواقع ایک مشکل کام تھا لیکن سر شاہ نے اس کام کو بحسن و خوبی انجام دیا اور یہ انتخاب تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبول ہوا۔

اِس انتخاب کے متعلق اُنھوں نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:۔

"اس انتخاب کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو اشعار انتخاب سے ترک کئے گئے ہیں وہ اچھے نہیں ہیں بلکہ ہر شخص کا انتخاب اُس کے مذاق کے موافق ہوتا ہے"

سر شاہ کا یہ انتخاب ایک انگریزی داں کے نقطۂ نگاہ سے کیا گیا ہے جیسا کہ اُنھوں نے دیباچہ میں صاف ظاہر کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی داں طبقہ میں اس کی قدر کی گئی۔

اس انتخاب کے مقدمہ میں آپ نے ذوق و غالب کی شاعری کا موازنہ نہایت دلچسپ طریقہ سے کیا ہے، اور دونوں نامور شعرار اُردو کی شاعری کے ہر صنف کا مقابلہ کرکے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے لیکن کہیں انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ قصائد میں ذوق کو ترجیح دی ہے۔ غالب اور ذوق کے سہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ذوق کا سہرا غالب کے سہرے سے نمبر لے گیا۔ قطعات میں غالب کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب کے قطعات قصیدہ نما ہیں اور قصیدہ کے طرز میں ہیں۔

اِس لحاظ سے ذوق کے چھوٹے قطعات سے مقابلتہً بلند تر ہیں۔ دونوں اُستادوں کی رباعیوں کو مساوی درجہ کا بنایا ہے اور اِس ضمن میں میر انیس کی رباعیات کا ذکر کرتے ہوئے دونوں اُستادوں کی رباعیات کو انیس کی رباعیات سے کمتر درجہ کا بتایا ہے۔ آخر میں دونوں اُستادوں کی غزلیات کا مقابلہ نہایت دلچسپ ہے۔ اِس موازنہ میں دونوں اُستادوں کی ہم طرح غزلوں کے چیدہ اشعار لکھکر یہ لکھ دیا ہے کہ ترجیح کا فیصلہ پڑھنے والے کی رائے پر چھوڑا جاتا ہے۔ لیکن پڑھنے والے کو صحیح فیصلہ پر پہونچنے کے لئے آپ نے نہایت خوبی سے دونوں اُستادوں کی خصوصیات کی طرف اشارہ کردیا ہے۔ مثلاً ذوق کو پختگی کلام، صحت زبان، سلاست بیان اور فصاحت کا مالک بتایا ہے۔ غالب کی مضمون بندی۔ فارسی تراکیب کو اُردو میں ڈھالنے کی قدرت، نازک خیالی اور بلاغت کا اعتراف کیا ہے۔ دونوں اُستادوں کے تمام اشعار کو جو اِس موازنہ میں درج کئے گئے ہیں اگر نقل کیا جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائیگا۔ ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے چند مشہور اشعار جن کا موازنہ کیا ہے لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں :-

مطلع
ذوق :- جل اُٹھا شمع نمط تارِ رگِ جاں میرا ۔۔۔ آہ روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا
دھیان میں آئینہ رخ کے گئی جان نکل ۔۔۔ رہ گیا ہائے کھُلا دیدۂ حیراں میرا
غالب :- سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے ۔۔۔ کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم ۔۔۔ تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

مطلع
ذوق :- لگا ہے تیر دل پر آہ کس کافر کے مژگاں کا ۔۔۔ نشاں سوفار کا معلوم ہوتا ہے نہ پیکاں کا
غالب :- خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں ۔۔۔ چراغ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

مطلع
ذوق :- بیمارِ عشق کا نہ جو تجھ سے ہوا علاج ۔۔۔ کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج
غالب :- لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں ۔۔۔ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

مطلع
ذوق :- یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں ۔۔۔ واں ایک خامشی تیری سب کے جواب میں
خط دیکھکر وہ آگئے بہت پیچ و تاب میں ۔۔۔ کیا جانے لکھ دیا اُنھیں کیا اضطراب میں
غالب :- قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں ۔۔۔ میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی ۔۔۔ پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

اس سلسلہ کی تیسری کتاب جو آپ نے مرتب کی وہ اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد میر کی مثنویات کا انتخاب ہے جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ایک بسیط مقدمہ شامل ہے جس میں میر کی سوانحمری

نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے، اور اُن کے کلام پر ریویو کیا گیا ہے، اور اُن کی نسبت بعض سوانح نگاروں نے جو غلطیاں کی ہیں تاریخوں کے حوالہ سے اُن کی صحت کی ہے۔
مولانا آزاد نے آبِ حیات میں میر کی نسبت جو قصے درج کئے ہیں، اس کی نسبت دوسرے تذکرہ نویسوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ یہ قصے آزاد کی گڑھت ہیں۔ سر شاہ نے ان الزامات کی ازسرِ نو جانچ کی ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ آزاد نے جو کچھ لکھا ہے وہ بے اصل نہیں ہے لیکن آزاد نے اپنی رنگین بیانی سے قصوں میں نمک مرچ ضرور لگایا ہے۔ اس طرح انھوں نے ادبی دنیا میں معدلت گستری کے فرض کو ادا کیا ہے۔ میر کی مثنویات کا انتخاب جس نقطۂ نظر سے کیا ہے اُس کا انھوں نے صاف الفاظ میں اظہار کر دیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے اُن اشعار کو جن میں فحش خیالات یا غیر فطری حکایات کا اظہار کیا گیا تھا خارج کر دیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس انتخاب کو بھی اُنھوں نے مغربی خیالات کے تعلیم یافتہ اصحاب کے پڑھنے کے قابل بنا دیا ہے۔ لیکن اس انتخاب میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ مثنوی کا لطف بھی ہاتھ سے نہ جائے اور اصل قصہ کی صورت بھی بدلی ہوئی معلوم نہ ہو۔
فی الواقع یہ ایک مشکل کام تھا اور میر کی مثنویات کا یہ انتخاب اُردو ادب پر بڑا احسان ہے، کہ سر شاہ نے میر جیسے شاعر کی مثنویات کو ایک خوش نما جامہ پہنا کر تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے ایسی صورت سے پیش کر دیا کہ اُس کے مطالعہ سے اُن لوگوں کے دل میں میر کی عظمت نہ گھٹے۔
آخر میں سر شاہ کی ایک آخری کوشش کا جو اُنھوں نے اُردو ادب کی خدمت کے سلسلہ میں فرمائی تھی اگر ذکر نہ کیا جائے تو ناانصافی ہوگی سر شاہ کے والد مولوی شاہ محمد عثمان صاحب مرحوم جونپور کے مشہور وکیل اور عربی فارسی کے عالم و فاضل تھے اور اُردو ادب کے ادیب تھے۔ اس علم و فضل کے ساتھ فنِ شعر سے بھی آپ کو فطری مناسبت تھی فدائی تخلص کرتے تھے بیشتر زیادہ تر آپ کا فارسی کلام ملتا ہے۔ کبھی کبھی اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے لیکن اپنی زندگی میں کبھی اپنے کلام کو مدوّن کرنے کی کوشش نہ کی۔ اُن کا انتقال ۱۳۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہوا انتقال کے بعد ہی سر شاہ کو یہ فکر ہوئی کہ اپنے والد ماجد مرحوم کے متروکہ جواہر ریزوں کو جمع کرکے دنیائے ادب میں پیش کر دیں۔ کئی سال کی کوشش میں اُنھوں نے مرحوم کے قطعات غزلیات جمع کرکے مرتب کر دی تھیں جن کو اُن کے برادر عزیز شاہ محمد سلیمان بی۔ ایس سی، ال۔ ال۔ بی وکیل الہ آباد نے مولانا کیفی چریا کوٹی کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں نظامی پریس بدایوں میں طبع کراکے شائع کرایا
سر شاہ کا نام اگر ماہرینِ قانون کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے تو اُسی کے ساتھ سائینس اور

ریاضی کے ماہرین میں بھی وہ کچھ کم مشہور نہ تھے انھوں نے عصر حاضر کے مشہور ترین ماہر سائنس اینسٹائن کے نظریۂ اضافیت میں جدید تحقیق پیش کر کے سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ علمی مسائل پر بھی آپ کو کچھ کم عبور حاصل نہ تھا۔ ان سب اوصاف کے ساتھ اُردو ادب سے آپ کی دلچسپی ایک ایسی خصوصیت تھی جس نے آپ کو اپنے ملک میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اور تعجب ہوتا تھا کہ ایک قانون داں اور ریاضی اور سائنس کا ماہر اُردو کا ادیب بھی ہو سکتا ہے اور اس کو شعر و شاعری کا مذاق بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ کی ذات نے اس تعجب کو دُور کر دیا اور دنیا کو بتا دیا کہ ذہانت استقلال اور عزم جس شخص میں جمع ہوں وہ جس فن اور جس علم میں چاہے تبحر پیدا کر سکتا ہے۔ سر شاہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں۔ لیکن اُن کی زندہ مثال آئندہ نسلوں کے لئے ہمیشہ رہنما کا کام دے گی۔

علمِ انسانی

دنیا کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود انسان کا علم ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ اس طویل زمانے میں جب کہ انسان نے عالم حیوانی میں ترقی کے بہت سے مدارج طے کئے ہیں۔ اس نے بتدریج معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ پھر بھی ہماری مثال ان بچوں کی ہے جو علم کے سمندر کے کنارے پر بیٹھے سنگریزے چن رہے ہوں۔ ہماری انتہائی لاعلمی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے جب ہم کائنات کی وسعت کا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر آپ اسے ملحوظ رکھیں کہ آفتاب اسی کھرب سال سے موجود ہے اس زمین کی عمر جس پر کہ ہم بستے ہیں دو ارب سال ہے اور زمین پر زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تیس کروڑ سال گزر چکے ہیں۔ مگر اس کے مقابلہ میں انسان کا وجود صرف تین لاکھ سال سے اور ذی عقل انسان کا صرف پندرہ بیس ہزار سال سے ہے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ چند ہزار سال کا زمانہ جس میں کہ انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہیں اس طویل زمانہ کا ایک نہایت خفیف سا جزو ہے جو کہ کائنات کے اسرار کو معلوم کرنے کے لئے درکار ہے۔ ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کی حدود لا انتہا اور اس کا دائرہ نامحدود ہے۔

سر شاہ سلیمان مرحوم

ہستی

از مسٹر فیاض الدین احمد خاں فیاض بی۔ اے

غم نعمتِ ہستی کا سرانجام نہیں ہے ہستی کا بجز کیف عدم نام نہیں ہے
وہ صبح ہے یہ جسکی کوئی شام نہیں ہے جو جان گیا اس کو وہ ناکام نہیں ہے
یہ دولتِ بیدار مگر عام نہیں ہے

کافر نہیں ہستی کو خدا ماننے والے یہ رازِ نہاں جانتے ہیں جاننے والے
پہچان گئے ہیں اُسے پہچاننے والے آ ہوش میں غم عیش کو گرداننے والے
ہستی یہ تری ذات سے الزام نہیں ہے

غم کیا ہے؟ مسرّت کی بدلتی ہوئی صورت خود موت ہے ہستی کی مچلتی ہوئی صورت
ماتم بھی ہے اِک عیش کی ڈھلتی ہوئی صورت تکلیف ہے راحت کی نکلتی ہوئی صورت
اِک کھیل ہے یہ گردشِ ایام نہیں ہے

ہستی کی ہر اِک لطف کا ہستی ہی بدل ہے یہ آئینۂ جلوۂ رخسارِ ازل ہے
ہستی ہی کے بازو میں تمنّاؤں کا بل ہے خود حسنِ ازل جلوہ گرِ دارِ عمل ہے
شایانِ طلب لذتِ آرام نہیں ہے

دُنیا میں اُبھرنا ہے تو پستی سے گذر جا پی جامِ عمل بادہ پرستی سے گذر جا
آ ہوش میں بے وقت کی مستی سے گذر جا ہستی کو بڑھاتا ہوا ہستی سے گذر جا
تقدیر کو رونے کا یہ ہنگام نہیں ہے

جو عام ہے ہستی کی وہ تفسیر بدل دے روشن جو ہو وہ رُخِ تصویر بدل دے
جو تیر پُرانے ہوئے وہ تیر بدل دے تدبیر کے اِک زور میں تقدیر بدل دے
محدود تری سعیِ خوش انجام نہیں ہے

سیفٹی فرسٹ[1]

(از مسٹر ضیاء الدین احمد برنی، بی - اے)

جب سے موٹروں کا چلن ہوا ہے یا جب سے بجلی سے چلنے والی گاڑیاں جاری ہوئی ہیں "سیفٹی فرسٹ" کے الفاظ بہت زیادہ سُننے اور پڑھنے میں آتے ہیں۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی حفاظت سب باتوں پر مقدم ہے، یعنی ہر شخص کو خیال رکھنا چاہیئے کہ جب وہ بازاروں میں چلے یا گاڑیوں میں بیٹھے تو اس طرح سے چلے اور بیٹھے کہ اُسے کوئی جسمانی ضرر نہ پہونچنے پائے۔ مثلاً بہت سے لوگ چلتی گاڑیوں پر سے اُترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ بھاپ اور بجلی کی گاڑیاں بہت تیز رفتار ہوتی ہیں، اس لئے ایسا اقدام خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اسی طرح لوگ ٹرام گاڑیوں کے معاملہ میں بھی احتیاط نہیں برتتے اور اکثر ایسی جگہ اُترنے کی کوشش میں جہاں ٹریم کا اسٹیشن نہیں ہوتا وہ اپنے تئیں خطرہ میں ڈالنے سے نہیں چُوکتے۔ اگرچہ ایسا کرنے میں انہیں بعض اوقات شدید ضربات آجاتی ہیں، اگر لوگ ریل گاڑیوں اور ٹریم کاروں میں چند منٹ کی دیر سویر کا خیال نہ کریں، اور صرف اُسی وقت بیٹھیں یا اُتریں جب گاڑی یا ٹریم رُک جائے تو بہت سے ناگہانی حادثوں کی روک تھام ہوسکتی ہے۔

لیکن ریل یا ٹریم کے حادثات پھر بھی کم ہوتے ہیں، ان کے مقابل میں موٹر گاڑیوں کے حادثات کی تعداد تو اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اُن کا سالانہ شمار ہزاروں تک پہونچ جاتا ہے۔ آئے دن ہم اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ بچے اور بوڑھے کس طرح سے موٹر گاڑیوں، موٹر سائیکلوں، موٹر بسوں، ٹیکسیوں اور لاریوں کی جھپیٹ میں آکر اپنی قیمتی جانیں کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ حادثات سال بہ سال بڑھ ہی رہے ہیں، اس لئے کہ موٹروں اور لاریوں وغیرہ کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ ذرا شہر بمبئی کی حالت پر غور کیجئے، اسکی آبادی تیرہ چودہ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں یہاں ایکسو ایک آدمی سڑکوں کے حادثات کے نذر ہوئے تھے، زخمی ہونے والوں کی تعداد ۳۵۲۲ تک پہونچ گئی تھی۔ ان اعداد میں سنہ ۱۹۳۶ء

---

[1] "Safety First."

میں اچھا خاصہ اضافہ ہوگیا، اور مرنے والوں کی تعداد بڑھکر ایک سو ستائیس[۱۲۷] ہوگئی، گو زخمی اشخاص کی تعداد گھٹ کر صرف ۳۱۹۱ رہ گئی۔ اس زبردست اتلافِ جان سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ "سیفٹی فرسٹ" کس قدر ضروری چیز ہے، اور ہم لوگ اس کی طرف سے کس قدر غافل ہیں!

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حادثات کیوں ہوتے ہیں؟ بمبئی پولیس کی سالانہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ موٹر گاڑیوں کی وجہ سے ایک سو ایک[۱۰۱] اشخاص کی موت بمبئی جیسے شہر کے لئے کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی، جہاں ساٹھ فی صدی لوگ بازاروں میں نہایت بے پروائی کے ساتھ چلنے کے عادی ہیں۔ رپورٹ میں جو علاج تجویز کیا گیا ہے وہ بھی سن لیجئے، اوّل یہ کہ ملک میں موٹر چلانے کا معیار بلند کیا جائے۔ بہتر سڑکیں بنائی جائیں، اور آمد و رفت کے قواعد پر زیادہ سختی سے عمل کیا جائے۔ رپورٹ میں حادثات کی بڑی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ لوگوں کو چلنا نہیں آتا۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ لوگ نہ تو ٹھیک طریقہ سے چلتے ہیں اور نہ صحیح طور پر سڑکوں پر ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہیں۔ حالانکہ لاکھوں چلنے والے اشخاص ایسے ہیں جو چالیس چالیس پچاس پچاس سال سے چل رہے ہیں، پھر بھی انھیں چلنا نہیں آتا۔ میرا روزمرہ کا مشاہدہ ہے اور ہر شخص اپنے طور پر اس کی تصدیق کر سکتا ہے کہ لوگ فٹ پاتھ یا پٹڑیوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے، اور سڑکوں پر اس طرح سے چلتے ہیں گویا وہ اپنے آگے پیچھے سے بالکل مطمئن ہیں۔ ایک شہر بمبئی میں کیا بلکہ تمام برطانوی سلطنت میں سڑک پر چلنے والوں کے لئے یہ اصول مقرر ہے کہ "بائیں طرف رہو"۔ جگہ جگہ موٹے موٹے حرفوں میں لکھ بھی دیا گیا ہے کہ "بائیں طرف کو چلو" لیکن لوگ اس ہدایت کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور ناحق حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں جہاں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے، یہ نہایت ضروری ہے کہ انھیں شروع سے سڑک کے مسلمہ قاعدوں کے مطابق چلنا سکھایا جائے۔ تاکہ حادثات کی تعداد کم ہو جائے۔ یہ کام اسکولوں اور کالجوں میں اور ریلوں اور سینماؤں میں پوسٹروں وغیرہ کے ذریعہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ سڑکوں کے حادثات کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ موٹر چلانے والے بھی بعض اوقات بُری طرح موٹریں چلاتے ہیں اور موٹر چلاتے وقت یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ سڑکیں صرف انھیں کے لئے بنائی گئی ہیں اور پیدل چلنے والوں کا گویا اُن پر

کوئی حق ہی نہیں۔ حالانکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ سڑک کے استعمال کا پہلا حق پیدل چلنے والوں ہی کو حاصل ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض موٹر ڈرائیور رات کے وقت شراب پی کر گاڑی چلاتے ہیں اور ایسی حالت میں سمجھ لیجئے کہ گاڑی کا خدا ہی حافظ ہے۔ ایسے موقعوں پر گاڑی کبھی تو درختوں سے ٹکرا جاتی ہیں اور کبھی روشنی کے کھمبوں سے۔ کبھی فٹ پاتھ یا پٹڑیوں پر چڑھ جاتی ہیں اور کبھی دریا یا سمندر میں گر پڑتی ہیں۔ اس طرح سے کئی تفریحی پارٹیاں ماتمی پارٹیوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ لیکن پھر بھی ان حادثات سے کوئی سبق نہیں لیا جاتا۔ میں نے کئی دفعہ ایسے ڈرائیوروں کو پولیس کے حوالہ کیا ہے، جن کے متعلق مجھے یہ یقین ہوگیا کہ وہ شراب کے نشہ کی وجہ سے "وھیل" پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ افراد کا یہی فرض ہے اور انھیں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ بعض دفعہ یوں بھی حادثات ہو جاتے ہیں کہ ایک گاڑی یا موٹر دوسری گاڑی یا موٹر کو پکڑنے کی فکر میں رفتار کی قیود سے آزاد ہو کر چلتی ہے۔ ایسے تیز رفتار ڈرائیوروں کو کافی سزا ملنی چاہیئے تاکہ وہ انسانی جانوں کو اپنی بے پروائی سے خطرے میں نہ ڈالیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ حادثات واقع ہی نہ ہوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا، خصوصاً موجودہ زمانے میں جب وقت اور فاصلہ پر فتح پانے کی اس قدر کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن لگاتار کوشش کے بعد اتنا ضرور ہوسکتا ہے کہ حادثات کی رفتار کم ہو جائے۔ لیکن انسداد کلی قریب قریب ناممکن ہے۔ حادثات کم کرنے کی ایک ترکیب یہ ہے کہ ایسی سڑکوں پر جہاں پیدل چلنے والوں کا ہجوم رہتا ہے موٹروں اور گاڑیوں کی رفتار مقرر کردی جائے تاکہ وہ پبلک کے لئے خطرہ کا باعث نہ ہوں۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ گنجان آبادی میں ان کی اور آدمیوں کی آمد و رفت کے لئے راستے مقرر کردیئے جائیں۔ اس سلسلہ میں بمبئی کی پولیس نے جو جدت طرازیاں دکھائی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ یہاں پر ان کا ذکر کیا جائے۔ اس نے بمبئی کے بعض تراہوں، چوراہوں اور بڑی بڑی شاہراہوں پر جو "جزیرے" (Islands) بنا دیے ہیں وہ یقیناً بہت مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ جزیرے ایسے مقامات پر بنائے گئے ہیں جہاں پیدل چلنے والوں کے علاوہ ہزارہا موٹروں کا گزر رہتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس جس مناسب سختی کے ساتھ نہ صرف راہگیروں سے بلکہ موٹر والوں سے سڑکوں کے قواعد کی پابندی کراتی ہے وہ بجائے خود قابل تعریف بات ہے۔ اگر کسی سے ذراسی بھی لغزش ہو جاتی ہے تو پھر آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں اُسے جواب دہی کے لئے ضرور آنا پڑتا ہے۔

قاعدہ بھی بنادیا گیا ہے کہ جب درمیانی اسٹیشنوں پر ٹریم سے مسافر اُتر رہے ہوں اُس وقت گزرنے والی موٹریں ٹریم سے کم از کم ایک گز کے فاصلہ پر رہیں تاکہ مسافر بہ اطمینان تمام اُتر سکیں۔ اس قاعدہ کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کرانے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اکثر اوقات اس کی خلاف ورزی سے حادثات واقع ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح پولیس نے بعض مقامات پر ٹریم کے درمیانی اسٹیشنوں پر چند گز تک پتھر لگوادیے ہیں تاکہ مسافر اطمینان سے اُتر جائیں۔ ابھی تک بمبئی کے سب علاقوں میں اس طریقہ کا رواج نہیں ہوا، لیکن ضرورت ہے کہ نہ صرف بمبئی بلکہ ہر شہر میں اس طریقے کو رواج دیا جائے، کیونکہ اس کی بدولت حادثات کی کافی حد تک روک تھام ہوجائے گی۔

مگر سڑکوں کے حادثات تمام و کمال محض موٹروں یا گھوڑے گاڑیوں ہی کی وجہ سے نہیں ہوتے۔ مثلاً بمبئی میں دو ایک تہواروں پر آتش بازی چھوڑی جاتی ہے، جو ہر سال کئی معصوم بچوں کی جانوں کی بھینٹ لے لیا کرتی ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے ایک ہولناک واقعہ دیکھا تھا جس کا اثر آج تک میرے دل میں موجود ہے۔ چند نو عمر لڑکوں نے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھکر سوڈے کی بوتل میں پٹاس بھر کر اس میں آگ کی چنگاری چھوڑ دی، مگر اس سے پہلے کہ بوتل زمین پر پھینکی جاسکے وہ بڑے دھماکے کے ساتھ پھٹی اور چھوڑنے والے لڑکے کے دونوں ہاتھ اور کلائی تک الگ کر گئی۔ لڑکا اور اُس کی غریب ماں اس واقعہ پر جس دردناک طریقہ سے ماتم کر رہے تھے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بہرحال میرا کہنا یہ ہے کہ آتش بازی بھی ایسی لعنت ہے جو ہر سال کئی جانیں لے لیا کرتی ہے ہمارے لیڈروں اور اسکولوں کے استادوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی نصیحتوں کے ذریعہ اس رسم کو بند کرانے کی کوشش کریں۔

اِس سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ حادثات میں مبتلا ہوجائیں اُن پر فوری توجہ دی جاسکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پولیس کے ہر آدمی کو "فرسٹ ایڈ" (First Aid) کی تعلیم دی جائے۔ معمولی ضربات میں ایسی وقتی امداد بہت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ڈیوٹی ادا کرنے والے سپاہیوں کے پاس فرسٹ ایڈ کا سارا سامان بھی موجود ہونا چاہیئے۔ تاکہ انھیں فوری امداد پہونچانے میں سہولت ہو۔ پولیس کو عوام کی خدمت کے جتنے موقعے حاصل ہیں کسی دوسرے طبقے کے لوگوں کو میسر نہیں۔ مگر اس کے لئے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ پولیس کو

زیادہ سے زیادہ مفید بنا دیا جائے۔ تاکہ پبلک کی ہر ممکن خدمت وہ اپنا فرض سمجھیں اور اس فرض کو بہتر سے بہتر طریقے سے انجام دیں۔ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ بڑے بڑے ریلوے اسٹیشنوں پر نہ صرف "فرسٹ ایڈ" کا انتظام ہے بلکہ چھوٹے چھوٹے اسپتال بھی قائم کئے جا رہے ہیں، تاکہ اگر کسی مسافر کو کوئی حادثہ پیش آجائے تو اُس کو فوراً کچھ نہ کچھ طبی امداد مل جائے اور ایسا نہ ہو کہ اسپتال پہونچتے پہونچتے وہ غریب ختم ہو جائے۔ سول اسپتال ذرا فاصلہ پر ہوا کرتے ہیں اور سخت حادثات میں مریض کا فوراً وہاں تک پہونچ سکنا آسان نہیں ہوتا۔

"سیفٹی فرسٹ" کی اور بھی شکلیں ہیں، مثلاً بیمہ کے ذریعہ اپنے بال بچوں کے مستقبل کی طرف سے اطمینان اور فراغت حاصل کر لی جائے وغیرہ۔ لیکن وہ طریقے فی الحال میرے موضوع سے خارج ہیں۔ مجھے اس وقت ریل اور سڑک کے حادثات کے متعلق یہ بات کہنی ہے کہ "سیفٹی فرسٹ" کا خیال لڑکوں اور لڑکیوں، جوانوں اور بوڑھوں، عورتوں اور مردوں غرض ہر طبقہ کے لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دینا چاہیئے۔ اور یہ بات ان کے ذہن نشین کر دینا چاہیئے کہ زندگی ایک خدائی امانت ہے جو اس قابل نہیں کہ اُس کے ساتھ بے پروائی برتی جائے یا اُسے ہیچ سمجھا جائے۔ زندگی کی حفاظت ایک مذہبی فرض ہے، اور ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ اس فرض کو اچھی طرح سے ادا کرے۔

کوئل

کوئل، آسمان کے جھلملاتے ہوئے سمندر میں تیرنے والی زندگی۔ نغمہ کی بکھری ہوئی تحریک سے میرے جذبات میں ہلچل پیدا نہ کر۔ میری زندگی کی لہریں ساکت ہیں، کیا تیرے روحانی نغمہ کے چراغ روشنی اور اُمید کی کائنات میں میرے تیرہ و تار اور بیجان و بےحس ارمانوں کو منور کر سکیں گے؟ تیرے مست کرنیوالے نغموں اور ان کے ہزاروں لاکھوں اثروں میں، آسمان میں۔ ہواؤں میں فطرت کی لاانتہا رنگوں میں جو حُسن کی دنیا بےقرار ہے کیا تو اپنے ننھے سے گلے سے اُس کی صحیح ترجمانی کر سکے گی؟ جس وقت زندگی خاک بن کر اڑنے لگتی ہے۔ اُس کے ہیبت ناک مناظر میں کیا تیرا نغمۂ موت اور اُس کے اندر چھپے ہوئے خدا کی مضحکہ خیز اور خوفناک ہستی کی ڈوبتی ہوئی آواز نہیں ہو جاتا؟

امرناتھ جوہری، بی۔ اے

اے دوست!

(از مسٹر یوسف ظفر، بی۔ اے)

مجھ کو مایوس نہ کر، میری طرف آ، اے دوست
میری اُمید کے سجدوں کو نہ ٹھکرا، اے دوست!

دوست! میں اُٹھ کے ترے در سے کہاں جاؤنگا
کون ہے تیرے سوا میرا سہارا، اے دوست!

پوچھ جلتی ہوئی قندیل سے میری حالت
مَیں نے کس طرح گزارا ہے زمانہ اے دوست!

ڈوبتا جاتا ہے دل ورطۂ تنہائی میں
میری حسرت کی طرف تو نے بھی دیکھا اے دوست!

میری تاریکیٔ قسمت میں اُجالا تو ہے
زندہ رکھتی ہے مجھے تیری تمنا اے دوست!

میں تجھے کھو کے خدائی سے خفا ہو جاؤں؟
تجھکو منظور ہے، اے دوست! تو اچھا اے دوست!

(۲)

تیرے دل میں مری وقعت نہیں، کیا کچھ بھی نہیں؟
تجھکو کیا مجھ سے محبت نہیں۔ کیا کچھ بھی نہیں؟

کھا نہیں ڈوبتے تاروں کی قسم کھا اے دوست!
مجھ سے ملنے کی بھی حسرت نہیں، کیا کچھ بھی نہیں؟

یہ بتا، ہاتھ دھڑکتے ہوئے دل پر رکھکر
تجھکو کچھ میری ضرورت نہیں کیا کچھ بھی نہیں؟

(۳)

کچھ نہیں؟ تو بھی نہ ٹھکرا، کہ بُرا لگتا ہے،
میں ترا ہو کے اگر اشک بہاؤں، اے دوست!

واقفِ حسرتِ پرواز نہیں میرا خیال
آ! تجھے عرشِ تخیل پہ بٹھاؤں، اے دوست!

لے چلوں سرحدِ ادراک سے بھی پار تجھے
اور وہاں گیت محبت کے سناؤں اے دوست!

تو جھکے خلق کے خودساختہ قانونوں سے؟
تیرے قدموں پہ دو عالم کو جھکاؤں اے دوست!

دوست سمجھا ہوں، بُرا کیا ہے اگر سمجھا ہوں
کیسے سمجھا ہوں تجھے کیسے بتاؤں اے دوست!

مجھکو پامال نہ کر، دیکھ جوانی کو نہ دیکھ
مَیں کہیں جان پہ ہی کھیل نہ جاؤں اے دوست!

میری دُنیا

(از محترمہ فرحت ہاشمی صاحبہ (بدایونی)

بیخودی میں چھیڑ دیجے نغمہ ہائے سازِ دل
پھر انھیں موجوں پہ خود ہی رقص بہم کیجئے

وہ شباب کی پُر مسرت رنگینیاں تھیں یا میری دیوانگی کی جنون انگیزیاں جن کی یاد رہ رہ کے مجھے ستاتی ہے، میرے سازِ غم پر بہیم مضراب لگاتی ہے اور مجھے اس دنیائے ظلم شعار سے دُور اور بہت دُور لے جاتی ہے۔ ...... لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں، نہ معلوم کیوں؟ اگر دیوانگی یہی ہے کہ میں اپنی دنیا میں گم ہوں اور میرے جنون کی تعبیر فراموشیٔ عالم ہے تو بس میرے لئے یہی پسندیدہ ہے۔ مگر آہ! دنیا والے اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔

اِک نمودِ مضطرب، اِک جوشِ بیتابانہ ہے — عشق دیوانہ سہی، کیا حُسن بھی دیوانہ ہے

ہاں وہ بھی ایک زمانہ تھا جب مجھ میں تعقل اور احساس کا مادہ تھا ..... دنیا کی رنگینیوں میں ڈوب جاتی تھی اور پھر حباب کی طرح سطح پر آجاتی تھی۔ اس تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لے کر مُسکرا دیتی تھی ...... مگر یہ سب کچھ کب تھا؟ ..... اُس وقت کہ جب اِس بھیانک دنیا کے ہر نغمہ میں ایک کیف اور ہر کیف میں ایک جوش اور ہر جوش میں ایک نشہ سا تھا۔ جب اس دنیا کی ہر لوری میں سرور و طرب جھولا کرتے تھے۔ اسی سرور و طرب کے آغوش میں جوانی سوتی تھی .... جب سینوں میں دل تھے اور دلوں میں شباب کی گوناگوں تصویریں اور اُن تصویروں کے احساس سے ولولے اور ولولوں میں آرزوئیں تھیں۔ ...... جلوۂ حسن عام تھا۔ میرے شباب کا ایک رنگین عنوان تھا عشق و ہوس متجانس نہ تھے۔ محبت کے دامن پر معصیت کا دھبّہ نہ تھا ... مجھے کائنات کا ذرہ ذرہ وجد کرتا ہوا نظر آتا تھا۔

ہماری شادی کو چار، پانچ ماہ کا عرصہ ہوچکا تھا۔ میں بے ماں باپ کی تعلیم یافتہ بچّی تھی جس کا تمام دنیا میں صرف ایک ہی سہارا بھائی نسیم تھا ...... اور اب وہی نسیم میری ٹوٹی ہوئی کشتی

کے ناخدا ہیں ......! اکثر شام کو "وہ" اور میں ہاتھ میں ہاتھ لیکر گھنٹوں ٹہلا کرتے تھے ہماری چال میں انتہائی بے باکی اور وارفتگی ہوتی تھی۔ پھر ہم نہ معلوم کن خیالات میں ڈوب جاتے تھے۔ اِسی عالم میں اگر بادل چاند کے منور چہرہ پر سپید نقاب ڈال دیتا تھا تو وہ میرے چہرہ سے دوپٹہ سرکا کر کہتے تھے" دیکھو دنیا تاریک ہوئی جاتی ہے" میں شوخی سے مگر تبسم کو متانت سے چھپاتے ہوئے کہتی "کیا آپ کی دنیا؟" تو وہ میرا ہاتھ دبا کر ایک خاص لہجہ میں کہتے "عقل والوں کی دنیا" میں طنزاً کہدیتی "عقل والے پاگل ہیں اور ظلوماً جہولا کا مصداق انھیں ہے" میں پھر ایک قہقہہ اور طویل قہقہہ لگاتی اور اُسی قہقہہ کی صدائے بازگشت میں ہم غرق ہو جاتے تھے۔"

فطرت نے میری طبیعت میں غور و تفکر کا مادّہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ میں استغراق کے عالم میں گزار دیتی تھی۔ یہی خصوصیت میری عادت بن گئی تھی۔ ایک مرتبہ میں اپنے گھر تھی "وہ" باہر گئے ہوئے تھے، گلابی جاڑے کا موسم تھا اور نومبر کی ہلکی ہلکی خنک ہوائیں روح کو مسرور کر رہی تھیں شام کا وقت تھا کہ وہ آئے، میں گویا ایک خواب سے چونک پڑی اور مسکرا کر کہا۔

"آیئے آیئے میں آپ ہی کی منتظر تھی"

وہ بولے "خیریت" اور میرے برابر صوفے پر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بیٹھ گئے۔

مجھے یوں خاموش دیکھکر اُن سے نہ رہا گیا، اور عجیب اضطرابانہ لہجہ میں بولے "کہو۔ کہو کیسی خاموش اور غیر معمولی ساکت ہو؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں ..... یونہی سی ایک بات ہے جس نے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ اچھا آپ کی کیا رائے ہے، آیا عشق حُسن پیدا کرتا ہے یا حُسن عشق"

"واللہ کس خبط میں پڑ گئی ہو، آخر یہ تو بتلاؤ کہ تم کو یہ سوجھا کیوں؟" وہ بولے۔

"نہیں آپ کا خیال ہے! ..... یہ مسئلہ تو قابل حل ہے" میں نے دبی زبان سے کہا۔

وہ ہنس دیے اور کہنے لگے "تمھارا سوال دلچسپ بھی ہے اور مبہم بھی، تم ایسے نتیجہ پر پہونچنا چاہتی ہو جس کو دنیا تسلیم کرلے۔ یہ غیر ممکن ہے .... مگر تم مجھ سے پوچھتی ہو تو میرا یہ خیال ہے کہ عشق حُسن پیدا کرتا ہے۔"

میں نے فوراً کہا "وہ کیونکر؟"

بولے "یہ امر تو مشاہدہ پر مبنی ہے، تمھیں کسی شے سے خواہ وہ انسان ہو یا جانور .... جاندار

پابے جان، اگر دلبستگی پیدا ہو جائے تو تم یقیناً اُس کے ہر ہر پہلو میں خوبیاں ہی خوبیاں دیکھو گی
گو حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز مطلقاً نہ بالذات اچھی ہے نہ بُری، صرف فرق یہ ہے کہ جس چیز سے
ہماری طبیعت نفرت اور غیر پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے وہ ہمارے لئے بُرائیوں کا مرکز ہو جاتی ہے،
اور جس شے سے ہم کو دلبستگی ہوتی ہے اُس میں حُسن ہی حُسن نظر آتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ جو چیز ہمارے
لئے غیر دلکش ہے وہ دوسرے شخص کو مرغوب ہو۔ در اصل "حسن" عشق کی حسین نظر کا منت کش ہے،
مثل مشہور ہے "لیلیٰ را بہ چشم مجنوں باید دید۔"

میں بولی کہ "میرا نظریہ آپ کے زاویۂ خیال سے مختلف ہے۔ عشق بنفسہٖ کوئی چیز نہیں، حُسن
عشق پیدا کرتا ہے۔ جب تک کوئی شے بالذات حسین نہیں ہوتی ہے، دل میں اس کی طرف سے
کوئی دلبستگی اور کشش کی لہر پیدا نہیں ہوتی۔ مثال میں لے لیجئے ایک گلاب کا پھول کیوں دیکھنے
والوں کی نظروں کو اپنے میں سمو لیتا ہے۔"

وہ مُسکرا کر کہنے لگے "تم غلطی پر ہو کوئی پھول خود حسین نہیں ہوتا ہے، یا بالفاظ دیگر حُسن کا
سرچشمہ نہیں ہوتا ہے، یہ نظر بازوں کی سحر آفریں تار نظر ہوتی ہیں جو عشق کے نور سے اُس میں حُسن
پیدا کر دیتی ہیں

خود اپنے حُسن کی تاثیر کو وہ کیا جانے تری نگاہ ہے ظالم، مری نگاہ نہیں

یا یوں سمجھو

عشق، رنگِ حُسن سے ہے بے نیاز حُسن، کیف عشق سے خالی نہیں

اصلیتِ "حُسن" صرف اس قدر ہے کہ ہم "حسن" کو فریب نظر سے تعبیر کرتے ہیں یا ذوق نظر
کو "حُسن" قرار دیدیتے ہیں۔ حُسن در اصل خالق نہیں مخلوق ہے۔۔ تم نے کبھی خوبصورت یا حسین چیز
کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، ہم اُسی شئے کو حسین کہتے ہیں جو ہمارے احساس جمال کو تسکین بخشے
اور ہمارے معیارِ حسن کے مطابق ہو۔"

میں نے کہا "تو آپ کے ذوقِ وجدانی کا نام حُسن قرار دیا جائے؟"

اُنھوں نے کہا "یہ حسن کی مہمل تعریف ہے"۔ "دنیا میں حُسن کے معیار بھی مختلف ہیں، اور جس
صورت سے نغمہ کا تعین غیر ممکن ہے اسی صورت سے حُسن کا تعین بھی نا ممکن ہے۔"

"اس کی تائید؟" میں نے دریافت کیا۔

"تو سنو" وہ بولے

زندگی کیا ہے نمودِ عاشقی　　عشق کیا ہے حسن کا آغاز ہے
ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے　　موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا
ہو نور پہ کچھ اور ہی اک نورِ عالم　　اُس رخ پہ جو چھا جائے مرا کیفِ نظر بھی

عشق خود حُسن ہے خود جلوہ ہے خود ذات و صفات
اِک یہی لفظ حقیقت ہے کل افسانوں کی

اور اسی طرح شعرا نے اپنے اپنے رنگ اور طرزِ ادا میں حقیقتِ عشق و حُسن کو دکھایا ہے"
"ذرا حافظؒ کا شعر بھی ملاحظہ کر لیجیے" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ؎

درازل پرتوِ حسنت ز تجلی دم زد　　عشق پیدا شد و آتش بہمہ عالم زد

تو آپ کا نظریہ غالباً اس شعر کی رو سے بدل جائیگا"
"معاف کرنا" وہ بولے "میرا مبحث حسنِ حقیقی یا حسنِ مطلق نہ تھا، میرا موضوع صرف مادی اور مجازی حُسن تھا اور بفرضِ محال تمھاری اس تعبیر کو صحیح بھی مان لیا جائے تو

عشق اگر حُسن کے جلووں کا ہے مرہونِ کرم　　حُسن بھی عشق کے احساس سے سبکدوش نہیں

اور اگر شعرا کے اس POETIC PHILOSOPHY سے قطع نظر کر لیا جائے تو ہم فلسفہ کے باوا آدم سُقراط کے اس قول سے کسبِ معنی کر سکتے ہیں:

A thing is not loved by those who love it because it is in a state of being loved but it is in a state of being loved because it is loved"
(Trial and death of Socretes)

یعنی کہ ہم کسی چیز سے اس بنا پر محبت نہیں کرتے کہ وہ خود قابلِ محبت ہے بلکہ وہ صرف اِس لئے قابلِ محبت ہے کہ ہم اس سے محبت کرتے ہیں"
"خیر" میں نے کہا ع

"اب یہ بازی رہنے دو ہم ہار گئے تم جیت گئے"

اس کے بعد اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور ہم لوگ آرام کرنے کو اُٹھ گئے
اسی طرح ایک عرصہ گزر گیا۔ ہم یوں ہی شرابِ محبت میں سرشار تھے کہ واقعات نے دوسرا رُخ پلٹا۔ کچھ دنوں سے "اُن" کو معمولی بخار کی شکایت ہو گئی تھی، اور اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ بہت زیادہ نحیف و مضمحل ہو گئے تھے۔ اُن کی وہ تمام شوخیاں اور تبسم آمیز باتیں ختم ہو چکی تھیں

ایک صبح میں "اُن" کے پاس بیٹھی تھی، یکایک اُن کا چہرہ تمتما اُٹھا اور غیر معمولی لہجہ میں (جس سے میں کبھی آشنا نہ تھی) بولے "اس تجاہل کا مطلب"

میں نے کہا ــــــ "تجاہل..... آخر تم کو اس قدر بدگمانی کیوں ہے، کہو تو کیا حال ہے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔"

آبدیدہ ہو کر بولے "مجھے تم سے تجاہل نہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم کو مجھ سے تجاہل ہے...... تم کو یاد ہوگا کہ تم نے ایک دفعہ کہا تھا 'مرد سب کچھ کر سکتا ہے مگر محبت نہیں کر سکتا'.... آہ تم مجھے نہ سمجھ سکیں اور یہی غم آج مجھے موت کے گھاٹ اُتار رہا ہے۔"

"ہرگز نہیں، قطعی نہیں" میں نے کہا "میرا مطلب یہ نہ تھا۔"

ہونٹوں پر تبسم لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "عورت کا دل بھی محبت سے لبریز ہے اور مرد کا دل بھی اُسی آگ سے مشتعل رہتا ہے، فرق یہ ہے کہ عورت کا دل ایک آبگینہ ہے جو ذرا سی ٹھیس سے فوراً چور چور ہو جاتا ہے۔ اور مرد کا دل ایک شمع ہے جو پگھل پگھل کر ختم ہو جاتا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ جس طرح دو مختلف رنگ کے سپید اور نیلے شیشوں میں شراب ہو ایک جگہ رنگ نمایاں اور دوسری جگہ نظروں سے مستور...... محبت سب کچھ ہے اور سب کچھ کر سکتی ہے۔"

اتفاقاً اُن کے آنسو میرے زانو پر گرے، ایک تیر تھا جو جگر کے پار ہو گیا، میں بے اختیار رونے لگی۔ مجھے حسرت سے دیکھ کر کہنے لگے "تم بھی رو رہی ہو"

"للہ اب آپ ان باتوں کو دماغ سے نکال دیجئے اور سو جائیے" میں نے کہا "میں سمجھ گئی مرد بھی محبت کر سکتا ہے۔"

کچھ وقفہ کے بعد بولے "میری آخری..... اور حقیر سی التجا ہے کہ تم مجھے بھول جانا.... دیکھو میرے تصور کو بھی اپنے خیال میں نہ آنے دینا۔"

اُن کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے، میں حیرت کے عالم میں مبہوت تھی اور اپنی غلط فہمی پر دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کر رہی تھی...... مگر آہ وہ وقت گذر چکا تھا.... اور اُن کے سرہانے بھیانک موت کی بے ربط آوازیں میرے دماغ میں گونج رہی تھیں:

آہ! موت نے اُن کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لیا۔

اب بھی پہلے کی طرح سورج نکلتا ہے۔ شام ہوتی ہے، وہی رات کی تاریکی ہوتی ہے

اور وہی چاند کی کرنیں، مگر میری دنیا ہمیشہ کے لئے تاریک ہو چکی ہے۔ آہ! اب مجھے خود بھی احساس نہیں کہ میں زندہ ہوں یا مُردہ۔ مگر عقل والے مجھے "دیوانہ" کہتے ہیں..... میرے سامنے جب دنیا کا نام لیا جاتا ہے تو میں گھنٹوں استغراق کے عالم میں ڈوب جاتی ہوں، وہ استغراق نہیں جو پہلے تھا بلکہ ایک جمود اور بے حسی کا عالم..... بے اختیار میری زبان سے نکل جاتا "دنیا ہائے دنیا! میری دنیا تو ختم ہو گئی۔ تصویر تھی جو مٹ گئی اور اب صرف حسرت ہی حسرت رہ گئی!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

غزل

حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی

کسی رنگ میں دلستانی نہیں ہے
کوئی شے یہاں جاودانی نہیں ہے

ہے ٹھہراؤ بھی، صرف فانی نہیں ہے
حقیقت ہے دنیا کہانی نہیں ہے

خیالات کی حیرت انگیز دنیا
کسی طرح بھی آنی جانی نہیں ہے

یہ ہے ہاں یہ ہے ماجرائے حقیقت
نہیں ہے یہ افسانہ خوانی نہیں ہے

لہو ہے لہو سب یہ توبہ کا دل میں
سبو میں مئے ارغوانی نہیں ہے

عجب ہے یہ حالت مرے آنسوؤں کی
نری آگ ہے اُن میں پانی نہیں ہے

یہ کیا ہو گیا ہائے قلب و جگر کو
کہ آنکھوں کی وہ خونفشانی نہیں ہے

ارے مجھ میں چھپ کے یہ کیا کہہ رہے ہو
میری بات میری زبانی نہیں ہے

بسی دل میں ہے ایک دنیا کہ جس میں
کہیں کوئی رازِ نہانی نہیں ہے

نہ جینا خوشی کا نہ مرنا خوشی کا
خوشی تو ہے جب زندگانی نہیں ہے

روانی میں ہے عمر رُکتی ہوئی سی
مگر یہ تو کوئی روانی نہیں ہے

زمیں پر ہے پورا اثر آسماں کا
محبت نہیں مہربانی نہیں ہے

خدائی میں جنسِ وفا کیوں گراں ہے
خدائی میں جس کی گرانی نہیں ہے

سکت پائے جس سے نہ پیری نہ طفلی
جوانی وہ کوئی جوانی نہیں ہے

خدا خود میں ہے آپ اپنی نشانی
غلط ہے کہ اُس کی نشانی نہیں ہے

بھرے ہیں دلوں میں گماں کیسے کیسے
یہ کیا ہے اگر بدگمانی نہیں ہے

جو اس صنف میں سحر ہے مشق کم
غزل میں وہ جادو بیانی نہیں ہے

سہرے

۱۱۔ دسمبر کو ہمارے پُرانے محب اور پنجاب کے نامور شاعر منشی تلوک چند صاحب محرومؔ کے صاحبزادے عزیزی جگناتھ آزادؔ کی شادی خانہ آبادی ہوئی۔ عزیز موصوف خود بھی اُردو کے اچھے شاعر ہیں، اس لئے اس خوشی کے موقعہ پر انکی سہرا خوانی کی محفل میں شعرائے نامدار نے اپنی سحر بیانی سے اچھا سماں باندھا مکرمی محرومؔ صاحب کو بھی احباب کے اصرار پر چند اشعار لکھنا پڑے لیکن پچھلے خانگی حادثات کی خلش ابھی تک اُن کے دل سے مٹی نہیں ہے اس لئے اس خوشی کے موقعہ پر بھی دل میں وہی مضمون پیوست تھا جو موقعہ ومقام کے لحاظ سے اُس وقت تو چھپا رہا مگر انکے اشعار میں اس کی جھلک نمایاں ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ اب یہ سہرا مکمل صورت میں ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دو اور سہرے بھی جو حضرت منورؔ لکھنوی اور چمنی سرشارؔ صاحب کے فکر رسا کا نتیجہ ہیں درج ذیل ہیں۔ زمانہ کے صفحات پر محرومؔ صاحب کے خاص حقوق ہیں، لیکن شاعرانہ حیثیت سے بھی یہ سہرے قدردانی کے مستحق ہیں۔ (ا۔ز)

سہرا

(شادی خانہ آبادی جگناتھ جی آزادؔ، نتیجۂ فکر والد بزرگوار منشی تلوک چند صاحب محرومؔ)

نظر افروز ہوا نورِ نظر کا سہرا
رشکِ انجم ہے مرے رشکِ قمر کا سہرا

نہیں پروا، جو نہیں لعل وگہر کا سہرا
حق نے بخشا ہے تجھے علم وہنر کا سہرا

تیرے سہرے کی جھلک نے مجھے دکھلایا ہے
ظلمتِ شام میں انوارِ سحر کا سہرا

بھول سکتا نہیں احسان ہیں اُن پھولوں کے
بن گئے جو مرے نوشاہ کے سر کا سہرا

محوِ دل سے ہوئے تیرے ستم، اے دَورِ فلک
کہ دکھایا ہے مجھے لختِ جگر کا سہرا

یادِ وِدیا[1] کی مگر مجھکو رُلاتی ہے لہو
اشکِ خونیں ہیں مرے لعل وگہر کا سہرا

شوق سے اہلِ سخن دیکھیں گے اسکو محرومؔ
کہ یہ سہرا ہے سخن سنج پسر کا سہرا

---

[1] یہ شعر جو اس وقت موزوں ہوا تھا محفل سہرا خوانی میں نہیں پڑھا گیا تھا لیکن اب شامل کر دیا گیا ہے۔ ودیا محرومؔ صاحب کی نوجوان بچی کا نام تھا جو بچپن ہی میں ماں کی محبت سے محروم ہو گئی تھی، اور باپ نے بڑے چاؤ سے پالا پوسا تھا۔ مگر وہ بھی نو عمری ہی میں داغ مفارقت دے گئی۔

(۲) (از نتیجۂ فکر منشی بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی)

تاروں کی چھٹکتی ہوئی تنویر ہے سہرا
پھولوں کی جھلکتی ہوئی تقدیر ہے سہرا

ہر شکل سے آمادۂ تسخیر ہے سہرا
خود نور جہاں، خود ہی جہانگیر ہے سہرا

محرومؔ کے جذبات کی تصویر ہے سہرا
آزادؔ کے احساس کی تفسیر ہے سہرا

مطرب کے ترانوں کا تسلسل ہے دلآویز
شاعر کی پھڑکتی ہوئی تحریر ہے سہرا

ہے اس کی صباحت کہ فصاحت ہے سخن کی
گویا لب گلرنگ کی تقریر ہے سہرا

پنجاب میں کیسر کی ہے پھولی ہوئی کیاری
اک نقش سر دامن کشمیر ہے سہرا

انوار سحر شام کے دامن میں نہاں ہیں
اک موجۂ دریائے طبا شیر ہے سہرا

روکے ہوئے تھامے ہوئے شدیز نظر کو
اک سلسلۂ شوق عناں گیر ہے سہرا

بیدار ہے نوشاہِ جواں سال کی تقدیر
کیا جانیئے کس خواب کی تعبیر ہے سہرا

منظور دعا ہو کے رہی ہر کہ و مہ کی
یعنی ہمہ تن جلوۂ تاثیر ہے سہرا

آج اس پہ جگن ناتھ کا قبضہ ہے مسلّم
محرومؔ کے فرزند کی جاگیر ہے سہرا

حاصل اسی رشتہ سے ہے اعزاز دلھن کو
دولھا کے لئے باعث توقیر ہے سہرا

ہر شعر میں تاثیر کچھ ایسی ہے منورؔ
مقبول بر رنگ سخن میرؔ ہے سہرا

(۳) (از مہاشے جیمنی سرشارؔ، خیر پور سادات)

پھولا جامہ میں سماتا نہیں یکسر سہرا
ہے جواں بخت جگن ناتھ کے سر پر سہرا

بہر نوشہ بنی ہر تار شعاع خورشید
کہکشاں، انجم تاباں، مہ انور سہرا

شکر خالق ہے کہ آج آپ نے خود دیکھ لیا
اپنے دلبند کا محرومِ سخنور سہرا

لگ نہ جائے کہیں بدبیں کی نظر دولھا کو
بن گیا اس سے نقاب رخ انور سہرا

کل تک آزاد تھا آزادؔ، ہوا آج اسیر
اپنی کوشش میں ہے منصور و مظفر سہرا

ہو رہائی نہ کبھی اس سے میاں بیوی کو
ایسی زنجیر محبت بنے گز بھر سہرا

دیدنی ہے یہ تری تاب رخ رنگ و شباب
لے بلائیں ترے عارض کی نہ کیونکر سہرا

ہے جگن ناتھ سے نوشاہ کے سر کی زینت
دیکھ پروین فلک تجھ سے ہے بہتر سہرا

توڑ لا عرش کے تاروں کو برادر کے لئے
گوندھ سرشارؔ نے کر گل و گوہر سہرا

تنقید کتب

دیر و حرم

یہ چودھری منظور احمد بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ وزیر آبادی سکریٹری میونسپل بورڈ لائلپور (پنجاب) کے دلآویز کلام کا مجموعہ ہے جس میں غزلوں کے علاوہ نظمیں اور گیت بھی ہیں۔ منظور صاحب کو نہ صرف اُردو زبان بلکہ ہندی پر بھی بے تکلف عبور حاصل ہے۔ چنانچہ زبان کی سلاست، لفظوں کی روانی، ترکیبوں کی چستی اور روزمرہ کی درستی کے ساتھ اچھے سے اچھے اور بلند پایہ خیالات کو بے ساختگی کے ساتھ نظم کر دیتے ہیں اور یہی بات ایک فطری شاعر کی خصوصیت ہے۔

جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے فاضل مصنف نے جدید رنگِ تغزل کی خوب دادِ سخن دی ہے۔ ان کی نظمیں بھی خوش آیند و کیف پرور ہیں، اور بعض نظموں کی سلاست و روانی خاص طور پر قابل تعریف ہے۔ آپ کی منظر نگاری اور شاعرانہ ادا کاری کے چند نمونے درج ذیل ہیں:۔

جب شام و سحر کے چکر میں ہر سال بہاریں آتی ہیں
جب کالی گھٹا کے دامن میں بگلوں کی قطاریں آتی ہیں
جب کوئل کوکو کرتی ہے، جب بوندا باندی ہوتی ہے
جب آم کا ٹپکا پڑتا ہے، جب گھر گھر شادی ہوتی ہے
جب کہرا خیمہ تنتا ہے، جب سرد ہوائیں آتی ہیں
جھولی میں موتی لاتی ہیں، چاندی کا فرش بچھاتی ہیں

خیالات گو سطحی ہیں مگر دلآویزی اور بے ساختگی کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں جس کی بدولت اشعار میں برسات کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

غزلیات میں بھی آپ نے اپنے جولانیٔ طبع کا ثبوت دیا ہے، مثلاً

یہ شوخ نظر توبہ، یہ چال معاذ اللہ
اُڑتے ہوئے شعلے ہیں، بہتا ہوا پانی ہے
اِک گوشۂ عزلت میں، اِک بامِ تماشا پر
یہ میری تمنا ہے، وہ تیری جوانی ہے
اِک دودِ چراغِ دل، اِک بوئے گلِ رعنا
یہ میرا فسانہ ہے، وہ تیری کہانی ہے

تینوں شعر عمدہ ہیں اور تخئیل بھی پاکیزہ ہے، البتہ لف و نشر مرتب کرتے ہوئے آپ "یہ" اور "وہ" کی ضمیریں اتفاق سے غلط استعمال ہو گئیں۔ مثلاً پہلا مصرعہ ہے "اِک گوشۂ عزلت میں، اِک بامِ تماشا پر" اس میں "گوشۂ عزلت" دور کی چیز ہے کیونکہ مصرعہ میں سب سے پہلے ہے اور "بامِ تماشا" قریب کی چیز ہے، اس لئے دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیئے تھا۔ "وہ میری تمنا ہے، یہ تیری جوانی ہے" پورا شعر اس طرح ہونا چاہیئے۔

اِک گوشۂ عزلت میں، اِک بامِ تماشا پر　　وہ میری تمنا ہے، یہ تیری جوانی ہے

اِسی طرح دوسرے اشعار بھی ترمیم طلب ہیں۔

فارسی اور برج بھاشا بڑی شیریں اور رسیلی زبانیں ہیں، اس لئے اگر اِن زبانوں کے لفظوں سے کوئی خوبی پیدا ہوسکے تو انھیں ضرور استعمال کرنا چاہیئے۔ مگر اس بارے میں ٹھولنس ٹھالنس جائز نہیں ہے۔ منظور صاحب نے بھی بعض نظموں میں ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں جو بہت لطف دیتے ہیں۔ البتہ بعض جگہ ایسے غیر مانوس الفاظ آگئے ہیں جو ذرا اُکھڑے سے معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں کے نمونے ملاحظہ ہوں:-

"جب سے گئے پردیس" نامی گیت میں منظور صاحب لکھتے ہیں:-

پھر بوندوں نے کان میں کہدی بھولی بسری بات　　ناگن بنکر ڈسنے آئی دُکھ کی کالی رات

رِم جھم رِم جھم میگھا برسے، بھیگی ہے برسات　　پھر چھلکا ہے آنکھ کا ساگر، پھر کانپی ہے گات

یہ بند بہت اچھا ہے اور ہندی کے سب لفظ اپنی اپنی جگہ لطف دے رہے ہیں۔ اگر "دُکھ" کی جگہ "برہ" اور "میگھا" کی جگہ "سینہا" لکھدیا جاتا تو زیادہ فصیح ہوجاتا۔ دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو:-

بیتی جائے عمریا فانی　　لُٹتا جائے روپ جوانی

اُلفت کے پتوار بنائیں　　اپنی نیّا پار لگائیں

ان شعروں میں "فانی" اور "الفت" ذرا بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں۔

بہرحال منظور صاحب کا کلام قابل تعریف ہے، اور دوسرے شاعروں کے کلام میں جو لغویات پائے جاتے ہیں اُن سے یہ مجموعہ بڑی حد تک پاک ہے۔ کتاب کے شروع میں علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کا تعارف اور محترمہ نجمہ تصدق بی۔اے، بی۔ٹی کا دیباچہ ہے۔ جن میں آپ کے کلام کی خصوصیات اُجاگر کی گئی ہیں لکھائی چھپائی جلد بندی وغیرہ سب بہت عمدہ ہے ضخامت دوسو صفحات قیمت دو روپیہ ۸؍۔ ملنے کا پتہ: لاہور بک شاپ بنسپت روڈ لاہور

شمعِ ازل[1]

اس زمانہ میں جبکہ شعر و شاعری حُسن نوازی، بادہ خواری سے بڑھکر اشتراکیت، کمیونزم، وطنیت و دین فراموشی کا ترجمان بنگئی ہے حضرت اختر زبیری نے اپنے لئے ایک نیا میدان پیدا کیا ہے یعنی ابتدائے اسلام کے جو مشہور لوگ گزرے ہیں اُن کی مدح و ستائش میں اپنے زورِ طبیعت کو صرف کیا ہے اور محمد صاحب اُنکے جانشینوں، اُنکی بیویوں اور اُنکے صحابیوں کی شان میں عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ اختر صاحب کی بعض سیاسی نظمیں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جیسے "فرانس کے مظالم" لیکن اگر کسی واقعہ سے ہٹکر بھی کوئی نظم لکھی ہے تو اسمیں بھی عہدِ رسالت کے حوالے دیئے ہیں۔ جہاں جہاں کوئی شعر تلمیح طلب آگیا ہے وہاں فٹ نوٹ دے کر تشریح کردی گئی ہے۔

---

[1] لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ نفیس حجم ۲۲۶ صفحات قیمت ایک روپیہ جو کچھ زیادہ نہیں ملنے کا پتہ: زبیر منزل پاٹا نالہ لکھنؤ۔

رفتارِ زمانہ

ممالکِ غیر

پچھلی مرتبہ جب اِن صفحات میں واقعاتِ جنگ کا ذکر کیا گیا تھا اُس وقت یونان پر جرمن حملے کا اندیشہ کیا جا رہا تھا، بلغاریہ پورے طور سے جرمنی کے اثر میں آ چکا تھا، روس کی خاموشی پریشانی کا باعث ہو رہی تھی ترکی نے بلغاریہ سے غیر جارحانہ معاہدہ کر کے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ وہ یونان کی جنگ میں شامل ہو کر اپنی جان جوکھوں میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ البانیہ میں یونان اٹلی کو برابر شکست پر شکست دے رہا تھا، اور اٹلی کے لئے جرمنی سے امداد لینے کے سوا اور چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ہٹلر نے اپنی پوری طاقت سے یوگوسلافیہ اور یونان پر قریب قریب ایک ساتھ حملہ کر دیا، دونوں جگہ اُسے غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ ان دونوں ملکوں کے ساتھ بھی اُس نے وہی رویہ اختیار کیا جو پچھلے سال یورپ کے دوسرے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے ساتھ اختیار کیا تھا یعنی اُس نے یوگوسلافیہ کو محوری قوتوں کے ساتھ نئے نظام میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ شاہزادہ پال نائب السلطنت نے یوگوسلافیہ کی طرف سے محوری معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ مگر عوام نے یہ کارروائی پسند نہ کی اور اُس کے خلاف جگہ جگہ مظاہرے شروع ہو گئے۔ فوج بھی بگڑ گئی۔ یہ حالت دیکھکر شاہزادہ پال تو ملک سے فرار ہو گئے اور فوجی افسروں نے تین ہی دن کے اندر نوعمر پرنس پیٹر کو تختِ سلطنت پر بٹھا کر شاہزادہ پال کے تمام وزیروں کو گرفتار کر لیا اور فوج کا بھی اجتماع شروع ہو گیا۔ ہٹلر کو یہ ناگوار ہوا اور اُس نے اپنے معاہدہ کی تصدیق کے علاوہ مطالبہ کیا کہ یوگوسلافیہ اپنے فوجی اجتماع کو منتشر کرے، اور جب یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو جرمنوں نے یوگوسلافیہ اور یونان دونوں پر حملہ کر دیا۔ یوگوسلافیہ پر تو چاروں طرف سے حملہ کر کے بلغراد کو دم کی دم میں تباہ و برباد کر دیا گیا، یونان پر دو طرف سے حملہ ہوا۔ حملہ آور فوجیں ایک طرف تو مغربی تھریس سے سالونیکا کی طرف بڑھیں، دوسری طرف بحیرۂ ایجین کے ساحل سے حملہ کر کے یونان اور ترکی کے تعلقات منقطع کر دیئے گئے۔ برطانیہ نے یونان کی امداد کا وعدہ کیا تھا، چنانچہ یونان کی درخواست پر برطانیہ کو شمالی افریقہ کے میدان سے بہت سی فوج بلقان کے محاذ پر بھیجنا پڑی۔ برٹش فوج نے یونانیوں کے ساتھ ملکر مناستر کے قریب مورچے قائم کئے۔ لیکن مغربی تھریس پر اس زور شور سے جرمن حملہ ہوا کہ کوئی مقابلہ کارگر ثابت نہ ہوا اور یونانیوں کو تھریس خالی کرنا پڑا۔ مناستر کے قریب بھی جرمنی کی مشینی فوج نے اپنے اندھا دھند حملوں سے یوگوسلافی مورچوں میں ایسے رخنے ڈال دیئے کہ یونان کی مشرقی فوج سے ان کا سلسلہ بالکل ٹوٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف مناستر پر اور دوسری

طرف سالونیکا پر دشمن کا قبضہ ہوگیا۔ یوگوسلانی فوجوں نے ہر مقام پر غیر معمولی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن وہ جرمنی کے اعلیٰ سامان جنگ اور کثرت فوج کی تاب نہ لاسکیں اور مناستر، پایہ تخت بلغراد، سراجیو وغیرہ بڑے بڑے شہر یکے بعد دیگرے دشمن کے قبضے میں چلے گئے۔ اسی درمیان میں کروٹ قوم کے لوگوں نے شاہ پیٹر کے ساتھ دغا کی اور جرمنی کی سرپرستی میں اپنی آزادی و خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوگوسلافیہ کی کثیر فوج نے دو محاذوں پر ہتھیار ڈال دیئے جس سے یوگوسلافیہ کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے مقابلہ کا خاتمہ ہوگیا۔ شاہ پیٹر کو اپنے وزیروں کے ساتھ یروشلم میں پناہ لینا پڑی۔ یونانی اور برطانوی فوجوں نے اسکے بعد اپنا محاذ ازسرنو درست کرنا چاہا لیکن نئے مورچوں پر بھی جو کوہ اولمپس سے لیکر البانیہ کی سرحد تک پھیلے ہوئے تھے جرمنوں نے ایسے سخت اور شدید حملے کئے کہ یہ بھی قائم نہ رہ سکے۔ مگر ان اندھا دُھند حملوں میں جرمنوں کا نقصان عظیم ہوا۔ امریکن اخبارات کا بیان ہے کہ یونان کی جنگ میں ساٹھ ہزار جرمن جان سے مارے گئے اور ڈھائی لاکھ جرمنوں کے قریب زخمی ہوئے، اتحادیوں کا نقصان بہت کم ہوا۔ لیکن جرمنی کی کثیر موٹر سوار فوجوں اور بیشمار ہوائی جہازوں نے مدافعت و مقابلہ کا کوئی انتظام قائم نہ رہنے دیا۔ یہ مقابلہ اتنا نا برابر ثابت ہوا کہ یونانی اور برطانوی فوج کو برابر پیچھے ہٹنا پڑا اور شاہ یونان کو اپنی گورنمنٹ کے ساتھ اپنے پایہ تخت سے ہٹ کر کریٹ چلا جانا پڑا۔ برطانوی فوجیں اپنے اپنے مقامات پر واپس پہونچادی گئیں کہتے ہیں کہ اس وقت تک برطانیہ کے ساٹھ ہزار سپاہی یونان پہونچ چکے تھے جن میں کم سے کم ۴۵ ہزار سپاہی صحیح سلامت یونان سے واپس پہونچا دیئے گئے۔ تھرماپلی کی مشہور گھاٹی میں جو جنگ ہوئی اس میں انگریزوں کے تین ہزار سے زیادہ سپاہی قتل اور زخمی نہیں ہوئے مگر یہ لوگ ایسی بہادری سے لڑے کہ جرمنی کی پانچ گنی فوج کو بھی ایک ایک مقام پر دو دو دن تک رُکے رہنا پڑا اور ہر جگہ کثیر نقصانات اٹھانا پڑے۔ برطانیہ کا جنگی سامان ضرور بہت کچھ پیچھے پڑا رہ گیا لیکن کہا جاتا ہے کہ اس میں زیادہ تر وہ چیزیں تھیں جن کی جرمنوں کے پاس کمی نہیں ہے۔
اس وقت اصلی یونانی گورنمنٹ تو کریٹ میں ہے لیکن جرمنوں نے پایہ تخت ایتھنس میں ایک کٹھ پتلی گورنمنٹ جنرل اسلوکیجو کے ماتحت قائم کر دی ہے۔ یہ شخص ایپیرس کی فوج کا کمانڈر تھا اور اسی کے حکم سے ایپیرس کی یونانی فوج نے جرمنوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

اِن دو ملکوں کے زیر ہو جانے کے بعد ترکی کے رویہ سے بھی کمزوری کا اظہار ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے چپ چاپ جرمنی سے ایک تجارتی معاہدہ کر لیا ہے جس کی رو سے ترکی جرمنی کی بنائی ہوئی مشینوں کے عوض اُسے تمباکو مہیا کریگا۔ اس معاہدہ کے مطابق ایک کرور دس لاکھ ترکی پاؤنڈ کا لین دین ہوگا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترکی اور جرمنی کے درمیان ایک اور تجارتی معاہدہ کی بات چیت ہو رہی ہے جس کی رو سے چالیس لاکھ ترکی پاؤنڈ کی زراعتی پیداوار جرمنی بھیجی جائیگی
ترکش پارلیمنٹ نے بھی ۲۹۔ اپریل کو اس معاہدہ پر اپنی منظوری دے دی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس معاہدہ کی تہ میں

روس کا دباؤ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بلقان میں جرمن فتوحات نے ٹرکش مدبروں کو اپنے رویہ پر نظرثانی کرنے پر مجبور کیا۔ بہرحال جو کچھ ہو مگر یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو رہی ہے کہ ترکی میں برطانوی اثر کم کرنے کی زور شور سے کوشش ہو رہی ہے اور عجب نہیں کہ ترکی اس اعتماد کو قائم نہ رکھ سکے جتنا کہ ابتک برطانیہ کو اسکے ساتھ تھا۔ ہٹلر مارشل پٹیان اور جنرل فرانکو پر بھی دباؤ ڈال رہا ہے۔ فرانس سے جنگی جہازوں کا مطالبہ ہے اور اسپین سے جبرالٹر کے حملے میں امداد دینے کی فرمایش ہے۔ مصر پر بھی حملے کی دھمکیاں ہیں اور نہر سویز پر قبضہ کرنے کی فکر ہے۔ اور عراق وغیرہ پر بھی اقتدار جمانے کی کوشش ہے۔ ترکی یونان و یوگوسلافیہ کا ساتھ دیتا اور روس بلغاریہ کی مدد کرتا تو ہٹلر کے لئے بلقان پر اس قدر جلد قابو پا لینا ذرا مشکل کام ہوتا۔ لیکن حالات نے اس وقت آزادی کے لئے جان دینے والوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ظلم و تشدد کرنے والی طاقتوں ہی سے موافقت کی۔ مگر یونان میں جرمنوں کو اپنے مقابل فوجوں کی بہادری اور پامردی کا حال بھی معلوم ہو گیا۔

ہٹلر نے شمالی افریقہ میں بھی انگریزوں کے خلاف اٹلی کو مدد دینا شروع کر دیا ہے۔ اس نے اٹلی کے جزیرہ سسلی پر تسلط حاصل کر لیا ہے، اور وہاں اپنے ہوائی اور سمندری اڈے قائم کر لئے ہیں اور ان کے ذریعہ اس نے ایک طرف تو بہت سا جنگی سامان اور فوجیں لیبیا کی بندرگاہ طرابلس میں پہونچا دیں، دوسری طرف اس نے جزیرہ مالٹا پر روزانہ ہوائی حملے کرنا شروع کر دیئے ہیں تاکہ کم سے کم مالٹا کی طرف سے جرمن فوج کی آمد و رفت میں کوئی مزاحمت نہ ہو سکے ممکن ہے ٹیونس علاقہ فرانس کے ساحل سے مدد لی گئی ہو۔ خیر کچھ ہو یہ واقعہ ہے کہ جرمنی نے نہایت خاموشی سے ہزارہا آہن پوش توپ گاڑیاں اور دوسرا سامان جنگ طرابلس پہونچا دیا۔ اور جب برطانیہ کو اپنی فوج کا ایک معقول حصہ لیبیا سے ہٹا کر بلقان بھیجنا پڑا اُس وقت جرمنوں نے برق رفتاری کے ساتھ حملہ کر کے پہلے کئی چھوٹی چھوٹی چوکیاں اور پھر بنغازی۔ درنہ۔ غزالہ اور آس پاس کے مقامات لے لئے۔ طبروق میں ابھی تک برطانوی فوج موجود ہے جو دشمن کا سختی سے مقابلہ کر رہی ہے مگر دشمن نے اس کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اور مصر سے بھی وہ طبروق کا راستہ بند کر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ تھوڑا سا چکر کھا کر مارد یہ اور لیبیا کے قلعہ قبازو پر قبضہ کر لیا ہے، اور الاذم اور مصر کی بندرگاہ سولم پر بھی دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اس طرح جس تیز رفتاری سے برطانوی فوج نے بنغازی تک لیبیا کا علاقہ فتح کر لیا تھا، اُس سے بھی زیادہ جلد اس علاقے پر اب جرمن قابض ہو گئے ہیں۔ مگر جب تک بحیرۂ روم پر برطانیہ کا قبضہ ہے لیبیا کی حالت زیادہ تشویشناک نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ طرابلس سے لیکر سولم تک ہزار ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ ہے اور اگر رسد اور سامان جنگ کے لئے سمندری راستے میسر نہ ہوں خشکی کی راہ سے مدد پہونچانا بہت دشوار ہے۔ یہ تو شمالی افریقہ کا حال ہوا۔ مشرقی افریقہ میں اطالوی سمالی لینڈ فتح ہو چکا ہے، برٹش سمالی لینڈ واپس لے لیا گیا ہے۔ ارٹیریا پر بھی برطانوی قبضہ ہو گیا ہے اور ملک حبش پر تیزی کے ساتھ قبضہ ہوتا جا رہا ہے،

اس طرح کم سے کم مشرقی افریقہ میں تو اٹلی کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

مگر اس جنگ میں افریقہ کی فتوحات کی خاص برطانیہ کی لڑائی اور اطلانتک کی بحری جنگ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ اسی لئے اطلانتک میں برطانوی جہازوں کے ڈبونے کی مہم اس زور شور سے جاری ہے کیونکہ ہٹلر خوب جانتا ہے کہ جب تک برطانیہ اس کا مقابلہ کرنے کو موجود ہے اس کی ساری فتوحات بیکار رہیں گی، اور برطانیہ اسی وقت مجبور و معذور ہو سکتا ہے جب اس کی ناکہ بندی کر کے اس کو خود اس کے گھر میں تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اسی لئے موسم بہار کے شروع ہوتے ہی لندن اُس کے مضافات اور تمام مشہور اور اہم مقامات میں بڑی شدت سے ہوائی حملے کئے جا رہے ہیں۔ ان حملوں سے جان و مال دونوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ مگر برطانیہ کے دلاور باشندے جس بہادری پامردی اور اُولوالعزمی سے ان حملوں کا مقابلہ کر رہے ہیں وہ دنیا کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ہوائی حملوں کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آخر مارچ ۱۹۴۱ء تک برطانیہ کے اونتیس ۲۹ ہزار آدمی جان سے مارے گئے اور چالیس ہزار زخمی ہوئے۔ یہ ہوائی حملے کیسے بے محابا اور بیدردانہ کئے گئے ہیں اس کے متعلق یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ برطانوی اسپتالوں کے دوسو پینتیس ۲۳۵ مریض بھی ہوائی حملوں سے ہلاک ہو گئے۔ تاریخی عمارتیں، گرجا گھر، کتب خانے اور ہوٹل، تھیئٹر سبھی کو ان سے نقصان عظیم پہونچا ہے۔ برطانیہ بھی ان حملوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے رہا ہے۔ اور اس کی ہوائی طاقت پچھلے سال کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، اور جرمنی کے اہم فوجی مقامات اور صنعتی کارخانوں کو کثیر نقصانات پہونچائے گئے ہیں اس وقت تک جرمنی میں بھی ہزارہا ٹن گولے برسائے جا چکے ہیں۔

حال میں السٹر کے جنوبی ساحل پر بھی جرمنی نے شدید گولہ باری کر کے نقصان عظیم پہونچایا، لیکن ابھی تک اسکو خود برطانیہ پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں پڑی، اور یہ حملہ ہٹلر کے لئے بھی ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اسی لئے وہ برطانیہ کی ناکہ بندی کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے جس کے لئے وہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ کیونکہ جب تک بحیرۂ اطلانتک سے جنگی سامان آتا رہیگا ہٹلر کی خیر نہیں ہے۔ پریسیڈنٹ روزویلٹ اور اُن کے وزیر بار بار کہہ چکے ہیں کہ امریکہ اس بات کو کبھی گوارا نہ کریگا کہ اس کا قیمتی مال جو وہ برطانیہ کی امداد کے لئے شبانہ روز محنت کر کے تیار کر رہا ہے برطانیہ پہونچنے کے بجائے سمندروں کی تہہ تک پہونچا دیا جائے۔ امریکن سینیٹ کی کمیٹی نے بھی پریسیڈنٹ روزویلٹ کو پورے اختیارات دے رکھے ہیں اور پریسیڈنٹ موصوف نے تہیہ کر لیا ہے کہ جنگی سامان لیجانیوالے جہازوں کے ساتھ مسلح جہازوں کا ایک دستہ بھی امریکن ساحل سے دو ہزار میل تک ان کی حفاظت کے خیال سے بھیجا جایا کریگا۔ جنگی سامان کی تیاری میں بھی امریکہ اپنی پوری طاقت صرف کر رہا ہے۔ غرض محوری طاقتوں کے ظلم و تشدد کو ختم کرنے کیلئے امریکہ اور برطانیہ کے عزم صمیم میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس عرصہ میں امریکہ کے

باشندے بھی پہلے سے کہیں زیادہ جوش کے ساتھ اپنے پریسیڈنٹ کے ساتھ ہیں اور مسٹر چرچل کہتے ہیں کہ جب کبھی ہوائی حملوں کے شکار لوگوں سے بات چیت کرتے ہیں یا مسمار و برباد شدہ مقامات کا معائنہ کرتے ہیں تو عوام کی ہمت اور مستقل مزاجی دیکھ کر ان کی روح تازہ اور بشاش ہو جاتی ہے۔ مسٹر چرچل نے اپریل کے آخری ہفتے میں اپنی براڈکاسٹ اسپیچ میں بلقان کے واقعات اور ہٹلر کی فتوحات بیان کرنے میں جس صاف گوئی اور راستبازی سے کام لیا ہے اس سے بھی یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ برطانیہ کے لوگ اس جنگ میں ہمت ہارنے والے نہیں ہیں اور خواہ کچھ ہو مگر ہٹلرازم کو ختم کئے بغیر دم نہ لیں گے۔ اس وقت بلقان میں جرمن اقتدار قائم ہو جانے کے بعد بھی برطانیہ کی صورت حال جون ۱۹۴۰ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ اچھی ہے۔ اور اگر چند ماہ بھی جنگ کھنچ گئی تو پھر پالسہ پلٹ ہی کر رہے گا۔

ہندوستان

جنگ کی وجہ سے یورپ میں انقلابی تبدیلیاں ہو رہی ہیں لیکن ہندوستان میں حکومت کے رویہ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ البتہ ہماری خانہ جنگی میں ترقی ضرور نظر آ رہی ہے۔ "پاکستان" کی پرزور حمایت نے کچھ دنوں سے ہندو مہاسبھا میں ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ اس لئے مدراس اور صوبہ متحدہ میں مسٹر جناح کے مجوزہ تقسیم ہندوستان کی تائید میں دھوم دھامی کانفرنسیں ہوئیں۔ لاہور میں بنگال۔ پنجاب۔ سندھ اور صوبہ سرحد کے قلیل التعداد ہندوؤں کی ایک اہم کانفرنس بھی ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کی صدارت میں ہوئی۔ پنجاب کے نوجوان ہندوؤں کی انجمن نے ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کے اعزاز میں ایک اہم خیر مقدمی جلسہ کیا۔ کانفرنس میں راجہ نریندر ناتھ صاحب کول صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنی تقریر میں اس مسئلہ کی مفصل تاریخ بیان کی اور ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے اپنی صدارتی تقریر میں گورنمنٹ کی پالیسی پر پرزور نکتہ چینی کی۔ آپ نے ہندو مہاسبھا کی طرف سے کہا کہ ہم ہندوستان کے سب باشندوں کو بلا تفریق مذہب و ملت یکساں حقوق دینے کو تیار ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ وہ بلا استثنا ہندوستان کے رنج و راحت کے شریک بنے رہیں اور اسی سرزمین کو اپنا مادری ملک سمجھیں۔ اصل ریزولیوشن میں بھی جو اس کانفرنس میں پاس ہوا، وطن پرستی پر خاص زور دیا گیا اور آئندہ آئین ہند سے فرقہ واری جذبات کو بالکل مٹا دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے محرک نے کمیونل ایوارڈ کی سخت مذمت کرتے ہوئے کہا کہ محب وطن ہندو سب کے لئے انصاف و مساوات کا طلبگار ہے اور کسی کے لئے کوئی خاص رعایت نہیں چاہتا یک ایسے صوبے میں جہاں ہندوؤں کی تعداد قلیل ہے یہ ایک اہم اعلان ہے۔

مسلم لیگ نے اپنے اجلاس مدراس میں اپنے اغراض و مقاصد میں یہ اصولی تبدیلی منظور کر لی ہے کہ اس نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہی اپنا مقصد قرار دیا ہے۔ صوبہ متحدہ میں مسٹر جناح نے

حال میں جو تقریریں کیں ان میں بھی اُنھوں نے اسی بات کو بار بار دُہرایا کہ جب تک پاکستان کا اُصول تسلیم نہ ہو جائے گا وہ مستقل طور پر کوئی آئین مرتب و منظور نہ ہونے دیں گے۔ عجیب بات ہے کہ ابھی تک اس تقسیم کے اُصول اور تفصیلات واضح نہیں کی گئی ہیں اور نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ سیاسی۔ اقتصادی اور جغرافیائی حیثیت سے یہ تقسیم کس طرح عمل میں آئیگی۔ مختلف اسکیمیں ضرور شائع ہو چکی ہیں۔ مگر کسی میں ان اہم مسئلوں کو قابل اطمینان طریقے سے حل کرنے کی کوشش نہیں ہوئی ہے۔ اسی سبب سے بابو راجیندر پرشاد کو یہ کہنا پڑا کہ جب تک کوئی مستند و مفصل اسکیم سامنے نہ آئے۔ کانگریس کے لیڈران اس کی بابت کوئی رائے نہیں دے سکتے۔ البتہ کانگریس اس خیال کو ملک کی ترقی اور سلامتی کے لئے مہلک سمجھتی ہے۔ مسٹر جناح نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ کانگریس کو پہلے اُصولی حیثیت سے اس مطالبے کو منظور کر لینا چاہیئے اس کے بعد تفصیلات طے ہوتی رہیں گی۔ ظاہر ہے کہ کانگریس جو ملکی اتفاق و یگانگت کے لئے پچاس سال سے زیادہ عرصہ سے سرتوڑ کوشش کر رہی ہے اپنا کیا دھرا دم زدن میں کیسے ملیا میٹ کر سکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ آج اسی باہمی نفاق کی بدولت یورپ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کی کیا حالت ہو رہی ہے خود انگریزوں کے آنے سے پہلے چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستوں کی کیا حالت تھی۔

بہر حال مدراس اور صوبہ متحدہ میں پاکستان کی موافقت میں ریزولیوشن پاس ہوئے اور مظاہرے کئے گئے۔ مسٹر جناح اس اسکیم کی خاطر ان صوبوں کے مسلمانوں سے بقیہ ملک کے مسلمانوں کی خاطر ایثار و قربانی طلب کر رہے ہیں لیکن ہم کو یہی یقین ہے کہ جلد یا دیر میں اس بارے میں عوام کا مغالطہ دور ہو جائیگا اور حقیقت حال واضح ہو جائیگی لیکن اس وقت اطراف ملک میں اس تحریک سے جو ہیجان پیدا ہو گیا ہے اس سے اکثر مقامات پر باہمی تعلقات بہت تلخ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ڈھاکہ۔ احمد آباد۔ بمبئی۔ کانپور وغیرہ میں اسی ماہ ہولناک فسادات ہوئے جن میں کشت و خون۔ لوٹ مار سے دریغ نہیں کیا گیا۔ اورنگ زیب (؟) پر بھی حملے ہوئے۔ یہ واقعات فریقین کے لئے شرمناک ہیں۔ اور ہر شخص کو ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے گورنمنٹ کو پاکستان اور اینٹی پاکستان دونوں قسم کے مظاہروں کو یک لخت بند کر دینا چاہیئے۔ اگر یہ مظاہرے امن و امان میں خلل ڈالنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ جنگ کے شعلے ہندوستان کے پھاٹک تک پہنچ چکے ہیں۔ گورنمنٹ کو ہندوستان کے آئینی مسئلہ کو بھی طے کر ڈالنا چاہیئے۔ مارچ میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب کی صدارت میں بمبئی میں اعتدال پسند ملکی لیڈران کی ایک اہم کانفرنس ہوئی جس نے مرکزی گورنمنٹ کے متعلق چند اہم تجویزیں پیش کی تھیں۔ ہر چند کہ یہ تجویزیں کسی طرح انتہائی نہیں کہی جا سکتی ہیں تاہم مسٹر ایمری وزیر ہند نے ۲۲۔ اپریل کو ان تجویزوں کو بھی پارلیمنٹ میں نامنظور کر دیا

اور ایک مرتبہ پھر اس مُرلنے قصّے کو دُہرایا کہ جب تک کانگریس و مسلم لیگ کا باہمی سمجھوتہ نہ ہو جائے کوئی نیا قدم نہیں اُٹھایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ایک طرح سے بمبئی کانفرنس کی تجویزوں کو ناقابل عمل بتاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ شاید تیج بہادر انتہا پسندوں کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ کانفرنس کمیٹی اور سر سپرو دونوں نے وزیر ہند کی تقریر کا مفصل اور مکمل جواب دیا ہے ملک میں بھی عام طور پر اظہار ناراضگی کیا گیا ہے۔ مہاتما گاندھی کے بیان سے ان کا انتہائی غصّہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے لیڈروں نے بھی اس پر علانیہ مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اور سر ستیلواد مسٹر سری نواس آئر۔ مسٹر چندر وارکر پریسیڈنٹ لبرل نیشنل فیڈریشن۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو جیسے اعتدال پسندوں نے اس تقریر سے یہی مراد لی ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستانیوں کو حکومت کا کوئی اصلی دخل دینے کو تیار نہیں ہے حالانکہ جیسا کہ سر رادھا کرشنن نے لکھا ہے "اب بھی ملک میں برطانیہ عظمیٰ کے واسطے کافی ہمدردی موجود ہے اور عام لوگوں کی خواہش ہے کہ وہ اس جنگ میں دل کھول کر برطانیہ کا ساتھ دیں لیکن وزیر ہند نے بمبئی کانفرنس کی تجویزوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نازک وقت میں بھی برطانیہ ہندوستان کو خود مختار بنانے کو آمادہ نہیں ہے۔" آپ کی رائے ہے کہ ممکن ہے شروع میں اہل ملک ایک خالص غیر سرکاری وزارت کا بھی زیادہ ساتھ نہ دے سکیں لیکن خود مہاتما گاندھی اس کو برطانوی حکمرانوں کے قلب کی تبدیلی کا ثبوت سمجھیں گے۔

بہرحال اس وقت اُولوالعزمی بلند نظری اور انصاف پروری کی ضرورت ہے۔ پارلیمنٹ میں جو مباحثہ ہوا ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے بڑے بڑے مدبران بھی وزیر ہند کے رویہ سے خوش نہیں ہیں۔ بعض صاحبوں نے کئی دوررس تجویزیں بھی پیش کیں۔ انگلستان کے بعض مقتدر اخبارات بھی حکومت برطانیہ پر زور ڈال رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کے متعلق اپنی پالیسی پر فراخ دلی سے نظر ثانی کرے۔ لندن ٹائمس۔ مینچسٹر گارجین۔ نیو اسٹیٹسمین وغیرہ نے اس کا پرزور مطالبہ کیا ہے۔ ہماری بھی یہی دلی تمنا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ارباب حکومت اگست ہی کے اعلان پر اڑے رہتے ہیں یا ضرورت وقت اور مقتضائے زمانہ کا کچھ لحاظ کرتے ہیں

اس غیر اطمینانی زمانہ میں بھی ملک میں جنگی امداد کے لئے کروروں روپیہ جمع ہو چکا ہے۔ اگر آئینی مسئلہ طے ہو جائے اور ہندوستانیوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ جنگ ختم ہوتے ہی ان کو بھی اپنے ملک میں وہی حیثیت حاصل ہو گی جو دوسرے ملکوں کی ہے پھر دیکھئے عام جوش و خروش کی کیا حالت ہوتی ہے۔

علمی خبریں اور نوٹ

تصنیف و تالیف و تعداد اشاعت کے لحاظ سے اس وقت اُردو کی سب سے زیادہ ترقی پنجاب میں ہو رہی ہے کسی زمانہ میں صوبہ متحدہ اور دہلی اردو کا قلعہ سمجھا جاتا تھا، مگر ایک عرصہ سے اضلاع آگرہ و اودھ اور دہلی میں ہندی زبان کا رواج غیر معمولی طور پر بڑھ رہا ہے۔ اور سالہا سال سے یہاں اُردو کی بہت ہی کم نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں صوبہ متحدہ کے اُردو اخبارات کی حالت بھی اچھی نہیں ہے، بہت کم اخبارات ایسے ہونگے جن کی اشاعت دو ہزار کاپی سے زائد ہو۔ لیکن پنجاب میں اچھے اچھے اُردو اخبارات نکل رہے ہیں اور اُن کی اشاعت بھی بہت معقول ہے چنانچہ پچھلے سال جون ۱۹۴۰ء میں ہمعصر "ملاپ" کی اشاعت اٹھارہ ہزار ساڑھے چھ سو کاپی تھی اس کے بعد ہمعصر "پرتاپ" کا نمبر تھا جس کا اوسط اشاعت پندرہ ہزار کاپی تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ دہلی کا ہمعصر "تیج" روزانہ بھی دس ہزار روزانہ نکلتا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تینوں پرچے روزانہ اخباروں کے بہترین نمونے ہیں۔ صوبہ متحدہ کے لئے تازہ ترین خبروں کے لحاظ سے ہمعصر "تیج" انگریزی کے کسی روزانہ اخبار سے کم نہیں ہے۔ صوبہ متحدہ میں اپریل لغایت جون ۱۹۴۰ء کی سہ ماہی میں اُردو کی کل اکسٹھ ۶۱ کتابیں شائع ہوئیں جس میں شاعری کی ۱۹ زبان کے متعلق ۱۱ تاریخ و جغرافیہ کی ۵ سوانحی ۲ تھیں۔ اسی عرصہ میں ہندی کی ۳۰۴ کتابیں چھپیں اس کے برعکس انھیں تین مہینوں میں پنجاب میں اُردو کی ۳۳۶ کتابیں چھپیں اور ہندی کی صرف ۶۹۔ یہی حال دوسری سہ ماہیوں کا سمجھنا چاہئیے۔ مثلاً ۱۹۴۰ء کی آخری سہ ماہی میں صوبہ متحدہ میں اردو کی صرف ۳۰ نئی کتابیں چھپیں۔ اور ان میں بھی شوکت صاحب تھانوی کی مزاحیہ کتاب "منشی جی" اور دو ایک درسی کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب ایک ہزار سے زائد نہیں شائع ہوئی۔ اسی مدت میں ہندی کی ۳۱۴ کتابیں شائع ہوئیں اور زیادہ تر کتابیں دو ہزار کی تعداد میں طبع ہوئی ہیں۔ بعض کتابوں کے چھ چھ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں

ہم اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ ہمارے صوبے میں اُردو کی ترقی رُکی ہوئی ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں، حالانکہ مشاعروں کی تعداد اور رونق میں بظاہر کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی اور اُردو کی حمایت و ہمدردی میں اکثر دھوم دھام جلسے بھی ہوتے رہتے ہیں جن میں وقتی جوش کے ماتحت دھواں دھار تقریریں کیجاتی ہیں، مگر نہ عوام اور نہ خواص ٹھنڈے دل سے اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے کوئی مستقل مالی بار اپنے ذمہ لینے کو تیار ہیں۔ یہاں تک کہ صوبے کے اکثر متمول و مقتدر اصحاب اُردو کتابوں رسالوں اور اخباروں کی خریداری ایک بار گراں سمجھتے ہیں بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زیادہ تر اصحاب اس مد کو فضول یا ناقابل برداشت خیال کرتے ہیں۔

THE ZAMANA, MAY 1941 — REGD. NO. A147.

زمانہ

مرتبہ دیانرائن نگم

جلد ۷۶ | مئی سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۵

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

سنترہ

پچھلے دنوں ایک امریکن ماہر عطریات سنترہ و لیموں وغیرہ ترشاوہ کے باغات کی سیر کرنے فلسطین
یا تھا۔ امریکہ کے بعد فلسطین سنترے پیدا کرنے والا دنیا میں سب سے بڑا ملک ہے۔ جہاں سنترے
کے کروڑوں درخت یہودیوں کے لگائے ہوئے اور یہودیوں کی ملکیت ہیں اور یہ ایک ایسا واقعہ
ہے جس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ یہودی قوم زراعت پیشہ قوم نہیں ہے۔ سنترے کے ان
تمام باغوں میں آبپاشی ہوتی ہے جس کے لیے عظیم الشان انتظام کیا گیا ہے۔ ان باغوں کو ربین کی خانہ
ساز کی بدولت توقع سے زیادہ ترقی ہوئی ہے ان باغوں کی پرورش کرنے کے لئے کالیفورنیا کے
جدید باغبانی کے طریقے رائج کئے گئے ہیں اور ان کی مستقبل کامیابی میں صرف ایک خارجی چیز یعنی ملیریا
خلل انداز ہوسکتی ہے گرم ملکوں کا یہ عذاب یعنی ملیریا عام طور پر فلسطین میں کافی سخت ہوتا ہے لیکن
اس کی شدت میں آبپاشی کی نالیوں اور خندقوں سے اور زیادہ اضافہ ہوگیا ہے جو مچھروں کے
پیدا ہونے اور پرورش پانے کے لئے بہترین جگہیں ہیں۔ ان نالیوں کے پانیوں پر تیل یا زہر
اس خیال سے نہیں ڈالا جا سکتا کہ کہیں سنترے کے درختوں کو نقصان نہ پہنچے۔ لیکن یہودیوں نے
بہت کامیاب علاج ... طریقہ یعنی کونین سے کر لیا ہے جو تحفظ اور علاج دونوں کے لئے
استعمال کی جاتی ہیں۔ ہمارے امریکن ماہر کا خیال ہے کہ فلسطین کی صرف سنترہ کاری ملیریا کی وجہ سے تباہ
نہ ہوگی۔ کیونکہ یہودی لوگ مجلس بین الاقوام کے ملیریا کمیشن کی تجویز پر عمل کرتے ہیں۔ یعنی ملیریا
کے لئے سنترہ کے باغوں میں کام کرنے والوں کو وہ چھ گرین کونین روزانہ استعمال کراتے ہیں
اور جب کوئی شخص ملیریا میں مبتلا ہو جائے تو اسے پانچ سات روز تک پندرہ بیس گرین کونین روزانہ دیتے ہیں
جس سے وہ اچھا ہو جاتا ہے ... ملیریا کمیشن کی جو رپورٹ شائع ہوئی تھی اس کے صفحہ ... پر
ملیریا کمیشن دوائیں درج کی گئی ہیں ان میں بلحاظ مستقل علاج کونین کا درجہ سب سے اول ہے کیونکہ
اول تو یہ طبی اعتبار سے محفوظ اور زہریلے مادے سے پاک ہے دوسرے اس کا

ل - احمد صاحب کی کتابیں

انشائے لطیف:- اردو ادب ذوق رکھنے والوں کیلئے صاحب الاسح کا علم تعارف کا محتاج نہیں ل احمد صاحب نے اردو میں افسانہ نویسی کا جو معیار پیش کیا ہے اپنی جگہ ایک مثال ہے - انکے قلم سے کامیاب افسانہ نفسیات و معاملات قلب اور حکمت و جذبات کی بولتی تصویر اور اردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے - پندرہ ۱۵ افسانوں کا یہ مجموعہ حسن و عشق کی کشمکش اور فلسفہ شباب کا مرقع ہے آپ اگر اردو زبان کی گہرائی اور اسکی شعر آفرینی کے قدردان ہیں تو اس مجموعہ کو دیکھئے

پونے تین سو صفحات - مجلد قیمت ڈیڑھ روپیہ

نغمات:- اس مجموعہ میں ل احمد صاحب کے ساٹھ مختصر ترین ادب پارے شامل ہیں جنہیں نثر کی شاعری کا ایک معجز آفرین کارنامہ کہا جاسکتا ہے - زبان کی نفاست البیان کی لطافت کا اندازہ کرنے کے لئے اس مجموعہ کا دیکھنا از بس ضروری ہے - ۲۰۰ صفحات - مجلد قیمت ایک روپیہ

محبت کا افسانہ:- یہ ایک طویل افسانہ ہے جسکے اندر ل - احمد صاحب نے موسیقیانہ زبان اور فلسفیانہ استدلال میں مسرت از دواج سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل افسانہ ہے اور ہر باب میں کسی نہ کسی معاشرتی و اخلاقی مسئلہ پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے - حجم ساڑھے تین سو صفحات مجلد قیمت دو روپیہ -

ملنے کا پتہ:-

(۱) منیجر زمانہ کانپور

(۲) عظیم اکبر محلہ منٹولہ - آگرہ

نئی کتابیں

زاد راہ:- منشی پریم چند مرحوم کی ان کہانیوں کا مجموعہ جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں لکھیں ۔

دنیائے تبسم:- مشہور مزاحیہ نویس جناب شوکت تھانوی کے بہترین افسانوں کا مجموعہ -

مجنوں کے افسانے ۱۲ جناب مجنوں گورکھپوری اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں موجودہ کتاب اُن کے منتخب اور قابل دید افسانوں کا مجموعہ -

پس پردہ:- چندر بھوشن سنگھ کے سات افسانوں ۱۲ کا مجموعہ - زبان پلاٹ اور فلسفیانہ انداز بیان کے اعتبار سے ایک قابل قدر چیز ہے

زمانہ بک ایجنسی کانپور

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید بیمثل کتابیں

انقلاب فرانس۔ فرانس کی تحریک آزادی اور وہاں کے انقلاب کی تاریخ میں ہمارے لئے بہت سے سبق ہیں جامعہ ملیہ کے ایک لائق فرزند مولوی عبدالقادر صاحب۔ بی اے نے انقلاب پر اس کتاب میں ایک غائر نظر ڈالی ہے۔۔ قیمت عہ

دیوان غالب :۔ دیوان غالب کا وہ مشہور ومعروف نسخہ جو جرمنی میں خاص اہتمام سے چھپوایا گیا ہے۔ مکمل دیوان مع دیباچہ مصنف کی سہ رنگی تصویر جو جرمن ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ نہایت نفیس جلد سنہرا کام قیمت قسم اول عگر

مرقع ادب :۔ ہندوستان کے مشہور انشاپرداز شعرا کے خطوط جو انھوں نے اپنے احباب کو لکھے حصہ اول عہ دوم عا۔

دنیا کی کہانی :۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں ہزاروں برس کی تاریخ اس انداز سے لکھی ہے کہ پڑھنے والا بادشاہوں کی لڑائیوں اور تاریخوں کے گورکھ دھندوں میں پھنسے بغیر وہ سب کچھ سمجھ جاتا ہے۔ جو تاریخ کا اصل مفہوم ہے لکھائی چھپائی وغیرہ عمدہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

دیوان شیدا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ۔ یہ بھی دیوان غالب کی طرح نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہے اور بالکل ویسا ہی خوبصورت اور خوشنما ہے جیسا دیوان غالب ہے قیمت عا،

کلام جوہر :۔ حضرت مولانا محمد علی مرحوم کا مکمل مجموعہ کلام جسے مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے خاص کاوش سے مرتب فرمایا ہے پڑھئے اور پاکیزہ مذاق کا لطف اٹھائیے۔ قیمت صرف ۱۰ مر

خیالستان :۔ سید سجاد حیدر یلدرم۔ یہ مختصر مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اب تک اس کے گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور اب بارھواں ایڈیشن مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔ قیمت مجلد عہ

خیالات مہاتما گاندھی :۔ یہ وہ لاجواب کتاب ہے جس میں مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے گاندھی جی کے مذہبی۔ سماجی اور سیاسی، خیالات شرح وبسط کے ساتھ درج کرکے دنیا پر احسان عظیم کیا ہے۔ قیمت حصہ اول عہ دوم عہ

ملنے کا پتہ۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

زمانہ

جلد ۷۶ — مئی سنہ ۱۹۴۱ء — نمبر ۵

ہندی مصوّری کا نیا دور

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے۔ ایل ایل۔ بی)

مغلوں کے زمانہ میں جس نئے طرز کی مصوری کی داغ بیل پڑی اُسے بقول ڈاکٹر کمار سوامی "ہندی پارسی" فنِ تصویر کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی تصویریں جہانگیر کے ابتدائی عہدِ حکومت تک عام رہیں اور انھیں مغل اسکول کا طرۂ امتیاز سمجھنا چاہیے۔ اس مصوری کے تمام نمونے عموماً چار طرح کے بتائے جاتے ہیں:۔

(۱) ایران کی مشہور عشقیہ داستانوں (لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد وغیرہ) کی رنگین تصویریں اور

(۲) ان کی نقلیں،

(۳) اسی طرز کی تمام دوسری تصویریں جو ہندوؤں کی قدیم تصانیف کے فارسی ترجموں مثلاً رامائن، یوگ وششٹ، کلیلہ دمنا اور سوز و گداز وغیرہ کے باتصویر ایڈیشنوں کی زینت ہیں۔

(۴) ہندی پارسی طرز کی شبیہیں،

مغل اسکول در اصل سترھویں صدی کی چیز ہے، اور کوئی شک نہیں کہ اس عہد کی خالص ایرانی مصوری ہندی فنِ تصویر سے بہت کچھ متاثر ہوئی ہے۔ سترھویں صدی کے شروع میں مغل اسکول کے تار و پود بکھرنے شروع ہو گئے تھے، اور اس زمانہ کے ہندو مصوّر اپنی

ملکی خصوصیات کی نمایندگی کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ان کے بنائے ہوئے تمام تخیلی و رومانی منظر خالص ہندی نژاد ہیں، گو ان کے لباس اور متعلقہ عمارتوں وغیرہ سے کسی قدر اجنبیت ترشح ہوتی ہے۔ لیکن بعض خاص خاص شبیہیں ایسی بھی ہیں جو خد و خال اور وضع قطع کے اعتبار سے بالکل غیر ملکی ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی مغل اسکول کا خاتمہ ہوگیا اور راجپوت مصوری کا آفتاب کمال طلوع ہوا۔ ہندی اور ایرانی فن میں جو اہم فرق ہے اس کا خود ابوالفضل نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ "ہندی مصوری کا پایہ ہمارے وہم و گمان سے بھی بلند تر ہے۔ جذبات کی بلندی اور مضامین کا تنوّع ہندی فن تصویر کی اہم صفات فارسی غزلیات کی ہیجان انگیزی اور شکار کے خشک مناظر کی دسترس سے باہر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مغلوں کی کردار نگاری بھی وہاں تک پہونچنے سے قاصر رہی"۔

راجپوت اسکول دراصل اجنتا ہی کے سلسلۂ رنگین کی ایک کڑی ہے۔ حالانکہ اس کا ہر نقش معیار قدیم کے زوال و ادبار کا زبان حال سے فریادی ہے۔ ڈاکٹر کمار سوامی کی طرح بعض دیگر مشرقی مفکرین کی بھی یہی رائے ہے کہ ہندی مصوری اجنتا کے غاروں سے نکل کر بھی معدوم نہ ہوسکی۔ بلکہ یہ سلسلہ مدتوں تک برابر جاری و ساری رہا۔ حالانکہ اس کے آخری زمانہ کے نقش و نگار اب ناپید ہیں، پھر بھی باغ (مالوہ) سیتنا نواس (مدراس) اور شری گری (لنکا) کے غاروں میں اب تک بعض ایسے نقوش موجود ہیں جو بلاشبہ اجنتا کی فن کاری کے مقلد ہیں۔

ہندی مصوری جس زمانہ میں اجنتا کے غاروں میں روپوش ہوکر معراج کمال کو پہونچ چکی تھی یورپ اس وقت تک اِس فنِ لطیف کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ اس لئے محقّقین ہندی فنِ تصویر کے عالمگیر اثرات کا پتہ لگانے میں چنداں دقت درپیش نہیں آتی پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی ترکستان۔ تبت۔ چین۔ جاپان وغیرہ کے تمام فنِ لطیف پر اجنتا کا رنگ غالب ہے۔ اسی اجنتا کی بنیادوں پر ہماری مصوری کے نئے اسکول کی شاندار عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔

پہلے پہل ۱۸۲۴ء میں سرجیمس نے اجنتا کا پتہ لگاکر اس کا اجمالی تذکرہ قلمبند کیا۔ اس کے بعد ۱۸۴۳ء میں مسٹر فرگیوسن نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ایک مفصّل تبصرہ لکھکر ایسٹ

انڈیا کمپنی کے حوالہ کر دیا۔ ۱۸۴۴ء میں کمپنی نے میجر آر جل کو اجنتا کی تصاویر کی نقلیں لینے کے لئے روانہ کیا اور میجر موصوف ۱۸۵۵ء تک اس کام میں مشغول رہے۔ ۱۸۶۶ء کی آتش زدگی کے بعد بمبئی آرٹ اسکول کے پرنسپل گرفتھ نے اس طرف توجہ کی اور ۱۸۷۲ء سے ۱۸۸۵ء تک اسکول مذکور کے طالب علموں کی مدد سے وہ مختلف تصویروں کی نقلیں حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں لیڈی ہیرنگھم نے ہندی مصوروں کو اس کام پر مقرر کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد نظام گورنمنٹ نے یہ کام سید احمد کے سپرد کیا۔ ۱۹۲۶ء میں بآلا صاحب نے ہندوستان بھر کے چیدہ چیدہ مصوروں کو اسی مقصد سے اجنتا روانہ کیا۔ اس طرح اجنتا کے سہارے ہندی مصوری کے نئے دور کی شروعات ہوئی۔

یوں تو انیسویں صدی کے اوائل ہی میں انگریز مصوروں کی نگرانی میں ہندوستان میں مصوری کے کئی اسکول کھل چکے تھے، لیکن خالص ہندی مصوری کی روح کو سب سے پہلے پوری کامیابی کے ساتھ نئے قالب میں ڈھالنے کا فخر بنگال کے سپوت اونیندرناتھ ٹیگور ہی کا حصہ ہے۔ اونیندر بابو جس زمانہ میں ہندوستان کی مصوری کا نام روشن کرنے میں مصروف تھے انھیں دنوں ہاویل صاحب کلکتہ آرٹ اسکول کے پرنسپل ہوکر ہندوستان آئے اور ٹیگور کی قلمکاری کا معجزہ دیکھکر ہندی فنِ تصویر کی فضیلت و برتری کے قائل ہوگئے۔ اونیندر نے اجنتا کے رنگ میں نئے نئے گل کھلائے اور نندلال بوس، استت ہالدار، شاردا چرن اکیل، سریندر ناتھ گنگولی، این۔ این گپت، شیلیندر ناتھ ڈے، گگیندر ناتھ ٹھاکر، کشتیندرناتھ مجومدار، راول اور حکیم محمد خاں وغیرہ جیسے ماہرینِ فن کی رہنمائی کرکے اپنے مشن کی تکمیل کی۔

ٹیگور کے شاگردوں میں نندلال بوس سب سے زیادہ کامیاب اور مشہور ہوئے۔ حالانکہ اکیل اور ہالدار بھی انھیں کی ٹکر کے ہیں، لیکن تخیل کی بلندی اور ریدت (اوریجنیلٹی) کے اعتبار سے ان کا پایہ اپنے معاصرین سے بہت بلند ہے۔ اونیندر بابو کی طرح حکیم کو چھوڑکر ان کے دیگر نامور شاگرد بھی بنیادی طور پر بودھ اسکول کے پیرو ہیں۔ بوس اور ہالدار نے تو اجنتا کی نقلیں اتارنے میں غیر معمولی شہرت و کامیابی حاصل کی ہے۔ بوس نے متعدد دیواروں اور چھتوں کو اجنتا کا مدِ مقابل بنانے کے علاوہ سات سو سے زائد خیالی تصویریں بنائیں، جن میں ایک سے ایک بڑھکر ہیں۔ بوس شانتی نکیتن میں اور ہالدار لکھنؤ آرٹ کالج میں نوآموز طلبا کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے جوہر ذاتی کی نمایش کر رہے ہیں۔

ڈے۔ ٹھاکر۔ بوس۔ ہالدار۔ اکیل۔ گپت۔ گنگولی اور مجومدار کی فنی خصوصیات کے بارے میں ارتقائی مدارج کے تفاوت کو نظر انداز کر کے بلامبالغہ وہ تمام باتیں دہرائی جا سکتی ہیں جو اجنتا کی مصوری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ان حضرات کی تصویریں اتنی بلند پایہ اور کثیر ہیں کہ ان کے نام گنانا یا ان کا انتخاب کرنا مشکل ہے۔ بوس نے ڈاکٹر ٹیگور کے ساتھ چین اور جاپان میں اپنے کمالات کی نمائش کی اور دنیا پر اپنے زور قلم کی دھاک بٹھائی۔

اکیل بنگال میں پیدا ہوئے اور دہلی میں مرے، یہیں انھوں نے اپنا آرٹ اسکول قائم کیا جو اب ان کے چھوٹے بھائی باروا اکیل کی زیر نگرانی ترقی کر رہا ہے۔ اکیل نے تقریباً ایک ہزار تصاویر اپنی یادگار چھوڑی ہیں جو ان کی بلندی تخئیل اور کمالِ فن کا ثبوت ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد ٹیگور کی کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا اور رنگ آمیزی و وضع خطوط کے وہ وہ کمالات دکھائے کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ یوں تو ہر صناع کا انداز جداگانہ ہوتا ہے لیکن اکیل نے شروع ہی سے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک اصطلاحی انقلاب کا علم بلند کیا۔ انھوں نے اپنے حریری نقوش (جن کا پس منظر ایک بالکل نئی چیز ہے) اور پنسلی خاکوں میں اس نئے طرز کے جوہر دکھائے ہیں اور چین و جاپان کی صنعت سے بالکل مختلف ایک نئی چیز پیدا کر کے رکھدی ہے نہایت ہلکے رنگ استعمال کر کے اکیل نے حریری مجسموں میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

اکیل کی رنگ آمیزی کے حیرت انگیز کمال کا یہ عالم ہے کہ جزئی تفصیلات کا فقدان ہوتے ہوئے بھی ان کی تصویریں حسن کاری کا جامع و مکمل اور بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے اس رنگ کی کامیابی کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ پرمود بابو جیسا آرٹسٹ بھی انھیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے اکیل نے ابتداءً دیہاتی زندگی کے خیالی نقوش پیش کر کے اپنے زورِ قلم کی دھاک بٹھائی اور پھر بدھ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پینتیس ۳۵ تصویروں میں نمایاں کیا۔ اور جس موضوع پر قلم اٹھایا اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ ان کے "عالمگیر" "شوکا ملال" "ماں"، "مردہ بچہ" اور "بدھ کے حضور میں" ایسے زبردست کارنامے ہیں جنھیں دیکھکر بڑے بڑے مبصروں کو کہنا پڑا کہ ان میں خطوط و رنگ کی حسن آفرینی کے علاوہ بہشتی چمک بھی موجود ہے۔ شاعری کا حسین رنگ اور موسیقی کی رنگین ترنگ اکیل کی تصویروں کی روح رواں ہے۔ پیرس اور لندن میں تین بار اکیل نے اپنے کمال کا مظاہرہ کر کے نہ صرف خراج تحسین وصول کیا بلکہ اپنے عزیز وطن کا بھی نام روشن کیا۔ مسٹر گوپال جی کے مندر میں اکیل کی اکتیس ۳۱ بڑی تصویریں ان کے کمال فن کا جلوہ دکھا رہی ہیں ابتدائی

کی گایوں کا گلہ" کے عنوان سے اکیل ایک سلسلۂ تصویر کی تکمیل میں محو تھے کہ ایک قسم کے زہریلے رنگ کے اثر سے ایک مہینہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد ان کی دُور رس آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو گئیں۔ یہی سلسلہ اکیل کا آخری سرمایہ ہے۔ بوس بابو کی طرح ان کے شاہکار عرض وطول ہند میں جھلملاتے ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں" کالی" "ترشت سورگ میں" لافانی محبوب "راس لیلا" وشوروپ تانڈو نرت وغیرہ وغیرہ اکیل کی بہترین تصویریں شمار کی جاتی ہیں۔ ہندوستانی راجاؤں، امیروں اور نوابوں کے علاوہ ان کی کئی تصویریں لارڈ زیٹ لینڈا (Lord Zetland) اور ریزے میکڈانلڈ (Ramsay Macdalanald) نے بھی خرید کی تھیں اپنے آخری ایام میں اکیل سری کرشن کی بندرابن کی زندگی اور دوارکا لیلا کا نقشہ اُتارنے کی کوشش میں منہمک تھے۔ ان کے تمام خاکے تیار ہو چکے تھے صرف رنگ بھرنا باقی تھا کہ طاوا آگیا اور وہ داغ مفارقت دیکر بھری محفل سے اُٹھ گئے۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بوس بابو کی ہر کوشش جذبات ومحسوسات کا آئینہ ہوتی ہے، وہ ہمیشہ ایک نئے موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں اور ظاہرداریوں سے دامن بچاکر دل کی دنیا کو اتنا نمایاں کر دیتے ہیں کہ پھر کسی عنوان کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ جس ڈھنگ کی تصویر بناتے ہیں اُسے اُسی رنگ میں اتنا مکمل کر دیتے ہیں کہ اصطلاحی باریکیاں خود منھ سے بول اُٹھتی ہیں۔ پہاڑی، مغل، راجپوت اور بودھ اسکول کی طرح چینی، جاپانی اور رومی طرز کی ہوبہو عکاسی اُن کے موئے قلم کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ فن کا ایسا عالمگیر ادراک دنیا میں شاید ہی کسی دوسرے مصوّر کو نصیب ہوا ہو۔ جاپان سے واپسی پر انھوں نے ریشم پر چینی رقاصہ کی ایک قدآدم تصویر بنائی تھی، یہی اُن کا شاہکار ہے۔ باغ کی کُٹیا میں ایک دفعہ اُنھوں نے مٹی گھول کر انگلیوں ہی سے ایک ایسی حسین تصویر بنا دی جسے دیکھکر ان کے ہاتھ کی روانی اور صفائی کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بوس بابو خانہ ساز خالص دیسی رنگوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ہالدار کے موضوعات مقابلتاً سطحی اور پامال ہوتے ہیں۔ بوس بابو کے تخیل کی رفعت اور ان کے اختراع کی گرمجوشی ان کی دسترس سے باہر ہیں۔ ہالدار رنگ و نور کے طوفانوں میں کھوئے سے رہتے ہیں۔ پھر بھی ان کی ہر کوشش میں جذبات نگاری کی شان موجود رہتی ہے۔

لکھنؤ کے حکیم محمد خاں نے مغل اسکول کے انداز میں ہندوؤں کی جذبات نگاری اور

مغرب کی رنگ آمیزی کو یکجا کر کے ایک نئی طرز کی داغ بیل ڈالی، اور اُن کی "نادر شاہ" نامی تصویر نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے فن کے واقعی استاد ہیں۔ ان کی اس تصویر کو دیکھکر ارونددو گھوش نے انھیں روفیل کا ہمپایہ قرار دیا ہے۔ گنگولی کی شاگردی میں رہ کر حکیم نے ہندوؤں کی مخصوص جذبات نگاری کا بھی بڑی کامیابی کے ساتھ تتبع کیا ہے۔ ان کی تصویروں میں "رکمنی کا خط" "نادر شاہ" "سرما" "بیربل کی بیٹی" "اکبر" "تاج محل کا خواب" "سمن برج میں جہانگیر اور نور جہاں" "گلاب کی کلی" "محمد شاہ رنگیلے کا دربار" "ہمایوں کی وفات"، "سکندرہ کی تعمیر"، "سکندر کی پیدائش"، "لیلیٰ مجنوں"، "قیدی دارا"، اور مولانا روم کے مسدس کے پہلے شعر کی تفسیر بالکل نئے ڈھنگ کی ہونے کے باعث خاص طور سے مشہور ہیں۔ حکیم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بنگال اسکول کی اندھی تقلید نہیں کی۔ حالانکہ وہیں سے اُنھوں نے فن مصوری کی تعلیم حاصل کی۔ چغتائی نے بھی حکیم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے، مگر ان کی تصویروں کی وضع قطع شکل و شباہت بالکل ایرانی ہوتی ہے۔ لیکن جذبات نگاری کے میدان میں قدم رکھتے ہی وہ بنگال اسکول کے ریلے میں بہہ جاتے ہیں۔ چغتائی کے پاس بوس اور حکیم وغیرہ کی طرح کوئی خاص پیغام نہیں ہے۔ اسی لئے انھیں خیام، غالب اور اصغر وغیرہ کا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔

بنگال اسکول کے باغیوں میں سب سے پہلا نام پرمود کمار چٹرجی کا آتا ہے۔ ان کی ابتدائی کوششیں شبیہ سازی تک ہی محدود تھیں۔ رفتہ رفتہ انھیں جذبات نگاری کا چسکا پیدا ہوا۔ اسی دوران میں وہ ہمالیہ پربت پر چلے گئے، جہاں قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ مذہبی تصویروں کی طرف بھی ان کی توجہ مبذول ہوئی اور آہستہ آہستہ وہ بنگال اسکول کے زبردست حامی بن گئے۔ قدرتی مناظر کی مغربی ڈھنگ کی بیشمار تصویریں ان کی یادگار ہیں لیکن بنگال اسکول کے رنگ میں انھوں نے جو تصویریں بنائی ہیں ان میں "شیوا اور پاربتی" ان کی بہترین تصویر مانی جاتی ہے انھوں نے کچھ تصویریں تیندر ناتھ سین کی شرکت میں بھی بنائی ہیں۔

بنگال کی طرح بمبئی میں بھی اُنیسویں صدی کے آغاز ہی سے نئے طرز کی مصوری میں کمال حاصل کرنے کی متعدد کوششیں ہوئیں۔ لیکن ابتدائی گمراہی کے باعث وہ کامیاب نہیں ہوئیں آجکل بمبئی اسکول کے نام لیواؤں میں کلاندھی سب سے آگے ہیں۔ خطوط کی سحرکاری ان کے موئے قلم کا ادنی معجزہ ہے۔

ٹیگور اسکول کے عالمگیر اثرات سے گجرات میں بھی فن مصوری کے ازسرنو زندہ کرنے کی تحریک

شروع ہوئی جس کے بانی مبانی رنجیت رام اور معاونین پرشوتم ماوجی اور دھرندھر جیسے صاحب نظر محبانِ وطن ہیں۔ اس تحریک کے آغاز سے چالیس برس پیشتر بمبئی میں آرٹ اسکول قائم ہو چکا تھا اُس وقت دھرندھر بمبئی کے چوٹی کے مصوروں میں شمار ہوتے تھے لیکن روی ورما کی طرح وہ بھی بمبئی آرٹ اسکول کے مقلد تھے، اور مغربی ڈھنگ کی تصویریں بنانے ہی کو سب سے بڑی کامیابی سمجھتے تھے۔ مہاراشٹر میں بھی ان کے ہم خیال چند مصور موجود تھے۔ لیکن انھیں دنوں بمبئی آرٹ اسکول میں ایک ایسا شخص بھی تربیت حاصل کر رہا تھا جس نے آگے چل کر ٹیگور کی مشعلِ ہدایت سے اپنا چراغ روشن کیا، اور گجرات کے نئے اسکول کا صحیح معنوں میں افتتاح کیا۔ یہ ہونہار نوجوان روی شنکر راول تھا۔

۱۹۱۵ء میں سورت میں جو نمائش ہوئی اُس میں راول کی گرجری سندری (حسین گوجری) کو طلائی تمغہ انعام ملا۔ جذبات کی نمایندگی اور خط و خال کی ہم رنگی راول کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اُن کے ہم نام و ہمعصر روی شنکر پنڈت بھی اعلیٰ درجہ کے مصور ہیں۔ مناظر کی عکاسی اور جانوروں کی منہ بولتی تصویریں بنانے میں انھیں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ ان کی تصویریں خطوط کی جادوگری کا نادر نمونہ ہوتی ہیں۔

راول کے شاگردوں میں کنو دیسائی نے خوب نام پیدا کیا ہے۔ عکسی تصویریں یا چھایا چتر بنانا ان کا مخصوص مشغلہ ہے۔ اور سلہٹ یا سیاہ دھبّوں سے شبیہہ سازی میں تو انھیں کمال حاصل ہے۔ سلہٹ کی تیاری میں مصوّر کے لئے خطوط کا استعمال ممنوع ہوتا ہے، اس لئے ایک ہی رنگ سے جذبات اور چہرے مُہرے کے انقلابات ظاہر کرنا پڑتے ہیں جو بہت مشکل کام ہے لیکن ڈیسائی کے لئے یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ ان کا ہر نقش سُبک اور شگفتہ ہوتا ہے اور اس میں تنوع کے ساتھ ساتھ تخیل کی بلندی بھی موجود رہتی ہے۔ کنو دیسائی نے ہندوستان کے نامور مصور نندلال بوس بابو کے آگے بھی زانوئے ادب تہ کیا ہے اور اپنی تصویروں میں وہی رنگ بھر کر انھیں اُجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

نئی دہلی کی سرکاری عمارتوں میں جن لوگوں نے اپنے کمالِ فن کے جوہر دکھائے ہیں، ان میں ایک جگنّاتھ اہیواسی بھی ہیں جو گجرات اسکول کے نمایندہ ہیں اور ایک بلند پایہ مصوّر مانے جاتے ہیں۔ پرمود کمار چٹرجی کے گجراتی شاگردوں میں سوما لال شاہ اور کرشن لال بھٹ نیز راول اور دیبی پرشاد رائے (مدراسی) کے شاگرد رسک لال پریکھ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں

واقعاتی تصویروں میں درگا شنکر پانڈیا نے اچھا نام پیدا کیا ہے۔

گجرات کی طرح مدراس۔ میسور۔ اور آندھر میں بھی بنگال اسکول کی تقلید سے انقلاب عظیم کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں، لیکن بدقسمتی سے یو۔پی۔ پنجاب اور بہار وغیرہ اس دوڑ میں بہت پچھڑے ہوئے ہیں۔ یو۔پی میں حکیم صاحب کے علاوہ مشہور مصور الیشری پرشاد کے صاحبزادے رامیشور پرشاد ورما اور پریم بہادر مدھوار بریلوی بھی ہونہار ہیں۔

خیر مقدم

(نتیجۂ فکر حضرت مدہوش)

۲۷۔اپریل ۱۹۴۱ء کو ریڈ کراس فنڈ کی امداد میں کانپور میں ایک مشاعرہ ہوا، جس میں اطراف ملک کے نامور شعرا رونق افروز تھے۔ مشاعرہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ایڈیٹر 'زمانہ' کو ان معزز مہمانوں کے خیر مقدم کا فرض ادا کرنا تھا۔ چنانچہ عین تاریخ مشاعرہ کی شام کو مکرمی مدہوش صاحب سے جو خود بھی اس بزم سخن کی شرکت کے لئے کانپور تشریف لائے تھے چند اشعار بطور خیر مقدم کہنے کی فرمایش کی گئی۔ ممدوح نے صرف چند منٹ کے غور و فکر میں مشاعرہ کمیٹی کے دلی جذبات کے اظہار میں مصرعہ طرح پر یہ پرلطف قطعہ نظم فرما دیا۔ (مصرعۂ طرح یہ تھا "دستِ سوال میرا اونچا ہے آسماں سے") صدر نے مختصر ریمارکس کے ساتھ مشاعرہ کے آغاز میں ان اشعار آبدار سے ارباب کمال کا خیر مقدم کیا۔ یہ قطعہ کیا ہے اردو شاعری کے متعلق ہمارے دلی جذبات کا آئینہ ہے۔ اس لئے ہم اسے ناظرین 'زمانہ' کو بھی لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیتے ہیں۔ ایڈیٹر

ایوانِ شاعری میں ان کاملانِ فن کی — تعظیم و داد و تحسیں ممکن نہیں زباں سے
ہیں آج زیبِ محفل وہ ہستیاں کہ جن کے — اشعار کو ہے نسبت در اصل کہکشاں سے
وابستہ اور بھی ہے اُمید ان سے ہم کو — اظہار گو کہ اس کا دشوار ہے زباں سے
تنقید زندگی میں وہ وہ بلندیاں ہوں — جو شعر کی زباں ہے بڑھ جائے آسماں سے
ٹوٹی ہوئی سی لے ہے لوٹا رباب عالم — بے نظمیاں ادب میں ہیں شورش جہاں سے
کھوئے ہوئے وہ نغمے مل جائیں کاش اس کو — سازِ سکوں ہو پیدا ہنگامۂ جہاں سے

پیدا ہو شعریت سے حسنِ عمل کی صورت
تعمیر ہو جہاں کی سوزِ غمِ نہاں سے

شیخ سے خطاب

(حضرت جوش ملیح آبادی)

اے شیخِ شہر! خرقۂ سالوس اُتار دے — دل کو بھی مثلِ کاکُلِ شبگوں سنوار دے
بنیادِ کاروبار ہے جس ماہ وش کا نام — اس ماہ وش کو خلوتِ جاں میں بھی بار دے
ہر دل پہ کندہ کرتا ہے جو نقش دل نشیں — خود اپنی لوحِ دل پہ بھی وہ نقش ابھار دے
تا چند دوسروں کے نکھارا کرے گا رنگ — اپنے بھی دل کا رنگ خدارا نکھار دے
تا چند منعموں کے لئے مژدۂ چمن؟ — بے زر کو بھی پیامِ نسیمِ بہار دے
اس ظاہری کلاہ کی تزئین تا کجا! — باطن کے تاج کو بھی دُرِ شاہوار دے

تو مُسکرا کے جوش دیا شیخ نے جواب
یہ نشہ وہ نہیں جسے تُرشی اُتار دے

رُباعی

حق کا کوئی پابند نہیں ہے واللہ — حق سے کوئی خورسند نہیں ہے واللہ
اخلاص و شرافت کا نمونہ ہے جو شخص — آدم کا وہ فرزند نہیں ہے واللہ

دیگر

تجرید کے دائرہ میں کثرت کیسی؟ — اطلاق کے میدان میں وحدت کیسی؟
اللہ کو اے احد بتانے والو! — اللہ کے اندر عددیت کیسی؟

دیگر

ابکی بھی کٹی یہ آہ و زاری برسات — لائی نہ پیامِ کامگاری برسات
افسوس کہ اس بار بھی اے جانِ بہار — روتے ہی گذر گئی ہماری برسات

زبان کے پیچیدہ مسئلہ کا حل

(از خواجہ غلام السیدین ایم-اے، ڈائرکٹر تعلیمات ریاست جموں وکشمیر)

بدقسمتی سے ملک کی قومی زبان کے مسئلہ کے بارے میں لوگوں میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور بعض لوگ اس پر بحث کرتے وقت اپنے من مانے اور بے بنیاد خیال کو ثابت کرنے کے لئے تاریخ کے اٹل اُصولوں اور فیصلوں کو بھول جاتے ہیں، اُنھیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قوم یا ملک کی زبان اُس کے صدیوں کے تاریخی حالات و واقعات کا نتیجہ اور مختلف جماعتوں کے میل جول اور تہذیبی لین دین کی یادگار ہوتی ہے، وہ کسی ریزولیوشن کے پاس کرنے سے نہ بن سکتی ہے نہ بگڑ سکتی ہے نہ بدل سکتی ہے۔ اور اگر اس کو زبردستی بدلنے کی اور تاریخ کے دھارے کا رخ کاٹنے کی کوشش کی جائے تو اس میں سیکڑوں برس کی تہذیب و تمدن کی عزیز یادگاریں تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے نامور شاعر میرؔ نے دل کی بستی کے بسنے اور اُجڑنے کے بارے میں ایک بڑے پتہ کی بات کہی تھی جو میرے خیال میں زبان کے معاملے پر بھی ٹھیک بیٹھتی ہے ؎

دل کی بستی کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے
دل کا اُجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم

زبان کی بستی کا بھی یہی حال ہے۔ ہمارے دیس کے سچے خیرخواہ جو لوگوں کے دلوں کو ملانا اور اس میل اور محبت کے ذریعہ اس ملک میں امن و آشتی کی بستی بسانا چاہتے ہیں، اُنھیں ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر سوچ بچار کرنا اور اس کو سیاسی جھگڑوں اور مخالفتوں کی لپیٹ سے بچانا چاہیئے تاکہ صدیوں کا بنا بنایا کھیل ہماری ہٹ دھرمی یا ناسمجھی کی وجہ سے بگڑ نہ جائے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے کے لئے سیاست، تجارت، صنعت و حرفت کا بہت بڑا میدان پڑا ہوا ہے، لڑنے والے سورماؤں کو اس میدان میں کشتی کرنے دیجئے مگر تعلیم اور زبان کے باغ کو ان کانٹوں سے پاک رکھیئے جو اس میدان میں پیدا ہوتے ہیں۔ زبان کے بارے میں دو تین باتیں اس قدر صاف اور سچی ہیں کہ اگر لوگ ان کو

---

[1] یہ مضمون پرنس آف ویلز کالج جموں کے کنووکیشن ایڈریس کا درمیانی جزو ہے جس میں خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست جموں و کشمیر نے مشترکہ زبان کے اہم مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

سمجھ لیں تو بہت سے جھگڑے مٹ جائیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مثلاً مصر میں لاکھوں عیسائی عربی بولتے ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی نہیں اپنی زبان سمجھتے ہیں، البانیہ اور چین میں لاکھوں مسلمان ان ملکوں کی زبان بولتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ زبان ان کی نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے یا ہندی ہندوؤں کی زبان ہے ایک بے معنی بات ہے زبان اُس شخص کی ہے جو اس کو بولے اور خدا کا شکر ہے کہ زبان کی بستی میں سرمایہ داری کا سکہ نہیں چلتا جس زبان میں شمالی ہندوستان کے کروڑوں ہندو مسلمان روزمرہ بات چیت کرتے ہیں اُس کو صرف ہندوؤں یا صرف مسلمانوں کی زبان قرار دینا قومی میل جول کے راستے میں روڑا اٹکانا ہے۔ یہ وہی زبان ہے جسے آپ سب لوگ اپنی بول چال اور تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں جب اپنی خاص مقامی بولی نہیں بولتے ہوتے۔ کشمیر میں کشمیری مسلمان آپس میں اکثر کشمیری بولی میں بات چیت کرتے ہیں اور جموں میں بہت سے لوگ آپس میں ڈوگری بولتے ہیں لیکن جب ایک ڈوگرہ کشمیری سے گفتگو کرتا ہے تو وہ یہی زبان بولتا ہے۔ اسی طرح پنجاب میں ہندو۔ مسلمان۔ سکھ آپس میں روزمرہ کی بات چیت پنجابی میں کرتے ہیں اور مثلاً بہار میں بعض جگہ میتھلی بولی بولتے ہیں۔ لیکن جب پنجابی، بہاری سے ہم کلام ہوتا ہے تو اسی زبان میں باتیں کرتا ہے جو ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں۔ یہ زبان کہیں باہر سے نہیں آئی، اسی ملک میں پیدا ہوئی، اسی میں پروان چڑھی، اس کے بناتے اور سنوارنے میں، اس کی نوک پلک درست کرنے میں، اس کو آب و تاب دینے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا برابر کا حصہ ہے۔ اور اس کی تاریخ میں دونوں جماعتوں کے ادیبوں کے نام ستاروں کی طرح چمکتے ہیں اسی زبان کو کبھی ہندی کہا گیا ہے کبھی اُردو، کبھی ہندوستانی۔ مگر جب تک ملک میں یہ زبانوں کی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی ان سب ناموں کا مفہوم ایک ہی سمجھا جاتا تھا۔ یعنی شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی بول چال کی زبان۔ لیکن اب ناسمجھ سورماؤں نے زبان کے نام اور مفہوم دونوں کے بارے میں لڑنا شروع کر دیا ہے۔ یعنی انھیں نہ آم کھانے سے مطلب ہے نہ گٹھلیاں گننے سے بلکہ محض گٹھلیوں کے ذریعہ عقل اور رواداری کا سر توڑنا منظور ہے!

زبان کے بارے میں ایک اور بات یاد رکھنی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ ہماری زبان کے مختلف سُر ہیں۔ آپس کی روزمرہ کی بات چیت میں اس کا ایک سُر ہوتا ہے، بازار کے لین دین اور بیوپار میں دوسرا اور علمی و ادبی مجلسوں میں تیسرا۔ اسی طرح گاؤں کا سُر شہر کے سُر سے مختلف ہوتا ہے، اور عورتوں کی بول چال کا سُر مردوں سے الگ اور زیادہ سُریلا ہوتا ہے۔ لیکن یہ شکایت کی بات نہیں یہ تو زبان

کی لچک اور وسعت کا ثبوت ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف میدانوں میں پہونچ کر اس علم زبان کے جُدا جُدا روپ نظر آتے ہیں۔ جب یہ زبان فلسفے، مذہب یا ادب کی سرزمین میں قدم رکھتی ہے تو آپ اس کا درشن ان نئے نئے روپوں میں کر سکتے ہیں۔ جب کوئی ادیب یا ودوان اپنی تعلیم اور مذاق کے مطابق ہندی اور سنسکرت کے خزانوں سے مدد لیتا ہے تو وہ ہندی ساہتیہ کی زبان بن جاتی ہے جب وہ فارسی اور عربی کے خزانوں کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ اردوئے معلیٰ بن جاتی ہے اور یہ بات بھی قابل اعتراض نہیں، کیونکہ:-

The wind of genius bloweth where it listeth.
And one knoweth not whence it cometh nor whither it goeth.

ہندوستان کے سینے میں اتنی فراخی اور رواداری ہے اور ہندوستانیوں کے دل میں اتنی گنجائش ہونی چاہیئے کہ وہ اُردو ادب اور ہندی ادب دونوں کی ترقی کے لئے کوشش کریں اور دونوں کی ترقی سے خوش ہوں۔ کیونکہ یہ دونوں زبانیں ہمارے ملک کی پیاری زبانیں ہیں اور ہمیں ان کا پھولنا اور پھلنا بھلا معلوم ہونا چاہیئے۔ اور انھیں دونوں زبانوں کا کیا ذکر ہے، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اور جتنی بڑی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہمیں ان کو بھی علم اور ادب سے مالا مال کرنا چاہیئے۔ البتہ آپس کی صوبائی بول چال کے لئے ایسی زبان کرنی چاہیئے۔ جو زیادہ سے زیادہ لوگ بول اور سمجھ سکیں۔ اور اس معاملہ میں ہندو اور مسلمانوں کو عربی اور سنسکرت، گھر کے لفظوں اور باہر کے لفظوں کا تعصب بھلا دینا چاہیئے کیونکہ یہ ملک کے ایکے کا سوال ہے جس کے مقابلہ میں اس قسم کے جھگڑے بے کار ہیں۔

جہاں تک ادب اور شاعری کا معاملہ ہے یاد رکھیئے کہ ہر اچھا ادیب یا شاعر یا مصنف اپنے لئے وہی زبان پسند کرتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنے من کی بات اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا سکتا ہو۔ کوئی باہر کا اثر اُسے مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی زبان میں کون سے لفظ استعمال کرے اور کون سے لفظ استعمال نہ کرے۔ اس بارے میں اس کی اپنی طبیعت اور خوش مذاقی ہی چراغ راہ کا کام دے سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر وہ کسی خاص جماعت یا طبقہ کا نام لیوا نہیں بننا چاہتا بلکہ عام لوگوں کی خاطر لکھتا ہے تو اُسے وہی زبان استعمال کرنا ہوگی جسے قبول عام حاصل ہو۔ اس لئے میرے خیال میں یہ کہنا درست ہوگا کہ اس شرط کے اندر اندر شاعر اور ادیب تو اپنی حدیں خود قائم کرتے ہیں، لیکن جہاں تک عام بول چال اور لین دین کا تعلق ہے ہمارا

فرض ہے کہ ہم آسان اور سلیس زبان بولیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہم اپنا مطلب سمجھا سکیں ایسی زبان کی جانچ یہی ہے کہ ہم وہ لفظ استعمال کریں جن کا سکہ چالو ہے۔ جو لوگ بےضرورت بڑے بڑے نامانوس لفظ استعمال کرتے ہیں وہ اپنی قابلیت سے دوسروں پر جھوٹا رعب ڈالنا چاہتے ہیں لیکن دراصل یہ ان کی زبان دانی کی کمی ہے جسے وہ بھاری بھاری لفظوں کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اعتراض کی بات بڑے بڑے لفظوں کا استعمال نہیں بلکہ نامانوس لفظوں کا استعمال ہے۔ یعنی وہ لفظ جن کی صورت اور معنی کو زیادہ تر لوگ نہ پہچانتے ہوں۔ بعض لوگ بے سمجھے بوجھے یہ حکم لگا دیا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی زبان میں عربی اور فارسی یا ہندی اور سنسکرت کے لفظ نہ لانا چاہئیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ جو زبان ہم اور آپ بولتے ہیں اُس کے زیادہ تر لفظ انھیں زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ یہ سب نہایت ترقی یافتہ زبانیں ہیں اور اگر آپ ان کے تمام لفظ اپنی زبان سے نکال دیں تو زبان بالکل کنگال ہو جائے گی۔ دراصل ہندوستان کی تہذیب اور ہندوستان کی زبان دونوں کی سب سے بڑی صفت یہی رہی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ بہت کھلے دل سے اپنے اندر ان چیزوں کو جذب کیا ہے جو انھیں دوسری تہذیبوں یا زبانوں سے حاصل ہوئی ہیں۔ اسی رواداری کی وجہ سے ہماری زبان اور ہماری تہذیب مختلف اثروں کا خوبصورت گنگا جمنی سنگھم بن گئی ہے۔ اسی لئے اب کسی لفظ یا اندازِ بیان یا کسی سماجی اثر یا علمی تحریک کو صرف اس وجہ سے رد کرنا کہ وہ ابتدا میں کسی غیر ملک یا غیر قوم سے تعلق رکھتی تھی، اپنی تاریخ کو جھٹلانا اور اپنی تہذیب کے ساتھ دھوکہ کرنا ہے۔ اگر شدھ ہندی کے پرچارک ملک کی زبان سے ان حسین الفاظ اور خیالات کو نکالنا چاہیں جو فارسی اور عربی زبانوں یا اسلامی تہذیب کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں تو یہ بہت بڑی تنگ نظری اور ملکی ایکے کے ساتھ دشمنی ہوگی۔ اسی طرح اگر اردو کے طرفدار ان لفظوں کے برتنے سے پرہیز کریں جو ہندی یا سنسکرت سے نکلے ہیں یا ان عمدہ تمدنی اثرات کو مٹانا چاہیں جن کا رشتہ پرانی ہندوستانی تہذیب سے ملتا ہے یا جو ہندو مسلم تہذیب کے میل جول سے پیدا ہوئے ہیں تو وہ بھی اتنے ہی قابل الزام ہیں۔

لفظوں کی کسوٹی صرف ایک ہی ہے، یعنی زبان میں ان کی کھپت اور قبول عام، جو لفظ شروع میں ہماری زبان میں مہمانوں کی طرح داخل ہوئے اور پھر اسی میں گھل مل کر گھر والے بن گئے وہ اب ہماری زبان کے لفظ ہیں خواہ وہ بچپن میں ہندی اور سنسکرت کی زبان میں پلے ہوں یا عربی اور فارسی کے چشم و چراغ رہ چکے ہوں۔ جو لفظ کئی سو برس کے میل جول کی وجہ سے ہماری زبان

میں رچ گئے ہیں انھیں زبان سے نکالنے کی کوشش نامبارک ہے۔ اور اگر انصاف کوئی چیز ہے اور تاریخ کا فیصلہ کوئی معنی رکھتا ہے تو اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے نوجوانوں کا فرض تو یہ ہے کہ وہ اُن تمام لفظوں کا سواگت کریں جو ہماری زبان کے ساتھ میل کھاتے ہیں لیکن زبان کو ایسی عطولنس ٹھانس سے بچائیں جو اس کی جینیس (Genius) کے خلاف ہو۔ اگر وہ اپنی قوم اور اپنی زبان اور ادب کے سچے خیر خواہ ہیں تو وہ نہ پریم اور سندر اور سماج اور روپ اور درشن جیسے خوبصورت لفظوں پر ناک بھویں چڑھائیں گے نہ مزاج شریف اور آداب عرض اور تہذیب شرافت سے خفا ہوں گے۔ ہماری زبان کے نغمے میں بہت سے سُر بھرے ہوئے ہیں، ان میں سے بعض کو نکال کر نغمہ کی مٹھاس کو کیوں کم کیا جائے؛ ہاں اگر روزمرہ کی بول چال میں ہم جان بوجھ کر تعصب و تنگ نظری سے کام لیں اور مگر کے بجائے پرنتو، اور کے بجائے تتھا، فائدہ کے بجائے اپیوگ، سوال کے بجائے پرشن اور جواب کے بجائے اتر، مدد کے بجائے سہائتا، جوں ہی کی بجائے بمجرد دیکھ، دیر لگانے کے بجائے معرض التوا میں ڈالنا، بات ماننے کے بجائے اعتراف حقیقت اور رائے دینے والوں کے بجائے رائے دہندگان پر اصرار کریں گے تو زبان کی موسیقی ہٹ دھرمی کی بھینٹ چڑھ جائے گی اور کچھ عرصے کے بعد ہم لوگوں کو جو آج کم وبیش ایک زبان بولتے ہیں ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کے لئے ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت ہو گی۔ خدا کرے کہ ہم زبانوں اور دلوں کی اس جدائی سے بچے رہیں!

شاید مجھ سے پوچھا جائے کہ میں جس قومی زبان کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس کا کہیں وجود بھی ہے یا وہ ابھی تک محض ایک خواب ہے جس کی بوجھ معلوم نہیں۔ وہ زبان بے شک موجود ہے اور اس کے اچھے نمونے آپ کو بہت سے ہندو اور مسلمان لکھنے والوں کی کتابوں میں ملیں گے۔ لیکن شاید اس کا سب سے اچھا نمونہ وہ زبان ہے جس میں حالی نے اپنی مشہور مثنوی "بیوہ کی مناجات" لکھی ہے اور جس کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق نے مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ اگر کبھی اس بدقسمت ملک کی ایک مشترک زبان بنی تو وہ "مناجات بیوہ" کی زبان ہو گی۔ دیکھیے اس سیدھی سادی اور آسان زبان میں جس میں ہندی سنسکرت۔ عربی۔ فارسی سب کے اچھے اچھے الفاظ سمٹے گئے ہیں ایک باکمال شاعر خدا کی حمد کے مشکل میدان میں کیا جوہر دکھاتا ہے۔

سب سے انوکھے، سب سے نرالے   آنکھ سے اوجھل، دل کے اُجالے
ناؤ جہاں کی کھینے والے   دُکھ میں تسلی دینے والے

جب، اب، تب، تجھ سا نہیں کوئی، تجھ سے ہیں سب، تجھ سا نہیں کوئی،
جوت ہے تیری، جل اور تھل میں باس ہے تیری پھول اور پھل میں
ہر دل میں ہے تیرا بسیرا تو پاس اور گھر دور ہے تیرا
دل میں ہے جن کے تیری بڑائی گنتے ہیں وہ پربت کو رائی
تو ہی ڈبوئے، تو ہی ترائے تو ہی بیڑے پار لنگھائے
تو ہی پلائے زہر کے پیالے تو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے
تو ہی دلوں میں آگ لگائے تو ہی دلوں کی لگی بجھائے
پُچکارے، چمکار کے مارے مارے مار کے پھر پُچکارے

اور پھر اس میٹھی زبان میں وہ ایک بدنصیب بیوہ کے دکھی دل کی پکار کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پتھر کا کلیجہ پانی ہو جائے، ذرا لفظوں کے انتخاب کو دیکھئے :-

ہیرا بخشا کان کو تو نے مشک دیا حیوان کو تو نے
جگنو کو بجلی کی چمک دی ذرّے کو کندن کی دمک دی
عام ہے سب پہ تیری رحمت ہیں محروم مگر بد قسمت
سب کو تیرے انعام تھے شامل میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں نون کو ترسی میں سانبھر میں
ان کے آخر میں نے لیا کیا مجھ کو مری قسمت نے دیا کیا!
نین دیئے اور کچھ نہ دکھایا دانت دیئے اور کچھ نہ چکھایا
سیلانی جب باغ میں آئے پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے
پیت نہ تھی جب پایا پیتم جب ہوئی پیت گنوایا پیتم
دل پہ ہے جب کوئی برچھی چلتی آہ کلیجہ سے ہے نکلتی
ورنہ ہے اس دنیا میں دھرا کیا خواب کا سا ہے اک یہ تماشا
عیش کی یاں مہلت ہے نہ غم کی سب یہ نمایش ہے کوئی دم کی
آنی جانی چیز ہیں خوشیاں چلتی پھرتی چھاؤں ہیں ارماں
ریت کی سی دیوار ہے دنیا اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے اس نگری کی ریت یہی ہے

سات سہاگ اور سوگ ہے یاں کا
ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
اُٹھ نہیں سکتے مجھ سے اب اک دم
یہ دنیا کے ناشدنی غم!
دل میں لگن بس اپنی لگا دے
سارے غم اپنے غم میں کھپا دے

یہ وہ زبان ہے جو نہ ہندو کی زبان ہے نہ مسلمان کی، یہ ہندوستان کے دکھے ہوئے دلوں اور گھٹے ہوئے جذبات کی زبان ہے جو اسی ملک کی خاک میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی اس کی بے لاگ خدمت کرنا ملک کا بھلا چاہنے والوں کا فرض ہے۔ اس کو اُردو بولنے والے اور ہندی بولنے والے دونوں اپنا سکتے ہیں اور اسی کو اگر آپ چاہیں تو ہندوستانی یعنی ہندوستان والوں کی زبان کا نام دے سکتے ہیں۔

پست قوم

(جوشؔ ملیح آبادی)

اپنے خلاف بات سُنیں اور خوش رہیں
ذہنوں میں وہ طہارت و وسعت کہاں ہے، جوشؔ!
چلتی ہے کوہ و بحر کو جو روندتی ہوئی
اہلِ جمود میں وہ محبت کہاں ہے جوشؔ!
اپنی اہانتوں کا کچھ احساس کر سکیں
اتنا دلوں میں جذبۂ غیرت کہاں ہے، جوشؔ!
اہلِ نظر کی قدر کریں حسب مدعا
ابنائے ملک میں وہ بصیرت کہاں ہے، جوشؔ!
گردن کا طوق، پاؤں کی زنجیر کاٹ دے
اِتنی غلام قوم میں ہمت کہاں ہے، جوشؔ!
اپنی تباہیوں پہ کبھی غور کر سکے
اِتنی ذلیل قوم کو فرصت کہاں ہے جوشؔ!
اِک حرفِ گرم سنتے ہی لَو دے اُٹھے دماغ
ہندوستان میں وہ حرارت کہاں ہے جوشؔ!

(نیا ادب)

من مندر کی دیوی

(از مسٹر فیاض الدین احمد خاں، فیاض، بی۔ اے)

وہ مست نظر، چال وہ اٹھلائی ہوئی سی
آنکھوں میں محبت کی چمک آئی ہوئی سی
بجلی وہ چمکتی ہوئی لہرائی ہوئی سی

لپٹا ہوا اِک سرمئی ساری میں بدن سب
جس طرح چھپا ہو کسی بادل میں چمن سب
جس طرح کلی کنج میں شرمائی ہوئی سی

مندر میں وہ اُس کے رُخِ روشن سے اُجالا
یا نور کا چمکا ہے شوالے میں شوالا
اِک شمع ہے چمکی ہوئی چمکائی ہوئی سی

ملتے ہی نظر مجھ سے وہ چونکی ہوئی تصویر
جس طرح اچانک ملے اِک خواب کی تعبیر
آنکھوں میں لگاوٹ لیے گھبرائی ہوئی سی

مندر کی فضاؤں میں ہے اِک برق سی مضطر
محجوب اداؤں میں ہے اِک برق سی مضطر
لپٹی ہوئی۔ سمٹی ہوئی۔ تھرّائی ہوئی سی

ہنگامِ طواف آہوئے رم خوردہ کا انداز
بھٹکی ہوئی نظروں کا وہ بھٹکا ہوا انداز
وحشت پہ وہ شوخی کی ادا چھائی ہوئی سی

اندازِ پذیرائیِ اُلفت ہے حسیں اور
پڑتا ہے کہیں پاؤں تو نظریں ہیں کہیں اور
کچھ کھوئی ہوئی چیز ہے کچھ پائی ہوئی سی

وہ چاند سے مکھڑے پہ بکھرتے ہوئے گیسو
قامت میں جوانی کا وہ چلتا ہوا جادو
ہر گام پہ جھومی ہوئی لہرائی ہوئی سی

پیغامِ نگاہوں کا مری غور سے پڑھنا
افسانۂ ارمانِ دلی غور سے پڑھنا
ہونٹوں پہ کوئی راز کی بات آئی ہوئی سی

وہ کیفِ مسلسل ہے نہ وہ جلوۂ بیتاب
اِک خواب تھا، اِک خواب تھا، اِک خواب!
تعبیر ہے تقدیر سے شرمائی ہوئی سی

پھرتی ہے نگاہوں میں مگر اب بھی وہ تصویر ہے دل میں ترا زور ترا چھوڑا ہوا ہر تیر
سینے میں تمنائیں ہیں اِترائی ہوئی سی
اب محوِ پرستش کسی مندر میں کہاں تو مندر وہ ترا من میں ہے رہتی ہے جہاں تو
ہر صبح تخیّل پہ مرے چھائی ہوئی سی

اللہ اللہ

(از حضرت سرشار کسمنڈوی)

تجلی کی گل کاریاں اللہ اللہ! ہر اک سُو شرر باریاں اللہ اللہ
وہ آنکھوں میں، دل میں کھٹک سی، چبھن سی وہ راتوں کی بیداریاں اللہ اللہ
گلستاں گلستاں، نشیمن نشیمن، یہ شعلے، یہ چنگاریاں اللہ اللہ
مرا گریۂ غم ہے، یا ابر رحمت تبسّم کی پھلواریاں اللہ اللہ
یہ آنکھوں میں تسنیم و کوثر کی لہریں یہ معصوم سرشاریاں اللہ اللہ
محبت جوانی، جوانی محبت نظر کی غلط کاریاں اللہ اللہ
ارے بے مروت، ارے بے مروّت یہ نخوت، یہ خودداریاں اللہ اللہ
دوائیں منافق، دعائیں مخالف محبت کی بیماریاں اللہ اللہ
کبھی مسکرانا، کبھی روٹھ جانا حسینوں کی دلداریاں اللہ اللہ
نگاہوں کی سازش، قیامت کی سازش بظاہر طرفداریاں اللہ اللہ
سُنا ہے کہ دنیا میں غم اور بھی ہیں وفا کی گرانباریاں اللہ اللہ
سنہری فضاؤں میں ٹھنڈی ہوائیں یہ برکھا کی تیاریاں اللہ اللہ

زمانہ ہے سرشار آفت رسیدہ
ہماری بھی لاچاریاں اللہ اللہ

حسرت موہانی

(از سید نجم الدین نقوی، بی۔ اے، آنرز)

اُردو غزل پر ایک اعتراض یہ بھی بڑے شد و مد سے کیا جاتا ہے کہ اس میں حقیقت سے دُور رہ کر خیالی دنیا میں تگ و دَو کی جاتی ہے۔ مگر لوگوں کا یہ خیال کہ غزل زندگی کے واقعات اور اُس کی حقیقی کیفیات کی ترجمانی نہیں کرتی بڑی حد تک غلط ہے۔ وہ غزل غزل ہی نہیں جس میں حقیقت سے ہٹ کر باتیں کہی گئی ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اُردو شاعری میں ہمیں ایسے بہت سے غزل گو حضرات ملتے ہیں جن پر مندرجہ بالا اعتراض بالکل صادق آتا ہے۔ لیکن اُن کی نسبت اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ غزل کہنا نہیں جانتے، اور اُنھیں ایک نقال سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غزل کیا چیز ہے؟ ظریف مرحوم نے ایک مصرع میں غزل کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے "تھا غزل معشوق سے کچھ دردِ دل کہنے کا نام" لیکن میرے خیال میں یہ تعریف بھی پُرانے تخیل کی بنا پر ہے۔ غزل معشوق سے صرف دردِ دل کہنے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ غزل عشق و محبت کے قلبی واردات اور لطیف احساسات کے اظہار کا نام ہے۔ احساسات غیر لطیفہ سے مراد اُن تاثرات سے ہے جو کبھی کبھی محبوب کی بے اعتنائی وفا کشی اور ستم ظریفی سے حبیب کے دل پر مرتسم ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ جہاں تک عشق مجازی کا تعلق ہے چاہے ہم اس کے انتہائی بلند معیار پر کیوں نہ پہونچ جائیں انسانیت ہم سے اور ہم انسانیت سے جُدا نہیں ہو سکتے۔ عاشق ہونے پر بھی ہم انسان ہیں اور محبت کرنے پر بھی ہم آدمی ہی رہیں گے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے تمام جذبات وہی ہونگے جو ایک صحیح الدماغ انسان اور غیرت مند آدمی میں ہونا چاہئیں۔ محبت میں تمام مصائب برداشت کرنے پر بھی ہم محبوب کے ساتھ انتہائی وفا شعاری سے پیش آئیں گے، لیکن اس پر بھی جب اُس کا اندازِ تغافل نہ بدلے گا تو ہماری رگِ حمیت بھی بھڑکے گی اور یہ کہنے پر مجبور ہونگے:۔

کچھ تو دینا تھا ہمیں تیرے تغافل کا جواب　　یا خدا جن کو تجھے دل سے بھلا دینا تھا

یہی وہ مقام ہے جہاں حسرت حقیقی غزل گو شعراء کے دوش بدوش اور نقالی کرنے والوں سے ممتاز ہیں۔ حسرت نے اپنی شاعری میں زندگی اور اُس کی پیچیدگیاں سامنے رکھی ہیں، ورنہ وہ یہ نہ کہہ سکتے :۔

نہیں آتی جو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وہ یہ نہیں مانتے کہ عشق مجازی کرنے والا ماسوا حسن وعشق کے ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عاشق ہوتے کے ساتھ ہی بھوک بھی لگتی ہے، پیاس بھی معلوم ہوتی ہے، دنیا کے اور مسائل بھی اُس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اعزا سے بھی اُنس کر سکتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک عرصہ کے لئے اپنے محبوب کو بھول جاتا ہے۔ لیکن جب اُس کا خیال آتا ہے تو بار بار آتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لئے خیالِ محبوب کے سوا تمام چیزیں ہیچ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ حسرت ایک حساس دل اور سوچنے والا دماغ لے کر آئے ہیں، وہ علم النفس سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عشق کیا چیز ہے اور حسن کا کیا مرتبہ ہے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حسن وعشق میں ایک ربط ہے، وہ بعض اوقات عشق کو احساسِ حسن کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ حسن بغیر عشق بیکار شے ہے۔ اور حسن میں اپنے حسین ہونے کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا، چنانچہ کہتے ہیں :۔

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

حسرت کے حالاتِ زندگی جو کتابی شکل میں ہمارے سامنے آئے ہیں اُن سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ کبھی عشق مجازی کے بھی گھائل رہ چکے ہیں۔ لیکن ایک کامیاب غزل لکھنے والے کے لئے جو سب سے بڑا معیار بنایا گیا ہے وہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم مولانا کو مولانا ہی نہ سمجھیں بلکہ یہ مان لیں کہ حسن وعشق کے راستوں کی بھی اُنھوں نے سیر کی ہے۔ اشعار ذیل اس کے متعلق کافی روشنی ڈالتے ہیں

آہ کہنا وہ ترا پاکے مجھے گرم نظر ایسی باتوں میں نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں
سن کے قاصد سے مرا حال کہا تو یہ کہا ہیں وہ بدنام کہیں مجھ کو بھی رسوا نہ کریں

یہ دونوں شعر بظاہر ابتذال کی حد تک پہنچ جاتے ہیں لیکن ان سے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جس سے ابتذال کا پہلو بالکل معدوم ہو جاتا ہے۔ الفت کا وہ درجہ بھی ہے

جب حبیب و محبوب ایک دوسرے سے مانوس ہونے لگتے ہیں، اور ملخندگی میں ایک قسم کی بے چینی محسوس ہونے لگتی ہے اور ملنے میں بھی ہچکچاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ غرض عجب کشمکش ہوتی ہے تکلیف کے بعد آرام ملنے پر تکلیفیں بھول جاتی ہیں، لیکن عیش مصیبت میں بار بار یاد آتا ہے چنانچہ حسرت کا شعر ہے:۔

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے ۔۔۔ دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا ۔۔۔ اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے ۔۔۔ اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

ان تمام منازل نے حسرت کے دل و دماغ پر جو خاص اثر ڈالا ہے اس سے حسرت کے اشعار میں اشعار کی تدریجی ترقی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

آہ اس نگاہِ مست کی شوخی جو بے خبر ۔۔۔ خوبی پہ روئے یار کی پہلے پہل گئی

بے خبر کا لفظ پہلے مصرع کی جان ہے، پہلے نگاہ بغیر جانتے ہوئے بلا کسی ارادے کے پڑتی ہے، یا

بھولے سے وہ ادھر بھی جو آنکلے تھے کہیں ۔۔۔ اُس دن کا بھولتا ہی نہیں ماجرا مجھے

بھولے سے بالکل ابتدائی درجہ ہے، بیخبری ثابت ہے، ابھی ان کا غیر ارادی طور پر ادھر آنکلنا صرف ماجرا کی حد تک ہے، یہ ماجرا بار بار یاد آتا ہے، بھولتا ہی نہیں۔

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی اُن کا ۔۔۔ جستجو کی کوئی تمہید اُٹھائی نہ گئی
بار بار آتا ہے یہ کس کا خیال ۔۔۔ بے خودی بتلا مجھے کیا ہو گیا
اُمید نہیں اُن سے ملاقات کی ہر چند ۔۔۔ آنکھوں سے مگر ذوقِ تماشا نہیں جاتا
تقریبِ محبت کی کیا خوب تھی وہ ساعت ۔۔۔ جس وقت ہوا مجھ سے وہ ماہ جبیں واقف
نہ پوچھیے کہ ہوئی حسن کی عجب حالت ۔۔۔ سُنی جو پہلے پہل عشقِ ناصبور کی بات
سُن کے قاصد سے مرا حال کہا تو یہ کہا ۔۔۔ ہیں وہ بدنام کہیں مجھ کو بھی رسوا کریں
روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں ۔۔۔ اِک تماشا دکھا گئیں آنکھیں
اُس نے دیکھا تھا کس نظر سے مجھے ۔۔۔ دل میں گویا سما گئیں آنکھیں
آج سُن کر میرے نالوں کو زراہِ التفات ۔۔۔ زیرِ لب اُس نے بھی کھینچی ایک آہِ التفات
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں ۔۔۔ یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
یاد ہیں یا وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں ۔۔۔ التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

جستیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار　　جس میں اُٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے
تجھ سے اہلِ دل کے تعجب ہے کہ عرصہ اتنا　　آج تک تیری جدائی کا یہ کیونکر گزرا
کچھ نہ پوچھو حال کیا تھا خاطرِ ناشاد کا　　اُن سے جب مجبور ہو کر میں جدا ہونے لگا
بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے　　ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
میں بے خبرِ غم تھا مگر وہ دمِ رخصت　　دیکھا کئے مڑ مڑ کے مجھے حدِ نظر تک

یہاں پر اِن تمام اشعار کے درج کرنے کی غرض صرف اس قدر ہے کہ غزل کے معترضین دیکھیں کہ اُن کا یہ اعتراض کہ غزل ایک شخصی ڈائری سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، ان اشعار کے پڑھنے کے بعد کہاں تک مسترد ہوتا ہے ان اشعار کی تشریح کرنا ان کا خون کرنا ہوگا۔ حقیقت میں نظریں اور زخم خوردہ دل انھیں مزے لے لے کر پڑھیں گے۔ واقعی حسرت کے یہ اشعار "رُوداد جہاں" ہیں نہ کہ ذاتی یا شخصی ڈائری۔

حسرت نے اپنے کلام میں دہلی اور لکھنؤ کے رنگ کو سمونے کی بھی کوشش کی ہے جس میں وہ پورے طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ اُن کے کلام میں ایک طرف زبان کی شیرینی، ترکیب کی چستی، الفاظ کا شکوہ اور محاورات کا برمحل استعمال پایا جاتا ہے تو دوسری جانب جذبات کی فراوانی، الفاظ کی سادگی اور سوز و گداز بھی موجود ہے۔ حسرت کے یہاں سطح بیں نظروں کے لئے بھی دعوتِ نظر کا سامان موجود ہے، اور صاحبانِ دل کی ضیافت کا بھی۔ لکھنؤ اسکول کے لوگ انھیں یوں اچھا سمجھتے ہیں کہ حسرت نے زبان کی خصوصیات پر بھی زور دیا ہے، اور دہلی والے اس لئے معترف ہیں کہ حسرت نے غزل کے معنوی پہلو کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اپنے اس کمال کا خود انھیں بھی احساس ہے، چنانچہ کہتے ہیں۔

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دلّی کی نمود　　تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

حسرت کی غزلیں چوٹی کنگھی کے بیانات سے خالی ہیں، کیونکہ اُنھوں نے شاعری کے خارجی پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا۔ وہ شاعری کو اظہارِ جذبات کا آلہ خیال کرتے ہیں، اس لئے اُن کے یہاں داخلی پہلو زیادہ پایا جاتا ہے۔ وہ محبوب کی تصویر کھینچتے وقت دوسروں سے بالکل الگ معلوم ہوتے ہیں، وہ ہاتھ پاؤں۔ ناک۔ کان اور کمر کا چنداں ذکر نہیں کرتے ہیں، بلکہ صفات کے ذکر سے اور الفاظ کی مدد سے ایک مدھم سا خاکہ ہماری نظروں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، اُس میں جیسا رنگ چاہیئے دے لیجئے یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے۔ ذیل کے چند شعر ایک پاکیزہ باحیا

جاں نثار اور شریف خاتون کا پیکر نظروں کے سامنے لاکھڑا کر دیتے ہیں۔

لایا ہے دل پر کتنی خرابی	اے یار تیرا حسن شرابی
پیراہن اُسکا ہے سادہ رنگیں	یا عکس مے سے شیشہ گلابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں	کیفیت اُن کی وہ نیم خوابی
وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی	ہیں وصف جسکے سارے کتابی

صوفیوں کے یہاں عشقِ مجازی حقیقی عشق کا زینہ خیال کیا گیا ہے، آتش کہتا ہے:-

ہمارے کفر کے پہلو سے دیں کی راہ یاد آئے	صنم رکھتے ہیں جس کو دیکھکر اللہ یاد آئے

ممکن ہے ایسا ہی ہوتا ہو، اور مولانا کا عشق بھی بڑھتے بڑھتے حقیقت سے جا ملا ہو، بہرحال اُن کے یہاں یہ صنف بھی انتہائے کمال پر نظر آتی ہے۔ اللہ اکبر معلوم ہوتا ہے احساسات کا ایک دریا ہے جو موجیں مار رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے حسرت کے تمام کلام میں اس قدر سادہ لیکن پرکار غزل جس کے لفظ لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھنے والے کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے مشکل ہی سے نکلے گی:-

سیہ کار تھے باصفا ہوگئے ہم	ترے عشق میں کیا سے کیا ہوگئے ہم
ہوئے محو کس کی تمنا میں ایسے	کہ مستغنی ماسوا ہو گئے ہم

صوفیوں کے یہاں "ہمہ اوست" کا مسئلہ بڑا اہم ہے، جس نے اس فلسفہ کو سمجھ لیا حقیقت شناسی کی معراج پا گیا۔ چونکہ یہ منزل انتہائی ارفع ہے اس لئے ہر شخص نے اس حد تک پہونچنے کی کوشش کی ہے اور مختلف پیرایہ سے اس پر روشنی ڈالی ہے، فارسی کے یہ چار مصرعے بہت مشہور ہیں:-

ز دریا موج گوناگوں برآمد	ز بے چونی بہ رنگِ چوں برآمد
گہے بر کسوتِ لیلےٰ فروشد	گہے بر صورتِ مجنوں برآمد

اس میں شک نہیں کہ فارسی والے بڑے مزے کے ساتھ اس مسئلہ کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ "ہمہ اوست" کے مسئلہ کو ان سے زیادہ کوئی دوسرا نہیں سمجھتا لیکن حسرت کے اس سادے شعر کے پڑھنے کے بعد زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔

ہم کیا کریں اگر نہ تری آرزو کریں	دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا

یہ اور بات ہے کہ حسرت کے یہاں فارسی کی حلاوت شیرینی اور مزا نہ ہو لیکن حسرت نے

ہمہ اوست کے مسئلہ کو بغیر کسی استعارہ، تشبیہ اور کنایہ کے کس قدر صاف اور سادے طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی شاعر نے خدا کی ذات کو دریا۔ موج۔ بے چونی۔ بزنگ چوں کسوت لیلیٰ اور صورت مجنوں" کے اندر محدود کر دیا ہے۔ لیکن حسرت نے خدا کو قیدِ مکان و زماں سے کہیں ارفع و اعلیٰ قرار دیا ہے۔ وہ تو ہر ورقے دفتر نیست" پر ایمان رکھتے ہیں

معائب کی فہرست حسرت کے یہاں بہت مختصر ہے، خوبیاں بُرائیوں پر پردہ ڈالے ہوئے ہیں کچھ متروکات وہ ضرور استعمال کرتے ہیں لیکن وہ سوا انھیں نظم نہیں کرتے ہیں بلکہ قدماء کی پیروی کے خیال سے جس پر وہ بار بار فخر کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اُن کے یہاں نسیم دہلوی اور مومن کا پورا پورا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس لئے وہ یہ دکھا دینا چاہتے ہیں کہ متروکات بھی اُسی خوبی سے نظم ہو سکتے ہیں جس خوبی سے متقدمین نے نظم کئے ہیں۔

لیکن ان تمام تاویلوں کے باوجود بھی حسرت پر یہ اعتراض اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے کہ اُنھوں نے متروکات کا استعمال کر کے اُردو میں دوبارہ وہ چیزیں داخل کر دیں جنھیں زمانہ کی کوششوں نے اُردو کے باغ سے چھانٹ کر علٰحدہ کر دیا تھا۔

سوزِ ناتمام

نتیجۂ فکر کیلاش ورما صاحب شایق ہنگامی

عشق کی سادگی کو دیکھ حسن کی برہمی نہ دیکھ
یعنی جو ہے نظارہ سوز اس کی طرف کبھی نہ دیکھ

دیر و حرم میں رہ کے بھی توڑ دے اُنکی بندشیں
رنگ مجاز پر نہ جا صورتِ ظاہری نہ دیکھ

وقت پڑے تو فرض ہے عشق کی منزلت کا پاس
حسن کی بارگاہ میں حسن کو مڑ کے بھی نہ دیکھ

مرکزِ حسن سے کہیں پائے خیال ہٹ نہ جائے
اپنی خودی پہ رکھ نظر عشق کی بیخودی نہ دیکھ

طور پہ اور بھی ذرا حوصلہ دے کلیم کو
جوہر عاشقی تو دیکھ منظرِ بیہشتی نہ دیکھ

کچھ کہیں رنگ لے نہ آئے جذبۂ شوق ناتمام
جو ترا صبر آزمائے اُسکی طرف کبھی نہ دیکھ

بارشِ اشک غم نہیں ریزشِ نور حسن ہے
چاندنی کا نظارہ کر چادرِ شبنمی نہ دیکھ

میری خوشی اسی میں ہے بس نہ کبھی ہوں شاد کام
ظرف کا امتحاں نہ لے تو مری تشنگی نہ دیکھ

کام تمام کر سکے ایک ہی جنبشِ نظر
شایق نیم جاں کی سمت بارِ دگر کبھی نہ دیکھ

تنقیدِ حیات کی کوشش

(۲)

(پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، ایم۔ اے)

(۲۱) دیکھئے کب شامِ نظمِ زندگی کی صبح ہو — آسمانوں کو بھی جیسے آرہی ہو نیند سی

(۲۲) دیکھ رفتارِ انقلاب فراق — کتنی آہستہ اور کتنی تیز

پہلا شعر اس وقت کہا گیا تھا جب انگلستان نے روس کی مدد سے چکوسلیویکیا کو بچانے کے بجائے چکوسلیویکیا کے ساتھ دغا کی تھی۔ اور چیمبرلین نے اُس ملک پر جرمنی کا قبضہ ہوجانے دیا جس پر خود انگلستان کے بعض وزرا مستعفی ہو گئے تھے۔ چکوسلیویکیا کی راجدھانی پراگ پر جرمن فوج کے حملے کے دردناک تصور کے ماتحت یہ شعر کہا گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کی رگیں شل پڑ گئی ہیں اور آسمانوں کو نیند سی آرہی ہے۔ صبح ہونے کے معنی خاتمہ ہونے کے بھی ہیں۔ مشہور عالم فرانسیسی شاعر روماں رولاں نے (جو نوبل پرائز حاصل کرچکے ہیں اور اشتراکی مصنفوں کے صفِ اول میں ہیں اور جنھوں نے گاندھی جی اور رام کرشن پرم ہنس کی سوانح عمری لکھی ہے) انقلابِ فرانس کے متعلق ایک ڈراما لکھا ہے۔ جس میں ایک جگہ یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ انقلاب فرانس ہونے کے چند لمحے پہلے تک جمہور کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ انقلاب ہونے والا ہے۔ اس موقع پر اس ڈراما میں یہ ناقابلِ فراموش فقرہ آیا ہے کہ انقلاب ہونے والا ہوتا ہے تو انقلاب سے زیادہ کوئی چیز انھونی یا غیر متوقع نہیں معلوم ہوتی۔[*] دوسرا شعر اسی جملے کے مطالعہ کا اثر ہے۔ دوسرے مصرع میں اس زبردست حقیقت کی ترجمانی کی گئی ہے "کتنی آہستہ اور کتنی تیز" کتنی غیر متوقع اور کتنی قریب

(۲۳) حیاتِ عشق کے ہاتھوں ابھی حیات نہیں — غم و خوشی کے لئے آدمی کی ذات نہیں

زندگی نہ تو غم ہو نہ خوشی نہ اُداسی نہ شگفتگی، لیکن ان لوازماتِ غم اور خوشی نیکی اور بدی سے زندگی بالاتر ہے۔ اس شعر میں عشق سے یہ شکایت کی گئی ہے کہ اس نے زندگی کو غم اور خوشی کا شکار بنادیا۔ دوسرے مصرعہ میں آدمی کی تقدیر کو اس کے مقصدِ وجود کو غم و خوشی سے بلند بتایا گیا ہے۔

---

[*] *Nothing is more unexpected than a revolution on the eve of a revolution.*

یہی وہ زندہ بے حسی ہے جو غالباً حیات کے مادّی عناصر کی آخری منزل ہے۔ لیکن زندگی کے اس داخلی ارتقا یا انقلاب کو ترکِ دنیا والی بے حسی ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے۔ بقول اصغر گونڈوی:۔

رنج و تعب اُٹھایا، رنگِ نشاط دیکھے — آئے نہیں ہیں یوں ہی انداز بے حسی کے

(۲۴) دیکھ تو ابتدا نہیں، سوچ تو انتہا نہیں — دردِ حیات الاماں اُٹھ کے جو اُٹھ چکا نہیں

زندگی اور وجود کے سکون کا تصور ناممکن ہے، سکون بھی ریاضیات کی اصطلاح میں ایک متوازن حرکت (Uniform motion.) ہے۔ زندگی اور موت، ازل اور ابد، دنیا، محشر اور جنت سب اِس ازلی اور لاانتہا حرکت کے وقفے ہیں۔ یعنی "آگے چلیں گے دم لے کر"۔

(۲۵) اس سے تو کفر ہی بھلا جو ہی اسی جہان کا — ایسے خدا سے کیا جسے فرصتِ ماسوا نہیں

جگر مرادآبادی کا مطلع تھا:۔

یہ تو نہیں کہ عرضِ غم درخورِ اعتنا نہیں — عالمِ حسن کو مگر فرصتِ ماسوا نہیں

میرے شعر کو "عالمِ حسن" کی اس بے نیازی کے خلاف جہاد اور بغاوت سمجھیئے۔ عالمِ حسن یا حسنِ حقیقی یا خدا کی بے نیازی کا کوئی ٹھکانا ہے؟ بقول مومن:۔

خدا کی بے نیازی آہ مومن! — ہم ایماں لائے تھے جورِ بتاں سے!

گنا ہگار کا تو یہ عقیدہ ہے کہ خدا کا وجود اور خدا کی بے نیازی یعنی عالمگیر وجود کے محرکات سے متاثر ہونے کی عدم صلاحیت ایک متناقض تصور ہے۔ بے نیازی محض ایک نفی صفت ہے، گو اضافیاتی نظریہ سے بظاہر بے نیازی ہر ذرہ اور ہر جاندار میں تصور کی جاسکتی ہے۔ لیکن ہر شے پر سبب اور علت کا اثر ہونا ایک عالمگیر حقیقت ہے جس سے "عالمِ حسن" بھی مستثنیٰ نہیں سمجھا جاسکتا۔ بقول عزیز لکھنوی: "کشش ہر ایک ذرہ کی زمیں سے آسماں تک ہے" ہاں عاشق سے حسن کی بے نیازی تجاہل اور تغافل کی اور بات ہے۔ پہلے مصرع میں "جو ہے اسی جہاں کا" والا ٹکڑا قابلِ توجہ ہے۔

(۲۶) نہ ازل ہے کچھ نہ ابد ہے کچھ یہی موت ہے یہی زندگی
جسے وقت کہتے ہیں اہلِ دل وہ فنا بھی ہے وہ بقا بھی ہے

(۲۷) یہ اجل بھی کیا یہ فنا بھی کیا کبھی دیکھ آکے فراق کو
اِسی زندگی کی تجھے قسم کہ جو درد بھی ہے دوا بھی ہے

(۲۸) جسے دیکھ فکرِ دوام ہے کوئی آشنائے فنا بھی ہے

یہ پیام بادِ خزاں بھی سُن کہ گلوں میں بوئے وفا بھی ہے

پہلے شعر کے متعلق جرمن شاعر کا یہ مقولہ قابلِ غور ہے کہ "وقت کے رخنوں سے ابد جھانکتی ہے" وقت ایک بیکراں حقیقت کا تموج ہے۔ مخصوص لمحات کے لحاظ سے فنا ہے اور کاروانِ وجود کی رفتار کے لحاظ سے بقا ہے۔ بقا زمانی چیز نہیں ہے بلکہ وجود کل سے احساس وحدت کا نام بقا ہے، جزویت اور کلیت، انفرادیت اور آفاقیت کی پُر اسرار نسبتوں کی روشنی میں فنا اور بقا کا سمجھنا ممکن ہوتا ہے۔ دوسرے شعر میں موت اور فنا کو غمِ ہستی کا علاج سمجھنے والے فلسفۂ شکست کی غلطی بتائی گئی ہے۔ "اسی زندگی کی چھپے قسم کہ جو درد بھی ہے دوا بھی ہے" تیسرے شعر کی شانِ نزول زیب النسا کا یہ فارسی شعر ہے:-

نہال سرکش و گل بے وفا و لالہ دو رنگ — دریں چمن بہ چہ امید آشیاں بستم

یہ نازک شعر اور اتنی نرم بات شاید ایک عورت ہی کہہ سکتی تھی۔ لیکن اگرچہ گل دو دن کے لئے کھل کے مرجھا جاتے ہیں۔ پھر بھی اس کی عارضی شگفتگی میں دوام کی شان ہے، اس میں بوئے وفا بھی ہے۔ کسی چیز یا حالت کا وقوع میں آ جانا ایک اٹل حقیقت ہے۔ لوگ خارجی دوام یا زمانی دوام کی تمنا کرتے ہیں۔ فنا کے راز سے آشنا ہو جائیں تو فنا ہی دوام ہے۔ دائمی اہی ہے جس کی حقیقت فنا ہو، نہ بدلنے کی صفت حقیقتاً فنا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کی وہ نظم بھی قابلِ غور ہے جس میں حُسن خدا سے پوچھتا ہے "جہاں میں کیوں نہ مجھے تونے لازوال کیا"

(۲۹) اُجڑنا سیکھ دنیا میں اگر سرسبز ہونا ہے — گلستاں لہلہائے بارہا نذرِ خزاں ہوکر
(۳۰) انھیں بہار کی آنکھوں نے بھی نہیں دیکھا — جو گل چمن کو مٹا کر کھلا کے جاتے ہیں

اِن دونوں اشعار میں نعرۂ انقلاب بلند کیا گیا ہے، تخریب کے بغیر تعمیر ممکن نہیں ہے۔ کوئی باغ محض چار روپیکتی سے یا کچھ شاخیں اور پتیاں قلم کرنے سے دوسرا جنم نہیں لے سکتا۔ اُسے خزاں کی تپتی ہوئی اور جھلس دینے والی ہواؤں کے جھونکوں اور جھکڑوں سے برباد ہونا پڑتا ہے۔ پہلے باغ میں چنگاریاں اُڑتی ہیں تب پھول کھلتے ہیں۔ اصلاح اور انقلاب میں فرق ہے۔ ارتقا کی مخصوص اور اہم منزل کا نام انقلاب ہے۔ دوسرے شعر میں "بہار" سے اس ظاہری چمک دمک کی طرف اشارہ ہے جو استبداد زمانہ سے اب چھوٹی پڑ چکی ہے۔ اِس مرگِ حیات نما کو مٹانے ہی سے وہ سچی زندگی حاصل ہوتی ہے جسے "بہار کی آنکھوں نے بھی نہیں دیکھا"، پھر کیا موجودہ جنگ "چمن کو مٹا کر" کسی نئے نظام زندگی کا گل تو نہیں کھلا رہی ہے؟

(۳۱) اُجڑنا تھا جنھیں اُجڑے بھرے گلزار کے ہاتھوں — مبارک برق کو غارت گرِ صد آشیاں ہونا

(۳۲) انھیں تنکوں میں ڈھونڈھا چاہئے بلبل — بجلیاں بھی ہیں آشیانوں میں

بسا اوقات آفت اور مصیبت عروج اور اقبال مندی کا پیش خیمہ ہوتی ہے (اجڑے بھرے گلزار کے ہاتھوں) اس فقرے میں (یتی عشیقہ) زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے فارسی کا یہ مصرع ظاہر کر رہا ہے "بلائے فرقتِ لیلیٰ و قربتِ لیلیٰ" اور میرا یہ شعر بھی:

اس درجہ ربط اور پھر اتنی مغائرت — تو میرے اور اپنے کبھی درمیاں بھی ہو

خارجی اور ظاہری مصائب کی بجلیوں کو غارت گرِ صد آشیاں ہونا مبارک۔ میں تو سب کچھ دے کے لٹا گیا ہوں، میرا بستا ہی اُجڑنا ہو گیا۔ دوسرا شعر بھی انھیں تاثرات کے ماتحت ہے۔ بقول غالب:

مری تعمیر میں مضمر تھی اِک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

لیکن یہ اشعار زندگی کے متعلق آخری حکم نہیں ہیں، آخرکار مایوسی کی اس عارضی منزل سے گذر کر غالب نے بھی یہ کہتے ہوئے حوادثِ عالم سے ہم آہنگی کا اعلان کیا۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

خدا اور ناخدا ضرور ی نہیں کہ دو ہوں۔

(۳۵) نسیم بہار سے خزاں لوٹتی تا بہ کے چمن — آج خزاں کے بھیس میں آئی ہوئی بہار دیکھ

(۳۶) سنا ہے بادِ خزاں کے ہاتھوں چمن کا دونا نکھار ہوگا — اثر سے اس شعلۂ نہاں کے کچھ اور رنگِ بہار ہوگا

اِن دونوں اشعار میں بھی تخریب اور انقلاب، آگ اور تلوار کے خلاقانہ اثرات (Creative Revolution) کی طرف اشارہ ہے۔ جرمن فلسفی نطشہ کا قول ہے کہ تمام ترقی درد کے لطیف اور روحانی بن جانے سے ہوتی ہے۔ All progress is the Spiritualization of pain.

(۳۷) منازلِ ارتقا کے دھوکے زمانہ پہلے بھی کھا چکا ہے — کسی کو جس کی خبر نہیں ہے وہ انقلاب ایک بار ہوگا

(۳۸) نہ خونِ منصور ہے شفق میں نہ قتلِ سرمد کی داستاں ہے — اب اس سے اوروں کی صبح ہوگی جو نعرہ گیر و دار ہوگا

لوگ سہل پسندی کے دھوکے میں سمجھتے ہیں کہ اصلاح اور ارتقا کی سلامت روی تاریخ کے مقاصد اور تمام دیگر منازل طے کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن تاریخ نازک اور اہم موقعوں پر جست کرتی ہے۔ دنیا کی کایا پلٹ جاتی ہے اور انسان خون میں نہاتا ہے۔ ارتقا کی انھیں غیر معمولی منازل کو انقلاب کہتے ہیں جب پرانا نظم و نسق کا تہس نہس ہو کر نئے نظام کے ساتھ نئی دنیا بنتی ہے

کہاں یہ نظمِ زندگی کہاں یہ دورِ آسماں — کہ لاکھوں ایسی محفلیں وہ آنکھیں لے اڑیں کہیں

دوسرے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ مذہب اور شرع کے نام پر اب کشت و خون کا بازار گرم نہ ہوگا اب اس سے اوروں کی صبح ہوگی جو نعرۂ پیکرمعار ہوگا یعنی حکمران طبقہ اہل دولت اور سرمایہ دار کوئی باقی نہ رہیں گے

نہیں صدائے انا الحق یہ اب کوئی نعرہ انا البعاں کے ہیں نعرے پیام دار و رسن (فراق)

(۳۹) خیال کو لیا ترنہ سمجھو عمل کی چنگاریاں ہیں اسمیں کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے کل وہ نار ہوگا

دنیا کا وہ ادب جسے سُن سُن کر اور پڑھ پڑھ کر کروڑوں آدمی جھومتے رہے کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکا بلکہ وہ صرف رنگ نشاط اور کیف غم تک محدود رہا۔ لیکن تاریخ ادب میں صدیوں کے بعد کبھی کبھی وہ خیال موجزن ہوتا ہے جو بے اثر نہیں رہتا۔ اور جس میں عمل کی چنگاریاں چھپی ہوتی ہیں روسو کا سماجی راضی نامہ (Social Contract) اور مارکس کا سرمایہ (Das Capital) وہ کتابیں ہیں جن میں ایسی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ یہ خیالات پہلے ظلمت سرائے دل میں نور پیدا کرتے اور پھر آگ لگاتے ہیں جس سے پرانی دنیا بھسم ہو جاتی ہے اور اس کی خاکستر سے نئی دنیا کی تعمیر ہوتی ہے۔ اسی تخریبی اور تعمیری اثر کو مد نظر رکھتے ہوئے شاید گیٹے نے کہا تھا کہ "لفظ ایک عمل ہے" (A word is an Act)

(۴۰) سر بسر غرق نور ہو لیکن زندگی اکتساب نار بھی ہے

(۴۱) نار کی منزلوں میں نور بھی ہے زیر دوزخ فراز طور بھی ہے

استغراق اور مراقبے، گیان دھیان، سرور، جمالیات اور فنون لطیفہ کے کیف و اثر سے ممکن ہے آدمی کچھ دیر کے لئے اپنے کو غرق نور سمجھے، لیکن یہ فردوس خیالی بھرپور زندگی نہیں ہے کیونکہ جہنم داخل ہوئے جنت نہیں ملتی اور زندگی زندگی نہیں ہوتی۔ سنسکرت کا ایک مقولہ ہے کہ حقیقی زندگی انسانیت کا درد اور انسانی فلاح کے مسائل کے احساس سے حاصل ہوتی ہے۔ اس احساس کی آزمائشوں سے گذرنا اکتساب نار ہے۔ اس کے بعد یعنی اجتماعی زندگی سے ہم آہنگی کے مرتبہ سے اُتر کر مجازی عشق کا مرتبہ ہے۔ دوسرے درجہ پر حقیقی زندگی عاشق کی ہوتی ہے جہاں باوجود "غرق نور" ہونے کے اکتساب نار بھی ضروری ہے۔ نشاط کے نور اور غم کی آنچ کو ایک کرنا زندگی ہے۔

دل کو فراق آنچ دے سوز نشاط عشق کی حاصل شعلۂ الم خاک ہے کیسا نہیں

یعنی نشاط کی ٹھنڈک اور تراوت کو سوز نشاط سے بدل لو۔ اسی طرح دوسرے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ حقیقی نور التہاب کی جلن کی ایک منزل ہے۔ قعر جہنم کی تہوں میں وہ بلندیاں ہیں جہاں

شمع سر طور جگمگا رہی ہے۔ ان اشعار میں ٹھنڈک اور جلن، خوشی اور غم کی یکساں ماہیت کو جدلیت (Dialectics) کے اصولوں کے مطابق بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ احساس ضدین کا اتحاد ہی اصل زندگی ہے، لیکن زہد و اتقا و سجدہ اور نماز ریاضت اور تپسیا، فقر و فاقہ سے اس اکتساب نار کو کوئی واسطہ نہیں۔ یہ چیزیں ہمیں اکثر اصلی زندگی سے الگ کر دیتی ہیں نفس کشی کا ڈھونگ اہل حکومت اور اہل دولت کے وظیفہ خوار مذہبی پیشواؤں نے اس لئے رچایا ہے کہ عوام جسمانی تکلیف کو روحانی لذت سمجھیں اور مادی تنزلی کو روحانی ترقی سمجھیں اور اس طرح بغاوت اور انقلاب کا خیال ان کے اندر پیدا ہی نہ ہو۔

(۴۱) نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی　　زندگی اُچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

زندگی کی اور بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، ایک یہ بھی سہی،

(۴۲) بچھڑے ہوئے اب اور ہی ڈھونڈھیں دلیل راہ　　اتنی بلند گردِ رہِ کارواں نہیں

(۴۳) بچھڑے ہوؤں کو دھیان ہزاروں طرح کے ہیں　　دل محوِ نالۂ جرسِ کارواں نہیں

پہلے شعر میں گردِ رہِ کارواں کے بجائے کسی اور چیز کو رہنما بنانے کی ترغیب ہے کیونکہ ہر دور کو رہنمائی کے لئے نئی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے، نیا دور نیا روشنی چاہتا ہے، ہر دور کو ایک نئی خود اعتمادی کی ضرورت ہے۔ دوسرے شعر کے ساتھ حالی کا یہ شعر بھی ذہن میں رکھئے:۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا　　ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

حالی نے بڑی اہم بات کہہ دی ہے، بڑھنے والے بڑھ جاتے ہیں اور لوگ بگل کی آواز ہی میں محو رہ جاتے ہیں۔ مگر میرے شعر میں دوسری طرح کے بچھڑے ہوؤں کا ذکر ہے جو یکسوئی سے نغمۂ جرس سننے سے محروم ہیں۔ ان کی پریشان خیالی "ہزاروں طرح کے دھیان" انہیں سکتے کے عالم میں رکھتی ہے۔ میرے شعر میں ایک دوسری کیفیت کی طرف اشارہ ہے جس میں بعض افراد اور بعض گروہ محض مجہولیت کے شکار ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نہ "چلتے ہیں تھوڑی دُور ہر اک تیز رو کے ساتھ" کو اپنا رویہ بناتے اور نہ "محوِ نالۂ جرس کارواں ہی رہتے ہیں بلکہ سفر کا دوسرا نظریہ رکھتے ہیں، اور گو بظاہر بچھڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن غالباً نئی منزل کی طرف بڑھنے کے مسائل طے کر رہے ہیں۔ ان کی پریشاں خیالی غرقِ خیالِ منزل ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور وہ نئے سفر اور نئے کاروان کی تنظیم کی تیاری میں ہیں

(۴۴) ہر آوازِ جرس پر اِک صدائے بازگشت آئی　　بہت ہے اس قدر بھی خیر یادِ رفتگاں ہونا

وقت نکل جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔ کارواں کالے کوسوں نکل گیا لیکن یہ سوچ کر کچھ سوز و ساز

ور پیدا ہو جاتا ہے کہ جہاں سے چلے تھے وہ مقام اور وہ لوگ چھوٹ گئے۔ اور ایسے چھوٹے کہ
ہر آواز جرس پر ایک صدائے بازگشت آئی "پچھلی منزلوں کے اس سناٹے سے متاثر ہو کر صدائے
بازگشت ہی کو یہ سمجھ لیا کہ کارواں کے آواز دینے پر پچھلی منزلیں آواز دیتی ہیں اتنی بھی یاد رفتگاں
ت ہے۔ جان بوجھ کر یہ خود فریبی عجیب چیز ہے۔

(۱) نہ ذکر موج فنا کر کہ غم کے بیڑوں کو گداز سینۂ ساحل ڈبو چکا کب کا

کسی ٹریجیڈی کے لئے بیرونی اور خارجی سانحات ہی کافی نہیں اور نہ ڈوبنے کے لئے سمندر کی تہ
ں جانے کی ضرورت ہے۔ وجود پر گہری نظر ڈالنے والوں کو ذرہ ذرہ ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ دُکھ اور سکھ
ونوں کے تصور سے سوز و گداز کا عالم پیدا ہو جاتا ہے اور دلوں پر ایک لطیف غم چھا جاتا ہے۔
انچہ میرا ایک دوسرا شعر ہے:۔

یہی ہوا کہ ترے غم زدوں پہ کچھ نہ ہوا جو آئے لفظ و بیاں میں وہ واردات نہیں

مشہور لاطینی شاعر ورجل کے ایک مصرعے میں انسان کے متعلق ہر شے میں احساس سرشک The sense of tears in things huma کا ذکر آیا ہے۔ انگریزی شاعر ورڈسورتھ
تا ہے کہ ہر پھول ان خیالات کا حامل ہے جن کی گہرائیوں تک آنسوؤں کی بھی رسائی نہیں ہے
ڑلنگ نے بھی ٹریجیڈی کا یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ کشتیاں ساحل سے لگی ہوئی سلامت کھڑی ہیا
یلن سینۂ ساحل کا گداز انھیں کب کا ڈبو چکا ہے۔ ان کی ظاہری سلامتی پر مت جاؤ لیکن غم کا یہ
حساس مجہولیت آموز نہیں بلکہ حیات آور ہے اس تصور سے نئی زندگی ملتی ہے جس سے ہم آہنگ
کر ہیں وہ وسعت اور گہرائی ملتی ہے۔ اور ان محرکات کا احساس ہوتا ہے جو سطحی رجائیت اور
طحی واقعیت ہمیں کبھی نہیں دے سکتی۔ متفکرانہ غم قنوطیت نہیں بلکہ یہ شعور کی سنجیدگی ہے۔

(۳) مستی ہو یا خمار ہو کر مے پرستیاں بے سود رفعتیں ہیں نہ بیکار پستیاں

مستی رفعت اور خمار اُتار یعنی پستی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی زندگی کے لئے
روری ہے کہ پہلے ان کا وہ توازن ٹوٹ جائے جو جمود کی طرح ہے۔ "کرمے پرستیاں" تاکہ اس جمود
بنیادیں ہل جائیں، نئی بلندیوں اور نئی پستیوں کا احساس ہو۔ زندگی میں انقلاب آئے۔ پھر
ن چڑھاؤ اور اُتار کو سمیٹتی ہوئی زندگی آب رواں کی طرح ایک نئی سطح حاصل کرے گی۔

(۴) شاید یہی حیات کی منزل کا راز ہے تنہا چلو، جہان کو لیکن لئے چلو

نہ ترک دنیا سے حیات کی منزلیں طے ہوتی ہیں نہ بھیڑ یا دھسان چال سے۔ پیشوایان انقلاب

اپنے تصورات کی خلوتوں میں اُس نئی روش کا پتہ چلا لیتے ہیں، اور اس تنہا روی کا راز دریافت کر لیتے ہیں جب دنیا منزلِ مقصود کی طرف گام زن ہو جاتی ہے۔ سائبیریا کے سنسان خطہ میں نظر بند رہ کر لینن نے انقلاب کا پروگرام مرتب کیا تھا۔ مارکس نے جلا وطن ہو کر برٹش میوزیم میں تنہا اس نئے انقلاب کا فلسفہ مرتب کیا تھا جس کی آواز پر اس وقت دنیا گامزن نظر آتی ہے حقیقی رہبر سچے ہادی سے زیادہ کوئی شخص تنہا نہیں ہوتا ہے اور نہ کسی اور کے اتنے ساتھی ہوتے ہیں۔ قدیم تاریخ میں بھی اس کی مثالیں ملیں گی۔ بہرحال "تنہا چلو جہان کو لیکن لئے چلو"

(۴۸) اے ساکنانِ دہر یہ کیا اضطراب ہے آنا کہاں خراب جہانِ خراب ہے

(۴۹) کیسی فنا کہاں کی بقا یہ کوئی بتائے دنیا میں زندگی بھی کہیں دستیاب ہے

پہلے شعر میں "آنا کہاں خراب" کا ٹکڑا قابلِ توجہ ہے۔ زندگی کے حادثات اور سانحات اور آزمائشوں کا وجدانی تصور کیا جائے تو ایک تشفی آمیز غم کا احساس ہوگا، ایک درگذر کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ شدتِ احساس میں ایک خاص نرمی پیدا ہو جائے گی۔ اور زندگی میں قبولیت کی صلاحیت آ جائے گی پھر اس کے بعد خارجی معنوں میں بھی دنیا مبدل ہو جائیگی پہلے جہانِ خراب پر ایمان تو لائیے اس سے ہم آہنگ ہو جیئے، کچھ سنبھلیئے، پھر دنیا کی کایا پلٹ کیجئے۔ انقلاب کا گہوارہ قنوطیت نہیں بلکہ احساسِ رجائیت ہے۔ دوسرے شعر میں فنا اور بقا کی روایتی تقسیم سے قطع نظر کرکے اہلِ دنیا کو زندگی تلاش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

(۵۰) کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

موجودہ نظام نے دنیا والوں کی زندگی کو ایک قیدِ قفس بنا دیا ہے۔ لیکن اس قفس کی تیلیوں سے کچھ نور سا چھن رہا ہے۔ کچھ زندگی کے وسیع امکانات کا پتہ مل رہا ہے۔ اے اہلِ قفس "کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو" یعنی اس انقلاب کی باتیں کرو۔ جب زندگی آزاد فضا میں میسر ہو گی۔ شعر میں جذبات نگاری اور درسِ عمل دونوں موجود ہیں۔ عمل کی جڑیں بھی نفسیات ہی میں ہیں۔

التماس

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے حلقہ احباب میں زمانہ کی توسیع اشاعت کی کوشش فرمائیں؟ اگر آپ زمانہ کی ادبی خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اپنے علم دوست احباب سے اسکی خریداری کی سفارش کرنے میں کیوں پس و پیش کرتے ہیں۔

منیجر زمانہ

تضادِ فطرت

(نتیجۂ فکر حضرت فطرت واسطی)

رقص میں ہے لیلیٰ شب بال بکھرائے ہوئے
بین کی لے پر ہو جیسے ناگ بل کھائے ہوئے

مے زمیں سے آسماں تک بادشاہی رات کی
اک مکمّل سحر ہے، کافر نگاہی رات کی

اُف یہ تاریکی کہ نظارہ بھی ہے زیر و زبر
کھوئے کھوئے ہیں مناظر، بھولی بھٹکی ہے نظر

ساقیِ شب نے پلائی ہے عجب مے وقت کو
زیست دم سادھے ہوئے ہے چُپ لگی ہے وقت کو

رات کا یہ رنگ اور اُس پر ہوائے تیز تیز
اک عذابِ مستقل میں اک مسلسل رستخیز

کب سے سرگرداں ہوں میں بھی جستجوئے راہ میں
کوئی شنوائی نہیں ہے رات کی درگاہ میں

چلتے چلتے دفعتاً پیدا ہوا ہے انقلاب
ہو رہے ہیں سامنے جلووں پہ جلوے بے نقاب

مسکراتی ہے فضا کیچلی بدلتی ہے زمیں
میں بھی اب دنیا میں ہوں مجھکو یقیں ہوتا نہیں

میں کنارِ راپتی ساکت کھڑا ہوں رات میں
گا رہی ہیں کوئلیں کچھ دُور پر باغات میں

سامنے پیپل ہے، پیپل پر ہے جل پریوں کا تخت
جگنوؤں کا تاج پہنے مسکراتا ہے درخت

ٹہنیوں پر بج رہے ہیں شادیانے رات کے
مست ہو کر گا رہے ہیں دیوتا ظلمات کے

بڑھتی ہی جاتی ہے پیہم گرمیِ دورِ نشاط
پتّے پتّے، ٹہنی ٹہنی میں ہے جوشِ اختلاط

مطربانِ خوشنوا ہیں ساز بھی ہیں چنگ بھی
تالیاں بھی بج رہی ہیں، رقص بھی ہے رنگ بھی

ایسے طوفاں اور ایسی شب میں یہ جشنِ بہار
حیرتِ نظارہ ہے نیرنگِ زارِ شاخسار

یہ طلسمِ شب اگر ہے ہوش اُڑانے کے لئے
میں بھی اک عنوانِ حیرت ہوں زمانے کیلئے

میرا ظاہر شادماں ہے، میرا باطن دردمند
میں طربگاہوں کا شیدا، میری فطرت غم پسند

لب پہ ہے موجِ تبسّم، دل غموں سے چُور ہے
چشمِ نم آلودہ ہے، لیکن نظر مسرور ہے

عمر بھر میں نے چھپائی بے گناہی عشق کی
دفن ہے پھر بھی مرے دل میں تباہی عشق کی

روح میں ہے کفرِ غم لب پر ہے انجیلِ شباب[1]
میری ہستی کا بھی عنواں ہے تضاد و انقلاب

---

[1] انجیلِ شباب میرا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جو آجکل زیرِ ترتیب ہے۔

مسولینی کی چند باتیں

(از ایمل۔لڈوک ترجمہ از حضرت سہیل عظیم آبادی)

ایمل لڈوک دنیا کا سب سے بڑا سوانح نگار سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس نے سوانح نگاری کو فن کی حیثیت سے بڑھاکر سائنس کے درجے تک پہونچادیا ہے، جس کی بدولت انسان کی کمزوریوں اور خوبیوں دونوں کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ اس نامور مصنف نے ۱۹۳۲ء میں مسولینی سے گفتگو کے نام سے ایک کتاب لکھی جو تمام یورپ میں بیحد مشہور ہوچکی ہے۔ چھ سال بعد اس نے یہ مضمون رسالہ "لیونگ ایج" بابت فروری ۱۹۳۹ء میں لکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب مسولینی کی ان کے مداح اور سوانح نگار کی نظر میں کیا حیثیت ہے۔

گو یہ مضمون پُرانا ہوچکا ہے پھر بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے اتنا ہی قابل قدر ہے جتنا اشاعت کے وقت تھا۔ اس میں اس نے یہ لکھا ہے کہ چھ سال سے میں اس کتاب کے سلسلے میں اپنے جمہوریت پسند احباب کے طعنے سُن رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی کٹر فسطائیوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ وہ اس کتاب کے علاوہ میری کوئی اور کتاب نہیں پڑھیں گے۔ اس دورویہ دشمنی کی وجہ ہے کہ اس کتاب میں ایک ناتواں جمہوریت پسند اور ایک طاقتور ڈکٹیٹر کی گفتگو مفکرانہ انداز میں درج کی گئی ہے۔ مسولینی نے جان بوجھکر ایک سیاسی مخالف کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔ چنانچہ اس کی تحریک بھی اُسی کی طرف سے ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں ہم دونوں کی چند بار مختصراً گفتگو ہوئی تھی۔ اس کے بعد اُسی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان مکالموں کو باضابطہ کتابی شکل دیدی جائے۔ ان مکالموں میں مسولینی نے بہت سی سچی باتیں مجھ پر ظاہر کردیں جن کا ظاہر ہونا مناسب نہ تھا۔ اسی لئے کتاب کے شائع ہوتے ہی اطالوی پریس مجھ پر برابر حملے کر رہا ہے۔

ان مکالموں کے لئے میں نے ہفتوں تیاری کی۔ ایسی تیاری جیسے شطرنج کی اہم بازی کے لئے کی جاتی ہے۔ مسولینی صرف یہ جانتا تھا کہ میں اُس سے چار سو سوالات کروں گا۔ چنانچہ اس نے بہت سے سوالات کے بہت ہی شاندار جوابات دیئے اور میں نے بھی اس کی دلچسپی بڑھانے کے لئے اطالوی زبان میں گفتگو شروع کی۔ لیکن بعد میں اپنی مادری زبان جرمن میں سوال کرنے لگا۔ جب

اپریل ۱۹۳۲ء میں یہ کام ختم ہوگیا تو مسولینی نے پوچھا کہ کتاب کا مسودہ کب تک تیار ہو جائے گا
میں جانتا تھا کہ ڈکٹیٹروں کو ہر کام میں تیزی اور سرگرمی پسند ہوتی ہے، اس لئے میں نے اُس سے
اس کام کو دو ہفتہ میں ختم کر دینے کا وعدہ کر دیا۔

میں نے اپنی بات پوری کر دکھائی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ بہت زیادہ تصحیح کرے گا لیکن میرا
خیال غلط نکلا۔ اُس نے ۲۳۰ صفحوں میں صرف اٹھارہ لفظ بدلے اور تقریباً کوئی ردوبدل نہ کیا۔

اس کے بعد کتاب کا ترجمہ ہونے لگا تاکہ اس کا خاص پبلشر اسے شائع کر سکے، مگر ترجمہ
مسولینی کو پسند نہ آیا۔ اُس نے شکایتاً کہا کہ اصل جرمن میں اُس کا مفہوم زیادہ صاف تھا اس لیئے
دوسرا ترجمہ ہونا چاہیئے، چنانچہ دوسرا ترجمہ کیا گیا جس کو اُس نے منظور کر لیا، اور فوراً ہی اس کو
پریس میں بھیجدیا گیا۔

جب مسولینی نے پروف کے چند اوراق اپنے خاص مقربین کو دکھائے تو وہ حد درجہ بدحواس
ہوئے۔ کیونکہ مسولینی نے سچائی سے اپنے جذبات اور خیالات ظاہر کر دیئے تھے۔ بیان ہے کہ
اس کے ایک بہت ہی عزیز دوست نے اُس سے کہا

"میں تمہاری حفاظت کے لئے خوشی سے اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوں، لیکن تم دنیا سے کہہ رہے ہو
کہ تمہارا کوئی دوست ہی نہیں"

پاپائی حکومت نے اُس کے پاس پھر اُس پادری کو بھیجا جو اُس کے پاس یہ سمجھانے آیا کرتا تھا
اُسے وجود خداوندی اور مسئلہ قضا و قدر کے متعلق علانیہ اپنی رائے کا اظہار نہ کرنا چاہیئے۔

آخر مسولینی اس مسودہ کے سامنے جھک گیا، اُس نے اپنے پبلشر سے کہہ دیا کہ یہ کتاب اپنی اصلی
صورت میں شائع نہیں ہو سکتی، جس پر پبلشر نے جواب دیا کہ بیس ہزار جلدیں چھپ چکی ہیں اور ان کی جلدبندی
بھی ہو چکی ہے اور چونکہ یہ کام مسولینی کی مرضی کے مطابق ہوا ہے اس لئے اب اس کی اشاعت روکنا
بہت مشکل ہو گا بلکہ اس کوشش میں یہ خرابی ہو گی کہ بہت سی غلط سلط باتیں مشہور ہو جائیں گی۔
اس پر مسولینی نے بھی محسوس کیا کہ واقعی ایسا ہی ہو گا اس لئے اُس نے کتاب کی اشاعت کی اجازت
دے دی لیکن پبلشر سے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن موجودہ حالت میں نہ چھاپے۔ اس کے
ساتھ ہی اس نے حکم دیا کہ تمام اخبارات میں کتاب کے اجزا اس کی اشاعت سے پہلے ہی شائع کر دیئے
جائیں۔ چنانچہ یہ اجزا جون ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان تمام اطالوی اخبارات میں بڑی بڑی تمہیدوں
کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ خود میلان میں مسولینی کے اخبار "پوپولو ڈی اٹالیا" نے اس کتاب کو "وقت"

کی چیز اور عالمگیر دلچسپی کی چیز قرار دیتے ہوئے خدا کے متعلق اُن حصّوں کو دوبارہ شائع کیا جو پاپائی حکومت کو حد درجہ شاق گزرا۔

اِن تمام واقعات سے مجھکو ڈکٹیٹر کی طاقت کا پورا ثبوت مل گیا۔

دوسری اشاعت کی اصل جس پر خود مسولینی نے نظر ثانی کی تھی میرے پاس موجود ہے۔ اس میں بہت کم تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ صرف پانچ صفحوں کے قریب جن میں مندرجہ بالا مباحث کی طرف اشارہ تھا قلمزد کیے گئے ہیں۔ البتہ نسلی امتیاز اور یہودیوں کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں بدلا گیا تھا۔ لیکن مسولینی اُس وقت تک پوپ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دوسری اشاعت کے متعلق سارے اٹلی کا خیال تھا کہ کتاب کی دلچسپیاں ضائع ہو گئیں اور پہلی اشاعت کا مطالبہ بڑھتا جارہا تھا۔ آجکل پہلی ایڈیشن کی قیمت پانچسو لیرا فی جلد ہونا چاہیئے روم کے مطالبہ کے مطابق میں نے گیارہ غیر ملکی ترجموں سے بھی وہ حصے نکال دیئے جن کو مسولینی نے قلمزد کر دیا تھا۔ لیکن جرمن اشاعت میں ایسا نہیں ہو سکا۔ کیونکہ جرمن اڈیشن کی بھی پچیس ہزار جلدیں پہلے ہی تیار ہو چکی تھیں۔ اس وقت بھی وہ حصے تقریبًا پچاس ہزار اطالوی اور جرمن زبان کی جلدوں میں موجود ہیں۔

(۲)

پہلا ٹکڑا جو مسولینی نے قلمزد کیا وفاداری کے متعلق تھا۔ نپولین کے متعلق ایک لمبی گفتگو کے درمیان مسولینی نے کہا "دوسری عظیم الشان بات جو میں نے نپولین سے سیکھی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب میرے دماغ سے لوگوں کی وفاداری کا فریب پورے طور پر نکل گیا ہے۔ اس بارے میں میں اس سے بالکل متفق ہوں"۔ یہ ٹکڑا قلمزد کر دیا گیا۔

دوسرا حصہ جو اُس نے بدلا وہ ۱۹۲۲ء میں مسولینی کے روم پر دھاوا اور بادشاہ کی مدافعانہ جدوجہد کے متعلق تھا۔ یہ سوال بہت پرانا ہو چکا ہے کہ کیا واقعی شاہ اٹلی اپنے اختیارات سے صفائی کے طور پر دست بردار ہو گیا تھا؟ جب میں نے اس بارے میں مسولینی سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ بادشاہ نے ایک حکمنامہ کے ذریعہ روم کو پہلے ہی سے مارشل لا کے سپرد کر دیا تھا۔

دوسری اشاعت میں اس نے اس بیان کو یوں بدلا:-

"اُن لوگوں نے یہی فیصلہ کیا تھا۔ لیکن بادشاہ نے دستخط کرنے سے دوبارا انکار کیا تھا"

دوسری پانچ قلمزد باتیں خدا، مذہب، اور کلیسا سے متعلق تھیں۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ

جادو ٹونے میں کس طرح اس کا عقیدہ پختہ ہوتا گیا۔ مگر بعد میں یہ بھی قلمزد کر دیا گیا۔

کسی دوسرے مقام پر عیسائیت اور کلیسا کی ترقی پر اس نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا:

"سینٹ پیٹر بہرحال ایک قسم کا پروپیگنڈسٹ تھا، دوسری طرف سینٹ پال روم آیا، اور عیسائیت کا اصل بانی اور ناظم وہی تھا۔ یہ بہت ہی حیرت انگیز تھا۔ یہودیت سے ایک نمایاں انحراف اور تبدیلی تھی ۶۰۔۶۹ تک کل یہودیت یروشلم، اسکندریہ، سالونیکا وغیرہ میں مرکوز تھی۔ اس کے بعد اچانک علٰحدگی پیدا ہوئی۔ یہودی آپس میں بٹ گئے، اور نیا مذہب ارمن کا فروں تک پہونچا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اہم واقعہ کس طرح رونما ہوا۔ اس سے کچھ ہی پہلے یہودی مسیح کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے"

میں نے ایک بار اس مسئلہ پر سوال کیا۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ یہ واقعی حیرت انگیز ہے کہ کس طرح ایک کارنامہ پہلے روایت پھر بدعت کی شکل اختیار کر لیتا ہے

"اگر عیسائیت روم کی شہنشاہیت کے دامن میں پناہ نہ لیتی تو یہودیت کا ایک جزو ہوتی۔

یہ ٹکڑا بھی قلمزد کر دیا گیا۔

ایک دوسرے مسئلے پر باتیں کرتے ہوئے میں نے دریافت کیا تھا:

"فسطائی حکومت میں ایسی عورتوں کی کیا حیثیت ہے جن کی شادیاں نہیں ہوئیں مگر وہ بچوں کی مائیں ہیں؟"

اس کا جواب اس نے دیا:۔

یورپ کی حکومتوں میں ایسی ماؤں کی سب سے زیادہ نگرانی ہم لوگ کرتے ہیں، ہم لوگ اس کی زیادہ پروا نہیں کرتے کہ بچے کی ماں قانونی طور پر شادی شدہ تھی یا بچے کے باپ سے اس کے صرف تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ اس مسئلے میں ہم لوگ کلیسا کے ہم خیال نہیں۔ کلیساؤں کا اپنا فلسفہ، اپنی تعلیم اور اپنی دنیا ہے"

یہ ٹکڑا بھی کاٹ دیا گیا۔

میں نے اس کے ایک ناول کا تذکرہ کیا جو اس نے جوانی میں کلیسا کے خلاف لکھا تھا، اس نے اس بارے میں کہا تھا:۔

"اس وقت کے پادری واقعی برائیوں سے بھرے تھے" یہ جملہ بھی قلمزد کر دیا گیا۔

سب سے طویل اور اہم حصہ جو کتاب سے خارج کر دیا گیا، اور جو دراصل کتاب کا لب لباب تھا وہ مسئلہ قضا و قدر سے متعلق تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا:۔

"اپنے اوپر عقیدہ رکھنا البتہ کچھ معنی رکھتا ہے"

اُس نے جلدی سے کہا اور مُسکرایا، اس کے بعد وہ لیمپ کی روشنی میں جُھک کر بولا:۔

"میں تمھیں اپنے تجربات بتاتا ہوں۔ جوانی میں کسی چیز پر میرا عقیدہ نہ تھا۔ اپنی ماں کی زندگی کے لئے میں نے بے فائدہ خدا سے دعائیں مانگیں، اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مر گئی۔ اس کے علاوہ بہت دنوں تک مجھ پر مذہبی خیالات کا اثر رہا، یہ شاید اُن عیسائی مدرسوں کا اثر تھا جہاں میں نے کچھ دنوں تعلیم پائی تھی۔ لیکن میں کم سے کم دنیا کی طرح اس امکان سے انحراف کرتا ہوں کہ ــــ ہو سکتا ہے کہ ہزاروں سال کے ہیر پھیر میں کسی وقت کوئی ما فوق الفطرت مظاہرے ہوئے ہوں ــــ دوسرے لفظوں میں فطرت خود مقدس ہے، میں نے خود اسے نہیں دیکھا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہزاروں سال کے ہیر پھیر میں پھر ایسے مظاہرے رونما ہوں۔ لیکن وہ مسئلہ زمین کی کشش یا موت کی طرح سائینس سے متعلق ہے۔ اب البتہ میرا عقیدہ ہو گیا ہے کہ عالم میں کوئی عظیم اور مقدس طاقت موجود ہے"۔

"عیسائیت کی طاقت؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک مقدس اور برتر طاقت ہے" اُس نے جواب دیا، اس انداز میں یہ جواب تھا کہ میرا سوال یوں ہی سارہ گیا۔ "انسان خدا کی عبادت مختلف صورتوں میں کر سکتا ہے، اور ہر شخص کو اُس کے رُجحانات کے مطابق آزاد چھوڑ دینا چاہئیے"۔

اِس کے بعد میں نے سوال کیا:۔

"انسان خود کوئی کام کیوں کرے جب اُس کی قسمت اُسے پہلے ہی سے مقررشدہ راستوں پر لیجاتی ہے"

مگر مسولینی کے نزدیک یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اُس نے کہا:۔

"انسان کو چاہیئے کہ قضا و قدر کا مقابلہ کرے، اور یہ مقابلہ اپنی قوت ارادی اور عمل کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ جدوجہد درجہ دلچسپ ہوتی ہے۔ ارادہ کو چاہیئے کہ وہ ایسی بساط تیار کرے جس پر قسمت کا پانسہ سیدھا پڑے"۔

مَیں نے اس سے کہا کہ میں نے حال ہی میں کسی کی لائبریری میں ایک مقولہ دیکھا ہے جس کے معنی (قسمت کی حدود سے باہر ہیں۔ اُس نے دریافت کیا، کیا اس آدمی نے کبھی بھی قسمت سے مقابلہ کیا ہے۔ میں نے اُسے اس آدمی کا نام بتایا، "بوابازبالبو"

"یہ میرا مقولہ نہیں" مسولینی نے کہا "کوئی آدمی قسمت کو دوبارہ دعوت مقابلہ نہیں دے سکتا، ہر آدمی کی موت اس کے کردار کے مطابق ہوتی ہے"۔

یہ جملے جن میں سے اکثر اس کے اخبار میں کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی شائع ہو چکے تھے اور جن کو وہ بہت اہمیت دیتا تھا یا پاپائی حکومت کے اختلاف کے خیال سے کتاب سے نکال دیئے گئے اس کے بعد سے مسولینی کی آزادیِ خیال کو جھٹکے لگنے شروع ہوئے۔ چنانچہ جب ۱۹۳۶ء میں دریائے نیل کے متعلق اپنی کتاب لکھ رہا تھا تو دریائے نیل کے متعلق میری تقریریں تمام اطالوی اخباروں اور ریڈیو میں خوب شائع ہوئیں، اور ایتھوپیا کی حکومت پر میں نے جو اعتراضات کئے تھے اُن سے اِن اخباروں نے خوب فائدہ اُٹھایا گیا۔

اسی درمیان میں جنگ چھڑ گئی، چنانچہ یکایک حالات بدل گئے، نام نہاد محور کے اثرات نمودار ہوئے۔ مسولینی نے کچھ لوہے اور کوئلے کے لئے نظریں دوڑانی شروع کیں۔ اس نے اکثر کتابوں کو ضبط کرنا ضروری سمجھا کیونکہ وہ جرمنی میں ممنوع تھیں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ میری کتاب (دریائے نیل) کا داخلہ بھی اٹلی میں ممنوع قرار دیا گیا ہے، تو میں نے مسولینی کو ایک خط لکھکر دریافت کیا کہ کیا واقعی میری تصانیف اٹلی میں ممنوع قرار دی گئی ہیں! خصوصاً جبکہ اُن میں سے اکثر کے متعلق خود مسولینی سے گفتگو ہو چکی تھی۔

۱۴۔ جولائی کو اُس نے مجھے کہلا بھیجا کہ کتاب پر سے پابندی اُٹھا لی گئی۔ میرے پبلشر نے بھی اس کی تصدیق کی، اور اس کی چھپائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں طباعت کا کام حکومت کے دباؤ سے یکایک روک دیا گیا۔

اِن واقعات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈکٹیٹروں کو بھی کیسی کیسی مجبوریاں پیش آتی ہیں، اور انھیں بھی اکثر اپنی مرضی کے خلاف کام کرنا پڑتا ہے۔ پہلی اور دوسری بار پادریوں کا دباؤ پڑا، تیسری بار نازیوں کے دباؤ سے مسولینی کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔

اور آج تو مسولینی کو نسلی امتیاز کا اُصول بھی ماننا پڑ رہا ہے جس کا وہ دل سے مخالف ہے۔ اِس مسئلے پر مجھ سے گفتگو ہو چکی ہے۔ آج اُس کے جرمن حلیف اُسے یہودیوں کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ گفتگو میں اور اس کے بعد کئی مرتبہ وہ مارکس، لسالے، اور راتھینو کی عظمت کا اعتراف کر چکا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ پچھلی چوتھائی صدی میں یہ لوگ یورپ کے بہترین دماغ تھے۔ اُس نے اطالوی یہودیوں کی خدمات کا بھی اعتراف کیا ہے۔ اور ہماری آخری گفتگو میں جب میں نے پھر نسل کی بحث چھیڑی اور اُس سے لاطینی قوم کے متعلق سوال کیا تو اُس نے میری بات کاٹ کر کہا:۔

جیسا میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ نسلی طور پر کسی قوم میں کوئی خصوصیت نہیں، یہ دماغی وہم ہے اور

واقعی طور پر اس کا کوئی وجود نہیں۔"

"تو پھر کوئی شخص اپنے کو کسی قوم سے بھی منسلک کر سکتا ہے" میں نے پوچھا۔ اس لئے کہا کہ ضرور ایسا ہو سکتا ہے۔"

اس گفتگو سے مسولینی دنیا کا ایک مفکر ثابت ہوتا ہے، اور اُس کے دشمنوں کو بھی اس کا اعتراف ہے اس کے بعد مسولینی کو بارہا اپنی رائیں تبدیل کرنا پڑیں لیکن میں نے اس کی شخصیت کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ کسی طرح بھی نہیں بدلی ہے۔ میں اس پر آمادہ نہیں کہ کسی سیاست داں کا اندازہ اس سے لگاؤں کہ میرے اور میری قوم کے متعلق اس کا کیا خیال ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک موقعہ پر میں نے مسولینی کو ہٹلر سے برتر پایا۔ تاہم اس کے متعلق میرے سارے خیالات صحیح نہیں نکلے۔ جب ہم دونوں کی گفتگو جاری تھی تو اُس نے صرف اٹھارہ نقطے بدلے، لیکن میں صرف ایک نقطہ بدلنا چاہتا ہوں۔ اس وقت میں نے اسے اٹلی کا مطلق العنان کہا تھا، اور یہی میرا خیال تھا۔ یہ صنعت میں نے غلط لکھ دی تھی۔

اب میں خدا حافظ کہتا ہوں! جو گھنٹے میں نے مسولینی کی ملاقات میں گزارے۔ وہ میرے بہت سے سیاسی احباب کی صحبت سے زیادہ دلچسپ تھے۔ ایک پُرجوش مخالف کی گفتگو سے زیادہ دلچسپ کوئی دوسری چیز نہیں۔

پنڈت رامیشور پرشاد شوکل کی ہندی شاعری

ہندی شاعر پنڈت رامیشور پرشاد شوکل آنچل بی۔ اے کے دو مجموعے "مدھولیکا" اور "اپراجیتا" سادھنا مندر الہ آباد اور بھارتی پستک مالا دارا گنج الہ آباد سے شائع ہوئے ہیں۔ آپکی شاعری کا زیادہ تر رخ المیہ ہے۔ اور سارا کلام سنسکرت الفاظ کی کثرت اور تخئیل کے جذباتی جوانی سے مشکل و ثقیل ہوکر رمز نگاری کی حد تک پہونچگیا ہے۔ آپنے شمع۔ پروانہ۔ نور۔ تپش۔ بہار۔ خزاں۔ چمن۔ قفس وغیرہ اُردو الفاظ بھی جا بجا استعمال کئے ہیں پھر بھی آپکی زبان آسان نہیں بن سکی۔ البتہ بعض بعض نظمیں دلکش و مؤثر ہیں۔ مدھولیکا میں میرے بھولے ساقی کے نام سے ایک پسندیدہ نظم ہے۔ مجموعی حیثیت سے آپ کے کلام میں حسرت و یاس درد و غم اور بیکسی و بیچارگی کے ساتھ ساتھ بیخودی اور وصال حقیقی کی تشنگی مختلف صورتوں میں نمایاں ہے۔

اس مجموعہ کا دیباچہ ہندی کے قابل و نامور ادیب پنڈت نند دُلارے باجپئی نے لکھا ہے۔ آنچل صاحب نے اپنی ایک نظم میں خدا کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے جس پر باجپئی جی لکھتے ہیں:۔

"صد کیلئے ایشور کے بیزار ازاں اور کوئی چیز نہیں ہے خصوصاً ہندوستان میں جہاں کوئی منظم چرچ نہیں ہے، مگر اس سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کس طرح مغرب کی اندھا دھند تقلید ہو رہی ہے۔ شاعروں کے ذمہ قومی تعمیر کا ذمہ دارانہ کام ہے اس سلطان کا اس اہم فرض سے بچنے کی کوشش کرنا دُور اندیشی نہیں ہے۔"

یہ دیباچہ اُردو شعراء کے توجہ کا بھی محتاج و مستحق ہے۔ ہمکو امید ہے کہ آنچل صاحب جو ابھی نو عمر ہیں آئندہ اپنے شاعرانہ جذبات کیلئے اس سے زیادہ صاف اور سلیس زبان استعمال کرینگے کیونکہ اگر کسی کلام کی زبان و بندش عام فہم نہو تو شاعر کی دماغی کوشش رائگاں جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

(س۔ ہ)

تتلی

(نتیجۂ فکر جناب رہبر بی اے)

ایک ننھی سی جان ہے تیری
دل میں رکھ لوں، ہے آرزو میری

ہلکا پھلکا نظامِ ہستی ہے
دو پروں میں بھی روح بستی ہے

تجھ سے افزوں ہے رونقِ گلشن
بڑھ گیا ہے بہار کا جوبن

جب بھی دیکھو ادھر اُدھر پھرتی
پھڑپھڑاتی ہوئی سی، خوش دل سی

پھول تیرے لئے ہی کھلتے ہیں
تجھ سے کیا مسکرا کے ملتے ہیں

تیری ہستی عجیب ہستی ہے
کون دنیا میں تیری بستی ہے؟

بھول کر آ گئی کہیں سے تُو
غیر مانوس ہے زمیں سے تُو

کیا ستارہ پری کے دامن کا
کھیل میں ٹوٹ کر زمیں پہ گرا؟

اک کرن نے تجھے پڑا دیکھا
شوقِ جلوہ گری نے اُکسایا

آ کے تجھ میں سما گئی وہ کرن
اور رنگیں بنا گئی وہ کرن

یا ہے ناہید کا کوئی نغمہ؟
اُس کے بربط پہ جو ادا نہ ہوا

راگ بننا جسے نہیں بھایا
رقص کرتا یہاں چلا آیا

ہاں، ستاروں کی ہے تو رقاصہ
شوق رکھتی ہے لالہ زاروں کا

کہکشاں میں مقام ہے تیرا
اُڑتے رہنا ہی کام ہے تیرا

روشنی پی کے زندہ رہتی ہے
راز کوئی گلوں سے کہتی ہے

بس انھیں گدگدانے آتی ہے
پھول جاتے ہیں تو بھی جاتی ہے

جب تو رنگیں پروں سے ہلتی ہے
میرے دل کی کلی بھی کھلتی ہے

قاشِ قوسِ قزح کی ہے گویا
جس کا شبنم نے آ کے منہ دھویا

خندۂ گل سے زندگی پائی
تیری ترکیبِ جلوہ آرائی

رقص کرتی ہے رقص کرتی رہ!
اس جہاں کو خوشی سے بھرتی رہ!

پھول محل

(شیخ تصدق حسین لکھنوی بی۔ اے ایل ایل۔ بی)

بینی رام سپاری فروش کی لڑکی تھی جو قوم کا بقال اور دوہرے ڈیل کا گورا چٹا خوشرو آدمی تھا۔ گول دروازہ سے متصل محلہ چکلہ میں رہتا تھا اور داد و ستد کا پیشہ بھی کرتا تھا۔

جب کہاروں کا جمعدار بھوانی مہرا (راجہ مہرا) اس جہان سے رخصت ہوا تو اس کے چھ سات لاکھ روپے لے کر وکادش بینی رام کے ہاتھ لگے۔ اس روپیہ کی بدولت اس نے عاملوں سے پوتہداری کے ذریعہ زر کثیر پیدا کیا۔ اسی زمانہ میں وہ عاشورن نام ایک شاہد بازاری کے دام الفت میں گرفتار ہوگیا کچھ دنوں تو رسمی تعلقات رہے پھر اسکو گھر بٹھا کر پابند کر لیا۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا احمد علی اور ایک لڑکی پیدا ہوئی جو حسن و جمال میں آفتِ روزگار تھی۔ بقول شاعر:-

حسنِ ملیح گورا بدن آمدِ شباب　　متوالی آنکھیں جیسے کہ پُر ساغرِ شراب

جب بینی رام نے سفر آخرت اختیار کیا تو ایک بیٹا رام دیال نامی اپنی ہمقوم بیوی سے بھی چھوڑا جو مہاجنی کی کوٹھی اور تمام مال و اسباب کا مالک ہوا۔ رام دیال نہایت بلند حوصلہ و جاہ پسند آدمی تھا مگر امی محض ہونے کی وجہ سے پر پرواز نہ تھے۔ باوجود اس خامی کے اس نے بہ سلسلہ جواہر فروشی نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے دربار تک رسائی پیدا کی۔ اس وقت اس جواں بخت وجواں سال تاجدار کی حسن پرستی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ رام دیال نے اپنی سوتیلی بہن دختر عاشورن کو بادشاہ کی خدمت میں تحفۃً پیش کر دیا۔ جنھوں نے اس گل اندام کو داخل حرم کر کے پھول محل کا خطاب دیا اور رام دیال کو بھی راجہ کا خطاب عنایت کیا۔ راجگی کا طرۂ امتیاز حاصل ہونے پر رام دیال کا غنچۂ دل شگفتہ ہوگیا اور عہدۂ وزارت کی دھن بھی دل میں سمائی۔ چنانچہ میر فضل علی اعتماد الدولہ وزیر اعظم کے مستعفی ہونے پر راجہ رام دیال کا دامن گلہائے مراد سے بھر گیا، اور بادشاہ نے امور سلطنت کی انجام دہی اقبال الدولہ پسر ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں مرزا جعفر ابن مرزا حاجی اور راجہ رام دیال کے سپرد کر دی۔ اس منصب عالی پر فائز ہونیکے بعد بقول سید کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ[1] راجہ رام دیال کا بھی دربار وزیر اعظم ہونے لگا اور شہر کے جتنے مفتری، جعل ساز، ہر بار مثل

[1] ملاحظہ ہو تواریخ اودھ مرتبہ مولانا نجم الغنی رامپوری۔

اور چاشت خور تھے سب جمع ہوئے۔

منشی عبد الاحد مصنف وقائع دلپذیر کے نزدیک چونکہ تینوں وزراء ناکردہ کار اور کم عمر تھے اس لئے اپنے عہدۂ جلیلہ کے فرائض بحسن و خوبی انجام نہ دے سکے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد عیش و عشرت میں پڑکر گلچھرے اُڑانے لگے اور بادہ گلگوں سے بھی مدہوش رہنے لگے جس پر تخمیناً دس ماہ کے بعد شاہ اودھ نے راجہ رام دیال اور دیگر وزراء کو برخاست کردیا اور نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو فرخ آباد سے بلاکر بتاریخ ۴۔ نومبر ۱۸۳۰ء قلمدان وزارت اُنکے سپرد کردیا۔

مولانا نجم الغنی مؤلف تاریخ اودھ نے ان واقعات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اعتماد الدولہ کا زوال راجہ رام دیال کے عروج کا باعث ہوا، اور تمام سلطنت میں اس کا حکم جاری ہونے لگا۔ مگر راجہ بالکل اَن پڑھ کندۂ ناتراش تھا۔ جب سرہربرٹ میڈک (Sir Herbert Maddock) ریزیڈنٹ ہوکر آئے تو اُنھوں نے ایک روز رام دیال کی مزاج پرسی کی۔ جس کے جواب میں اُس نے بجائے "نفخ" کے کہا میرے پیٹ میں "نفس" بہت رہتا ہے۔ یہ سُنکر ریزیڈنٹ سمجھ گئے کہ یہ شخص علم و فضل سے بالکل بیگانہ ہے اور کسی مقتدر اور ذمہ واری کے عہدہ کی قابلیت اور اہلیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اُنھوں نے یہ بات بادشاہ کے گوش گزار کرکے اُن پر اپنا منشار بھی ظاہر کردیا کہ رام دیال جیسے شخص کا مدار المہام ہونا سلطنت کے لئے باعث بدنامی ہے۔ اس کے بعد راجہ رامدیال کی آمدورفت ریزیڈنسی میں موقوف ہوگئی اور پرچہ پیام چوبدار کی معرفت جانے لگا۔ اگر کوئی مشکل کام پیش آتا تو نجم الدولہ کے ذریعہ سے انجام پاتا۔ رام دیال سے ریزیڈنٹ کی ناراضگی کا خاص سبب یہ تھا کہ ایک روز اُنھوں نے رام دیال سے دریافت کیا کہ کیوان جاہ کس کے نطفہ سے ہیں اور ساتھ ہی اس کے راجہ کو ہدایت بھی کردی کہ یہ بات اپنے تک رکھنا۔ مگر راجہ پیٹ کا ہلکا تھا بات ہضم نہ کرسکا اور اپنی سرخروئی جتانے اور اترجانے کو یہ واقعہ حرف بحرف بادشاہ سے بیان کردیا جس پر ایک روز انھوں نے بر سبیل تذکرہ ریزیڈنٹ سے دریافت کیا کہ آپ کیوان جاہ سے کیوں ناخوش ہیں۔ یہ سُنکر ریزیڈنٹ دم بخود رہ گئے اور دل میں سمجھ لیا کہ یہ حرکت رام دیال کی ہے اُسی روز سے راجہ ریزیڈنٹ کی نظروں سے گر گئے۔ مابعد بادشاہ نے بھی اُن کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں، بعدہٗ اُن کے حکم سے ٹیڑھی کوٹھی میں گرفتار ہوکر اپنے ہی مکان سکونہ میں نظربند کردیئے گئے۔ اس طور پر چار دن کی چاندنی ختم ہوگئی اور اُن کے حواشی بھی اپنی اصلی حالت پر آ گئے

منشی رام سہائے تمنّا مؤلف احسن التواریخ نے بادشاہ کی بے رخی اور راجہ کی اسیری کے حسب ذیل

اسباب بتلائے ہیں، اُن کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"میڈاک صاحب نے بمعائنہ تحریرات سابقہ اخراج رام دیال و معزولیِ شرکار نیابت پر کمر ہمت چُست کی، اتفاقات وقت سے کچھ جبل و رشوت ستانی ان لوگوں کی ثابت ہوئی۔ ریزیڈنٹ نے بادشاہ سے عرض کی اگر اخراج رام دیال میں حضور کو تامل ہے تو وہ ریزیڈنسی میں محبوس کیا جائیگا ناچار بادشاہ نے قید کیا۔ اور اکبر علی خاں فرزند امیرالدولہ حیدر بیگ خاں کو بارہ دن تک کام نیابت پر مقرر کیا۔ بعد اس کے منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں بہادر وزیر ہوئے۔"

راجہ رام دیال کی اسیری کے بعد بھی بھُول محل تو بادشاہ کے گلے کا ہار بنی رہیں مگر راجہ مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح جہاں پناہ کے دل سے بالکل اُتر گئے اور اُن کا چمن آرزو ہمیشہ کے لئے اُجڑ کر رہ گیا۔

راجہ رام دیال کا عالی شان مکان چوپڑی والی گلی متصل گول دروازہ میں بوسیدہ حالت میں ابتک موجود ہے اور مکان سے متصل ایک محلہ بھی موسومہ فرش راجہ رام دیال اب تک اُن کے نام سے موسوم ہے۔ اُن کے باپ بینی رام کا بھی ایک وسیع باغ محلہ نوازگنج کے قریب ابتک موجود ہے جو کسی کے ہاتھ بک چکا ہے اور اب اس میں کاشتکاری ہوتی ہے مگر داخلہ کا عالی شان پھاٹک اُس کی اگلی عظمت کا پتہ دیتا ہے۔ باغ ابتک سپاری والے کا باغ یا سپاری باغ کے نام سے مشہور ہے۔

جذباتِ بسمل

(از حضرت بسمل الہ آبادی)

انھیں کیوں داغہائے دل سمجھئے ستاروں کی بھری محفل سمجھئے
وقارِ داغ و قدرِ دل سمجھئے اُسے لیلےٰ اِسے محمل سمجھئے
کھلے گا بعد اس کے مطلبِ غم ذرا پہلے زبانِ دل سمجھئے
جہاں چل پھر کے رُک جاتی ہیں موجیں اُسی کو دامنِ ساحل سمجھئے
سرِ منزل بھی کوئی دم نہ ٹھہرا مجھے گردِ رہِ منزل سمجھئے
ادھر آندھی اُدھر بجلی کا کھٹکا چمن والوں کی یہ مشکل سمجھئے
جوابِ تیغِ قاتل ہر غزل ہے کلامِ حضرتِ بسمل سمجھئے

بابو مہابیر پرشاد سری واستو انجم مرحوم

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔اے، ایل ایل۔بی)

بابو مہابیر پرشاد سری واستوا انجم اگست ۱۸۹۳ء بمقام خیرآباد ضلع سیتاپور ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے بی۔اے اور ایل ایل۔بی پاس کیا۔ اُردو فارسی میں خاصی لیاقت تھی لڑکپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ یوں بھی خیرآباد کی سرزمین شعروشاعری کی جنم بھومی رہی ہے۔ مضطر خیرآبادی اور ریاض خیرآبادی کو کون نہیں جانتا۔ انجم نے انھیں بزرگوں سے فیض پایا تھا اور انھیں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اس طرح شعروشاعری کی فضا میں آپ کا شباب گذرا تھا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ آپ نے کس سے اصلاح لی، لیکن بیخود۔ ریاض اور امیر کا ذکر آپ کی زبان پر اکثر رہتا تھا۔

آپ نہایت متین، کم سخن، سنجیدہ مزاج اور خوش گفتار تھے۔ آپ کی ہنسی تبسم اور مسکراہٹ کی حد تک رہتی تھی کبھی قہقہے کی نوبت نہ آتی تھی، آپ کو اپنے صلح کل مشرب پر فخر تھا، ایک فارسی غزل میں اسی طرف اشارہ ہے

بحمد اللہ ز بندِ سبحہ و زنّار آزادم
بتارِ گیسوئے پُرپیچ جاناں کارہا بستم

مذہب کے معاملے میں وہ ہمیشہ بے لوث رہے "بہ سیرت مسلماں بہ صورت ہندو[۱]" والی کہاوت ان پر صادق آتی ہے، مذہبی کٹرپن کی ادائیں انھیں پسند نہ تھیں۔ تھیاسوفی کی اکثر کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ دنیا میں ایک مذہب اور ایک ہی معاشرت ہو۔ اس مسئلہ پر کئی بار ان سے گفتگو رہی، ان کے خیالات بہت وسیع تھے، فلسفہ پسند اور تصوف کے قائل تھے۔ تصوف کے اکثر اشعار ان کے ورد زبان رہتے تھے۔ قاضی ابرار حسین صاحب ڈپٹی جسٹرار چیف کورٹ لکھنؤ جو آب رٹیائر ہو چکے ہیں مشائخین میں شمار ہوتے ہیں اور صاحب حال و قال بزرگ ہیں اُن سے اکثر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ انجم مرحوم کبھی کبھی کوئی ایسا شعر پڑھ دیتے تھے کہ قاضی صاحب کو وجد آجاتا اور بار بار دہرانے

[۱] اصلی ہندو مذہب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کسی ملت سے تعصب نہ ہو چنانچہ یہی بے تعصبی اس کا جوہر ہے۔

گنتے تھے۔ اس قسم کی صحبتوں کا ایک شعر راقم کو یاد ہے :۔

تو نے ازل میں دل پہ یہ کیسی نگاہ کی
اب تک ہے زلزلے میں زمیں جلوہ گاہ کی (انجم)

انجم مرحوم چاہتے تو وکالت کرتے اور خوب کرتے، مگر ان کا دردمند دل اور رجحانِ طبیعت وکالت کی مصروفیتوں کی اہل نہ تھی۔ ان کی مرنجاں مرنج طبیعت کو نہ وجاہت ذاتی کا خیال تھا اور نہ قانونی موشگافیوں سے انھیں کوئی دلچسپی تھی۔ اس لئے آپ نے اس پیشہ کی طرف رغبت نہ کی راقم نے اُن کی زبان سے اُن کا یہ شعر اکثر سُنا ہے جس کو وہ لُطف لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ اس شعر سے ظاہر ہے کہ ان کی طبیعت کا میلان کس طرف تھا اور کس طرف نہ تھا ؎

کوہ و صحرا میں بھٹکنے کا چلن یاد نہیں
تیرا دیوانہ ہوں، مجنوں نہیں، فرہاد نہیں

اگست ۱۹۲۱ء میں وہ بہ سلسلۂ ملازمت عدالت العالیہ چیف کورٹ اودھ میں ترجمان کی حیثیت سے بمشاہرہ یکصد روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔ صرف اٹھارہ سال ملازمت کی اور اگست ۱۹۳۹ء میں اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔ شاعروں کی زندگی میں چند باتیں شاعرانہ ہوا کرتی ہیں۔ دیکھئے انجم کی پیدائش اگست (۱۸۹۳ء) میں ہوئی، ملازمت اگست (۱۹۲۱ء) میں اور وفات بھی اگست (۱۹۳۹ء) میں ہوئی۔ گویا آپ کی زندگی کا اہم مہینہ اگست تھا، اور یہ تقویمی مطابقت زندگی کے شعر کے لئے سنگِ میل تھی۔

ملازمت کے ساتھ ہی ساتھ ان کی بعض خاص مصروفیتیں بھی تھیں، مثلاً وہ ایک تجربہ کار ہومیوپیتھ ڈاکٹر بھی تھے اور تھوڑی بہت پریکٹس بھی کرتے تھے۔ درحقیقت ہومیوپیتھی ان کے گھرانے کی جاگیر رہی ہے۔ انجم مرحوم کے چھوٹے بھائی اب بھی سیتاپور میں ہومیوپیتھی کی پریکٹس کرتے ہیں۔ آپ کی ہمشیرہ لکھنؤ کے مشہور ہومیوپیتھ ڈاکٹر پیارے لال کو بیاہی ہیں۔ اس طرح انجم مرحوم صبح و شام جب دفتر کے کام سے چُھٹی پاتے تو خلقِ خدا کی طبی خدمات انجام دیتے۔ دفتر والوں کے تو وہ گویا فیملی ڈاکٹر تھے۔

آپ نے پانچ لڑکے اور غالباً دو بیٹیاں یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ کی زوجہ محترمہ رائے بہادر بابو بھاگوت پرشاد صاحب ڈسٹرکٹ سشن جج اوناؤ کی ہمشیرہ ہیں۔ بچے ابھی سب کم عمر اور زیرِ تعلیم ہیں خدا اُن کے پس ماندہ بزرگوں کا سایہ ان پر قائم رکھے۔ ضلع سیتاپور میں آپ کے والد متوسط زمیندار تھے

ملازمت کے بعد انجم نے بہت کم کہا، جو کچھ کہا وہ بھی جمع نہ کیا نہ کسی رسالے میں چھپوایا مشاعروں سے انھیں اُلجھن سی ہوتی تھی، اس لئے مشاعرہ سے جی چراتے تھے۔ ان کا کلام ان کے عزیزوں سے تو دستیاب نہ ہو سکا لیکن حسن اتفاق سے ایک دن محترمی شیخ بدرالزماں صاحب وکیل (لکھنؤ) سے انجم کا ذکر آیا۔ شیخ صاحب موصوف کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ چنانچہ ان کے پاس لکھنؤ کیننگ کالج میگزین کا ۱۹۱۹ء کا ایک پرچہ مل گیا جس میں انجم کی ایک فارسی غزل اور دو اُردو غزلیں تھیں جو بجنسہٖ ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہیں:-

قیامت را بہ بالائے بتانِ فتنہ زا بستم ... خرامِ ناز را ہنگامۂ روزِ جزا بستم
بخونِ خویشتن آلودہ کردم دستِ رنگینش ... تعالیٰ شانہٗ بر پنجۂ مرجاں حنا بستم
حقیقت بود یک آئینہ من از خام کاریہا ... بہ رُویش صد ہزاراں پردہائے ما سوا بستم
چناں تنگ آمدم از دل کہ چوں از بر بدر کردم ... ندانستم کہ در بر غیر یا بر آشنا بستم
بحمد اللہ ز بند سبحہ و زنار آزادم ... بتارِ گیسوئے پُر پیچ جاناں کار ہا بستم
مجو از من نشانِ آرزو عمریست کز حرماں ... تمنا را بدل بشکستم و دستِ دعا بستم
اجابت دستِ من بوسید و او از راہ صلح آمد ... چو حرزِ جب رقم نہ بود بر دستِ دعا بستم

میسر شد مرا گیسوئے جذباتِ دلِ انجم
چو مہر بے وفا ورزیدم و عہدِ وفا بستم

حنا ہو بھی جو اُن کے دست و پا تک سُرخرو ہو کر ... تو کیا کیا خون رُلوایا مجھے دل نے لہو ہو کر
برنگِ غنچۂ گل کیا خبر تھی دل گرفتوں کو ... کہ سب دل کا لہو اڑ جائیگا یوں رنگ و بو ہو کر
بگڑ بیٹھیں وہ غیروں سے اگر یہ راز کھل جائے ... کہ رہتے ہیں ہمیں ہر دل میں اُن کی آرزو ہو کر
لہو سے جامۂ صد چاک چپکا ہے مرے تن پر ... بنا ہوں غنچۂ گل آشنائے رنگ و بو ہو کر
یہ سچ ہے خوبیاں سب کس کو ملتی ہیں زمانے میں ... جفا سیکھی بتان بے وفا نے خوبرو ہو کر
دلِ بیباک سے جانِ حزیں نے یہ شکایت کی ... قیامت ہے کہ رہنا ایک گھر میں اور عدو ہو کر
بھلا ہم اور چھوٹے میکدہ، توبہ کر اے واعظ ... رہیگی خاک بھی اپنی یہیں جام و سبو ہو کر

یہ کیا منہ پھیر کر بھرتے ہو ٹھنڈی سانس اے انجم
تمہیں جو کچھ ہو کہنا کہہ لو اُن سے دو بدو ہو کر

ناگہاں کو خوشی سے جو گوارا کرتے ... انتہائے غم ہستی کا تماشا کرتے

ہم کو توفیقِ محبت بھی اُسی نے بخشی　　ورنہ ممکن تھا کہ ہم اسکی تمنا کرتے
ہم کو شکوہ ہے فقط عالمِ محویت کا　　انھیں پہلو میں بٹھا کر تو نہ ڈھونڈھا کرتے
تمھیں انجم تھا اگر شوقِ سخن سنجی کا　　دلِ پُر جوش میں کچھ درد بھی پیدا کرتے

انجم مرحوم کا ایک مختصر سا تذکرہ خواجہ عبدالرؤف عشرت مرحوم کی تصنیف اُردو زبان کے ہندو شعرا میں بھی ہے اسمیں بھی آپکے چند اشعار لکھے ہیں اُنھیں میں سے ایک غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

قیام عمرِ رواں کا مسافرانہ ہے　　جہاں میں رہتے ہیں جبتک کہ آب دانہ ہے
عبث غرور ہے توفیقِ خیر پر زاہد　　یہ اس کی بخشش و رحمت کا اک بہانہ ہے
مجھے ریاضت و طاعت پہ اعتماد نہیں　　سرِ نیاز ہے اور تیرا آستانہ ہے
فنا ہی کا ہے بقا نام دوسرا انجم　　نفس کی آمد و شُد موت کا ترانہ ہے

اس کے علاوہ ایک مرتبہ راقم کو انھوں نے اپنے چند اشعار سُنائے تھے جس میں صرف دو شعر یاد رہ گئے یہ مقطع اُن کے ایک دوست کی زبانی دستیاب ہوا۔ اشعار یہ ہیں:۔

نثار ہو گئے سب جی کے وارنے والے　　سنوارتے رہے گیسو سنوارنے والے
صنم کدے میں، کلیسا میں گھر میں کعبے میں　　پکارتے ہیں تجھی کو پکارنے والے
بنی ہے دم پہ مریضانِ عشق کے انجم　　گذار دیں گے یہ دم بھی گذارنے والے

ایک شعر اور یاد ہے:۔

تنگ دامانِ لحد میں یہ سمجھکر خوش ہوں　　آنکھ کے سامنے چرخِ ستم ایجاد نہیں

راقم نے مرحوم کی زندگی میں جب ان کا کلام مانگا تو انھوں نے ایک انتخاب تیار کر لیا لیکن مجھے نہ دے سکے جب تقاضا کیا تو یہی کہا کہ میز کے خانے میں رکھ کے بھول گیا ہوں۔ کسے معلوم تھا کہ وہ اتنی جلد وہ ہم سے جدا ہو جائینگے چنانچہ وہ انتخاب بھی نہ مل سکا یہ بکھرے ہوئے جواہر ریزے جو مل سکے وہی اس وقت کام آئے۔

انجم مرحوم کی نا وقت وفات چند روز کے بخار سے ہوئی چیف کورٹ اسٹاف میں ان کے شریک کار ان کو قدر و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اپنے ہم چشموں میں ہمیشہ اپنی متانت و سنجیدگی کے لئے مشہور رہے ان کی اچانک موت کو سُنکر سب ہکا بکا رہ گئے۔ انکے ایک شریک کار جو پٹھان ہیں سیرے ڈپارٹمنٹ میں رو رہے تھے۔

وفات پر اہل دفتر نے ایک تعزیتی جلسہ بھی خان بہادر شیخ محمد باقر صاحب رجسٹرار جیف کورٹ کی صدارت میں منعقد کیا، اور چیف کورٹ الیسوسی ایشن کی طرف سے بھی ایک تعزیتی جلسہ سید شہاب الدین صاحب صدر الیسوسی ایشن وسپرنٹنڈنٹ دفتر ترجمہ ہوا تھا۔ بہرحال

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن　　زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

*

تنقید کتب

شعرائے عثمانیہ یعنی مرقع سخن جلد چہارم

یہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل نوجوان شاعروں کے پسندیدہ اور منتخب کلام کا مجموعہ ہے جس میں قاضی غلام احمد اشرف آرام، محمد جلال الدین آشک، سید محمد اکبر، محمد امیر آمیر، محمد عبد القیوم خاں باقی، ڈاکٹر بدر الدین بدر، ابو الفتح نصر اللہ برقی، محمد شعیب حزیں، عبد السلام ذکی، حبیب اللہ رشدی سید علی حسنین زیبا، صمد رضوی صاحب ساز، مہندر راج سکسینہ، محمد نصر اللہ سروش، ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ، بدر الدین خاں شکیب سید نبی الحسن شمیم، شنکر موہن لال، عزیز احمد عزیز، مخدوم محی الدین زور، میر حسن الدین، صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش، سکندر علی وجد، لطیف النسا بیگم، نوشابہ خاتون کی پانچ پانچ نظمیں اور پانچ پانچ چیدہ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔

جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے، ہمیں صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کی یہ غزل بہت پسند ہے،

شراب ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا — پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
جھلک رہا تھا تبسم بھی ساغرے میں — پھر ایک بار اسی طرح مسکرا کے پلا
شراب نغمہ بھی بہتی رہے فضاؤں میں — کلام حافظ و خیام گنگنا کے پلا
کچھ امتیاز رہے میکدہ میں میکش کا — لبوں سے اپنے ہر اک جام کو لگا کے پلا

لطیف النسا بیگم کی یہ رباعی بھی خوب ہے :-

دنیا کی محبت میں اسیری دیکھی — اسباب امارت میں فقیری دیکھی
سیکھی ہے مرے دل نے قناعت جب سے — بے مائگی میں شان امیری دیکھی

گل نغمہ

یہ مولوی عظیم الدین احمد صاحب کے دلپذیر کلام کا دلچسپ مجموعہ ہے جس میں نظمیں اور

لہ لکھائی چھپائی۔ کاغذ۔ جلد عمدہ ہے۔ بڑی تقطیع کے ۲۳۱ صفحے ضخامت۔ قیمت پونے تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- ادارۂ ادبیات اردو، بر فعت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

غزلیں دونوں شامل ہیں۔ شروع میں مسٹر کلیم الدین احمد نے ایک مقدمہ لکھا ہے، جسے شعر و شاعری اور تنقید، تقریظ کی کسوٹی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس مجموعہ کو بھی اسی معیار کو پیش نظر رکھکر دیکھا جائے۔

مسٹر کلیم الدین احمد کے نزدیک "غزل نیم وحشی صنفِ شاعری ہے" جس میں ہوتا کیا ہے بقول مسٹر کلیم - معشوق کا حسن جس سے مہ و خورشید شرمندہ، اس کی سنگدلی و ستم انگیزی عشق کا جوش و خروش، عاشق کی وفاکیشی اور حرماں نصیبی، وصل کی جستجو، رقیبوں کے شکوے، جور فلک کے گلے، مئے گلفام کی ہوس، واعظ سے چھیڑ چھاڑ، باغ و بہار کے منظر، غرض انھیں باتوں کی صبر شکن تکرار ہوتی ہے۔ اگر طاقتِ پرواز میسّر ہوئی تو عشق مجازی چھوڑ کر عشق حقیقی کی چاشنی پیدا کی، تقدس، ریاضتِ نفس، ترک عیش و عشرت، ریاکاری سے اجتناب، حرص و ہوا سے پرہیز وغیرہ پر بھی خامہ فرسائی کی گئی"۔ کلیم صاحب کی پیش کردہ فہرست اس قدر وسیع ہے کہ دنیا و دین کا شاید ہی کوئی مضمون اس فہرست سے باہر ہو، مگر جو غزل مضامین کے لحاظ سے اس قدر جامع ہو اُسے "نیم وحشی" قرار دینا ظلم نہیں تو کیا ہے۔ "گل نغمہ" کی ایک چھوٹی سی چیز "روح نغمہ" ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ کلیم صاحب بتائیں کہ ان اشعار کا کون سا مضمون ایسا ہے جو ان کی پیش کردہ فہرست میں نہیں ہے:-

چھین لیتی ہے مری جان کو ایمان سمیت | آہ! یہ کون سا جادو تری آواز میں ہے
جلوۂ ہوش ربا، جرأت حیرت افزا | وہ ترے حسن میں ہے یہ ترے جانباز میں ہے
دل بری، جاں طلبی، دل شکنی، بے مہری | وہ تبسم میں ترے، یہ ترے انداز میں ہے
ٹوٹ سکتا ہی نہیں اس کی خموشی کا طلسم | لوح محفوظ نہاں، سینۂ ہمراز میں ہے
روح نغمہ نے نواساز سے ہنسکر یہ کہا | سوز آفت کا ترے ساز کی آواز میں ہے
پھونک دے آن میں جو جان و جہاں کی ہستی | ایسا نغمہ! ابھی پوشیدہ مرے ساز میں ہے

پہلے شعر میں "ایمان سمیت" کا ٹکڑا بہت خوبصورت اور فصیح ہے۔

کلیم صاحب نے اپنے مقدمہ میں اُردو تنقید کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"اردو تنقید محض الفاظ کے دام میں جا پھنسی، روح کو نظر انداز کرکے جسم پر نگاہ دوڑائی گئی، اور کیوں نہ ہو جب جسم، روح سے بے نیاز ہو! الفاظ کی صحت، محاوروں کی فصاحت، زبان کی روانی، سلاست پر نظر ڈالی، تو کبھی کبھی، ربط یا بندش کی سند طلب کی، کہیں صنائع

بدائع کو دیکھا تو کہیں عامیانہ الفاظ و تراکیب کی مذمت کی۔ اگر تحسین پر اتر آئے تو تعریف کی بوچھار اور اگر مذمت پر اُتر آئے تو ہجو کی بھرمار کی، اسی کا نام تنقید ہے۔"

مگر شعر میں اچھے لفظوں، بلند تخیل عمدہ ترکیب، لفظوں کے صحیح استعمال (ردیف و قافیہ اور بحر کی پابندی) کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ شاعر و ادیب سے تہذیب زبان کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس لئے شاعر ہی الفاظ کو غلط اور بے محل استعمال کریں تو پھر الفاظ کے صحیح استعمال کی کس سے اُمید کی جاسکتی ہے۔ یہاں "گل نغمہ" کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے، جس میں شاعر نے لفظ "طرح" دو طرح استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کبھی الگ ہوئیں وہ اس طرح بصد انداز جدا ہوں رشک سے جس طرح دو پری تمثال

پہلے مصرعہ میں "طرح" کی "ر" سے "متحرک ہے، مگر دوسرے مصرعہ میں نہیں ہے، ذرا سے ردّ و بدل سے یہ شعر یوں ہوسکتا ہے:۔

کبھی الگ ہوئیں اس طرح وہ بصد انداز جدا ہوں رشک سے جیسے طرح دو پری تمثال

جہاں تک ہم نے اس مجموعہ کی نظموں پر غور کیا ہے وہ بہت شگفتہ ہیں اور بعض بعض نظمیں سبق آموز بھی ہیں۔ اس مجموعہ کی لکھائی چھپائی وغیرہ میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ مصنف اور مقدمہ نگار دونوں کے فوٹو اور مصنف کا عکس تحریر بھی موجود ہے، اس کا حجم بڑی تقطیع کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات ہے، قیمت ڈھائی روپیہ، ملنے کا پتہ: کتابستان۔ الہ آباد۔

محمد حسین آزاد

اس کتاب میں محترمہ جہاں بانو بیگم (نقوی) ایم۔ اے نے شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی سوانحعمری تفصیل کے ساتھ قلمبند کی ہے، چنانچہ مولانا کے خاندانی حالات آپ کی پیدایش، تعلیم، ملازمت، تصانیف عادات و خصائل، احباب، نثر نگاری اور شاعری سب پر بہت کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد اُردو زبان کے بہت بڑے محسن ہیں اور جدید اُردو شاعری کے اوالالعزم بانی ہیں جن کا احسان اُردو زبان قیامت تک نہیں بھول سکتی۔ اس لئے ہمارے زمانہ کے لوگوں کو مولانا کے حالات سے کافی واقفیت ہے لیکن آئندہ کے لئے محترمہ جہاں بانو صاحبہ نے یہ کتاب لکھکر اُردو زبان پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سبھی، ضخامت دو سو صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: ادارہ ادبیات اُردو رنت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن

رگبی کی زندگی

یہ کتاب ٹامس ہیوز کی مشہور انگریزی کتاب ٹام براؤنس اسکول ڈیز (Tom Brown's School Days) کا سلیس اور شگفتہ ترجمہ ہے۔ اصلی کتاب ۱۸۵۷ء میں لکھی گئی تھی، جسے اب مسٹر بشیر رشاد ایم۔ اے، اوستان کے بعض قابل معاونین نے اُردو زبان کا جیت جامہ پہنا دیا ہے۔ کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہے جسے اپنی طالب علمی کے زمانہ کی یاد نہ آتی ہو، اور وہ اپنے حلقۂ احباب میں اس زمانہ کے حالات لطف لے لے کر بیان نہ کرتا ہو۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ انگلستان کے سکنڈری اسکولوں کا طریقۂ تعلیم، کورس، اور تفریحات کیا ہوتے ہیں اور انگلستان کے نوجوانوں کے تعلیم و تربیت کا کیا انتظام ہے۔ غرض بحیثیت مجموعی کتاب دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات۔[1]

علم دولت[2]

یہ کتاب ملک کے مشہور ماہر اقتصادیات پروفیسر برج نراین ایم۔ اے کی قابل قدر تصنیف ہے، جس میں انھوں نے اس علم کے متعلق بہت سی مفید معلومات یکجا کر دی ہیں۔ کتاب میں پانچ باب اور پچیس فصلیں ہیں، جن میں دولت کی تعریف، دولت کمانے کے طریقوں، دولت کی تقسیم، سرمایہ و مزدوری کے تعلقات، مانگ اور پیداوار کے توازن، ٹیکسوں، شرح مبادلہ، اور حکومت کے فرائض وغیرہ وغیرہ مسائل پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ زبان بھی سلیس اور عام فہم ہے۔ زر یا سکہ کی قیمت کا سمجھنا عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے، مگر پروفیسر برج نراین نے اور ان کی مختلف قیمتوں کے نقشوں کے ذریعہ سے اس مسئلہ کو بڑی خوبی سے سمجھایا ہے۔

ٹیکس کا مسئلہ بھی ایک ٹیڑھا مسئلہ ہے، براہ راست اور بالواسطہ ٹیکسوں کے لئے جنھیں انگریزی میں (Direct, Indirect) کہتے ہیں، پروفیسر صاحب نے ان کے لئے دو نئی اصطلاحیں ایجاد کی ہیں، یعنی سیدھے و ٹیڑھے ٹیکس جو ہمارے خیال میں بہت خوب ہیں۔ علم اقتصادیات میں دو اور مشکل مسئلوں یعنی مبادلۂ زر اور بین الاقوامی تجارت پر بھی پروفیسر صاحب نے خوب بحث کی ہے۔ غرض کتاب بہت مفید اور قابل قدر ہے۔ ہماری رائے میں کالجوں کے

[1] قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔

[2] لکھائی چھپائی کاغذ۔ جلد وغیرہ اچھی ہے، چھوٹی تقطیع کے ۴۰۰ صفحے ضخامت۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ، ملنے کا پتہ: مسٹر لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز تاجران کتب لاہور۔

اقتصادیات کے طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ پہونچےگا۔ درحقیقت اُردو میں یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اور فاضل پروفیسر برج نراین نے اسے لکھکر زبان اُردو پر بڑا احسان کیا ہے۔ جن حضرات کو مزدوری اور سرمایہ داری کے مسئلوں سے عملی دلچسپی ہے ان کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

اقتصادی ہند

یہ کتاب بھی پروفیسر برج نراین ایم۔اے کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کتاب "علم دولت" میں پروفیسر صاحب نے دولت اور اُس کے متعلق مسائل پر عام نظر ڈالی ہے اور اس کتاب میں صرف ہندوستان کے اقتصادی حالات سے خصوصیت سے بحث کی گئی ہے ہر ملک کی اقتصادی حالت کو سمجھنے کے لئے چند باتوں کے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً ملک کا رقبہ کیا ہے، آبادی کتنی ہے، پیداوار کیا ہے، سلسلہ آمد و رفت کیسے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

جس ملک کا رقبہ کم اور آبادی زیادہ ہے اس کے باشندوں کو کھانے پکانے اور دوسری ضروری چیزوں کے لئے ہمیشہ دوسرے ملکوں کا دست نگر رہنا پڑے گا۔ ایسے ملکوں کی مثالیں جاپان اور برطانیہ ہیں۔ مگر جس ملک کا رقبہ وسیع اور آبادی کم اور پیداوار زیادہ ہے لیکن آمد و رفت اور باربرداری کے ذرائع نہیں ہیں اس کی تمام پیداوار گھر میں ہی پڑی سڑے گی۔ دوسرے ملکوں کو بھیجکر اس سے نفع نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ ایسے ملک افغانستان، ایران اور حبش ہیں پروفیسر برج نراین نے ہندوستان کی انھیں تمام باتوں کو پیش نظر رکھکر یہ سبق آموز اور پُراز معلومات کتاب لکھی ہے جس میں ہندوستان کا رقبہ، آبادی، مختلف چیزوں کی پیداوار وغیرہ کا مفصل حال درج ہے اور یہ بھی تبلا دیا گیا ہے کہ یہاں کارخانوں کے قانون کیا ہیں، بیکاری کی کیا کیفیت ہے، اور وہ کس طرح دُور کی جا سکتی ہے؟ ریلوں اور سڑکوں کی کیا حالت ہے؟ غیر ملکوں سے تجارت کی کیا صورت ہے، قیمتیں کس طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ غرض روپیہ، بنک، مبادلہ قوانین زراعت، مالگذاری وغیرہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر فاضل مصنف نے سلیس اور عام فہم زبان میں بحث نہ کی ہو۔ کتاب کے آخری باب میں پنجاب کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ غرض پوری کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے جس پر ہم فاضل مصنف کو مبارکباد دیتے ہیں[1]۔

---

[1] ضخامت ۲۹۰ صفحے قیمت ڈیڑھ روپیہ ملنے کا پتہ لالہ لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب وپبلشرز لاہور،

علمی خبریں اور نوٹ

پروفیسر حامد حسن صاحب قادری پرونسپل سینٹ جانس کالج آگرہ نے اُردو طالب علموں کے فائدہ کے لئے "داستان اُردو" کے نام سے اُردو ادب کی مفصل تاریخ لکھی ہے جو عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔

مارچ سنہ حال میں ہز ہائینس نواب صاحب رامپور کی سرپرستی میں ریاست رامپور میں رضا اکیڈیمی کے نام سے ادبی انجمن قائم ہوئی ہے جسکی افتتاحی رسم ہز ہائینس ممدوح کے دست مبارک سے ادا ہوئی۔ اُمید ہے کہ اس اکیڈیمی سے اردو زبان میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

رائے بہادر رام بابو سکسینہ صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی دیوان ریاست کوٹہ و مصنف تاریخ اُردو لٹریچر نے کئی سال کی تلاش و تحقیق کے بعد یوروپین و انڈو یوروپین شعرائے اُردو و فارسی کا ایک دلچسپ تذکرہ لکھا ہے جس میں تقریباً ایک سو یوروپین و انڈو یوروپین شاعروں کے سوانحی حالات مع تصاویر درج ہیں اور ان کی زیادہ تر غیر شائع شدہ نظموں کے مفصل انتخابات بھی پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب مکمل ہو چکی ہے اور نولکشور پریس لکھنؤ میں زیر طبع ہے۔

آج کل آپ دور جدید کے اُردو شاعروں کا ایک مکمل تذکرہ لکھنے کیلئے ضروری مسالہ جمع کر رہے ہیں۔

حضرت تمنائی اور جناب سہیل عظیم آبادی کی کوشش سے پٹنہ میں نیا سنسار کتاب گھر کے نام سے ایک کارخانہ قائم ہوا ہے جس کے ذریعہ اُردو کی سستی اور اچھی کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا جائیگا۔ شائقین ادب ایک روپیہ سالانہ فیس دیکر اس کتاب گھر کے ممبر ہو سکتے ہیں۔ انہیں اسکی ہر نئی کتاب آدھی قیمت پر دیجائیگی۔ معمولی کتابوں کی قیمت آٹھ آنہ تجویز کیگئی ہے۔ اور دوسری مطبوعات بھی ۲۵ فیصدی کمیشن کی رعایت سے دیجائیں گی دائمی ممبری کی فیس پچیس روپیہ رکھی گئی ہے۔ جس کے عوض میں اس سلسلہ کی تمام کتابیں بلا قیمت نذر کی جائیں گی۔ اور دوسری کتابیں ۳۳ فیصدی کمیشن پر دیجائینگی۔ فی الحال تین کتابیں یعنی "زندہ چین" کے نام سے چینی کہانیوں کا ایک مجموعہ "الاؤ" کے نام سے سہیل صاحب کی سماجی کہانیوں کا مجموعہ اور مسٹر محمد علی ردولوی کی معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ "گناہ کا خوف" کے نام سے چھپ رہی ہیں بنتظمان کتاب گھر ہر ماہ ایک نئی کتاب شائع کرنیکا انتظام کر رہے ہیں

انڈین پریس الہ آباد نے بعض انگریزی کتابوں کے سلسلے کی تقلید میں ہندی زبان کی پانچسو منتخب کتابوں کے

شایع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ اوّل بیس کتابیں شائع ہو کر بازار میں فروخت ہو رہی ہیں۔ باقی کتابیں ہفتہ میں ایک کتاب کے اوسط سے شائع ہونگی۔

بہار کے نامور رہنما ڈاکٹر راجیندر پرشاد اور اُن کے قوم پرست رفیق قومی نقطۂ خیال سے ہندوستان کی ایک نئی اور مفصل تاریخ تیار کرنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ یہ ضخیم تواریخ اکیس جلدوں میں شائع کیجائیگی پچھلے زمانہ کے ہر دور کے حالات لکھنے کا کام خاص خاص ماہرین فن کے سپرد کیا گیا ہے۔ چنانچہ سر جادوناتھ سرکار۔ راؤبہادر کے۔ این۔ دکشت۔ پروفیسر حبیب جیسے ممتاز مورخ اسکی تیاری میں حصہ لے رہے ہیں۔ ہندوستانی مورخوں سے اتنے بلند پیمانہ پر ملک کی تاریخ لکھوانے کی کوشش اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے جس کی ملک میں خاص قدر ہونی چاہیئے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس اہم تاریخ کی پہلی جلد عنقریب چھپکر شائع ہوجائیگی۔

پچھلے مارچ میں ہندوستانی زبانوں کے مشہور فاضل سر جارج گریرسن کی وفات سے مشرقی علوم کا ایک زبردست ماہر کامل اُٹھ گیا۔ آپ نے ہندوستان کی تمام مروجہ زبانوں کے متعلق اکیس (۲۱) جلدوں کا ایک محققانہ سلسلہ شائع کیا تھا، جو آپ کی سالہا سال کی تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہے۔ آپ کا انتقال نوے سال کی عمر میں ہوا اور آپ نے اتنی طولانی عمر تحقیق علوم ہی میں صرف کردی مشرقی زبانوں کے متعلق آپ کی رائیں قول فیصل کا حکم رکھتی تھیں۔

مولانا عبدالرزاق صاحب کانپوری مصنف البرامکہ و مہتمم تاریخ ریاست بھوپال نے بیس (۲۰) سال کی محنت و جانفشانی کے بعد حکیم ناصر خسرو بلخی کے سفرنامہ کا ایک مشرح ایڈیشن تیار کیا ہے اصل سفرنامہ فارسی میں ہے جس کا فرانسیسی ترجمہ پروفیسر شیفر ڈ نے کیا ہے۔ جب ۱۸۸۱ء میں یہ سفرنامہ ہندوستان آیا تو شمس العلما مولانا حالی نے نواب صاحب لوہارو کے کتب خانہ سے اسکا اصلی نسخہ حاصل کر کے اسکی نقل دہلی سے شائع کی۔ مگر اب یہ نسخہ نایاب ہو گیا ہے۔ پروفیسر شیفر ڈ کا تصحیح کردہ سفرنامہ برلن سے بھی شائع ہوا۔ اب مولانا عبدالرزاق نے تقریباً دو سو صفحات پر اس کا نہایت صاف اور سادہ اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور ڈھائی سو صفحات پر اس سفرنامہ کے تاریخی نوٹ اور تقریباً سو صفحات میں ناصر کی سوانحعمری لکھی ہے۔ اب یہ قابل قدر کتاب انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام دہلی میں چھپ رہی ہے۔ البرامکہ کا جدید اڈیشن انتظامی پریس کانپور میں زیر طبع ہے جو عنقریب شایع ہونے والا ہے۔

دوسرے ملکوں کے مشہور مصنفوں کو تصنیف و تالیف سے کس قدر آمدنی ہوتی ہے اسکا اندازہ اسی بات سے ہوسکتا ہے کہ مسٹر ونسٹن چرچل وزیر اعظم برطانیہ کو اُن کی تصانیف سے تقریباً پچیس ہزار پونڈ سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ پریسیڈنٹ امریکہ کی بیوی مسز روزویلٹ نے فاسزم کے خلاف کتابیں لکھکر ایک سال کے اندر تقریباً ڈھائی لاکھ روپیہ پیدا کیا۔ ہندوستان میں شاید سب سے زیادہ رقم جو کسی کتاب کے حق تصنیف میں ملی ہے وہ مہاتما گاندھی کو مسرس میکملن کمپنی نے انکی خود نوشت سوانحعمری کیلئے

[illegible] امریکہ میں اسکی اشاعت کے حق کے لئے ایک لاکھ روپیہ کا چیک دیا تھا۔ جسے مہاتما جی نے
قت کھادی اسپنرس ایسوسی ایشن کے حوالہ کر دیا تھا۔

موجودہ زمانے کے بڑے بڑے مصنفین کی آمدنیوں کا کیا ذکر کیا جائے زندگی میں ہزاروں لاکھوں روپے خرچ
کے بعد بھی وہ مرنے پر بڑی بڑی رقمیں چھوڑ جاتے ہیں۔ مثلاً سر جیمس بیری نے تقریباً پونے دو لاکھ پونڈ کی جائداد چھوڑی
ینن نے ڈھائی لاکھ پونڈ۔ سوکٹر ہیوگو کی جائداد کا اندازہ تین لاکھ پونڈ کیا جاتا ہے۔ کپلنگ نے ڈیڑھ لاکھ پونڈ چھوڑے
ڈی نے کیا نوے ہزار پونڈ۔ گالز ورذی نے اٹھاسی ہزار پاؤنڈ، جارج مور نے ۷۵ ہزار پاؤنڈ، کانن ڈائیل نے ۶۳ ہزار
نڈ۔ آرنلڈ بینٹ نے چالیس ہزار پونڈ۔ چسٹرٹن نے ۲۰ ہزار پونڈ۔ جوزف کانرڈ نے بیس ہزار پونڈ۔ لارڈ مارلی
۵۰ ہزار پونڈ۔ لارڈ برائس نے ۳۰ ہزار پونڈ اور مشہور ناول نگار چارلس ڈکنس نے اسی ہزار پونڈ چھوڑے تھے۔

اس کے برعکس ہندوستان کے اہل قلم کی حالت دیکھئے تو سخت افسوس ہوتا ہے۔ خصوصاً اردو ادیبوں کی
لت تو بالکل ہی ناگفتہ بہ ہے۔ حال میں اردو کے ایک ہر دلعزیز مصنف جو عرصہ سے بیمار ہیں اپنی بابت ایک
خط کے دوران میں لکھتے ہیں کہ "تندرستی کی حالت میں میں نے کبھی کسی کتاب پر رائلٹی لی اور نہ کبھی کسی مضمون کا
معاوضہ لیا۔ کتابیں تصنیف کرکے دوست و احباب کو دیدیں کہ چھپواؤ اور نفع اٹھاؤ۔ اب بیمار پڑ کر قلم اٹھانا دوبھر ہو گیا
اور نوبت فاقوں پر پہونچی۔ تب مجبور ہو کر دو ایک کتابوں کی رائلٹی لی ہے۔ باقی کتابوں کے پبلشروں نے کل رقم مار لی
ہندی میں اردو افسانوں کا ترجمہ دیا تو اس سے کچھ پیسے مل گئے۔ چھوٹے بھائی کی بیس روپیہ ماہوار امداد پہ
پڑا سڑ رہا ہوں۔ کوشش کر رہا ہوں کہ اپنی ہی کتابیں کمیشن پر لیکر فروخت کروں مگر اشتہار کو پیسہ نہیں۔"

اس خط کو پڑھکر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مگر "بدست اندر درم نیست" والا معاملہ ہے۔ کیا اردو زبان
کا کوئی ایسا سرپرست نہیں ہے جو مستحق خادمان ادب کی حاجت روائی کا ضروری انتظام کرسکے؟ ہز ہائینس نواب
صاحب بھوپال کی اولوالعزمی کو ہزار آفریں ہے کہ انھوں نے علامہ اقبال کو پانچسو روپیہ کا گراں قدر وظیفہ دیکر انہیں
روزمرہ ضروریات سے بے نیاز کر دیا تھا، اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے وارثوں کو وظیفہ ملتے رہے ہیں
یوں ملک میں تقریباً ہر سال اقبال ڈے منائے جاتے ہیں، رسالوں میں لمبے چوڑے مضامین نکلتے ہیں اور بڑی
بڑی تنقیدی کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن عام قدردانی کا حال نہ پوچھئے۔ علامہ مرحوم کے اولین مجموعۂ کلام
"بانگ درا" کا پہلا اڈیشن ستمبر ۱۹۲۴ء میں تین ہزار شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد پندرہ سال کے اندر یعنی جون ۱۹۳۹ء تک
کل چار اڈیشن نکلے جن کی مجموعی تعداد ۲۳ ہزار جلدیں ہوئی۔ پندرہ سال کی لمبی مدت میں زمانۂ حال کے سب سے
بڑے اردو شاعر کے پہلے مجموعۂ کلام کی صرف ۲۲ ہزار جلدیں فروخت ہوں۔ یہ اردو ادب کیلئے [illegible]

زمانہ

کانپور

جلد ۴۹ — جون ۱۹۲۷ء — نمبر ۶

فہرست

[illegible]

[illegible]

ناشر [illegible]

قیمت [illegible]

زعفران [illegible]

قدرت کے رحم وکرم پر

بحر روم کے ساحل سے جنوب مستقیم تقریباً سو میل کے فاصلے پر صحرائے اعظم سے لگا ہوا وادی [illegible] کا ایک چھوٹا سا ضلع ہے جس کے باشندے ایک ایسی پہاڑی ندی کے کنارے رہتے ہیں جو ریگستان کے وسط ایک گہری گھاٹی کاٹتی ہوئی چلی گئی ہے اس گھاٹی کی تہہ میں شگفتہ و سرسبز باغات کا سلسلہ چلا گیا ہے لیکن آبادی بہت قلیل ہے۔ نسلاً یہ لوگ بربر اور سفید فام ہیں اور عربی زبان بولتے ہیں۔ ہر قبیلہ دیہات میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس طرح سے گرمی کا زمانہ اس گاؤں میں گذرتا ہے جو دریا کی تہہ میں باغات کے قریب واقع ہوتا ہے اور جاڑے کا زمانہ دوسرے گاؤں میں بسر ہوتا ہے جو اونچے میدان میں واقع ہوتا ہے۔ یہ خانہ بدوش بہت شدت سے ملیریا کا شکار ہوتے ہیں جس کا سبب ایک تو ان کی غریبانہ زندگی اور دوسرا پانی کے قریب رہنا ہے۔ جون سے لیکر اکتوبر تک جب دریا [illegible] کم ہوتا ہے تو تہہ میں ملیریائی مچھروں کی پیدائش کے لئے ایک وسیع میدان بن جاتی ہے۔ لیکن جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو یہ سب الابلا بہہ جاتی ہے۔ اگر دریا میں طغیانی بار بار آتی ہے تو ملیریا کا خطرہ [illegible] جاتا ہے ورنہ کسی سال تو آرام سے گذرتی ہے اور کسی سال ملیریا کا شکار بننا پڑتا ہے۔ مختصر اہل وادی کی زندگی قدرت کی طاقتوں کے رحم وکرم پر منحصر ہے۔

پچھلے دنوں حکومت الجزائر اور مجلس اقوام کی صحت کمیٹی کی مالی امداد سے [illegible] [illegible] ان علاقوں کے باشندوں کو کونین کھلائی گئی تھی۔ اس علاج کو لوگ [illegible] باشندوں نے بہت پسند کیا اور جب حسب منشا نتائج برآمد ہوئے تو گرد ونواح کے ریگستانی دیہات میں کونین پھیل گئی۔ مجلس اقوام کے ملیریا کمیشن کی [illegible] کے مطابق انسداد ملیریا کے لئے [illegible] لازمی ہے اور اگر کسی کو ملیریا ہو جائے تو اسے پانچ سات روز [illegible] [illegible] ملیریا کمیشن کی رپورٹ انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے [illegible] بات پر زور دیا ہے کہ [illegible] ایک [illegible] ہے۔

[illegible]

یادگارِ پریم چند

مشہور رسالہ "زمانہ" کان پور

کا

"پریم چند نمبر"

جس میں

منشی پریم چند کے پرانے دوستوں اور اردو کے بہترین انشاپردازوں اور شاعروں کے جو نفیس مضامین نثر اور نظم شائع ہوئے ہیں

— (جس میں) —

منشی پریم چند کی زندگی اور ادبی کارناموں کا ایک جامع اور مکمل مرقع پیش کیا گیا ہے

اور

منشی جی کی تصانیف کی فہرست، ان کا عکس تحریر اور مختلف اوقات کی آٹھ ہاف ٹون تصاویر بھی ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں

حجم خاص صفحات تصاویر علاوہ

قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول۔

المشتہر

منیجر "زمانہ" کانپور

"زمانہ" کے پرانے فائل

دفتر "زمانہ" میں کئی سال کے پرانے فائل موجود ہیں جن کے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا قدیم ترین اور مشہور رسالہ اڑتیس سال سے اردو زبان و ادب کی کس قدر انہماک اور سرگرمی سے خدمت کر رہا ہے اس کے نقادانہ مضامین اور گرانپایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں "زمانہ" کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں۔ خریداروں سے حسب ذیل رعایت کی جائے گی۔

(۱) تیرہ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے ...

(۲) چار سال کے خریدار سے فی فائل تین روپیہ

(۳) ایک سال کے خریدار سے ... محصول علاوہ

نوٹ: آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہیے۔ فائل ... میں ... باقی ہیں ... میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں ... تک متفرق پرچے بھی آرڈر آنے سے مل سکتے ہیں۔

منیجر "زمانہ" کانپور سے طلب فرمائیے

واردات

منشی پریم چند مرحوم کے تیرہ ... نہایت ... میں شائع ...

شائقین طلب فرمائیں

... "زمانہ"

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید کتابیں

محمد بہادر شاہ ظفر خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ از منشی محمد امیر احمد علوی۔ بی اے اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے قیمت عمر

میدان عمل ۔ منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے اسمیں ملک کی موجودہ بیدار و بےچین روح کی جیتی جاگتی تصویریں فطری عشق و محبت کے سادہ، دلکش اور بناوٹ سے [illegible] نقشے ملیں گے۔ بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے صفحات پانسو۔ کتابت اعلیٰ۔ کاغذ نفیس حسن طباعت ۔ [illegible] اور مضبوط جلد وزیب ڈسٹ کور قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ

[illegible] سحر ۔ یعنی شگفتہ اور دلفریب کا اردو حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز [illegible] جس کی [illegible] [illegible] کی ہے قیمت آٹھ آنہ ۸ر

[illegible] جہانگیر [illegible] کے مشہور و [illegible] [illegible]

لسان الغیب شرح دیوان حافظ مع مفصل سوانح عمری ملک کے مشہور اہل قلم حضرت [illegible] کا نام ہے کہ یہ شرح یکتائی کے درجہ تک پہونچگئی ہے قیمت جلد اول دو روپیہ عہ۔

مکمل عورت ۔ لڑکیوں کی تعلیمی و سوشل حالات کا مقابلہ ایک کو یوروپین اسکول اور دوسری کو کنیا ودیالہ میں داخل کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کنیا ودیالہ کی لڑکی تعلیمی و سوشل حالات میں بہتر ہے۔ قیمت آٹھ آنہ ۸ر

قومی نمبر رسالہ زمانہ ۔ جس میں [illegible] مضامین نظم و نثر اور رنگین و سادہ تصاویر اور مہاتما گاندھی۔ لالہ لاجپت رائے۔ ڈاکٹر بھگوان داس۔ مسز نائیڈو ڈاکٹر اقبال کے خاص پیامات اور بہت سے قابل [illegible] مضامین نظم و نثر شایع ہوئے ہیں۔ قیمت عہ

اختر ستان ۔ ملک کے مشہور سخن [illegible] جعفر علیخاں اختر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ پر تاثیر اور ہر شعر تیر و نشتر ہے قیمت عہ۔

ترجمہ رامائن منظوم ۔ [illegible] اصل [illegible] [illegible] پایا [illegible] ترجمہ [illegible]
ترجمہ [illegible] شاد تصور

زمانہ

جلد ۷۶ — جون سنہ ۱۹۴۱ء — نمبر ۶

فنِ تنقید اور اُردو ادب

از قاضی حامد علی مجازی، بی۔اے (علیگ)

(۱)

اُردو ادب میں تنقید نگاری ایک نئی چیز ہے، مگر دوسری زبانوں کا یہ ایک قدیم اور مستقل فن ہے۔ سب سے پہلے یونان میں اس فن کی تکمیل ہوئی، اگرچہ موجودہ دور میں مغربی ملک ہی اس کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ لیکن قبل پیدائش مسیح تہذیب کے ارتقا میں سب سے پہلے بابل Babylon کا نام آتا ہے اُس کے بعد یونان کے بڑے بڑے حکمار کا شمار ہے۔

تہذیب اور علم و فن لازم و ملزوم ہیں، علم کے بغیر تہذیب کا وجود ہی نہیں ہوتا اور تہذیب کے بغیر کوئی علم و فن بھی ترقی نہیں کر سکتا چنانچہ جب یونان میں بڑے بڑے ادیب اور فاضل حکیم پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے خیالات کی تنویر سے دنیا کے ہر تاریک گوشہ کو منور کر دیا تو فنِ تنقید نے بھی جنم لیا۔ اور ارسطاطالیس (Aristotle) اور افلاطون (Plato) کے ہاتھوں اس کو بھی ترقی ہوئی۔

کتابوں کے سلسلے میں لفظ "تنقید" یا "رائے فیصل" کا سب سے پہلے استعمال اپنے معدود مضمون میں اسکندریہ کے عاقلوں نے ۲۸۰ء قبل مسیح میں کیا۔ چنانچہ نفس مضمون کی ترتیب

Alaxanderian Scholars. ✻

جملوں کی ترکیب ۔ تسلسل مضمون کی تشریح اور توضیح پر اظہار رائے تنقید کے نام سے تعبیر ہوئی
رفتار زمانہ کے ساتھ یہ نظریہ بھی کہ تنقید کا صرف کتابوں کے ساتھ تعلق ہے ۔ بدل گیا اور
اس نظریہ کو وسعت دے کر تنقید کی یہ تعریف کی گئی کہ "Criticism is the exercise of Judgment inthe provisnce Art." یعنی تنقید فنون لطیفہ پر رائے زنی کا نام ہے" اس کے بعد افلاطون کے ظہور تک کوئی اور رائے قائم نہ ہوسکی
افلاطون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ادب میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی ظاہری اور غیرمرئی حقیقت ظاہر ہونا چاہیئے ۔ اسی نظریہ کی بنا پر اُس نے تنقید کو "تلاش حقیقت" کا دوسرا نام قرار دیا
اس اصول تنقید کی رو سے اُس زمانہ کا یونانی لٹریچر یعنی ہومر اور ہیسیڈ کی نظمیں اور پنڈار (Pindar) کے ترانے اور ایتھنس کے ڈرامانگاروں کے شاہکار حقیقی ادب میں شمار نہیں ہو سکتے ہیں کیونکہ افلاطون ہر فن لطیف میں اخلاقی عنصر کا متلاشی تھا ۔ اُس نے اپنی کتاب "جمہوریت" میں لفظ "حقیقت" اور "تنقید" کو ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے :-

Criticism as a means of ascertaining to what extent a work of litera ture conveyed truthful and wholesome information, and corresponded to the external realities of the world.....

Study of literature or art is a question of morality...

Litrature and art are vehicles of morality."

ان الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ افلاطون کی "تنقید" سے صرف یہ مراد تھی کہ ادب کا اخلاقی نکتۂ خیال سے جائزہ لیا جائے اور جن ادبی تحریرات میں اخلاقی جزو موجود ہو وہ "ادب" میں شامل سمجھی جائیں ورنہ نہیں ۔ اسی اُصول کے ماتحت اُس نے اپنے تمام پیشرو اور ہمعصر یونانی شاعروں کے کلام کو صرف بے معنی ہی نہیں ٹھہرایا بلکہ نوع انسانی کے لئے مُضر قرار دیا ۔ افلاطون کے بعد اُس کے شاگرد ارسطاطالیس کا عروج ہوا اور اُس نے افلاطون کے نظریۂ ادب و تنقید سے مخالفت کرتے ہوئے دنیا کے سامنے ایک نئی اور مستحکم رائے پیش کی ، وہ اس بات کا حامی تھا کہ

Republic ۔ ۱ *Homer and Hesiod* ۔ ۱

اگر ادب میں "بقا" کا عنصر نہ ہو تو وہ صحیح معنوں میں ادب کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کی نظر میں ادب اور انسانی زندگی کو ایک خاص طریقہ پر لازم و ملزوم ہونا چاہیئے۔ وہ ادب کو انسان کے اخلاقی اور ذہنی ارتقا کا مظاہرہ سمجھتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ ادب میں صرف ظاہری اور غیر مرئی حقیقت ہی کا عکس نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس کے تخیئل میں حقیقت کا واقعی مظاہرہ ہونا چاہیئے۔ "خیالات" یا دماغی تصویریں" ادب کی بقا کے لئے ضروری نہیں۔ اور تخیئلی اشکال کے بغیر کوئی تحریر "ادب" میں شامل نہیں سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کی رائے میں ادب اور سائینس میں یہی فرق ہے کہ ادب میں "احساسات" (*Feelings*) لازمی ہیں۔ سائینس میں ان کی ضرورت نہیں۔ حقیقت کے مظاہر کے دو پہلو ہیں، ایک (*Subjective*) دوسرا *Objective*۔ پہلی صورت میں انسان حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے جیسا کہ وہ اپنے دماغ میں تصور کرتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ اسے من و عن بیان کر دیتا ہے جیسا کہ اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں :-

"Art then is the presentation of the real in its mental aspect."

اور جب ادب کا تخیئل انسانی سے تعلق تسلیم ہوگیا تو نقاد کا پہلا فرض یہ ہوا کہ وہ احساسات یا خیالات کا جائزہ لے۔ اسی ضمن میں ارسطاطالیس نے اس بات سے بھی اختلاف کیا ہے کہ اخلاقی پہلو ادب کا ضروری عنصر ہے۔ کیونکہ اخلاقیات (ٹھوس اخلاقی تعلیم سے) نفس مطلب خشک اور غیر دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اور جب تک کوئی تحریر دلچسپی پیدا نہیں کرسکتی وہ ادبی معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔ اس کی رائے میں ہر فن لطیف کو انسان کی خوشی کا باعث ہونا چاہیئے۔

"Art is to give Pleasure."

ارسطاطالیس نے اپنی کتاب REHTORICS میں تنقید کے متعلق یہ رائے دی ہے:-

The business of Critical effort is to see the amount of pleasure conveyed in a Specimen of art and to ascertain the meaning of human life as a whole."

یعنی تنقیدی کوشش کا کام آرٹ کے کسی نمونہ میں دل خوش کرنے والی چیزوں کا دیکھنا اور بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کے معنی تلاش کرنا ہے۔

اب یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ علم و فن کی تجدید کے زمانہ میں تنقید کے نظریہ اور اُصولوں کی کیا نوعیت قرار پائی۔ اٹھارھویں اور اوائل اُنیسویں صدی کے نقادوں کا رویہ تخریبی رہا۔ والٹیر (Voltaire) نے شیکسپیئر کے مایۂ ناز ڈرامہ ہملٹ (Hamlet) کو ناقص قرار دیا ہے۔ نامور جرمن فلسفی اور شاعر گوئٹے (Goethe) نے ڈانٹے (Dante) کی مشہور و معروف تصنیف (Inferno) کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مشہور انگریزی شاعر بائرن (Byron) نے متعدد انگریزی شاعروں کے کلام سے عجب نفرت کا اظہار کیا ہے۔ مشہور و معروف انگریز نقاد میتھو ارنالڈ نے جو زمانۂ قدیم اور زمانۂ متوسط کے ادب کا بڑا مدّاح ہے۔ اپنے ہم عصر شاعران باکمال مثل براوننگ، ٹینی سن، مارس، روزیٹی اور سوین برن وغیرہ کو بالکل نظرانداز ہی کر دیا ہے۔ حالانکہ اٹھارھویں اور اُنیسویں صدی کے لیے اُصول تنقید نگاروں میں صرف اُسی کی ذات عام نقادوں سے وقیع اور بالاتر سمجھی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اپنی انتہائی قدامت پرستی کی وجہ سے اُس نے اپنے ہم عصر شاعروں کی اہمیت نہ پہچانی ہو، مگر دنیائے تنقید میں یونانی حکماء کے بعد وہ افضل ترین نقاد سمجھا جاتا ہے۔ اُس نے ادب اور خصوصاً شاعری کے متعلق یہ اُصول قائم کر دیا ہے کہ

"Poetry is a Criticism of life."

یعنی شاعری حیات انسانی کا تبصرہ ہے۔

تنقید کے متعلق اس کا خیال ہے کہ ادب میں کوئی تخلیقی کوشش اس وقت تک بارور نہیں ہو سکتی جب تک ادیب کے پاس اس کا ضروری مسالہ موجود نہ ہو۔ یہ مسالہ خیالات ہیں جن کے بغیر کوئی ادبی کارنامہ ظہور ہی میں نہیں آ سکتا ہے۔ میتھو ارنالڈ کی یہ بھی رائے ہے کہ ایک ادبی تحریر کی تخلیق کے لئے دو طاقتوں کا بیک وقت جمع ہونا ضروری ہے۔ یعنی ادبی ذہنیت اور استدراک کی فضا جو خیالات کی صورت یعنی ادب کا مسالہ مہیا کرتی ہے۔ وہ لکھتا ہے

"For the Creation of a master work of Literature two powers must concur, the power of the man and the power of the moment."

"یعنی کسی ادبی شاہکار کے لئے دو قوتوں کا یکجا ہونا لازمی ہے، آدمی کی قوت تخیل اور وقت کا اثر مگر یہ مسالہ تنقیدی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ بہ الفاظ دیگر خیالات کی تخلیق کے لئے "تنقید" کی قابلیت ایک لازمی عنصر ہے۔ تنقیدی کوشش کا کام سوسائٹی میں صحیح اور حقیقی خیالات

پھیلانا ہے، اس کا قول ہے کہ سچائی کا احساس ہی زندگی کا احساس ہے۔

"The touch of truth is the touch of Life."

یعنی حقیقت اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لئے شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ "دنیا" اور" انسانی زندگی پر دقیق نظر رکھتا ہو۔

میتھو آرنالڈ کے نظریہ کے مطابق تنقید نگار کے لئے غیر جانبدار اور غیر متعصب ہونا ضروری ہے اس کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ ترین مدارج سے واقف ہو اور کسی قسم کی غرض یا مقصد سے متاثر ہوئے بغیر اور تعریف و تخریب کے پہلوؤں سے بالاتر ہو کر عوام میں ان مدارج کی اشاعت کرے اُس نے ایک لفظ میں ایک کلیہ یہ بتا دیا ہے کہ "تنقید قطعی بے لوث ہو" یہی کلیہ ہر تنقید نگار کے لئے شمعِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

(۲)

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اُردو ادب میں "تنقید نگاری" ایک نئی چیز ہے۔ مشرقی علوم کا یہ کوئی قدیم فن نہیں ہے۔ اس کے دو سبب پیش کئے جاتے ہیں، اول یہ کہ مشرقی تہذیب کا ایک اہم عنصر "مروت" ہے۔ اس لئے کسی ادبی کارنامہ پر کوئی دلشکن رائے ظاہر کرنے کا رواج نہیں ہوا۔ ہمدردی اور پاسداری ہمارے بزرگوں کے اخلاق کا ضروری جزو تھا۔ اسی لئے وہ تنقید کو پسند نہ کرتے تھے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے عیوب سطحِ عام پر آ جاتے ہیں بہرحال وجہ جو بھی ہو واقعہ یہ ہے کہ اُردو ادب میں تنقید نگاری مفقود تھی۔ انگریزی کی تقلید میں اس کا رواج ہوا، سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں شاعروں کے کلام پر تنقید کی، مگر ان کی رائیوں میں ایک طرف فطری شوخی اور ظرافت کو دخل تھا۔ دوسری طرف تعصب اور جانبداری کی وجہ سے حقیقی تنقید نگاری کا حق ادا نہ ہو سکا۔

درحقیقت آزاد کے پیشِ نظر تنقید نگاری کا کوئی صحیح مفہوم بھی نہ تھا اور نہ تنقید کا کوئی معیاری نمونہ ہی ان کے روبرو موجود تھا، جن سے وہ اُصول تنقید اخذ کر سکتے۔ البتہ صرف ایک غیر زبان کا مبہم سا خاکہ ضرور ان کے دماغ میں تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسی کو عملی جامہ پہنا دیا بہرنوع آبِ حیات اُردو میں تنقید نگاری کی پہلی کوشش تھی، مگر اس نے نہ تو شاعری کا کوئی اہم نظریہ

ط The rule may be summed up in a word —— Disinterestedness.

پیش کیا اور نہ تنقید کا کوئی خاص معیار ہی قائم کیا۔ البتہ شاعروں کے تذکرے میں بہترین افسانہ نگاری کا حق ادا کرکے آزاد نے "آبحیات" میں اپنی طبع رواں کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں

آزاد کے بعد دو شخصیتیں اور قابل ذکر ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی کے پیش نظر "تنقید" کا صحیح مفہوم تھا جس کو انھوں نے "یادگار غالب" اور مقدمۂ شعر و شاعری میں پیش کیا "یادگار غالب" میں مولانا حالی نے غالب کی اصلی شخصیت پیش کرنے اور ان کی شاعری کی پوری اہمیت ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے "اور "مقدمۂ شعر و شاعری" میں انھوں نے شاعری کی تعریف اور شاعر کے لازمی خصوصیات بیان کی ہیں۔ دونوں کتابوں میں انھوں نے حقیقی معنوں میں تنقید نگاری کے اصول کو پیش نظر رکھکر رائے زنی کی ہے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر جانبدار اور بے لاگ تھے۔ اُنھوں نے غالب کی خوبیوں اور اوصاف کے ساتھ اُن کے نقائص اور عیوب بھی بیان کر دیئے ہیں جس سے ناظرین کو غالب کی اصلی حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے، اور کوئی بات پس پردہ نہیں رہ جاتی۔ جس سے تنقید میں سُقم پیدا ہو سکے۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں مولانا حالی شاعری کی مکمل تعریف پیش کرنے سے قاصر رہے اور ایک حقیقی شاعر کا معیار قائم نہ کر سکے۔ اُن کا قول ہے کہ شاعر کا ذہن فوٹو کے کیمرے سے مشابہت رکھتا ہے۔ اُس پر ایک واقعہ کا جو عکس پڑتا ہے اُس سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور یہ کیفیت اس کو اس کے متعلق اپنے دلی جذبات بیان کرنے پر مجبور کرتی ہے' مگر اس نظریہ میں یہ نقص ہے کہ فوٹو کی پلیٹ ایک ہی وقت میں دو مخالف و متضاد مناظر پیش نہیں کر سکتی۔ اس کے خلاف اُردو شاعر (قافیہ پیمائی سے مجبور ہو کر) ایک ہی وقت میں دو مختلف جذبات پیش کر دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے اُردو شاعر کا دماغ فوٹو پلیٹ کے مشابہ نہیں ہوتا ہے۔

اس سے قطع نظر حالی نے جو کچھ لکھا ہے اس خیال سے لکھا ہے کہ عوام اس سے مستفیض ہو سکیں اور شاعری میں حسب ضرورت اصلاح پیدا ہو جائے۔ اُن کا مقصد یہ بھی تھا کہ نیچرل شاعری کی طرف عوام کا رجحان ہو۔

مولانا شبلی کی ذات مجموعۂ کمالات تھی، وہ ادیب، نقاد۔ سیرت نگار، فلسفی اور شاعر سبھی کچھ تھے، اور اُنھوں نے کامیابی کے ساتھ تنقید نگاری کا حق ادا کیا۔

اُن کی کتابیں "موازنۂ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" بہت مبسوط اور جامع ہیں۔ شعر العجم میں

انھوں نے انتہائی تحقیق اور غور و فکر کے بعد شاعری کی تعریف، شاعر کے خصوصیات، اصناف شاعری اور ایرانی شاعری پر تبصرہ لکھا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے فارسی شاعروں کا بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تبصرہ کر کے عوام کو فارسی شاعری سے روشناس کر دیا ہے۔ گو بعض اوقات وہ ذاتیات میں پڑ کر اپنی ذاتی پسندیدگی کے رَو میں بہہ جاتے اور جانبدارانہ پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ بات مستقم میں اس لئے شمار نہیں ہو سکتی کہ ہر شخص کو اپنی پسند اور ناپسندیدگی کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ مولانا شبلی نے شعر العجم میں نہایت فاضلانہ طریقہ پر ایرانی شاعری اور شعراء کے ماحول کو پیش کیا ہے۔ جس سے اُس زمانہ کی شاعری کا پس منظر بھی سامنے آجاتا ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی اس متانت اور غیر جانبداری کو موازنہ انیس و دبیر میں قائم نہ رکھ سکے۔ اور دبیر کی اس قدر مذمت کی کہ انھیں مرثیہ گوئی میں کوئی جگہ ہی نہ دی۔ تاہم مجموعی طور پر اُردو زبان مولانا شبلی کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، کیونکہ انھوں نے اُردو ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کر دیا ہے۔

مولانا شبلی کے بعد اُن کے شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی مولانا کے اُصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اُردو شاعری کا تبصرہ کیا اور اکثر اُردو شاعروں کے کلام کے عیوب اور اوصاف کو منظر عام پر پیش کر دیا۔

دوسرے تنقید نگاروں میں مولانا وحید الدین سلیم کا نام بھی قابل ذکر ہے، اُنھوں نے اُردو زبان کو سدھارنا چاہا، اور اس کو عام اور ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کی۔ اُن کا خیال تھا کہ اُردو اُس وقت تک عوام میں مقبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ عملی طور پر یہ ذہن نشین نہ کر لیا جائے کہ اُردو ایک مشترکہ زبان ہے۔ اسی بنا پر انھوں نے اس خیال کو دُور کرنے کے لئے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان اور ان کی تہذیب و تمدن کا آئینہ ہے۔ اس زبان کا نام "ہند المانی" تجویز کیا تھا۔ کیونکہ اس ملک کی دونوں قومیں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دوش بدوش تمدن و معاشرت کے منازل طے کر رہے ہیں۔ اور اُردو پر دونوں کو یکساں حق حاصل ہے۔

مولانا وحید الدین سلیم کا سب سے بڑا کارنامہ اُن کا مضمون "ہمارے شاعروں کی نفسیات" ہے۔ جس میں انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ مروجہ اُردو شاعری صرف قافیہ پیمائی ہے۔ اُردو شاعروں کے ہاں واقعی قافیہ خیال پر مقدم ہے، اور وہ عموماً کسی خاص جذبہ سے متاثر ہو کر

شعر نہیں کہتے بلکہ اُن کے لئے خاص چیز "قافیہ" ہے اور اسی قافیہ کی مناسبت سے وہ خیال "باندھ" کر لاتے اور شعر موزوں کرتے ہیں۔

اُن کا خیال ہے کہ "غزل" اُردو شاعری کی تخریب کا باعث ہے، کیونکہ غزل میں شاعر مسلسل طور پر اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار سے مجبور رہتا ہے، اور ردیف و قافیہ کا التزام شاعر کے خیالات کے ادا ہونے میں سدراہ ہوتا ہے۔ لہذا یا تو مثنویاں لکھی جائیں یا ایسی نظمیں ہوں جس میں قافیہ اور ردیف کا التزام بالکل نہ ہو۔ ان کے مضامین "سودا کی ہجویہ نظمیں" "میر کی شاعری" "عہد میر کی زبان" "اُردو شاعری کا مطالعہ" اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ مولانا موصوف نے انتہائی باریک بینی اور نکتہ رسی سے شاعروں کے کلام کا جائزہ لیا اور اس کے متعلق غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔

مصنف روح تنقید نے تنقید کے اصولوں کو کتابی شکل میں پیش کیا ہے، اور انھیں اصولوں کو پیش نظر رکھکر اُردو شاعری سے بحث کی ہے۔ قادری صاحب نے شاعری کی ایک جامع تعریف پیش کی ہے اور مختلف اصناف سخن پر فاضلانہ تبصرہ بھی کیا ہے۔ مگر ان سے ایک اہم غلطی یہ ہوگئی کہ انھوں نے غیر ملکی شاعری کی خصوصیات کو مشرقی شاعری کے ماحول سے ہم آہنگ کرنا چاہا، اس لئے وہ مشرقی شاعروں کی طبیعتوں کا صحیح اور مکمل جائزہ نہ لے سکے۔ البتہ انھوں نے اصول تنقید کو نئے طریقے سے یکجا کر کے اُردو میں ایک مفید کتاب ضرور پیش کر دی ہے۔

اس وقت اُردو ادب میں تنقید نگاری کا کافی مسالہ جمع ہو رہا ہے۔ اکثر ادیبوں کو تنقید و تبصرہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو گیا ہے، جس سے اُمید ہے کہ آئندہ چل کر یہ زبان بھی دوسری زبانوں کے ہم پلہ ہو جائے گی۔ تنقید سے ہمارے ادیبوں کے نظریے بھی درست ہو رہے ہیں۔ بعض بعض اُردو رسالوں میں بھی تنقید کتب کا خاص اہتمام ہے اور مولانا شبلی سے لیکر اب تک اُردو میں تنقید نگاری میں خاص ترقی ہوئی ہے جس کا فائدہ ہماری آئندہ نسلیں بخوبی اُٹھائیں گی۔

جہانِ فانی

فانی جہاں، یہ عکس فانی کیا ہے؟ شبنم کا فریب دُرفشانی کیا ہے؟
پھولوں کی ہنسی ہے شادمانی کیا ہے پانی کا اُبال ہے جوانی کیا ہے؟

مہر نوش ایم۔ اے

جگر پارے

تازہ کلام حضرت جگرؔ مرادآبادی

سودا جو آپ ہے سر میں وہ سودا ہی اور ہے
اس کا چمن ہی اور ہے صحرا ہی اور ہے

لیلیِ آب و گل تو ہزاروں ہزار ہیں
مجنوں ہے جس کی روح وہ لیلیٰ ہی اور ہے

یہ حسنِ رنگ رنگ بھی کچھ کم نہ تھا، مگر
کیا کیجئے کہ دل کا تقاضا ہی اور ہے

جو حسنِ شش جہت سے نہ سیراب ہو سکی
محسوس اب ہوا وہ تمنا ہی اور ہے

صورت میں یہ فروغ یہ جذب و کشش کہاں؟
در پردہ کوئی شاہدِ معنیٰ ہی اور ہے

خود حسن استعارہ ہے جس کے جمال کا
وہ جانِ حسن، حسنِ سراپا ہی اور ہے

جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرتِ بلند
شاید وہ حسن و عشق کی دنیا ہی اور ہے

(۲)

جو مسرتوں میں خلش نہیں جو اذیتوں میں مزا نہیں
ترے حسن کا بھی قصور ہے مری عشق ہی کی خطا نہیں

مرے جذبِ عشق پہ تہمتیں مجھے بے بسی کا گلہ نہیں
ترے جبرِ حسن کی خیر ہو، مرے اختیار میں کیا نہیں

جسے میں بھی خود نہ بتا سکوں مرا رازِ دل ہے، وہ رازِ دل
جسے غیر دوست سمجھ سکے مرے ساز میں وہ صدا نہیں

یہ طریق چند ہے خوب تر مگر آہ واعظِ بے خبر
اُسے سازگار ہو زہد کیا جسے معصیت بھی روا نہیں

مرا ذوق بھی مرا شوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں

مرے درد میں یہ خلش کہاں، مرے سوز میں یہ تپش کہاں
کسی اور ہی کی پکار ہے، مری زندگی کی صدا نہیں

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے پھر بھی غیر عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں، مری نظم میں ہیں لطافتیں
مرے فکر میں کہیں اے جگر ادبِ کثیف کی جا نہیں

(۳)

ناصح فسانہ اپنا ہنسی میں اڑا گیا
خوش فکر تھا کہ صاف یہ پہلو بچا گیا

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

دل بن گیا نگاہ، نگہ بن گئی زباں
آج اک سکوتِ شوق قیامت ہی ڈھا گیا

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

تبرکاتِ شاد

(حضرت شاد عظیم آبادی کی ایک غیر مطبوعہ غزل[له])

بھول نہ اُس کو دُھن ہے جدھر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے،
شکل نمایاں اب ہے سحر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

آنکھیں مَلتے صحنِ چمن میں جھوم کے اُٹھے نیند کے ماتے
دیکھ صبا نے آ کے خبر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

نیلے نیلے رنگ کے اوپر بڑھتی ہی جاتی اب ہے سفیدی
ہو گئی رنگت زرد قمر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

پنکھ پکھیرو خواب سے چونکے، سب نے خوشی کے نعرے مارے
آئی صدا مرغانِ سحر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

زور نہ طاقت سنگ نہ ساتھی، پاؤں سے اپنے آپ ہے چلنا
تجھ پہ ہے بھاری راہ سفر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

کلامِ حسرت

تم کو اِس بات کا خیال نہیں — ورنہ جینا مرا محال نہیں
حُسن کو صبر پر ہے کیوں اصرار — عشق پابندِ اعتدال نہیں
تم سے رکھتا ہے کون دل کو عزیز — تم نے یہ کیا کہا کہ ٹال نہیں
حالِ دل سُن کے ہم سے کیوں ہو خفا — ایلچی کو کہیں زوال نہیں

دامنِ شعرِ عشق پر حسرت
داغ اہمال و ابتذال نہیں

له حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم کے یہ اشعار آبدار اُن کے لائق نبیرہ حضرت ارشاد کاظمی کے لطف و توجہ سے صحیح رسالہ کئے

کلامِ میرؔ[1]

۳

(از میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

نہیں وہ قیدِ الفت میں۔گرفتاری کو کیا جانے
تکلّف برطرف، ہمسری یاری کو کیا جانے
بے مہر ہے

مرتا ہے کیوں تو ناحق یاری برادری پر
دنیا کے سارے ناتے ہیں جیتے جی فلک کے
جیتے جی تلک کے

آج میرے خون پر اصرار ہر دم ہے تمھیں
آئے ہو کیا جانیے تم کس کے سنکارے ہوئے
سنکارے ہوئے

نوٹ: سنکارے ہوئے یعنی بھڑکائے ہوئے۔

تنک گرم تو سنگریزے کو دیکھا
نہاں اس میں بھی شعلۂ طور ہے
دیکھ

یہ گرد راہ اوسکی یارب کس اور سے اوٹھیگی
سو سو غزال ہر سو آنکھیں لگا رہا ہے

رہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر
جینے کا اس سیمتن میں اب کیا مزہ رہا ہے
سمے

دل زخم خوردہ کی اور اِک لگا ئیے
مداوا کیا خوب گھائل کا اپنے
کے
لگائی

یہ فنِ عشق ہے آوے اسی طینت میں جس کی ہو
تو زاہد پیر نابالغ ہے بے تہ تجھکو کیا آوے
نستے

ہمارے دل میں آنے سے تکلّف کو غم بیجا ہے
یہ دولت خانہ ہے اُسکا وہ جب چاہے چلا آوے
غم کو بیجا ہے

ضبطِ سرشکِ خونیں سے جی کیو نکہ شاد ہو
اب دل کی طرف تو ہو کا سارا بہاؤ ہے
لوہو

مرا یہ شور سُن کے جو لوگوں نے کیا پوچھا تو کہے ہے کیا
جسے کہتے ہیں صاحبو یہ وہی تو خانہ خراب ہے
کچھ کہا
جسے میر

[1] اس سلسلے کے پہلے مضامین ترتیب وار جون، جولائی، دسمبر ۱۹۴۰ء اور اپریل ۱۹۴۱ء میں ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں۔ ہمارے قابل دوست نے کلامِ میر کی صحت اپنے ذہنِ رسا سے کی ہے۔ (ا-د)

ہر یک سے کہا نیند میں پر کوئی نہ سمجھا	شاید کہ مرے حال کا قصہ عربی ہے

ہند

عزلت سے نکل شیخ کہ تیرے لئے تیار	کوئی بعفت گزری مسیح کوئی دہ وجبی ہے

مسیح

روشن ہے جل کے مرنا پروانے کا و لیکن	اے شمع کچھ تو کہہ تو تری بھی تو زباں ہے

تو بھی کچھ کہہ تیرے بھی تو

گرم ہیں شور تجھ حسن کے بازار کئی	رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی

گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے

نوٹ :۔ تجھ حسن کے یعنی تیرے حسن کے

اپنے کوچے میں نکلیو تو سنبھالے دامن	یادگار مژۂ میر وہاں خار کئی

ہیں واں

رکھیو قدم سنبھل کے کہ تو جانتا نہیں	مانند نقش پا یہ سر راہ کون ہے

تو جانتا نہیں

ایسا اسیر خستہ جگر میں سنا نہیں	ہر آہ میر جس کی ہے جان کاہ کان ہے

جانکاہ - کون ہے

کیا میر تو روتا ہے پامالی دل بھی کو	ان لونڈوں نے تو دلّی سب سر پر اٹھالی ہے

دہلی

نماز چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے	ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخ زعفراں ہے

نازِ چمن

باغ و بہار ہے وہ، میں کشت زعفراں ہوں	جو لطف اک ادھر ہے تو یاں بھی اک سماں ہے

سو رنگ اُس طرف ہیں

اس مجن کو کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض	اول تو میں سند ہوں پھر میری یہ زباں ہے

میں

تیرا خرام دیکھے تو جا سے نہ ہل سکے	کیا جی نظر رہ کا جو ترے آگے چل سکے

تدرو

نوٹ :۔ معلوم ہوا کہ دلّی میں بھی ہلنا کو ہلنا بولتے تھے

کیا اُس غریب کو سر سایۂ ہما	جو اپنی بید ماشی سے مکتی نہ جھل سکے

بید ماغی

ہے جائے خیف بزم جہاں مل لے اے اننگ	اپنے اوپر جو کوئی گھڑی ہاتھ مل سکے

مل

مرے اس رگ کے مرجانے سے وہ غافل ہے کیا جانے — گزرنا جان سے آسان، بہت مشکل ہے کیا جانے
رگ کے

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن سے — یوں ہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے
میں

کب تلک جی رو کے جفا ہووے — آہ کریئے کہ ٹک ہوا ہووے
کب تلک جی رکے۔ خفا ہووے

مرگئے ہم تو مرگئے تو جیئے — دل گرفتہ تری بلا ہووے
ہم مرے تو مرے۔ جیئے تو جیئے

تھے شہر میں اے پری جتنے سیانے — سب ہو گئے ہیں شور تر اس کے دوانے
اے رشکِ پری

کب کب مری عزت کے لئے ہو ٹک پاس — آئے بھی جو ہو تو مجھے مجلس سے اٹھانے
آئے ہو

پایا ہے نہ ہم نے دلِ گم گشتہ کو اپنے — خاک اُسکی سرِ راہ کی کوئی کب تئیں چھانے
پائے

ہم جگر سوختہ کی جی میں جو آوے تو ابھی — درد دل ہو کے فلک تجھ میں سرایت کیجئے
ہم جگر سوختوں کے ہی

لطفِ قبائے تنگ پہ گل کا بجا ہے ناز — دیکھی نہیں ہے اون نے ترچھی پھیس رہی
تری چولی پھنس رہی

ہر گھڑی رنجش۔ ایسی باتوں میں — کوئی اخلاص و پیار رہتا ہے

آج کل بے قرار ہم بھی ہیں — بیٹھ جا۔ چلتے ہار ہم بھی ہیں
چلنے ہار

مدعی کو شراب۔ ہم کو زہر — عافیت دوستدار ہم بھی ہیں
عاقبت

نوٹ:۔ عاقبت بمعنی آخر۔ آخر ہم بھی تو دوست ہیں دشمن نہیں ہیں۔

یہ جان اگر بید مولہ کہیں دیکھے — باقی ہے کسی موئے پریشاں کی نشانی
بید مولہ

صبر بھی کریئے بلا پر میر صاحب جی کبھو — جب نہ تب رونا ہے کڑھنا، یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے
ہی

آج تیری گلی سے ظالم میر — لہو میں شور بود آیا ہے
لوہو

جی میں تھا عرش پہ جا، دیئے تکیہ لیکن　　　بستر خاک ہی میں اب تو بچھایا ہم نے
کیجیے

بارے گل میں جا۔ مرغ چمن سے مل کر　　　خوبی گل کا مزہ خوب اڑایا ہم نے
بارے گل باغ میں، جا

بے کلی سے دل بیتاب کی مر گزرے تھے　　　سو تہ خاک بھی آرام اٹھایا ہم نے
نہ پایا

عرصہ ہے تنگ چال نکلتی نہیں ہے اور　　　جو چال پڑتی ہے سو وہ بازی بات کی
بازی ہے مات کی

کھلکتا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　　اس کی آنکھوں کی نیمخوابی سے
کھلنا

کام تھے عشق میں بہت پر میر　　　ہم ہیں فارغ ہوئے شتابی سے
ہمیں

(دیوان دوم)

ہر ذی حیات کا تو سبب ہے جو حیات کا　　　نکلے ہے جی ہی اس کے لئے کائنات کا
جو

اشجار خامہ ہو دیں خامہ و آب سیہ بحار　　　لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اس کی صفات کا
اشجار خامہ ہو دیں۔ سیاہی ہوں سب بحار

میں مردماں کو آنکھیں دیا ہے خدا نے سے　　　سرمہ کریں ہیں وہ کے تری خاک دھول کا
جن　　　در کی تیرے

برسوں سے مری اس کی ہی رہتی ہے صحبت　　　تیغ اس کو اٹھانا تو سر مجھکو جھکا جانا
رہتی ہے یہی صحبت

اس آفتاب بن مجھے کچھ سوجھتا نہیں　　　گریے ہی اپنے دن ہیں تو ایک شب سے کیا
یہ ہی　تاریک

قصہ تو مختصر تھا ولے طول کو کھچا　　　اعجاز دل کے شوق سے اطناب سا ہوا
ایجاز

چل باغ میں بھی سوتے سے اٹھکر کبھو کہ گل　　　ٹک ٹک کے راہ دیدۂ بیخواب سا ہوا
تک تک کے راہ

طرفہ آتش خیز سنگستاں ہے دل　　　متبس یاں سے ہے شعلہ طور کا
مقتبس

بلا سے اسکی آنکھ جو پڑتی ہے دس جاگہ　　　ہمارا حال تو مدِ نظر نہیں رکھتا
جو پڑتی ہے آنکھ

یہ چہرہ دیکھ بیلتس کے رُخ زرد پہ میرے — کہتا ہے میر رنگ تو اب کچھ نکھر چلا
دیکھو

وہ دل کہ تیرے ہوتے رہے تھے بھرا بھرا — اب اُس کو دیکھیے تو ہے اِک گھر خراب سا
رہے تھا

سر ہی چڑھا رہے ہے ہر اک بادہ خوار کے — ہے شیخ شہر یا کوئی جن ہے چڑھا ہوا
پڑھا ہوا

اُس کام و جان و دل سے جو کوئی جدا ہوا — دیکھا پھر ہم نے خاک میں اُس کو ملا ہوا
اس کام جان و دل سے — دیکھا پھر اُس کو خاک میں ہم نے

اِس قدر آنکھیں چھپاتا ہے تو اے مغرور کیا — ٹک نظر ادھر نہیں کہ اس سے ہے منظور کیا
ٹک نظر ایدھر۔ نہیں کہ

نوٹ:۔ ذرا ادھر بھی نظر کر اور نہیں تو یہ کہہ تجھے کیا منظور ہے۔

وصل و ہجراں سے نہیں ہے عشق میں کچھ گفتگو — لال دلکی چاہیئے ہے یاں قریب و دُور کیا
لاگ دل کی

دیکھ بہتے آنکھ میری ہنس کے بولا کل وہ شوخ — یہ نہیں ابتک ہوا منھ کا ترے ناسُور کیا
یہ نہیں ابتک ہوا

نوٹ:۔ یہ نہیں ہوا یعنی اچھا نہیں ہوا۔

یاہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم — کہنے کو اختیار ہے پر اختیار کیا
بلتے ہیں

میرے مُردے سے بھی وہ چونکے ہے — اب تلک مجھ میں جان ہے گویا
چونکے ہے

چاہیئے جیتے گزرے اُس کا نام — منھ میں جبتک زبان ہے گویا
جیتے

پھر آج یہ کہ آئی کل شب یہ رہ گئی ہے — سوتا نہ رہتا ٹک تو قصہ ہی مختصر تھا
پھر آج کی کہانی

کیفی ہو کیوں تو ناز سے پھر گرم رہ ہوا — برسوں سے صوفیوں کا مصلیٰ تر نہ ہوا
گرم رہ — نہ تہ ہوا

نوٹ:۔ کیفی ہو یعنی مست ہو کر ناز سے چلنے لگا۔

کہتے ہیں ضائع کیا اپنے تئیں — میر تو رونا تھا یہ کیا کر گیا
دانا

ہر خستہ مرا خواہاں یک زخمِ دگر تھا — کی مشقِ ستم تو نے پر خون نہ کر آیا

ترا — زخمِ دگر کا تھا

بالفعل تو ہے قاصد محو اُس خط و گیسو کا — ٹک جیتے تو ہم پوچھیں کیا بیخبر آیا

لے کے خبر آیا

نوٹ :- ٹک جیتے یعنی ذرا حواس میں آئے تو پوچھیں کیا خبر لایا۔

صنعت گریاں ہم نے کیں سیکڑوں یاں لیکن — جیسے کبھو وہ ملتا ایسا نہ ہُنر آیا

جس سے

چمن میں جا کے جو میں گرم صف بار رہا — گل اشتیاق سے تیرے گلے کا ہار رہا

گرم وصفِ یار رہا — میرے

بہت دنوں سے درونی میں اضطراب سا تھا — جگر تمام ہوا خون تپ فرار رہا

درونہ — تپ قرار ہوا

نوٹ :- درونہ بمعنی دل

شکیب میر جو کرتا تو وقر رہ جاتا — اُدھر کو جا کے عبث یہ جیب خوار ہوا

یہ غریب

ایک دل کو ہزار داغ لگا — اندرونی میں جیسے باغ لگا

اندرونہ

خونی کمینچہ بند خوباں کے — خوب بادھونگا گرہ دباغ لگا

خوب کمینچوں گا — باندھوں گا — دماغ

ہم نہ جانا اختلاط اُس طفل بازیکو شکار — گرم بازی آگیا تو ہم کو بھی بہلا گیا

طفل بازی کوش کا

ہو گئے تحلیل سب اعضا مرے پا کر گذار — رفتہ رفتہ ہجر کا اندوہ مجھکو کھا گیا

گداز

جور و ستم اُٹھاتے ہی اُسکے پڑینگے شیخ — مسجد میں گر وہ عاشق بیدرد آگیا

اُٹھانے ہی — بانیِ بیداد

کہہ وہ شکستہ پا بہمہ حسرت نہ کیونکے جائے — جو نہ ایک دن تیری گلی میں چلا پھرا

کیونکہ — جو ایک دن نہ تیری

آنسو گرا نہ رازِ محبت کا پاس کر

میں جب سے ابر برسوں تئیں دل بھر پھرا

جیسے — دل بھرا پھرا

شاعر

(مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ بی اے۔ ایل ایل۔ بی شاہجہاں پور)

ازل سے ہے فطرت مری عاشقانہ پیامِ محبت ہے میرا فسانہ
مرے جام میں وہ مئے آتشیں ہے تصدق ہے جس پر شرابِ مغانہ
لبِ آبِ کوثر کبھی پی تھی میں نے وہی میرے سر میں ہے کیفِ شبانہ
نگاہِ حقارت سے مجھ کو نہ دیکھو کہ میں درحقیقت ہوں فخرِ زمانہ
صدائے ملائک ہے آواز میری سرودِ بہشتی ہے میرا ترانہ
مَیں وہ بلبلِ خوشنوائے چمن ہوں کبھی جس کا طوبیٰ پہ تھا آشیانہ
قلمرو میں داخل مری لامکاں ہے
فلک سے بھی اُونچا مرا آستاں ہے

سخن میرا صافی ہے مشرب ہے عالی کہ سینہ ہے میرا کدورت سے خالی
دکھاتا ہوں میں حسنِ معنی کے جلوے نہ سمجھو کہ دنیا ہے میری خیالی
عدم کے کوئی مجھ سے اسرار پوچھے کہ بستی ہے وہ بھی مری دیکھی بھالی
بہت غمزدہ پہلے رہتی تھی دنیا سمجھتی تھی مَیں ہوں فنا ہونیوالی
نہ یہ چہچہے تھے عنادل کے لب پر نہ گلزار میں تھی یہ رنگیں جمالی
دیا جب پیامِ بقا مَیں نے آکر تو ہستی کے چہرے پہ آئی بحالی
جہاں سر جھکائے مرے آستاں پر
کہ احسان میرا ہے سارے جہاں پر

نہ اورنگ و افسر نہ زر بخشتا ہوں زمانہ کو ذوقِ نظر بخشتا ہوں
جو محروم ہیں دولتِ رنج و غم سے اُنھیں آنسوؤں کے گہر بخشتا ہوں
گدازِ محبت کی خواہش ہے جن کو اُنھیں داغہائے جگر بخشتا ہوں
ستارے بھی اُمیدوارِ کرم ہیں کہ ذرّوں کو تابِ قمر بخشتا ہوں

مجھے پیار کرتے ہیں مظلوم و بیکس　　کہ آہوں کو ان کی اثر بخشتا ہوں
مرے در پہ حاضر ہوں شیخ و برہمن　　کہ میں عشق نوعِ بشر بخشتا ہوں

ازل سے محبت کا ہے پاس مجھکو
غریبوں کے غم کا ہے احساس مجھکو

جو کہتے نہیں ہیں کچھ اپنی زباں سے　　میں واقف ہوں ان کے بھی دردِ نہاں سے
نہیں ہے جنھیں رخصتِ آہ و زاری　　فغاں کر رہے ہیں وہ میری زباں سے
فرشتو! یہ خلاقِ عالم سے کہہ دو　　مجھے اُنس ہے خستگانِ جہاں سے
مرے دل کو ازبر ہے اُن کی کہانی　　کہ ہے ملتی جلتی مری داستاں سے
نصیبوں کو اپنے دُعا دے رہا ہوں　　کہ ناشاد ہوں گردشِ آسماں سے
کچھ ایسے بھی ہیں داغ میرے جگر پہ　　جو خوشتر ہیں گلہائے باغِ جناں سے

ملی ہے مجھے ہستیِ غیر فانی
کہ دل میں ہے پنہاں غمِ جاودانی

جہاں جب تلک ہے میں گاتا رہونگا　　بہشتی ترانے سناتا رہوں گا
حقیقت کے چہرے سے پردہ اُٹھا کر　　حقیقت کا جلوہ دکھاتا رہوں گا
کدورت گہِ عالمِ آب و گِل میں　　شرابِ محبت پلاتا رہوں گا
غریبوں کی مجبوری و بیکسی پر　　لہو چشمِ تر سے بہاتا رہوں گا
رہے گا نہ یہ قصرِ سرمایہ داری　　کہ بنیاد اس کی ہلاتا رہوں گا
زمانہ کی حالت نہ بدلے گی جب تک　　میں روتا رہوں گا رُلاتا رہوں گا

کوئی حد بھی ہوتی ہے ضبطِ فغاں کی
ضرورت ہے اب انقلابِ جہاں کی

آنکھوں سے خونِ دل کے دریا بہا دیے ہیں　　پھر بھی ہے نامکمل شرحِ غمِ نہانی
دونوں طرف کشاکش دونوں کھنچے کھنچے سے　　ان کو بھی کچھ شکایت مجھکو بھی بدگمانی
کیا پھر وہی فسانہ دوہرائے گا زمانہ؟　　کیوں یاد آ رہی ہے بیتی ہوئی کہانی
اے عشق اس حجابِ آخر کو بھی اُٹھا دے　　اب میری زندگی ہی پردہ ہے درمیانی

مرزا غالب کی بے اعتدالیاں

(از مسٹر اقبال انصاری، ایم۔ اے)

تذکروں کے مطالعہ کے بعد ہندوستانی شعراء مثلاً فیضی، بیدل۔ خان آرزو۔ قتیل۔ واقف۔ فاخر مکین مظہر وغیرہ ہندوستانی شاعروں کے کمال فن پر ہم فخر کرتے ہیں لیکن جب ہم عود ہندی میں ان کے متعلق مرزا غالب کے خیالات پڑھتے ہیں تو ہمارا حوصلہ بڑی حد تک پست ہو جاتا ہے، خان آرزو ہی کے متعلق ایک طرف سرو آزاد، خزانۂ عامرہ، عقد ثریا، چمنستان الشعراء۔ ریاض الشعراء سفینۂ خوشگوار اور مجمع النفائس رکھیے اور دوسری طرف غالب کی اس عبارت کو ملاحظہ فرمائیے "وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے"۔ اس جملہ کے وزن نے اگرچہ تحقیق کی روشنی میں اُن کی ادبی عظمت کو نہیں گھٹایا ہے، پھر بھی ایک فاضل مصنف کی زبان سے نکلنے کی وجہ سے اُسے بہت کچھ سُبک ضرور کر دیا ہے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ خان آرزو بے مایہ ہیں، فارسی دانی سے نابلد ہیں، تحقیق میں غلطیاں کی ہیں، تو بھی اُن کے لئے یہی شرف کیا کم ہے، وہ فاضل جید تھے، اردو فارسی عربی میں شاعری کرتے تھے، صاحب تصنیفات تھے اور فارسی دانی میں شیخ علی حزیں، والہ داغستانی اور قزلباش خاں اُمید سے ٹکر لیتے تھے۔ سات دیوان اساتذۂ ایران مثلاً بابا فغانی، شفیعائے اثر کمال خجندی وغیرہ کے جواب میں کہے، ساقی نامہ و مثنویاں حکیم سنائی، ملا نوعی، زلالی خوانساری اور ظہوری ترشیزی کے جواب میں لکھیں، ایران اردو کا ایک بھی ایسا شاعر نہ پیدا کر سکا جو یہاں کے کسی شاعر کا ہم رتبہ کہا جا سکتا۔ مرزا مغز فطرت اور قزلباش خاں اُمید ضرور ریختہ کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اس میں جو اظہار کمال کیا ہے وہ یہ ہے، فطرت:۔

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے — در گلشن آئینہ گتا جوم پڑی ہے

قزلباش خاں اُمید:۔

در و دیوار سے اب صحبت ہے — یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں — الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں

انیسؔ کے اشعار فطرت کے مقابلہ میں زیادہ صاف و سلیس ہیں، لیکن یہ اُردو کا وہ زمانہ تھا جبکہ یہ اپنے شباب پر پہونچ چکی تھی۔ سوداؔ و میرتقیؔ کے اشعار کے سامنے ان کی کیا حقیقت ہے۔ ایرانیوں کی کاوشوں نے یہ چند شعر پیش کئے اور ادھر فیضیؔ، غلام علی آزادؔ۔ بیدلؔ و خان آرزوؔ کے ضخیم دیوان دیکھیے اور فیصلہ کیجئے کہ شعرائے ایران قابلِ مدح و ستایش ہیں یا شعرائے ہندوستان۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ میں اُردو کا اسکالر نہیں اور نہ غالبؔ سے بغض وعناد رکھتا ہوں، غالبؔ کا معتقد ہوں، اُن کے کمالِ فن کا معترف ہوں، اُن کی عزت اُسی طرح کرتا ہوں جیسے باسویل، ڈاکٹر جانسن کی کرتا تھا۔ مگر جہاں باسویل نے ڈاکٹر جانسن کو Monarch of Literature (تاجدارادب) کہا ہے۔ وہاں اُن معمولی معمولی واقعات اور غلطیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اس ادیب سے وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں، اور یہ سب اس لئے کہ جانسن کی پُوری تصویر ہمارے سامنے آجائے۔ آیئے اسی نظریہ کے ماتحت ہم بھی غالبؔ کا مطالعہ کریں۔ یہاں پر ہم غالبؔ کے چند خطوط پیش کرتے ہیں۔ جن سے اُن کے تنقید کا نظریہ اور بے اعتدالیوں کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

"فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبع کلام اہلِ زبان لیکن: قتیلؔ و واقفؔ و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ اُن کو موزونی طبع کیئے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ و عامیانہ جو اطفال دبستاں جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں صرف کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ جب رُودکی و عنصری و خاقانی ورشید وطواط اور اُن کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور اُن کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہونچے اور ذہن آٹو جاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔"

اِن سطروں میں تکمیل فارسی کے لئے ۲ دو چیزیں ضروری قرار دی گئی ہیں، تتبع اہلِ زبان و مناسبت طبیعت اور آگے چل کر قتیلؔ وغیرہ کی "موزونی طبع" کو مان بھی لیا، تو اب مناسبت طبیعت کی بحث بہت کچھ کم ہو گئی۔ غالباً مرزا صاحب کا خیال مناسبت طبیعت سے فطری ذوق ہو اور یہ بھی واقفؔ و قتیلؔ کے لئے مسلّم ہے۔ واقفؔ کے متعلق تو یہاں تک ایرانی کہا کرتے تھے "زاغ ہند زبانِ طوطی از کجا یاد گرفت" اب تتبع اہلِ زبان باقی رہ گیا تو اس کے متعلق بھی تذکرے بتاتے ہیں

قتیل و واقف نے نہایت اہتمام کے ساتھ حصول زبان کی طرف توجہ کی۔ قتیل اٹھارہ برس کے سن سے محمد باقر شہید اصفہانی کی زیر نگرانی و تربیت رہے اور شہید ہی نے مرزا صاحب کے لئے قتیل تخلص پسند کیا۔ (عقد ثریا)

واقف کے تتبع کے متعلق سفینۂ ہندی قلمی پٹنہ لائبریری کا جائزہ لیجئے اور اس میں خود ان کی شہادت سُنئے کہ ابتدا میں وہ خوشگو اور آفریں لاہوری سے اصلاح لیتے تھے لیکن اُن کی اصلاحیں واقف کو پسند نہیں تھیں، لہذا انھوں نے دیوانِ سعدی و خسرو کو سامنے رکھکر مشق سخن شروع کی۔ سعدی تو مسلّمات میں سے ہیں اب رہ گئے امیر خسرو تو ان کی زباندانی، اہلیت و عظمت کے خود مرزا غالب معترف ہیں اور فرماتے ہیں :-

"خسرو کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی وہم طرح سعدی شیرازی ہے۔"

جہاں تک اُصول تنقید کا تعلق تھا مرزا صاحب کے معیار پر قتیل و واقف پورے اُترتے ہیں اس پر بھی وہ تمام ہندوستانی شعراء کو ہیچ و پوچ بتاتے ہیں۔ اگر ہندوستانی شاعر ایسے ہی جاہل تھے تو جمال اینجو شیرازی اور سروری کاشی ان کے اشعار سند میں نہ پیش کرتے۔ قتیل و واقف نے تو تتبع کیا اور مرزا صاحب نے موردِ الزام ٹھہرایا۔ اگر یہ فارسی الفاظ میں تصرف بھی کرتے تو بجا تھا اس لئے کہ ایرانیوں نے بیسیوں عربی اور ہندی الفاظ پر تصرف کیا ہے لہذا "تصرف صاحب قدرتانِ ہند در فارسی چرا جائز نباشد" (شمر) اور قتیل و واقف کے صاحب قدرت و قادر الکلام ہونے میں کوئی شک ہی نہیں رود کی، عنصری و خاقانی و طواط کی مثال تو مرزا صاحب نے دی لیکن شہادت و توضیح سے یکقلم گریز کیا ہے۔ اس کو تعصب کے سوائے اور کیا سمجھا جائے۔ ایک ہی موقعہ نہیں ہے۔ غالب کے اکثر و بیشتر خطوط سے اسی رویّہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک ادبی ڈکٹیٹر کی طرح فوراً فیصلہ دیدیتے ہیں اور شہادت و صراحت سے ہمیشہ اغماض کرتے ہیں۔ وارستہ و خان آرزو ہی کا معاملہ لے لیجئے کہ اُس نے خان آرزو کا نام احترام سے لیا ہے۔ حاکم لاہوری کی غزلوں پر خان موصوف نے جو اعتراضات کئے تھے اُن کا جواب دیا ہے اور بہت سے اعتراضات کو صحیح بھی تسلیم کیا ہے۔ آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں دو تین شعر پیش کئے ہیں جن میں اُنھوں نے بھی خان آرزو کے بعض اعتراضات کو صحیح مانا ہے مصطلحات میں بھی وارستہ نے خان آرزو پر کافی اعتراضات کئے ہیں لیکن اس کے بھی اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ وہ ہندیوں کا کلام سندی نہیں سمجھتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ شیخ علی حزیں کے سلک ارادت میں داخل ہو چکا تھا۔ باینہمہ اپنے قول کی تصدیق میں اُس نے وہی اشعار پیش کئے ہیں جو خان آرزو نے چراغ ہدایت میں دیئے تھے

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ وارستہ کا تمامی زندگی کا کارنامہ اور بنائے شہرت یہی مصطلحات ہے اور خان آرزو کی ذات مختلف علوم و فنون میں اس سے کئی گنا زیادہ ہے اور کئی گنا بے مثل اُن کی تصنیفات ہیں۔ وارستہ نے خان آرزو پر اعتراضات کر کے اپنے کو کامیاب بنایا مگر یہ بھی یاد رہے کہ اس کام کے لئے اس نے خان آرزو ہی کی ذات کو منتخب کیا۔ اگر سراج اللغت و چراغ ہدایت نہ لکھی گئی ہوتیں تو غالباً آج وارستہ کے مصطلحات کا وجود بھی نہ ہوتا۔ اور جس فن کے خان آرزو مخترع ہوئے اس کا یہ مکمل اور یوں بھی اصل و نقل کا جو فرق ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تمام اعتراضات صحیح نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے غلط بھی ہیں۔ اب مرزا غالب کا یہ کہنا کہ سیکڑوں اعتراضات ہیں اور ہر اعتراض بجا ہے بالکل قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں استدلال سے کوئی واسطہ نہیں رکھا گیا ہے پھر وارستہ کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے منہ کی کھاتا ہے" مرزا صاحب اگر اُن مقامات کو پیش کرتے جہاں اُسکو منہ کی کھانی پڑی تو سمجھ میں بھی آتا۔ اس کے علاوہ اپنے متقدم کے لئے یہ لہجہ اختیار کرنا بہت رکیک معلوم ہوتا ہے۔

حضرت صاحب عالم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے مرزا صاحب لکھتے ہیں:-

....اب ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دیوانی سنگھ تم متخلص بہ قتیل جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے اُس کی تصدیق نہ کر دے تب تک اس کا کلام قابل استناد نہو۔ قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں۔ اس کے علم فارسی کا ماخذ اُن لوگوں کی تقریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ آتے اور ہنگامہ آرا ہوتے بیشتر ان میں کشمیری یا کابلی و قندھاری تھے اور اگر احیاناً کوئی عامۂ اہل ایران سے بھی ہو تو تقریر اور ہے اور تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ بقراط اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر و حید نثریں کیوں خون جگر کھایا کرتے۔ وہ سب طرح کی نثریں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہیں نہ رقم فرمایا کرتے.... میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں تب معلوم ہوگا کہ یہ کتنا لغو گو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے"

مرزا غالب کسی بات کے لئے جو کلیہ قائم کرتے ہیں اُس پر ثابت قدم نہیں رہتے۔ عود ہندی ہی میں ایک جگہ پر عرفی و ابوالفضل کے مباحثہ میں عرفی کی فتح تسلیم کرتے ہیں، اور یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اُس نے جب سے ہوش سنبھالا، گھر کے بڈھوں بوڑھیوں سے فارسی سنی۔ یہاں پر شنی ہو

تقریر زباں دانی کے لئے لازمی قرار دی گئی، اور پھر سطور بالا میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ تحریر اعدہے اور تقریر ادرہے۔ یہ کلیہ بھی بالکل صحیح نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ خسرو و فیضی و سرخوش اہل ایران کی تحریروں ہی کا نتیجہ ہیں۔ خان آرزو اپنی کتاب مثمر میں مرکب الفاظ کی بحث میں اہل زبان سے جو غلطیاں ہوتی ہیں، اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"چوں مرکبات را مقامہائے خاص باشد و عوام را بر نکات ایں اطلاع نبود بعضے از فضلائے ہند یکے از شعرائے ایران گفتہ کہ ملائے شما فارسی را از پیرزالہائے خود آموختہ اند و ما از فصحائے شما مثل خاقانی و انوری و مراد فاضل مذکور ہمیں مرکبات است کہ در مقامہائے مختلف گونہ گوں آمدہ و عوام اسرار آں ندانند و اننددیس تربیت کردۂ خواص بہتر از تربیت کردۂ عوام"

اب رہ گئی یہ بحث کہ قتیل پر غیر زباں دانوں نے اثر ڈالا تو یہ بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ باقر شہید اصفہانی کی تربیت موجود ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مرزا جیسے باکمال شاعر نے کیونکر ایسا غیر منصفانہ تبصرہ کیا ہم جانتے ہیں کہ مرزا صاحب کے اعتراضات وتبصرے اُن کے دل کا غبار اور مخالفین کی ہنگامہ آرائیوں کا نتیجہ ہیں اور ایسی صورت میں قتیل پر اعتراضات کر کے وہ اپنے دل کو تسکین دے سکتے تھے۔ لیکن ہمیں اُن کے یہاں کچھ اور ملتا ہے جو مرزا ایسے مہذب انسان کے لئے کسی طرح بھی شایانِ شان نہیں۔ خیر اگر قتیل کو اُنھوں نے گالیاں دیں تو اُن کی آڑ لیکر تمام ہندوستانی ادب و شعر کو کیوں معرض تلف میں ڈال دیا۔ غیاث الدین۔ عبدالواسع ہانسوی و واقف وغیرہ کے متعلق کیوں اس قدر نا ملائم الفاظ لکھے۔ یہ تو اُن کے ہمعصر بھی نہیں تھے کہ ان کی ہرزہ سرائیوں کو معاصرانہ رقابت کا نتیجہ کہہ کر نظرانداز کر دیا جائے معاصرین کے ساتھ رشک و رقابت کے واقعات سے شعراء و علما سب کے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ اور آخر میں یہ بات بھی رہ جاتی ہے کہ آپ کو گالی دینے کا حق ہی کیا ہے۔ تنقید کا کوئی معیار گالیوں کو جائز نہیں رکھ سکتا۔ اس کے علاوہ غالب سے قبل کی صدیاں اس چیز کی متحمل نہیں تھیں کہ ہم اسے سوسائٹی کا نتیجہ کہہ دیں۔ اٹھارھویں صدی کو لیجئے، اس میں وارستہ و خان آرزو سے معرکے ہوئے۔ آزاد و خان آرزو ایک دوسرے پر اعتراضات کرتے تھے اور سب کچھ ہوتا تھا لیکن دامن تہذیب کو ہاتھ سے کہیں بھی جانے نہیں دیا گیا ہے۔ اور ہم کو اُن کی تحریروں میں آج بھی ایک لفظ ایسا نہیں ملتا ہے جو مرزا صاحب کے ارشادات کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔ شیخ علی حزیں کی ایک ذات ضرور ملتی ہے جن سے خان آرزو کے تعلقات بہت کچھ کشیدہ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ بھی مرزا صاحب ہی جیسے تھے۔

اور انھوں نے بھی خان آرزو کو بہانہ بنا کر تمامی ہندوستان کی ہجو کر ڈالی اور خود شعرا کو صلواتیں سنائیں ۔ لیکن آپ خان موصوف کا تمام کلام دیکھ ڈالئے، ایک لفظ بھی علی حزیں کی شان کے خلاف نہ ملے گا۔ کوشش سے بھی آپ کو شیخ کے متعلق اس سے زیادہ سخت الفاظ نہ ملیں گے کہ "شاعر روستائی ایران" کہا گیا ہو۔ جہاں ادب وتہذیب کا یہ لحاظ رکھا گیا ہو وہاں قتیل کے متعلق کھتری بچہ "اُلّو کا پٹھا" عبدالواسع کے لئے "گھاگس اُلّو" اور غیاث الدین کے لئے "معلم فرومایہ" وغیرہ کے معزز القاب سننا کون پسند کرے گا؟

یقیناً کسی شخص کی ادبی زندگی اس کے اخلاق سے بالکل علٰحدہ چیز نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ غالب کے اخلاق اپنے بیوی، بھائی کے ساتھ عمدہ رہے جس کا ثبوت اُردوے معلیٰ میں موجود ہے لیکن معاصرین وغیر معاصرین وہندوستانی شعراء کے تذکرے میں اخلاق وہمہ دانی کے دعوے نے اُن کی شہرت وادبیت کے پلّہ کو بہت ہلکا کر دیا ہے ۔ اور ہم یہ دیکھکر گھبراتے ہیں کہ انھوں نے اپنی اس ذہنیت سے ہندوستانی ادب کو کس حد تک نقصان پہونچایا ہے۔ ہم کو مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ غالب جہاں اپنی شاعرانہ نکتہ سنجیوں کے باعث احترام کا مستحق ہے، وہاں اپنے نامناسب رایوں کی وجہ سے حد درجہ قابل الزام بھی ہے۔ اس قسم کی بے اعتدالیاں آپ کو غالب کے یہاں اکثر ملتی ہیں، جو کبھی تنقید کے غلط اصول اور کبھی گالی کے بھیس میں ہیں۔ بہرحال ہم تو یہی کہیں گے کہ اگر مرزا صاحب خود بینی وخود پرستی کو دُور کر سکتے تو آج تنقید کے وہ شاہکار ہمارے سامنے ہوتے جس کی دنیا میں نظیر نہ ملتی ۔ لیکن افسوس ہے غالب جذبات کے سیلاب میں بہہ کر خدا معلوم کہاں سے کہاں چلے گئے ۔ آخر میں ہم عرفی کے چند اشعار پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں، جن کو اُس نے غالباً ایسے ہی حضرات کے لئے کہے ہیں :-

بچشم مسلحت بنگر مصاف نظم ہستی را | کہ ہر خارے دراں وادی ورفش کاویان بینی
زگرد رغبت خاطر فرو شو دیدۂ فطرت | اگر خواہی کہ حسن خار وگل یک یک عیاں بینی
تو سرتا دیدۂ بر شعلۂ تابی بہ خاکستر | ببینی حسن خاکستر چو در روشنگراں بینی
تو از ملک عراقی واز گوں کن عادت پیشیں | اگر خواہی کہ حسن رونق ہندوستاں بینی

التماس کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے حلقۂ احباب میں زمانہ کی توسیع اشاعت کی کوشش فرمائیں اگر آپ زمانہ کی ادبی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اپنے علم دوست احباب سے اسکی خریداری کی سفارش میں کیوں پس وپیش کرتے ہیں؟

منیجر زمانہ

اعترافِ کفر

(از منشی تلوک چند محروم، بی۔ اے)

ششدرِ جلوۂ نیرنگیِ یزداں ہوں میں   چمنِ وحدتِ باری کا غزلخواں ہوں میں
بلکہ حیرانِ بتِ آئینہ ساماں ہوں میں   کافرِ دیر نشیں نزدِ مسلماں ہوں میں
یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں

بت نیا کار مرا، دہر صنم خانہ مرا   دل رہا حسرتیِ جلوۂ جانانہ مرا
لا دوا درد کی روداد ہے افسانہ مرا   زندگی درد ہے اور طالبِ درماں ہوں میں
یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں!

ذرے ذرے سے عیاں پرتوِ انوار اُس کا   پھر بھی ممکن نہیں اے وائے کہ دیدار اُس کا
خالقِ پاک وہ ہے، میں ہوں پرستار اُس کا   اُس کے الطاف کا شرمندۂ احساں ہوں میں
یہ اگر کُفر ہے؟ اِس کُفر پہ نازاں ہوں میں!

گرچہ روپوش عناصر میں ہے معبود مرا   گنگ ہے اور نہ بتِ سنگ ہے مسجود مرا
منزلِ عرش سے بھی دُور ہے مقصود مرا   جانبِ منزلِ مقصود شتاباں ہوں میں
یہ اگر کفر ہے؟ اِس کُفر پہ نازاں ہوں میں!

زیرِ محراب جو ہوتا ہے کبھی عشوہ فروش   شیخ کہتا ہے مجھے کافرِ زُنّار بدوش
میں ہوں خاموش کہ بے صرفہ ہے یہ جوش و خروش   خاطر آزردہ ہوں اس سے، نہ پریشاں ہوں میں
یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں؟

قائل اعمال کے آئینِ مسلّم کا ہوں   اپنے افعال سے ڈرتا ہوں اگر ڈرتا ہوں
عملِ خیر کی توفیق کا میں جویا ہوں   ہوں خطاکار، گناہوں پہ پشیماں ہوں میں
یہ اگر کُفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں

آرزو ہے کہ دل و دست و زباں سے میرے   کسی جاندار کو آزار نہ ہرگز پہونچے
نظر آتی ہے رضا حق کی اہنسا میں مجھے   جس کو آزار سے نفرت ہے وہ اِنساں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں!

کہیں صورت جو قفس کی نظر آتی ہے مجھے
بیکسی بلبلِ نالاں کی رُلاتی ہے مجھے
خونِ پروانہ کی بُو شمع سے آتی ہے مجھے
اس لئے گرمیِ محفل سے گُریزاں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں!

برہمن سے ہے عبث شیخ حرم کا جھگڑا
جو حقیقت پہ نظر ہو تو ہے بیجا جھگڑا
دم بخود سُن کے ہوں دونوں کا پُرانا جھگڑا
کہ دبستانِ خموشی کا سخنداں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اس کفر پہ نازاں ہوں میں!

مجازِ حقیقت

(جناب مائل نقوی، سکریٹری انجمن ترقی ادب بھوپال)

کون ہے رازِ دارِ خلوتِ راز
سب ہیں پردے حقیقت اور مجاز

کردیا دل کو وقفِ سوز و گداز
مرحبا عشق اے غریب نواز

اُن کے قدموں پہ ہے جبینِ نیاز
کوئی دیکھے نیازمند کے ناز

ہیں تصوّر سے اُن کے راز و نیاز
اے شبِ ہجر تیری عمر دراز

اللہ اللہ یہ لطافتِ عشق
درد بھی اب نہیں ہے محرمِ راز

کوئی ہمدم نہیں شبِ فرقت
اِک غمِ یار ہے مگر دمساز

جب چمن میں کلی چٹکتی ہے
صاف آتی ہے آپ کی آواز

میری غم کوشیوں کو کیا جانیں
ساکنانِ حریمِ نعمت و ناز

پھر ہے محبوب کیوں ہلالِ عید
اُن کے ابرو کے گر نہیں انداز

بیخود از چلا ہوں اُن کی طرف
سازِ دل پر ہیں نغمہ ہائے حجاز

عشق و دیوانگیِ ذوقِ جمال
حسن مستور راز اندر راز

مائل خستہ اور یہ جوشِ کلام
حضرتِ عشق کے ہیں سب اعجاز

تنقیدِ حیات کی کوشش

(۳)

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ایم۔ اے)

(۵۱) سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں   دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

ایک دن اپریل کی خوشگوار اور خنک آمیز گرمی کی رات میں کسی نامعلوم جذبہ کی رَو میں بستر آرام چھوڑ کر ٹہلنے لگا۔ معاً ایسی بے اختیار بے چینی پیدا ہوئی کہ دیوار سے سر ٹکرانے کو جی چاہنے لگا نہ جانے کس عالم میں تھا کہ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی اچانک پیدا ہوا کہ کہیں میرے سر ٹکرانے سے درو دیوار کو چوٹ نہ لگ جائے۔ بیدلؔ نے بھی اس پتھر کو جس سے اُسے سخت ٹھیس لگی تھی نرمی اور نزاکت کا خواب بنایا تھا۔ اور غالبؔ نے بے ستون کو خواب شیریں لکھا ہے۔ لیکن بیدلؔ اور غالبؔ کے اشعار کی طرف میری توجہ میرے فاضل دوست مجنوںؔ گورکھپوری نے اس وقت دلائی جب میں اپنا شعر کہہ چکا تھا۔ میرا شعر جہاں تک سنگ و آہن کی نزاکت کا تعلق ہے بیدلؔ اور غالبؔ سے ملتا ہے لیکن دوسرے مصرع نے اس میں ایک نئی شان پیدا کر دی ہے۔ یہاں پر یہ عرض کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ بیدلؔ غالبؔ اور میرا مفہوم عقل اور واقعیت کے خلاف نہیں ہے۔ سنگ و آہن گلاب کی پنکھڑی نہ ہوں اور اپنی جگہ غم سے بھی بے نیاز ہوں۔ لیکن ان کی بھی ایک قدر اور اہمیت ہے اور ہر شئے کی طرف ہمارا رویہ مہذب ہونا چاہئیے۔ ہر شئے سے ہمیں اپنی حساس زندگی کی وحدت کا احساس ہونا چاہئیے۔ مادّے ہی کی لطافتوں سے ہماری رگیں اور ہمارا خون ہمارے دل و دماغ کی ساخت ہوئی ہے۔ عبرانی تصور یا حجازیت میں تثنیت (Dualism) کا عیب ہے اسی لئے اس تصور میں نہ نرمی ہے نہ گہرائی اور نہ حجازیت کے نام سے درسِ عمل میں کوئی معنویت۔

(۵۲) قید کیا رہائی کیا ہے ہمیں سے ہر عالم   رُک گئے تو زنداں ہے چل پڑے بیاباں ہے

(۵۳) خواب گاہ میں تیری ہم ہیں نیند کے جھونکے   اک سکونِ بے پایاں ہستیٔ پریشاں ہے

بقول اصغرؔ گونڈوی "جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے"۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کے لئے رُک جانا پیامِ اسیری ہے اور چل پڑنا پیامِ آزادی۔ لیکن اس چل پڑنے میں بہت سے عقائد اور محبوب روایتوں کو الوداع کہنا پڑتا ہے۔

دوسرے شعر میں عشقیہ انداز بیان کی چاشنی دے کر اس راز کی طرف اشارہ ہے کہ انسانیت کا درد رکھنے والوں کے دکھتے ہوئے بےچین دلوں اور اُن کے چین کی نیند نہ سو سکنے ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا سکھ کی نیند سوتی ہے۔ ان کی ہستی پریشان دنیا کے لئے اک سکونِ بے پایاں ہے۔

(۵۴) ہر ذرّے کو وحشت میں بیاباں نہ سمجھ لے ہر قطرے کو گھبرا کے سمندر نہ بنا دے

ہر ذرّہ اور ہر قطرہ کو لامحدود کہا جا سکتا ہے، لیکن کھوٹے کھرے کی پرکھ ضروری ہے۔ مذہب سیاست، سماجی نظام سب کو خیر و برکت کا لامحدود بیابان اور سمندر نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ عملی زندگی میں ردّ و قبول وفاداری اور غدّاری رفاقت اور مقابلہ سب کی ضرورت ہے۔ محض وجد کرنے سے کام نہیں چلتا۔ تخریب اور انقلاب بھی عملی زندگی کے اہم پہلو ہیں۔ نئی دنیا کی جولانگاہ مرتب کرنے میں ایسی وحشت اور گھبراہٹ نہ ہونی چاہیئے کہ ہم ہر ذرّے کو بیابان سمجھ لیں اور ہر قطرے کو سمندر مان لیں بہر حال اقرار کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں انکار کی بھی ضرورت ہے۔

(۵۵) غمِ حیات وہی دورِ کائنات وہی جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے

تقدیر پر بھروسہ کرنے والی یا راضی بہ رضا رہنے والی زندگی اور قانون و نظام (Law & order) والی زندگی، ہر حال میں اللہ کا شکر کرنے والی زندگی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کا غلط تصور رکھنے والی زندگی، تبدیلی اور انقلاب سے نفرت کرنے والی یا ڈرنے والی زندگی موت کے برابر ہے جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے۔

(۵۶) کر عہدِ گزشتہ کو شریکِ غمِ امروز خاکسترِ ماضی سے کچھ اُٹھتا ہے دھواں بھی

مجھے بسا اوقات اپنی موجودہ زندگی کی غمگینی کے احساس کے ساتھ ساتھ گذشتہ زندگی اور اُس کے دُکھ سُکھ بھی یاد آ لئے۔ اور یہ محسوس کر کے دل دُکھ سا گیا کہ اب میں اپنی عمر رفتہ سے بے تعلق ہو چکا ہوں۔ ماضی سے یہ بے تعلقی مجھے ایک نفسیاتی خود غرضی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ماضی بالکل مٹ جانے والی چیز نہیں ہے۔ "خاکسترِ ماضی سے کچھ اُٹھتا ہے دھواں بھی"

یہ شعر انھیں اثرات کے ماتحت موزوں ہوا ہے، اگرچہ جب سے ہوش سنبھالا غم ہی غم میں زندگی کٹی۔ اور آج بھی غم ہی کی زندگی ہے۔ لیکن حال کے غم میں اتنی محویت نہ ہونا چاہیئے کہ پُرانی حالت بھول جائے۔ اس لئے کم از کم عمر رفتہ کو جس کی خاکستر سے اب بھی دھواں اُٹھ رہا ہے غمِ امروز میں شریک کر لینا چاہیئے۔ سیاسی اور اجتماعی زندگی کو عہدِ گذشتہ کی تاریخ میں شریک کر لینا چاہیئے۔ ایسا کرنا رجعت پسندی نہیں بلکہ ترقی پسندی ہے۔ ورڈسورتھ کہتا ہے کہ میں

چاہتا ہوں کہ میری زندگی کے دن ایک فطری طہارت کے زیر اثر باہم منسلک رہیں۔

(۵۷) کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اُٹھتا ہے　　　بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

میں اپنے آپ کو غمگین پا کر اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جو لوگ خوشحال اور تندرست ہیں، بڑے عہدوں پر ہیں، جاہ و ثروت کے مالک ہیں، جن کی خانگی زندگی بھی ناکامیاب نہیں نظر آتی اور جو عشق کی جانکاہ آزمایشوں سے محفوظ ہیں، اور جن کی زندگی میں ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے وہ کتنے خوش اور بشاش ہوں گے۔ پچھلے پچیس برسوں سے بڑے غور سے ایسے لوگوں کے چہروں کا مطالعہ کرتا رہا۔ مگر مجھے تو ان کے چہروں پر ایک سُوناپن نظر آیا اور یہ بسا اوقات کھسیائے ہوئے سے دکھائی دیئے۔ کبھی کبھی ایک احمقانہ اطمینان بھی ان کے چہروں پر نظر آیا مگر وہ حقیقی خوشی نہ تھی رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا کہ غمگین نہ ہونا خوش ہونا نہیں ہے، جیسے زہر نہ کھانا اچھی اور صحت بخش غذا کھانے کے برابر نہیں ہے۔ ۱۹۳۹ء میں اسی مشاہدہ سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا گیا تھا، اسکے سال ڈیڑھ سال بعد یہ دو تین شعر ہوئے ہیں:۔

لئے رہیں وہ زمانے میں اپنی بے فکری　　　جو غم شناس نہیں وہ خوشی کو منہ نہ چڑھائیں
جو با فراغ ہیں کچھ پائیں زندگی کا مزا　　　رُکے نہ سانس مگر اُن کے دم بھی گھٹتے جائیں

جس پیکرِ نشاط کی رگ رگ دُکھی نہیں
اس کی خوشی کو غور سے دیکھو خوشی نہیں

میں نے ان لوگوں میں غم اور خوشی دونوں سے تڑپ جانے کی صلاحیت نہیں پائی۔ انگریزی فلسفی جان اسٹوارٹ مِل کا یہ مقولہ بھی ان اشعار کے کہتے وقت ذہن میں تھا کہ جس میں غمزدہ ہونے کی صلاحیت ہے اس میں خوش ہونے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے، مگر غور و فکر کی دوسری منزلوں پر جا کر میں نے یہ سمجھا کہ زندگی غم اور خوشی دونوں سے بالاتر ہے، لیکن اس مقام پر پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ غم اور خوشی کے جھگڑوں سے ایک بار بلکہ کئی بار زندگی کی بنیادیں ہل جائیں۔ مگر یہ بات صرف عشق سے حاصل ہوتی ہے۔ نشاط کا بار بھی محبت ہی کو اُٹھانا پڑتا ہے" بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہونگی"۔ رہا حُسن اُس کی حالت بھی سُن لیجئے:۔

کچھ گراں ہو چلا ہے بارِ نشاط　　　آج دُکھتے ہیں حُسن کے شانے

(۵۸) اشک سا دیدۂ انجم میں جھلک جاتا ہے　　　یہ بھی اک راز ہے انسان کی قسمت کی طرح

کسی روز جب رات زیادہ گزر گئی ہو، زمین سے آسمان تک سناٹا ہو کچھ دیر تک ستاروں

کو دیکھئے، وہ بھید جو بیان سے باہر ہے گر جو انسان کی قسمت میں چھپا ہوا ہے اُس کی کچھ جھلک وہاں دکھائی دیتی ہے۔

(۵۹) کھلیں گے رازِ جہاں مشتِ خاکِ آدم سے — اسی غبار میں اک کارواں بھی پنہاں ہے

موجوداتِ عالم میں غیر جاندار اور جاندار سب میں انسان ہی کی ہستی ایسی ہے جو خود بھی نئی ہوتی جا رہی ہے اور آفاق کو بھی نیا کرتی جا رہی ہے۔ صرف انسان کا وجود انقلاب پذیر ہے۔ دیگر موجودات بھی غیر شعوری طور پر انسان سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں، لیکن اصول ارتقا صحیح معنوں میں انسانی زندگی میں کارفرما ہے۔ انسان کی فطرت بدل رہی ہے اور اس تغیر کی کوئی حد و انتہا نہیں مشتِ خاکِ آدم میں جو کارواں پنہا ہے اُسی سے تمدن کے رنگارنگ مظاہرے ہوتے ہیں۔

(۶۰) خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ — کون پیمانہ ہے جو چور نہیں

اصغر گونڈوی فرماتے ہیں:۔

اگرچہ ساغرِ گل ہے تمام ترلے بود — چھلک رہی ہے چمن میں مگر شرابِ وجود

یہ شرابِ وجود وہ پگھلی ہوئی آگ ہے کہ مہر و ماہ کے پیمانے بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتے اور وہ بھی اس سے خستہ اور چور نظر آتے ہیں۔ شرابِ وجود ہمیشہ سے چھلک رہی ہے اور ہمیشہ چھلکتی جائے گی۔ لیکن یہ شراب پیمانہ گداز اور پیمانہ شکن ہے۔

(۶۱) شورشِ کائنات ہے خاموش — موت ہے زندگی کے دوش بدوش

موجودہ نظامِ عالم انقلاب سے دوچار ہو رہا ہے۔ تمام تجارتی اور سیاسی زور و شور اُس پُر اسرار سکوت کا پتہ دے رہا ہے جس کے بطن میں انقلاب تھرتھرا رہا ہے۔ سرمایہ داری اور ملوکیت کے تمدن کا یہ آخری دور ہے، جس کی شورش انگیز زندگی کے دوش بدوش اس تمدن کی موت بھی چپ چاپ چل رہی ہے۔ یہ سناٹا طوفان کے قبل کا سناٹا ہے۔

(۶۲) تیری تقدیر ترے ہاتھ میں ہے — شاملِ جبر اختیار بھی ہے

یہ شعر انفرادی زندگی کے لئے نہیں کہا گیا ہے، کیونکہ ہزارہا آدمیوں میں مشکل سے کوئی ایک اِس حالت میں ہوتا ہے کہ انفرادی حیثیت سے اپنی زندگی بدل سکے۔ مگر اجتماعی زندگی پر یہ شعر بخوبی صادق آتا ہے۔ دنیا بھر کے مزدور پیشہ اگرچہ نظام سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے رہے ہیں مگر انقلاب کر کے اپنی تقدیر بدل سکتے اور دنیا میں اشتراکی راج قائم کر سکتے ہیں۔

(۶۳) ہاتھ ملتی آ رہی ہے موت بھی زندگی سی زندگی تو نے نہ کی

موت زندگی کی دشمن سمجھی جاتی ہے، حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے، کیونکہ موت اور زندگی حقیقتاً ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ جس شخص کو جینا نہیں آیا اُس کی موت بھی خوشی سے نہیں بلکہ جبراً و قہراً ہاتھ ملتی ہوئی آتی ہے، "جیتے مُردوں سے موت کیا لپٹے"

(۶۴) کچھ پوچھ نہ اِس وقفۂ ہستی کی کشاکش کچھ ٹھہری ہوئی موت ہے کچھ عمرِ رواں بھی

یہ شعر ایک نازک احساس کے ماتحت کہا گیا ہے، کبھی کبھی وقفۂ ہستی پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور موت دونوں کچھ ٹھہری ہوئی سی ہیں، بقول میرؔ:-

"دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ"

(۶۵) انقلابِ بے مفر ہر گردشِ دہر دَوَر میں اِس زمین و آسماں کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

زمین و آسمان ہمارے لئے سامانِ سکون نہیں، کیونکہ وہ ہر لحظہ ایک ایسے انقلاب کا پتہ دیتے ہیں جس سے مفر نہیں۔ ایک دوسرا شعر بھی ملاحظہ ہو:-

تمام انقلاب ہے محال ہے ٹھہر سکے یہ دَورِ آسماں کہیں یہ گردشِ زمیں کہیں

انسانیت کو زندہ رہنے کے لئے وجود کا ایک متحرک تصور ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور شعر بھی ملاحظہ طلب ہے:-

کریں تو کس سے کریں راہِ عشق کا شکوہ رُکیں تو پاؤں نہ مانیں چلیں تو منھ کی کھائیں

واقعی بغیر حقیقی توازن پیدا کئے نہ رُکنا ممکن نہ چلنا ممکن۔

(۶۶) موجِ فنا کو کشتیاں چیر گئیں، کہ دیکھتی بحر کی بیکرانیاں غفلتِ ناخدا تو کیا

غفلتِ ناخدا بحر کی بیکرانیاں کیا دیکھتی۔ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، غفلت ناخدا نہیں جاتی۔ لیکن کشتیاں بغیر ناخدا کی مدد کے موجِ فنا کو چیر گئیں۔ تعلیم یافتہ اور متمول "قائدانِ اعظم" اور بڑے بڑے راشٹرپتی "مسلم کلچر اور ہندو کلچر" کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جمہور کروڑوں کی تعداد میں کارواں در کارواں بیڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ بن کر اُٹھی، اور سرمایہ داری اور ملوکیت کی موجِ فنا کو چیرتی ہوئی بحر کی بیکرانیوں سے دو چار ہوتی ہوئی ساحل پر آ لگی اور دنیا بھر میں اشتراکی راج قائم کر دیا۔

(۶۷) مبارک نامِ آزادی، سلامت دردِ آزادی سکھایا سَو طرح قطروں کو بحرِ بیکراں ہونا

دردِ آزادی کی بدولت قطرے سیکڑوں انداز سے سمندر سے ہم آہنگ ہونا سیکھ

لیتے ہیں۔ بکھری ہوئی بدنصیب اور مظلوم انسانیت آج آزادی کے نام سے آزادی کے درد سے ٹوٹے ہوئے بحرِ بیکراں کی طرح دنیا بھر میں اپنا راج قائم کرنا چاہتی ہے، یہ قطرے ایک دن بحرِ بیکراں ہو کر رہیں گے۔

(۶۸) مدوائے انقلابِ زندگی، اب تک نہیں آیا — زمیں ہونا زمیں کو، آسماں کو آسماں ہونا

زمین و آسمان یوں تو رات دن چکر میں ہیں، لیکن جب تک انسانیت میں انقلاب نہیں ہوتا زمین زمین نہیں ہو سکتی اور آسمان آسمان نہیں ہو سکتا۔ فطرت اور مظاہرِ قدرت گویا خود انقلاب کے انتظار میں ہیں، یہ انقلاب ہو تو وہ بھی اپنی اصلی شکل میں نظر آئیں۔

(۶۹) فریبِ ضبط کھا کر موت کو ہستی سمجھ بیٹھے — نہ آیا زندگی کو اضطرابِ جاوداں ہونا

موجودہ نفسیاتی تحلیل (Psycho-analysis) کی رُو سے ضبط و تشدد (Repression) زندگی کے لئے مضر بلکہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ زندگی ایک اضطراب جاوداں ہے، اس کے ساتھ ضبط یا زبردستی کر کے جو جھوٹا سکون حاصل ہوتا ہے وہ موت کو ہستی سمجھ لینے کے برابر ہے یہ جھوٹا سکون قابلِ اعتبار نہیں ہے اور اسی کی بدولت انسان کا دل بغلی دشمن ثابت ہوتا ہے:

(۷۰) گوشِ برآواز ہونا ہی شکستِ ساز ہے — اک سکوتِ غم کو ہنگامہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

یہ شعر ایک نازک احساس کی ترجمانی کر رہا ہے، ہر صدا اپنی شکست کی آواز ہے، غور سے سنیئے تو صدائے ساز شکستِ ساز ہے۔ ہم نغمۂ ساز کو ایک ہنگامہ سمجھ بیٹھے ہیں، حالانکہ وہ حقیقتاً ایک سکوتِ غم ہے۔ میرا ایک شعر ہے:-

چھیڑنے والے چھیڑ کر سازِ طرب سنا کئے — نغمۂ درد بھی نہیں پردۂ کائنات میں

(۷۱) اللہ رے اضطراب کہ حسِ اضطراب کا — موجِ فنا بھی اِک اثرِ ناتمام ہو

اضطراب ایک جان لیوا لیکن زندہ چیز ہے، اتنی زندہ کہ موجِ فنا بھی اس کا اک اثرِ ناتمام ہے اور موت تڑپتی ہوئی زندگی کی ایک جھلک ہے۔

(۷۲) یوں تھرتھرا رہی ہیں رگیں کائنات کی — گویا قریب روزِ قیامت ہے اِن دنوں

جب انقلاب آنے والا ہوتا ہے تو مناظرِ قدرت بھی تھرتھراتے نظر آتے ہیں۔ جس "روزِ قیامت" کا یہاں ذکر کیا گیا ہے یہ وہ قیامت نہیں ہے جو دُنیا کو مٹا دے اور ایک فرضی جنّت اور جہنم اور برزخ کو آباد کرے۔ بلکہ وہ قیامت ہے جو دنیا میں نئی روح دوڑا کر اس کو بنا دے۔ اسی نئی روح کے انتظار اور اسی کے خیر مقدم کے لئے کائنات کی رگیں

ہو رہا ہی ہیں۔

(۷۳) جو گلے تک آ کے اٹک گیا جسے تلخ کام نہ پی سکے
وہ لہو کا گھونٹ اُتر گیا تو سُنا ہے شیر و شکر بھی ہے

زہرابۂ غم جب تک گلے میں اٹکا رہے تلخ ہے۔ لیکن جب گلے سے اُتر کر ہضم ہو گیا تو یہی لہو کا گھونٹ شیر و شکر ہو گا۔ ایڈورڈ کارپنٹر کا قول ہے کہ جو شخص محبت میں ناکام رہا وہ اپنے کو دیوتا سمجھ سکتا ہے۔ میرا بھی شعر ہے:-

جو زہر ہلاہل ہے امرت بھی وہی لیکن معلوم نہیں تجھکو انداز ہیں پینے کے

(۷۴) تو زمان و مکاں سے گذر بھی جا تو رہِ عدم کو بھی کاٹ لے
وہ ثواب ہو کہ عذاب ہو، کہیں زندگی سے مفر بھی ہے

مٹ جانا یا فنا فی اللہ ہونا خود فریبی ہے، "زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا" والی دعا قبول نہیں ہو سکتی۔ زمان و مکان، وجود و عدم، عذاب و ثواب سے فرضی طور پر نکل کر بھی زندگی سے مفر نہیں۔ وجود کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں، عنوان بدلتے رہتے ہیں لیکن وجود باقی رہتا ہے خودی اور بیخودی زندگی کے محض دو رخ ہیں، اس لئے زندگی سے بھاگنے کی کوشش فضول ہے اور اس سے گھبرانا نادانی۔

یہ فنا بھی کیا یہ اجل بھی کیا کبھی دیکھ آ کے فراق کو
اسی زندگی کی چھپے ستم کہ جو درد بھی ہے دوا بھی ہے

(۷۵) کوئی اہلِ دل کو کمی نہیں، مگر اہلِ دل کا یہ قول ہے
ابھی موت بھی نہیں مل سکی ابھی زندگی میں کسر بھی ہے

اہلِ دل کے پاس کیا نہیں، بقول شاعر "فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ" لیکن وہ زندہ موت "وہ وجودِ محض ہونا، وہ آفاقی وجود حاصل کرنا ایسا بلند معیار ہے کہ اہل دل بھی کہہ اُٹھے" ابھی موت بھی نہیں مل سکی، ابھی زندگی میں کسر بھی ہے"۔ یعنی ابھی ان کا وجود موت اور زندگی، ہستی اور نیستی کے سر نہیں ملا سکا۔ ابھی دونوں میں کسر ہے۔

(۷۶) یہ کام نہ لے نالہ و فریاد و فغاں سے افلاک اُلٹ دینے کا ڈھب اور ہی کچھ ہے

ہمارے شاعر قدیم تصور کی اس غلطی کا شکار رہے کہ روتے چلانے اور دعا کرنے سے خدا خوش ہو کر تقدیر بدل دیتا ہے۔ یہ فلسفۂ دعا اور فلسفۂ گریہ و ماتم ایک فرضی خدا کے تصور کا

مرہونِ منت ہے۔ مگر افلاک اُلٹ دینے کا ڈھب اور ہی کچھ ہے یعنی منظم ہو کر انقلاب کرنا
ایک اور شعر ہے :-

خون شہید ناز کا آج ہے زیب داستاں نعرۂ انقلاب ہے ماتم رفتگاں نہیں

(۷۷) مذہب کی خرابی ہے نہ اخلاق کی پستی دنیا کے مصائب کا سبب اور ہی کچھ ہے

دین دھرم مٹنے سے دنیا پر مصیبت نہیں پڑی نہ پڑ سکتی ہے۔ دنیا کا اخلاق ہرگز پست نہیں۔ اور نہ اخلاق کو مذہب سے خواہ مخواہ کوئی تعلق ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ موجودہ دنیا کا اخلاق پچھلے زمانہ کے اخلاق سے بلند تر ہے۔ دنیا کے مصائب کا سبب اور ہی کچھ ہے۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری اور ملوکیت جو دنیا کو چین سے جینے اور ترقی کرنے نہیں دیتے۔ اصلاحِ مذہب اور اصلاح اخلاق کے بجائے سیاسی اور اقتصادی انقلاب کی ضرورت ہے۔

(۷۸) دیکھ دنیا نہیں ہے وہ دنیا اب نہیں اہل دل کی ہمت اور

عشق حسن سے کہہ رہا ہے کہ ہم نے دنیا بدل دی، اس سے زیادہ ہماری ہمت نہیں۔ اس اظہار عجز و معذوری میں جو حلم اور غرور چھپا ہوا ہے ان پر غور کیجئے، میرا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

تجھ کو تو مرے حال سے کیا کام ہے لیکن شاید یہ مرا درد زمانے کے لئے ہے

(۷۹) معنیٔ تقدیر تو وہ تھا، جسے کاتبِ تقدیر بھی سمجھا نہیں

وہ راز کیا جو کسی پر بھی کھل سکے۔ سنسکرت کا مقولہ ہے کہ انسان کی تقدیر خدا نے بھی نہیں جانی، آدمی کی کون کہے۔

(۸۰) جس میں نئی دنیا کا تماشا نظر آئے سنتے ہیں کہ وہ ساغرِ جم اور ہی کچھ ہے

جامِ جمشید میں تو یہی پرانی دنیا نظر آتی تھی، ہم نے سنا ہے کہ ایک اور ساغرِ جم ہے جس میں نئی دنیا کا تماشا نظر آتا ہے، کیا یہ نیا ساغر جسمِ انسانیت کے دل کا جام جم تو نہیں ہے جو آج نئی دنیا کا خواب دیکھ رہی ہے؟

(۸۱) احساس لبِ احساس ہے یہ رنج و خوشی کیا اے عشق تجھے کارِ اہم اور ہی کچھ ہے

احساس کو دکھ سکھ غم اور خوشی سے معرا کرنا اور اس کو شدید کر لینا یعنی واقعیت اور عمل کے مقاصد سے ہم آہنگ کر لینا ہی اسکو زندہ کر لینا ہے، اور یہی کار اہم عشق کے ذمہ ہے۔ یہ بڑا مشکل معیار ہے۔

(۸۲) تو نہ ہستی ہی کو سمجھا تو عدم سے بےخبر زندگی ہی زندگی ہے موت ہو یا زندگی

موت اور زندگی ایک دوسرے کے منافی نہیں جو ہستی اور عدم دونوں کو نہیں سمجھتے وہی زندگی اور موت میں فرق کرتے ہیں ورنہ" زندگی ہی زندگی ہے موت ہو یا زندگی"۔

(۸۳) ہر دل کو بنائیں گے جہاں تاب ہر جام کو جام جم کریں گے

جام جم حقیقت میں اُس صدق و صفا کا نشان ہے اور امکانات کی ایک علامت[۱] ہے جو انسان کے دل میں پنہاں ہیں۔ چنانچہ مسیحی روایتوں میں "ہولی گریل" (Holy Grail) کی روایت ہے۔ یہ جام جم اور "ہولی گریل" انسان کا دل اور انسانی شعور ہے۔

(۸۴) پھر جمود روزگار انگڑائیاں لینے لگا موت نے شاید نوائے زندگی پھر چھیڑ دی

جب میں وہ شعر کہہ چکا جو اس مضمون میں اکیسواں شعر ہے، یعنی آسمانوں کو بھی جیسے آہی ہے نیند سی، تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ نظم زندگی کی شاید صبح ہونے والی ہے۔ پھر جمود روزگار انگڑائیاں لینے لگا اور موت نے وہ نغمۂ سحری چھیڑ دیا جو پیام زندگی ہے، موت نے کیوں؟ اس لئے کہ کُشت و خون کا بازار گرم ہوئے بغیر نہ جمود روزگار ٹوٹے گا اور نہ زندگی کا نظم ہی بدلیگا

اس شعر میں بھی تخلیقی انقلاب Creative Revolution کی طرف اشارہ ہے۔

(۸۵) تری طرف سے محبت کی قوت تخریب بنا کوئی نئی دنیا اگر بنا آئے

قوت تخریب کو کام میں لائیں تو نئی دنیا بن سکتی ہے۔ انقلاب سے بربادی اور آبادی یعنی تخریب و تعمیر دونوں ہوتی ہے۔ اسی لئے انقلاب کو ایک تخلیقی قوت کہا جاتا ہے۔

(۸۶) نثار دیدۂ بے خواب۔ جاگنے کی طرح جو جاگ بھی نہ سکے اس کو نیند کیا آئے

بے خوابی کا ایک نفسیاتی سبب بھی ہوتا ہے، بسا اوقات رات کو بستر آرام پر جاکر مجھے یہ احساس ہوا کہ آج کا دن سُونا سُونا کٹ گیا۔ چنانچہ میں اس خیال سے ایسا غیر آسودہ رہا کہ نیند بھی نہیں آئی۔ میرے جاننے والے اس کا حال بخوبی جانتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک یونیورسٹی کے طالب علم نے اس کا سبب پوچھا۔ یہ شعر اسی سوال کا جواب ہے، ایک دوسرا شعر بھی سُن لیجئے۔

نہ جاگنے دے نہ سونے دے وہ ہوا کیجئے یہ زندگی ہو تو اس زندگی کو کیا کہیئے

تصحیح

افسوس کہ منشی تلوک چند صاحب محروم کے قطعہ مطبوعہ زمانہ اپریل ۱۹۴۱ء میں کتابت کی چند غلطیاں ہو گئی ہیں، جو درج ذیل ہیں۔ ناظرین رسالہ درست فرمائیں:-

			غلط	صحیح
صفحہ ۱۸۲	شعر ۱	مصرعہ دوم	نزدیک ہے	نزدیک ہیں
" "	شعر ۳	مصرعہ دوم	غوغائے آسماں	غوغائے میکشاں
" "	شعر ۶	مصرعہ دوم	یہ سہو	یا سہو

---

[۱] Symbol

ہجومِ یاس

(از محمد فاروق احمد محشر بدایونی)

ماہ و انجم پا بپیادہ ہیں بساطِ چرخ پر
چاندنی سے مطلعِ انوار ہیں دیوار و در

جگمگاتی پھر رہی ہیں جگنوؤں کی ٹولیاں
یا ستارے گر رہے ہیں آسماں سے ٹوٹ کر

دیدنی ہے صحنِ گلشن میں تماشائے بہار
وجد کرتے ہیں برابر جوشِ مستی میں شجر

شمعِ نظارہ سے پُرتنویر ہے بزمِ خیال
کثرتِ انوار سے روشن ہے فانوسِ نظر

کس قدر دلسوز ہے یہ منظرِ بیچارگی
سو رہی ہے اک سراپا ناز فرشِ خاک پر

آنکھ میں آنسو جگر میں ٹیس دل میں حسرتیں
جس کی دنیا میں نہیں عیش و مسرت کا گذر

ناتوانی کا نشانہ بےقراری کا شکار
جس کے رُخ پر رنگ بن کر چھا گیا دردِ جگر

جس کے طرزِ بیخودی پر کہکشاں بھی لوٹ ہے
چھیڑتی ہے جس کو رہ رہ کر ستاروں کی نظر

نیم وا آنکھیں، نگاہیں مضمحل، چہرہ اُداس
موت بھی آنسو بہا دے جس کی صورت دیکھ کر

ایک وہ ناکام ہستی، ایک وہ مجبورِ غم
جس کے نالے نارسا جس کی دعائیں بے اثر

جس کی زلفیں چھانتی رہتی ہیں سُرمہ خاک کا
مفلسی سر پیٹتی ہے جس کے حالِ زار پر

جس کی سانسوں میں نمایاں آہ کی چنگاریاں
جس کے سینہ میں جہانِ بےکسی زیر و زبر

گورا گورا جسم اُس پر میلے میلے چیتھڑے
غیرتِ گلشن سراپا پیکرِ غم سر بسر

سو گیا جس کا مقدر مفلسی کی گود میں
عمر بھر کو رنج و آفت کا دوشالا اوڑھ کر

اُف یہ سناٹے کا عالم حیف یہ تصویرِ یاس
کس قدر اندوہگیں ہے رات کا یہ پچھلا پہر

میری فطرت

مصائب سے اُلجھ کر مُسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا

نگاہیں جس کی جم جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر
اُسے ماضی کی بےرحمی کو دہرانا نہیں آتا

فاشزم نازیزم اور عورت[ملہ]

فاشزم اور نازیزم کی آزادی دشمنی اب اس قدر رسوائے زمانہ ہو چکی ہے کہ اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ یورپ کی موجودہ جنگ اور چھوٹی چھوٹی قوموں کی پسپائی اور غلامی کو دیکھکر بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ فاشزم یا نازیزم صرف سیاسی آزادی کا دشمن ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ فاشزم اور نازیزم بنیادی طور پر ہر قسم کی آزادی کے دشمن ہیں جو انسان کو انسان بناتی ہے۔ شخص واحد کی مجنونانہ حکومت کا نظارہ کتنا ہولناک ہے، اسے کچھ یورپ والے ہی بیان کر سکتے ہیں۔ اٹلی، جرمنی اور فاشسٹ یا نازی طرز حکومت میں انسان کتنا پابند اور مجبور ہوتا ہے اس کا مطالعہ بھی حد درجہ دلدوز ہے۔

آج اٹلی، جرمنی اور دوسری جگہوں پر جہاں یہ طرز حکومت جاری یا اثر انداز ہے وہاں مصنف فن کار، مقرر، اخبار نویس ہر ایک مجبور ہے۔ لیکن اس نظام حکومت میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت عورتوں کی ہے۔

فاشزم یا نازیزم اور عورتوں کی آزادی ایک دوسرے کی ضد ہے۔ فاشسٹ حکومت دراصل مطلق العنانی، ہٹ دھرمی اور وحشت و بربریت کا مظاہرہ ہے، اس کو انسانیت، انصاف اور منطق سے کوئی لگاؤ نہیں۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے فاشسٹ حکومت کے ماتحت عورت مردوں کا غلام بن کر رہ جاتی ہے۔ فاشسٹ حکومت میں عورت کی زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ ڈکٹیٹر کے مجنونانہ خیالات کی تکمیل کے لئے سپاہی پیدا کرے، اُن کی خدمت گزاری کرے، اور اُن کی ہوس کاریوں کا تختۂ مشق بنے۔

فاشزم کے قائد اعظم مسولینی نے اپنے مشہور سوانح نگار ایمل لڈوگ کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ:-

---

ملہ یہ مضمون سلویا پنکھرسٹ کے مضمون کو پڑھنے کے بعد لکھا گیا ہے، مگر لکھنے والے نے مزید معلومات بھی شامل کر دی ہیں، تاہم بجنسہٖ البتہ سلویا پنکھرسٹ ہی کا مضمون ہے۔ آئندہ بھی زمانہ میں اس قسم کے کئی سیاسی علمی مضامین شائع ہوتے رہیں گے۔ (ا- ز)

مرد کی خدمت گزاری اور فرمانبرداری ہی عورت کا فرض مقدم ہے۔ ریاست میں عورت کا اور کام ہی کیا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اُنھیں کسی قسم کا حق نہ ملنا چاہیئے۔ اگر میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق دیتا تو لوگ مجھ پر ہنستے۔ بہر حال جیسی طرز حکومت ہم لوگوں نے قائم کی ہے، اُس میں عورتوں کی کوئی گنتی نہیں۔"

امیل لڈوگ کی یہ کتاب دنیا بھر کی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے، اور مسولینی کی مستند سوانحعمری شمار کی جاتی ہے۔ مسولینی عورتوں کے معاملے میں حد درجہ وحشی ہے، اُس نے ایک بار یہ بھی کہا ہے کہ "مجھے اپنے آباؤ اجداد میں سب سے زیادہ دلچسپی ایک شخص سے ہوئی جو وینس میں رہا کرتا تھا، اُس نے اپنی بیوی کو اس لئے قتل کر دیا تھا کہ اُس کے خیال میں وہ وفادار نہ تھی۔ اُس نے اُس کے سینہ میں دو چھریاں ماریں اور بھاگ گیا تھا...... رومانگنا گھرانے کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، اور میں بھی اُسی نسل سے ہوں۔"

جب سے اٹلی میں فاشزم کی طاقت بڑھ گئی تو وہاں ایک قانون یہ بھی بنا دیا گیا ہے کہ کوئی عورت گیارہ برس سے زیادہ عمر کے لڑکے کو کوئی ایسا مضمون نہیں پڑھا سکتی جس سے اُس کے کردار پر اثر پڑتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فاشسٹ حکومت سارے ملک کے مردوں کو بربریت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے، اور وہ جانتی ہے کہ انسان کے خیالات اور کردار کس طرح ترتیب پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاشسٹ حکومت کے قیام کے بعد وہاں کے مردوں میں عورتوں کے لئے ہمدردی کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہا۔

اٹلی سے باہر یہ ناگوار حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ وہاں کی عورتوں کو کس قدر ساری زندگی مردوں کے ہاتھوں بے جان کٹھ پُتلی کی طرح اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ جو اُن کی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ فاشسٹ نظام حکومت اور فاشسٹ سماج نے عورتوں کو ہر حق سے محروم کر رکھا ہے۔ ملکی قانون کے مطابق عورتوں کی سماج، حکومت اور قانونی اداروں میں کوئی حیثیت ہی نہیں اور عورتوں کو طرح طرح کی چالاکیوں اور عیاریوں سے کام لیکر ہر حیثیت سے مجبور کر دیا گیا ہے۔

اٹلی میں فاشسٹ دَور سے پہلے شادی کی عمر لڑکیوں کے لئے کم سے کم پندرہ ۱۵ سال اور لڑکوں کے لئے اٹھارہ سال تھی۔ اب اُسے گھٹا کر لڑکیوں کے لئے چودہ ۱۴ اور لڑکوں کے لئے سولہ ۱۶ کر دیا گیا۔ وہاں کی بے بس لڑکیوں کو جنھیں کسی قسم کا قانونی حق حاصل نہیں، کم عمری ہی میں ماں بننے پر مجبور کر دیا گیا ہے

اٹلی کی غریب عورتیں اس قانون سے لازمی طور پر نقصان اٹھا رہی ہیں۔

اگر اٹلی کے سابق قانون اور نئے فاشسٹ قانون کا مقابلہ کیا جائے تو بڑی آسانی سے معلوم ہوجائے گا کہ فاشسٹ نظام حکومت کس طرح عورتوں کے حقوق پر چھاپا مار رہا ہے۔ ہر چند اٹلی کا قدیم قانون بھی کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا، پھر بھی اس وقت سے ضرور بہتر تھا موجودہ فاشسٹ عہد حکومت کے ماتحت تو عورتوں کی حیثیت گائے اور بکریوں سے زیادہ نہیں رہی۔ مرد مختار کل ہیں اور عورتیں مجبور محض۔

فاشسٹ قانون کے ماتحت گھر کے مالک کو حق ہے کہ وہ عورتوں اور بچوں کو جس قسم کی چاہے سزا دے سکتا ہے۔ مرد عورتوں کو مارپیٹ کرنے پر صرف ایسی حالت میں سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے جب عورت کو کوئی جسمانی نقص واقع ہو یا اُس کا دماغ خراب ہوجائے یا عرصہ تک بیمار رہے۔ لیکن ایسی حالتوں میں بھی مرد کو چھ ماہ سے زیادہ سزا نہیں دی جاسکتی۔ حالانکہ اس سے پہلے اس جرم پر پانچ سال تک کی سزا دی جاتی تھی۔ اگر مارپیٹ کی زیادتی کی وجہ سے عورت مرجائے تو مرد کو آٹھ سال تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ موت قتل نہیں سمجھی جاتی۔ حالانکہ پہلے قانون میں یہ جرم قتل ہی تھا۔ موجودہ قانون کے ماتحت اطالوی مرد کو اپنی بیوی پر ہر طرح کے اختیارات حاصل ہیں۔ جس طرح ایک قصاب کو اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے اپنی خریدی ہوئی بکری کو ذبح کر ڈالے، اُسی طرح ایک شوہر کو اختیار ہے کہ جب چاہے اپنی بیوی کو مارپیٹ کرے بشرطیکہ اُس کی کسی ہڈی کو صدمہ نہ پہونچے۔ لیکن ہڈی ٹوٹنے یا کسی سخت صدمے کے بعد بھی قانون نمائشی ہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ مرد کو آسانی کے ساتھ معافی مل جاتی ہے۔

اگر کوئی کم عمر لڑکی شوہر کے مظالم سے تھک کر بھاگ جائے تو پولیس اُس کو گرفتار کرکے اُس کے شوہر کے حوالے کردیتی ہے۔ اس کے علاوہ شوہر کے گھر سے بھاگنے کی سزا ایک سال قید اور دس ہزار لائر[1] جرمانہ کی سزا مقرر ہے۔ لیکن مرد پر کوئی پابندی نہیں، اس کا جہاں جی چاہے جاسکتا ہے۔

اگر کوئی عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرے تو قانوناً اُسے دو سال قید تک کی سزا مل سکتی ہے۔ سزائے قید کی یہ میعاد یورپ کی ساری حکومتوں سے زیادہ ہے لیکن اس کے برعکس مرد بالکل آزاد ہے اُس پر کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ وہ کوئی باضابطہ داشتہ نہ رکھے وقتی طور پر وہ جس عورت سے دل چاہے تعلقات قائم کرسکتا ہے۔ بیوی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

[1] لائر اٹلی کا ایک سکہ ہے۔

اور اگر مرد کسی دوسری عورت کے ساتھ مستقل ناجائز تعلقات بھی قائم کر لیتا ہے تو فاشسٹ عدالت میں اُس پر جرم ثابت ہونا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔

"قتل" "عزت کے لئے" قاتل اگر مرد ہے اور مقتول عورت، تو فاشسٹ حکومت مرد کے ساتھ ہر طرح کی رعائتیں برتتی ہے۔ اس سے پہلے بیوی بیٹی یا بہن کے قتل پر بشرطیکہ مقتولہ کسی غیر مرد کے ساتھ پکڑی گئی ہو تین سے سات سال تک کی سزا مقرر تھی۔ لیکن نئی فاشسٹ حکومت نے قانون کو کھینچ تان کر بہت لچکدار بنا دیا ہے۔ اس لئے اگر کوئی مرد شک پر بھی اپنے گھر کی کسی عورت کو قتل کر دے تو اُسے رہائی مل سکتی ہے۔ بہر حال نئے فاشسٹ قانون نے مرد کو اپنی بیوی، بہن اور بیٹی کی زندگی کا مالک بنا دیا ہے۔ اگر کوئی مرد دوسری عورت سے تعلقات قائم کرے اور بیوی سے اس پر جنگ ہو تو وہ اُسے قتل کر کے اظہار شک کے بعد آسانی سے رہائی پا سکتا ہے۔

یہ قانون دراصل اُس وحشیانہ فلسفۂ اخلاق کے ماتحت بنایا گیا ہے جس کی تعلیم فاشزم سے ملتی ہے اور جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ "عورتیں مردوں کی جائداد ہیں، عورت مرد کی پابند ہے مگر مردوں کو دوسری عورتوں سے دلچسپیاں حاصل کرنے کی پوری آزادی ہے۔

اٹلی میں عورتوں کو عصمت فروشی کے جرم میں بھی سخت سزائیں دی جاتی ہیں، خواہ وہ افلاس ہی سے اس کے لئے مجبور ہوں۔ لیکن مردوں کو زنا بالجبر پر بھی محض معمولی سزا دی جاتی ہے درحقیقت اٹلی میں بےبس عورتوں کی حفاظت کے لئے کوئی قانون ہی نہیں ہے۔ لڑکی کی رضامندی خواہ وہ کتنی ہی کم عمر کیوں نہ ہو مرد کے لئے جواز قرار دیدیتی ہے۔ قانون نہیں دیکھتا کہ مرد نے کم عمر لڑکی کو بہکا کر ایک قومی جرم کیا ہے، وہ مرد کو رہا کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں بھی کہ لڑکی سولہ سال سے کم عمر ہو اور مرد شادی شدہ۔ اور لڑکی یہ ثابت کر دے کہ مرد نے اپنا شادی شدہ ہونا چھپایا۔ اور اُس سے بیاہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مرد کو تین مہینے سے لیکر دو سال تک کی سزا مل سکتی ہے۔ لیکن اگر مرد یہ ثابت کر دے کہ لڑکی پہلے سے آوارہ تھی، جو تعلقات قائم ہونے کے بعد آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے تو پھر مرد کی رہائی یقینی ہو جاتی ہے فاشسٹ حکومت ہر طرح سے مرد کی مدد کرتی ہے، کیونکہ اُسے ہوس ملک گیری کی تکمیل کے واسطے زندہ صفت مردوں کی ضرورت ہے

سابق اطالوی قانون میں اغوا کی سزا سات سال تک تھی، اور عورت اکیس برس کی عمر تک نابالغ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن نئے قانون کے ماتحت عورت چودہ برس کی عمر میں بالغ ہو جاتی ہے اور بالغ عورت کا اغوا تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اور نابالغ لڑکی کو اغوا کرنے کی سزا زیادہ سے زیادہ تین سال قید ہے۔

اٹلی کے نئی تعزیرات کی دفعہ ۵۲۰ اُس افسر یا پولیس کے سپاہی کے متعلق ہے جس کی حفاظت و نگرانی میں کوئی عورت رکھی گئی ہو، لیکن سپاہی نے اُس کے ساتھ زنا کیا ہو۔ اٹلی میں یہ دفعہ بابت اہم ہے کیونکہ اکثر عورتیں جو قید یا نظربند کی جاتی ہیں مردوں کی نگرانی میں رکھی جاتی ہیں۔ سابق قانون میں اس قسم کے جرم کی سزا دس سال تک تھی، لیکن اب زیادہ سے زیادہ تین سال کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ لیکن اتنی سزا کسی سپاہی کو نہیں دی جاتی ہے!

اٹلی کے فاشسٹ نظام کا تو جائزہ ہو چکا، یہ وہی نظام ہے جس کی بنیاد ہی بقول مسولینی "روحانیت اور بلند اخلاقی" نظریوں پر قائم ہے۔ اب آئیے ہٹلر کی قومی اشتراکی حکومت میں عورتوں کی حالت کو دیکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نازستی حکومت عورتوں کے حق میں فاشسٹ حکومت سے بھی زیادہ ہولناک ہے۔ اور نازستی نظام نے عورت کو بالکل پامال کر دیا ہے اور وہ اسے ایک قابل فخر کارنامہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا ایک جرمن اخبار نے لکھا تھا کہ:-

"جو عورت خود کماتی ہے، وہ مرد کو زخمی کرتی ہے، صرف اسی حیثیت سے نہیں کہ وہ مرد کی مقابل بن جاتی ہے، بلکہ درحقیقت وہ مرد کو خاندان کا سرپرست اور سردار بننے سے روکتی ہے۔"

کیسا سیدھا سادہ نظریہ ہے اور کیسی کھری بات ہے، مگر نازستی ازم نے عملی طور پر بھی اسے کر دکھایا ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء کے انقلاب کے بعد عورتوں کو ریشتاغ اور صوبائی پارلیمنٹوں میں جو جگہیں ملی تھیں اُسے نازستی ازم نے اقتدار پاتے ہی عورتوں سے چھین لیا، اور اُن تمام عورتوں کو جو حکومت، مقامی کونسلوں یا دوسرے سرکاری یا نیم سرکاری دفتروں میں ملازم تھیں برطرف کر دیا۔ انتہا یہ کہ اسپتالوں اور اسکولوں کی ملازمتوں سے بھی انھیں زبردستی علیحدہ کر دیا گیا تیس سال تک کی عورتوں پر قانوناً پابندی لگا دی گئی۔ اور وہ عورتیں بھی ملازمتوں سے محروم کر دی گئیں جن کے شوہر غیر آریائی تھے۔ ۳۰۔ جون سنہ ۱۹۳۲ء کو ایک نیا قانون بنا جس کے رو سے ساری شادی شدہ عورتوں کو ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا اور اُن عورتوں کو جن کی شوہر کے علاوہ باپ۔ بھائی یا اور کوئی عزیز کفالت کر سکتے ہوں ملازمت کے حق ہی سے محروم کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹی تنخواہیں پانے والے اکثر مردوں پر بڑے بڑے خاندانوں کا بوجھ پڑ گیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ غریب ہو گئے۔ اُن کے لڑکے روپیوں کی کمی کی وجہ سے سائنس، فلسفہ اور علم پڑھنے کے بدلے کم عمری میں نازستی فوج میں داخل ہوتے چلے گئے۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے بڑی زیادتی یہ ہوئی کہ نازستی حکومت نے یہ قانون جاری کرنے سے پہلے ہی ہزاروں عورتوں کو برطرف کر دیا

جو جمہوری حکومت کے زمانہ سے بہت سے دفتروں میں کام کر رہی تھیں۔

پچھلے پچیس ۲۵ سال سے جرمنی کی عورتوں کو بغیر کسی شرط کے یونیورسٹیوں میں داخل ہونے کا حق حاصل تھا۔ وہ قانونی پیشے بھی اختیار کر سکتی تھیں، لیکن اب صرف دس فی صدی لڑکیاں باسالاریٹ (Baccalaureat) (جو میٹرکیولیشن کے مقابلہ کا امتحان ہے) کے امتحان میں شریک ہو سکتی ہیں اِس حق تلفی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۳۴ء میں دس ہزار پانچ سو لڑکیوں نے یہ امتحان پاس کیا، اُن میں سے صرف ایک ہزار لڑکیوں کو یونیورسٹی میں داخل ہونے کی اجازت ملی لیکن یہ لڑکیاں بھی ایسے تعلیمی شعبوں میں داخل نہیں ہو سکتیں کہ کوئی آزاد پیشہ اختیار کر سکیں البتہ پچھتر ۷۵ لڑکیوں کو صرف ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت مل جاتی ہے، لیکن جرمنی کے ڈاکٹر اس کے بھی خلاف ہیں۔

جرمنی میں سائنس کی تعلیم صرف مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے متعلق ایک جرمن اخبار میں یہ سرکاری بیان شائع ہو چکا ہے:۔

"عورتوں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سائنس کے سارے کام مردوں کے ہیں، عورتوں کو نظری طور پر غور و فکر نہیں کرنا چاہیئے، اُس کا دماغ ایسی باتوں سے خالی رہنا چاہیئے۔ عورت کا کام صرف اچھے بچے پیدا کر کے اُن کی پرورش کرنا ہے۔"

اس عہد میں جب کہ مادام میری کیوری اور میریا مونٹسری پیدا ہو چکی ہیں یہ بات کتنی حیرت انگیز اور عجیب ہے!

جرمنی کی تعلیم گاہوں میں عورتوں کو صرف نیچے درجے کی جگہیں مل سکتی ہیں، اور بقول ایک تعلیمی رسالہ "مرد جو تعلیم دیا کرتے ہیں وہ عورتوں کے مقابلہ میں لڑکوں کی ذہنیت کو زیادہ بہتر ترتیب دیتے ہیں" حالانکہ آج ساری دنیا اس کو تسلیم کر چکی ہے کہ عورتیں شفیق معلمہ ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن ہٹلر کے جرمنی کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ساری دنیا جس بات کو مانتی ہے جرمنی میں وہ غلط سمجھی جاتی ہے، ساری دنیا جس بات کو برا سمجھتی ہے جرمنی میں اسکو صحیح سمجھا جاتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ جرمن عورتوں کی ذہنی نشوونما ختم ہو رہی ہے۔ اُن کو مار مار کر گھریلو دھندوں میں اُلجھایا جا رہا ہے اور اگر انھیں ملازمتیں دی بھی جاتی ہیں تو اسلحات کے کارخانوں یا زہریلی گیسیں بنانے کے کارخانے میں۔

ان دنوں جرمن عورتوں کو دن میں بارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد نازیت پر لکچر سننے پڑتے ہیں آپ خود اندازہ کیجئے کہ سارا دن کھیتوں اور گھروں کا کام کرنے کے بعد ایک عورت کس طرح لکچر

گھٹنے جا سکتی ہے۔ لیکن اٹھارہ سے اکیس سال تک کی عورتوں کو تو ایک مستقل ضابطہ کے ماتحت محنت کرنا پڑتی ہے اور جو عورتیں کل تک دفتروں میں اعلیٰ عہدوں پر نظر آتی تھیں آج کھیتوں اور گھروں کا کام کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ نازیت کے ماتحت انسانی تہذیب کی ترقی میں کتنی بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ کیا عورتوں کی آزادی کے بغیر انسانی تہذیب ترقی کر سکتی ہے؟

ریاضِ رضواں

(از حکیم سید محمد عباس صاحب رضواںؔ)

کیفِ نگاہِ مست سے، پھر گئے دن بہار کے — پھولوں میں رنگ بھر گئے، دیدۂ پُر خمار کے
ہم سے قفس نصیب سب، گلشنِ روزگار کے — گنتے ہیں انگلیوں پہ دن، آتی ہوئی بہار کے
آئے جو چشمِ شوق تک، دستِ تصورِ جنوں — سیکڑوں پُرزے ہو گئے، دامنِ انتظار کے
اہلِ عشق ایک جا۔ باغ میں بیٹھتے ہیں جب — رہتے ہیں روز تذکرے، گذری ہوئی بہار کے
جامۂ دل میں عمر بھر۔ بوئے جنوں بسی رہی — سونگھ لیئے تھے قیس نے، پھول مرے مزار کے
زخمِ جگر میں بخیہ گر، بخیہ رفو کا کام ہے — ٹانکے یہ ٹوٹ جائیں گے آتے ہی دن بہار کے
ختم اسی جگہ ہوئیں، راہِ وفا کی منزلیں — اُڑ کے جہاں جہاں گئے ذرّے مرے مزار کے
ہچکی قضا کی لب پہ تھی آپ کھڑے تھے سامنے — ہو گیا چپ مریضِ غم، پھر یہ کسے پکار کے
مانا کہ شوقِ دید ہے، ہوش میں رہیئے کلیم — چڑھیئے گا بامِ طور پر، پردہ ذرا پکار کے
شام ہوئی تو شمع نے، اشک بہائے رات بھر — صبح ہوئی تو ہنس دیئے، پھول مرے مزار کے

رضواںؔ عدم میں روشنی پہونچی دیارِ عشق سے
بن گئے داغِ دل چراغ، شب کو مرے مزار کے

ہوائے زمانہ

(از منشی جگدیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔اے۔ ایل ایل بی)

جوانی کی رنگین راتیں فسانہ — بہار آفرینِ حسن کا کیا ٹھکانا
محیطِ فلک چار دن چاندنی ہے — گھڑی بھر ستاروں کی یہ روشنی ہے
بہار و خزاں کے ہیں دن آتے جاتے — انھیں دیر لگتی ہے جاتے نہ آتے
گل و یاسمن کا ہے بلبل کو رونا — برابر ہے کانٹوں کا ہونا نہ ہونا
سرِ شاخ شبنم کا موتی پرونا — شب و روز سبزہ کا دامن بھگونا
گلِ لالہ دل دے کے ہوتا ہے داغی — نسیمِ سحر ہے گلستاں سے باغی
کسے راس آئی ہوائے زمانہ؟

بنی ہے جبھی تک یہ دنیا بنی ہے — یہاں چیز ہے جو بھی وہ رفتنی ہے
نہیں جز طلسمِ نظر دارِ فانی — کہانی ہے اور وہ بھی جھوٹی کہانی
بدلتا ہے گر رنگِ عالم تو پھر کیا — اسی پر ہے دورِ فنا منحصر کیا؟
نگاہوں پہ غفلت کا پردہ پڑا ہے — نہاں فی الحقیقت بقا در فنا ہے
تغیّر کے چکر میں ہر شے ہے قائم — رہا ہے رہے گا یہی رنگ دائم
وہی آسماں ہے وہی سرزمیں ہے — ابھی تک جواں ہے نئی ہے حسیں ہے
وہی خندۂ گل بداماں چمن ہے — وہی شمعِ سوزاں وہی انجمن ہے
وہی آب و گل ہے وہی باد و آتش — وہی طرز و اندازِ نقش و نگارش
خدائی کا ہے یہ عجب کارخانہ — وہی طائرِ دل وہی آب و دانہ
نیا رنگ و روغن نیا پیرہن ہے — بنوعِ دگر تازہ عہدِ کہن ہے
ابھی تک وہی ہے ادائے زمانہ

تنقید کتب

مبادی سیاسیات

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے پروفیسر ہارون خان شروانی ایم۔ اے نے ۱۹۳۵ء میں یہ کتاب دو حصوں میں لکھی تھی۔ چنانچہ دونوں حصے الگ الگ جلدوں میں شایع کئے گئے تھے اور پہلے حصے پر زمانہ میں ریویو بھی ہو چکا ہے۔ مگر اب پروفیسر صاحب نے دونوں حصوں کو بعد نظر ثانی یکجائی طور پر شایع کیا ہے جس سے یہ کتاب پہلے سے کسیقدر مختلف اور جامع ہوگئی ہے ۱۹۳۷ء سے اب تک دنیا کے سیاسی حالات نے اسقدر پلٹا کھایا کہ فاضل مصنف کو اس کتاب میں جگہ جگہ ردو بدل کرنا پڑا۔ اور ۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء تک جو واقعات دنیا میں ہوئے ان کے ضروری نتیجے بھی انھوں نے پیش کر دیئے ہیں۔

کتاب کا موضوع پولٹیکل سائنس ہے۔ فاضل مصنف نے اسیں افلاطون کی مشہور کتاب "ریاست" کی طرح مختلف ابواب قائم کرکے سیاسیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ زبان بھی صاف اور عام فہم ہے کتاب کے آخیر میں اردو انگریزی اصطلاحات کی بھی ایک جامع فہرست دیدی ہے۔ بغرض یہ کتاب اسکولوں اور کالجوں کے طالبعلموں کے لئے خاص طور پر مفید ہے

فاضل مولف نے ایک جدت یہ کی ہے کہ انھوں نے بعض جغرافیائی ناموں کا نیا ترجمہ کیا ہے۔ مثلاً (۱) آئرلینڈ کی جگہ آئرستان اسکاٹلینڈ کے بجائے اسکاچستان لکھا ہے اسطرح سوئٹزرلینڈ کو سوئسزستان۔ نیوزیلینڈ کو نوزستان وغیرہ قرار دیا ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ ہم اس جدت کی تائید نہیں کر سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں پروفیسر صاحب نے اس طبع آزمائی کی ناحق تکلیف اٹھائی ہے کیونکہ اردو داں جماعت جس آسانی سے آئرلینڈ یا نیوزی لینڈ سمجھ لیتی ہے آئرستان یا نوزستان کو نہیں سمجھ سکتی۔ اسکے علاوہ انکی وضع کی ہوئی بعض اصطلاحیں اسقدر ثقیل اور غیر مانوس ہیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے لغت درکار ہے۔ مثلاً "دساتیر" جو "دستور" کی جمع ہے اور "کانسٹی ٹیوشن" کا ترجمہ ہے ہمارے نزدیک ریپبلک کی انگریزی اصطلاح زیادہ مانوس ہے اسلئے اسے بدستور رہنے دیا جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ کتاب کی لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ ضخامت ساڑھے سات سو صفحات سے زیادہ قیمت پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ دہلی۔

تازیانے لہ

یہ پندرہ دلچسپ افسانوں کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے۔ جو مختلف اہل قلم کے زور طبع کا بہترین نمونہ کہے جا سکتے ہیں ان افسانوں کو الطاف مشہدی صاحب نے جمع کیا ہے اور ان کو دیکھکر ہم ان کے نظر انتخاب کی داد دیتے ہیں۔ منشی پریم چند کا افسانہ شطرنج اور مسٹر علی عباس حسینی کا قصہ "باون اتیے" پلاٹ اور لٹریچر دونوں لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔ بہر حال یہ کتاب سفر میں وقت کاٹنے کے لئے اچھی چیز ہے۔ بعض افسانوں میں زبان کی خامیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے ان کی دلچسپی کم ہو گئی ہے لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ ضخامت ۲۰۴ روپیہ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ مسز لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور

تصحیح زمانہ مئی سنہ ۱۹۴۲ء صفحہ ۲۸۱ پر حضرت مدہوش نے قطعہ خیر مقدم کے چوتھے شعر کا دوسرا مصرع جو شعر کی زبان ہے بڑہ جائے آسماں سے"۔ غلط چھپ گیا ہے۔ صحیح مصرع یہ ہے۔ جو شعر کی زمیں ہے بڑہ جائے آسماں سے

صفحہ ۱۹۰ سطر ۲۳ پر شعر مندرجہ کا مصرع اول "ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش۔ غلط ہے صحیح مصرع یہ ہے: ہر رات ہوئی صبح کو اک خواب فراموش۔ یہ شعر جناب جگر مرادآبادی کا نہیں بلکہ حضرت یگانہ چنگیزی لکھنوی کا ہے۔

رفتارِ زمانہ

جنگ کے حالات

جرمنی کی لڑائی ابھی تک کسی فیصلہ کن مرحلے پر نہیں پہونچی ، افریقہ کے مشہور جنگی ماہر جنرل اسمٹس کا (جو اب فیلڈ مارشل ہوگئے ہیں) قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ابھی جنگ کا خاتمہ دور ہے ۔ اُن کی رائے میں ابھی گویا لڑائی کی شروعات ہی ہوئی ہے ۔ عنقریب ہی اتحادیوں کو سخت ترین آزمائشوں سے گذرنا پڑیگا امریکہ کے وزیر جنگ مسٹر (Stimson) کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ جنگ آیندہ چار سال تک تو ضرور چلے گی برطانیہ کے افسران اور مدبر بھی ایک طولانی مقابلے کے لئے تمام ضروری تیاریاں کر رہے ہیں ۔ جرمنی کو اپنی تیاریاں مکمل کرنے میں آٹھ دس سال لگے ہیں ۔ برطانیہ کے مدبر آغاز جنگ سے خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور اُنھوں نے جو کچھ کیا ہے پچھلے اکیس بائیس مہینوں میں کیا ہے ۔ برطانیہ کی آبادی بھی جرمنی سے تقریباً نصف ہے لیکن برٹش نوآبادیوں ، برطانوی مقبوضات اور سب سے بڑھکر امریکہ کی امداد سے اُمید قوی ہے کہ اسلحہ اور دیگر ضروری سامان کے اعتبار سے وہ اس سال کے آخر تک جرمنی کے ہم پلّہ ہوجائیگا ۔ اس وقت سلطنت برطانیہ تن تنہا جرمنی کا مقابلہ کر رہی ہے ۔ روس کے علاوہ تمام یورپ پر اس وقت جرمنی کا عارضی قبضہ ہوگیا ہے اس لئے نہ صرف جنگ جاری رکھنے بلکہ عارضی فتوحات حاصل کرنے میں اُسے بڑی سہولت ہوگئی ہے ۔ چنانچہ پچھلے دنوں جزیرہ کریٹ پر اس کی ہوائی فوج نے اس زور و شور کا حملہ کیا کہ بارہ تیرہ دن کے اندر شاہ یونان کی یہ آخری جائے پناہ بالکل ملیامیٹ ہوگئی ۔ برطانوی فوجیں چھ سات ماہ سے کریٹ میں موجود تھیں اس لئے عام خیال تھا کہ جرمن آسانی سے اس اہم جزیرہ پر فوج کشی نہ کرسکیں گے ۔ لیکن تجربہ سے یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا ۔ ہٹلر نے بیشمار ہوائی جہازوں کے ذریعہ کریٹ میں نہ صرف کثیر فوج اُتار دی بلکہ اُن کی مدد کے لئے تمام ضروری سامانِ جنگ بھی پہونچا دیا ۔ برطانوی سپاہیوں نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوج کی مدد سے اس حیرت انگیز حملے کا بڑی دلاوری اور پامردی سے مقابلہ کیا لیکن میدان جنگ سے قریب ہوائی اڈوں کی کمی کے باعث یہ مقابلہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکا آخر انھیں اپنی بچی کھچی جمعیت کے ساتھ میدان چھوڑنا پڑا ۔ مگر انھوں نے اتنی مزاحمت ضرور کی کہ جرمنوں کو فتح کے لئے بہت گراں قیمت ادا کرنی پڑی ۔ چنانچہ یونان اور کریٹ کے نقصانات کے علاوہ جہاں برطانیہ کے پندرہ ہزار سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے وہاں جرمنی کے بارہ ہزار سپاہی قتل و مجروح کردیئے گئے ۔ اس کے علاوہ

برطانوی بیڑہ نے پانچ ہزار جرمن سپاہی سمندر میں غرق کردیئے اور جرمنی کے تقریباً دوسو بمبار ہوائی جہاز اور ڈھائی سو فوج لیجانے والے ہوائی جہاز بھی تباہ و برباد ہوئے۔ برطانوی جنرل برطانوی سمندری بیڑے کی مدد سے اپنے سترہ ہزار سپاہی کریٹ سے صاف بچا لائے۔ اسی دوران میں بحری بیڑوں کا بھی مقابلہ ہوا اور گو برطانیہ کے بھی کئی جہاز برباد ہو گئے لیکن ان سب کے معاوضہ میں بسمارک نامی جرمنی کے مشہور و معروف جنگی جہاز کو غرق کردیا گیا جس کے متعلق ہٹلر کا دعویٰ تھا کہ وہ ایسا مضبوط تیار ہوا ہے کہ کسی طرح سے غرق ہی نہیں ہوسکتا ہے۔ اس عظیم الشان جنگی جہاز کی غرقابی برطانوی بیڑہ کی ایک زبردست فتح ہے۔ کیونکہ جرمنی کے لئے اس نقصان کو پورا کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ معرکۂ کریٹ کے دوران میں اٹلی اور جرمنی کے کئی اور بڑے بڑے جہاز غرق کر دیئے گئے۔ برطانیہ کو بھی نقصان پہونچایا گیا لیکن جیسا کہ ہم آگے چلکر دیکھیں گے یہ نقصان دشمن کے نقصانات کے مقابلے میں بہت کم رہا۔

معرکۂ کریٹ کے متعلق اکثر لوگوں کو سخت مایوسی ہوئی ہے جس کی آوازِ بازگشت انگلستان کے اخبارات اور برطانوی پارلیمنٹ کے مباحثے میں سنائی دی لیکن ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو پچھلی جنگ یورپ کے دوران میں بھی اس قسم کے کئی دلشکن واقعات ہوئے تھے۔ ایسی سخت اور تند لڑائی میں جیسی کہ آجکل ہو رہی ہے ہم کو وقتاً فوقتاً ناگوار باتیں برداشت کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔ مگر کریٹ کی شکست کے بھی بعض خوش گوار پہلو ہیں جیسا کہ برٹش اخبار ڈیلی اکسپرس کے فوجی نامہ نگار نے لکھا ہے کہ برطانوی فوج نے کریٹ میں رات دن ایک کرکے ہٹلر کے اٹھارہ ہزار بہترین جوان موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ اس کا بیان ہے کہ اس معرکہ میں جرمنی کے تقریباً چھ سو بہترین حملہ آور ہوائی جہاز برباد ہوئے۔ انگریزی فوج کو ہوائی جہازوں سے اترنے والی فوج کے مقابلے کا بھی غیر معمولی تجربہ حاصل ہوگیا۔ کیونکہ معرکۂ کریٹ سے پہلے دنیا کی تاریخ میں اس قدر کثیر فوج نے ہوائی جہازوں کے ذریعہ پہونچکر کبھی کسی ملک پر ایسا زبردست حملہ نہیں کیا تھا۔ کریٹ کا تجربہ برطانوی فوج کے لئے خود برطانیہ میں اس قسم کے حملہ کی مدافعت میں بڑا مفید ثابت ہوگا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ یہ تجربہ اتحادیوں کے لئے بڑا تلخ تجربہ تھا۔

مگر اس جنگ میں کسی ایک میدان کے سر نہ ہونے سے بددل ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مجموعی حیثیت سے مختلف محاذوں پر نظر ڈال کر ہم کو اپنی رائے قائم کرنا چاہیئے۔ جرمنی نے یونان کو فتح کرکے فی الحال اٹلی کے حوالہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے لیکن ۲۰ مئی کو مشرقی افریقہ میں اٹلی کی عظیم الشان سلطنت کا بالکل خاتمہ ہی ہوگیا۔ اس وقت تک تقریباً ڈھائی لاکھ اطالوی سپاہی برطانیہ کی قید میں آچکے ہیں ابی سینیا (حبش) اطالوی قبضے سے بالکل نکل گیا۔ اور سابق شاہ حبش پھر اپنے پرانے پایہ تخت ادیس ابابہ میں

پہونچ گئے ہیں۔ شروع سنہ ۱۹۴۱ء میں مشرقی افریقہ میں تین لاکھ مستقل اٹالین فوج موجود تھی، جس میں ایک لاکھ خالص اطالوی سپاہی تھے، ان کے ساتھ ایک ہزار بڑی توپیں، صدہا آہن پوش ٹینک اور بہت سے ہوائی جہاز بھی تھے۔ پچھلے چار ماہ کی لڑائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ ساری فوج تباہ اور اُس کا کل سامان برباد ہوگیا۔ اس فوج کے ایک لاکھ تیس ہزار سپاہی قید اور پچپن ہزار قتل ہوئے، باقی یا تو گم ہیں یا کسی نہ کسی طرح ختم ہوچکے ہیں۔ اس عظیم الشان فوج کا سارا سامان انگریزوں کے ہاتھ لگا اور سات لاکھ مربع میل کی اراضی اٹلی کی سلطنت سے نکل گئی۔ اس وقت تک جو نوآبادیاں اٹلی کے قبضے سے نکل گئی ہیں اُن کا رقبہ ایشیائے کوچک کے برابر اور برطانیہ سے سات گنا زیادہ ہے۔ اطالوی فوج کے سپہ سالارِ اعظم ڈیوک اوسٹا (Duke Aosta) اور ان کے ساتھ کے دوسرے کئی بڑے بڑے جنرل بھی گرفتار کرلئے گئے ہیں۔ جو سامان جنگ ضائع ہوا اس کی قیمت کا اندازہ دس ارب پاؤنڈ لگایا گیا ہے جس کی تیاری کے لئے پورے دو سال درکار ہونگے۔ اطالوی سپاہیوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا لیکن انگریزی جنرلوں کی حسنِ تدبیر اور اُن کے سپاہیوں کی پامردی کے آگے کچھ پیش نہ گئی۔ افریقہ کے معرکوں میں ہندوستانی فوج نے بھی بڑی جوانمردی دکھائی۔ ہمارے لئے یہ بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں نے ہر جگہ جہاں اُنھیں اب تک بھیجا گیا ہے اپنی بہادری کے بے نظیر ثبوت دیئے۔ حال میں ہمارے ایک نوجوان فوجی افسر لفٹنٹ بھگت کو جن کی عمر ابھی صرف ۲۳ سال کی ہے ملکِ معظم نے اس کی بے نظیر جوانمردی کے اعتراف میں برطانیہ کا سب سے بڑا جنگی اعزاز وکٹوریہ کراس عطا کیا ہے۔

ان شاندار فتوحات کے علاوہ برطانیہ کو عراق کے معرکہ میں قابلِ قدر کامیابی حاصل ہوئی۔ جرمنوں نے بعض ذی اثر عراقیوں کو انگریزوں کی مخالفت پر ابھارا تھا چنانچہ رشید علی جیلانی نے اپنی طرف کچھ فوج کرکے عارضی طور پر گورنمنٹ عراق پر قبضہ کرلیا۔ مگر چند ہی روز میں رشید علی کو ایران بھاگنا پڑا اور زیادہ خونریزی کے بغیر اب اس بغاوت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ بغداد میں ایک ماہ کے شور و شر کے بعد پُرانی حکومت ازسرِنو قائم ہوگئی ہے، اور برطانوی سفارت خانہ کو پھر اس کی پُرانی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ جرمنی نے مصر پر بھی دست درازی شروع کی ہے لیکن اسکندریہ کی شہری آبادی پر متعدد ہوائی حملوں سے جان و مال کا نقصان پہونچانے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ برطانیہ نے اس کا ردِّ عمل یہ کیا کہ فوراً ہی آزاد فرانسیسی فوج کی امداد سے سیریا کو وشی گورنمنٹ کی غلامی سے آزاد کرنے کی عملی تدبیر شروع کردی۔ چنانچہ اس وقت تک کئی اہم مقامات اتحادیوں کے قبضہ میں آگئے ہیں، دمشق پر بھی عنقریب ہی قبضہ ہونیوالا ہے۔ سیریا میں داخل ہوتے ہی آزاد فرانسیسی اور برطانوی افسروں نے سیریا اور اُس کے مضافات کو آزاد کرنے کا اعلان کردیا۔

تیئیس[23] سال ہوئے اتحادی فوجیں سیریا کو وسطی دول یورپ سے آزاد کرانے کی غرض سے اس ملک میں داخل ہوئی تھیں۔ اب انھوں نے اُسے سیاسی و اقتصادی آزادی دلانے کا وعدہ کیا ہے۔ پچھلی جنگ کے خاتمے پر سیریا کی حکومت جمہوریہ فرانس کے سپرد کی گئی تھی۔ مگر جمہوریہ فرانس نے اسکے ساتھ لیے وعدے پورے نہیں کئے اور اب خود فرانس کی جمہوری حکومت بھی قائم نہیں رہی۔ اس طرح اخلاقی حیثیت سے وشی گورنمنٹ کو سیریا پر قبضہ قائم رکھنے کا کوئی حق باقی نہیں رہا، لیکن وہ اب بھی سیریا پر قبضہ رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اتحادی سیریا کو حتی المقدور نقصانات سے بچانا چاہتے ہیں اس لیے اتحادی فوج نرمی سے کام لے رہی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ عنقریب سیریا آزاد ہو جائے گا کیونکہ اس پر موجودہ فرانسیسی حکومت کا قبضہ قائم رہنا اتحادیوں کے لئے بہت مخدوش ہے۔ اس کے ہوائی اڈوں سے جرمن عراق اور موصل کے تیل کے چشموں، نیز فلسطین اور مصر پر آسانی سے حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر سیریا اتحادیوں کے ساتھ ہو جائے تو عراق، خلیج فارس اور ہندوستان تک کی آسانی سے حفاظت کی جا سکتی ہے اور سائپرس بھی بہت کچھ محفوظ ہو سکتا ہے۔ بغداد ریلوے کا ایک حصہ سیریا ہوتے ہوئے ترکی جاتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ سیریا کو آزادی دے کر اتحادی اپنا اکیس سال کا پُرانا عہد پورا کر رہے ہیں جو انھوں نے پچھلی جنگ کے خاتمے پر کیا تھا۔ اور جسے فرانس ایک لیت و لعل میں ڈالے ہوئے تھا۔ سیریا کی آبادی تیئیس[32] لاکھ اسی ہزار ہے جس میں تقریباً چوبیس[24] لاکھ مسلمان اور تقریباً سات لاکھ عیسائی ہیں۔ ہم کو اُمید کرنا چاہیے کہ جس پالیسی کا برطانیہ نے سیریا میں اعلان کیا ہے اس کو آئندہ بھی اپنے تمام نوآبادیات میں قائم رکھیگی۔

بحر اطلانتک کی لڑائی میں بھی برطانیہ اپنی پوزیشن بخوبی قائم کئے ہوئے ہے۔ شروع ہی سے فریقین ایک دوسرے کے جہازوں پر بے پناہ حملے کر رہے ہیں۔ آخری نتیجہ کیا ہوگا اس بارے میں قطعی حکم لگانا تو مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہٹلر نے جو دعویٰ کیا تھا کہ وہ مارچ ۱۹۴۱ء کے شروع ہوتے ہی برطانوی جہازوں کی آمد و رفت بند کر دیگا وہ پورا نہیں ہوا اور امید ہے کہ آئندہ بھی پورا نہ ہوگا۔ یوں تو پچھلے بیس[20] ماہ سے جہازوں پر برابر حملے ہو رہے ہیں جن سے اوسطاً ہر ماہ تین لاکھ چھ ہزار چار سو ٹن کے وزنی جہازوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ پچھلے مہینوں میں سب سے زیادہ نقصان مارچ ۱۹۴۱ء ہی میں ہوا جب چار لاکھ نواسی ہزار ٹن وزنی جہاز غرق کئے گئے۔ لیکن اس نقصان کی اصلی اہمیت اُسی وقت ذہن نشین ہو سکتی ہے جب ہم یہ سمجھ لیں کہ برطانیہ کے اس سے چوگنے پچگنے وزن کے جہاز ہر وقت بحر اطلانتک سے گذرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ برطانوی بمبار کشتیاں بھی جرمن جہازوں پر حملے کرتی رہتی ہیں۔ مثلاً پچھلے مئی ۱۹۴۱ء میں ان حملوں کی بدولت جرمنی کے دو لاکھ ستاون ہزار ٹن وزنی جہاز غرق ہوئے۔ برطانیہ کا نقصان تین لاکھ چالیس ہزار ٹن سے

زائد نہیں ہوا۔ پچھلے چند مہینوں کے برطانوی نقصانات کی تفصیل یہ ہے:۔

جنوری ۱۹۴۱ء	تین لاکھ چھ ہزار	فروری ۱۹۴۱ء	تین لاکھ ۴۴ ہزار
مارچ ۱۹۴۱ء	چار لاکھ ۸۹ ہزار	اپریل ۱۹۴۱ء	چار لاکھ ۵۴ ہزار

مئی ۱۹۴۱ء تقریباً تین لاکھ ۵۴ ہزار جس میں معرکۂ کریٹ کے نقصانات بھی شامل ہیں۔

اسی طرح اپریل کے نقصانات میں بحر اکجین کے ایک لاکھ ستر ہزار ٹن کے نقصانات شامل ہیں۔ بحری نقصانات کے ساتھ ہی ساتھ ہم کو ہوائی جنگ کے نقصانات کا بھی مقابلہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وسط مشرق کے مختلف محاذوں پر (بشمول عراق) مئی ۱۹۴۱ء میں اتحادیوں نے دشمن کے سولہ سو چھیانوے (۱۶۹۶) ہوائی جہاز تباہ وبرباد کئے، مگر دشمن ان کے دوسو ساٹھ (۲۶۰) ہوائی جہازوں سے زیادہ تباہ نہ کرسکا۔ اسی طرح برطانیہ کی سرزمین پر ۱۴۳ بمبار ہوائی جہاز نیچے گرائے گئے۔ اگر سب قسم کے ہوائی جہازوں کو شامل کرلیا جائے تو برطانیہ نے دشمن کی ۲۵۸ مشینیں تباہ کیں، اس کے مقابلے میں برطانیہ کی طرف ۶۲ مشینیں برباد ہوئیں۔ گویا برطانیہ اور جرمنی کے نقصانات ایک اور چار کی نسبت سے ہوئے۔

یہ اعداد و شمار تسلی بخش ہیں، اور اگر ہم امریکہ کی بڑھتی ہوئی امداد کا اندازہ کریں تو پھر اتحادیوں کی آخری فتح کے متعلق کوئی خدشہ باقی نہیں رہتا ہے۔ اس وقت امریکہ کے کارخانے اس زور شور سے کام کررہے ہیں آئندہ چھ ماہ یعنی ۱۹۴۱ء کے آخر تک ۱۲½ لاکھ ٹن وزن کے سوداگری جہاز تیار ہوکر مکمل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اور اگلے سال یعنی ۱۹۴۲ء میں ۳۵ لاکھ ٹن وزن کے جہاز اور ۱۹۴۳ء میں پچاس لاکھ ٹن وزن کے جہاز تیار کرنے کا بند و بست ہورہا ہے۔ ان جہازوں کی قیمت کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ ۵۰۰ سوداگری جہازوں کی تیاری میں ایک ارب ½ ۶۲ لاکھ ڈالر کا صرفہ آتا ہے۔

پریسیڈنٹ امریکہ نے ہر ممکن طریقہ سے برطانیہ کی امداد کا تہیہ کرلیا ہے۔ چنانچہ اس وقت وہ بڑی سرگرمی سے جرمن جاسوسوں کی شرارتوں کا تدارک کررہے ہیں جو آئے دن کارخانوں میں ہڑتال کرا کے برطانیہ کی امداد کے کام میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ پریسیڈنٹ موصوف نے ۱۳-جون کو جنگی سامان بنانے والے کارخانوں کو سرکاری انتظام میں چلانے کا اختیار لے لیا ہے۔ انھوں نے اسی ماہ ایک بہت بڑے صنعتی کارخانے کی ہڑتال حکماً ختم کردی۔ امریکن سینیٹ کے ۶۴ ممبروں نے (بخلاف ۲۵) اس حق کی تائید میں ووٹ دئیے حال میں پریسیڈنٹ روزویلٹ نے امریکہ کے مختلف شہروں سے جرمنی کی سفارتی ایجنسیوں کے بند کردینے کا بھی حکم جاری کیا ہے۔ یہ ایجنسیاں بظاہر سفارتی ضروریات اور تجارتی معاملات طے کرنے کی غرض سے قائم تھیں لیکن دراصل ان میں جرمنی کا سیاسی پروپیگنڈا ہوتا تھا۔ پریسیڈنٹ صاحب نے جرمنی کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے

ان ایجنسیوں کو یک لخت ختم کردیا ہے۔ عام خیال ہے کہ اس حکم کے بعد برطانیہ کے ساتھ امریکہ کے باضابطہ شریکِ جنگ ہونے میں بہت ہی کم کسر رہ جاتی ہے۔ شروع جون سنہ ۴۱ء میں عام باشندگانِ امریکہ کی رائے کا جو اندازہ کیا گیا تھا اس کے مطابق (۶۲) باسٹھ فیصدی امریکن جنگ میں فوراً شامل ہونے کی طرف تھے باقی میں چھبیس (۲۶) فیصدی لوگ جنگ سے علیحدہ رہنے کی طرف اور بارہ (۱۲) فیصدی بالکل غیر جانبدار تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ عنقریب ہی اسی (۸۰) یا پچھتر (۷۵) فیصدی امریکن جنگ کے موافق ہو جائیں گے اور پھر پریسیڈنٹ صاحب کو اعلان جنگ کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگا۔ حالات تیزی کے ساتھ امریکہ کو جنگ کی طرف لئے جا رہے ہیں وسط جون میں جرمنی نے رابن مور نامی امریکن جہاز ڈبو دیا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق امریکہ نے جرمنی سے جواب اور نقصان کا معاوضہ طلب کیا ہے۔ پریسیڈنٹ صاحب امریکن جہازوں کی حفاظت کے تمام ضروری انتظامات کرنے پر آمادہ معلوم ہو رہے ہیں۔ مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ نے اہل امریکہ سے اپیل کی ہے کہ برطانیہ کی امداد میں وقت کی تنگی کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ مسٹر موصوف نے اسی تقریر میں کہا ہے کہ خواہ کتنی ہی مشکلات کیوں نہ پیش آئیں لیکن برطانیہ آخر وقت تک اپنی اور دوسرے ملکوں کے آزادی کی اٹل حفاظت کرتا رہے گا۔

چند دنوں سے جرمنی خاموش ہے، دیکھئے روس کی طرف توجہ ہوتی ہے یا برطانیہ پر حملہ کا خیال پورا کیا جاتا ہے۔

شاید برطانیہ کے پارلیمنٹری حلقوں میں ہندوستانی مسئلہ کے متعلق کچھ بے اطمینانی پیدا ہو رہی ہے پچھلے پارلیمنٹری مباحثہ سے بھی یہی ترشح ہوتا تھا اور حال کے واقعات سے بھی یہی بات ظاہر ہو رہی ہے۔ واقف حال انگریز اور مزدور پارٹی کے ممبران مسٹر ایمرے وزیر ہند کے طرز عمل سے مطمئن نہیں ہیں، اور اس بات کی کوشش شروع ہو گئی ہے کہ جب مسٹر چرچل اپنے وزیروں میں ردّ و بدل کریں تو مسٹر ایمرے کو ان کی مسلمہ قابلیت کے مطابق کوئی اور موزوں و مناسب عہدہ دیدیا جائے۔ اور ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور کسی دوسرے ہمدرد، تجربہ کار اور روشن خیال مدبر کے سپرد کی جائے۔ اس سلسلہ میں مسٹر ویجووڈ بین کا نام لیا جاتا ہے جو لیبر گورنمنٹ کے زمانے میں وزیر ہند رہ چکے ہیں۔ مگر کوئی وزیر ہند وزیر اعظم کی پالیسی کے خلاف عملی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اور مسٹر چرچل نے ابھی تک ہندوستان کے متعلق ایک حرف بھی اپنی زبان فیض ترجمان سے نہیں نکالا ہے۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسٹر ایمرے کا غیر ہمدردانہ رویہ کہاں تک خود ان کی رائے کا عکس ہے اور کہاں تک وہ اس بارے میں مسٹر چرچل کی ہمنوائی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات محتاج تشریح نہیں ہے کہ مسٹر ایمرے وزیر ہند کی حیثیت سے قطعاً ناکامیاب ثابت ہوئے ہیں چنانچہ جب کبھی پارلیمنٹ میں یا اس کے باہر ان کو ہندوستان کے متعلق کچھ کہنے کا موقع ملا ہے ان کی باتوں سے

اہل ملک کو شکایت ہی کا موقع ملا ہے۔ کانگریس کا تو ذکر ہی کیا ہے، انھوں نے ہندوستان کے مسلمہ و مستند وفادار لبرل لیڈران کو بھی اپنے بیجا شکوک اور ناروا الزامات سے ناراض کر دیا ہے۔ حال میں ان کی جو دو ایک تقریریں ہوئی ہیں اُن میں کوئی تقریر ایسی نہیں ہے جو نکتہ چینی سے بالاتر کہی جا سکے۔ غالباً مسٹر ایمرے اور اُن کے ہم خیال لوگ جنگ کے دوران میں ہندوستان کے ملکی انتظامات میں کسی اُصولی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھتے، اسی لئے وہ ایک نہ ایک بہانہ سے ہندوستانی مدبروں کے مطالبوں کو برابر ٹالتے رہتے ہیں۔ مسٹر ممدوح سے بارہا یہ بھی اپیل کی گئی کہ ہندوستان آکر اور حالات کا خود مشاہدہ کر کے تمام مطالبات کے متعلق مناسب فیصلہ کریں، مگر انھوں نے اس پر بھی کوئی دھیان نہیں دیا اور اس زحمت کو غیر ضروری سمجھا۔ اپنی تقریروں میں وہ کبھی کوئی بات کہکر اور کبھی کوئی اور بات کہکر معاملے کو برابر ٹالتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی مطالبات پُورے کرنے کی تو انھیں کوئی عجلت نہیں لیکن اُن کی یہ خواہش ضرور ہے کہ تمام ہندوستان بلا پس و پیش جنگی امداد پر کمربستہ نظر آئے۔ انگریزی مدبروں کی اس وقت عام طور پر یہی خواہش معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ شروع جون میں مس ایلنار راتھبورن صاحبہ ممبر پارلیمنٹ[ے] نے کانگریسیوں کے نام ایک کھلی چٹھی بھیجی جس میں انھوں نے جنگ کے بارے میں پولیٹیکل لیڈروں کے رویہ کی سخت شکایت کی ہے اور آخر میں اُن کا لہجہ دھمکی آمیز بھی ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی طرف سے اس کا مفصل اور ترکی بہ ترکی جواب شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور نے دیدیا ہے۔ ٹیگور ان روشن خیال ملکی رہنماؤں میں ہیں جو انگریزی راج کے احسانات تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اس بزرگی کے زمانے میں شاعر اعظم نے جن الفاظ میں بعض تلخ حقیقتوں کا اظہار کیا ہے، اس سے اس وقت عام ہندوستانیوں کی اندرونی بد دلی کا ثبوت ملتا ہے۔ حال میں چند اور انگریزی عورتوں نے بھی ہندوستان کی عورتوں سے جنگی امداد کی اپیل کی ہے۔ اس کا جواب مسز وجے لکشمی پنڈت صاحبہ نے (جو صوبۂ متحدہ کی کانگریسی گورنمنٹ میں وزیر رہ چکی ہیں اور حال میں ستیاگرہ کے سلسلے میں اپنی سزا ختم کر کے جیل خانہ سے رہا ہوئی ہیں) اچھے طور پر دیدیا ہے۔ کانگریسی ستیاگرہ کے سلسلے میں اس وقت تقریباً بیس ہزار محبِ وطن جیل خانوں میں بند ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ حالت کسی نقطۂ خیال سے قابل اطمینان نہیں ہے اس لئے ہماری رائے تو یہی ہے کہ اس حالت کو جلد سے جلد ختم کر دینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں یہ بات تسلی بخش ہے کہ تمام دلشکن حالات کے باوجود دونوں ملکوں کے چند ذی اثر اصحاب اس گتھی کو سُلجھانے کی کوشش جاری کئے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو اور کنور سر جگدیش پرشاد صاحبان آخری ہفتۂ جولائی میں بمبئی کانفرنس کا ایک دوسرا اور پہلے سے وسیع تر اجلاس منعقد کر رہے ہیں۔ اُدھر برطانیہ کے چند اُلوالعزم نوجوان آکسفورڈ یونیورسٹی میں آئندہ ماہ کے آخر تک مدبران برطانیہ کی ایک مشاورتی کانفرنس طلب کر رہے ہیں جس میں ہندوستان کے قائم مقام بھی

ے Miss Eleanar Ruthborne M.P.

مدعو ہونگے اور یہ چھ دن تک برابر جاری رہیگی۔ اس کانفرنس میں مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ کے شرکت کی بھی اُمید کی جاتی ہے۔ دیکھیے اِن تحریکوں کا کیا نتیجہ ہوتا ہے' اور ملک کے لئے کوئی مفید بات نکلتی ہے یا نہیں

پچھلے دو مہینوں سے تحریک پاکستان میں کچھ ضعف آتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ مسلم لیگ کے دو مقتدر رکن سر سکندر حیات اور مسٹر فضل الحق نے اپنے اپنے طریقہ سے اس کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ بیدار مغز وزیر اعظم پنجاب تو بارہا اپنی تقریروں میں اس سے اپنی بے تعلقی بلکہ بیزاری کا اظہار کر چکے ہیں، اب پُرجوش وزیر اعظم بنگال نے بھی سیاسی سمجھوتہ کی خواہش ظاہر کی ہے اور ماضی و حال کے تمام صوبجاتی وزیروں کی ایک گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی ہے۔ اتنے دنوں کی خاموشی کے بعد مدبران ملک میں سمجھوتہ کی خواہش پیدا ہونا آئندہ کے لئے فال نیک ہے۔ حال میں بعض معززین نے بھی تحریک پاکستان کی علانیہ مخالفت کی ہے۔ مثلاً نواب صاحب مرشد آباد نے ۱۰ جون ۱۹۴۱ء کو اخبارات کے نام ایک مفصل بیان شائع کیا ہے، جس میں اُنھوں نے ملک کے مختلف طبقوں میں اتفاق باہمی کی ضرورت پر بہت زور دیا ہے اور فرقہ وارانہ اسپرٹ کی ترقی کو ملک کے لئے سخت مضر قرار دیا ہے۔ آپ کی رائے میں سیاسی دور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ خیر خواہانِ ملک اس موقعہ پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوئے خاموش نہ بیٹھے رہیں بلکہ اُس تحریک کو جسے وہ بدنصیب سمجھتے ہیں اپنا سر اُٹھانے کا موقعہ ہی نہ دیں۔ آپ کی رائے میں اس کا نتیجہ اس کے سوائے اور کچھ نہیں نکل سکتا کہ ہندوستان کی دُور تک پھیلی ہوئی آبادی میں جنم بھر کا بَیر ہو جائے۔ اس لئے ہندوستان کی حقیقی بیداری اس میں ہے کہ اس کے ہر طبقہ کے لیڈران ملکی ترقی کے دشوار گذار راستے میں کوئی ایسی رکاوٹ باقی نہ رہنے دیں جو ہمارے آخری اور مشترکہ سیاسی مقصد کے حصول میں سدِ راہ ہو۔ آپ لکھتے ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کے ہندو مسلمان جو عہدِ مغلیہ سے ابتک بھائیوں کی طرح رہتے چلے آئے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے قطع تعلق کر کے جدا نہیں ہوئے ہیں اس نازک وقت پر بھی امن اور صلح کے ساتھ نہ رہیں۔

۸ جون کو مسٹر ایم شریف سابق وزیر صوبۂ متوسط کی صدارت میں احاطۂ مدراس کے ضلع کمبا کونم میں جنوبی ہند کے مسلمانوں کی اینٹی پاکستان کانفرنس ہوئی۔ مسٹر شریف کی صدارتی تقریر ہندوستان کی ملکی یگانگت کا ایک پُرزور اور مدلل بیان ہے۔ اُنھوں نے بجا طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ جمہوریت میں کثیر التعداد طبقہ کا اولین فرض ہے کہ وہ قلیل تعداد والی جماعتوں کی پُوری طور پر حفاظت کریں، مگر انکی رائے میں محض حقوق پر زور دینے سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کے سوائے اور کچھ نہ ہوگا۔ یہ کانفرنس ہر حیثیت سے جنوبی ہند کے مسلمانوں کی نمایندہ کانفرنس تھی۔ اور مارچ کی پاکستانی کانفرنس کے بعد اس نے ان اطراف کے تمام مسلمانوں کی وکالت کا پورا حق ادا کر دیا۔ مسٹر شریف کو ذاتی حیثیت سے کانگریس ہائی کمانڈ سے کافی شکایات ہیں مگر اُن کی حُبِ وطنی کی تعریف کرنا چاہیئے کہ اُنھوں نے ذاتی شکایتوں سے متاثر ہو کر کانگریس سے کنارہ کشی نہیں کی۔

مدراس مسلم لیگ کے بعض بڑے بڑے لیڈران نے بھی پاکستان کی تجویز سے اپنا اختلاف ظاہر کیا ہے۔ دوسرے صوبوں کے اکثر لیڈران اس تحریک کی محض اس لئے تائید کر رہے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ یہ انقلابی مطالبہ اُن کے فرقہ کے لئے مفید ہوگا، کیونکہ اس طرح کانگریس ملکی یگانگت قائم رکھنے کی دھن میں ان کی جائز اور ناجائز سب باتیں منظور کرلے گی۔ اس خیال کی پرزور تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حال میں حیدرآباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے جو موجودہ تجویز پاکستان کے اولین محرک ہیں خاص خاص کانگریسی لیڈروں سے اس مسئلہ پر مفصل خط و کتابت کی ہے۔ آپ کی صاف اور صریح رائے ہے کہ مسلمان پاکستان کی تجویز سے دست بردار ہو جائیں اگر اُن کو اس بات کا اطمینان دلا دیا جائے کہ ہندوستان کے اُتر پوربی اور اُتر پچھمی حصوں میں جہاں اُن کی کثیر تعداد ہے اُنھیں مرکزی حکومت کی مداخلت کے بغیر اندرونی انتظامات کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے ڈاکٹر لطیف کی چٹھی کے جواب میں عام طور پر اس مطالبے سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے اصلاحات کی رو سے صوبوں کو اندرونی معاملات میں بہت کچھ اختیارات حاصل ہوگئے ہیں۔ ان اختیارات کے ضروری اضافہ میں بھی انھیں کوئی عذر نہیں ہے۔ لیکن ملکی حفاظت اور خارجی معاملات میں وہ صوبوں کو مرکزی حکومت سے آزاد کرنے کے سراسر خلاف ہیں اور اس میں کوئی کمی برداشت نہیں کرسکتے۔ یہی پوزیشن ہر دور اندیش محب وطن کی ہوگی جو ملکی ضروریات کو صوبہ اور فرقہ سب سے بالاتر سمجھتا ہے۔ برطانوی مدبر بھی اس سے منحرف نہیں ہوسکتے۔ خواہ اس وقت وہ کسی مصلحت سے اس امر کا صاف اعلان کریں یا نہ کریں۔

پاکستان کے ایجی ٹیشن نے عوام کو عجیب و غریب غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ انھیں میں ایک خاص غلط فہمی کا جو ریاست حیدرآباد کی مسلم آبادی میں رفتہ رفتہ پھیلائی گئی ہے ہز اگزالٹڈ ہائی نس اعلیٰحضرت نظام دکن نے بروقت نوٹس لیا ہے۔ کچھ دنوں سے عوام حیدرآباد میں یہ نظریہ پھیلایا جا رہا ہے کہ خسرو دکن ریاست کی مسلم آبادی کے قائم مقام کی حیثیت سے ریاست دکن کے حکمراں ہیں۔ یہ انوکھا نظریہ تاریخی نقطۂ خیال سے سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔ مگر اس کا زہر آہستہ آہستہ عوام میں سرایت کر رہا تھا۔ لیکن بیدار مغز حکمران ریاست نے اس باہمی نااتفاقی اور بدامنی کی تخم ریزی کا سدباب کر دیا اور ایک خاص فرمان جاری فرما کر اس دعویٔ باطل کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اعلیٰحضرت نے پچھلے دو ماہ میں پے درپے تین اہم فرمان جاری فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک میں اس بات کی پرزور تردید کے بعد کہ رعایا کے کسی طبقہ کو حکومت میں کوئی خاص دخل یا پوزیشن حاصل ہے جو دوسرے طبقوں کو نہیں ہے اس امر کا بخوبی اطمینان دلایا گیا ہے کہ اعلیٰحضرت خود بدولت اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ ان کی رعایا کے ہر فرد کے ساتھ بلا لحاظ اس کے کہ وہ اعلیٰ ہے یا ادنیٰ، امیر ہے یا غریب یکساں انصاف اور مساوات کا سلوک کیا جائے گا۔ تیسرے فرمان میں ہز اگزالٹڈ ہائی نس نے اس بات کو آئینہ کی طرح صاف کر دیا ہے کہ انکی اور اُن کے بزرگوں کی ہمیشہ یہی

The Zamana, July 1941. Regd. No. A[illegible]

زمانہ

مرتبہ دیانرائن نگم

نمبر ۱	جولائی سنہ ۱۹۴۱ء	جلد ۷۷

فہرست

... زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

زمانہ

جلد | جولائی سنہ ۱۹۲۱ء

فہرست

کروڑوں

امریکہ والوں کے نزدیک کروڑوں تو کوئی چیز ہی نہیں ہے اسی لئے اُن کے تمام تخمینے اربوں میں کئے جاتے ہیں۔ تازہ مگر کسیقدر حوصلہ فرسا مثال ان نقصانات کا تخمینہ ہیں جو امریکہ میں ملیریا سے ہوئے ہیں راک فیلر فاونڈیشن کے کارکنان نے ملیریا کے ذریعہ سے سالانہ مالی نقصانات کا تخمینہ نو کروڑ تیس لاکھ پونڈ کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ٹیلی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر جواچکے تو انھوں نے نقصانات کا تخمینہ ۵ کھرب کیا اور لکھا کہ امریکہ میں ہر سال کم از کم پچاس لاکھ آدمی ملیریا سے بیمار ہوتے ہیں۔ اعداد وشمار میں اسقدر تضاد کے باوجود یہ حیرت انگیز واقعہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ امریکہ جیسے اعلے درجہ کے ملک میں ملیریا کا مرض ابھی تک صحت کا سب سے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ جسے ہونا نہیں چاہیئے تھا۔ کیونکہ امریکہ کے لوگ نہ تو مفلس ہیں اور نہ انسداد ملیریا کے طریقوں سے ناواقف ہیں امریکہ کے محکمہ صحت عامہ کی طرف سے ملیریا کے مریضوں اور ملیریا سے واقع شدہ موتوں کی تعداد شایع کی جاتی ہے لیکن یہ کبھی صحیح نہیں ہوتی ہے۔ پارسال موسم خزاں میں ڈاکٹر ایل ایل ولیمس جونیر انچارج شعبۂ ملیریا محکمہ صحت عامہ امریکہ نے تخمینہ لگایا تھا کہ اچھے برسوں میں ملیریا کے مریضوں کی تعداد ۲۰ لاکھ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب ملیریا کی وبا پھیلتی ہے تو مریضوں کی تعداد ساٹھ لاکھ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہ تعداد جنوب مشرقی ریاستوں کی آبادی کے چھٹے حصے کے برابر ہے۔

دو برس ہوئے امریکہ کے محکمہ صحت عامہ نے اعلان کیا تھا کہ لیگ اقوام کے ملیریا کمیشن نے کونین کی جو خوراک مقرر کی ہے اسکی وہ تائید کرتا ہے۔ یہ خوراک انسداد ملیریا کے لیے چھ گرین روزانہ اور علاج ملیریا کے لئے پندرہ بیس گرین روزانہ پانچ سات دن تک ہے۔ ملیریا کمیشن کی رپورٹ بابت ۱۹۳۷ء کے صفحہ ۱۲۵ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ واقعی ملیریا کی دواؤں میں جہانتک رواج کا تعلق ہے کونین کا درجہ اول ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو وہ طبی طور پر موثر چیز ہے ، دوسرے وہ بے ضرر ہے۔ تیسرے اس کا طریقہ استعمال اور اس کی خوراک ہر کوئی جانتا ہے۔

محمد بہادر شاہ ظفر:۔ خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ از منشی محمد امیر احمد علوی۔ بی۔ اے اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے قیمت عہ ر

میدان عمل:۔ منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے اس میں ملک کی موجودہ بیداری کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ و دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے بہ حد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے صفحات پانسو کتابت اعلیٰ، کاغذ نفیس، روشن طباعت خوبصورت اور مضبوط جلد دیدہ زیب ڈسٹ کور قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ عہ

مثنوی سحر:۔ یعنی شکنتلا اور دشمنت کا اردو ترجمہ حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز، دوسرا ایڈیشن جس کی مصنف نے نظر ثانی کی ہے قیمت آٹھ آنہ ۸ ر

نصائح چانکیہ:۔ یعنی نامور ہند چانکیہ کے مشہور و معروف دبنیتی کا ترجمہ از جناب پنڈت ہنمنت راؤ صاحب مددگار خزانہ سرکار عامرہ گورنمنٹ نظام قیمت چھ آنہ ۶ ر

قومی نمبر رسالہ زمانہ جس میں ۲۷ قابل دید مضامین نظم و نثر اور رنگین و سادہ تصاویر بہا تا

گاندھی، لالہ لاجپت رائے۔ ڈاکٹر سپرو۔ مسز نائیڈو و ڈاکٹر اقبال کے خاص پیغامات اور بہت سے قابل دید مضامین نظم و نثر شایع ہوئے ہیں قیمت ایک روپیہ عہ ر

اثرستان:۔ ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرع پر تاثیر اور ہر شعر تیر و نشتر ہے۔ قیمت عہ

زاد راہ:۔ منشی پریم چند مرحوم کی ان کہانیوں کا مجموعہ جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھیں قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ ر

دنیائے تبسم:۔ مشہور مزاحیہ نویس جناب شوکت تھانوی کے بہترین ظرافت آمیز افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ

مجنوں کے افسانے:۔ جناب مجنوں گورکھپوری اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں موجودہ کتاب اُن کے منتخب افسانوں کا مجموعہ قیمت ۱۲ ر

پس پردہ:۔ جناب چندر بھوشن سنگھ کے سات افسانوں کا مجموعہ۔ زبان، پلاٹ اور فلسفیانہ انداز بیان کے اعتبار سے ایک قابل قدر چیز ہے قیمت ۱۲ ر

حیات بیوہ:۔ جس میں مصنف نے بیوگان کی حالت زار کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور اُن کی جانکاہ مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا ہے قیمت ۵ ر

ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور**

زمانہ

جلد ۷۷ جولائی سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۱

اشتراکیت کی جدّوجہد

(السید صدرالدین الحسنی ریڈر اصلاح انسٹی ٹیوٹ آف دستورِ جدید)

یورپ میں اشتراکیت کی عملی تاریخ کا سلسلہ ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتا ہے مگر اس کے پہلے فرانس میں سینٹ سیموں و فوریہ اور انگلستان میں روبرٹ اون جیسے حضرات نے اشتراکی خیالات کی تبلیغ اور اقتصادی تحریک کی تنظیم شروع کر دی تھی۔ چنانچہ انگلستان کی لبرل پارٹی کی ابتدا روبرٹ اون سے منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۴۸ء میں جب کارل مارکس نے ایک جماعتی بیان شائع کیا اُس وقت سے اشتراکیت کے اُصول ایک منظم پروگرام اور لائحہ عمل کی صورت میں دنیا کے سامنے آئے۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء اور اس کے بعد یورپ میں جو کشمکش ہوئی اس کی بنیاد یہی اشتراکیت تھی۔ جرمنی اور فرانس میں اشتراکیوں نے اس کی کوشش کی کہ لیڈری کی باگ ڈور متوسط طبقہ کے ہاتھوں سے چھین لی جائے۔ مگر چونکہ اس وقت انگلستان کے علاوہ یورپ کے کسی ملک میں صنعت و حرفت کی اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ مزدوروں کی طاقت ایک منظم اشتراکی تحریک کو چلانے کے لئے کافی ہوتی اس لئے یہ جد و جہد ناکام رہی اور اشتراکی حریت پسندوں کو ناموافق حالات سے دو چار ہونا پڑا۔

پچھلی نصف صدی میں اشتراکیت کی اس ناکامی سے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب اس کی ترقی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد اشتراکی لیڈروں نے پھر اس تحریک کو زور شور کے ساتھ

شروع کیا اور لندن کا شہر جلا وطن اشتراکی لیڈروں کا ایک پناہ گاہ بن گیا جس کے دامن میں کارل مارکس کی سرپرا ہی میں اشتراکیوں کی ایک بڑی جماعت قائم ہو گئی۔

اس کے بعد سنہ ۱۸۶۴ء میں جب پہلی بین الاقوامی مزدور پارٹی[له] قائم ہوئی تو اشتراکی لیڈروں نے اپنی ساری کوششیں اسی بات پر منعطف کیں کہ یورپ کے مختلف ملکوں خصوصاً جرمنی اور فرانس میں باضابطہ اشتراکی جماعتیں قائم ہو جائیں۔ چنانچہ جرمنی میں ایک طویل عرصہ کی جدوجہد کے بعد ایک جمہوری اشتراکی جماعت قائم ہوئی جس کے بہت سے اصول موجودہ جرمنی میں رائج ہیں۔ یہ جمہوری اشتراکی پارٹی شہنشاہیت کے زوال کے بعد سے برابر جرمنی حکومت میں نمایاں رہی۔ لیکن جب ہٹلر نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اُس وقت اس پارٹی کا شیرازہ بکھر کر نیشنل سوشلزم میں مل جل گیا اور آج سارا جرمنی اسی وطنی اشتراکیت کا پرستار ہے۔

اس کے بعد فرانس میں اشتراکیت کا دو بڑی طاقتوں سے سامنا ہوا، ایک پرڈیون کے متبعین کی جماعت تھی جو قریب قریب انارکسٹ تھے اور ہر اجتماعی مسئلہ کو اشتراکیت کے اصول سے بالکل مختلف طریقے پر جانچنے کے عادی تھے۔ دوسری طاقت بلانکی کے متبعین کی تھی جو اگرچہ کارل مارکس کی رائے سے بڑی حد تک متفق تھے مگر ان کا میلان زیادہ تر بغاوت و انارکی کی طرف تھا۔

اسی طرح اٹلی میں بھی اشتراکیت کے لئے صاف راستہ نہ تھا۔ کیونکہ وہاں ایک طرف اس کی مخالف ماٹزینی کے متبعین کی جماعت تھی، دوسری طرف ایک دوسری پارٹی تھی جو بیکن روسی کے انارکسٹانہ خیالات سے متاثر تھی۔ تقریباً ایسے ہی حالات روس میں بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ اشتراکیوں نے وہاں صنعتی کارخانوں کی عدم موجودگی میں کاشتکاروں کو ورغلایا چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اُنھوں نے آنکھیں کھولیں تو ان کو مارکس کے نظریات سے انارکزم کی راہ بہتر معلوم ہوئی۔

لیکن سنہ ۱۸۷۰ء اور سنہ ۱۸۷۱ء میں روس اور فرانس کی جنگ میں نپولین کی شکست کے بعد جب فرانس میں اشتراکیوں نے زور پکڑا جس سے اُن کو حکومت میں دخل حاصل ہو گیا تو اُس وقت بین الاقوامی مزدور پارٹی کو یورپ میں ایک بلند مقام حاصل ہو گیا۔ فرانس میں اشتراکی حکومت کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی، کیونکہ اول تو یہ حکومت مختلف عقیدوں کے لوگوں کا مجموعہ تھی، دوسرے ان لوگوں نے چند ایسی کارروائیاں کیں جن سے فرانسیسی قوم بگڑ گئی اور اُس نے موسیو تھیرس

[له] یہ بین الاقوامی مزدور پارٹی یعنی یورپین تاریخ میں "پہلی پارٹی" کے نام سے موسوم ہے تاکہ دوسری اور تیسری بین الاقوامی پارٹی میں تمیز ہو سکے جن کا بیان آگے آئیگا۔

کی تائید شروع کر دی جس کی وجہ سے فرانس میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جو تقریبا دو ماہ تک (۱۱ اپریل تا ۲۸ مئی ۱۸۷۱ء) جاری رہی۔ مگر اس میں اشتراکی پارٹی کو شکست ہوئی اور اس کے ہاتھوں سے حکومت چھن گئی۔ اب فرانسیسی جمہوریوں کا راستہ صاف ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے تیسری بار پھر جمہوری حکومت قائم کی۔ جس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ یہ حکومت متوسط طبقہ کی حکومت ہوگی۔ چنانچہ اس وقت تک فرانسیسی حکومت انھیں خصوصیات کے ساتھ قائم رہی۔

فرانس کی پہلی اشتراکی حکومت کے ٹوٹ جانے کے بعد اشتراکی لیڈروں کے حوصلے پست ہوگئے۔ اور یورپ میں اشتراکیت کی حیثیت محض ایک قومی اجتماعی تحریک کی ہوگئی اور مختلف ملکوں میں اسے عروج و زوال کی منزلوں سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ جب جرمنی میں کارل مارکس کے نظریے رواج پذیر ہو رہے تھے۔ اُس وقت پرنس بسمارک اس کی مخالفت پر مستعد ہوگئے، اور اُنھوں نے اُسے سخت سے سخت قوانین میں جکڑ دیا جس کا سلسلہ تقریباً ۱۸۷۸ء سے ۱۸۹۰ء تک جاری رہا۔ اور جس نے اشتراکیوں کو جرمنی سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہ لوگ باہر جاکر بھی اپنی تحریک چلاتے رہے اور بالآخر ان کی کوششوں سے اسے جرمنی میں بہت فروغ حاصل ہوا اور وہاں کی جمہوری اشتراکی پارٹی نے ۱۸۹۱ء میں قومی سیاست کے اندر ایک نمایاں جگہ حاصل کرلی۔ اسی سال سے جرمن اشتراکی جرمن پارلیمنٹ رشتاغ (Riechstag) میں اپنی نشستوں کی زیادتی کے لئے بہت سرگرمی سے کام لینے لگے۔ مگر اس سے پارٹی کے مقاصد اور خیالات میں بہت کچھ انقلاب آگیا۔ اور یہ جماعت ایک دم اعتدال پسند ہوگئی۔ اس تبدیلی کا سب سے بڑا باعث ایڈورڈ برنسٹین تھا۔ گو برنسٹین اور اس کے ہمخیال رفیقوں کو ۱۹۰۳ء کی کانفرنس میں پارٹی سے علٰحدہ کر دیا گیا۔ مگر اس کے موئدین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی وجہ سے پارٹی کے اصولوں میں اہم تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ اور اس کا مقصد انقلاب کے بجائے صرف اصلاح ہوگیا۔ یعنی اس جماعت کی رگ رگ میں اعتدال پسندی سرایت کر گئی۔ یہ وہی جرمنی کی جمہوری اشتراکی پارٹی ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔

انگلستان میں بھی گذشتہ صدی کے آخری حصہ میں لبرل حلقوں کے قیام کا رجحان پیدا ہو چلا تھا۔ مگر آگے چل کر جب اقتصادی الجھنیں بڑھ گئیں تو یہ تحریک کمزور پڑ گئی اور اس کی جگہ پر مزدور اپنی الجھنوں سے گھبرا کر ایک ایسی جماعت بنانے کے خواستگار ہوئے جس کے مقاصد ومطالبات کافی وسیع ہوں۔ چنانچہ لیبر پارٹی وجود میں آئی جس کی مزدوروں نے پوری تائید کی۔ اور چند ہی سال میں اس کو اتنی تقویت حاصل ہوگئی کہ اس کے نمایندے پارلیمنٹ کے انتخاب

میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہونے لگے۔ تاہم بعض لوگوں نے اس سے بڑھکر مارکسزم کے اصولوں پر ایک اشتراکی جماعت قائم کی۔ مگر مزدوروں نے اس کے متعلق کوئی گرمجوشی نہیں دکھلائی جس کی وجہ سے اس تحریک میں کوئی زور پیدا نہیں ہوا۔ مگر جب بیسویں صدی کے شروع میں مسٹر کیر ہارڈی کی رہنمائی میں مزدور پارٹی پھر از سر نو مرتب ہوئی تو اس سے اس اشتراکی پارٹی کو بہت ٹھیس لگی۔ اور اس کی قوت اور بھی کمزور ہو گئی۔ یہ مزدور پارٹی یورپ کی دوسری اشتراکی جماعتوں سے بالکل مختلف تھی، اور گو وہ بعض اشتراکی اصولوں سے متفق تھی مگر اشتراکیت سے اس کا راستہ کوسوں دور تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ مشکلات کی اصلاح کی جائے نہ کہ اشتراکی ہنگامہ آرائی کے ذریعہ، یہ حربے حقیقی اصلاح کے لئے بالکل بیکار سمجھے گئے۔

مگر روس کے حالات جرمنی اور انگلستان سے مختلف تھے، اس لئے کہ روسی اشتراکی وہاں ظلم و تشدد اور جلاوطنی وغیرہ کا ہمت و استقلال سے مقابلہ کرتے رہے۔ بڑے بڑے اشتراکی رہنماؤں کو سائبیریا اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں جلاوطن کر دیا گیا۔ مگر اس تحریک کی آگ برابر مشتعل رہی۔ آگے چل کر جب ۱۹۰۵ء کے اہم انقلاب میں اشتراکی ناکام رہے تو ان کے اوپر مصائب و مظالم کا انبار اور بھی زیادہ ہو گیا جس کی بدولت ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ روس کی اس اشتراکی تحریک کو باہر سے تقویت دیں۔

ان مظالم کے علاوہ اس وقت روسی اشتراکی مختلف جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک پارٹی کا مقصد کاشتکاروں کی اصلاح تھا اس لئے ان کا سارا دار و مدار کاشتکاروں پر تھا۔ مگر چونکہ ان کے نزدیک انقلاب کے بغیر کاشتکاروں کی اصلاح نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے ان کا رجحان انارکزم کی طرف ہو گیا۔ اور وہ بیکن روسی کے خیالات سے متاثر ہو گئے۔ ایک دوسری جماعت مارکس کی پیرو کار تھی، مگر ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں اس کے دو حصے ہو گئے، ایک بالشویزم کی جماعت تھی جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سے اس وقت تک روسی اشتراکیت کے نام سے موسوم اور دوسری جماعت کارل مارکس کے اصولوں کی پیرو ہونے کی دعویدار تھی مگر درحقیقت اس کا خیال یہ تھا کہ روس میں اشتراکیت اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب متوسط طبقہ سے تعاون پہلے ایک جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ یہ پارٹی بالشویزم کی انقلاب پسندی اور تدریجی تب کے بجائے فوری عروج کی مخالف تھی۔ اور اس کے نزدیک یک بیک اشتراکیت کا قیام ناممکن وہم و گمان تھا۔

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلی بین الاقوامی مزدور پارٹی ۱۸۶۴ء میں قائم ہوئی تھی، مگر فرانس کی اشتراکی حکومت کی ناکامیابی کے بعد یہ بھی آہستہ آہستہ فنا ہو گئی۔ لیکن ۱۸۸۹ء میں اشتراکی جماعتوں نے ملکر ایک دوسری بین الاقوامی پارٹی قائم کی جو دوسری بین الاقوامی پارٹی یا بین الاقوامی اشتراکی پارٹی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ جماعت پہلی بین الاقوامی جماعت سے مختلف تھی، کیونکہ اس کے پاس کوئی ہمہ گیر مرکزی پروگرام نہ تھا، بلکہ اس کی توجہ صرف اس بات پر محدود تھی کہ مختلف اشتراکی جماعتوں کو کس اسلوب اور کس طرح سے چلایا جائے۔ لیکن اس دوسری پارٹی نے ۱۹۱۱ء تک اس مسئلہ کو بھی اپنے سامنے رکھا کہ امن و جنگ کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے۔ اور اس میں اشتراکیوں کی کیا حیثیت ہو؟ یہ موضوع امسٹرڈم (ہالینڈ) کی ۱۹۰۴ء کی کانفرنس کا خاص موضوع تھا۔ چنانچہ فرانسیسی اشتراکی جورز نے "نئی فوج" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی، مگر اسٹٹگرٹ (جرمنی) کی دوسری کانفرنس میں ہر فیہ نے نیشنلزم اور وطنیت کی صدا بلند کی، اور اس میں جرمنی کے دو لیڈروں سبیل اور نو لکار نے صاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کر دیا کہ اگر جرمنی پر حملہ ہوا تو جرمنی کی جمہوری اشتراکی پارٹی سب سے پہلے اس کی مدافعت میں حصہ لے گی۔

اس کے بعد ۱۹۱۱ء میں جب یورپ کی فضا بہت مکدر ہو گئی۔ تو ۱۹۱۲ء میں اشتراکی لیڈروں نے بین الاقوامی تعلقات پر غور و فکر اور اپنی امن پسندانہ پالیسی کی وضاحت کے لئے یکجا ہو کر ایک اہم ریزولیوشن یہ پاس کیا کہ دنیا کے تمام مزدور اپنی اپنی ملکی حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ اپنی خارجی پالیسی کو امن پسندی کے اصولوں کی بنیاد پر مرتب کریں۔ تاکہ دنیا عالمگیر جنگ سے باز رہے اس کی امن پسندی کی یہ صدائیں تمام لوگوں کی زبانوں سے بلند ہو رہی تھیں جس کے لئے پھر ۱۹۱۴ء میں ایک اہم کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز تھی، مگر جنگ کے چھڑ جانے سے سارا پروگرام یکایک معطل ہو گیا۔ اور کانفرنس نہ منعقد ہو سکی۔

اس جنگ سے اشتراکیوں کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اشتراکیوں نے اس خوفناک جنگ کو روکنے کی بڑی کوشش کی تھی، مگر جب ۱۹۱۴ء کے موسم گرما میں یورپ کی حکومتیں باہم دست و گریباں ہو گئیں تو اشتراکی پارٹی بھی اپنے بین الاقوامی جماعت کے فیصلہ کے خلاف اپنی قومی حکومت کی تائید و حمایت میں مشغول ہو گئی۔ مگر اس کے باوجود اس وقت چند ایسے اشتراکی موجود تھے جنھوں نے اپنی قومی حکومت کے جنگی رویہ سے اختلاف کر کے

فرانسیسی اشتراکی لیڈر موسیو
جنگ سے روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ناظرین کو یاد ہو گا کہ فرانسیسی اشتراکی لیڈر موسیو
جس کا ثمرہ اُسے موت کی
نے فرانسیسی حکومت کی اس بارے میں مخالفت کی تھی
نے فرانسیسی حکومت کی اس بارے میں مخالفت کی تھی جس کا ثمرہ اُسے موت کی
ں میں حاصل ہوا۔ اسی طرح مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے بھی انگلستان کے جنگی رویہ پر اعتراض
تھا۔ مگر اس پر چنداں دھیان نہیں دیا گیا۔ مگر اس سلسلہ کا ایک پُر لطف واقعہ یہ ہے کہ جب
سٹر میکڈانلڈ بین الاقوامی اشتراکی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ایک انگریزی جہاز پر سفر
نے والے تھے تو اُس وقت جہاز کے سارے کام کرنے والوں نے اس جہاز میں کام کرنے
سے انکار کر دیا جس پر مسٹر میکڈانلڈ سوار ہوں۔ لیکن درحقیقت بہت کم لوگ بین الاقوامی اشتراکی
انفرنس کے نقطۂ خیال پر ثابت قدم رہے۔ یا اس اشتراکی تحریک کی بین الاقوامی پہلو کو اپنی قومیت
پر ترجیح دی۔ اور اُس کے فیصلہ کو لائقِ احترام سمجھا۔ بلکہ اس جنگ میں عموماً ہر شخص اپنی قومیت پر قربان
ہوا اور سبھوں نے پارٹی کے ساتھ جنگ میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ فرانس اور برطانیہ کی اشتراکی
پارٹیاں جنگی وزارتوں میں مل کر پوری طرح سرگرمِ کار ہو گئیں۔ اور اگر جرمن حکومت جرمنی کی اشتراکی
جمعیت کو وزارت میں دعوت دیتی تو وہ بھی یقیناً اُسے قبول کر لیتی۔ بہر حال اس کے باوجود بھی اسکی
ہمدردی اپنی گورنمنٹ کے ساتھ تھی۔

غرض اِن حالات میں جب بین الاقوامی اشتراکی پارٹی کا شیرازہ بکھر رہا تھا، ستمبر ۱۹۱۵ء اور
اپریل ۱۹۱۶ء میں زمر فولڈ اور کنیتال میں دو بین الاقوامی اشتراکی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، جن میں
اشتراکی جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں دو قسم کے خیالات کے لوگ شریک
تھے۔ ایک جماعت یہ سمجھتی تھی کہ شاید یہ کانفرنس جنگ کے انسداد کا ذریعہ ہو سکے اور دوسری جماعت
کا خیال تھا کہ اس عالمگیر جنگ سے فائدہ اُٹھا کر ہمیں ان کانفرنسوں کو اشتراکیت کی تبلیغ کا ذریعہ
بنانا چاہیئے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اشتراکیت کو ہر جگہ پھیلانا چاہیئے۔ اس خیال کا پہلا حامی لینن تھا۔
اس کے بعد روس کی عظیم الشان اشتراکی بغاوت ہو گئی جو درحقیقت حکومت کے مظالم
ومصائب کا نتیجہ تھی۔ اس وقت روسی اشتراکی مختلف جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک پارٹی انقلاب
پسند اور انارکسٹ تھی جس کا مقصد کاشتکاروں کی فلاح تھا۔ دوسری پارٹی مارکس کی پیرو
شمار ہوتی تھی، اس میں بھی دو پارٹیاں تھیں، ایک اعتدال پسند جو طبقۂ متوسط سے تعاون
کی قائل تھی، دوسری پارٹی مزدوری کے انقلاب کی حامی اور یہ مزدوروں کی ڈکٹیٹری کی
طالب تھی۔ اس وقت اسے بالشویک کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مگر جب ۱۹۱۷ء میں روس میں

اعتدال پسند اشتراکیوں اور طبقہ متوسط کے آزاد خیالوں نے بغاوت شروع کی تو سب خیال کے اشتراکیوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اس انقلاب کے بعد جو وزارت قائم ہوئی اس کا وزیر اعظم کرنسکی تھا لیکن اس کے بعد جب بالشویکوں کی قیادت اور لینن کی رہبری میں دوسرے انقلاب کے شعلے مشتعل ہوئے اور ان لوگوں نے ایک مزدور ڈکٹیٹری کا اعلان کیا تو یورپ میں اشتراکی دو جماعتوں میں منقسم ہو گئے اور دونوں میں اختلاف کی خلیج اس وقت اور زیادہ وسیع اور عمیق ہو گئی۔ جب بالشویک روس کی حکومت پر پوری طرح سے قابض ہو گئے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ حقیقی اشتراکیت کے پیرو وہی ہیں اور انھوں نے ایک تیسری بین الاقوامی اشتراکی پارٹی قائم کی، اور اپنے اصولوں کے مطابق دنیا کو ایک عالمگیر انقلاب کی دعوت دینے لگے جس کے اصول مارکس کی کتابوں اور اس کے اس اعلان سے ماخوذ ہیں جسے اس نے ۱۸۴۸ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ بالشویکوں نے جمہوری اعتدال پسند اشتراکیوں پر یہ اتہام لگایا کہ وہ کارل مارکس کے نظریات کے منکر ہیں۔ اور ان لوگوں نے سرمایہ داری قائم کرنے کے واسطے متوسط طبقہ کے تعاون کا ڈھونگ نکالا ہے۔ اس کا جواب اشتراکیوں نے یہ دیا کہ خود بالشویک اشتراکیت کے اصولوں سے منحرف ہو گئے اور انھوں نے روس کی جمہوریت اور عوام کی آزادی کا خاتمہ کر کے روسی عوام پر محض قوت و طاقت کے ذریعہ تسلط اور غلبہ حاصل کیا ہے۔ روس کی اس باہم کشمکش کا سلسلہ بہت طولانی ہے۔ اور اس کا مفصل ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

روس کے حالات تبدیل ہو جانے اور اشتراکیت کا رخ دوسری طرف پھر جانے کے بعد بھی جمہوری اشتراکیوں نے یورپ کے دوسرے ملکوں میں اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ چنانچہ جرمنی میں (باوجود اس کے کہ روسی بالشویزم سے متاثر ہو کر وہاں ایک بالشویک پارٹی قائم ہو گئی تھی) جمہوری اشتراکی اپنے اصولوں پر قائم رہے۔ اسی طرح انگلستان کی بھی اشتراکی تحریک پر اس بالشویزم کا کوئی اثر نہ پڑا۔ فرانس میں بھی جب بعض اشتراکیوں کا میلان بالشویزم کی طرف ہو چلا تھا جمہوری اشتراکی پارٹی کی کامیابی کے ساتھ پھر سے تنظیم کی گئی۔ چنانچہ وزیروں کے انتخاب میں یہ پارٹی سب سے نمایاں اور سب پر فائق رہی۔ رہا اٹلی تو وہاں اس وقت تین جماعتیں تھیں ایک بالشویک، دوسرے وہ جنھیں بالشویک بھی نہیں کہا جا سکتا۔ تیسرے وہ جو بالشویزم کے مخالف اور فاشزم کے حامی تھے۔

اب ہم [illegible] اور بالشویک نقطۂ خیال پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اشتراکی

ـف ہے۔ اشتراکی اور بالشویک دونوں یہ چاہتے ہیں کہ تمام صنعتی کارخانے اور ذرائع پیداوار تختیں قوم یا حکومت کی ملک ہوں مگر بالشویک انقلاب اور بغاوت سے اپنا مدعا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اشتراکی ان چیزوں کو قانون کی امداد سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ملک میں اس طرح کی حکومت قائم کریں کہ مجلس قانون ساز میں وہ بھاری تعداد میں داخل ہو سکیں۔ اور قانونی طور پر اپنے اصولوں کے مطابق اقتصادی حکومت کی بنیاد ڈالیں بالشویک اس کے مخالف ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سرمایہ داری نظام ہماری کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دے گا۔ بلکہ قانونی حکومت حاصل ہونے سے پہلے ہی کچل ڈالے گا۔ اسی لئے بالشویک ان لوگوں کو جو تدریجی طور پر قانونی حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں اشتراکیت کا دشمن تصوّر کرتے ہیں۔

اشتراکیوں اور بالشویکوں کے اختلاف کی یہ پہلی جڑ ہے۔ آگے چل کر اختلاف کی ایک عالیشان عمارت کھڑی ہو گئی ہے۔

حسنِ بے مثال

(حضرت فراق گورکھپوری)

رگوں میں طراوت جو دے وہ آگ ہے تو — سدا بہار رہے تو عشق کا سہاگ ہے تو
دلوں کو نہیں جلتے ہیں کہ بجھتے ہیں — ارے نہ آگ نہ پانی ہے جو وہ لاگ ہے تو
سکوت کو بھی تو کانوں میں گونجتا پایا — جو ایک کر دے سُنا اَن سنا وہ راگ ہے تو
جھلک رہی ہے جبیں کائنات کی تجھ سے — اِک امرِ غیب سے کھُل جائے جو وہ بھاگ ہے تو
ملائے سنگ نے بیسوں جگہ سے کوٹے دی — ز فرق تا بقدم اک دبی سی آگ ہے تو
جدا ہر اک سے، ہم آہنگ بھی زمانے سے — قبولیت کی جو تصویر ہے وہ تیاگ ہے تو
ہوائے شامِ ابد زلفِ یار بس ہے ترا — جو ڈس لے صبحِ قیامت کو بھی وہ ناگ ہے تو
میں تجھکو دیکھ رہا ہوں کہ کان بجتے ہیں — ہے کوئی نشۂ لرزاں کہ کوئی راگ ہے تو
کہاں چمن کی بہاریں کہاں یہ رنگِ نشاط — جو خونِ عشق سے کھیلا گیا وہ پھاگ ہے تو
بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم — لگا دے نام کو جس میں یہ تیں وہ داگ ہے تو
نگاہ و گوش کی پُرکیف تشنگی کو نہ پوچھ — اِک آدھ کھِلی سی کلی آہ وہ سہاگ ہے تو
فراق اپنے دکھوں کو بھلا کے کہتا تھا — سدا بہار رہے تو [illegible]

بہارِ کشمیر[1]

(از نواب محمود علی خاں عرف آغا علی خاں محمود رئیس الہ آباد)

یہ سچ ہے کیفِ دل کہاں حریمِ روزگار میں کہ جس کا ذرّہ ذرّہ ہو تلاشِ غمگسار میں
مگر نظر اُٹھا تو آپ کہ اِس بہشتِ زار میں مچل رہی ہیں فطرتیں نسیمِ خوشگوار میں
مسرتوں کا جوش ہے شبابِ نو بہار میں

گھٹائیں اپنی گود میں گلابیاں لئے ہوئے ہَوا کے نرم دوش پہ صُراحیاں لئے ہوئے
چمن کے ذرّے ذرّے کی جوانیاں لئے ہوئے گلوں کے حُسن و عشق کی کہانیاں لئے ہوئے
تڑپ رہی ہیں بجلیاں تبسّمِ بہار میں

لرز رہی تھی بزمِ گل عتابِ برشگال سے وہ ٹپکیں رس کی بُوندیاں حجابِ برشگال سے
برس پڑیں وہ مستیاں شرابِ برشگال سے اُبل پڑیں جوانیاں شبابِ برشگال سے
کچھ اور عطر بڑھ گیا نسیمِ مشکبار میں

زمینِ صحنِ باغ کو نئی ملی ہیں لذّتیں دماغِ حُسن و عشق میں مچل رہی ہیں اُلفتیں
چمن کے رہنے والوں کی بدل رہی ہیں قسمتیں جہانِ آب و گل سے اب اُبھر رہی ہیں راحتیں
خوشی کی لہر آ گئی چمن کے قلبِ زار میں

شگفتگی کے زور سے اُبھر رہی ہیں پتیاں پہن کے سبز ساریاں مچل رہی ہیں ڈالیاں
کھنک رہی ہیں بوندیوں سے پھول کی کٹوریاں نکھر رہا ہے حُسنِ گل برس رہی ہیں مستیاں
چمن کا رنگ آ گیا ہے کُنج کے سبزہ زار میں

گرہ وہ کھُل گئی ہے کیا بہار کے نقاب کی کہ ہر طرف ہیں محوِ رقص دیویاں شباب کی
مَیں کس زباں سے داد دُوں نگاہِ انتخاب کی کہ ہیں یہ سب کرامتیں بہار میں شراب کی
چھلک رہا ہے جامِ مَے نگاہِ بادہ خوار میں

[1] یہ نظم رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب بالقابہ کی صحت کی خوشی میں لکھی گئی تھی۔ ممدوح ایک طولانی علالت کے بعد بحالیِ صحت کی غرض سے کشمیر تشریف لے گئے تھے۔

چمن سے رنگ رنگ کی اُبل رہی ہیں مستیاں شبابِ نوبہار نے بھریں کچھ ایسی بجلیاں
کہ اِک نگاہِ مست سے اُبھر گئیں جوانیاں کلی کلی کی جوش میں مسک رہی ہیں چولیاں
بھری ہیں کتنی شوخیاں شبابِ نوبہار میں

گلوں کی بارگاہ کی بدل گئی ہیں جو کھٹیں صبا نے خود بکھیر دیں چمن کی زلف کی لٹیں
اُتر کے بیلیں شاخ سے بدل رہی ہیں کروٹیں عروسِ گل کے لب پہ ہیں عجیب مسکراہٹیں
نہ جانے کیسی بیخودی ہے اس بہشت زار میں

حسین مرغزار کے بغل میں ہیں پہاڑیاں اور اُن سبھوں کی برف سے گندھی ہوئی ہیں چوٹیاں
اُفق پہ رنگ رنگ کی مچل رہی ہیں سرخیاں کہ یا شفق کی نہر میں نہا رہی ہیں دیویاں
ملاحتوں کے قافلے پڑے ہیں کوہسار میں

ہے ضو فگن یہ عکسِ گل حسینِ آبشار میں نہا رہی ہیں یا پری اُتر کے جوئبار میں
کچھ اتنا کیف بڑھ گیا تھا میرے قلبِ زار میں نگاہ جم کے رہ گئی فضائے کوہسار میں
اُتر رہی تھیں دیویاں بہار کی بہار میں

خنک سوادِ شام کی صراحیاں لئے ہوئے نگاہِ مست و شوخ میں گلابیاں لئے ہوئے
شبابِ نوبہار کی جوانیاں لئے ہوئے لبوں پہ ارضِ حسن کی کہانیاں لئے ہوئے
مچل رہے تھے زمزمے صدائے آبشار میں

ہزار داستاں کی تھیں چمن میں نغمہ سنجیاں سُنا رہی تھیں بلبلیں شبابِ گل کی داستاں
گلوں کو دیکھ دیکھ کر چہک رہا تھا بوستاں قطار در قطار سب یہ کہہ رہے تھے خوش بیاں
وہ فخرِ ہند آ گیا ہے اِس بہشت زار میں

ہوئی ہیں جس کے نطق سے ادب میں سحر کاریاں فدا ہیں خوش بیانیاں نثار خوش کلامیاں
وہ جس کے لفظ لفظ میں ہیں معجزہ نمائیاں اُسی سے ہونگی ہند کے چمن کی نخلبندیاں
گلے ملیں گے بھائی بھائی پھر نئی بہار میں

شفا سے اُس جناب کی ملیں وہ دل کو راحتیں کہ سرزمینِ حسن نے بدل دیں اپنی لذتیں
اُبل پڑی ہیں چشمۂ علوم کی سخاوتیں ادب کے بوستاں کی پھر بدل رہی ہیں قسمتیں
شباب پھر سے آ گیا ہے ہند کی بہار میں

ہمارے افسانے

(موجودہ دَور کے عام افسانوں پر ایک سرسری نظر)

از پروفیسر محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی - از مدراس

آجکل اُردو زبان میں افسانوں کی بھرمار ہے، چند ٹھوس اور بلند پایہ رسالوں کے سوا اکثر و بیشتر رسالے افسانوں سے بھرے رہتے ہیں۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے یہ بات نہ تھی۔ اُس زمانے کے رسالوں میں زیادہ تر مفید کارآمد اور معلومات کو بڑھانے والے مضامین ہوا کرتے تھے دکن ریویو مخزن۔ زمانہ کانپور۔ الناظر لکھنؤ۔ پھر پنجاب ریویو لاہور، ادیب الہ آباد۔ لسان العصر لکھنؤ ایسے رسالے تھے، جن پر اُردو زبان فخر کرسکتی ہے۔ ان کا ہر نمبر علم و ادب کا بہترین اور قابل قدر سرمایہ پیش کرتا تھا۔ اور آج بھی وہ اُسی قدر مفید ہیں جتنے اپنی زندگی میں تھے۔ افسوس ہے کہ رسالہ زمانہ کے سوا اب ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا۔ سب بند اور مرحوم ہوچکے ہیں۔ اللہ زمانہ کو حیاتِ خضر عطا فرمائے بہرحال ان رسالوں کے ہر نمبر میں کم سے کم ایک بلند پایہ، دلچسپ اور سبق آموز افسانہ ہوتا تھا مگر اب تو بعض رسالے افسانوں کے سوا اور کچھ شائع ہی نہیں کرتے۔

افسانوں کے سیکڑوں مجموعے بھی کتابی صورت میں شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔ ملک میں بہت سے افسانہ نگار پیدا ہوئے اور اچھی خاصی شہرت بھی حاصل کرچکے ہیں۔ لیکن جب کبھی مجھے افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوجاتا ہے تو افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ آجکل کچھ اس قسم کے بازاری بے نتیجہ اور حد درجہ رکیک بلکہ فحش افسانے لکھے جانے لگے ہیں۔ جن کو پڑھنے کے بعد طبیعت مکدر ہوجاتی ہے۔ اور افسوس کے ساتھ اُٹھا کر رکھ دینا پڑتا ہے۔ خصوصاً ہمارے ملک کے نوجوان مسلمان افسانہ نگاروں کی طبیعت کا رجحان ہی کچھ عجیب و غریب ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے محض نفسانی اور شہوانی جذبات کو حرکت میں لانے، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو آوارہ بنانے، اُن کے اخلاق خراب کرنے یعنی تباہ کن عشق بازی سکھانے، فیشن پرستی اور بیجا آزادی کا غلط ذوق پیدا کرنے یورپ کی مغربی معاشرت کی نقل اُتارنے اور اس پر اترانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ زیادہ تر یہ افسانے تجارتی اغراض سے لکھے جاتے ہیں، لکھنے اور چھپوانے کا مقصد پیسہ کمانا ہوتا ہے۔ مصنف اور پبلشر

کی بات ہے۔ قوم کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جہنم میں جائیں یا جنت میں۔ ممکن ہے ان سے پیسہ مل جاتا ہو۔ لیکن اس ناپاک اور مہلک لٹریچر کی بدولت جس قدر اخلاق تباہ ہو رہے ہیں وہ نہایت افسوسناک اور خطرناک ہیں۔

اِن افسانوں کے لکھنے والے زیادہ تر نیم تعلیم یافتہ، بے روزگاری کا شکار، "سینما زدہ" اور ایک حد تک آوارہ خیال، پریشان دماغ نوجوان ہوتے ہیں۔ ان کے پڑھنے اور پسند کرنے والے بھی کچھ اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان افسانوں کے قصّے یا واقعات و حالات تقریباً یکساں اور زیادہ تر سینما بینی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً عورت اور مرد (ہیروئن اور ہیرو) دونوں اعلیٰ خاندان کے، اعلیٰ سوسائٹی کے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ روشن خیال گھروالوں کے، مغربی تہذیب کے دلدادہ، آزاد اور پردہ کے مخالف یا نیم پردہ کے پابند، لباس اور مکانات اور اُن کی آرایش، کھانے پینے کے آداب، رہنے سہنے کے طریقے، سب تقریباً مغربی یا نیم مغربی، باپ کہیں کے بڑے عہدہ دار یا دولتمند تاجر یا زمیندار ہوا کرتے ہیں۔ عورتیں اکثر ساڑیوں میں ملبوس اور مرد سوٹ بوٹ میں نظر آتے ہیں۔ بنگلے کوٹھیاں، فرنیچر سب انگریزی طرز کے، جن میں پایئں باغ بھی گویا ضروری ہیں۔ غرض ہر چیز و در جدید کی مگر دونوں ہندستانی ہوتے ہیں۔ اور ان کی باتیں اخباری یا کتابی زبان میں ہوتی ہیں۔ اُس سادہ اُردو میں نہیں جو گھروں میں بولی جاتی ہے۔ اگر دونوں مسلمان ہوں تو غلط سلط فارسیت کا غلبہ اور ہندو ہوں تو ہندی الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ آجکل چند ہندی الفاظ بھی ضرور لائے جاتے ہیں۔ مثلاً پریم سماج وغیرہ۔ ہر جملے میں تکلف اور بناوٹ۔ غرض ان افسانوں کے مکالموں میں وہ زبان نظر آتی ہے جو در اصل نہ کہیں سننے میں آتی ہے نہ دیکھنے میں اور نہ حقیقت میں کہیں بولی جاتی ہے گفتگو کا ہر انداز انوکھا، ہر بات میں مکروہ مبالغہ۔ اور ہر ایک قصّہ دُور از کار لفاظیوں سے بھرا ہوا۔ اور بالکل خلاف واقعہ ہوتا ہے۔ اکثر باتیں عام رواج، رسم، معاشرت کے خلاف اور اَن ہونی ہوتی ہیں۔ جو اس وقت کسی خیالی ہندوستان میں ہوں تو ہوں۔ غرض اِن افسانوں کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ہندوستان نہایت تعلیم یافتہ اور دولتمند مُلک ہے اور جو حد سے زیادہ جدید تمدن کا مرکز، بے فکری، آسایش اور تموّل کا گھر، شایستگی اور نئی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ گویا ہمارا ملک سراپا رومان ہے، نہ یہاں افلاس عام ہے اور نہ جہالت۔ نہ یہاں کوئی مُصیبت زدہ مزدور نہ محنت کش فاقہ زدہ کسان، نہ آپ کو اِن افسانوں میں کسی غریب گھرانے کی تصویر ملے گی، نہ بُرے رسم و رواج کا مرقع۔ نظر آئے گا۔ نہ مفلسی کے شکار انسانوں کی زندگی کے نمونے ملیں گے اور نہ مصائب زدہ

گانؤں والوں کے المناک حالات کے وہ مناظر دکھائی دیتے ہیں جو آپ آجکل ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں
غرض کہاں تک طول دیا جائے۔ پہلے اکثر ہیرو علیگڈھ کے تعلیم یافتہ یا طلبہ ہوا کرتے تھے یا اور کسی
کالج کے، اور اب اکثر و بیشتر یورپ سے واپس آئے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے افسانہ نگاروں کی ادبی کائنات، جس پر بڑی بڑی عمارتیں اور قلعے کھڑے کر دئیے
جاتے ہیں۔ میرا یہ تبصرہ عام اور اکثر افسانوں پر ہے، ورنہ آج بھی کبھی کبھی ایسے افسانے دیکھنے میں
آجاتے ہیں جو حقیقی معنے میں "فسانہ" کہے جاسکتے ہیں۔ اور ان میں وہ روح موجود ہوتی ہے جو دلوں کو
کھینچتی اور دماغوں میں اپنے غیر فانی نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ اور جن پر ہماری زبان بجا طور پر ناز کر سکتی ہے
مگر یہ نہ عام طور پر مقبول ہوتے ہیں نہ ان کے لکھنے والوں کو زیادہ شہرت ہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی
وجہ سے ہمارے اکثر افسانہ نگار ناکام ہیں اور اردو کی ادبی دنیا میں کوئی امتیازی درجہ حاصل
نہیں کر سکے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہمارے زیادہ تر افسانہ نگار زبان کا مرتبہ گرا رہے ہیں۔

ہمارے کامیاب اور غیر فانی افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ تابناک نام پریم چند کا ہے
اُن کے افسانے جہاں کہیں مل جاتے ہیں ہر اردو داں شوق سے پڑھتا، لطف حاصل کرتا اور
کچھ اثر لے کر اُٹھتا ہے۔ پریم چند آنجہانی کو یہ غیر فانی شہرت اور کامیابی کیوں حاصل ہوئی، ذرا اس پر
غور کر لیجئے، اُن کے زیادہ تر قصّے اہل ملک کے روزمرّہ زندگی کے سچے نمونے ہیں، خواہ وہ گانؤں
کی معاشرت ہو یا شہر کی، تعلیم یافتہ اور دولتمند گھرانوں کا ذکر ہو یا غربت زدہ جھونپڑیوں کا،
ان کے زیادہ تر قصّے غریب دیہاتیوں کی زندگی کے المناک مناظر پیش کرتے ہیں۔ پھر زبان اس
قدر سادہ و سلیس اور بیان میں اتنا لوچ اور نرمی کہ سبحان اللہ، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوش خرام
ندی آہستہ آہستہ بہتی اور اس کی روانی دل میں گھر کرتی چلی جاتی ہے، عجیب اثر ہوتا ہے۔ مگر ہمارے
افلاس زدہ، مغربی فکشن کے دلدادہ نوجوان ادیب اس رنگ کو اختیار نہیں کرتے۔ ہمارے خیال
میں اُن کی ناکامی کے سو فیصدی اسباب یہی ہیں۔ انھیں کی قسم کے چند ایڈیٹر صاحبان اپنی
اپنی ضرورت سے ضرور ان کی حوصلہ افزائی کر دیتے ہیں۔ مگر اس سے ملک کے اردو پڑھنے والے
طبقے کا مذاق روز بروز خراب ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ ایسا عبرتناک ہوگا کہ جس کی تلافی نہ ہوسکے گی
خدا کی مرضی اور ہماری بدبختی سے یہ متعدی مرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ خدا کی پناہ۔ مصیبت یہ ہے
کہ یہ مرض بڑھتا ہی جاتا ہے۔ عموماً رسالوں میں علمی مضامین، ادبی و تاریخی، تنقیدی مقالے اور
خاصکر ایسے مضامین تو بہت ہی کم نظر آتے ہیں، جو لکھنے والے کی ذاتی کاوش، محنت تحقیق

(ریسرچ) کا نتیجہ ہوں۔ چند بلند پایہ علمی رسالوں کے سوا جن کی تعداد ملک میں بہت ہی کم اور ان کی اشاعت بالکل ہی محدود ہے۔ تمام رسالے شروع سے آخر تک افسانوں سے پٹے نظر آتے ہیں۔ خواہ وہ دہلی کے ہوں یا بنگال کے، بہار کے ہوں یا بمبئی کے، اور پنجابی رسالے تو گویا اس معاملے میں سب سے آگے اور سب کے اُستاد ہیں۔ اُن کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، اور آئے دن ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب اور بالخصوص لاہور اس وقت اُردو کا سب سے بڑا دارالاشاعت ہے۔ لیکن وہاں اُردو کی خدمت آمدنی کا ذریعہ، وجہ معاش، تجارت پیشہ بن کر رہ گئی ہے۔ اچھی کتابیں بہت کم اور ایسی زیادہ شائع ہوتی ہیں جن کا شائع نہ ہونا ہی اچھا ہوتا۔ اور جن پر مذاقِ سلیم کو خون کے آنسو بہانا پڑتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ ملک کے پڑھنے والوں کا مذاق اس قدر بگڑ گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ لاہور کے بعد دوسرا نمبر دہلی کا ہے، دُلہنوں کی کانفرنس، پہلی رات کی سرگزشت، دُلہن کی ڈائری، ایک ایکٹرس کی اپنی بیتی، گناہ کی راتیں، وغیرہ کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ اور دھڑا دھڑ بک رہی ہیں۔ بعض پر لکھا ہوتا ہے "اسے عورتیں نہ پڑھیں"۔ بعض کی نسبت اشتہارات میں دیکھنے میں آیا، لکھتے ہیں کہ یہ کتاب کنوارے اور کنواریاں نہ منگائیں۔" عربی کی ایک مثل یا مقولہ ہے کہ "الانسان حریصٌ فی ما منع" (آدمی کو جس چیز سے روکا جائے اُسی کا وہ حریص ہوتا ہے)۔ یہ انسانی فطرت ہے، اور اس راز کو یہ لوگ خوب جانتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی ہی لڑکیاں اور لڑکے اس قسم کی کتابوں کو زیادہ شوق سے منگاتے ہیں اور اپنے عزیزوں سے چھپا کر چپکے چپکے دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آخر اخلاقی حیثیت سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ مصنف اور تاجر کو چند ٹکے مل جاتے ہیں!

ہم احسان فراموش اور ناشکر گزار نہیں، اُردو کی ترقی و اشاعت میں پنجاب کا جو حصہ ہے ہم اس کو جانتے اور مانتے ہیں، مگر اب یہ چند سال سے جو رَو چل گئی ہے اس کو روکنا اور اُس کی اصلاح کرنا پنجاب اور دہلی کے سچے اہلِ قلم اور بہی خواہانِ اُردو کا فرض ہے۔ امید ہے کہ ہمارا یہ مخلصانہ گلہ ناگوارِ خاطر نہ ہوگا۔

اچھی تصانیف کی آجکل مٹی خراب ہے۔ ایک شخص برسوں کی محنت اور کاوش کے بعد ایک کتاب تیار کرتا ہے اور بڑی مصیبت سے رستم کے ہفت خواں طے کر کے ہزار یا سَو کی تعداد میں چھپواتا ہے، لیکن وہ پندرہ بیس سال تک نہیں بکتی، جو کچھ روپیہ لگتا ہے اُسے اپنی گرہ سے ادا کرنا پڑتا ہے، اور اگر وہ بے غیرت نہیں ہوتا تو پھر کبھی تصنیف و تالیف کا نام نہیں لیتا

اگر وہ کسی تاجر کتب یا دارالاشاعت کے مالک کے پاس جاتا اور چاہتا ہے کہ مناسب حق تصنیف لے کر دیدے تو کوئی ادارہ کتاب لینے اور چھاپنے پر تیار نہیں ہوتا۔ نہ کوئی تاجر کچھ جلدیں خرید کر اس کی اشاعت پر آمادہ ہوتا ہے۔ غریب جہاں جاتا ہے، یہی جواب ملتا ہے "اینڈ مال ہے" آخر بیچارہ مایوس و ناکام واپس ہوتا ہے۔ علمی اور سنجیدہ رسالے جو ملک میں اس وقت شائع ہو رہے ہیں اُن کی حالت بھی حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ان رسالوں میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کے مصارف دوسری مدوں سے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ ایسے ادارے بھی زیادہ کامیاب اور دولت مند نہیں جو ملک میں اچھی کتابیں اور بلند پایہ افسانے پیش کرتے ہیں۔ البتہ وہ رسالے مالی اور اشاعتی اعتبار سے بہت کامیاب ہیں، جن کا مقصد محض اس قسم کے افسانوں اور بازاری یا فحش لٹریچر کی اشاعت ہے۔ وہ تاجر اور ادارے سرمایہ دار بن گئے ہیں جو ایسے ناول اور کتابیں شائع کر کے ملک کے نوجوانوں کی زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔ دیکھیں ہمارے سنجیدہ ادارے اور سنجیدہ ارباب قلم کب ادھر متوجہ ہوتے ہیں، اور اس خوفناک متعدی بیماری کا کیا علاج سوچتے ہیں۔ ورنہ موت تو یقینی ہے۔ یاد رہے کہ ایسا لٹریچر زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ چند روزہ ہوا ہے، اور یہ مقبولیت بھی کچھ دنوں کی مہمان ہے پھر ردّی کے مول بھی کوئی نہ پوچھے گا۔ ابھی ربع صدی پہلے اُردو ناولوں کا بڑا زور تھا، ہزاروں لکھے گئے اور لاکھوں کی تعداد میں چھپے لیکن آج اُن کا پتہ بھی نہیں ہے، کام وہ کیجئے جو کچھ دنوں زندہ رہے۔

انھیں وجوہ کی بنا پر مجھے اُردو افسانوں سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ میں نے ملک کے بہترین لکھنے والوں کے ناول اور افسانے پڑھے ہیں، مگر اب زمانہ اور مذاقِ عام بدل چکا ہے اب ہمارے ملک میں انھیں کوئی نہیں پوچھتا، اس لئے کہ اُن کا پروپیگنڈا نہیں۔

مجھے بنگالی ناولوں اور افسانوں کے ترجمے بہت پسند ہیں، یا اُسی قسم کے افسانے، حقیقت میں وہ خوب ہوتے ہیں۔ بنگال کے سحر نگار ناول نگار بنکم چند چٹرجی کے اکثر و بیشتر ناولوں کا ترجمہ لکھنؤ کے مشہور و نامور ادیب و انشا پرداز منشی جوالا پرشاد برق آنجہانی نے کیا تھا۔ برق زبردست شاعر اور عدالت خفیفہ لکھنؤ کے جج تھے۔ اور جن کی لال کوٹھی کبھی جھاؤلال کے پل پر مشہور تھی۔ تقریباً اُن کے سب ناول نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپے اور ملتے ہیں۔ یہ ترجمے زبان اور افسانوی حیثیت سے لاجواب ہیں۔ لیکن اُن کی شہرت مُردہ ہو چکی ہے۔ اب ان کا کوئی پروپگنڈا کرنے والا نہیں اور بوڑھا نولکشور پریس اپنے پرانے ڈھرے پر چلا جا رہا ہے۔ اس کے مالک کو نہ اس سے زیادہ فائدہ ہے

اور نہ اُنھیں اودھر چنداں توجہ اور دلچسپی۔ محض دادا کا نام قائم رکھنے کے لئے پولیس کا وجود باقی ہے اس لئے ان ناولوں اور ان کے مترجم کی یاد دلوں سے تقریباً محو بھی ہوچکی ہے۔ غضب یہ ہے کہ اردو کی مستند تاریخوں میں بھی ان کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ ان میں آجکل کے ایسے لوگوں کا تذکرہ موجود ہے جن کی اُن کے آگے کوئی حقیقت نہیں۔ یہ بات بھی بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ پریم چند آنجہانی اسی قسم کے بنگالی افسانوں سے متاثر ہوئے۔ اور غالباً یہی اُن کی کامیابی کا راز ہے۔ سُدرشن جی بھی افسانہ نگاری میں اسی ڈگر پر چل کر کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ تر بنگالی افسانوں کا ترجمہ کرتے اور خود بھی اُسی انداز میں لکھتے ہیں۔ لیکن پنجابی ہونے اور زیادہ محنت و توجہ نہ کرنے کی وجہ سے اُن کی زبان ویسی عمدہ نہیں جیسی پریم چند کی ہے۔

گو میرا رُجحان طبع افسانہ نگاری کی جانب زیادہ نہیں رہا۔ تاہم میں نے اپنے مذاق اور اپنی پسند کے موافق بہت سے عربی افسانوں کا اور تین چار ناولوں کا ترجمہ کیا ہے۔ ایک افسانوں کا مجموعہ جس کا نام "انسانی قربانیاں" ہے۔ مُدّت ہوئی دائرہ ادبیہ لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ بہت پسند کیا گیا مگر اب عرصہ سے نایاب ہے اور افسانے مختلف رسالوں میں شائع اور مقبول ہوچکے ہیں، رسالوں نے ایک دوسرے سے نقل کئے اور بار بار چھپے، بعض طبع زاد افسانے بھی مقبول اور کامیاب ہوئے۔

خیر میں چاہتا یہ ہوں کہ ہمارے نوجوان افسانہ نگار بیدار ہوں اور غور کریں، سوچ سمجھکر قدم اُٹھائیں اور آگے بڑھیں تو کامیابی دشوار نہیں۔ مذاق کی اصلاح بھی ممکن ہے، اخلاق کی بھی، زبان اور ادب کی بھی۔ ہم اس صنفِ ادب سے بہت کچھ مفید کام لے سکتے ہیں، کیونکہ یہ انسانی طبائع پر فطرتاً زود اثر ثابت ہوتی ہے۔ اس سے دنیا میں بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں، بلکہ اُن کی کایا پلٹ کی جاسکتی ہے۔ اور تنزل و ادبار میں مبتلا قومیں غلامی و تباہی سے نکل کر جلد عروج و آزادی کی منزل تک پہنچ سکتی ہیں۔ کیا ہمارے افسانہ نگار اس مسئلہ پر غور کریں گے؟

زمانے کا ساقی تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے!۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟ (غالب)

مزدور اور سرمایہ دار

(جناب انیس مرتضٰی زبیری مارہروی مولنس، ایم۔ایل۔اے)

(پہلا سین)

موسم گرما میں اک مزدور ہے مصروفِ کار
سخت محنت سے پسینہ میں ہے ڈوبا جسمِ زار

سارا چہرہ دھوپ کی تابش سے کمھلایا ہوا
بھوک کے صدموں سے دل جیسے ہو مرجھایا ہوا

ہاتھ اس کے ٹوکری ڈھو ڈھو کے پتھر ہو گئے
یا الٰہی دن جوانی کے بھی دو بھر ہو گئے

پاؤں ننگے گرم بالو ریت سے جھلسے ہوئے
وہ کہیں پھٹ پھٹ گئے ہیں اور کہیں چھلے ہوئے

اک لنگوٹی کے سوا اس کے بدن پر کچھ نہیں
کاش پورا جسم اپنا ڈھانپ سکتا وہ کہیں

جسم میں نکلی ہوئی ہیں یوں ہزاروں ہڈیاں
جیسے لپٹی ہوں کسی ڈھانچے سے لاکھوں رسیاں

جسم اس کا دھوپ میں محنت سے کالا پڑ گیا
کس مصیبت سے الٰہی اس کو پالا پڑ گیا

سخت محنت کر رہا ہے کھا رہا ہے جھڑکیاں
آنکھ سے آنسو رواں ہیں سہہ رہا ہے گھڑکیاں

آہ اے مزدور، تیرا حالِ ابتر دیکھ کر
چشمِ شاعر ہو گئی اشکوں سے آخر تر بہ تر

تو سمجھتا ہے کہ دنیا میں خوشی ناپید ہے
یعنی یہ دارِ محن اک جائے مکر و کید ہے

تیری آہیں پھونک دیں گی یہ زمین و آسماں
تیرے نعرے چرا اڑا دینگے جہاں کی دھجیاں

(دوسرا سین)

چل رہے ہیں برقی پنکھے سو رہا ہے اک رئیس
ٹٹیاں خس کی لگی ہیں قصر ہے کتنا نفیس

اسکی راحت راحتِ جنت سے ہرگز کم نہیں
اس کی زینت خلد کی زینت سے ہرگز کم نہیں

اس کا بستر عیش و عشرت کے لئے تیار ہے
ماسوا راحت ہے جو کچھ وہ محض بیکار ہے

اس کی دنیا محفلِ آراستہ کا نام ہے
بزم میں یعنی مے و نغمے سے اس کو کام ہے

نعمتیں دنیا کی حاضر اس کے کھانے کے لئے
گو کہ مفلس مر رہے ہیں چند لقموں کے لئے

اس کو اندازہ نہیں ہے بھوک کیا چیز ہے
کیا خبر اس کو حقِ ہمسائگی کیا چیز ہے

اس کو کیا اندازہ کیا ہیں مفلسوں کی سختیاں
کیا خبر اس کو کہ کیا ہیں نالہائے بیکساں

اُس کو کیا پرواہ کوئی رات دن ننگا پھرے — کیا خبر اسکو جو کوئی بھوک میں تڑپا کرے
اُس کو کیا اندازہ کوئی بے دوا بیمار ہے — ایک پیسہ کے لئے مرنے کو بھی تیار ہے
اُس کو کیا اندازہ کوئی دھوپ میں جھلسا کرے — کیا خبر اس کو جو کوئی رات بھر تڑپا کرے
میں نے مانا تو ہے بندہ عیش کا سرمایہ دار — مفلسوں کا حال بدلے گا کبھی پروردگار!
تا بکے یہ عیش و عشرت تا بکے زعم سرور — خاک میں مل جائے گا اک دن ترا سارا غرور
دوستی کا دم کسی سے وہ کبھی بھرتی نہیں — امتیازِ شاہ و مفلس موت کچھ کرتی نہیں
موت آئے گی تو بے نام و نشاں ہو جائیگا — تیرا سرمایہ نصیبِ بیکساں ہو جائے گا

آہ بیکس کچھ نہ کچھ اپنا اثر کر جائے گی
ایک دن وہ تیرے دل میں تیر بن کر جائیگی

ساقی

(از جناب احمد ندیم قاسمی)

مری تشنہ لبی کیوں موردِ الزام ہے ساقی — کہ جی بھر کر لُنڈھانے کا یہی انجام ہے ساقی
مری ویران آنکھیں اب زباں کا کام کرتی ہیں — نہفتہ میری خاموشی میں اک کہرام ہے ساقی
میں وہ مے نوش ہوں جسکی نگاہِ تیز سے ابتک — فلک کا تارا تارا لرزہ بر اندام ہے ساقی
مری پرواز کے چرچے ہیں حورانِ بہشتی میں — فرشتوں کی زبانوں پر بھی میرا نام ہے ساقی
جھپٹ جس کی پہاڑوں کے کلیجے چاک کرتی ہے — مرے ہاتھوں میں وہ شمشیرِ خوں آشام ہے ساقی
نظر آتا ہے جس میں دورِ مستقبل کا ہر لمحہ — مرے سینے میں اک ایسا اچھوتا جام ہے ساقی
حقیقت میں مشیّت نے فقط اک کھیل کھیلا ہے — وگرنہ زندگی اک محشرِ اوہام ہے ساقی
منجّم سے نہ سُن افلاک کی گردش کے افسانے — وہاں جانا تو مجھ سے بے ہنر کا کام ہے ساقی

مجھے تو بس خود اپنے عشق کا ظرف آزمانا ہے
نہ شوقِ سرخوشی نے خواہشِ انعام ہے ساقی

مولانا شبلی اردو شاعر کی حیثیت سے

(از سید اصغر علی سکندر آبادی)

اگرچہ اُردو ادب میں مولانا شبلی کا نام بہت مشہور ہے لیکن شاعر کی حیثیت سے انھوں نے کوئی خاص نام پیدا نہیں کیا۔ جس کے متعدد وجوہ ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کی اُردو شاعری کوئی درجہ نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا موصوف کو اُردو شاعری میں بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔

اُنھوں نے شاعرانہ حیثیت سے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی، اس لئے ان کی شاعری کو بالکل فطری سمجھنا چاہیئے۔ وہ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے، اُن کا مطالعہ بھی بہت زیادہ تھا۔ اعظم گڈھ کے مشاعروں میں وہ شریک بھی ہوتے تھے اور اپنے یہاں بھی مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے جن میں بذاتِ خود حصہ لیتے تھے۔ اُس زمانہ میں منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی کا بہت چرچا تھا اس لئے مولانا نے بھی اپنا تخلص تسلیم کے ہموزن تسنیم رکھا۔ لیکن بعد میں خود اپنے نام شبلی کو تخلص قرار دیا جو آخر تک برقرار رہا۔

مولانا کی شاعری میں غزلیات، قصائد، مثنوی، مسدس، وغیرہ سبھی اصنافِ سخن ہیں، لیکن ان سب میں اُن کی نظمیں زیادہ مؤثر اور قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں کو مختلف عنوانات کے ماتحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً تاریخی اور اخلاقی جس میں اسلامی روایات اور تاریخی واقعات قلمبند کئے گئے ہیں دوسری اصلاحی نظمیں جو قوم کی اصلاح کی غرض سے لکھی گئیں، اور تیسری سیاسی نظمیں جو اس زمانے کے واقعات کے عکس ہیں اور جن کے مطالعہ سے اس زمانے کی سیاسی حالت پر کافی روشنی پڑتی ہے

سب سے پہلے ہم مولانا کی غزلیات کو دیکھتے ہیں۔

غزلیات: مولانا کی آمد کلیات میں سب سے پہلی غزل نہایت کامیاب ہے، ملاحظہ ہو:-

اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے نشان چھوڑا نہ پھر کہیں کا — گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا

بھلی تھی تقدیر یا بری تھی، وہ راز کس طرح سے عیاں ہو — بتوں کو سجدے کئے ہیں آگے کہ مٹ گیا سب لکھا جبیں کا

وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں — سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہوں گی ابھی تو سن ہے [illegible]

نیا عالم ہے یہ طرز بندش، سخنوری ہے فسونگری ہے کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

مگر عام طور پر یہ کہنا درست ہو گا کہ مولانا کی غزلیات میں کوئی خاص بات نہیں ہے البتہ فارسی ترکیبیں دیکھنے کے لائق ہیں، ایک دوسری غزل کے چند شعر یہ ہیں:-

یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے　　گلِ ترکو ہوسِ خار نہ ہونے پائے
اسمیں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ　　شکوۂ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے
پھر کہیں جوش میں آجائیں نہ یہ دیدۂ تر　　سامنے ابرِ گہربار نہ ہونے پائے
جمع کر لیجئے غمزوں کو مگر خوبیِ بزم　　بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے
آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی
حالِ دل دیکھیئے اظہار نہ ہونے پائے

مختلف غزلیات کے چیدہ چیدہ اشعار یہ ہیں:-

قتل ہو کر بھی سبکدوشی کہاں　　تیغ کا گردن پہ احساں رہ گیا
کیا قیامت ہے کہ کوئے یار سے　　ہم تو نکلے اور ارماں رہ گیا
لوگ پہونچے منزلِ مقصود تک　　میں جرس کی طرح نالاں رہ گیا
تیس دن کے لئے ترکِ مے و ساقی کرلوں　　واعظِ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں
کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے　　تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کرلوں
دردِ فرقت سے ترے ضعف ہے ایسا ہم کو　　خواب میں بھی ترے دشوار ہے آنا ہم کو
کچھ اکیلی نہیں میری قسمت　　غم کو بھی ساتھ لگا لائی ہے
موت بھی روٹھ گئی تھی مجھ سے　　یہ شبِ ہجر منا لائی ہے
مجھ کو لیجا کے مری آنکھ وہاں　　اِک تماشا سا دکھا لائی ہے
آہ کو سوئے اثر بھیجا تھا　　واں سے کیا جانئے کیا لائی ہے

ان اشعار میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

قصائد مولانا کا وہ قصیدہ جو انھوں نے سلطان عبدالحمید والی ترکی کی شان میں لکھا تھا بہت مشہور ہے۔ درحقیقت اس کا طرز بیان پُر جوش ہے اور استعارات و تشبیہات ایک سے ایک بلند پایہ ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

پھر بہار آئی ہے شاداب ہے پھر دشت و چمن　　بن گیا رشکِ گلستانِ ارم پھر گلشن

شعلہ زن پھر چمنستاں میں ہوئی آتشِ گل — پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن
آگ پانی میں لگا دی ہے کسی نے شاید — حوض میں عکسِ گل و لالہ ہے یا جلوہ فگن
باغ میں بادِ بہاری کی جو آمد کی ہے دھوم — بہرِ تسلیم ہر اک شاخ کی خم ہے گردن
مسند آرائے تجمل جو ہوا شاہدِ گل — مرغِ گلشن یہ صدا دیتے ہیں "الملک لمن"
شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں صبا ہے بدمست — وجد میں تال لگاتا ہے ہر اک برگِ سمن
سر نکالے ہیں حبابوں نے تہِ آب سے کیوں — نظر آتی نہ تھی پانی میں مگر سیرِ چمن
چونکتے ہیں جو کبھی خواب سے اطفالِ بہار — تھپکیاں دیتی ہے سونے کے لئے بادِ چمن

دوسرا قابلِ ذکر اور کامیاب قصیدہ وہ ہے جو مولانا نے جسٹس سید محمود کی شادی کے موقعہ پر لکھا۔ اس کا مضمون پرشکوہ اور مناسبِ وقت ہے۔ شادی کی مناسبت سے مولانا نے بہاریہ تمہید لکھی ہے اور اسی زمین میں قصیدہ کہا ہے جو محسنؔ کاکوروی کے مشہورِ زمانہ قصیدہ

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

پھر ہوا بادِ بہاری کا جو عالم میں عمل — چھا لیا سبزۂ نوخیز نے سب دشت و جبل
ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر بادِ بہار — جھومتے آتے ہیں پھر صحنِ چمن میں بادل
نو عروسانِ چمن کے ہیں نرالے انداز — کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل
سمتِ قبلہ سے جو اٹھتی ہیں گھٹائیں ہر بار — کہتی ہیں توبہ زاہد سے کہ ابکی تو سنبھل
کچھ عجب شان سے تنتے ہیں جوانانِ چمن — صحنِ گلزار ہے یا عیش و طرب کا دنگل
جھومتی چلتی ہے نہجو دروشوں پہ جو نسیم — غنچے کہتے ہیں چٹک کر کہ سنبھل دیکھ سنبھل
اے صبا باغ میں آنا تو دبے پاؤں ذرا — نیند میں سبزۂ خوابیدہ کے آ جائے نہ خلل
بوئے خوش سے یہ نسیم سحری کہتی ہے — حجرۂ غنچہ میں کیا کرتی ہے آ، سیر کو چل
اوجِ اقبال تو دیکھو کہ سلیماں کی طرح — سیر کرتے ہوئے پھرتے ہیں ہوا پر بادل
مژدہ اے بادہ کشو اب تمہیں [illegible] کا ہے — ابر کا عالمِ بالا پہ بچھا ہے اب تو محل
میں بھی [illegible] وقت جو محمود ہے تو — میں بھی ہوں نازِ سلف تو ہے جو غزادل

[illegible] علی گڑھ میں ایک جلسہ کیا تھا جس میں خود سر [illegible]

اور اُن کے نامور رفقائے کار نے حلیہ اور پوشاکیں تبدیل کر کے تقریریں اور نظمیں پڑھی تھیں۔ یہ مسدس جس کا عنوان "تماشائے عبرت" ہے مولانا نے اسی جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس کے شروع کا بند

آج کی رات یہ کیوں جمع ہیں احباب بہم　　　بھیڑ کیا ہے نظر آتا ہے یہ کیسا عالم
نوجوانانِ ہنر پرور و ارباب ہمم　　　جوق کے جوق چلے آتے ہیں کیسے پیہم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا جو یہ سب سمجھے ہیں
شاید اس بزم کو یہ بزمِ طرب سمجھے ہیں

اس کے بعد یہ بات واضح کر کے کہ یہ کوئی تماشا نہیں ہے بلکہ مقامِ عبرت ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے کبھی سلطنتیں کی تھیں اُن کی اولاد آج ایکٹر بنی ہوئی ہے اور اپنی عزت و وقار کا کچھ خیال نہیں ہے۔ اسلام کی عظمتِ رفتہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے آخر کے تین بند نہایت دردناک ہیں جنھیں اگر آج بھی پڑھا جائے تو محال ہے کہ آنسو روک لئے جائیں۔

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصّے　　　یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے　　　دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے
کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانے سے مٹا دیں کیونکر

مرو و شیراز و صفاہان کے وہ زیبا منظر　　　بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در
مصر و غرناطہ و بغداد کا ایک ایک پتھر　　　اور وہ دلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر
ان کے ذرّوں میں چمکتے ہیں وہ جوہر ابتک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں از بر ابتک

اِن سے سُن لے کوئی افسانۂ یارانِ وطن　　　یہ دکھا دیتی ہیں آنکھوں کو وہی خوابِ کہن
تیرے ہی نام کا لے قوم یہ گاتے ہیں بھجن　　　تیرے ہی نغمۂ پر درد کے یہ ہیں ارگن
پوچھتا ہے جو کوئی ان سے نشانی تیری
یہ سنا دیتے ہیں سب رام کہانی تیری

مثنوی: اب تک یہ سمجھا جاتا رہا تھا کہ مثنوی صرف داستان حسن و عشق کے لئے وقف ہے مگر مولانا شبلی نے ثابت کر دکھایا کہ دیگر اصنافِ سخن کی طرح مثنوی سے بھی ترقی و اصلاح قوم کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

ادراکِ جمالِ یار نگہ می تواں نمود
حرفے ز حالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام — جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرقِ آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کر دیئے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اُڑا دیئے تھے — اٹلی کو کنوئیں جھنکا دیئے تھے
با ایں ہمہ جاہ و شوکت و فر — اقلیم ہنر بھی تھی مسخر

اس پچھلی داستانِ عروج کے بعد تنزّل کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

یہ قوم کہ تاجِ آسماں تھی — اب کوئی گھڑی کی میہماں تھی
تھے جان کے پڑ گئے جو لالے — ہر سانس پہ لیتی تھی سنبھالے
جس چشمہ سے اک جہاں تھا سیراب — وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب
پامال ہوا تھا بوستاں کیا! — آئی تھی بہار پہ خزاں کیا!
وہ ابر کہ چھا رہا تھا یکسر — دو دن ہوئے کھل گیا برس کر
پستی نے دبا لیا فلک کو — خورشید ترس گیا چمک کو
اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے — عیسیٰ کو تلاشِ چارہ گر ہے
جو ابر ابھی برس گیا ہے — اک بوند کو اب ترس گیا ہے

تنزّل کا مکمل نقشہ کھینچنے کے بعد امید کا سہارا بھی دکھایا ہے، یہ سہارا کیا تھا، سرسید کی تحریک علی گڑھ۔

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دلگیر — پہلو میں اثر، بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے چھینے لیتی بلا تھی — جادو تھی، فسوں تھی، جانے کیا تھی
ڈوبی ہر تن جو تھی اثر میں
نشتر سی اتر گئی جگر میں

مرثیے | مولانا نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب کی موت پر دو مرثیے بربادیِ خانماں اور نالۂ شبلی کے نام سے لکھے۔ پہلا مرثیہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے:۔

وہ برادر کہ مرا یوسفِ کنعانی تھا — وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیِ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمتِ یزدانی تھا — قوتِ دست و دلِ شبلیِ نعمانی تھا
جوش اُسی کا تھا جو میرے سرِ پرشور میں تھا — بل اسی کا یہ مرے خامۂ پرزور میں تھا
ہم سے ناکاروں کی اک قوتِ عالی تھا وہی — مایۂ عزتِ اجداد کا حامل تھا وہی

نالۂ شبلی کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:۔

وہ بھی تھا ایک دن کہ یہ وحشت سرائے دل — اک محشرِ نشاط و وفورِ سرور تھا
رنگینیٔ خیال سے لبریز تھا دماغ — جو شعر تھا چراغِ شبستانِ حور تھا
سینہ میں تھا چمن کدۂ صد امیدِ نو — آنکھوں میں کیفِ بادۂ ناز و غرور تھا
اک ایک برگ تھا ورقِ نوبہارِ حسن — ذروں کے رخ پہ صبحِ سعادت کا نور تھا

درحقیقت دونوں مرثیے درد و کرب کی مجسم تصویریں ہیں۔

اب ہم مولانا کی نظموں کو مختلف عنوانات کے تحت دیکھیں گے، مثلاً تاریخی اور اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی وغیرہ وغیرہ۔

تاریخی اور اخلاقی نظمیں | یہ نظمیں عام طور سے اسلامی روایات کے متعلق ہیں، اور مولانا نے ان نظموں میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ صحیح واقعات بھی خوش اسلوبی سے نظم کئے جا سکتے ہیں۔ گو ان نظموں میں اکثر روایات ہی کو نظم کر دیا گیا ہے پھر بھی ان میں شاعری کا پورا زور موجود ہے۔ ان نظموں میں اسلامی معاشرت کے ایسے واقعات درج ہیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے، چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں

مولانا کی آخری نظم بعنوان "اہل بیت رسول صلعم کی زندگی" اس سلسلہ کی ایک شاندار نظم ہے، اس میں رسول مقبول کی صاحبزادی کی روزانہ زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:۔

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال — گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں — چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار — گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا
آخر گئیں جنابِ رسولِ خدا کے پاس — یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذنِ عام تھا

محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض
واپس گئیں کہ پاسِ حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضور نے
کل کس لئے تم آئیں تھیں کیا خاص کام تھا
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں
حیدر نے ان کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن
جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بند و بست سے فارغ نہیں ہنوز
ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گزرتی ہیں
میں ان کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں
جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا
یوں کی ہے اہلِ بیتِ مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

دوسری نظم " ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر " سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آنحضرت پر صحابہ کرام و صحابیات کس طرح اپنی جان چھڑکتے تھے اور آپ کو بخیریت اور خوش و خرم دیکھ کر اپنا دُکھ بھول جاتے تھے۔

کافروں نے یہ کیا جنگِ اُحد میں مشہور
کہ پیمبر بھی ہوئے کشتۂ شمشیر دو دم
ہو کے مشہور مدینہ میں جو پہونچی یہ خبر
ہر گلی کوچہ تھا ماتم کدۂ حسرت و غم
ہو کے بیتاب گھروں سے نکل آئے باہر
کودک و پیر و جوان و خدم و خیل و حشم
وہ بھی نکلیں کہ جو تھیں پردہ نشینانِ عفاف
جن میں تھیں سیدۂ پاک بھی با دیدۂ نم
ایک خاتون کہ انصار نکو نام سے تھی
سخت مضطر تھیں نہ تھے ہوش و حواس ان کے بہم
موقعِ جنگ پہ پہونچی تو یہ لوگوں نے کہا
کیا کہیں تجھ سے کہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں ہم
تیرے بھائی نے لڑائی میں شہادت پائی
تیرے والد بھی ہوئے کشتۂ شمشیر ستم
سب سے بڑھ کر یہ کہ شوہر بھی ہوا تیرا شہید
گھر کا گھر صاف ہوا ٹوٹ پڑا کوہِ الم
اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا
یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہِ امم
سب نے دی اُس کو بشارت کہ سلامت ہیں حضور
گرچہ زخمی ہیں سر و سینہ و پہلو و شکم
بڑھ کے اُس نے رُخِ اقدس کو جو دیکھا تو کہا
تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہے سب رنج و الم
میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

آج گاندھی جی اچھوت اُدھار میں مصروف ہیں، لیکن اسلام نے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اس مسئلۂ مساوات کی تعلیم عام کر دی تھی۔ مولانا کی ایک نظم "مساواتِ اسلام" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے

بارگاہِ نبوی کے جو مؤذن تھے بلال　　کر چکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر
جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں　　جا کے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھل کر
میں غلامِ حبشی اور حبشی زادہ بھی ہوں　　یہ بھی سُن لو کہ مرے پاس نہیں دولت و زر
اِن فضائل پہ مجھے خواہشِ تزویج بھی ہے　　ہے کوئی جس کو نہ ہو میری قرابت سے عذر
گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ "دل سے منظور"　　جس طرف اُس حبشی زادہ کی اُٹھتی تھی نظر
عہدِ فاروق میں جس دن کہ ہوئی اُنکی وفات　　یہ کہا حضرتِ فاروق نے بادیدۂ تر

اُٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا
اُٹھ گیا آج نقیبِ حشمِ پیغمبر!

مسلمان حق بات پر اپنے خلیفہ تک سے نہ چوکتے تھے اور اُسے بھی مجمعِ عام میں ٹوکنے سے گریز نہ کرتے تھے، اور پھر خلیفہ بھی اپنی بات کے غلط ہونے پر اپنے آپ کو قصوروار مان لیتا تھا۔" عدلِ فاروقی کا ایک نمونہ" اور "اظہار قبول حق" جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے، اسی قبیل کی دو نظمیں ہیں:۔

وارثِ عدلِ پیمبر عمر ابن الخطاب　　ہیچ تھی جن کے لئے منزلتِ تاج و سریر
مجمعِ عام میں لوگوں سے اُنھوں نے یہ کہا　　مہر باندھو نہ زیادہ کہ ہے یہ بھی تبذیر
جس قدر تم کو ہو مقدور وہیں تک باندھو　　حکم یہ عام ہے سب کو اُمرا ہوں کہ فقیر
ایک بڑھیا نے وہیں ٹوک کے فوراً یہ کہا　　تجھ کو کیا حق ہے جو تو کرتا ہے ایسی تقریر
صاف قرآں میں قنطار کا لفظ آیا ہے　　تجھ کو کیا حق ہے کہ اس لفظ کی کردے تغییر؟
لاکھ تک بھی ہو تو کہہ سکتے ہیں اسکو قنطار　　تھا یہ اِک وزن کہ اس وزن کی یہ ہے تعبیر

سرنگوں ہو کے کہا حضرتِ فاروق نے آہ!
میں نہ تھا اس سے جو واقف تو یہ میری تقصیر"

ہجرتِ نبوی صلعم، تعمیرِ مسجد نبوی صلعم، ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی، اور رسول اللہ صلعم کا حلم اور عفو، خلافتِ فاروقی کا ایک واقعہ، جرأتِ صداقت، نظامِ حکومتِ اسلام، ہمارا طرزِ حکومت، عدل جہانگیری اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف وغیرہ وغیرہ اسی سلسلہ کی دوسری نظمیں ہیں۔

سیاسی نظمیں　مولانا کا سیاسی مسلک وہی تھا جو آجکل دارالعلوم ندوہ کا ہے۔ مولانا ہی ایک کیا اس

زمانے کے ہر مسلمان کا یہی مسلک تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ اسلامی دنیا پر نئے نئے عذاب اور مظالم نازل ہو رہے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام اور الحاق کے سلسلہ میں گورنمنٹ اور مسلمانوں میں اختلاف، مسجد کانپور کا واقعہ تقسیم بنگال کی تنسیخ، طرابلس اور بلقان کی لڑائی اور مسلم لیگ کے واقعات ایسے تھے جن سے ہندی مسلمانوں میں ایک آگ سی لگ گئی اور انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات اُبھر آئے۔

مولانا کی اس زمانے کی نظمیں اکثر پریس ایکٹ کے ماتحت ضبط کر لی گئیں۔ اسی لئے وہ منظر عام پر نہیں ہیں۔ یہ نظمیں اخبار زمیندار لاہور، ہمدرد لکھنؤ، مسلم گزٹ لکھنؤ اور الہلال کلکتہ میں جو مولانا ابو الکلام کا ہفتہ وار اخبار تھا "کشاف" اور "وصاف" کے نام سے چھپتی تھیں۔ لیکن اکثر نظمیں الہلال کلکتہ ہی میں چھپیں کیونکہ مولانا شبلی اور مولانا آزاد میں پورا اتفاق رائے تھا۔

جنگ بلقان ان نظموں میں سب سے مشہور وہ نظم ہے جو رفاہ عام لکھنؤ کے جلسے میں پڑھی گئی جو مجروحین جنگ کی امداد کے لئے چندہ فراہم کرنے کی غرض سے ہوا تھا۔ یہ نظم "شہر آشوب اسلام" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نظم ۱۱۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کے اخبار زمیندار لاہور میں چھپی۔ پڑھتے وقت حاضرین پر یہ اثر تھا کہ ہر شخص رو رہا تھا اور محفل مجلس عزا کا سماں پیش کرتی تھی۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم جنگ بلقان میں ایک طبی وفد ترکی لے کر گئے تھے، اس کی واپسی پر بھی مولانا نے ایک نہایت پرزور نظم لکھی تھی۔

واقعۂ مسجد کانپور مسجد کانپور کے فساد کے سلسلے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک برقی لہر دوڑ گئی تھی اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ چنانچہ مولانا نے بھی اس کے متعلق متعدد نظمیں لکھیں، جن میں سے صرف دو کے تھوڑے تھوڑے اقتباس پیش کئے جاتے ہیں:۔

پھنائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے

یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ تیغ آزادی
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ بچے ہیں سویرے انکو سو جانے کی عادت ہے

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

دوسری نظم کا ہر شعر اثر کرنے والا ہے، ملاحظہ کیجئے:۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں

کچھ نوجواں ہیں بے خبرِ نشۂ شباب　　ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
اُٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بیدریغ　　محرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینوں پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار　　از بسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں
کچھ پیرِ کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا　　جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

مسلم لیگ — مسلم لیگ نے جو اہمیت آج حاصل کرلی ہے وہ ہمیشہ ہی سے موجود نہ تھی بلکہ پہلے اس کا کام صرف یہ تھا کہ سال میں ایک اجلاس کرلیا جائے اڈریس، مولانا اسکو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں　　محسنِ قوم بھی ہے خادمِ حکام بھی ہے
ربط ہے اسکو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی　　جس طرح "صرف" میں اک قاعدہ ادغام بھی ہے
اسکے آفس میں بھی ہر طرح کا ساماں ہے درست　　ورقِ سادہ بھی ہے کلکِ خوش اندام بھی ہے
ہیں قرینے سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو　　جابجا دفترِ پارینۂ احکام بھی ہے
چند بی۔اے ہیں سند یافتۂ علم و عمل　　کچھ اسسٹنٹ ہیں کچھ حلقۂ خدام بھی ہے
ہو جو تعطیل میں تفریحِ سیاحت مقصود　　سفرِ درجۂ اول کے لئے دام بھی ہے
یہ تو کچھ ہے، مگر ایک گزارش ہے حضور　　گرچہ یہ سوءِ ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے؟

ایک دوسری نظم میں مولانا مسلم لیگ کو بتلاتے ہیں کہ کون سے کام ایسے ہیں جو انھیں کرنا چاہئیں:

آپ لبرل جو نہیں ہیں تو بلا سے نہ سہی　　یاں کسی کو طلبِ افسر و اورنگ نہیں
کام کرنے کے بہت سے ہیں جو کرنا چاہے　　اب بھی یہ دائرۂ سعی و عمل تنگ نہیں
سال میں یہ جو تماشا سا ہوا کرتا ہے　　کام کرنے کے یہ انداز نہیں ڈھنگ نہیں
کچھ تو نظم و نسقِ ملک میں بھی دیجئے دخل　　شیوۂ حق طلبی ہے، یہ کوئی جنگ نہیں
کچھ نہ کچھ نظمِ حکومت میں ہے اصلاح ضرور　　ہم نہ مانیں گے کہ اس آئینہ میں زنگ نہیں

کم سے کم حاکمِ اضلاع تو ہوں اہلِ وطن!
کیا ہزاروں میں کوئی صاحبِ فرہنگ نہیں

جب سلف گورنمنٹ کا معاملہ درپیش تھا تو اس میں مسلم لیگ نے سوٹ ایبل کی ایک شرط لگا دی تھی، اس کا جو مقصد تھا واضح ہے، مولانا نے اس کے خلاف اپنی مختلف نظموں میں صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ان کی مختلف نظموں سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:۔

سمجھے نہ یہ کہ "سوٹ ایبل" کی جو شرط ہے
تمہیدِ سجدہ ہائے جبینِ نیاز ہے

سمجھے نہ لوگ یہ کہ یہی لفظِ پُر فریب
اِس ملک میں طلسمِ غلامی کا راز ہے

سب یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب لیگ و کانگریس
دونوں کا ایک عرصہ گہِ ترک و تاز ہے

اپنی دوسری نظم میں فرماتے ہیں:۔

اِک ذرا سی مگر اس لفظ میں تخصیص بھی ہے
جس سے ہیں متفق اللفظ سب اربابِ نظر

یعنی وہ سلف گورنمنٹ کہ ہو "سوٹ ایبل"
یا کہ موزون و مناسب ہو بالفاظِ دگر

یہ مسلّم کہ ہر اک ملک کی حالت ہے جدا
جس کا آئینِ حکومت پہ بھی پڑتا ہے اثر

جو حکومت کہ کناڈا کے لئے موزوں ہے
ہے وہی مملکتِ ہند میں سرمایۂ شر

ملک میں ہم بھی ہیں، ہندو بھی ہیں عیسائی بھی
جو کہ ہیں نخلِ حکومت کے لئے برگ و ثمر

واقعی قیدِ "مناسب" ہے بجا اور موزوں
آپ اس قید کو کس کام میں لائیں گے مگر؟

پہلے بھی آپ تو اس حصن میں لیتے تھے پناہ
پہلے بھی آپ اِسی دشت میں تھے راہ سپر

جب کبھی کوئی بھی تحریک سیاسی ہو گی
آپ اس قیدِ "مناسب" کو بنائیں گے سپر

اب بھی ہیں جادۂ مقصد کے وہی نقشِ قدم
اب بھی اوراقِ سیاست کا وہی ہے مسطر

یہ وہی لفظ ہے مجموعۂ صد گونہ فریب
یہ وہی لفظ ہے سرمایۂ صد گونہ ضرر

آپ ہر بار جو بڑھ بڑھ کے پلٹ آتے ہیں
ہے اِسی شیوۂ تعلیمِ غلامی کا اثر

آپ کے فلسفۂ نو کے یہ الفاظِ جدید
گو بظاہر ہیں زیبندۂ اربابِ بصر

ہے حقیقت میں اسی متنِ غلامی کی یہ شرح
ہے حقیقت میں اِسی نخلِ سیاست کا ثمر

چند جملے جو زبانوں پہ چلے آتے ہیں
آپ دُہراتے ہیں ہر بار باندازِ دگر

ایک انہیں سے ہے یہ بھی کہ "ابھی وقت نہیں"
ہے اسی لفظ کی تشریح باندازِ دگر

آج یہ لفظ "مناسب" جو نیا وضع ہوا
آپ اس لفظ کو ہر بار بنائیں گے سپر

آپ کے دائرۂ بحث کا مرکز تھا یہی
آپ کی گردشِ پیہم کا یہی تھا محور

آپ اس دام سے برسوں بھی نہ چھوٹیں گے کبھی
آپ اس کوچۂ پُرخم سے نہ ہوں گے سر بر

آپ اس بھول بھلیاں سے نہ نکلیں گے کبھی | دل سے جائے گا نہ تعلیم غلامی کا اثر
جب کہیں بھی کوئی پہلوئے غلامی ہوگا | ہر طرف پھر کے اسی نقطہ پہ ٹھہرے گی نظر
اس قدر سرد مزاج اور پھر اس پر تبرید | خوف یہ ہے کہ پہونچ جائے نہ فالج کا اثر

آپ کچھ گرم دوائیں جو گوارا فرمائیں
ہم دعاگو یہ سمجھتے ہیں کہ ہوگا بہتر

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ تحریک علی گڈھ میں حالی۔ محسن الملک، وقار الملک، اور نذیر احمد وغیرہ کی طرح مولانا شبلی بھی سرسید مرحوم کے رفیق کار تھے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو جب یونیورسٹی کا درجہ دینے کا قضیہ پیش ہوا تو اس سلسلہ میں چند باتوں میں مسلمانوں اور گورنمنٹ میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ کالج کا نام مسلم یونیورسٹی رکھا جائے اور ہندوستان کے تمام مسلم کالج اور اسکول وغیرہ اس سے ملحق کردئیے جائیں۔ گورنمنٹ الحاق کرنا نہیں چاہتی تھی، اور کالج کا نام علیگڈھ یونیورسٹی رکھنا چاہتی تھی۔ اس سلسلہ میں مولانا نے خوب خوب نظمیں لکھیں اور ان میں مسلمانوں کے خیالات کا اظہار کیا۔ مولانا نے اپنی ایک نظم مسلم یونیورسٹی میں یہ بتا کر کہ لفظ مسلم سے گورنمنٹ کو احتمال بیجا ہوگیا ہے آگے الحاق کے مسئلہ پر لکھتے ہیں کہ:۔

الحاق سے کچھ اور نہ تھا مدعائے خاص | بس اک عموم درس وفا کا خیال ہے
یعنی کہ پھیل کر یہ زمانے کو گھیر لے | اب تک جو مختصر یہ علی گڈھ کا جال ہے
یہ پالسی ہے شاہراہ عام قوم کی | اس سے کوئی الگ ہے تو وہ خال خال ہے
پھر بھی حضور کی نہ گئیں سر گرانیاں | پھر بھی گناہگار مرا بال بال ہے
اتنی سی آرزو بھی پذیرا نہ ہوسکی | اب کیا کہیں کہ اور بھی کچھ عرض حال ہے

آخر میں الحاق کے معاملہ میں گورنمنٹ نے قطعی طور سے انکار کردیا اور کسی صورت سے راضی نہ ہوئی۔ مگر اس ساری جد و جہد کا وہی حشر ہوا جو مسلمانوں کی تقریباً ہر تحریک کا ہوتا ہے کہ تقریریں بڑی دھواں دھار ہوتی ہیں اور جب عمل کا وقت آتا ہے تو صفر۔ مولانا نے اس کا ذکر اپنی ایک نظم "یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ" میں کیا ہے جو ۲۸۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کو لکھی گئی۔ اجلاس میں مسلمانوں کے جوش و خروش کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

احرار کہہ رہے ہیں زمانیں گے ہم کبھی | ویٹو کا وائسرائے کو کیا اختیار ہے
الحاق اگر نہیں ہے تو یہ سعی ہے عبث | مسلم کا لفظ خاص ہمارا شعار ہے

جو والیانِ ملک کہ تھے زیبِ انجمن　　سب دم بخود سے تھے کہ یہ کیا خلفشار ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں　　نے وہ خروش و جوش نہ وہ گیر ودار ہے
ڈٹی ہوئی صفیں ہیں علم سرنگوں ہیں سب　　بازوئے تیغ گیر جو تھا رعشہ دار ہے
"سازش" کا ایک جال بچھایا ہے ہر طرف　　ہر شخص اس کی فکر میں مصروف کار ہے
سرمستیاں ہیں دورِ قدح ہائے راز کی　　ہر شخص "حکمتِ عملی" کا شکار ہے
جو بات کل تلک سبب ننگ و عار تھی　　وہ آج مایۂ شرف و افتخار ہے
جس بات پر کہ نعرۂ نفریں بلند تھے　　اب وہ قبولِ خاطرِ ہر ذی وقار ہے
کل کہہ چکے ہیں کیا؟ یہ نہیں اب کسی کو یاد　　اب نکتہ ہائے زیرلبی پر مدار ہے
خود آپ اپنے ہاتھ سے کھائی ہے گو شکست　　کہتے ہیں پھر یہ فتحِ مبیں یادگار ہے
حیران تھے عوام کہ کیا ماجرا ہے یہ　　یہ کیا دو رنگیِ چمنِ روزگار ہے

احرار کا طریقِ عمل ہے اگر یہی
پھر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے

یہاں یہ ذکر کر دینا شاید بیجا نہ ہوگا کہ احرار ان کو کہتے تھے جو ترقی کرنا چاہتے تھے اور ترقی پسند تھے۔

لاحی نظمیں

مولانا شبلی درحقیقت سچے مسلمان تھے اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان پستی سے اُبھریں۔ انچہ اسی مقصد کو اپنے سامنے رکھکر اُنھوں نے مختلف نظمیں لکھیں۔ اپنی ایک نظم "اسلام کے تنزل کا لی سبب" میں یہ بتا کر کہ گو تمام دنیا کے مسلمان ایک سے نہیں ہیں پھر بھی تنزلی کے معاملہ میں یکساں ہیں ن کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ:-

بحثِ مافیہ میں پہلی غلطی یہ ہے کہ آپ　　جس کو اسلام سمجھتے ہیں وہ اسلام نہیں
آپ کھانے کو بنا دیتے ہیں پہلے مسموم　　پھر یہ کہتے ہیں غذا موجبِ اسقام نہیں
اعتقادات میں ہے سب سے مقدم توحید　　آپ اس وصف کو ڈھونڈھیں تو کہیں نام نہیں
کون ہے شائبۂ شرک سے خالی اس وقت　　کون ہے جس پہ فریبِ ہوسِ خام نہیں
آستانوں کی زیارت کے لئے شدِ رحال　　اس میں کیا شان پرستاریِ اصنام نہیں
اب عمل پر جو نظر کیجئے آئے گا نظر　　کہ کسی ملک میں پابندیِ احکام نہیں
اغنیاء کی ہے یہ حالت کہ نہیں ہے وہ رئیس　　جس کے چہرے پہ فروغِ مے گلفام نہیں
نہ کہیں صدق و دیانت ہے نہ پابندیِ عہد　　دل میں ناصاف زبانوں پہ جو دشنام نہیں

آیتِ فاعتبروا پڑھتے ہیں ہر روز مگر
علماء کو خبرِ گردشِ ایّام نہیں

الغرض عام ہے وہ چیز جو بیدینی ہے
صاف یہ بات ہے دھوکہ نہیں ابہام نہیں

اِن حقائق کی بنا پر سببِ پستیِ قوم
ترکِ پابندیِ اسلام ہے، اسلام نہیں

ایک دوسری نظم میں بتاتے ہیں کہ ہمارے مولویوں کو اب اس کی بجائے کہ وہ تبلیغ کریں کام یہ رہ گیا ہے کہ کام کرنے والوں کی تکفیر کرتے رہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اِک مولوی صاحب سے کہا میں نے کہ کیا آپ
کچھ حالتِ یورپ سے خبردار نہیں ہیں

آمادۂ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں
ہرچند ابھی مائلِ اظہار نہیں ہیں

تقلید کے پھندوں سے ہوئے جاتے ہیں آزاد
وہ لوگ بھی جو داخلِ احرار نہیں ہیں

جو نام سے اسلام کے ہو جاتے تھے برہم
ان میں بھی تعصب کے وہ آثار نہیں ہیں

افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا
یا ہیں تو بقول آپ کے دیندار نہیں ہیں

کیا آپ کے زمرہ میں کسی کو نہیں یہ درد
کیا آپ بھی اس کے لئے تیار نہیں ہیں

جھلا کے کہا یہ کہ یہ کیا سوءِ ادب ہے
کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر
بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں

مولانا اپنی ایک نظم "دعوتِ عمل" میں جو ۱۸۹۳ء کے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پڑھی گئی تھی حاضرین کے اوصاف کی تعریف کرنے کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ جو باتیں دوسری قوموں کے لئے علاج کا حکم رکھتی ہیں وہی ہمارے لئے مضر ثابت ہوتی ہیں۔ مگر ان عام خامیوں کے علاوہ بھی ہم میں کچھ اور خامیاں بھی ہیں، ان کے تدارک کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔

یہ جو کچھ سن چکے ہو قوم کی تم حالتِ ابتر
نہ سمجھو یہ کہ ہے اس داستاں کا خاتمہ اس پر

ہماری سب سے بڑھکر بدنصیبی جو ہے وہ یہ ہے
کہ بے پروا ہیں وہ بھی قوم کے جو آج ہیں لیڈر

گیا وہ وقت جب تھا بس اسی کا نام ہمدردی
کہ دو آنسو بہالیں قوم کی درماندہ حالت پر

گیا وہ وقت ہم کو ناصحوں کی جب ضرورت تھی
فلک نے کر دیا اِک اِک کو آپ اپنا نصیحت گر

گئے وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے
ہمارا حال خود عبرت فزا ہے آج سر تا سر

ضرورت اب ہے گر ہمکو تو بس ہے ان بزرگوں کی
کہ جن میں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہوں جوہر

فقط باتیں ہوں کچھ کام بھی بن آئے ہاتھوں سے کہیں جو کچھ وہ منہ سے کر دکھائیں اس سے کچھ بڑھکر
نہیں گر یہ تو بس اک گرمیٔ صحبت کے ساماں ہیں یہ قومی مرثیئے یہ وعظ یہ اسپیچ یہ لکچر
طلب از رسمی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر
تمہیں جو کام ہیں درپیش گو مشکل سے مشکل ہیں مگر کرنے پہ آجاؤ تو ہیں آساں سے آساں تر
ابھی تک تم میں ہے اسلاف کا کچھ کچھ اثر باقی شرر گو بجھ چکے پر گرم ہے اب تک وہ خاکستر
ابھی کچھ کچھ مہک باقی ہے ان مرجھائے پھولوں میں ابھی کچھ کاٹ ہے اس تیغ میں گو مٹ چکے جوہر
وہی فیاضیاں تم میں ہیں جو تھیں حسن و حاتم میں مگر بیہودہ رسموں کے لئے وہ وقف ہیں یکسر
کچھ اس سے کم ہوا تھا صرف تجہیز اسامہ میں لٹا دیتے ہو تقریبوں میں جتنا تم زر و زیور
فقط آپس کے جھگڑوں میں تم اس سے کام لیتے ہو وہ جودت اور ذہانت جس میں اب بھی تم ہو نام آور

سنبھلنا اب بھی گر چاہو تو ہے وقت اور ضرورت بھی
وگرنہ پھر نہیں رہنے کی جو کچھ ہے یہ حالت بھی

مختصراً یہ کہ مولانا نے اپنے اُردو کلام سے اصلاح قوم کا بڑا کام کیا اور اپنے لئے اُردو شاعری میں بھی ایک جگہ پیدا کر لی۔

دُعا

(برائے اطفال)

(از مسٹر بندھو لال ٹیگور)

عطا کر علم وہ مجھکو کہ جس کی تابنا کی سے جہالت، ظلمت و وحشت جہاں سے دُور ہو جائے
بنا اس چرخِ عالم کا مجھے وہ ضَو فشاں اختر کہ جس کی اِک جھلک ظلمت کدوں کا نور ہو جائے
بنوں میں اَمن کا داعی اُخوت کی وہ دُھن چھیڑوں دلوں کی ساری دنیا درد سے معمور ہو جائے
مرا ہر حرف ہو اِک تازیانہ پشتِ غفلت کو مرا ہر لفظ عالم کو صدائے صُور ہو جائے
ہو مجھ سے اس جہاں میں وہ نظامِ زندگی قائم کہ جو دل مضمحل ہو کیف سے مسرور ہو جائے

ترے دربار میں یارب، مرے آقا مرے مولےٰ
ہے یہ ہر دم دعا میری، اگر منظور ہو جائے۔

سرد ہوا

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم - اے)

چوٹیوں سے کوہ کی ٹھنڈی ہوا بہتی ہوئی — آئی اور یوں آئی اپنی داستاں کہتی ہوئی
کوہساروں سے چلی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی — موتیوں سے ابر کے دامن کو وہ بھرتی ہوئی
ہر قدم پر ناز کرتی اور اٹھلاتی ہوئی — جس طرح کوئی دلہن آتی ہے شرماتی ہوئی
بیخودی کی چال چلتی مست ہو کر جھومتی — ڈالیوں پر مسکراتی پتیوں کو چومتی
آئی گردوں کے ستاروں سے ضیا لیتی ہوئی — باغ سے گزری تو کلیوں سے حیا لیتی ہوئی
تیرتی آئی فضاؤں میں وہ لہراتی ہوئی — ساز قدرت کا بجاتی اور کچھ گاتی ہوئی
کشت زاروں میں گزر اسکا گلستانوں میں ہے — جنگلوں میں وادیوں میں اور میدانوں میں ہے
بیکسی کا دوش پر ساماں لئے وہ آ گئی — دم کے دم میں ہر طرف عالم پہ آ کر چھا گئی

ڈھونڈتی پھرتی رہی مجھکو شب خاموش میں
اور پھر چپکے سے آ بیٹھی مری آغوش میں

کھڑکھڑاتا پتہ

(از جناب راجہ مہدی علیخاں)

سرسراتی ہوئی آئی چمنستاں میں ہوا
آہ سوکھے ہوئے پتے تری غمناک صدا

بین کرنے لگیں مسرور ہوائیں افسوس — دم بخود ہو گئیں پر کیف فضائیں افسوس
فاختہ کے دل افسردہ میں اک ہوک اٹھی — پھول مرجھا گیا کملا گئی معصوم کلی
تیتری روتی ہوئی صحن گلستاں سے گئی — پر الم راگ سنانے لگی محزوں ندی

آہ سوکھے ہوئے پتے تری غمناک صدا

اُردو ہندی ہندوستانی

(از "حق پسند")

"زمانہ" میں کچھ عرصہ سے پھر زبان سے متعلق مضامین کی گرم بازاری ہے۔ اس دَور کی ابتدا مرزا اعظیم بیگ صاحب چغتائی کے مضمون "صحتِ الفاظ" سے ہوئی۔ اس مضمون کا مدعا یہ تھا کہ صحتِ الفاظ کی آڑ میں بھی آپس کی کشمکش بڑھ رہی ہے۔ ہندوؤں کو شکایت ہے کہ اُردو میں ایک طرف خالص عربی فارسی الفاظ کو اُن کی اصلی ترکیبوں کے ساتھ ٹھونسا جارہا ہے اور دوسری طرف ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی صورت بگاڑی جارہی ہے۔ اگر عربی فارسی الفاظ کو صحت کے شکنجہ سے ہٹایا جائے اور ہندوستانی ماحول کے موافق بنا کر اُن کے سمجھنے اور سیکھنے میں سہولت پیدا کی جائے۔ اور ہندی اور سنسکرت الفاظ کو بگاڑنے کی کوشش نہ کی جائے، تو ایسی زبان مشترکہ زبان بن سکتی ہے۔ غرض ایک مشترکہ ہندوستانی زبان کی فکر اس مضمون کی محرک تھی، اور محترم مرزا صاحب نے اس پیچیدہ مسئلہ کی گرہ کشائی کے لئے خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی اور اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے مبصرین سے اپیل بھی کی تھی۔

چنانچہ "زمانہ" بابت مارچ ۱۹۴۱ء میں خان بہادر ممدوح، منشی شیام موہن لال صاحب جگر بریلوی، سید محمد اظہار الحسن صاحب بی۔ اے، ایل ایل۔ بی، اور مسٹر "ح۔ق" اور "زمانہ" بابت اپریل ۱۹۴۱ء میں نواب محمود علی خاں صاحب نے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

میرا خیال سب سے زیادہ جناب سید محمد اظہار الحسن صاحب سے ملتا ہے۔ جن کے مضمون کو میں نے بہت زیادہ پسند کیا ہے، اس لئے بھی کہ دوسروں پر کسی قسم کے چھینٹے اُڑانے کے بغیر ممدوح نے حقیقتوں کا نہایت خوبی اور جامعیت سے اظہار کیا ہے۔ دوسرے خان بہادر جناب اثر لکھنوی ہیں۔ اِن ہر دو بزرگوں نے صاف صاف الفاظ میں اِس حقیقت کا اعادہ فرمایا ہے کہ ہندی اور اُردو دو مستقل اور علٰحدہ علٰحدہ زبانیں ہیں اور بہی خواہانِ قوم کو چاہیئے کہ ان دونوں کو سیکھیں اور دونوں کی ترقی میں کوشاں رہیں۔ ہندوستانی بجائے خود کوئی علٰحدہ زبان نہیں ہے، اور ہندی اُردو کو ملا کر ہندوستانی بنانے کی کوشش بے سود ہے۔ جناب اظہار الحسن صاحب کے الفاظ میں "ہندی اور اُردو ملکر ہندوستانی تو کیا بنے گی، ہاں اُردو اور ہندی دونوں کی مٹی پلید ہو جائے گی۔"..... ہندوستانی

کے سایہ کے پیچھے دوڑنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں کو اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے کا موقعہ دیا جائے۔" "اُردو۔ ہندی۔ ہندوستانی" سے متعلق کام کی باتیں صرف اتنی ہیں بقیہ چیزیں فروعی اور صرف اُردو سے متعلق ہیں۔

لیکن اس قطعی، صاف صریح اور واضح رائے کے بعد اپریل کی اشاعت میں نواب محمود علی خاں صاحب کا مضمون اسی عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جس میں وہی اُردو کے مشترکہ زبان ہونے کا دعویٰ پیش کیا گیا ہے۔ جس کے ثبوت میں سر تیج بہادر کی مشہور رائے پیش کی گئی ہے کہ اُردو ہندو اور مسلمانوں کا مشترکہ اور ناقابل تقسیم ترکہ ہے۔ اس مضمون میں نواب صاحب نے اُردو کو لشکری زبان بتلایا ہے ہندو ادیبوں سے شکایت کی ہے کہ اُردو میں اگر ہندو تہذیب و تمدن کی نمایندگی نہیں ہے تو خود وہ بھی ذمہ دار ہیں کہ اس طرف توجہ نہیں کی۔ اُنھوں نے "ہندوستان کے سچے بہی خواہ" اور منصف مزاج ہندو صاحبان سے یہ اپیل بھی کی ہے کہ چونکہ ان کے بزرگوں نے صدہا برس کی محنت سے اس زبان کو یعنی اُردو کو سرسبز و شاداب کیا ہے اور اپنے جواہر افکار سے اس کے خزانہ کو مالامال کیا ہے، اس لئے وہ اسے اُن ہندو صاحبان کے ہاتھوں سے تباہ و برباد ہونے سے بچائیں جو وقتی جذبات سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ وغیرہ۔

اس کو پڑھتے ہی مجھکو مکرمی جگر بریلوی کی اس کتاب کا خیال آیا جو اُنھوں نے حال میں تصنیف فرمائی ہے (ابھی یہ تصنیف شائع نہیں ہوئی ہے) جس میں اُردو کی اصلیت سے بحث کی ہے، ہندوں نے اُردو کی ترقی میں جو بیش بہا خدمتیں کی ہیں اُن کا تفصیلی تذکرہ دیا ہے، اور بہت سی کام کی باتیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب اگر کسی طرح "زمانہ" میں بہ اقساط شایع ہو جائے تو اُردو کی لشکری زبان ہونے ہونے کی حقیقت ظاہر ہو جائے، اور یہ حقیقت بھی روشنی میں آجائے کہ ہندوؤں نے کس طرح اپنی مذہبی کتابوں کو اُردو میں منتقل کر کے اپنی تہذیب و تمدن کی نمایندگی کی کوششیں کیں لیکن وہ سب دبا دی گئیں۔ اور اُردو میں ہندی کے جو کچھ الفاظ پھر بھی رہ گئے، اُن کو کس طرح رفتہ رفتہ غیر فصیح ہونے کے الزام سے خارج کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ اب اُردو صرف وہ چیز رہ گئی ہے جس میں محض مسلم تہذیب و تمدن کی نمایندگی ہے اور اُس کا مزاج ایسا قائم ہو گیا ہے کہ اُس میں یہ گنجایش باقی نہیں رہی کہ اُس میں ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی کھپت ہو سکے۔ جس سے وہ کسی اور خصوصًا ہندو تہذیب و تمدن کی نمایندگی کر سکے۔ جگر صاحب نے بڑی دماغ پاشی اور جگر کاوی سے مواد فراہم کیا اور اُس کو اپنی خوبصورت زبان میں پیش کیا ہے۔ اُردو سے دلچسپی رکھنے والے ہر مکتب خیال کے

بزرگوں کے لئے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یہ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی۔

خیر، اب میں نواب صاحب کی اپیل کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دل پر بھی اس کا گہرا اثر ہوا ہے اس لئے کہ ممدوح کا لب و لہجہ دلی خلوص اور سچی لگن کا مظہر ہے اور ایسے مضامین ہر لکھنے والوں کے لئے قابل اتباع ہیں، اس لئے کہ اس سے غیر ضروری تلخیاں نہیں بڑھتیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ممدوح اپنے جذبات کی رَو میں ایک ذہنی مغالطہ کا شکار ہو گئے ہیں۔ جس کی وضاحت ایک گفتگو کے خلاصہ سے بخوبی ہوگی جو میرے ایک مسلمان دوست سے اسی مضمون پر ہوئی تھی۔ میرے دوست نے ارشاد فرمایا تھا کہ دیکھئے صاحب جھگڑا سیاسیات سے بڑھتا بڑھتا کہاں تک آپہونچا، اب زبان کے معاملہ کو بھی ایک دنگل بنا دیا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ دنگل کس نے بنایا تو فرمایا 'یہی ہندو مسلمانوں نے' تالی دونوں ہی ہاتھوں سے بجتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بھائی جان! تالی کے دونوں ہاتھوں سے بجنے کی بات موقع بے موقع خواہ مخواہ چسپاں کی جاتی ہے۔ یوں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک ہاتھ اگر مفلوج بھی ہے تو دوسرا ہاتھ اُس پر ضرب لگا لگا کر آواز پیدا کر سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرا ہاتھ بھی اس تالی کے بجانے میں عملی تعاون کرے۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ آیا ہندو اس بات پر بضد اور مُصر ہیں کہ مسلمانوں کو اُردو چھوڑنی اور ہندی پڑھنی پڑے گی، فرمایا یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے برخلاف صورت واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں پر یہ متواتر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ ہندی سے قطع تعلق کریں اور اُردو کو اختیار کریں۔ اگر کہیں انھیں حکومت حاصل ہے تو حکومت کے زور سے اُردو اُن پر لازمی قرار دی جاتی ہے اور حکومتی رعب، قاعدہ قانون وغیرہ وغیرہ کے ایسے ایسے شکنجے کسے جاتے ہیں کہ پہلے تو کوئی دم مارنے کی جرأت ہی نہیں کرتا اور کسی نے اگر ذرا چون وچرا کی کہ اُس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ یا اگر کسی جگہ ہندو قدرے منظم حالت میں ہیں اور تنظیم کے ساتھ احتجاج کرتے ہیں جیسا کہ پنجاب میں تو میٹھی میٹھی باتیں بنا کر معاملہ کو التوا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاں حکومت حاصل نہیں ہے وہاں ہندی کے خلاف اور اُردو کی تائید میں اپیلیں کی جاتی ہیں یعنی یہ کہ ہندو اُردو کو اختیار کریں اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب ہماری مادری ورنہ قومی زبان تو ہندی ہے، ہم اُردو اختیار نہیں کر سکتے تو ہر طرف سے شور بپا کیا جاتا ہے کہ دیکھئے ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ اندازی کی جا رہی ہے اور اُردو کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ہندو حیران ہیں کہ ہمارے اُردو کو اختیار کرنے ہی سے اردو

کیسے تباہ و برباد ہو جائیگی؟ کیا سودا، میر، انیس، آتش، ناسخ، ذوق، غالب، داغ، حالی، اقبال وغیرہ نے شاعری محض اس لئے کی کہ ہندو اس کو پڑھتے ہیں یا پڑھیں گے (یا انھوں نے ہندوؤں کے نام پر ناک بھوں سکوڑے تھے کہ ان کو اس کے سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ ہی کہاں؟) آیا ان شاعروں کا کلام ہندوؤں کے لئے کوئی خاص پیغامِ زندگی رکھتا ہے، جیسا مسلمانوں کے لئے ہے؟ یا جیسا سور داس۔ تلسی۔ کبیر۔ میرا، رحیم وغیرہ وغیرہ ہندی کے شعرا کے کلام میں ہندوؤں کے لئے موجود ہے۔ پھر یہ شور وغل کس بنیاد پر ہے کہ ہندو اُردو کی طرف رجوع نہیں ہوتے تو اُردو کو تباہ و برباد کرنا مقصود ہے یہ تو خواہ مخواہ گلے پڑکے کوسنے کی بات ہے"۔ میرے دوست خاموش ہو گئے، ممکن ہے مروت سے، لیکن میں نواب صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بنظرِ انصاف اس پہلو پر غور فرمائیں کہ آیا ہندو ہندی کو مسلمانوں پر ٹھونسنا چاہتے ہیں یا مسلمان حضرات مختلف طریقوں سے کوشش کر رہے ہیں کہ ہندو ہندی سے روگرداں ہو جائیں اور اُردو کی طرف رجوع ہوں۔

نواب صاحب ممدوح نے ایک بات اور فرمائی ہے کہ "مشترکہ زبان کے مسئلے کو طے کرکے کسی خاص زبان کے حق میں فیصلہ کیا جا کر اُس کے ہندوستان کے طول و عرض میں اشاعت کی اگر کوشش نہ کی جائے تو یقیناً یہاں کے کاروبار سیاست، تہذیب اور شائستگی میں بجائے ہم آہنگی کے مشکلات اور اختلافات کا اضافہ ہوتا جائیگا، جو بات ملک کے سچے بہی خواہوں کے لئے ناقابلِ برداشت بن جائیگی"۔ نواب صاحب اُردو کو ایسی مشترکہ زبان خیال فرماتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت نواب صاحب ممدوح کے پیش نظر غالباً صرف یو۔پی اور پنجاب تھا، اور مدراس، بمبئی، گجرات، بنگال وغیرہ صوبہ جات نظر انداز ہو گئے تھے۔ یہ غلطی مسلمان بھائیوں سے عام طور پر ہوتی ہے۔ میں نے اپنے مضمون "ہندوستان کے لئے ایک عام زبان کا مسئلہ" میں جو "زمانہ" جون ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا، اس غلطی کی جانب اشارہ کر کے اس مضمون میں بتلایا تھا کہ ایک زمانہ تھا جب صرف یو۔پی کا خطہ ہندوستان کہلاتا تھا اور اسی نسبت سے آج تک یو۔پی کا باشندہ دوسرے صوبوں میں ہندوستانی کہلاتا ہے اور اُس کی زبان ہندوستانی۔ اور چونکہ اسلامی دورِ حکومت میں (دہلی کے بعد لکھنؤ) یو۔پی میں اُردو کا زور تھا لہذا "ہندوستانی" سے مراد "اُردو" لی جانے لگی۔ اب زمانہ اور ہے، اب "ہندوستان" کل ہند کو کہتے ہیں اور ایک عام زبان جو قوم پرست لوگ چاہتے ہیں وہ کل ہند کے لئے چاہتے ہیں۔ صرف

یو.پی. اور پنجاب کے لئے نہیں. لہذا دیکھنا یہ چاہیئے کہ جو زبان کل ہند میں یعنی سارے ہندوستان میں سمجھی جاسکے گی وہ کیسی ہوگی. ظاہر ہے کہ وہ زبان زیادہ آسان ہوگی جس میں مختلف صوبوں کی زبانوں کے الفاظ زیادہ ملتے ہوں۔ میں نے اُس مضمون میں چند اُردو جملوں کا تلگو، کنڑی مرہٹی، گجراتی اور بنگالی میں ترجمہ دے کر یہ واضح کیا تھا کہ جو الفاظ ان سب زبانوں میں عام ہیں وہ سنسکرت الفاظ ہیں لہذا وہ زبان کل ہند میں چالو ہو سکے گی جس میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہو اور سنسکرت الفاظ بھی اپنی شُدھ حالت میں کیونکہ ان صوبائی زبانوں میں سنسکرت الفاظ اپنی شُدھ شکل میں استعمال کئے جاتے ہیں، توڑ مروڑ کر نہیں مثلاً وہاں ویشیا ہی کہیں گے بیسوا نہیں. گرام کہیں گے گاؤں نہیں. اس لئے اب نئی اصطلاح میں ہندوستانی اگر کوئی زبان کہلا سکتی ہے تو وہ زبان ہوگی جس میں سنسکرت کے خالص الفاظ کی کثرت ہو جو یو.پی. اور پنجاب کے مسلمانوں کو چھوڑ کر بقیہ ہندوستان میں ہر جگہ آسانی سے سمجھی جاسکے گی. اسی لئے جب ہندوستانی زبان کی وضاحت کی ضرورت داعی ہوئی تو مہاتما گاندھی جی کو یہ کہنا پڑا کہ ہندوستانی سے مراد ہندی ہندوستانی ہے۔ یہ تعریف فرقہ پرستی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ٹھوس واقعات پر جن پر صرف ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ جھگڑا ہی کیوں ہے، اُردو والے اُردو میں کوشاں رہیں ہندی والے ہندی کی ترقی کریں. اگر کوئی عام زبان پیدا ہوتی ہے تو آپ ہی آپ ہو جائیگی۔ اس جذبات انگیزی اور سر پھٹول سے اُس عام زبان کے راستہ میں روڑے پیدا ہو رہے ہیں۔

تسبیح خیال[1]

یہ چھوٹی سی کتاب نواب شہید یار جنگ حیدرآبادی کی تقریباً دو سو رباعیوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے جس میں حسن و عشق، علم و حکمت، اخلاق و ادب غرض ہر موضوع پر رباعیاں موجود ہیں۔ زبان بھی اچھی ہے۔ مجموعہ کے شروع میں فاضل مصنف نے ناظرین کو اپنی شخصیت اور اپنی شاعری سے روشناس کرایا ہے اور اسکے بعد سید ذاکر حسین صاحب کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے۔ جہانتک رباعیوں کا تعلق ہے ان میں ناظرین کو اخلاقیات کا کافی مسالہ ملے گا۔

[1] ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔

حقایق و معارف

نتیجۂ فکر حضرت سرشار کسمنڈوی

معاف اے دوست اب تابِ شکیبائی کہاں مجھکو
پسِ پردہ نظر آتی ہیں کچھ پرچھائیاں مجھکو

سنبھالیں اب تری نیچی نظر کی شوخیاں مجھکو
اٹھا ہے لیکے اپنے ساتھ دردِ ناگہاں مجھکو

کبھی تو ہوش آئے گا بقدرِ امتحاں مجھکو
پکارے اور پکارے جائے ظالم آسماں مجھکو

اُٹھا لینے دو پروانے کی خاکِ رائیگاں مجھکو
بنانا ہے اسے اپنی نظر کا پاسباں مجھکو

یہاں تک آ گیا ہوں منزلِ مقصود کی دُھن میں
جہاں کچھ مل رہا ہے بے نشانوں کا نشاں مجھکو

سُبکسارانِ ساحل فرصتِ نظارہ کیوں پائیں
اُچھالے جا یوں ہی تا دیر اے موجِ رواں مجھکو

محبت اے محبت وہ مُبارک وقت آ پہونچا
کہیں دیکھے کہیں پائے نگاہِ پاسباں مجھکو

کبھی دل کے دھڑکنے کی بھی آوازیں نہیں آتیں
نگاہِ شوق اپنے ساتھ لے ڈوبی کہاں مجھکو

یہ تھک کر بیٹھنے والوں سے آخر بے رُخی کیسی
بدلنا ہی پڑے گا اب مذاقِ کارواں مجھکو

اُنھیں دیکھا تو پھر خود کو نہ دیکھا بزمِ ہستی میں
نگاہِ شوق کا سودا پڑا کتنا گراں مجھکو

ذرا اے ہم صفیرانِ چمن آنکھیں کھلی رکھنا
ملی تھیں راہ میں کچھ آندھیاں کچھ بجلیاں مجھکو

معاذ اللہ یہ قیدِ تعیّن کی دل آویزی
کہ جیسے مل گئی ہو عشرتِ کون و مکاں مجھکو

ترے جلووں میں گم ہونا نشانِ ارجمندی ہے
کسی مدّت کی ہوں منظور میں بے ہوشیاں مجھکو

میں اپنی زندگی کا مدعا اب تک نہیں سمجھا
سمجھتے ہوں تو سمجھائیں زمین و آسماں مجھکو

ذرا ہنس دو ابھی ڈوبی ہوئی نبضیں ابھرتی ہیں
یہیں پر ختم کرنا ہے بہارِ داستاں مجھکو

مری آنکھوں میں کچھ رنگین آنسو دیکھنے والے
وفا کی راہ میں درپیش ہیں قربانیاں مجھکو

جوانی گدگداتی ہے تو کلیاں مسکراتی ہیں
گراں ہیں فطرتِ معصوم کی رسوائیاں مجھکو

یہی چشمک رہی سرشار اگر صیاد و گلچیں میں
نظر آتا ہے اپنا آشیاں خلد آشیاں مجھکو

ؔ یہ غزل، ہیلاپل کلب لکھنؤ کے لئے لکھی گئی تھی۔

وکیل اور منشی

(از سید علی عباس حسینی، ایم۔ اے)

وکیل صاحب نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے حقہ پیتے ہوئے گلا صاف کر کے کہا:۔

"منشی جی، آج بھی کوئی مؤکل نہیں آیا!"

منشی جی بڑے جہاندیدہ تھے، وہ اکثر سوچا کرتے تھے کہ انھوں نے ان نئے وکیل صاحب کی "منشی گری" آخر کی ہی کیوں؟ رنڈی سے نائکہ، ڈاکٹر سے کمپاؤنڈر اور وکیل سے منشی اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے جب تک کہ اُن کی طرف عام رجوع نہ ہو۔ ان پیشہ وروں میں سے جس کی بھی نہ چلتی ہو اُس کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنا ایک ڈوبتے ہوئے جہاز سے اپنے کو باندھ رکھنا ہے! منشی جی تجربہ کار تھے، وہ اس گُر سے واقف تھے، لیکن وہ بڑے وکیل صاحب کی وصیت سے مجبور ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے مرتے وقت خاص طور سے تاکید کی تھی "متین میاں کو کام تمیں سکھانا، اور پیشے کے گُر بتاتے رہنا" آخر زندگی بھر ان کا نمک کھایا، کچھ تو خیال کرنا ہی چاہیئے تھا۔ سچ ہے:۔

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے!

اور منشی جی کو اس کا یقین تھا کہ وہ بڑے ایماندار ہیں، یہ اور بات ہے کہ مہینہ میں دو چار مرتبہ عدالت میں جا کر جھوٹا حلف اُٹھا لیا، یا غلط گواہی دے دی، تو اس سے ایمان کیوں جانے لگا۔ عدالتوں میں کوئی سچ بھی بولتا ہے؟ اور جھوٹی قسم کے ساتھ قرآن کے علاوہ اور کون سی کتاب اُٹھائی جا سکتی ہے، کیا "کنگ ریڈر" یا "توبۃ النصوح"؟ خدا خوب جانتا ہے کہ یہ دروغ بافی پیٹ پالنے کے لئے ہوتی ہے، ایسا نہ کریں تو بھوکوں مریں! ذریعہ معاش پیدا کرنے کی اسی نے تو تاکید کی ہے، اور اُسی نے تو خودکشی کو ممنوع قرار دیا ہے:

تو پھر آخر منشی جی سے آخر کیا کریں؟ وہ مزدوری کر نہیں سکتے تھے، اس کے لئے مضبوط ہاتھ پاؤں چاہئیں، پھر کرتا پاجامہ پہن کر اور دوپلی ٹوپی لگا کر کوئی بھیک مانگتا ہے؟

باپ دادا ہمیشہ سپید پوش رہے، اس طرح کی محنت کے کام ہمیشہ "چھوٹے طبقے" کے لوگوں کے لئے مخصوص رہے۔ اگر منشی جی بھی ایسے ہی کام کرنے لگتے تو اُن کی خاندانی شرافت خاک میں مل جاتی، اور گویا اپنے ہی ہاتھوں اپنی ناک کاٹ ڈالتے! وہ تجارت کر نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ اس کے لئے سرمایہ چاہیئے، اور خون میں "بنیاگری" کے جراثیم، یہ دونوں چیزیں ان کو ورثہ میں نہیں ملی تھیں۔ وہ نوکری کر نہیں سکتے تھے، اس کے لئے اسکول اور کالج کے سرٹیفکٹ چاہیئے تھے اور ان سے ان کی جیبیں خالی تھیں!

پھر سرٹیفکٹ ملنے پر بھی ملازمت کہاں ملتی ہے۔ سیکڑوں بی۔اے، ایم۔اے دربدر کی خاک چھانتے پھرتے ہیں، ابھی پرسوں ہی تو اسٹیشن پر وہ نوجوان جوجوتوں پر پالش کرنے آیا تھا کیسی زناٹے کی انگریزی بولتا تھا، کہتا تھا انٹرمیڈیٹ پاس ہے۔ زرد زرد چہرہ دھنسی دھنسی آنکھیں، پھٹی قمیص میں سے ہڈیوں کا ڈھانچہ جھلکتا ہوا، کتنا غریب پر ترس آتا تھا، ماں باپ نے کن ارمانوں، کن اُمیدوں سے تعلیم دلوائی ہوگی!

پھر آخر رشید اور مجید کی تعلیم پر جو اتنے پیسے اُٹھ رہے ہیں، اُن کا کیا حشر ہوگا؟ انھیں بھی کوئی نوکری ملے گی یا نہیں؟ پیسوں کا الگ کال ہے۔ جب سے متین میاں کا ساتھ ہوا بس وہی سوکھے پندرہ تنخواہ کے رہ گئے، نہ کوئی مؤکل پھنستا ہے نہ کوئی مقدمہ آتا ہے اور نہ محنتانہ ملتا ہے۔ جو کچھ بڑے وکیل صاحب کے زمانہ میں جمع کیا تھا وہ متین میاں کے ساتھ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ مگر اس طرح کب تک بسر ہوگی، آخر منّو اور دلّا اور کو بھی تو پڑھانا ہے اور چھمّو اور چھدّن کی شادیاں بھی تو کرنا ہیں۔ ماشاء اللہ جوان ہوگئی ہیں۔ کب تک ماں کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی رہیں گی۔" اے اللہ تو ہی خوب جانتا ہے کہ جھوٹا حلف اُٹھانے اور غلط گواہی دینے کو میں بھی بہت بُرا سمجھتا ہوں! مگر کروں تو کیا کروں! سچ بول کر کیا چھ بچوں اور بوڑھی بیوی کو فاقہ کی آگ میں اپنے ہاتھوں سے جھونک دوں؟

وکیل صاحب نے اپنے سوال کا جواب نہ پاکر پھر پکارا "منشی جی!"

"جی میاں"۔

"آپ تو دادا جان کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں"

"جی ہاں، اُن کے آخر عمر میں مجھے ان کی خدمت کا موقع ملا تھا، بلا کے ذہین تھے۔ میاں "ڈھول کی ربیتی" بجتے ہی ڈھول کی! میں کیا عرض کروں کہ کس غضب کا دماغ پایا تھا۔"

"اُنھوں نے منشی جی زمانہ بھی بہت ہی اچھا پایا تھا"

"کیوں نہیں میاں، کیوں نہیں! اُس وقت ہر شہر تحصیل سے دس پانچ وکیل ہوتے تھے اور اب تو برساتی کیڑے ہیں، برساتی کیڑے! اب ان کی تعداد ہر تحصیل میں اتنی ہے جتنی اجودھیا میں بندروں کی!"

"ہاں منشی جی یہ تو ضرور ہے، لیکن ان میں سے جن کے پاس دماغ ہے وہ چمک ہی اُٹھتے ہیں"

"ہاں میاں یہ تو سچ ہے!"

"تو منشی جی دادا جان کا دماغ تو کچھ نہ کچھ ورثہ میں ملا ہی ہے!"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں میاں!"

"تو زمانہ ویسا آپ بنائیے اور موقع نکالئے! آخر میرا دماغ اور آپ کا تجربہ دونوں بیکار تو نہیں جا سکتے!"

"تو میاں شروع شروع میں تو اپنے ہی پاس سے خرچ کرنا پڑیگا۔"

"یہ کیوں!"

"دوسرے منشیوں سے موکل حاصل کرنے میں"

"اچھا یوں ہی سہی"

"گوینڈے بھی چھوڑنے پڑیں گے"

"ان کا کیا کام ہے؟"

"جی میاں وہی کام کرتے ہیں، جو اپنے کبوتر دوسرے کے کبوتروں میں ملکر کرتے ہیں موکلوں کے سامنے آپ کی تعریف کے پل باندھ دیں گے اور ان کو بہکا لائیں گے۔"

"اچھا، وہ بھی سہی!"

"دوا حکام سے افسروں سے بھی میل ملاپ بڑھانا پڑیگی۔"

"آجی آپ جو کچھ کہیں گے وہ سب ہو جائے گا"

"ہاں میاں! یہ سب ایک طرح کا اشتہار ہے!"

"تو پھر اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیجئے!"

"بہت اچھا میاں!"

(۲)

"منشی جی! دو سال ہو گئے، کام تو چل نکلا، لیکن ابھی تک مہینہ کا خرچ پورا نہیں اترتا"
منشی جی نے ناک کے بانسے پر رکھی ہوئی عینک کو بھوؤں کے اوپر پیشانی پر اٹکایا، سوچنے لگے دو برس میں کیا کیا جتن کرنے پڑے، کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے، دوسرے منشیوں کو رشوت کارندوں کو کمیشن، پولیس والوں کی خاطر مدارات، نہ جانے کتنی چالیں چلنا پڑیں اور وکیل صاحب ہیں کہ اب بھی مطمئن نہیں، انسان کا پیٹ اس کی آمدنی کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے، ان کی خود بھی یہی حالت تھی، پہلے سو کے پندرہ میں گزر بسر ہو ہی جاتی تھی، اب جو زرا ہاتھ کھلا، دس پانچ ہر ہفتے دکھائی دینے لگے تو خرچ بھی بڑھ گیا، لیکن ایک بڑا کام ہو گیا، چھمو کی شادی ہو گئی اور کھاتے پیتے لوگوں میں ہو گئی، مگر ابھی چھدن باقی ہے، پھر رشید، منور، ولادر اور مجید کی تعلیم، ہر روز نئی کاپیاں، ہر ہفتے نئی کتابیں، ہر مہینے فیسیں! وکیل صاحب بیچارے بھی تو لڑکوں لڑکیوں کو تعلیم دلوا رہے ہیں، ان کے ہاں بھی کیسے اٹھتا ہو گا، کوئی نہ کوئی صورت تو آمدنی بڑھانے کی نکالنا ہی پڑے گی۔ ارے آجکل کی سیاسی فضا سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے! منشی جی ایک بار مسکرا دیے۔ زندگی کے تاش پر لپٹا ہوا تاگا الجھ چکا ہی تھا کہ پھر سرا مل گیا!۔
وکیل صاحب نے کھالنس کر ان کو پھر مخاطب کیا "منشی جی مرجوعہ بڑھانے کی کوئی نئی تدبیر ہونا چاہیئے!

"جی ہاں میاں ہونا تو چاہیئے"
"پھر آپ نے کچھ سوچا؟"
"جی میری رائے میں تو اب کچھ لیڈری کا بھی ڈھونگ رچانا چاہیئے"
"یعنی اب سیاسیات کی ہڑبونگ میں بھی پڑوں"
"جی ہاں میاں، موقع موقع سے ایک آدھ تقریر، اپنی قوم پر جھوٹے سچے الزامات کا بیان!
"مگر ان میں تو کئی جماعتیں ہیں"
"آپ کو ہر ایک سے کیا مطلب! آپ کو تو اسی جماعت کا ساتھ دینا ہے جس میں سرمایہ دار ہوں"
"یہ کیوں؟"
"جی، میاں کوئی موٹا اسامی پھنسا، اپنی پانچوں گھی میں رہیں! اور پھر کسی خاندانی آن بان

والے رئیس سے دوستی ہو گئی تو ریاست کے سارے مقدمے اپنے ہی ہاں آنے لگیں گے۔"

"یہ تو منشی جی آپ ٹھیک کہتے ہیں"

"جی ہاں میاں اور کیا۔ اگر کہیں حق اور ناحق کی بحث میں پڑ کر کنگلوں کی طرف بہک گئے تو اپنے پاس ہی سے رقم خرچ کرنا پڑے گی، اپنی ہی جیب سے!"

(۳)

منشی جی، خرچ بھر کو تو ضرور نکل آتا ہے، مگر بچتا اب بھی کچھ نہیں"

منشی جی نے جیب سے خانہ ساز بٹوا نکالا۔ خاصا وزنی اور بڑا تھا، چھیدن بٹیا کی سسرال والوں نے کل ہی بھر کر بھیجا تھا، جھوٹا سلمہ ستارہ بھی پوری چمک پر تھا۔ بہت ہی آہستہ سے منشی جی نے سمدھیانے کا یہ تحفہ کھولا، باریک ترشی ہوئی ڈلی نکالی، اسے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھا، پھر کٹا ہوا کتھا اس میں رکھا، ایک لونگ ڈالی اور ایک چٹکی بھر تمباکو ملالی، پھر ڈلی ایک انگلی سے اُلٹتے پلٹتے رہے، دیکھ رہے تھے کہ ڈلی کا کوئی سڑا ہوا یا پھول والا حصّہ تو نہیں آگیا ہے، جب اچھی طرح اطمینان کر لیا تو سب کچھ ایک بار پھانک لیا۔ پھر چنوٹی سے تھوڑا سا چونا کلے کی انگلی سے نکال کر ڈلی چباتے ہوئے وکیل صاحب کی طرف دیکھا۔ دو تین بار آنکھیں جھپکائیں اور چونے کا ایک حصّہ چاٹ لیا۔

وکیل صاحب جانتے تھے کہ یہ سب منشی جی کے سوچنے کے انداز ہیں۔ وہ کنکریوں اور سنگریزوں کے ڈھیر سے ہیرے کا ٹکڑا نکال کر پیش کرنے والے ہی ہیں، اس لئے انھوں نے پھر اپنی بات دہرائی۔

"بچتا اب بھی کچھ نہیں"

"ہاں میاں، وہ تو میں خود ہی برابر حساب لکھتا ہوں"

"ان بڑے آدمیوں سے ملنے ملانے میں ٹیم ٹام سے رہنا بھی تو پڑتا ہے"

"جی ہاں میاں، ناچتے وقت بھڑکتی، چمکتی پیشواز تو پہننا ہی پڑتی ہے"

"پھر یوں ہی تو بسر نہیں ہو سکتی۔ آئندہ کیا ہوگا؟ لڑکیاں لڑکے بھی تو سیانے ہو رہے ہیں"

"ہاں میاں"

"پھر!"

"جی میاں اب کے [illegible]"

"رائے تو اچھی ہے، مگر کس وارڈ سے؟"

"جہاں سے سب سے زیادہ دولتمند آدمی کھڑا ہو"

"تو منشی جی اس کے روپیوں کی جھنکار میں میری آواز کون سنے گا؟"

"جی، تو موقع دیکھیں گے تو ہزار دو ہزار لے کر خود ہی بیٹھ جائیں گے"

"اور اگر وہ ہماری پارٹی کے اثر سے خود ہی بیٹھ گیا"

"تو میاں میری ہے، آخر بڑی میونسپلٹی ہے، اس کے اختیار میں ہزاروں نوکریاں ہیں، سیکڑوں ٹھیکے ہیں......"

"اور آپ ان کے لئے سفارش کرینگے ہی!"

"جی میاں! — اور آپ کو اپنے بوڑھے منشی کی خاطر کرنا ہی پڑے گی!"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں! ضرور! ضرور!"

(۴)

"منشی جی، میں نے آپ کی خاطر سے میونسپلٹی کا الکشن تو چھوڑ دیا، مگر کام کچھ بہت آگے نہیں بڑھا"

"جی ہاں، میاں لیکن ڈیڑھ ہزار کا تو فائدہ رہا"

"مگر پارٹی والوں نے تو حصہ لگا کر اُسے ایک ہی ہزار کر دیا"

"جی ہاں میاں، لیکن شیر اپنے شکار میں سے گیدڑوں کو بھی تو کچھ حصہ دے ہی دیتا ہے"

"جی ہاں، مگر اس وقت دیتا ہے جب خود شکم سیر ہو لیتا ہے"

"ہاں میاں، مگر اس کا بھی وقت آرہا ہے!"

"یعنی؟"

"جی اب کے صوبے کی اسمبلی کی امیدواری کے لئے کھڑا ہونا چاہیئے"

"مگر اس میں آپ نے کیا فائدہ سوچا ہے؟"

"جی، وزراء سے، بڑے بڑے حکام سے ملاقات ہوگی"

"تو اس سے کیا فائدہ؟"

"جی، چھٹن میاں کی تعلیم پر جو اتنا روپیہ صرف کیا جارہا ہے، تو ان کی ترقی کی بھی تو کوئی صورت ہونا چاہیئے"

"میں آپ کا مطلب نہ سمجھا"

"میرا مطلب یہ ہے میاں کہ کسی سفارش سے بڑا کام نکلتا ہے، ورنہ اچھے اچھے بی۔اے ایم۔اے ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں"

"لیکن منشی جی اتنے بڑے الکشن کے لئے تو بہت سا روپیہ چاہیئے!"

جی ہاں میاں، چاہیئے تو، مگر میونسپلٹی والے ہزار موجود ہی ہیں، بقیہ کی فکر اللہ کر دے گا!"

آخر بتایئے تو کہ آپ نے کیا سوچا ہے"

"جی میاں، ایسے مہاجن بھی تو ہیں جنھیں یہ فکر لگی ہے کہ سُود در سُود کے خلاف کوئی قانون نہ پاس ہونے پائے!"

اچھا تو اِن لوگوں سے بھی آپ سے ملاقات ہے!"

جی، وہ خود ہی ڈھونڈھ لیں گے۔ غرض والا باؤلا ہوتا ہے!"

"تو پھر اللہ کا نام لیکر کام شروع کر دیجئے"

اِسی وقت سے لیجئے میاں، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

"دیال بانی"

رادھا سوامی مت کے مشہور مہرشی مہاشے شیوبرت لال صاحب مرحوم کی صدہا کتابیں شایع ہوکر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ آپ کو تمام عمر ہندو تاریخ ہندو اتہاس اور ہندو فلسفہ سے ایک خاص دلچسپی رہی۔ چنانچہ آپ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دھارمک اپدیش کی نذر کر دیا تھا۔ اب آپ کی یادگار میں دیال نامی ایک مفید و دلچسپ اُردو رسالہ دیال نواس مٹھی گنج الہ آباد سے شائع ہو رہا ہے۔ حال میں اس کارخانے نے "دیال بانی" کے نام سے ایک چھوٹی سی ہندی کتاب شائع کی ہے جس میں مہرشی مرحوم کے وہ تمام خطوط۔ یکجا کر دیئے گئے ہیں جو آپ نے شریمتی بھگوتی دیوی کے نام اُن کے شوہر کی وفات کے بعد پند و نصیحت کے طور پر لکھے تھے۔ شائقین اس مجموعہ کو سکریٹری صاحب دیال نواس الہ آباد سے مفت بلا قیمت حاصل کر سکتے ہیں۔

برسات

(از حضرت لطیف انور)

موسمِ برشگال آیا ہے — لطف افزائے حال آیا ہے
آسماں پر محیط ہیں بادل — بادہ نوشوں میں پڑگئی ہلچل
بابِ میخانہ کھول دے ساقی — جسم و جاں میں ہوئی ہے ناچاقی
آرزو رابطِ زندگانی ہے — زندگانی اگرچہ فانی ہے
جسم تعمیرِ خاک ہے گویا — روح ہر شے سے پاک ہے گویا
ہاتھ بڑھتے ہیں جانبِ مینا — واقفِ غم ہے دیدۂ بینا
بختِ ہندوستاں ہے خوابیدہ — یا ہے درپیش راہِ نادیدہ
شوقِ منزل کو رہنما کر دے — جامِ صہبائے ناب سے بھر دے
جذبۂ دل اگر نہ ہو ہادی — جلوہ کیا دے عروسِ آزادی
ہو نہیں سکتا سازگارِ دل — یادِ ماضی خیالِ مستقبل
عہدِ حاضر سکوں پذیر نہیں — وہم میں ہیں اگر اسیر نہیں
سو غموں کا ہے ایک غم خالی — نو شگفتہ گلوں کی پامالی
کیا دلِ بے نوا ملول نہیں — آسماں کا گلہ فضول نہیں
وہ گھٹا چھائی وہ اُٹھا بادل — زلفِ فطرت نے کھائے بل پر بل
دے وہ جام شراب دے ساقی — نام کو غم نہ رہ سکے باقی
آج عالم ہے کیوں اُداسی کا — راز کھل جائے خود شناسی کا
فکرِ مصروفِ ہست و بود ہے کیوں — کشمکشِ حاصلِ وجود ہے کیوں
سانس کیوں حلق میں اٹکتا ہے — دل میں کانٹا سا کیوں کھٹکتا ہے

لطف کیا دے گی بادہ آشامی
اک غلامی ہزار ناکامی

رفتارِ زمانہ

جنگ روس و جرمنی پچھلے پرچہ میں جنگ کے سلسلہ میں جرمنی کے متعلق لکھا گیا تھا کہ "دیکھئے روس کی طرف توجہ ہوتی ہے یا برطانیہ پر حملہ کا خیال پورا کیا جاتا ہے" یہ سطریں خشک بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ ۲۱-جون کی صبح کو جرمنی نے روس پر یکایک اس قدر وسیع پیمانہ پر حملہ کر دیا کہ بحر قطب شمالی سے لیکر بحیرۂ اسود تک ڈیڑھ دو ہزار میل کے علاقہ میں لڑائی چھڑ گئی۔ دو سال بھی نہیں ہوئے کہ ہٹلر نے روس سے دوستی کا اعلان کیا تھا۔ اب یکایک اس نے یہ الزامات لگائے ہیں، اول یہ کہ روس نے بالٹک کی ریاستوں لتھونیا، لیٹویا، اسٹونیا پر قبضہ کر کے ان کی آزادی و خود مختاری خاک میں ملا دی، جس کی وجہ سے ہزاروں جرمنوں کو ان ملکوں سے ہجرت کرنا پڑی دوسرے روس نے بلغاریہ کی حمایت کر کے بلقان میں جرمن پیش قدمی روکنے کی کوشش کی۔ تیسرے ایک طرف تو اس نے دردانیال و باسفورس میں اڈے حاصل کرنے کی لئے اٹلی و جرمنی کی مدد چاہی اور دوسری طرف انگریزوں سے ساز باز کر کے یوگوسلافیہ کو ہوائی جہاز اور سامان جنگ بھیجنے کی کوشش کی۔ بلغراد کے قنصل خانہ سے جو دستاویز ملی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ روس جرمنی پر حملہ کرنے والا ہی تھا۔ اور روس نے جرمنی کی سرحد پر خواہ مخواہ ایک عظیم فوجی جمعیت لاکر ڈال دی۔

حملہ کرنے سے پہلے ہٹلر نے اسٹالین سے رومانیہ اور فنلینڈ کی سرحدوں سے روسی فوجیں ہٹانے یوکرین کو جرمنی کے قبضہ میں دینے، جرمنی کو روس کے راستہ سے سامان جنگ منگوانے، قفقاز کے علاقہ سے مٹی کا تیل لینے کی اختیارات کا مطالبہ کیا۔ ظاہر ہے کہ روس ان باتوں کو کیسے مان سکتا تھا

بات یہ ہے کہ جرمنی ابتک برطانیہ کو مغلوب نہیں کر سکا۔ امریکی امداد سے جنگ کی طوالت کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے جس کے لئے جرمنی کو غلہ اور پٹرول کی اشد ضرورت ہے اور ان کے حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ یوکرین اور روسی قفقاز ہیں۔ اسی وجہ سے روس پر حملہ ضروری ہو گیا۔

اس جنگ میں رومانیہ، فنلینڈ، ہنگری اور اسپین، جرمنی کا ساتھ دے رہے ہیں مگر برطانیہ نے روس کے ساتھ ایک فوری معاہدہ کر لیا ہے۔ جس کی رو سے برطانیہ ہر طرح سے روس کو مدد دیگا۔ اور یہ بھی طے ہوا ہے کہ روس برطانیہ سے مشورہ کئے بغیر صلح نہ کریگا۔ امریکہ کی ہمدردی بھی زیادہ تر روس ہی کے ساتھ ہے۔

جرمنی نے روس پر سب طرف سے حملے کئے ہیں جن میں تین طرف کے حملے زیادہ شدید ہیں۔ فنلینڈ

کی طرف سے جرمنوں نے روسی بندرگاہ مرمانسک پر قبضہ کرکے جنوب کی سمت لینن گراڈ تک پہونچنے کا ارادہ کیا ہے اور لینن گراڈ کو ہوائی جہازوں سے نقصان بھی پہونچایا ہے۔ دوسرا حملہ پولینڈ کی طرف سے کیا گیا جہاں سب سے زیادہ گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ اس محاذ پر روسی فوجیں پولینڈ سے ہٹکر اصلی روسی علاقہ میں چلی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ خونریز لڑائی اس محاذ پر بیالسٹاک اور منسک کے میدانوں میں ہوئی، جہاں جرمنوں کو سخت نقصان پہونچا۔ اندازہ ہے کہ اس محاذ پر تقریباً دس لاکھ جرمن سپاہی کام آئے۔ مگر جرمن اپنی زبردست فتح کا دعویٰ کر رہے ہیں اور روس کے چار لاکھ قیدی گرفتار کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ ہزاروں ٹینک اور ہوائی جہازوں کی تباہی اور منسک سے آگے تک کے علاقہ کی فتح کا دعویٰ علیحدہ ہے۔ اس مغربی محاذ پر اس وقت فریقین کی نوے لاکھ فوج شدید جنگ میں مصروف ہے۔ اور فریقین کی طرف سے اپنی کامیابیوں کے دعوے کئے جاتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ابھی فیصلہ کن جنگ نہیں ہوئی۔ اس وقت جرمنی کی فوجیں یوکرین کے صدر مقام کیف کے دروازے پر اور دوسری طرف نووا گروڈ سے آگے بڑھکر ماسکو کے راستہ پر بتائی جاتی ہے۔

روس پر تیسرا شدید حملہ رومانیہ کی طرف سے کیا گیا ہے۔ اس طرف بقول جرمن نیوز ایجنسی رومانیہ اور جرمنی کی فوجیں ملکر بیسارابیہ کے دارالحکومت پر قابض ہو گئی ہیں، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اسی محاذ پر روس نے دشمنوں کو سب سے زیادہ نقصان پہونچایا ہے۔ روسی ہوائی جہازوں نے رومانیہ کی بندرگاہ کانسٹینزہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور شہر پلوسٹی کو جہاں رومانیہ کے تیل کے کارخانے ہیں جلاکر خاک کر دیا۔ دوسری طرف چھوٹے چھوٹے روسی جنگی جہاز دریائے ڈینیوب میں اس قدر دور تک گھس گئے ہیں کہ رومانیہ کے پایۂ تخت بخارسٹ کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور رومانیہ کی گورنمنٹ وہاں سے بھاگ کر کسی دوسری جگہ چلی گئی ہے۔ بحیرۂ اسود کا دروازہ بھی روسیوں نے بند کر دیا ہے جس سے قفقاز کا راستہ نہیں مل سکتا۔ اس طرح جرمنی رومانیہ کے تیل سے محروم ہو گیا ہے جس کی اس وقت اس کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

اس وقت فریقین اس قدر متضاد اور مبالغہ آمیز بیانات شائع کر رہے ہیں کہ انھیں پڑھکر صحیح نتیجہ تک پہونچنا دشوار ہے لیکن غیر جانبدار ذرائع سے معلوم ہو رہا ہے کہ اگرچہ جرمنوں نے روس پر نہایت شدید حملے کئے ہیں اور انھیں کچھ کامیابیاں بھی حاصل ہوئی ہیں لیکن روسی فوجیں ہر طرف سے ہٹ ہٹا کر اور سمٹ سمٹا کر جرمنی کے مقابلے کے لئے مردانہ وار ڈٹ گئی ہیں۔ روسیوں کے فوجی نظام یا دم خم میں کسی جگہ کوئی فرق نہیں آیا ہے اور جس شدت کے ساتھ روسی فوجیں اس وقت دشمن کا مقابلہ کر رہی ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اپنی قوت مدافعت پر بھروسہ ہے۔ روس کا فوجی یا سیاسی محاذ کہیں سے بھی شکست نہیں ہٹا ہے اور وہ دشمن کو پیچھے ڈھکیلنے میں مصروف ہیں۔ جرمنوں کا طریقہ جنگ یہ ہے کہ کسی جگہ پہلے

وہ اپنے ٹینکوں اور موٹر سوار دستوں سے توڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور پیدل فوج آکر تسلط جما لیتی ہے۔ اس وقت تک جرمنوں نے سمولنسک اور نوا گروڈو پر قابض ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہاں بھی وہی کھیل کھیلا گیا ہوگا لیکن روسی دستے آگے بڑھی ہوئی جرمن فوج کو گھیر کر مات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ روسی فوج جس علاقہ کو خالی کرتی ہے اُسے پوری طرح تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے تاکہ دشمن کو کسی قسم کا فائدہ نہ پہونچ سکے۔ جرمنی کی فوجی طاقت گھٹتی جاتی ہے اور رسد کی دشواریاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ غرض روس کی جنگ کا جرمنی پر خراب اثر پڑ رہا ہے۔ اور ممکن ہے وہ جلد ہی تھک جائے۔ مغربی سمت سے برطانیہ کے ہوائی جہاز روزمرہ جرمن شہروں پر حملے کر کے تباہی و بربادی پھیلا رہے ہیں۔ اس کا اثر بھی جرمنی کے لئے پریشانی کا باعث ہوگا۔

شام دوسری طرف ملک شام پر برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ اور فرانسیسی جنرل ڈینٹز نے لڑائی سے پریشان ہو کر اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ چنانچہ ۱۱ جولائی سے لڑائی بند ہو گئی ہے التوائے جنگ کی شرائط کے مطابق شام اور لبنان پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگا۔ فرانسیسی سپاہیوں سے اسلحے لئے جائیں گے البتہ جو فرانسیسی سپاہی وشی گورنمنٹ کے ساتھ رہنا چاہیں گے انھیں فرانس جانے کی اجازت ہوگی، اور جو فرانسیسی اتحادیوں کا ساتھ دینا چاہیں گے انھیں متحدہ فوج میں شامل کر لیا جائیگا۔ جو سول افسران اپنے عہدوں پر رہنا چاہیں گے انھیں بحال رکھا جائیگا۔ اس طرح پولس کا انتظام بھی بدستور اتحادیوں کے سپرد رہیگا۔ اسی قسم کی کل بائیس شرطیں طے ہوئی ہیں۔

افریقہ برطانیہ کی دوسری بڑی کامیابی یہ ہوئی ہے کہ مشرقی افریقہ سے اطالوی سلطنت کا جنازہ اُٹھ گیا ہے حبش کے کوہستانوں میں کہیں کہیں اطالوی سپاہیوں کے قلعہ نشین دستے البتہ باقی رہ گئے ہیں مگر یہ بھی عنقریب یا تو خود ہتھیار ڈال دینگے یا قید کر لئے جائیں گے۔ لیبیا میں بھی طبروق پر برطانوی قبضہ قائم ہے اور وہاں کی برطانوی فوج بڑی جوانمردانگی دے رہی ہے اور وقتاً فوقتاً اپنے مورچوں سے نکل کر دشمن کی صفوں پر چھاپے مار کر اور نقصان پہونچا کر اپنی جگہ واپس آجاتی ہے۔ بہرحال اس محاذ پر ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ شمالی افریقہ میں برطانوی ہوائی جہازوں کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اور بنغازی، طرابلس، اور درنہ پر حملوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اب چونکہ حبش اور مشرقی افریقہ کی مہموں سے فارغ ہو کر بہت سی برطانوی سپاہ دوسرے محاذوں کے لئے خالی ہو جائیگی اسلئے جنرل ویول جنھوں نے مشرق وسطیٰ میں پچھلے دنوں زبردست کارنامے انجام دیئے تھے اب ہندوستان میں کمانڈر انچیف کی حیثیت سے بھیج دیئے گئے ہیں اور آپ کی جگہ ہندوستان کے سابق کمانڈر انچیف سر آچن لک مشرق وسطیٰ کے کمانڈر انچیف بنا دیئے گئے ہیں۔

برطانیہ بہرحال برطانیہ کے دم خم بدستور قائم ہیں اور برطانوی قوم کا بچہ بچہ ہٹلر کی فرعونیت کو ختم کرنے پر تُلا ہوا ہے برطانوی ہوائی جہاز مغربی جرمنی، اور جرمنی کے مقبوضہ مغربی علاقوں میں پہونچکر تقریباً روز بمباری کر رہے ہیں۔ مسٹر چرچل اعلان کر چکے ہیں کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ سخت حملے ہونگے۔ کیونکہ برطانیہ کی ہوائی طاقت روز بروز بڑھ رہی ہے۔

برطانوی گورنمنٹ میں بعض تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔ پرانی وزارت بدستور باقی ہے اور جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اُن کا ہندوستان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بہرحال مسٹر ڈف کوپر وزارت اطلاعات سے ہٹا دیئے گئے ہیں اور ان کی جگہ مسٹر بریکن وزیر اطلاعات مقرر کئے گئے ہیں۔ سابق وزیر اعظم مسٹر بونر لا کے صاحبزادہ مسٹر آر کے لا نائب وزیر خارجہ مقرر ہوئے ہیں۔ مگر مسٹر ایمرے بدستور وزیر ہند ہیں۔

امریکہ امریکہ برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کی امداد و اعانت پر مستعد ہے بلکہ روز بروز جنگ کے قریب ہوتا جاتا ہے اس طرف اس کا تازہ ترین کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے جزیرہ آئس لینڈ پر قبضہ کر لیا ہے جو ڈنمارک کا تھا اور جس پر حال میں برطانیہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ امریکہ کی یہ کارروائی یورپین جنگ میں شرکت کا ایک نیا پہلو سمجھا جاتا ہے۔

جاپان روس و جرمنی کی جنگ شروع ہونے کے بعد جاپان نے بھی کروٹیں بدلنا شروع کی ہیں۔ جاپانی وزارت ٹوٹ گئی ہے اور گو اب بھی وزیر اعظم پرنس کونوے ہی ہیں لیکن نئی وزارت میں بری و بحری فوج کا عنصر زیادہ ہو گیا ہے ایک طرف جاپان کا رخ جنوب یعنی انڈوچائنا اور مشرقی جزیروں کی طرف ظاہر ہوتا ہے اور دوسری طرف شمال میں جاپانی فوج کی روسی سرحد کی طرف نقل و حرکت شروع ہو گئی ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ ماسکو سے جاپانی سفیر واپس بلا لیا گیا ہے اور دوسری طرف یورپین سمندروں سے تمام جاپانی جہاز واپس بلا لئے گئے ہیں اور جنوبی افریقہ کے جاپانیوں کو بھی واپس چلے آنے کا حکم دیدیا گیا ہے۔ ان حالات میں جاپان کی آئندہ پالیسی پر کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے مگر تھوڑے ہی دنوں میں یہ گتھی خود بخود کھل جائیگی۔

ہندوستان ہندوستان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ جنرل واویل مشرق وسطیٰ سے ہندوستان میں بحیثیت کمانڈر ان چیف آ گئے ہیں اور اُنھوں نے بھی سابق کمانڈر ان چیف صاحب کی پالیسی جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے، چنانچہ ایک ڈیفنس کونسل بھی قائم ہو گئی ہے اور اب ہندوستانیوں کو فوجی معاملات میں بھی پہلے سے کہیں زیادہ زور اور اثر کے ساتھ مشورہ دینے کا موقع رہیگا۔ اس کے ساتھ ساتھ وائسرائے کی اگزیکٹیو کونسل میں بھی توسیع کر دی گئی ہے یعنی اب تین سرکاری ممبروں کے مقابلے میں سات ممبر غیر سرکاری ہوں گے نئی کونسل کے لئے جو ممبران مقرر کئے گئے ہیں اُن کی فہرست یہ ہے:۔

(۱) سر ہومی مودی ممبر سپلائی۔ (۲) رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری ممبر اطلاعات، (۳) مسٹر ای راگھویندر راؤ ممبر سول ڈیفنس (۴) ملک سر فیروز خاں نون ممبر لیبر (۵) مسٹر اینے ممبر تارکین وطن (۶) سر سلطان احمد

ممبر قانون (۸) مسٹر نلنی رنجن سرکار ممبر تعلیم، صحت و زراعت۔ ان جدید ممبروں کو اسّی ہزار روپیہ کے بجائے چھیاسٹھ ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ ملا کرے گی۔

ڈیفنس کونسل جو بنائی گئی ہے اسمیں برٹش انڈیا اور دیسی ریاستوں کے تیس ممبر ہونگے۔ ریاستی ممبروں کے ناموں کا ابھی اعلان نہیں ہوا ہے، برٹش انڈیا کے حسب ذیل ممبر لئے گئے ہیں۔ (۱) ڈاکٹر امبیدکر (۲) آنریبل مولوی سید سر محمد سعد اللہ (۳) آنریبل مسٹر اے۔ کے فضل الحق۔ (۴) نواب سر محمد احمد سعید خاں آف چھتاری (۵) کمار راجہ سر سٹھیا پیٹیار آف چیٹی ناڈ (۶) آنریبل مہاراجہ ادھراج دربھنگہ (۷) مسٹر رام راؤ مادھو راؤ دیشمکھ (۸) لفٹننٹ کرنل سر ہنری گڈنی (۹) سر کاؤس جی جہانگیر (۱۰) راجہ بہادر کالی کوٹ (۱۱) آنریبل ملک خدا بخش خاں (۱۲) مسٹر جمنا داس مہتہ (۱۳) مسٹر جی۔ بی۔ مارٹن (۱۴) مسٹر بیرن مکرجی (۱۵) لفٹننٹ سردار نونہال سنگھ۔ (۱۶) بیگم شاہنواز (۱۷) آنریبل خان بہادر میجر سردار سر سکندر حیات خاں (۱۸) رائے بہادر ایم سی۔ راجہ۔ (۱۹) مسٹر دی۔ احمد شاہ (۲۰) آنریبل خان بہادر اللہ بخش محمد عمر سومرو (۲۱) سر جوالا پرشاد سریواستو (۲۲) خان بہادر سر محمد عثمان

آخر جولائی میں پونا میں غیر جانبدار مدبران ملک کی پھر کانفرنس ہو رہی ہے۔ انگلستان میں ہمدردان ہند سمجھوتہ کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں ممکن ہے کہ عنقریب ہی کوئی امید افزا صورت پیدا ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی رہائی کی بھی افواہ ہے لیکن جب تک برطانیہ اپنے زاویۂ نگاہ میں اصولی تبدیلی کا اعلان کرنے پر تیار نہ ہو ہندوستانی قوم پرستوں کے رویہ میں فرق ہونے کی ہمکو کوئی امید نہیں ہوتی۔ مہاتما گاندھی برطانیہ کو پریشان کرنا نہیں چاہتے تاہم بحالات موجودہ وہ تحریک ستیاگرہ کو اُنماہ چار پانچ سال تک جاری رکھنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں سمجھوتہ کی کیا اُمید کیجا سکتی ہے۔ بعض ستیہ گرہیوں کی رہائی کا کوئی دیرپا اثر نہیں ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کا مسئلہ اب آئرلینڈ کے مثل پیچیدہ ہو گیا ہے جب تک برطانیہ اولوالعزمی اور اخلاقی جرأت سے کام نہ لیگی اسے ہندوستان کی طرف سے مستقل اطمینان نصیب ہوگا اور ہندوستان کے مطمئن ہونے کے بعد دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو برطانیہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکے۔

اردو کے نئے رسالے

معاصر یہ رسالہ اس سال سے مسٹر عظیم الدین احمد صاحب کی ایڈیٹری میں پٹنہ سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ افسانوں نظموں اور غزلوں کے علاوہ کئی مسلسل مضامین بھی نکل رہے ہیں جو قابل قدر ہیں ہمکو پوری امید ہے کہ یہ پرچہ ترقی کریگا اور شائقین اسکی قدر کرینگے۔

چھپا اردو مسٹر ظہیر الحسن قاضی اس رسالہ کے ایڈیٹر ہیں پرچہ مجموعی حیثیت سے اچھا ہے لیکن اسکے ٹائیٹل سے ہمکو ایک طرح کی الجھن سی محسوس ہوتی ہے ہم نہیں چاہتے کہ کسی ادبی رسالہ کا ٹائیٹل اس طرح کا ہو۔ سالانہ چندہ صرف ... روپیہ ... ہے جو کافی سستا معلوم ہوتا ہے۔ پتہ دفتر چھپا اردو نمبر ۲۴ ہارسٹن اسٹریٹ کلکتہ سے طلب کیجئے۔

علمی خبریں اور نوٹ

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی صدارت میں اردو انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کا بندوبست کیا ہے معلوم ہوا ہے کہ اس کے ابتدائی مرحلے طے ہو چکے ہیں اور ترتیب کا کام بھی کئی پروفیسروں کے زیر اہتمام شروع ہو گیا ہے۔

حکومت سندھ نے تعلیم بالغان کے لئے وسیع پیمانہ پر ایک اسکیم تیار کی ہے۔ جسکے ماتحت تین سو نائٹ اسکول کھولے جائیں گے اور سولہ سے بیس سال کے نوجوانوں کو جو کبھی اسکول نہیں گئے ہیں تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے گا۔ اس اسکیم پر پچیس ہزار روپیہ سالانہ خرچ تجویز کیا گیا ہے۔ اور اس کے ماتحت بارہ ہزار نوجوانوں کو ہر سال تعلیم دیجائے گی۔

ہم نے دلی افسوس سے سنا کہ پچھلے دنوں عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر معتقد ولی الرحمن صاحب ایم۔ اے کا عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کو فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی اور انھوں نے پچھلے سال کئی فلسفیانہ مضامین زمانہ میں اشاعت کے لئے عنایت فرمائے تھے۔ افسوس کہ یہ مضمون انکی حیات میں رسالہ میں شایع نہ ہو سکے اب ہم انھیں جلد ہدیۂ ناظرین کریں گے۔ پروفیسر صاحب کی وفات سے اردو ادب کو نقصان عظیم پہونچا ہے۔ خداوند تعالےٰ انھیں بہشت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ہندوستان خاص میں اسوقت فن خوشنویسی کے زوال کا زمانہ ہے ہمارے نوجوان اور اسکولوں کے طالب علم اس فن سے عموماً بے پروا ہو رہے ہیں کسی زمانہ میں لکھنؤ وغیرہ کے خوشنویس تمام ملک بھر میں مشہور رہے مگر وہاں بھی اب بحیثیت فن اسکا انحطاط ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ریاست حیدرآباد دکن میں اب بھی خوشنویسی کی قدر کیجاتی ہے چنانچہ حال میں اس نیم مردہ فن میں جان ڈالنے کی غرض سے ایک انجمن "مجلس احیاء خوشنویس" کے نام سے نواب اکبر یار جنگ بہادر کی صدارت میں قائم ہوئی ہے انجمن مذکور نے خوشنویسی کے ایک کل ہند انعامی مقابلہ کا اعلان کیا ہے جسمیں ملک کے بہترین خوشنویسوں کو چھ سو روپیہ مالیت کے آٹھ انعامات دیئے جائیں گے۔

کچھ عرصہ ہوا ہمعصر مشیر دکن حیدرآباد دکن نے زمانہ کے ایک مضمون کا ریویو کرتے ہوئے اس ناچیز رسالہ کے متعلق لکھا تھا کہ "یہ ۱۴ سال سے جاری ہے اور ابتدا سے اب تک ہندو مسلمانوں کا مشترکہ ادبی و ثقافتی پرچم سمجھا جارہا ہے۔ اسمیں ملک کے بہترین اہل قلم کے مضامین شایع ہوتے ہیں جو رسالہ کی پالیسی شروع

سے ابتک ہندوستانی قومیت کے تعمیری پہلو پر مبنی رہی ہے ۔

پچھلے دسمبر میں کل ہند اردو کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ کانپور میں بھی بیگم اعزاز رسول صاحبہ ڈپٹی پریسیڈنٹ قانونی کونسل صوبہ متحدہ و صدر مجلس استقبالیہ آنریبل سر شیخ عبد القادر صاحب پریسیڈنٹ کانفرنس سے اپنے اپنے پرمغز ایڈرسوں میں اس رسالہ کی ادبی خدمات کا بہت حوصلہ افزا الفاظ میں ذکر کیا تھا ۔ انجمن ترقی اردو کے اخبار ہماری زبان نے جب کبھی کانپور کا نام لیا تو زمانہ کا ذکر خیر کرکے اس کے مستقل معیار کا خصوصیت سے اعتراف کیا ۔ ناظرین زمانہ بھی وقتاً فوقتاً اپنی قدردانی کا اظہار کرتے رہتے ہیں اسوقت ان خیالات کے مفصل بیان کا موقعہ نہیں ہے مگر یہاں پر ایک نئے مضمون نگار مسٹر مشیر علی صدیقی ۔ ایم ۔ اے کی رائے کا اقتباس بیجا نہ ہوگا ۔ آپ نے پچھلے دنوں ایک خط میں لکھا ہے کہ مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ زمانہ اپنی پرانی روش پر قائم ہے اور ہنگامی چیزوں سے پرہیز کرتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ آجکل رسالہ کو ایک مستقل معیار پر نکالنا بڑا مشکل کام ہے آپ کو اس کے لئے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے ۔ میں زمانہ کو اردو کا ایک معیاری پرچہ تصور کرتا ہوں گذشتہ سال جب اردو میں ایم ۔ اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا میں نے زمانہ کے حالی نمبر اور پریم چند نمبر سے کافی فائدہ اٹھایا ۔

یہ قدردانی اپنی جگہ پر حوصلہ افزا ہے لیکن اسوقت ملک کے حالات کچھ ایسے دلشکن ہو گئے ہیں کہ اسوقت تک زمانہ کے استحکام کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوسکا اور ابھی تک اسکی آئندہ زندگی سے بیفکری نصیب نہیں ہوئی ۔ ایک عرصہ سے کئی تجویزیں زیر نظر ہیں ۔ لیکن ان سب کی تکمیل کے لئے قدردانان زمانہ اور ترقی خواہان ادب کی عملی امداد و سرپرستی کی ضرورت ہے ۔ احباب کو تکلیف دینے میں قدرتاً تب کو پس و پیش ہوتا ہے اسلئے زمانہ کے استحکام کی تجویزیں بھی التوا میں پڑی ہوئی ہیں ۔ لیکن وقت گذرتا جاتا ہے اور ۴۰ سال تک مسلسل کام کرنے کے بعد اسبات کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ اس کا جلد سے جلد انتظام ہو جانا چاہیئے ۔ سرکاری ملازم پچیس یا تیس سال کی خدمت کے بعد پنشن کے حقدار ہو جاتے ہیں ہمارا کوئی ذاتی مطالبہ نہیں ہے مگر کیا اردو ادب کے ایک ادنیٰ خدمتگزار کا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ یہ اہم رسالہ کسی فرد واحد کی کوشش و محنت سے بے نیاز ہو کر اپنی ہستی قائم رکھ سکے ؟ ۔ ہمارے خیال میں اسکی صرف ایک صورت باقی ہے یعنی اسکی اشاعت کا انتظام ایک باضابطہ رجسٹر شدہ کمپنی کے سپرد کیا جائے اسقدر دانان ...... امداد کے اصول پر اسکے لئے ضروری سرمایہ اکٹھا کر دیں ۔ یہی کمپنی زمانہ اور اسکی تمام خصوصیات کے قائم رکھنے کی ذمہ دار ہو اور پرانی جلدوں کے خاص خاص مضامین کو کتابی شکل

میں شایع کرکے ۔ رسالہ اور اس کے مطبوعات سے اگر کچھ نفع ہو تو وہ حصہ داروں میں تقسیم ہونیکے بجائے اردو ادب کے توسیع و ترقی میں صرف کیا جائے عموماً ادبی کوششیں مالی حیثیت سے نفع بخش ثابت نہیں ہوتی ہیں ۔ اسلئے ہم سرمایہ اکٹھا کرنے والوں کو مالی نفع پہونچانے کے خیالات یکلخت نظر انداز کردینے چاہئیں تاکہ قدردان احباب اس کمپنی کے حصے ذاتی نفع کے خیال سے نہیں بلکہ محض اردو ادب کی امداد اور ملک کی ادبی خدمت میں ہاتھ بٹانے کے لحاظ سے خریدیں ۔ منتظمین کمپنی کی خوش معاملگی اور حسابات کی صفائی کا ہم بخوبی وعدہ کرسکتے ہیں لیکن نفع پہونچانے کا نہ ہمکو خیال ہے اور نہ ہم اسکی کوئی امید دلانا چاہتے ہیں ۔ یوں بھی دیسی زبانوں کے اخبار اور رسالے شاذونادر ہی مالی حیثیت سے نفع بخش ہوتے ہیں ۔ اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ زمانہ کے قدردان ان سب پہلوؤں کو مدنظر رکھکر ہمکو اس تجویز کے متعلق اپنی رائے سے مطلع فرمائیں کہ اگر دس دس روپیہ کے حصے رکھے جائیں وہ کسقدر حصے خود لے سکیں گے اور کسقدر حصے اُن کے احباب خرید سکیں گے ۔ یہ معلوم ہوجائے تو اس اسکیم کی تفصیلات طے کیجائیں ۔ بہرحال ہمارے ناظرین اور قدردان چاہیں گے تو زمانہ کی آیندہ زندگی کیطرف سے اطمینان ہوسکتا ہے ورنہ تمام ذاتی کوششوں کا جو حشر ہوتا ہے زمانہ بھی حد سے حد ایڈیٹر کی زندگی تک قائم رہ سکتا ہے۔

مندرجہ بالا نوٹ زمانہ کے پچھلے نمبر کے لئے لکھا گیا تھا لیکن عدم گنجایش کی وجہ سے جون نمبر میں شایع نہیں ہوسکا اس اثنا میں راقم الحروف کی ایک آنکھ میں یکایک کچھ ایسی شکایت پیدا ہوگئی کہ ڈاکٹروں نے اسے لکھنے پڑھنے کی ممانعت کردی ہے ۔ چنانچہ یہ پرچہ جس طرح سے ہوسکا بے اطمینانی کی حالت میں تمام کرکے پریس بھیجا جارہا ہے ۔ مزید ڈاکٹری مشورہ کے لئے ایڈیٹر زمانہ کو کلکتہ جانے کی ہدایت کی گئی ہے چنانچہ ۲۲ جولائی کو یہ سطریں لکھکر وہ کلکتہ روانہ ہوگیا ۔ وہاں آپریشن کی ضرورت پیش آئے یا کوئی اور علاج تجویز ہو ابھی اسکے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ پرچوں کی ترتیب دوسرے ہاتھوں سے ہو ۔ مگر اس نئی مصیبت نے زمانہ کی مخدوش حالت کو اور بھی نمایاں کردیا ہے اسلئے ہم نہایت زور کے ساتھ اپنے تمام ہمدردوں اور قدردانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس دیرینہ خدمت کے آئندہ استقلال و استحکام کیلئے ہر ممکن امداد سے دریغ نہ فرمائیں ۔ تمام قدرشناسانِ رسالہ سے ہم فرداً فرداً اپیل کرتے ہیں کہ وہ خود اور اپنی کوشش سے زمانہ کی آئندہ زندگی قائم رکھنے کے لئے مستقل سرمایہ فراہم کردیں جسکے لئے ایک مختصر ٹرسٹ یا کمیٹی قائم کردیجائیگی جو بے لوثی سے اس خدمت کو ہر حالت میں جاری رکھنے کی ذمہ دار ہوگی ۔ اگر دس دس روپیہ کے حصے تجویز کئے جائیں تب بھی ضروری ہے کہ کم سے کم بیس پچیس ہزار روپیہ کے حصے علم ہمدردانِ رسالہ خریدلیں باقی کیلئے خاص خاص احباب کو تکلیف دیجاسکتی ہے لیکن جبتک عوام کوئی معتدبہ رقم فراہم نہ کردیں اس وقت تک ہم زیادہ مقتدر حیثیت رکھنے والے قدردانوں کو زحمت دینے کیلئے [illegible] کلکتہ میں آپریشن کے قبل کچھ ابتدائی علاج تجویز ہوا ہے ۔ علاج معالجہ کا سلسلہ [illegible] [illegible]

فہرست مضامین زمانہ جلد ۶۰ جنوری لغایت جون

مضامین نثر

حصۂ نظم

THE ZAMANA, AUGUST 1941. REGD. No. A147

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم

نمبر ۲	اگست سنہ ۱۹۴۱ء	جلد ۷۷

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا
چندہ سالانہ پانچ روپیہ ۸/ ممالک غیر سے آٹھ روپیہ
نمونہ سات آنہ
(حقوق محفوظ)

Malaria in Turkey.

ٹرکی میں ملیریا

ٹرکی جسے پہلے "مرد بیمار" کہا جاتا تھا. کمال آتاترک کے زمانہ میں ایک جدید اور خوش حال سلطنت بن گیا ۔ ان پڑھ لوگوں کی تعداد حیرت انگیز طور پر کم ہو گئی ہے ۔ جو گویا لاطینی رسم الخط کی برکت ہے جسے کمال آتاترک نے اپنی طبیعت سے ملک میں جاری کیا تھا ۔ اب ترکی عورتیں بھی برقع یا شلوار نہیں پہنتیں ۔ عورت ہو یا مرد ہر ایک کو "ووٹ" دینے کا حق حاصل ہے ۔ اور ٹرکی کا دارالحکومت انقرہ جدید قسم کے چیدہ فن تعمیر کا نمونہ ہے ۔

جدید ٹرکی میں حفظان صحت اور صفائی پر خاص توجہ دی گئی ہے وزیر صحت عامہ کی ہدایت کے بموجب (یہ وزارت نہیں بدلی) ایسے عمدہ نتائج برآمد ہوئے ہیں جنھیں پہلے ناممکن خیال کیا جاتا تھا اور یہ واقعہ ملیریا کے خلاف جدوجہد کرنے کے سلسلے میں نہایت نمایاں ہے ۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ٹرکی میں ایسے بہت سے علاقے تھے ۔ جہاں کے اکثر باشندے ملیریا میں مبتلا ہوا کرتے تھے لیکن وزیر صاحب صحت عامہ کی ہدایت سے اب ان علاقوں کی حالت بدلنے کی سخت کوشش کی جا رہی ہے اور ملیریائی مچھروں کی بیخ کنی کے لئے سخت کوشش ہو رہی ہے جسکا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انقرہ ملیریا سے پاک ہو گیا ہے

لیگ اقوام کی ملیریا کمیشن کی تازہ رپورٹ سے یہ بات صاف ظاہر ہو گئی ہے کو نین ملیریا کے انسداد اور علاج کے لئے بہترین دوا ہے ۔

انسداد ملیریا کے لئے کمیشن مذکور نے فصل بھر میں چھ گرین کونین روزانہ تجویز کی ہے اور اگر کوئی شخص ملیریا میں مبتلا ہو جائے تو اسے پانچ سات دن تک پندرہ بیس گرین روزانہ دی جائے ۔ اسکے بعد کوئی علاج کی ضرورت نہیں اگر بدقسمتی سے ملیریا پھر نمودار ہو جائے تو پہلے کی طرح پھر کونین کھائی جائے ۔ ملیریا کمیشن کی رپورٹ بابتہ ۱۹۳۷ء کے صفحہ ۱۲۲ پر [illegible] ہے کہ چونکہ کونین ایک بے ضرر چیز ہے [illegible] ڈاکٹر صاحب کی نگرانی کے بغیر بحالت لازم بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن دوسرے مرکبات [illegible] کی نگرانی کی ضرورت ہے ۔

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید مثل کتابیں

انقلاب فرانس۔ فرانس کی تحریک آزادی اور وہاں کے انقلاب کی تاریخ میں ہمارے لئے بہت سے سبق ہیں۔ جامعہ ملیہ کے ایک لائق فرزند مولوی عبد القادر صاحب بی اے نے انقلاب فرانس پر اس کتاب میں ایک غائر نظر ڈالی ہے قیمت عہ

دیوان غالب۔ دیوان غالب کا وہ مشہور ومعروف نسخہ جو جرمنی میں خاص اہتمام سے چھپوایا گیا ہے۔ یکمل دیوان معہ دیباچہ مصنف کی سہ رنگی تصویر جو جرمن مہر مندی کا اعلیٰ نمونہ ہے نہایت نفیس جلد سنہرا کام۔ قیمت قسم اول عہ

مرقع ادب۔ ہندوستان کے مشہور انشاپرداز شعرا کے خطوط جو انھوں نے اپنے احباب کو لکھے حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

دنیا کی کہانی۔ پروفیسر محمد حبیب صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں ہزاروں برس کی تاریخ اس انداز سے لکھی ہے کہ پڑھنے والا بادشاہوں کی لڑائیوں و تاریخوں کے گورکھ دھندوں میں پڑے بغیر وہ سب کچھ سمجھ جاتا ہے جو تاریخ کا اصل مفہوم ہے لکھائی چھپائی وغیرہ عمدہ

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

دیوان شیدا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ۔ یہ بھی دیوان غالب کی طرح نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہے اور بالکل ویسا ہی خوبصورت اور خوشنما ہے جیسا دیوان غالب ہے قیمت عہ

کلام جوہر۔ حضرت مولانا محمد علی مرحوم کا مکمل مجموعہ کلام جسے مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے خاص کاوش سے مرتب فرمایا ہے۔ پڑھئے اور پاکیزہ مذاق کا لطف اٹھائیے قیمت صرف عہ

خیالستان مصنفہ سید سجاد حیدر یلدرم۔ یہ مختصر مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اب تک اس کے گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور اب بارہواں ایڈیشن مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے قیمت مجلد عہ

خیالات مہاتما گاندھی۔ یہ وہ لاجواب کتاب ہے جس میں مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے گاندھی جی کے مذہبی سماجی اور سیاسی خیالات شرح وبسط کے ساتھ درج کر کے دنیا پر احسان عظیم کیا ہے

قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

ملنے کا پتہ زمانہ بک ایجنسی

محمد بہادر شاہ ظفر۔ خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ از منشی محمد امیر احمد علوی بی اے۔ اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں۔ جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے قیمت عہ

میدان عمل۔ منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے اس میں ملک کی موجودہ بیداری کے بعض روح کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ و دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے صفحات پانسو کتابت اعلیٰ کاغذ نفیس اور روشن طباعت خوبصورت اور مضبوط جلد دیدہ زیب ڈسٹ کور قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ عالعہ

مثنوی سحر۔ یعنی شکنتلا اور سنینت کا اردو ترجمہ حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز، دوسرا اڈیشن جسکی مصنف نے نظر ثانی کی ہے قیمت ۸ر

نصائح چانکیہ۔ یعنی نامور ہند چانکیہ کی مشہور و معروف نیتی کا ترجمہ از جناب پنڈت سنجنت رام صاحب مددگار رفتہ انہ سکار عالیہ گورنمنٹ نظام قیمت چھ آنہ

قومی ... رسالہ ترانہ جس میں ۲۷ قابل دید مضامین نظم و نثر اور رنگین و سادہ تصاویر ... [illegible]

... [illegible]

ڈاکٹر سپرو، مسز نائیڈو و ڈاکٹر اقبال کے خاص پیغامات اور بہت سے قابل دید مضامین نظم و نثر شایع ہوئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ عہ

اثرستان۔ ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرع پر تاثیر اور ہر شعر تیر و نشتر ہے قیمت ...

زادِ راہ۔ منشی پریم چند مرحوم کی ان کہانیوں کا مجموعہ جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

دنیائے تبسم۔ مشہور مزاحیہ نویس جناب شوکت تھانوی کے بہترین ظرافت آمیز افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ ایک روپیہ چار آنہ

مجنوں کے افسانے:۔ جناب مجنوں گورکھپوری اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں۔ موجودہ کتاب ان کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے قیمت بارہ آنہ ۱۲ار

پس پردہ:۔ جناب چندر بھوشن سنگھ کے سات افسانوں کا مجموعہ، زبان، پلاٹ اور فلسفیانہ انداز بیان کے اعتبار سے ایک قابل قدر چیز ہے۔ قیمت بارہ آنہ ۱۲ار

حیات بیوہ:۔ جس میں مصنف نے بیوگان کی حالت زار کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور ان کی جانکاہ مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا ہے قیمت ۸ر

اچھوت کانپور

ل۔ احمد صاحب کی کتابیں

انشائے لطیف :۔ اردو ادب سے ذوق رکھنے والوں کے لیے صاحب لالہ رخ کا نام تعارف کا محتاج نہیں ل۔ احمد صاحب نے اردو میں افسانہ نویسی کا جو معیار پیش کیا ہے اپنی جگہ ایک مثال ہے انکے قلم سے نکلا ہوا ہر افسانہ نفسیات و واردات قلب اور حکمت و جذبات کا اعلیٰ تصویر ادر اردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے پندرہ افسانوں کا یہ مجموعہ حسن و عشق کی کشاکش اور فلسفۂ شباب کا مرقع ہے آپ اگر اردو زبان کی گیلی اور اردو نثر کی شعر آفرینی کے قدردان ہیں تو اس مجموعہ کو دیکھیے پونے تین سو صفحات مجلد قیمت دو روپیہ ؏

نغمات اس مجموعہ میں ل۔ احمد صاحب کے مختصر ترین ساٹھ ادب پارے شامل ہیں جنھیں نثر کی شاعری کا ایک وجد آفرین کارنامہ کہا جاسکتا ہے زبان کی نفاست اور بیان کی لطافت کا اندازہ کرنیکے کیلئے اس مجموعہ کا دیکھنا ازبس ضروری ہے حجم ۱۳۶ صفحات مجلد قیمت عہ

محبت کا افسانہ :۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے جسکے اندر ل۔ احمد صاحب نے موسیقیانہ زبان اور فلسفیانہ انداز میں مسرت اور روح سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اسکا ہر باب ایک مستقل افسانہ ہے اور ہر باب میں کسی نہ کسی معاشرتی یا اخلاقی مسئلہ پر نگاہ نظر ڈالی گئی ہے حجم ساڑھے تین سو صفحات مجلد قیمت دو روپیہ

(۱) منیجر زمانہ کانپور
(۲) عظیم اظہر محلہ منٹولہ۔ آگرہ

گلشن صحافت میں ایک غنچۂ نو کا اضافہ

شباب

ادب اردو کا ایک ترقی پسند ماہنامہ

ملک کے مشاہیر اہل قلم حضرات کے بلند پایہ مقالے ترقی یافتہ ادب کے اعلیٰ مضامین۔ دلچسپ اصلاحی افسانے اعلیٰ نفسیاتی ڈرامے تاریخی شہ پارے۔ روح نواز پر کیف غزلیں۔ وجد آور سرمدی نظمیں سولہ دلآویز پیارے گیت ماہ بماہ اپنی تمام رعنائیوں و لغزشوں اور معنوی خوبیوں کے ساتھ مطلع صحافت پر عنقریب جلوہ گر ہوگا نمونہ کا پرچہ بالکل مفت روانہ ہوگا فوراً اپنے اسم گرامی اور مکمل پتہ سے مطلع کریں

منیجر شباب پوسٹ بکس نمبر ۴۲۷ بمبئی نمبر ۳

یادگار حالی

مشہور رسالہ زمانہ کا دسمبر ۱۹۳۵ء نمبر شمس العلماء مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کی یاد میں حالی نمبر کی حیثیت سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے جسمیں مولانا کے سوانحی حالات کے علاوہ انکی نظم اور نثر پر متعدد تنقیدی مضامین مع ہیں موجودہ زمانہ کے کئی نامور شاعروں اور انشا پردازوں نے اس کیلئے خاص مضامین لکھے ہیں جشن حالی پت کا بھی مفصل تذکرہ ہے کئی عکسی تصاویر بھی زیب رسالہ ہیں غرض ہر حیثیت سے یہ پرچہ قابل قدر یادگار حالی نمبر کہلانیکا مستحق ہے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲ علاوہ محصولڈاک۔ ملنے کا پتہ

زمانہ بکڈپو کانپور

زمانہ

جلد ۷۷ — اگست ۱۹۴۱ء — نمبر ۲

لکھنؤ اسکول کی شاعری

(از سیّد علی جواد زیدی، ایم۔ اے)

لکھنؤ اسکول کی شاعری کے خلاف اتنا کامیاب پروپیگنڈا کیا گیا ہے کہ آج معمولی طالب علموں سے لیکر فارغ التحصیل مضمون نگاروں تک کے نزدیک لکھنؤ کی شاعری خرافات کا مجموعہ اور گل و بلبل اور انگیا چولی کا ذخیرہ ہے۔ نہ اس میں جذبات کی تصویر کشی ہے اور نہ حقائق کی گلکاریاں۔ مدرسے ہوں یا اسکول، کالج ہوں یا یونیورسٹیاں، ہر جگہ اساتذہ اور طلبا اسی قسم کے بے سروپا اعتراضات پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ نقادِ سخن بھی اسی کورانہ تقلید میں مبتلا ہیں جیسے معمولی شائقین۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اگر غور کیجئے کہ یہ لکھنؤ اسکول ہے کیا؟ تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اردو ادب کی تاریخ میں تو اس اسکول کا کہیں پتہ نہیں۔ بہرحال اس سلسلہ میں واقعات ذیل پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے:۔

(۱) جب جہان آباد (دہلی) برباد ہوا تو وہاں کی ادبی محفل درہم برہم ہو گئی اور طوائف الملوکی اور بے سروسامانی کا ایسا دور دورہ ہوا کہ وہ نامور شاعر بھی جن کی نزاکت مزاج اور قناعت نفس کے افسانے آج تک زبان زد عوام و خواص ہیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ شاہان اودھ کا دربار یارانِ نکتہ داں کے لئے صلائے عام تھا۔ اس لئے چند شاعروں کو چھوڑ کر باقی سب بڑے بڑے شاعر لکھنؤ گرد و نواح لکھنؤ میں چلے آئے۔ اور یہیں شاعری اور اصلاح شعر میں مشغول ہو گئے۔ اس لئے اگر اردو شاعری کا کوئی لکھنؤ اسکول ہے تو اس کے بانی یہی شعرائے دہلی تھے پھر دہلی اور لکھنؤ اسکول کی تقسیم کیسی؟

مگر اس تقسیم کے پردے میں سیاسی عنصر کو بھی دخل ہے کیونکہ اُردو شاعری کی یہ تقسیم سلطنت اودھ کے زوال کے بعد کی گئی ہے۔ شاہان اودھ کی رنگ رلیوں کے تاریک پہلوؤں کو اسی طرح اُچھالا گیا ہے اور ان کی اخلاقی حالت کو اتنا پست و ذلیل بنا کے پیش کیا گیا ہے کہ آج شاید ہی کوئی ایسا ہو جو یہ تسلیم کر سکے کہ شاہان اودھ دنیا میں شراب و ساغر اور شاہد و ساقی کے سوا کسی اور چیز سے واقف بھی تھے۔ اب جبکہ ہندوستان میں قومیت کا کچھ کچھ احساس ہو چلا ہے اور تاریخی واقعات کی تحقیق و تدقیق کا شوق بھی پیدا ہو رہا ہے تو لوگوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں۔ نوجوان نقادوں نے جو عموماً قیاس آرائیوں کے مؤید اور کورانہ تقلید کے دلدادہ ہیں اس سیاسی شور کو حقیقت سمجھ کے غلط واقعات کی بنیاد پر تخیل کا ایک وسیع قلعہ تیار کر دیا۔ ان میں جن لوگوں کو اپنی ذہانت پر ناز تھا وہ ایک قدم اور آگے بڑھے اور ان کو "واجد علی شاہی سوسائٹی" کا عکس شاعری اور ادب میں بھی نظر آنے لگا۔ چنانچہ اسی شاعری کا نام لکھنؤ اسکول کی شاعری پڑ گیا۔ معلوم نہیں یہ حضرات یہ کیسے بھول گئے کہ آخر داغ کے یہاں یہی خصوصیتیں کیسے سمٹ آئیں، اور آج بھی جلیل کے یہاں کیوں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

(۲) لکھنؤ کی شاعری پر یہ اعتراضات لکھنؤ کی بربادی کے بعد شروع ہوئے۔ جب علم و ادب کے چرچے کم ہو گئے اور عوام کو روٹی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ قسمتیں گردش میں تھیں اور زمانے کی ہوا کا رُخ پلٹ چکا تھا کسے فرصت تھی کہ ان اعتراضات کا جواب دیتا۔ مگر جن لوگوں کی نظر اُردو ادب کے گراں بہا ذخیروں اور اس کی مختلف ادبی تحریکوں کے نشیب و فراز پر ہے وہ میری تائید کریں گے کہ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے اُردو کا تمام پرانا لٹریچر یکساں ہے، وہی مضامین کی محدود فضا ہے اور وہی اندازِ بیان کی فرسودگی۔ قدم قدم پر فارسی شاعری کی تقلید ہے، تبدیل آب و ہوا کا اثر ضرور ہوا ہے۔ مگر وہ کچھ ایسا نہیں ہے کہ جس پر خاص دھیان دیا جائے۔ پھر بھی اگر ہم اُردو غزل گو شاعروں کو ان کے مختلف اسکولوں میں تقسیم کرنا ہی چاہتے ہیں تو مندرجۂ ذیل تین اسکول بنائے جا سکتے ہیں:-

۱۔ دکن اسکول

۲۔ فارسی اسکول

۳۔ جدید اسکول

دکن اسکول کے ذیل میں اُس زمانے کی شاعری آ جائے گی جب شاہان اودھ برسرِ اقتدار تھے اور رعایا کی انتہائی محبت میں انھیں کی زبان میں پریت، پریم، پیا، جوگن اور سجن کے گیت گاتے اور سنتے تھے۔ اس اسکول کی شاعری پر ہندی شاعری کا اثر غالب تھا۔

فارسی اسکول اُن تمام غزل گویوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیگا جو فارسی شاعری سے متاثر تھے۔ یا ہیں، جو فارسی عروض فارسی اندازِ بیان اور فارسی تخئیل کو مشعلِ راہ بنا کر شعر و سخن کی منزل میں قدم رکھتے ہیں۔

جدید اسکول کو ہم غالب اسکول بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ خود غالب اپنے کو فارسی شاعر سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ　　　بگذر از مجموعۂ اُردو کہ آں نیرنگِ من است

لیکن اُس نے اُردو غزل میں اپنی جدّت پسند طبیعت سے مجبور ہو کر انقلابی تبدیلیوں کی بنیاد ڈالی اُس نے اُس زمانے کے قدامت پرستوں کی نگاہ میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ضرور بنائی لیکن غزل گوئی کا معیار بھی بہت بلند کر دیا۔ جن خیالات کو اس کے متقدمین شجرِ ممنوعہ سمجھے ہوئے تھے۔ اس نے نہایت آزادی سے اُن کو اپنی غزلوں میں ظاہر کیا یہی نہیں بلکہ اُس نے دبی زبان میں اُردو ادب کے اس رُجحان کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی کہ ادب کو غزل ہی تک محدود کر دینا چاہیئے۔ اُس نے ببانگِ دہل پُکار کے کہا کہ:

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل　　　کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

اسی جدید اسکول کے متبعین حالی، چکبست، سرور اور اقبال ہیں، آج کل کے غزل گو اسی جدید اسکول کی تقلید کی کوشش کرتے ہیں، اور ان میں سے اکثر کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

اس تقسیم کے علاوہ اور کوئی تقسیم ممکن نہیں ہے۔ لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کا کبھی وجود نہیں رہا۔ شاعری کے اسکول اس وقت تک نہیں بنائے جا سکتے ہیں جب تک مختلف گروہوں کے شاعروں کے سوچنے کا طریقہ ایک دوسرے سے جداگانہ نہ ہو۔ لکھنؤ اور دہلی اسکول کے شاعروں کا اندازِ تخئیل یکساں ہے اگر کسی جگہ کوئی شاعر اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ سامنے آتا ہے تو وہ مستثنیات میں ہے محض ذاتی خصوصیات پر اسکول نہیں بنائے جا سکتے۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض بھی کر لیا جائے کہ کسی زمانے میں "لکھنؤ اسکول" موجود تھا تو کم از کم اس بیسویں صدی میں تو اس کا کہیں وجود باقی نہیں ہے۔ خیالات کی اشاعت کے وسیلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ بڑی حد تک خیالات میں یکرنگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک خیال دوسرے خیال سے بہت جلد ہم آغوش ہونے کی کوشش کرتا ہے اور بہت سے خیالات جب ایک دوسرے سے ٹکرا تے ہیں تو ہم آہنگی کی شمع روشن ہو جاتی ہے۔ نظم ہو یا نثر خیالات کے اعتبار سے موجودہ صدی میں سب کے سب بہت کچھ یکساں نظر آتے ہیں

بظاہر اقبال کے ذہن میں پاکستان کا تخیل اس تخیل سے بالکل جداگانہ ہے جو جوش کے ذہن میں متحدہ ہندوستان کا ہے لیکن اسرار و حقائق کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگانے والی نگاہیں فوراً پہچان لیتی ہیں کہ دونوں تخیلات کی روح وہی "احساس اتحاد" ہے جو عام ہو چلا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں "انتہا پسندوں" کی کمی نہیں۔ اس وجہ سے اکثر و بیشتر "قدامت" اپنی پوری قوت سے "جدت" سے جنگ کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے مگر یہ جنگ بھی ہندوستان گیر ہے اور لکھنؤ یا دہلی یا کسی مخصوص خطہ میں محدود نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے موجودہ زمانہ میں لکھنؤ اسکول یا دہلی اسکول کا تذکرہ مذاق سلیم کی ہنسی اڑانے کے مرادف ہے۔ اس مضمون میں آگے چل کر جس "لکھنؤ اسکول" کا تذکرہ کیا جائے گا وہ بے راہ رو تنقید نگاروں کا مفروضہ اسکول نہیں ہے بلکہ "لکھنؤ اسکول" سے ہماری مراد وہ اسکول ہے جو خیالات کے اعتبار سے کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتا۔ لکھنؤ یا لکھنؤ کے گرد و نواح میں رہنے والے شعراء کا اور ایسے شعراء کا جو اول الذکر سے فیض یاب ہوئے ہیں، ایک ایسا گروہ بنایا جاسکتا ہے جو یو۔ پی کے مختلف گوشوں میں پھیلا ہوا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان شاعروں نے بیسویں صدی میں ادب اردو کی کیا خدمات انجام دی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا انجمن ہمارا ادب لکھنؤ کے اراکین نے اس بات کا جائزہ لینا چاہا تھا کہ فنی، جذباتی اور افادی حیثیت سے لکھنؤ اسکول کی شاعری کا ادبیات اردو میں کیا درجہ ہے۔ مگر یہ تینوں حیثیتیں تھوڑے سے غور کے بعد ایک ہی ہو جاتی ہیں کیونکہ اگر کسی شاعر نے بہ اعتبار فن کوئی اضافہ کیا ہے یا جذبات کی ترجمانی کی ہے تو دونوں کا مقصد افادی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم سے ایک دماغی بےچینی کا پتہ چلتا ہے۔ ملک کے موجودہ سیاسی ماحول میں دماغی سکون ناممکن ہو گیا ہے کیونکہ یہ انقلاب اور تبدیلی کا دور ہے جس میں مختلف نظریے آپس میں ٹکرا رہے ہیں، مختلف عقائد ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں، مختلف جماعتیں بقا اور فنا کے برزخ میں اضطراب و انتشار کا شکار ہو رہی ہیں یہ وہ وقت ہے جب ہمیں فیصلہ کرنا ہے، ہمارا ماضی ہم سے دور، حال پہلو بہ پہلو اور مستقبل قریب ہے ہمارا مستقبل یا تو ہمارے ماضی اور حال کی کوئی درمیانی صورت ہوگی، یا ہمارے ماضی و حال کا ردّ عمل۔ دونوں صورتوں میں ہمیں کو فیصلہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فیصلہ پر ماضی کے مقابلے میں حال کہیں زیادہ اثر انداز ہوگا۔ اس لئے حال کے نظریات کا اثر بھی ہم پر زیادہ ہے۔ آجکل دنیا کا نظریہ افادیت پسندانہ ہو گیا ہے، پھر اگر شاعری بھی سراسر افادیت پسند ہو تو کیا مضائقہ ہے اگر اس کے ساتھ ہی ماضی کی یاد بھی دلوں میں باقی رہے۔ اسلئے موضوع افادی ہی رہا مگر

فن اور جذبات کے لحاظ سے تقسیم بھی کردی گئی

بہر حال اس وقت میں بھی اس ترتیب کو قائم رکھتے ہوئے شعرائے لکھنؤ کی شاعری کے اُنھیں پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا لیکن قبل اس کے کہ لکھنؤ کے موجودہ دَور کی خوبیاں یا خامیاں گنائی جائیں مناسب معلوم ہوگا کہ اُن قوتوں کا بھی صحیح احساس کرلیا جائے جو اس بیسویں صدی میں عموماً ہماری زندگی کے ہر شعبے پر خصوصاً شاعری پر اثر انداز ہورہی ہیں۔

اردو ادب اور بیسویں صدی

ہندوستان میں نہ معلوم کتنے سیاسی انقلابات ہوچکے ہیں لیکن اس کے پہلے جتنے انقلابات ہوئے ان میں عوام کا کوئی حصہ نہیں تھا، صرف اعلیٰ طبقہ کے لوگوں اور بادشاہوں کے درمیان مناقشات ہوتے تھے، لڑائیاں چھڑتی تھیں، فتح و شکست ہوتی تھی بیسویں صدی میں سیاسی تحریک جدید اُصولوں پر شروع ہوئی، انقلاب میں حصہ لینے والوں کا حلقہ وسیع ہوگیا۔ چنانچہ ملک کی سیاسی تحریک رجعت پسندوں کے دائرہ سے نکل کر اعتدال پسندوں اور لبرلوں کی محفلوں میں جلوہ افگن ہوئی، مگر بعد چندے وہاں سے بھی آگے بڑھ گئی۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں عوام کا اثر بہت بڑھ گیا، لاکھوں کروروں ہندوستانی کھدر کی ٹوپیاں پہن کر جوق در جوق ترنگے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔

۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۰ء کی سیاسی تحریکیں صحیح معنوں میں عوام کی تحریکیں (جنتا اندولن) تھیں اس طرح جب رفتہ رفتہ ملکی سیاست پر عوام کا قبضہ جمنے لگا تو طبقاتی رعونت کے قلعے بھی مسمار ہونا شروع ہوگئے جو سربلند تھے انھیں سرنگوں ہونا پڑا، اعلےٰ طبقات کو بھی عوام سے ربط ضبط بڑھانے کی فکر ہوئی مگر عوام سے راہ و رسم پیدا کرنا آسان نہیں ہے چنانچہ جتنا ہی اُنھیں غور سے دیکھا گیا اتنے ہی انقلابی جذبات کی فراوانی ہوئی، اشتراکیت کا زور بڑھا، قومیت پر ناز کرنے کا موقعہ ملا۔ اور درباری ذہنیت رکھنے والے "شاعروں اور ادیبوں کی تباہی کا زمانہ آگیا۔ کیونکہ اب کان اُن نغموں کو سننے کے لئے بیچین نہیں جن میں زندگی کی آزادی کا اظہار نہ ہو اور طبقاتی تفریق کو ختم کردینے کا مصمم ارادہ کروٹیں نہ لے رہا ہو۔

عوام کی بیداری شاعروں اور ادیبوں پر پوری طرح اثر انداز ہوئی، ایک طرف تو سیاسیات کا اُردو ادب پر اثر پڑنے لگا دوسری طرف مغربی علوم و فنون سے لوگوں کی دلچسپی بڑھنے لگی، کتابوں کے ترجمے کئے گئے اور ادب کی نئی تحریکوں، اندازِ بیان کی نئی شاہراہوں اور اظہارِ خیال کے جدید اسلوبوں کا پتہ چلا، اُن میں سے بعض بعض باتیں قابل اخذ و تقلید معلوم ہوئیں مگر اُن کی تقلید میں احتیاط سے کام لیا گیا۔ اسلوبِ بیان اور تنوعِ خیالات میں ایرانی شاعری کا بھی پرتو تھا ہندی شاعری کی بھی

جھلک تھی اور مغربی زبانوں کا بھی عکس تھا۔ یہی امتزاج خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گو اردو کے اکثر شاعر اس امتزاج کو قائم نہ رکھ سکے، مگر لکھنؤ کے چند شاعر اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ خیالات کے اعتبار سے بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ اگرچہ اکثر شاعروں نے اپنا نقطۂ نظر بالکل ذاتی رکھا، پھر بھی اُن کے خیالات پر عوام کے جذبات و خیالات حاوی ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض شاعر اپنی انفرادی شخصیت کھو بیٹھے اور عوام کی دنیائے خیال کا جزو بن گئے۔

اِسی سیاسی ماحول میں بیسویں صدی کا ادب تربیت پا رہا ہے، اس وقت یہ سوال اُٹھانا کہ لکھنؤ کے شعراء نے کوئی فنی خدمت انجام دی یا نہیں بالکل ایسا ہی ہے جیسے اقتصادیات کی کسی کتاب میں جمہوری حکومت کے مختلف نظریوں پر بحث و مباحثہ۔ پھر بھی چونکہ اب تک اردو شاعری دقیانوسی نظریوں کے ماتحت فنّی قیود سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکی ہے۔ اس لئے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق جو چیزیں بیکار، بے ربط اور غیر مسلک نظر آتی ہیں اُن پر بھی روشنی ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔

لکھنؤ کی بدنامی اس وجہ سے بھی ہے کہ اُس نے ہمیشہ فنی عیوب و محاسن کا خیال رکھا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، زبان میں صفائی، اسلوبِ بیان میں تنوع، خیالات میں وضاحت، اظہارِ مطالب میں روانی اور سلاست، تشبیہات اور استعارات میں جدّت اُن کا خاص حصّہ رہا ہے۔ جس پر لکھنؤ بجا طور سے ناز کر سکتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں جو چیز خاص طور سے قابلِ ذکر ہے وہ لکھنؤ کا بلند پایہ ادبی رُجحان ہے۔ اُس نے جب سے دہلی کا علمی خزانہ میراث میں پایا اس وقت سے اس بات کی کوشش جاری رکھّی کہ اُردو کو عوام کی زبان بنایا جائے۔ اور ایسے خیالات کو نظم کیا جائے جن سے عوام کو دلچسپی ہو اور جو عوام کی تفریحِ طبع کا سامان مہیا کر سکیں۔ ایک زمانہ تھا جب اس رُجحان کو سُوقیانہ اور عامیانہ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا، مگر ادبی امارت پرستی کا وہ دَور ختم ہوگیا۔ اب عام طور پر یہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ ادب کو عوام کے جذبات کی ترجمانی کرنا چاہیئے۔ اس بدلے ہوئے ماحول اور تبدیل شدہ فضا میں انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ شاعروں کی خدمات کا اعتراف کیا جائے جو اب تک نشانۂ ملامت بنے ہوئے ہیں۔ درحقیقت یہی اصحاب اُردو ادب میں ایک بڑے انقلاب کے بانی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کا عام فہم زبان میں بیڑا اُٹھایا ہے۔ چنانچہ موجودہ دَور میں حضرت آرزوؔ کی "خالص اُردو" اپنے ساتھ ایک پیامِ انقلاب لائی ہے جس کی عظمت کا شاید آج اعتراف نہ کیا جائے لیکن ایک مشترکہ زبان کی بڑھتی ہوئی تحریک

اور "ہندستانی" کی مقبولیت دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری آیندہ نسلیں حضرت آرزو کو خراج تحسین دینے کے لئے آگے بڑھیں گی مشترک زبان بننے کی صلاحیت موجودہ دور کی مفرس اُردو یا سنسکرت شبدوں سے بھری ہوئی ہندی میں نہیں ہے۔ میں اپنے ہی مضمون کو جب پڑھتا ہوں تو بار بار سوچتا ہوں کہ کیا یہی مشترکہ زبان ہے؟ مگر ماحول سے میں بھی مجبور ہوں۔ بہرحال "خالص اُردو" نے ہمارے لئے وہ نہر بنا دی ہے جس میں اظہار خیال کی موجیں آنے والی صدیوں میں اُٹھا کریں گی اور ضروریاتِ زمانہ کے مطابق اُن میں مدوجزر پیدا ہوتا رہیگا۔ آرزو کی "سُریلی بانسری" جو فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں چھاپی گئی ہے آپ ہی اپنی نظیر ہے۔

خالص اُردو کی تحریک ایک نئی تحریک ہے جس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ایک فن کار ہی لگا سکتا ہے خالص اُردو کی غزلوں کو دیکھکر زبان کے اس عبور کا پتہ چلتا ہے جو اس وقت عنقا کی مثال ہے۔ وہ آسان اور دیسی الفاظ جو کبھی زبان زدِ خاص و عام تھے آج ہم انھیں بالکل ہی بھول گئے ہیں، اور وہ الفاظ رفتہ رفتہ مُردہ ہوتے جاتے ہیں اور فارسی، عربی اور سنسکرت کے "روڑے" اُن کی جگہ لے رہے ہیں ان میں چند ایسے الفاظ بھی ہیں جو بعض باتوں کو ایسی خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ کسی زبان کا کوئی لفظ اُن باتوں کو پُورے طور پر ادا کر ہی نہیں سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے شعر کو ملاحظہ فرمائیے

وہ بھی بڑا ہے "باؤلا" تجھ کو جو پاکے چھوڑ دے　　　تیرے تو ڈھنگ ہیں یہی اپنا بنا کے چھوڑ دے

یا

جو کچھ ہے سو اپنی سمجھ کا اُجالا　　　اس "اندھیر نگری" میں بتی نہ ڈھونڈھو

"باؤلا" اور "اندھیر نگری" دونوں ایسے لفظ ہیں جن کے مطالب پر کوئی دوسرا لفظ حاوی نہیں ہو سکتا حضرت آرزو کی خالص اُردو والی غزلیں ایک نئی چیز ہیں۔ کم سواد نقاد انھیں دیکھکر چیں بجبیں ہوتے ہیں اور مختلف اعتراضات کرنے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ خالص اُردو کیا بلا ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ ایک تو اُردو غزل یوں ہی قیود کے بوجھ سے دبی جاتی ہے اس پر یہ مزید قید عائد کرنا کہ فارسی یا عربی کا کوئی لفظ استعمال نہ ہو شاعری کی روح کو مردہ کر دینا ہے۔ مگر یہ حضرات درحقیقت نہ شاعری کی پُرپیچ منزلوں ہی سے واقف ہیں اور نہ انھیں یہی معلوم ہے کہ اُردو کو ملکی زبان بنانے کے لئے کن اَن تھک کوششوں کی ضرورت ہے۔ اکثر اصحاب تو فن تنقید کی چند انگریزی کتابیں پڑھکر نقاد بن گئے ہیں، مگر ان کو کون سمجھائے کہ کسی ملک کی ادبیات پر تنقید کرنے سے پہلے اس پر عبور، تاریخ سے واقفیت، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی ماحول کا علم ضروری ہے۔ ان چیزوں سے قطع نظر جو تنقید ہوگی گمراہ کن ہوگی۔ حقیقی تنقید کے لئے ہمدردی اور تعمیری جذبہ اشد ضروری ہے ورنہ یہی کہنا پڑیگا

رحم لے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو — کوئی لوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بُو
شاعری اور منطقی بحثیں، یہ کیسا قتلِ عام — بُرشِ مقراض کا زلفوں کو دیتا ہے پیام
فکر کا جس کی حواسِ ظاہری پر ہو مدار — شاعری کے قصرِ مدہوشی میں پا سکتا ہے بار

بہرحال حضرت آرزو کی "خالص اُردو" کی غزلیں فنی حیثیت سے ایک زبردست لسانی تحریک ہونے کے علاوہ اظہارِ جذبات کے نئے راستے بھی نکال رہی ہیں۔ فارسی شاعروں کی تقلید میں ہم نے اظہارِ جذبات کے راستے محدود کر لئے تھے، مگر حضرت آرزو نے تمام بند دروازے کھول دئے ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کا مصرع سنیئے، فرماتے ہیں"

"کاٹ رہا تھا میں گلا، کہتا تھا کوئی ہائیں ہائیں"

ہمارے کہنہ مشق اور پرانے ڈگر پر آنکھیں بند کرکے چلنے والے شاعر "کہتا تھا کوئی ہائیں ہائیں" کی جگہ "منع کر رہا تھا" یا "روک رہا تھا" نظم فرماتے۔ لیکن "کہتا تھا کوئی ہائیں ہائیں" میں جو بے ساختہ پن شدتِ جذبات، محاکاتی صداقت اور وسعتِ مشاہدہ ہے وہ کسی دوسرے جملے میں مل ہی نہیں سکتی۔

کچھ حضرت آرزو ہی پر موقوف نہیں بلکہ لکھنؤ کے دوسرے بلند مرتبہ شاعر بھی بیش بہا فنی خدمات انجام دے رہے ہیں، حضرت صفی کا یہ شعر پڑھئے:-

دنیا کا ورقِ بینشِ اربابِ ہنر ہے — اِک تاش کا پتہ ہے کفِ شعبدہ گر میں

کیا اس مفہوم کو اس سے بہتر الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے؟ حضرت صفی کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

دوسرے مصرعے میں شاعر نے جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہ نہ صرف انوکھا بلکہ فنی حیثیت سے ہمارے ادب میں ایک مستقل اضافہ ہے۔

حضرت اثر کی ذاتِ گرامی بھی مغتنم ہے، اور جو کچھ میں آج اُن کے متعلق کہنا چاہتا تھا وہ اس سے پہلے خود ہی ایک شعر میں نظم فرما چکے ہیں ؎

اثر ہے نام، وطن لکھنؤ، عزیز استاد — نکالتا ہوں نئے راستے زباں کے لئے

اثر نے اپنے کلام سے اس دعوے کا مکمل ثبوت بہم پہونچایا ہے۔ یہاں کسی مخصوص شاعر کے کلام پر سیر حاصل بحث کا موقع نہیں ہے اس لئے صرف چند اشعار ہی پر اکتفا کی جائیگی، مثلاً ملاحظہ ہو:-

گلوں سے کہتے ہی کہتے نسیم مست ہوئی — ترے خرام کی رنگینیوں کا افسانہ

اس شعر میں جو نازک مضمون پیدا کیا گیا ہے وہ تو اپنی جگہ پر ہے لیکن اس خیال کو جن ...

لفظوں اور جس رنگین پیرائے میں ادا کیا گیا ہے اُس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ "نسیم مست ہوئی" ان تین لفظوں میں معانی کا ایک مواج دریا بند ہے۔ یہ طرز اثر کا خاص حصہ ہے۔ اُنکا دوسرا شعر ہے

تجھ پر نثار حسرتیں، حسرتیں کیسی؟ جنتیں　　چھین لے اور لذتیں، لذتِ غم بڑھائے جا

جذباتی حیثیت سے قطع نظر اثر نے اظہار خیال کا ایک نیا راستہ نکالا ہے اور آنے والی نسلوں کو یہ بتایا ہے کہ جب مختلف جذبات بیک وقت دل میں موجود ہوں تو اُن کو کس طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے یہ اختصار کی ایک حیرت انگیز مثال ہے، کیونکہ اس میں اختصار کا اختصار اور تفصیل کی تفصیل ہے۔ الفاظ تبدیل کر دیجئے اور مضمون خاک میں مل جائیگا۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ سب مفہوم ادا بھی نہیں کئے جا سکتے۔ اثر کا ایک شعر اور ہے:۔

یہ اپنی مستیِ دوشینہ کا ہے افسانہ　　ستارے ٹوٹ پڑے چھُٹ پڑا جو پیمانہ

دوسرے مصرع میں اثر نے نرالی تشبیہ دی ہے، اور تشبیہ سے وہ کام نکالا ہے جو مصور کے قلم اور ماہر نفسیات کی زبان سے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اثر کا ایک شعر اور، اور بس ؎

محشر سے یوں چلے ہیں گنہگار جرم عشق　　گویا انھیں میں بٹ گیا جتنا غرور تھا

"تخیلی محاکات" کی بہترین مثال ہے۔ جرم عشق کی عظمت کا احساس رکھتے ہوئے اِن مجرموں کا کردار جن لفظوں میں شاعر نے پیش کیا ہے وہ عرصہ تک یادگار رہیگا۔

زبان کے اعتبار سے لکھنؤ اس گئی گزری حالت میں بھی اقصائے ہند میں اپنا جواب نہیں رکھتا حضرت آرزو لکھنوی زبان دانوں کے سرخیل ہیں، ان کے اشعار پڑھنے سے ٹکسالی زبان کا معیار معلوم ہوتا ہے، لکھنؤ کی زبان کی شیرینی، سادگی اور بے تکلفی ہر سننے والے کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ ذیل میں آرزو کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

ہوئے بن کر حال نہ پوچھو بہتے ہیں اشک تو بہنے دو　　جس سے بڑھے بیچینی دل کی ایسی تسلی رہنے دو

بے موت میں مروں تمھیں آتی نہیں حیا　　کیا جب کھڑے ہو تیغ کو عریاں کئے ہوئے

وہ کہیں کہ آرزو کو مری غفلتوں نے مارا　　ابھی ہم یہ بات کہتے تو نہ اعتبار ہوتا

خوف میں رسوائی کے جس کو در سے اُٹھائے دیتے ہو　　جب وہ پھرے گا مارا مارا، پھر کس کا کہلائیگا

دو روزہ جوانی کے زور اللہ اللہ　　کہ جیسے اسی کا زمانہ رہے گا

ظرف خالی کو ٹھوکے دیکھے ٹھنکانے سے کیا؟　　مدعا بھی جب ہو کچھ، پوچھو گے دیوانے سے کیا؟

ہو جو پتھر بھی تو دو باتوں میں ہو جائیگے موم　　آرزو آتا ہے اُس جادو بیان سے ہوشیار

جو کہہ کے جھوٹتا ہو پھر انتظار اُس کا — اے دل کی سادہ لوحی صدقے ترے یقیں پر
دواؤ نہ منہ، جیر سے بہتر ہے محبت — کٹتی ہے اگر بات تو چلتی ہے زباں اور
ہیں یہی ساقی جو بلے پروائیاں — توڑ دیں گی بند بند انگڑائیاں
عشق پر بھی چھا گئیں رعنائیاں — اُف تری توڑی ہوئی انگڑائیاں
ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسب مراتب ہیں — لو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی
حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے — شمع کا شعلہ جب لہرایا، اڑ کے چلا پروانہ بھی
بنے تھے اس لئے بجلی کہ آنکھ جھپکا دو — بدل کے بھیس بھی رکھتے ہو سامنا کرتے

اس قسم کی سیکڑوں مثالیں حضرت صفی اور آثر کے یہاں بھی موجود ہیں۔

یہ اعتراض بھی اکثر بار بار دُہرایا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے شاعر اپنی تمام توجہ زبان پر مبذول رکھتے ہیں اور خیالات کی پروا نہیں کرتے۔ مگر اوپر جو اشعار نقل کئے گئے ہیں اُن میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جو صرف زبان کی خاطر کہا گیا ہو۔

یہ ضرور ہوا کہ شعرائے لکھنؤ شاہانِ اودھ کے دَور میں شاعری کے محاسنِ ظاہری کی طرف زیادہ مائل ہو گئے تھے جس کی وجہ سے خارجی پہلو کچھ زیادہ نمایاں ہو گئے، چنانچہ وہ اشیا کی ظاہری خوبیوں پر زیادہ نظر رکھتے تھے اور اُن جذبات کا اظہار نہیں کرتے تھے جو اُن کے دیکھنے سے خود ان کے دل میں پیدا ہوتے تھے مگر اس کے لئے وہ ادب کے دربار میں سزا کے مستحق نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ کیونکہ شاعری سے زیادہ اصلاح زبان اُن کا مطمح نظر تھا۔ اور جب ایک عنصر پر زور دیا جائے گا تو دوسرے عناصر کا مدھم پڑ جانا فطری ہے۔ لیکن اب شاعری کا داخلی پہلو زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے، چنانچہ آجکل لکھنؤ اور گرد و نواح کے شعرا جذبات کی تصویر کشی اور علم النفس اور فلسفہ کے دقیق مسائل کے حل میں مشغول ہیں۔ اور اب مضامین میں بھی کافی تنوع ہو گیا ہے۔ شاعری کے نظریہ میں بھی خاص تبدیلی ہو گئی ہے "جہانِ آرزو" میں حضرت آرزو لکھتے ہیں ؎

جو سخن ہو اک نیا پیغام ہو — وحی تو ممکن نہیں الہام ہو

اسی طرح اثر نے رسالہ ادب بابتہ ماہ جنوری ۱۹۳۱ء میں ایک مضمون کے دوران میں لکھا ہے:۔

"شاعری جذبات راستی و حسن افتدار کی انفعالی کیفیت کا اظہار ہے۔ بیکر جذبات کی روح رواں تخیل و تعقل ہیں۔ الفاظ میں توازن و تناسب اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب خیال میں یکرنگی کے ساتھ تنوع بھی ہو۔ تخیل کی جولانگاہ کل کائنات اور شاعری کا مقصود

روح میں انبساط کی لہر دوڑانا اور اس کا ارتفاع ہے۔ شاعری فطرت اور رسم و رواج کے درمیان رشتۂ اتحاد قائم کرتی ہے۔ یہ بھی شاعری کا فیض ہے کہ مادی اور روحانی عالم کے مشاہدات سے ہم یکساں لذت اندوز ہوتے ہیں۔"

اس مضمون میں ابتک وزن وتوانی کی سختیوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ آرزو نے اپنے دیوان جہان آرزو کے مقدمے میں شعر کے چار عناصر ترکیبی بیان کئے ہیں (خیال۔ الفاظ۔ انداز بیان اور وزن عروضی) اس میں وزن عروضی کو چوتھا درجہ دیا گیا ہے۔ اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہوا کا رخ کس طرف ہے، تاہم اس میدان میں ابھی تک پہلے ہی کی طرح ہو کا عالم ہے ہاں جب کبھی کوئی شاعر ہندی اوزان میں کچھ نظم کرتا ہے تو دلچسپی کا کچھ نیا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔

لکھنؤ اور جذبات | لکھنؤ کی خلقت ہمیشہ سے جذباتی مشہور ہے اور نزاکت تو اُن کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی نظر آتی ہے۔ اسی لئے شعرائے لکھنؤ کے کلام میں آداب گفتگو، نشست و برخاست وغیرہ کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ان پر تصنّع کا الزام بھی عائد ہوتا ہے، گو انھوں نے نزاکت طبع کے جا بیجا مظاہرے کئے ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے جذبات سے لاعلمی نہیں ہے

اس صدی میں بھی چکبست۔ رواں۔ عزیز۔ جوش۔ آنند نراین ملّا۔ حضرت صفی۔ شمیم کرہانی وغیرہ نے اپنی فلسفیانہ، مذہبی۔ قومی۔ اخلاقی اور سیاسی نظموں سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں ایک ہلچل سی مچادی ہے، اور اُردو شاعری کو دوسری قوموں کی شاعری کے دوش بدوش لاکر کھڑا کر دیا ہے اُن کے تمام جذبات میں اتنا تنوع ہے اور ہر جذبے کے متعلق اتنا لٹریچر فراہم ہو گیا ہے کہ اُن پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ فی الحال صرف اُن خصوصیات کا ذکر کر دینا مقصود ہے جو موجودہ ماحول کی پیدا کردہ ہیں۔

شعر اور جذبات کا باہمی ربط ایک واضح حقیقت ہے، ہمارا ہر فعل ایک جذبہ کا تابع اور ہر بات ایک جذبہ کے ماتحت ہے، مگر ہمارے اکثر جذبے غیر محسوس ہوتے ہیں اور ان کے بار بار طاری ہونے سے ان کا احساس فنا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے غیر محسوس جذبے شاعری کی بارگاہ میں باریاب نہیں ہو سکتے کیونکہ شاعری کو صرف ایسے جذبات کی ضرورت ہے جو اپنے اندر ایک برقی اور طلسمی کیفیت رکھتے ہوں اور جن کی انفعالی شان صاف طور سے نظر آرہی ہو۔ یہ جذبات مشاہدے اور فکر وغور سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے ہی ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں ہمارے دماغ میں تجزیہ کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ اس چیز کے مختلف اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور وہ

مل کر دل پر کیا متحدہ اثر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دل بیچین ہو کر بھک جاتا ہے اور ذہن میں ایک ایسی خیالی تصویر قائم ہو جاتی ہے جس کے حُسن و قبح پر بحث کرنے کا عقل کو موقع ہی نہیں ملتا۔

اشیار کی ماہیت دریافت کرنا شاعر کا کام نہیں بلکہ سائنس دانوں کا فریضہ ہے۔ شاعر تو شدّتِ جذبات سے اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی تحقیقات کر ہی نہیں سکتا ہے۔ اُس کا کام صرف اُن جذبات کا اظہار کرنا ہے جو اِن چیزوں کے دیکھنے سے اس کے دل پر طاری ہوتے ہیں، وہ وارداتِ قلبی کا ترجمان ہے جس کے لئے دیکھنے والی آنکھیں، سوچنے والا دماغ، محسوس کرنے والا دل اور وجدانی زبان درکار ہیں، جتنا ہی وسیع اور غائر اس کا مشاہدہ ہوگا قوتِ متخیلہ کے معدن بھی اتنے ہی گوہر خیز ہونگے، دل کا احساس جتنا ہی شدید ہوگا، اور زبان میں اس کے بیان کی جتنی کیف پرور صلاحیت ہوگی اتنا ہی شعر کامیاب ہوگا۔

جذباتی شاعری کی ان خوبیوں کا احساس اُردو شاعروں میں انیسویں صدی کے تیسرے ربع کے آخری دَور سے پیدا ہونے لگا ہے۔ جب اُردو زبان ترقی کی اس منزل پر پہونچ گئی تو لکھنؤ کے مردم خیز خطّہ سے انیس نے علم سرداری بلند کیا۔ انیس نے جذبات نگاری میں نفسیاتی سچائیوں کے بیان پر خاص طور سے زور دیا۔ اور ہم بیسویں صدی کے شعرار کے کلام میں بھی انھیں کی پیغمبرانہ تصویر کشی کا عکس دیکھ رہے ہیں۔

قدمار کے کلام میں مایوس کن یکسانیت پائی جاتی ہے، ہر شعر میں ایک ہی جذبہ یعنی جذبۂ یاس کارفرما نظر آتا ہے اور بس۔ لکھنؤ نے جب نفسیاتی حقائق پر زور دینا شروع کیا تو ہمارے شاعروں نے جہاں تک ہو سکا اس خطرے سے بچنے کی کوشش کی، اور اُنھوں نے شاعری کے رجائی پہلو کو بھی اُچھال اور منظر عام پر لاکر پیش کیا۔ چنانچہ لکھنؤ کے شاعروں نے کائنات کے ہر پست و بلند اور نیک و بد کا مطالعہ کرنا اور انھیں نظم کا جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ ان کے جذبات کے تنوع سے امید ہوتی ہے کہ اُن کی شاعری بہت دنوں باقی رہیگی۔ صفی نے اپنے ایک شعر میں اسی بات کو کھلے الفاظ میں نظم کر دیا ہے:-

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے ۔۔۔ دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

اب جب کبھی کوئی شعر سامنے آتا ہے تو یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں دلی جذبات کا اظہار ہے یا نہیں۔ اس قلبِ ماہیت کی وجہ یہ ہے کہ اب شاعروں کا ماحول تبدیل ہو گیا ہے جن کی نسبت جوش کو کہنا پڑا کہ ایسا شاعر ہونا چاہیئے کہ:-

راستے کا ذرّہ ذرّہ جس کو دیتا ہو صدا ۔۔۔ نظم کرتا جا مجھے بھی شاعرِ رنگیں نوا

کہاں تو زمانہ کی ناقدرشناسی کا دُکھڑا رویا جاتا تھا اور کہاں شاعر یہ کہنے لگے :۔

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اگر ماحول اس طرح نہ بدل گیا ہوتا تو یہ شعر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ :۔

جسے میں گُل سمجھتا ہوں لطافت میں نزاکت میں
مذاقِ عام گلشن کا اُسی کو خار کہتا ہے (اعظم کریوی)

مجھکو ادب نہ سر و ھو کے میں کہیں یہ حُسن بڑا ہی کافر ہے
اس جھوٹی دنیا میں مجھکو مغرور بنائے رکھیئے گا (آرزو)

نشۂ مے مانگے کی چیز اس کی بھی کوئی ہستی ہے
جوشِ جوانی کیا کہنا مستی اپنی مستی ہے (آرزو)

یا جیسا کہ اثر نے کہا ہے :۔

جنبش لبوں کو کیا ہوئی ساغر چھلک گیا پر کیف ہے شراب سی تقریر دیکھنا
وہ رات بھیگی ہوئی وہ کراہنا میرا ہر ایک وقت تو ایسا سماں نہیں ہوتا
جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی کچھ انھیں سے دل دیوانہ بہلتے دیکھا
جو سانس ہے رُکی ہے، جو آنکھ ہے لڑی ہے چھیڑا یہ آج کس نے افسانہ بیخودی کا
فلک کا بس نہیں جو چوم لے جھک کر قدم میرے زمینِ کوئے جاناں لے رہی ہے امتحاں میرا

صفی کے یہاں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں، مثال کے لئے صرف تین شعر ملاحظہ ہوں :۔

افسانۂ یوسف میں تصویر کے دو رخ ہیں اک دست بداماں ہے اک سر بگریباں ہے
کل ہم آئینہ میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کئے کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے
بزمِ عشرت کا وہ نغمہ جس پر اُن کو ناز ہے غالباً ٹوٹے ہوئے دل کی مرے آواز ہے

عزیز مرحوم کے یہاں بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں :۔

اے ناشناس اہلِ وفا میں ترے نثار کیا سوچتا ہے خوں بھری تلوار دیکھکر
اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

آرزو نے جذبات نگاری میں حیرت انگیز کمال بہم پہونچایا ہے، مثال کے طور پر چند شعر دیکھئے :۔

جوشِ جنوں میں وہ ترے وحشی کا جھینپنا بندا پنے ہاتھ سے درِ زنداں کئے ہوئے
لے ہوائے جاں فزائے خلد ہے یا کوئے دوست لے رہا ہوں سانس پر سانس آ رہی ہے بوئے دوست

کیا چھپے گا شوق کافر سے یہ پوشیدہ گناہ
دیکھ ہی لیتا ہوں آنکھیں بند کرکے سوئے دوست

نہ اک مذاق نہ اک جنس ہے نہ ایک زباں
ہوا ہے اور نہ ہوگا مزاج داں صیاد

الزامِ خامشی کیوں اُس نازآفریں پہ
بنتی ہے جنبشِ لب آکر شکن جبیں پر

سمجھا ہے اس جنبشِ لب کا منشا
ابھی دوڑتا خون ٹھہرا رہے گا

تاخیر کی بنیاد ہے خود عجلتِ بے جا
جلدی ہے جو لکھنے کی تو رُکتا ہے قلم اور

ٹوٹے چمک چمک کے ستارے اُمید کے
یہ ایک خواب تا بہ سحر دیکھتے رہے

بیخود موہانی کے دو شعر بھی اس ضمن میں قابلِ تذکرہ ہیں:-

ٹوٹی ہوئی ناؤ دیکھتا ہوں
دھارے کا بہاؤ دیکھتا ہوں

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

آلِ رضا نے کیا خوب کہا ہے:-

وہ پہلی چوٹ وہ احساس آمد آمدِ عشق
اُٹھا جو درد تو دل نے کہا مبارک ہو

طے ہو چکیں شکستِ تمنا کی منزلیں
اب اس کے آگے گریۂ بے اختیار ہے

سراج لکھنوی کے کلام کا عمق اور طرزِ ادا کی سلاست و روانی کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کے اشعار کے متعدد نمونے پیش کئے جائیں۔ افسوس اُن کے کلام کا مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا اس لئے صرف چ[ند] اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

جانے والے تری بیگانہ وشی کے صدقے
دیکھ ادھر دیکھ کہ ہم سے بھی شناسائی ہے

حسنِ خوابیدہ اُٹھا انگڑائیاں لیتا ہوا
فطرتِ بیدار ہے یا صبح کا ہنگام ہے

مجبوریاں ہیں ہمدم، ناچاریاں ہیں ناصح
ہم خود نہیں تڑپتے، تڑپائے جا رہے ہیں

ڈوبنے والے لب بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو روک
چادریں پانی کی ہیں، یہ دامنِ ساحل نہیں

رندی و مستی کے جذبات نظم کرنے میں لکھنؤ اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ جگر نے بھی اس موضوع [پر] قیامتیں برپا کی ہیں:-

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا شیشہ اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

اس سلسلہ میں جوش کی نظم "ناصحِ مشفق سے خطاب" ایک شاہکار ہے:-

تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ زنہار نہ پینا
یہ کیوں نہیں کہتے کہ خبردار نہ جینا

کس طرح نہ ڈوبی ہوئی نبضوں کو ابھاروں   کیونکر نہ جڑوں دل کی انگوٹھی پہ نگینا
کیا عقل ہے کہتے ہو مجھے مائل پستی   میں عرش پہ چڑھنے کو لگاتا ہوں جو زینا
واللہ کہ فیضانِ مئے ہوش رُبا سے   انسان کو انسان سے نہیں رہتا ہے کینا
دن کو بھی وہی عقل ہے شب کو بھی وہی ہوش   کوثر کی قسم موت سے بدتر ہے یہ جینا
کیا تھر ہی شب کو بھی نہ ڈھالوں مئے خوش رنگ   دن بھر تو بہاتا ہوں میں بیچارہ پسینا
واللہ اگر دوں نہ مئے ناب کے چھینٹے   جلتا ہی رہے شب کو بھی جلتا ہوا سینہ
تم کس لئے جلتے ہو اگر آتشِ تر میں   کھیتا ہے کوئی شخص جوانی کا سفینہ
اے ضابطۂ موسم و اوقات کے پابند!   مے خانہ کی ہر رات ہے ساون کا مہینا
واللہ کہ یوں مے سے دمکتا ہے دل جوش   الہام سے جس طرح جھلک اُٹھتا ہے سینہ

...کی افادی شاعری | لکھنؤ کی افادی شاعری کا ذکر کرنے سے پہلے ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ افادیت ...کیا مراد ہے. مختصر لفظوں میں وہ شاعری افادی کہی جا سکتی ہے جو کسی ایسے مقصد کو پیش نظر رکھکر ...لی ہو جس کا نتیجہ اُن لوگوں کے لئے فائدہ مند ہو جو شعر پڑھتے ہیں یا جن کے لئے وہ شعر کہا گیا ہے ...ز کچھ عرصہ سے فلسفیوں میں افادیت پسندوں (Pragmatists) کا حلقہ روز بروز ...یع ہو رہا ہے. ان لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ جو علم ہمیں عملی نتائج سے بے نیاز بنا دے وہ سچا علم ...ں ہے. اس نوع کے ادیب اور شاعر اس شاعری کو افادی شاعری کہتے ہیں جو کسی اخلاقی، ...شرتی یا سیاسی مقصد کو پیش نظر رکھتی ہو.

اس قسم کی شاعری کی ابتدا حالیؔ، آزادؔ اور اسمٰعیلؔ میرٹھی نے کی۔ اسمٰعیل میرٹھی نے اپنے نظریہ ...نی نظم "مروّجہ شاعری" میں وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں:-

سخنورانِ زماں کی بھی ہے یہی حالت   کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑیئے زنہار
سوائے عشق نہیں سوجھتا انھیں مضمون   سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اِک طومار
تمام اگلے زمانے کا ہے یہ پس خوردہ   کہ کر رہے ہیں جگالی وہ جسکو سو سو بار
نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگ حکمت و قدرت   نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش و نگار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصول موضوعہ   کہ جھوٹ موٹ کے بن جائیں ایک عاشق زار
صفت ہے دوست کی جلاد و ظالم و غدار   ستم شعار دل آزار، بے وفا، مکار
ہے لبروں کی بھی شامت نہ منھ رہا نہ کمر   بجائے زلف کے دو اژدہوں کی ہے پھنکار

غریب شیخ پہ ہر دم دو لتیاں جھاڑیں — کریں مساجد و کعبہ سے دُم دبا کے فرار
کہاں ہے ان کا ٹھکانا، کدھر ہے انکا مقام — وہی ہے بیت صنم اور خانۂ خمّار
کریں گے اس قدر ایمان و دین کی توضیح — کہ گویا ہیں کوئی ہفتاد پشت کے کفّار
اگرچہ ہاتھ میں تسبیح لب پہ ہو توبہ — بنیں گے شعر میں یاں مے پرست و بادہ گسار

نہ کچھ خدا کا لحاظ اور نہ انبیا کا ادب
یہ اُن کی کفر بھری شاعری خدا کی مار

یہ تحریک جس نے مولویوں کے آغوش میں جنم لیا آگے چل کر عام تحریک ہو گئی، مگر رفتہ رفتہ پرانے قدامت پرستوں نے پھر قدامت کی دیوی کے قدموں پہ پھول چڑھانے شروع کئے۔ اور اس تحریک کو جس کی ابتدا خود انھوں نے کی تھی نوجوانوں کے لئے چھوڑ دیا۔ اب اس بیسویں صدی میں اس پر ترقی پسند مصنفین نے قبضہ جما لیا ہے، اور اُمید ہے کہ یہ تحریک جدید ترین اصولوں کی تقلید کرتی رہے گی۔

اخلاقی شاعری اُردو زبان میں اخلاقی شاعری کا جو ضخیم مجموعہ موجود ہے اس کے سرسری مطالعہ کے لئے بھی کافی وقت درکار ہے۔ مگر اخلاقی نظریوں میں بھی روز بروز نئے اختلافات پیدا ہو رہے ہیں اور پرانے نظریے جنھیں لوگ کبھی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اب صرف چند بوڑھے پرستاروں کے حافظوں میں محفوظ ہیں۔ مگر اُن کی حکومت اُن نوجوان دلوں پر سے اُٹھ گئی ہے جن پر آنے والی دنیا کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ پہلے اکبرالہ آبادی کہا کرتے تھے کہ :۔

ہم ایسی کُل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

وہ یہ دُکھڑا رویا کرتے تھے کہ

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

لیکن آج نہ اُن کتابوں کی ضبطی کا کوئی طرفدار ملے گا اور نہ اس پردہ داری پر اصرار کرنے والا۔ اشعار میں قناعت، صبر، توکّل، خاکساری کے سبق دینے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب اس کی جگہ "خودی" کے احساس اور دنیا کی تلخ حقیقتوں پر صبر کر کے بیٹھنے کی جگہ زندگی کی جدوجہد میں زور شور سے حصہ لینے کی تلقین کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ

گو آفت و غم کے مارے ہیں — ہم خاک نہیں ہیں تارے ہیں
اِس جگ کے راج دُلارے ہیں
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم — (مجازؔ)

جہاں گذشتہ دور کے سے خیالات رکھنے والے شعراء یہ کہا کرتے تھے کہ:-

سرنگوں چار طرف گنبدِ مینائی ہے
واہ کیا حسن تقاضائے جبیں سائی ہے (مانی جائسی)

وہاں اب ہمارے شعراء یہ کہتے ہیں کہ:-

مذاقِ بندگی عصر کا تقاضا ہے نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر (جوش)

پہلے شعراء یہ سمجھتے تھے کہ اخلاقی اصول ترمیم و تنسیخ کے قابل نہیں، وہ اُن اصولوں کو الہام و وحی تصور کرتے تھے اور انہیں تبدیلی کے قائل نہ تھے، اگرچہ کبھی کبھی کوئی آواز ایسی بھی سنائی دیتی تھی کہ ع

"زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بساز"

مگر عموماً اس میدان کے سارے رہرو پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ اب اُن کی جگہ آرزو جیسے شاعروں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ماحول کا ایک خاص اثر ہے، اور ہر عمل کا ایک محل اور موقع ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ

جو ترے عمل کا چراغ ہے وہی بے محل ہے تو داغ ہے
نہ جلا کے بیٹھ اسے صبح سے نہ بجھا کے سو اسے شام سے

آج اعظم کے لئے یہ سوچنا اور یہ سوال کرنا ممکن ہو سکا ہے کہ:-

ملوں میں غیر سے طرزِ سلوکِ یار کہتا ہے
اب اس موقع پہ تو کیا اے دلِ خود دار کہتا ہے؟

ورنہ پہلے تو یہ تصور بھی شاعر کی اخلاقی دنیا میں گناہ تھا۔

پہلے شاعر ماضی کی یاد سے دل بہلاتے ہوئے کہتا تھا کہ:-

ریادِ ایام کہ بے رنگ تھی تصویرِ جہاں دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں (حالی)

مگر اب شاعر پریشان ہو کر کہتا ہے کہ:-

خلعتِ نو زندگانی کو پہنانا چاہیئے قصۂ ماضی کو اک دم بھول جانا چاہیئے (شمیم کرہانی)

غرض اخلاقی شاعری کا معیار بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے، اور خشک اخلاقی نظریئے فراموش ہوتے جاتے ہیں۔

آنند نرائن مُلا کا نام ایسے شاعروں کی فہرست میں سب سے پہلے لکھا جائے گا جو ہمارے سامنے ایک بلند معیارِ اخلاق پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں اپنے نظریوں کی تشریح بہت وضاحت سے کی ہے، یہ نظم ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، چند بند درج ذیل ہیں:-

جادۂ تاریک طے کر نورِ منزل دیکھکر بحرِ طوفاں سے گذ مینارِ ساحل دیکھکر

مثلِ مجنوں بھول جا صحرا کو محمل دیکھ کر — فکرِ رنج و حسرت کر جلوۂ دل دیکھ کر
آرزوؤں کو بنا لے ترجمانِ زندگی
اپنے دل کے ہاتھ میں دیدے عنانِ زندگی

جی میں آجائے تو صحرا کو بنا رشکِ چمن — مستقل اپنے ارادوں پر مثالِ کوہ بن
مشکلیں ہوں لاکھ آنے دے نہ ابرو پر شکن — ولولوں کو رکھ مثالِ بحرِ پیہم موجزن
عاشقِ صادق مآلِ شوق سے ڈرتا نہیں
رہروِ کامل کبھی مڑ کر نظر کرتا نہیں

خوں کے ہر قطرے سے پیدا کر شرارِ آرزو — اپنے سینے کو بنا اک کشتِ زارِ آرزو
زیست وہ اچھی جو ہو جائے نثارِ آرزو — دل وہی دل ہے رہے جو بے قرارِ آرزو
لب تمناؤں کے اپنے چوم اے دل بڑھ کے تو
آسماں سے توڑ لا تارے فلک پر چڑھ کے تو

مکتبِ ہستی میں اس کو خوگرِ تعزیر کر — دل کو دے درسِ جنوں اور قابلِ زنجیر کر
آرزو کی قبر پر امید پھر تعمیر کر — بندۂ تدبیر بن کر شکوۂ تقدیر کر
اپنی ہستی کی کمر کس اور خدا کا نام لے
زندگی کی جد میں ناکامیوں سے کام لے

اپنی صورت ناامیدی کو دکھانے ہی نہ دے — یاس کی محفل میں ارمانوں کو جانے ہی نہ دے
کچھ بھی ہو جوبن پہ لیکن میل آنے ہی نہ دے — آتشِ دل آپ حسرت سے بجھانے ہی نہ دے
نالۂ دل میں بھی اندازِ ترنم ہی رہے
مثلِ گل دل خون ہو لب پر تبسم ہی رہے

اسی طرح ملاؔ کی مشہور نظم "بیسوا" بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اُن کی دوسری نظموں میں بھی اسی طرح کی اخلاقی تعلیمات موجود ہیں لیکن اس جگہ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ ڈاکٹر علیم سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین نے ایک مرتبہ اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ " شاعری جب خطیبانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے تو اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ جب شاعر ناصحانہ انداز میں یہ کہنا شروع کرتا ہے کہ ہم کو یہ کرنا چاہیئے اور وہ نہ کرنا چاہیئے تو انسان کی آزاد اور مغرور فطرت بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ ملاؔ کی مندرجہ بالا نظم میں یہ بات ضرور پائی جاتی ہے۔ مگر دو وجہوں سے ہم انھیں قابلِ مواخذہ نہیں سمجھتے

ایک تو یہ اُن کی ابتدائی نظم ہے اور بعد کی نظموں میں انھوں نے اس بات کو محسوس کر کے اس سے احتراز کیا ہے۔ دوسرے ظاہر بیں نگاہوں کو تو یہ خطابت معلوم ہوتی ہے مگر جب غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں یہ جذبات عرصہ سے بھرے ہوئے تھے۔ یکایک وہ ان کی شدت سے مجبور ہو کر برس پڑا ہے۔ گو "آرٹ" کے معروف تخیل نے نظم کو خطابت کا رنگ دیدیا ہے۔

مولانا حسرت موہانی جنھوں نے اپنی زندگی سیاسی ہنگاموں میں بھی اسی طرح گزاری ہے جس طرح شعر گوئی میں۔ اس عہد کے ممتاز معلّم اخلاق مانے جاتے ہیں، اُن کے کلام میں ایک نیا فلسفۂ عمل و حرکت ملتا ہے، جو ذیل کے چند شعروں سے اچھی طرح واضح ہو جائے گا:۔

اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو　　ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمر کے صدیے سنا اہم نہ جان　　روشنی ضمیر سے عقل سے اجتہاد کر

حق سے بقدر مصلحت بھی جو کرے گریز　　اس کو نہ پیشوا سمجھ اُس پہ نہ اعتماد کر

خدمت اہل جور کو کر نہ قبول زینہار　　فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوشش ذات خاص پر ناز کر اعتماد کر

اگرچہ حسرت کے یہاں بھی اکثر پُرانے شاعروں کی طرح تلوّن مزاجی ہے جس کا ثبوت خود اُن کی سیاسی زندگی سے بخوبی ملتا ہے۔ چنانچہ یاس کی اس شدید مخالفت کے باوجود وہ مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، یہ شعر اُن کی اسی ذہنیت کی غمازی کرتا ہے کہ:۔

ہم نے یہ مانا کہ یاس کفر سے کمتر نہیں　　پھر بھی ترا انتظار دیکھئے کب تک رہے

جوش ہندوستانی زبان کے شاعروں میں "شاعرِ انقلاب" مانے جاتے ہیں لیکن بعض اوقات اُن کا نظریۂ اخلاق بھی امارت پسندوں کے نظریہ سے مشابہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اپنی نظم "چادر کی بھیک" میں وہ اُس سماج کے نظام کو تباہ کر دینے کے قابل نہیں بتاتا جو کڑکڑاتے جاڑے میں ایک بڑھیا کے لئے ایک چادر مہیا نہیں کر سکتا بلکہ اس پر ماتم کرتا ہے کہ خود اس کے پاس ایک چادر نہیں کہ اس بڑھیا کو اُڑھا سکے، مگر پھر بھی آخری شعر میں اُنھوں نے اپنے کو سنبھالا ہے اور ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے جو سوسائٹی کے لئے تازیانۂ عبرت ہے، یہ چھوٹی سی نظم خلاف معمول بہت سہل زبان میں لکھی گئی ہے، اس لئے اسے بھی نیچے نقل کرتا ہوں:۔

معاذ اللہ اس شدت کی سردی — نہیں چڑھتا کسی صورت سے پارا
ترشح ہو رہا ہے ہلکا ہلکا — دھوئیں میں گم ہے دریا کا کنارا
صدا یہ دے رہی ہے ایک بڑھیا — کہ بابا میں بہت ہوں بے سہارا
ہوائیں چل رہی ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی — اُڑھا دو کوئی اک چادر خدارا
مدد میں کر سکوں لے جو ش کیونکر — کہ خود گردش میں ہے میرا ستارا
فقط ہلکی سی اِس بڑھیا کو چادر — خُدایا، داورا، پروردگارا

احسان بن دانش جو پنجاب میں رہتے رہتے پنجابی سمجھے جانے لگے ہیں اصل میں یو۔پی، کے رہنے والے ہیں، اوران کی شاعری میں جہاں تک اندازِ بیان اور سلاستِ زبان کا تعلق ہے صاف طور پر لکھنؤ کی شاعری کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے بھی کئی اخلاقی نظمیں لکھی ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ کہیں بھی اُنھوں نے خطیبانہ رنگ اختیار نہیں کیا ہے۔ ان کی مشہور نظم "تین جنٹلمین" میں اُنھوں نے آدھی رات کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے

محوِ خواب ناز تھا جاگیرداروں کا غرور — اب نہ آتی تھی غلاموں کی صدائے جی حضور

لیکن ان کے ذہن میں بھی شرافت کے متعلق قدامت پرستوں کا خاص تصور قائم ہے۔ چنانچہ انھوں نے تین جنٹلمینوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ :۔

پھر گئی تھی ان کو قسمت ان بنوں میں چھوڑ کر — بیٹھ جاتی ہے شرافت جس جگہ دم توڑ کر
مفلسی کی ان چٹانوں سے تھا ان کا سامنا — جن سے ہو جاتا ہے مشکل دین و ایماں تھامنا

شاعر کے دل میں صرف شرافت ہی کے دم توڑنے سے درد نہیں اُٹھتا بلکہ اس کو یہ تصوّر بھی بڑا ڈراؤنا اور بھیانک معلوم ہوتا ہے کہ غریبی اتنی انتہائی حد کو پہونچکر انسان کو دین و ایمان سے بھی غافل کر دے گی۔ اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے پیش نظر انسانوں کی مفلسی سے اتنا متاثر نہیں ہے جتنا اس خوف سے کہ دین کی بقا مشکل ہو جائیگی۔ ان سب کے باوجود احسان کی جو چیز ان تمام لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہے وہ ان کا باغیانہ نظریہ ہے جو پنجاب کی فضاؤں میں اکثر دب تو جاتا ہے مگر جیسے شاعر چھپا بھی نہیں سکتا۔ اس کی جیتی جاگتی مثال اسی نظم کا یہ شعر ہے :۔

ملک والے یوں ہوں اپنے ملک میں روٹی سے تنگ
دیکھو چھڑ جائے نہ زرداروں میں اور بھوکوں میں جنگ

اس سلسلہ میں یہ کہنا غالبًا بیکار ہوگا کہ اُردو کے تمام شاعروں نے ایسے تمام مذہب پرستوں سے

اظہار بیزاری کیا ہے جو گندم نما جو فروش ہوتے ہیں۔ ریاکاری کو یہ لوگ بہت بڑا گناہ سمجھتے رہے
آثر نے کیا خوب رُباعی کہی ہے ؎

دوزخ دُنیا ہوئی ہے مکاروں سے　　شرمندہ معصیت ہے کرداروں سے
مذہب پردہ ہے جن کی غداری کا　　اللہ کی پناہ! ایسے دینداروں سے

تقدیر کا اعتقاد اور ایسا اعتقاد جو تدبیر سے بے نیاز کر دینے کی گھات میں رہتا ہو خدا جانے کہاں سے اُردو کے تمام شاعروں کے دماغوں پر مسلط ہو گیا ہے۔ آرم لکھنوی کا شعر ہے کہ

سعی ہے بیکار آؤ بیٹھ کر روئیں آرم　　پائے شل اُٹھتے نہیں اور دُور ہے منزل ابھی

یا اسی طرح آثر کی ایک رباعی ہے کہ

جو راہ چلے ہم وہی تقدیر چلی　　کشتی سوئے ساحل صفت تیر چلی
ناگاہ وہ طوفان حوادث اُٹھا　　تقدیر چلی اور نہ تدبیر چلی

مگر ان تعلیمات کے عام اور ہمہ گیر ہونے کے بعد بھی بھلا اسکی ہمت رکھتا ہے کہ وہ بلند آہنگی کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ ع "بندۂ تدبیر بن کر شکوۂ تقدیر کر"

اصلاح معاشرت اور شاعری جب سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ شاعری کا کام صرف دل کا بہلانا نہیں، بلکہ نوع انسانی کے لئے فائدہ پہونچانا بھی ہے اُس وقت سے کئی شاعروں نے معاشرتی اصلاح پر دھیان دینا بھی شروع کیا ہے۔ معاشرت کی اصلاح اسی فلسفہ کے ماتحت کی جا سکتی ہے جو سوسائٹی کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہو۔ ہاں اگر معاشرت میں اصلاح کی جگہ انقلاب پیش نظر ہو تو شاعر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ سماج کے مروجہ فلسفہ کی پابندی کرے۔ وہ آزاد ہے کہ جس فلسفہ کی چاہے تلقین کرے۔ ہندوستانی شعرا میں عام طور سے یہ ہمت مفقود رہی ہے۔ ادھر سات آٹھ برس سے البتہ زمانہ کی بدلی ہوئی ہوا نے انھیں کچھ جری بنا دیا ہے، مگر اب بھی اُن میں پوری طور پر جرأت نہیں آئی ہے۔ دو ایک مستثنیات ضرور ہیں مگر اس سے کوئی عام قاعدہ نہیں بن سکتا۔

معاشرتی اصلاح کا بیڑا سب سے پہلے حالی اور آزاد نے شعر کے ذریعے اُٹھایا تھا۔ اُن کا میدان عمل بہت تنگ تھا رفتہ رفتہ متاخرین اس دائرہ کو وسیع کرتے گئے اور چکبست کے زمانے تک تو گویا رُت ہی بدل چکی تھی۔ اُن کی نظم "پھول مالا" کو دیکھئے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:-

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے　　خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز
رُخ سے پردے کو ہٹایا تو بہت خوب کیا　　پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز

لیکن اسی کے ساتھ کس شد و مد کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ

خاک میں دفن ہیں مذہب کے پرانے کھنڈر تم یہ سوئے ہوئے فتنے نہ جگانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لَے جس میں سما ہی نہ سکے راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز

اکبر الہ آبادی اس کے خلاف جدت پسندوں کی ہر بات قابل مضحکہ سمجھتے تھے، یہی نہیں بلکہ وہ نیتوں پر بھی حملے کر جاتے تھے[1]۔ مثلاً کہتے ہیں کہ

کچھ غرض اور ہے احباب نہ اس شک میں رہیں بس یہ ہے شوق کہ پبلک کی جھکا جھک میں رہیں
نہیں منظور نمازوں میں گذاریں راتیں ہاں کمیٹی ہو تو اُلجھے ہوئے بک بک میں رہیں
نغمۂ مرغ سحر سے نہیں انجن کو غرض پیٹ انگاروں سے بھر لیجئے بھک بھک میں رہیں

جوش کی اکثر نظمیں اصلاح معاشرت کے نصب العین کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہیں، اُن کی نظم "ذاکر سے خطاب" اس اعتبار سے کامیاب ترین ہے، اس میں انھوں نے انقلابی نظریے پیش کئے ہیں، جب یہ نظم لکھی گئی تھی تو اخبارات کے کالم اس کے جواب میں سیاہ کئے گئے تھے اور منبروں کی بلندی سے بڑے غیظ وغضب کا اظہار کیا گیا تھا، مگر اس نظم نے خاطر خواہ نتائج پیدا کئے اور بڑی حد تک طرز ذاکری میں صحیح طریقہ کی اصلاح شروع ہو چکی ہے اسی طرح جوش نے اس رسم کا بھی مذاق اُڑایا ہے کہ جب ریل کسی دریا کے پل پر سے گزرتی ہے تو مذہبی لوگ دریا میں پیسے پھینک دیا کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ

اے مسافر! پل سے گنگا کے گزرتی ہے جو ریل پھینکتا ہے کس لئے پیسے یہ کیا کرتا ہے کھیل

جوش کو آج کل کے طالب علموں سے بھی شکایت ہے کہ انھوں نے "نسوانیت کی ہر رنگین ادا سیکھ لی ہے"۔ وہ نوجوانوں کو میدانِ عمل میں سرگرم کار دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کی "نسوانی معاشرت" کے سخت مخالف ہیں۔ اس موقع پر وہ بہت تند و تیز طنز سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

نازکی کا اقتضا پتلی چھڑی باندھے ہوئے شوق کنگن کا کلائی میں گھڑی باندھے ہوئے

اور وہ نوجوانوں سے سوال کرتے ہیں کہ ع "نالے میں قربان رن میں نکلو گے اسی انداز سے"

[1] کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حملے اکثر و بیشتر حق بجانب نہیں ہیں (ا۔ ق)

اپنی مشہور نظم "کمسن کے لئے موت ہے شوہر کا بڑھاپا" میں اُنھوں نے ہندوستان کی اس قبیح رسم کے خلاف بھی پورا زور قلم صرف کیا ہے کہ یہاں بعض اوقات شادی میں عمر کے تفاوت کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا، اور نوجوان لڑکیوں کی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا دیا جاتا ہے یہ رسم رفتہ رفتہ اُٹھتی جا رہی ہے پھر بھی ابھی باقی ہے اور اسی لئے جوش کو ایسی نظم کہنے کی ضرورت ہوئی۔ "فتنۂ خانقاہ" میں اُنھوں نے ریاکار صوفیوں کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے اور صاحبانِ فہم کو یہ غور کرنے کی دعوت دی ہے کہ کیا اس صورت حال کو اسی طرح باقی رکھنا چاہیئے؟

سیاسی شاعری سیاسی تحریکوں نے ہماری شاعری پر جو اثر ڈالا ہے اُس کا ایک مختصر سا خاکہ میں اس مضمون کے شروع میں پیش کر چکا ہوں، اب صرف اُن کے ارتقا سے بحث کرونگا۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے اس بیس سال کے قلیل عرصہ میں جس طرح ہندوستانی سیاست نے کئی رنگ بدلے ہیں اسی طرح شاعری بھی چولے بدلتی رہی ہے۔ ایک چیز جس کا میں نے مضمون کے حصۂ اول میں ذکر نہیں کیا ہے وہ مسلمانوں کا سیاسی رُجحان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان ابتدا سے ملک کی تحریک آزادی میں انفرادی طور پر شامل رہے، مگر اجتماعی طور پر وہ صرف تحریک خلافت ہی کے سلسلے میں کانگریس کے قومی پلیٹ فارم پر یکجا ہوئے۔ پہلے تو جو قوم سب سے زیادہ انگریزوں سے نفرت کرتی تھی اور جذبۂ انتقام سے لبریز تھی وہ مسلمان ہی تھے، مگر رفتہ رفتہ سرسید اور مولانا نذیر احمد کے سے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کو برطانیہ کی دوستی کا سبق پڑھانا شروع کیا، علی گڑھ کالج سرکاری حیثیت سے (Muslim mass contact Centre) مسلم رابطۂ عوام کا مرکز بن گیا، اس لئے دفتری حکومت کے اُلجھاوے میں پڑ کر پُرانی باتیں بھول گئے۔ لیکن خلافت کی تحریک کے سلسلے میں ہندوستان کے دونوں بڑے فرقوں نے برطانوی سامراج کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا۔ لیکن یہ تحریک چونکہ سیاسی سے زیادہ مذہبی تھی اس لئے مصطفےٰ کمال پاشا کے عزم واستقلال کو دیکھکر مسلم لیڈروں نے اس تحریک کی کامیابی سے مایوس ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس عرصہ میں مسلمانوں کی اقتصادی اور سیاسی حالت انتہائی پستی کو پہونچ چکی تھی۔ یاس اور قنوطیت اُن کو گھیرے ہوئے تھی۔ فطری طور سے اقبال کے فلسفۂ خودی نے اور "پین اسلامزم" کی تحریک نے انھیں اپنا گرویدہ بنانا شروع کیا۔ لیکن عوام کی حالت اقتصادی حیثیت سے روز بروز گرتی ہی جا رہی ہے۔ اس لئے اب اِن نغموں میں بھی اُن کے لئے دلچسپی کا کوئی سامان باقی نہیں رہ گیا اور وہ کھلم کھلا ایسے پلیٹ فارم پر جمع ہونے کے لئے تیار ہیں جو سامراجی

نظام اور سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے میں اُن کا مددگار ثابت ہو۔ یہ تمام رجحانات صاف طور سے شاعری میں ظاہر ہیں۔

اکبر کی طنز سے بھری ہوئی ظریفانہ شاعری ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً برٹش راج کی خوبیاں بیان کرتے کرتے کس خوبی سے نظم کو ختم کرتے ہیں:-

جب اتنی خوبیاں موجود ہیں یہاں اکبر　　تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اسکے ٹیم فول بھی ہے

یا اس خیر خواہی کی وجہ کتنی نفسیاتی بتائی ہے جو برطانوی سامراج کو ہندوستان میں اپنے ماننے والوں سے بطور خراج ملتی ہے۔ اکبر کے نزدیک خیر خواہی وہ ہے جو اس لئے ہو کہ ہم جس کی خیر خواہی کرتے ہیں وہ اس کے قابل ہے، اس کے اعمال و افعال اور اس کا طریق کار اتنا پسندیدہ ہے کہ اس کی بد خواہی کا تصور بھی نہیں آسکتا۔ مگر یہ بھی کوئی خیر خواہی میں خیر خواہی ہے کہ صرف اس لئے حضور سرکار کرتے ہیں کہ اگر نہ کریں گے تو سزا بھگتیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات　　خیر خواہی وہ نہیں جو کہ ہو ڈر سے پیدا

یا اس بات کو کتنے لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ برطانوی سامراج کے حامی ہندوستانیوں کو تباہی کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اُن پر ایسا جمود اور بے حسی طاری کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ یہ محسوس بھی نہ کر سکیں کہ اُن کا گلا کاٹا جا رہا ہے ؎

قتل سے پہلے ہے کلوروفارم　　شکر ہے اُن کی مہربانی کا

اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ دوسری قوموں پر جب کوئی بیرونی طاقت اپنا قبضہ جمانا چاہتی ہے تو اس کے خلاف اَن تھک کوششیں کرتے ہیں مگر ہندوستانی خود اس غلامی کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ؎

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا　　طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

اکبر کو اس کا بھی صدمہ ہے کہ یورپ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام ایشیا کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور اس عظیم الشان براعظم پر بسنے والی ہر قوم نیند میں مست پڑی ہے ؎

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے　　کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی　　نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

وہ ہندوستانیوں کی غفلت کا ہر ایک جگہ ماتم کرتے ہیں، اُن کے آپس کے نفاق پر آنسو بہاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس سے بڑے بڑے کاموں کے لئے بنائے گئے ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر کٹ مرنا

یہ کہاں کی عقلمندی ہے ؎

بنائے ملت گری ہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا اُبھر رہے ہیں
کٹی اگر اتحادِ ملت ہوئیں رواں خونِ دل کی موجیں ہم اس کو سمجھے ہیں آبِ صافی نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں
قفس ہے کم ہمتی کا سیمیں پڑے ہیں کچھ پردہ ہائے رنگیں اسی پہ مائل ہے طبع شاہیں نہال ہیں یا نہ پر رہے ہیں

مولانا شبلی نعمانی زیادہ تر ایک نثار، مورخ اور تنقید نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں، اور عام طور پر لوگ یہ کم جانتے ہیں کہ وہ شاعر بھی تھے، مگر وہ شاعر تھے اور اُنھوں نے شاعری کے ذریعے بہت ہی مفید خدمتیں انجام دی ہیں۔ اُن کی نظمیں اکثر سیاسی ہیں اور اُنھوں نے دل کھول کر اپنے سیاسی خیالات کا نڈری سے اظہار کیا ہے۔ مثلاً "احرار" کے متعلق کہتے ہیں کہ

یہ اعتراض آپ کا بیشک صحیح ہے "احرار" قوم میں ہیں بہت خامیاں ابھی
چلتے ہیں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ گم گشتہ طریق ہے یہ کارواں ابھی
زود اعتقادیاں ہیں، تلوّن ہے، وہم ہے ہو جاتے ہیں ہر ایک سے یہ بدگماں ابھی
دل میں نہ عزم ہے نہ ارادوں میں ہے ثبات جھیلے نہیں، ہیں معرکۂ امتحاں ابھی
بے اعتدالیاں ہیں اور ادائے کلام میں باہر ہے اختیار سے اِن کی زباں ابھی
ہر دم ہیں گو مسائلِ ملکی زبان پر اِن میں سے ایک بھی تو نہیں نکتہ داں ابھی
یہ سب بجا درست مگر سچ جو پوچھیے جو کچھ کہ ہے یہ ہے اثرِ رفتگاں ابھی
چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں ایک اک قدم پہ پاؤں چھوٹے ہیں قیدِ سخت سے یہ سخت جاں ابھی
آئے کہاں سے قوتِ رفتار پاؤں میں کچھ بیڑیاں ہیں پاؤں کی بندِ گراں ابھی
غوں غاں ہے کچھ مباحثِ ملکی نہیں، ہیں یہ
اِک طفل ہے سیاستِ ہندوستاں ابھی

مولانا شبلی نے کئی برس پہلے مسلم لیگ کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہی آج بھی حرف بحرف صحیح نظر آتی ہے، جو کہہ گئے وہ پتھر کی لکیر ہو کر رہ گیا۔ اتنا زمانہ گزرا، فضا بدل گئی مگر مسلم لیگ نہ بدلی ان کی نظم اس قابل ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کیا جائے ؎

پختہ کاروں کے لئے آلۂ تسخیر ہے یہ نوجوانوں کو صلائے طمعِ خام بھی ہے
رہنمایانِ نوآموز کا ہے مکتبِ درس زینۂ فخر و نمائشگری عام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں محسنِ قوم بھی ہے، خادمِ حکام بھی ہے

رابطہ ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی — جس طرح صرف میں اک قاعدۂ ادغام بھی ہے
اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا ساماں ہے درست — ورقِ سادہ بھی ہے کلکِ خوش اندام بھی ہے
یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک گزارش ہے حضور — گرچہ یہ سوء ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے

ظریف مرحوم ظریفانہ شاعری کرتے تھے لیکن اسی طرز خاص میں سیاسیات کے نکتے بیان کر جاتے تھے۔ اُن کی نظم "افیونیوں کا رجز" بہت مشہور ہے جو انھوں نے جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء کے زمانے میں کہی تھی، اور چھپتے ہی اس قدر مقبول ہوئی کہ ہر زبان پر جاری تھی۔ اسکے چند شعر یہ ہیں

ہم لوگ ہیں افیونی جب رنگ جما دیں گے — جرمن ترے نشے کو مٹی میں ملا دیں گے
برلن ہی میں دم لیں گے واللہ جو چڑھ دوڑے — افیون کے مشکی کی جب باگ اٹھا دیں گے
تو ہم سے بہادر یا ہم تجھ سے بہادر ہیں — پینک سے ذرا چونکیں پھر تجھکو بتا دیں گے
میکسم اسے سمجھے گا لشکر ترا اے جرمن — ہم ڈیڑھ خمے حقے کی گڑگڑ جو سنا دیں گے
ہے گولیاں کھانے کی دن رات ہمیں عادت — افیون کی ڈبیا تو دیکھے تو دکھا دیں گے
سرکار کے دشمن کو ہم کوس کے کھا لیں گے — اور اپنے تصور سے نام اسکا مٹا دیں گے
رستم سے سوا طاقت ہو جائے گی ہم سب میں — جب چائے میں بالائی تھوڑی سی ملا دیں گے
اتنے تجھے ہم ڈھیلے ماریں گے ابے جرمن — خاکی تری وردی کو مٹی میں ملا دیں گے
لا اپنے کروزر کو دیکھیں تو وہ کیسا ہے — ہم گومتی میں ڈونگیا پر چڑھ کے بھگا دیں گے
بلجم سے کہو تیرا جب ملک ملے تجھکو — ہم اندہ ہمدردی کچھ اور بڑھا دیں گے
وعدوں کو ہمارے تو سچ جان کے چیکارہ — لے تو سہی برلن بھی ہم تجھ کو دلا دیں گے
ہم روس سے ناخوش تھے اب اس سے بہت خوش ہیں — ٹھیکے پہ جو آئے گا افیون پلا دیں گے
شاباش ہے اے اٹلی لینا تو مرے شیرا — جرمن سے لڑے جانا ہم لوگ دعا دیں گے
ترکوں سے کوئی کہدو کیوں لڑتے ہو اے آغا — تم جان اگر دو گے جرمن تمھیں کیا دیں گے
جن لوگوں کے کہنے سے تم جان گنواتے ہو — بھیا یہی سب مل کر اک روز دغا دیں گے

واللہ، ظریف ایسا لکھا یہ رجز تم نے
ہم سب کا ارادہ ہے چندہ سے صلہ دیں گے

اِس نظم میں ظریف نے ۱۹۱۲ء کی سیاسیات پر بڑی خوش اسلوبی سے تبصرہ کیا ہے، یہ ادب اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے جس کی نظیر ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی۔ بہرحال ظریف لکھنوٗ ہی کے شاعر تھے۔ اسی زمانے میں ظریف مرحوم کے بڑے بھائی مولانا صفیؔ لکھنوی نے وہ شہرہ آفاق نظم لکھی جو ہر زبان پر جاری ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے اور اُن احساسات کا اظہار کیا ہے جو اس وقت ہر مسلمان کے دل میں موجود تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت مسلمانوں کا سیاسی رُجحان کیا تھا ؎

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو دکھا دیں گے　مشرق کا سرا اُٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے ہیں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہیں　بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ　شعلے بھڑک اُٹھیں گے دامن جو ہوا دیں گے
ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن　وقت آنے دو وقت آتے پھر تم کو بتا دیں گے
فاران پہ گرجے تھے، برسے تھے جہاں بھر میں　گھر کر جو کہیں کڑکے طوفان اُٹھا دیں گے
مرجھائی ہوئی کھیتی ہم اب ہیں تو کیا غم ہے　چھینٹے ہمیں رحمت کے پھر نشوو نما دیں گے
جڑ ہم نے پکڑ لی ہے کلّے نئے پھوٹیں گے　گر خاک میں بھی ہم کو اِک بار ملا دیں گے
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے　اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں　یہ صور جہاں پھونکا مردوں کو جلا دیں گے

اے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ تو ہو گا
یہ نظم صفیؔ پڑھ کر ہم اس کو سنا دیں گے

اس زمانے کی باتیں اسی زمانے کے ساتھ گئیں، بعد کی نظموں میں یہ بات نہیں ملتی۔ تحریک آزادی کو شاعر رفتہ رفتہ اس کے صحیح مفہوم میں سمجھنے لگے۔ اب محض برطانیہ کی مخالفت سے اُن کی تشفّی نہیں ہوتی تھی بلکہ اب وطن دوستی کا سچا جذبہ اور آزادی کی سچی محبت اُن کے کلام کا جزو بن گئی۔ چکبست نے اپنی "ہوم رول" والی نظم میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے، مثلاً:

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رُول کے بدلے

اس تحریک نے آگے بڑھ کر کچھ اور رنگ بدلا اور آزادی کی خیالی تصویروں نے رفتہ رفتہ عملی جامہ پہننا شروع کیا۔ عوام سے ربط بڑھانے کے سلسلے میں رہنمایانِ وطن کو سماج کے نظام میں

ایک عظیم الشان انقلاب کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ تحریک اشتراکی بن گئی چنانچہ یہی انقلاب آجکل کے تمام شاعروں کی سیاسی نظموں کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس وقت بھی اکثر شعرا آزادی کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہیں۔

اس سلسلہ میں مجھے آل احمد صاحب سرور کا مضمون "جدید اردو شاعری کے بعض میلانات" یاد آتا ہے جس میں انہوں نے جوش کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ صحیح معنوں میں انقلابی نہیں اور انقلاب کے ظاہری اور غارت گر پہلو سے خوش ہوتے ہیں، ان کی نظر اس خاک و خون سے گزر کر آنے والے سماجی نظام اور اس کے غیر معمولی حسن تک نہیں پہنچتی جس کے سامنے خاک و خون کا کھیل کوئی وقعت نہیں رکھتا۔" وغیرہ وغیرہ۔ موجودہ شاعری پر ایک حد تک میرا اعتراض بھی ہے کہ وہ انقلاب کے جذباتی پہلو زیادہ اجاگر کر دیتی ہے، مگر اس حسن سے سروکار نہیں رکھتی جو انقلابی نظریوں اور ادب کے ہم آغوش ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے، تاہم میری نظر میں سرور صاحب کے اعتراض کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔

درحقیقت موجودہ سماجی نظام اتنے عرصہ سے قائم ہے اور اپنے لئے ایسی ہموار فضا پیدا کر چکا ہے کہ اس کا اس وقت تک خاتمہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ دو اقتصادی قوتیں یعنی سرمایہ اور مزدوری مع اپنے تمام متعلقات کے ایک دوسرے سے سرگرم پیکار نہ ہولیں یہ خود انقلاب نہیں بلکہ انقلاب کا پیش خیمہ ہوگا۔ بہرحال شاعر اس بارے میں اس وجہ سے مجبور ہے کہ اس کی دنیا جذبات کی دنیا ہے۔ اس لئے وہ خاک و خوں میں غلطاں مناظر سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ مگر وہ روتا نہیں، بلکہ ایک انقلابی کی طرح خوش ہوتا ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کے فلسفہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر میری ناچیز رائے میں اقبال کی آخر عمر کی شاعری میں فلسفہ زیادہ ہے اور شاعری کم ہے۔

میں اس شاعری کے لئے ان شاعروں کو معاف کرنے کا طرفدار نہیں ہوں جو اب میدان میں آرہے ہیں۔

جوش جب یہ کہتا ہے کہ

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
دیکھکر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے
موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے

تو اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ:۔

قسم اس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے

اٹھو وہ صبح کا غرفہ کھلا، زنجیرِ شب ٹوٹی وہ دیکھو پو پھٹی، غنچے کھلے، پہلی کرن پھوٹی
اُٹھو، چونکو، بڑھو، منھ ہاتھ دھو، آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو

سرور صاحب شاید ایک نظم میں شاعر کا مکمل فلسفہ ڈھونڈھتے ہیں۔ حالانکہ کسی نظم سے زیادہ "مکمل" دنیا میں کوئی چیز نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر علیم صاحب کا بھی خیال ہے کہ آج کل کی اُردو شاعری میں "مرثیہ" زیادہ ہوتا ہے اسی لئے یہ شاعری ہم میں جذبۂ ہمدردی تو پیدا کر دیتی ہے مگر وہ غم نہیں پیدا کرتی جو اس نظام کے مٹانے پر ہم کو آمادہ کر دے۔ لیکن عام طور سے موجودہ دَور کے نوجوان شعراء میں یہ بات نہیں ہے۔ مثال کے لئے جوش کی نظم "کسان" اور مجاز کی نظم "مزدور کا گیت" کافی ہیں۔

غرض اِن تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھکر جب لکھنؤ اور نواحِ لکھنؤ کے شعراء کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے تو لکھنؤ اسکول اور لکھنؤ کے شعراء کے خلاف پروپیگنڈے کی حقیقت کھل جاتی ہے اگرچہ کہنے والے اب بھی کہہ سکتے ہیں

ممکن ہے کہ تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں
اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا

قندِ پارسی

(از حضرت طالب دہرہ دونی)

تا حسنِ تو بکشورِ خوبی علم زدہ یکسر بنامِ جملہ حسیناں قلم زدہ
خال سیہ است بر رخِ نیکوئی آں نگار یا شاہِ حبش خیمہ بباغِ ارم زدہ
گردید گرد بادِ صبا در ہوائے او تا دستِ خود بطرۂ پُرپیچ و خم زدہ
خوں ریخت و جاں گرفت زعشاقِ اہلِ دل ایں طرّہ رہزنیست کہ راہِ عدم زدہ
ساید تمام عمر بآں سنگِ آستاں کلکِ قضا جبینِ مرا چوں رقم زدہ
برپا شدہ است حشر کہ بر خاکِ من زناز آں سرو ناز فتنۂ محشر قدم زدہ
پرسی چہ حالِ طالبِ بیکس کہ کیست ایں آوارہ خانمان و غریب است و غم زدہ

"شبنم"

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بی۔ اے ایل ایل بی)

بدل رہا ہے دوبارہ نظام عالم کا — اُڑے گا دم میں پھریرا سحر کے پرچم کا
ستارہ خاک نشینوں کا ماہوشں چمکا — بساطِ حُسن میں سکہ رواں ہے شبنم کا

ازل سے وقفِ تمنائے دُر فشانی ہے
جواب بحر ہے کہنے کو بوند پانی ہے

متاعِ ہستی بے بود کھونے آتی ہے — گلوں کی مانگ میں موتی پرونے آتی ہے
جبینِ نور کو اشکوں سے دھونے آتی ہے — مآلِ حُسن پہ ہر صبح رونے آتی ہے

جڑے ہوئے ہیں نگینے سے چشمِ پرفن میں
چھٹک رہے ہیں ستارے سے باغ کی بن میں

وفورِ شوق میں سجدے بچھائے جاتی ہے — وفا کے نام پہ آنسو بہائے جاتی ہے
مگر گلی ہے کہ دامن بچائے جاتی ہے — کس اعتبار پہ ہستی مٹائے جاتی ہے

سپردِ خاکِ چمن عشق کا خزانہ ہے
ہنوز تشنۂ تکمیل یہ فسانہ ہے

شرابِ آتشِ گل تیز تر ہے پانی سے — کہ مل رہی ہے گلے کمسنی جوانی سے
پڑی ہے اوس سی شبنم پہ بدگمانی سے — تمام اشک ہے سوزِ غمِ نہانی سے

یہی سزا ہے حسینوں سے دل لگانے کی
ہزار حیف کہ دنیا میں ہے خطا نیکی

ولی گجراتی تھے یا دکنی؟

سید ظہیر الدین مدنی۔ ایم۔ اے

شاہ ولی محمد کے دکھنی اور گجراتی ہونیکا جھگڑا بہت پرانا ہو چکا ہے لیکن اسقدر دلچسپ ہے کہ اس بحث لطف سے خالی نہیں۔ ولی پر ہر مضمون سے اسکی وطنیت پر ایک نت نیا پہلو نکلتا ہی ولی کے دکن یا گجراتی ثابت کرنے کے لئے کوئی مضمون نگار قیاس سے کام لیتا ہے کوئی اسکی زبان کو ثبوت میں لاتا ہے اور کسی کو جذبہ وطنیت کھینچے لئے جاتا ہے۔ لیکن لکھنے والوں نے زیادہ تر اس کو دکھنی ثابت کرنے میں اُن کی زبان ہی کو دلائل کا مرکز بنایا ہے۔

میری نظر سے آجتک جتنے تذکرے اور مضامین گذرے انہیں سے زیادہ تر ولی کو دکھنی بتلاتے ہیں۔ لیکن ان مضمون نگاروں نے جس چیز پر دلائل کی بنیاد رکھی ہے وہ گلے سے نہیں اترتی اور دل چاہا کہ میں بھی اسکی تہ تک پہونچنے کی کوشش کروں۔

شکر خدا کا کہ ولی اپنے مذہب وملت پیر و مرشد کے متعلق ایسی ایسی باتیں کہہ گئے ہیں کہ انکے سنت جماعت ہونے اور زبدۃ العارفین قطب الواعظین علامہ شاہ نور الدین اور شاہ وجیہ الدین صاحبان کے عقید تمند ہونے میں کسی کو شک وشبہ ہو نہیں سکتا۔ ورنہ خدا معلوم اسپر بھی کیا کیا بحثیں ہوتیں۔

میں صرف زبان کا پہلو پیش کرتا ہوں جسکو جناب احسن مارہروی مرحوم اور دیگر فاضل مضمون نگاروں نے ولی کے دکھنی ہونے کی سند میں پیش کیا ہے جناب احسن کلیات ولی شائع کردہ انجمن ترقی اردو میں لکھتے ہیں۔

> بارہویں صدی ہجری کے تمام تذکروں میں جنکو ان حالات سے زیادہ قربت زمانی حاصل ہے ولی کو دکھنی اور اورنگ آبادی لکھا گیا ہے۔ اس صورت میں متاخرین کا بغیر کسی کافی ثبوت کے احمد آبادی یا گجراتی لکھدینا ناقابل تسلیم ہے۔
>
> چونکہ ولی کے تمام اہم واقعات گم ہیں اسلئے قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ صوبہ گجرات میں، طالبعلمی کے سوا کسی سلسلۂ معاش و ملازمت نے زیادہ یا تمام عمر قیام رکھنے پر مجبور کیا ہو اور اس طرح

احمد آبادی مشہور ہو گئے ہوں ۔ (اصل وطن ۔ صفحہ ۱۵)

مندرجہ بالا سطروں سے احسن صاحب کا یہ خیال مترشح ہوتا ہے کہ ولی نے اپنی عمر کا کچھ حصہ گجرات میں بسر کیا اور غالباً اس وجہ سے وہ احمد آبادی مشہور ہو گئے ۔ لیکن کیا اس قیاس کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ ولی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ دکن میں بسر کیا ہو اور اسطرح دکھنی مشہور ہو گئے ہوں اور شاید یہی وجہ ہو کہ ان کے کلام میں چند دکھنی محاورے اور الفاظ پائے جاتے ہیں ۔ ولی کا دکن میں عمر بسر کرنا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ جس ملک میں شاعر، عالم، ہنرمند وغیرہ کی قدر ہوتی ہے وہیں وہ جاتے ہیں ۔ جب کسی انقلاب حکومت کی وجہ سے ملک کو خیرباد کہتا ہے جیسطرح مصحفی امروہہ سے دلی اور لکھنو چلے گئے ۔ اسیطرح ولی بھی شاید گجرات چھوڑ کر دکن گئے ہوں ۔ میر صاحب بھی کچھ عرصہ کے لئے دلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے ۔ اسیطرح ولی بھی گجرات چھوڑ کر دکن گئے ہوں گے ۔ انکی کشش کے لئے آزاد ۔ سراج جیسی ہستیاں موجود تھیں اگر اسوقت کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ گجرات میں خانہ جنگیاں اس حد تک بڑھی ہوئی تھیں کہ چند شریف خاندانوں نے گجرات کی سکونت کو ترک کر دینا ہی مناسب سمجھا ۔ لہذا علامہ شاہ وجیہ الدین صاحب کے پوتے شاہ اسداللہ گجرات چھوڑ کر بیجاپور تشریف لے گئے ۔ شاید اسیطرح ولی بھی دکن گئے ہوں گے اور دکھنی لب ولہجہ میں غزلیں کہی ہوں ۔

آگے چل کر جناب احسن نے کلیات ولی میں "ولی یقینی دکھنی ہے" کی سرخی کے تحت چند اشعار اور چند محاورے دیئے ہیں اور کلیات کے صفحہ ۱۰۲ پر تمام ایسے محاورے علیحدہ دیئے ہیں جو دکن کے سوا کہیں نہیں بولے جاتے ہیں ۔ میں انہیں سے چند قابل اعتراض محاورے پیش کرتا ہوں ۔

دسنا ۔ بونا ۔ انکھاں ۔ پلکاں ۔ ہور ۔ نکو ۔ باتاں ۔ تجھ سری ۔ انجھو ۔ چاکھا ۔ نین ۔ جن نے ۔ ان نے من ۔ اپس ۔ کنے ۔ واہنچ ۔ ہنچ ۔ اتا ۔ ادایاں ۔ جھاڑ ۔ اجھو لگ ۔ انہوں کو ۔ پروانگی ۔ چپ ۔ کدھی ناخون ۔ پونچھ ۔ بگی ۔ وغیرہ ۔

یہ ان چند محاروں کو جناب احسن نے دکن میں سنا اور یہ حکم لگا دیا کہ یہ دوسرے صوبوں میں نہیں بولے جاتے ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاید جناب احسن گجرات تشریف نہیں لائے ورنہ یہ خیال رفع ہو جاتا ۔ اور ولی کو دکھنی ثابت کرنے کے بجائے وہ اسے گجراتی ثابت کرتے ۔

لیوائی ۔ دسنا ۔ بگی ۔ نکو اور جیب تمام محاورے گجرات کے دیہاتوں میں اور بڑے شہروں میں زبان زد عام ہیں ۔ اور نہایت بے تکلفی سے استعمال کئے جاتے ہیں اور اسکی سند یہ ہے کہ ۱۹۳۹ء میں

جناب مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو دہلی اور جناب پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی گجرات کے دورے پر تشریف لائے تھے اور جب سورت سے قریب مقام ہانسوٹ میں مولوی صاحب نے وہاں کے لوگوں کی تقریریں سنیں تو فوراً فرمایا کہ یہ قدیم اردو کا نمونہ ہے۔

اسکو بالفاظ دیگر اسطرح کہا جائے کہ گجرات کے گاؤں میں ابتک ولی کی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اب ولی کے چند گجراتی ہمعصروں کا کلام ملاحظہ فرمائیے۔

احمدی		رہے نادر خیالاں میں ملے شوریدہ حالاں میں
ہوئے صاحب کمالاں میں کدہر آکر کدھر نکلے

ذیل کے اشعار نازنی پٹھان قصہ میں سے لئے ہیں یہ قصہ کسی شخص نے جسکا تخلص حامد تھا ۱۱۹۶ھ سے ۱۱۹۸ھ تک میں منظوم کیا ہے۔

ارے خان ایوی نہ کربات انے		نہ کربات ایوی تو کیسر کنے
اگر مل کریں کافراں قیل وقال		شہر سے میں وونکا انھوں کو نکال

اب ذرا غور فرمایئے۔ جناب احسن فرماتے ہیں:-

بعض الفاظ گجرات ودکن میں ضرور مشترک ہو سکتے ہیں۔ مگر اس شاذ اشتراک کو کثرت اختصاص پر ترجیح دینا تحقیق کا خون کرنا ہے (اصل وطن۔ صفحہ ۱۵) ناظرین اب شاذ اشتراک اور کثرت اختصاص پر غور فرمائیں۔ جناب احسن کے الفاظ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ولی گجراتی تھے کیوں کہ ولی کے کلام میں صرف تین محاورے خالص دکھنی ہیں اور باقی سب کے سب مشترک ہیں جو اسوقت تو کیا آج بھی بولے جاتے ہیں۔

رہا اب سوال گنگری کا جوڑا "ونگر کریلہ وھار چوتی" کا تو یہ ولی نے دکن میں سنا ہوگا اور ایک نادر چیز سمجھ کر شعر میں کھپایا ہو۔ اکثر شعرا دیگر صوبوں کی نادر چیزوں کا ذکر کرکے آخیر میں نوٹ لگا دیتے ہیں۔

جناب احسن فرماتے ہیں اسیطرح ایسے بعض اشعار جن میں کسی تخیل خصوصیت سے سحر بنگالہ یا شہر سورت اور دلی کی جمنا کا ذکر آگیا ہو۔ ان کو پڑھکر جیسے گارسان دی تاسی کی طرح یہ سمجھ لینا کہ اسکا قائل سورت دہلی یا بنگال کا رہنے والا ہے ایک لاطائل خیال اور بے سوچا بات ہے (اصل وطن صفحہ ۱۵)

ناظرین غور فرمائیں کہ جب گارسان دی تاسی کو سورتی۔ دہلوی یا بنگالی سمجھنے کا حق نہ تھا

تو دوسروں کو ولی کے دو چار محاورے اور گجگری کا جوڑا اور کریلا دھار چوٹی پر سے یہ حکم لگا دینے کا کیا حق تھا کہ ولی دکنی ہے۔

جناب احسن نے غزل نمبر ۲۵-۳۶-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۴-۵۴-۶۶-۷۷ اور ۷۸ پر حکم لگا دیا ہے کہ یہ خالص دکنی محاوروں میں ہیں۔ لیکن باستثنائے ۲۵-۳۶-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱ سب محاورے اتبک گجرات میں بولے جاتے ہیں۔ جناب احسن صفحہ ۵۹ پر نوٹ میں فرماتے ہیں کہ مندرجہ بالا نمبر کی غزلیں خالص دکنی محاوروں میں ہیں۔ نیز یہ بھی آپکا قیاس ہے کہ شاید یہ غزلیں کسی اور قدیم شاعر کی غزلیں دیوان ولی میں شامل کر دی گئی ہوں۔

یہ قیاس درست بھی ہو سکتا ہے لہذا اس قیاس کی بنا پر ولی کو دکنی نہیں کہہ سکتے تاوقتیکہ کہ ولی کا صحیح کلام دستیاب نہ ہو۔ ولی کی مثنوی "در فراق گجرات" میں ولی کے اشعار سے مترشح ہے کہ ولی گجرات سے دکن گئے، تو ان کو اس کے چھوڑنے کا بہت غم ہوا۔ اور اسی بنا پر اپنے دل کو تسلی دینے کو مطلع میں فرماتے ہیں۔

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں ۔۔۔۔ پھر اسکے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

میری بحث صرف زبان پر تھی جسکے متعلق میں نے اپنے خیالات عرض کر دیئے جناب احسن ہر پہلو کی جانچ پڑتال کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ولی دکنی تھے اور میں یہ گذارش کرتا ہوں کہ اس پہلو کو اگر بغور دیکھا جائے تو ولی گجراتی ثابت ہوتے ہیں۔

لطف کلام

(حضرت لطیف انور گورداسپوری)

ہے ابھی دل میں درد کا آغاز ۔۔۔۔ بیٹھی جاتی کیوں مری آواز
شمع جل جل کے بجھ گئی آخر ۔۔۔۔ مرگ پروانہ کا تھا یہ انداز
زحمت دام گستری نہ اٹھا ۔۔۔۔ کب بدلتی ہے فطرت شہباز؟
مشکل زیست ہو گئی آساں ۔۔۔۔ اے غم عشق! تیری عمر دراز
دام ہو یا قفس ہو یا گلشن ۔۔۔۔ میری فطرت ہے ہر جگہ پرواز

شاد کیا ہوا ابھی تو ہیں اے نور
راہ میں اور کچھ نشیب و فراز

پروانہ

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ، بی۔اے، ایل ایل بی وکیل شاہجہانپور)

اے کہ تو روزِ ازل سے محوِ روئے شمع ہے
خرمنِ ہستی کو تیرے جستجوئے شمع ہے

انجمن میں اے حریصِ لذتِ آزارِ دوست
خاک کر دیتی ہے تجھکو آتشِ رخسارِ دوست

گرچہ پیغامِ اجل ہے شمع کی اُلفت تجھے
رخصتِ فریاد بھی دیتی نہیں غیرت تجھے

بوالہوس ہوتے ہیں نالاں دوست کی بیداد سے
پختہ مغزانِ جنوں بیگانہ ہیں فریاد سے

دہر میں تو در حقیقت رازدانِ عشق ہے
تیرے مذہب میں خموشی ترجمانِ عشق ہے

جانِ دیگر لُطفِ اندوزِ بقا ہوتا ہے تو
اللہ اللہ شمع کے آغوش میں سوتا ہے تو

تجھکو حاصل ہے سکوں آرام گاہِ یار میں
بلبلِ شوریدہ سر محوِ فغاں گلزار میں

تیرا سینہ اضطرابِ شوق کا گنجینہ ہے
تو بھی انساں کی طرح اِک عاشقِ دیرینہ ہے

آہ یہ ضبط و تحمل یہ خموشی کی ادا
دل کو برماتی ہے تیری جاں فروشی کی ادا

عشق کے عالم میں غوغا بے زبانی سے تری
گرمیِ بازارِ الفت بے نشانی سے تری

اے قتیلِ خنجرِ غم اے شہیدِ بے زباں
داب و آدابِ محبت تو نے سیکھے ہیں کہاں

ایک ناکس اور گہر آمائے اسرارِ وفا
ایک ناچیز اور یہ آشوبِ غم کا حوصلا

قلب تیری بیخودیِ شوق پر قربان ہے
ایک میں کیا، انجمن کی انجمن حیران ہے

تیرے اندازِ جنوں ہیں اس قدر حیرت فزا
یہ گماں ہوتا ہے تو انساں سے بازی لے گیا

اِس ستائش سے نہ اے ناداں ہو سرمستِ غرور
تیری حدِ وسع سے انسان کی منزل ہے دور

اس کے رُتبے کو پہونچنا واقعی دشوار ہے
بیخودی کے واسطے کچھ ہوش بھی درکار ہے

بخش دیتی گر تجھے فطرت مذاقِ آگہی
کشورِ الفت کی مل جاتی تجھے شاہنشہی

اے کہ تو ہوش و خرد سے دہر میں بیگانہ ہے
نامکمل تیری الفت کا ابھی افسانہ ہے

بزمِ عالم میں ہے تو جاندادۂ حسنِ مجاز
تیری نظروں سے ہے پنہاں جلوۂ معنی کا راز

شمعِ روشن سے ہے محفل میں پُرافشانی تری
حُسنِ صورت کی طرح الفت بھی ہے فانی تری

شمع روشن سے ہے محفل میں پرافشانی تری
حسنِ صورت کی طرح الفت بھی ہے فانی تری

شمعِ کشتہ کی محبت سے تجھے پرہیز ہے
طلعتِ شمعِ فروزاں اشتیاق انگیز ہے

گو فروغِ شمع کی ہے زندگانی ایک رات
عشق پر لازم نہیں پابندیِ مرگ و حیات

اے کہ تو اک عمر سے ہے دامِ صورت میں اسیر
از زنِ ہندو طریقِ عشقِ صادق یاد گیر

آرزو جس طرح مٹتی ہے دلِ مضطر کے ساتھ
خاک ہو جاتی ہے وہ بھی قالبِ شوہر کے ساتھ

قابلِ عزت جہاں میں یوں تو ہر دیوانہ ہے
شمعِ کشتہ پر جو قرباں ہو وہی پروانہ ہے

ابرِ نوبہار

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے ایل ایل بی)

نمود ہے سحاب کی نگاہِ بادہ بار سے
بھڑک رہی ہیں بجلیاں فروغِ لالہ زار سے

جوانیاں برس رہی ہیں ابرِ نوبہار سے
لپٹ رہی ہیں بدلیاں شعاعِ زرنگار سے

نگاہِ شوق لڑ گئی بہار میں بہار سے
ٹپک پڑی شرابِ حسن گل تو گل ہیں خار سے

مچل رہی ہیں شوخیاں چھلک رہی ہیں مستیاں
جلو میں آبشار کے کنارِ جوئبار سے

ٹپک رہی ہے بوند بوند شبنمِ نظر فروز
لٹک رہی ہیں شاخ شاخ موتیوں کے ہار سے

نکھر رہی ہے موبموئے ہزار رنگ و بو
جوانیِ بہارِ حسن حسن کے ابھار سے

ہر ایک موجۂ خنک لئے ہوا اپنی رو میں برف
کلی کلی ہے سیمتن ہوائے خوشگوار سے

چڑھا رہی ہے موج پر نشیب کوہسار کو
اتر رہی ہے چاندنی فرازِ کوہسار سے

یہ کچھ عجیب سیر ہے جگر کا حال غیر ہے
لگی ہے ایک آگ سی شراب کی پھوار سے

بُنیادی تعلیم

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

از مسٹر مبشر علی صدیقی، ایم۔ اے، بی۔ ٹی (علیگ)

افراد
- مہاتما
- ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم،
- ایک قومی تعلیمی ادارے کے پرنسپل،
- معلّم،

وقت:۔ آجکل کا زمانہ مقام:۔ ہندوستان

مہاتما:۔ بُنیادی طریقۂ تعلیم ملک میں مقبول ہو رہا ہے، بچّے اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ نئی روشنی کے معلّم اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں، قدامت پسند ناک بھوں چڑھاتے ہیں (قدموں کی چاپ اور دروازے کا کھُلنا) آئیے حضرات، آپ لوگوں سے بہت دنوں میں ملاقات ہوئی۔

ڈائرکٹر:۔ مہاتما جی! مزاج اچھے ہیں

مہاتما:۔ کرپا ہے بھگوان کی،

پرنسپل:۔ مہاتما جی! ہمارے نئے تعلیمی تجربے کو تین سال کے قریب ہو گئے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اب اس کا جائزہ لیا جائے اور بنیادی تعلیم کو تنقید کے آئینہ کے سامنے لایا جائے۔

ڈائرکٹر:۔ کچھ صوبوں میں بنیادی تعلیم جاری کی گئی، بعض میں کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے، بعض میں دق کے مریض کی طرح آخری سانسیں لے رہی ہے اور بعض میں اس کا جنازہ بھی نکل چکا۔

مہاتما:۔ ڈائرکٹر صاحب! آپ کے یہاں ریاست میں اس کا تجربہ کیسا رہا، میرے خیال میں اگر تعصب کی عینک کو اُتار کر دیکھا جائے تو بُنیادی قومی تعلیم میں فی الواقع اگر ایک طرف ہندوستان کی بیکاری کا حل ہے تو دوسری طرف بچّہ کو اپنی پوشیدہ صلاحیتیں اُبھارنے کا کافی موقع ملتا ہے۔

ڈائرکٹر:۔ مہاتما جی! آپ کا خیال درست ہے، بچّہ اور زندگی کے بیچ میں اس پُرانی تعلیم نے "کتاب"

کی ایک ایسی دیوار حائل کردی ہے جو بچہ کو کسی اور چیز کے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی ہے، ہمارے یہاں اس کا تجربہ ہورہا ہے، ناکامی کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

(معلم اندر داخل ہوتا ہے)

پرنسپل:- آئیے ماسٹر صاحب! چند سال پہلے آپ نے ہمارے یہاں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی فرمائیے آپ کے نارمل اسکول میں بنیادی تعلیم کا کیسا کام ہورہا ہے؟

معلم:- میں نے کئی ایک ایسی جماعتوں کو غور سے دیکھا جہاں بنیادی طریقہ پر تعلیم دی جارہی تھی، بچے ہنستی خوشی کام کررہے تھے۔ اِس صوبہ کے تمام پرائمری اور مڈل اسکولوں میں درجہ ۲ تک بنیادی تعلیم لازمی قرار دیدی گئی ہے اور اس سال سے درجہ ۳ میں بھی اس کا نفاذ ہوجائیگا۔ سب ڈپٹی انسپکٹر ڈرائنگ ماسٹر اور نارمل اسکولوں کے بیشتر ماسٹر بنیادی تعلیم کا ریفرشر کورس مکمل کرچکے ہیں۔

ڈائرکٹر:- ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ معلمین کی ذہنیت میں بھی اس سے کچھ تبدیلی ہوتی ہے یا نہیں، ورنہ ؎

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

معلم:- انسان کی ذہنیت کو بدلنا واقعی بڑا مشکل کام ہے، ایکس ریز کی طرح انسان کے دل کی حالت معلوم کرنا ہر ایک کا کام نہیں، یہاں بڑے بڑے عقلمند ٹھوکر کھاجاتے ہیں۔ میں نے بہت سے معلمین کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ بنیادی تعلیم کا طریقہ محض خیالی ہے اور اُسے مستقل طور پر عملی جامہ پہنانا مشکل ہے اس کے رائج ہونے سے ہمارے مدرسے کارخانے تو بن جائیں گے لیکن علمی لیاقت مفقود ہوجائیگی اور بچوں کا ادبی ذوق لپیٹ ہوجائیگا۔ ہمارے مدرسوں سے اچھے بڑھئی اور لوہار فارغ التحصیل ہوکر نکلیں گے لیکن اچھے سائنس داں، سیاست داں، ادیب اور انشاپرداز کم نکلیں گے۔

ڈائرکٹر:- اس قسم کے اعتراضات عرصہ ہوا کئے گئے تھے، ہم نے اس وقت ان کا جواب بھی دیدیا تھا لیکن میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں، پرانے طریقۂ تعلیم نے ہمارے یہاں کتنے فلسفی، شاعر، سیاست داں اور انشاپرداز پیدا کئے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر مان لیا جائے کہ موجودہ بنیادی طریقہ بھی (حالانکہ یہ غلط ہے) اس قسم کے افراد مہیا کرنے سے قاصر ہے لیکن ان کے بجائے تندرست افراد اور اچھے شہری پیدا کرتا ہے تو کیا صحیح ہے؟ اسکول چھوڑنے کے بعد ایک نوجوان طالب علم اس دنیا میں اپنے آپ کو ایک اجنبی تصور نہ کریگا بلکہ زندگی کی دوڑ میں برابر کا حصہ لیگا۔ اسمیں خود اعتمادی اور عمل کرنے کی قوت پیدا ہوگی اور وہ سماج کا ایک مفید رکن بن سکے گا۔

پرنسپل:۔ ابتدا میں ہر اسکیم پر اعتراضات کئے جاتے ہیں، لیکن جب تجربہ کی کسوٹی پر اُسے پرکھا جاتا ہے تو اُس کے جوہر خالص سونے کی طرح چمکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی خامیاں دھندلی نظر آتی ہیں تو رفتہ رفتہ دنیا اُسے قبول کر لیتی ہے۔ ماحول اور ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلیاں اور اضافہ کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ مجموعی طور پر افادی اور عملی حیثیت سے بہت کامیاب بن جاتی ہے۔

مہاتما:۔ ہمیں تعلیم میں قدامت پرستی کے خلاف عرصہ تک جنگ کرنا پڑیگی، پرانے اُستادوں کی ذہنیت کو بدلنا پڑیگا، نئے اُستادوں کو نئے سانچے میں ڈھالنا پڑیگا تب کہیں جاکر یہ قید خانے (بقول برنارڈ شا) صحیح معنیٰ میں مدرسے بن سکیں گے۔ اس کے ساتھ ہمیں اُستاد کا درجہ سماج میں بھی مقرر کرنا پڑیگا۔

پرنسپل:۔ استاد کا درجہ سماج میں .... ہمارے سماج میں استاد کا درجہ کانسٹیبل یا پٹواری سے بہت نیچے اور خدمتگار سے کچھ آگے ہے۔ اس کی تنخواہ ایک کلرک کی تنخواہ سے کم اور چپراسی کی تنخواہ سے کچھ زیادہ ہے۔ سماج نے اس کی خدمات کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اس ملک میں کسی کو احساس نہیں، اس ناقدری کی وجہ سے اسمیں رفتہ رفتہ کمتری کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اگر سماج نے اُستاد کی ہمت افزائی نہ کی تو اس نئی تعلیم کی تمام کوششوں کا نتیجہ معلوم!

مہاتما:۔ ہمیں تصویر کا تاریک رُخ نہ دیکھنا چاہیئے، نا اُمید ہونے کی کوئی وجہ نہیں، نئی قدریں پرانی قدروں کی جگہ لیں گی۔ سماج استاد کی قدر کرے گا اور ضرور کرے گا

ڈائرکٹر:۔ سماج استاد کی قدر کرے گا اس میں کوئی شبہ نہیں، لیکن استاد کو بھی سماج کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ استاد نے اپنے ناقص طریقوں سے بچوں کی صدہا نسلیں تباہ و برباد کر دیں، اُن کی ہمتیں پست کر دیں، اُن کے خیالات محدود کر دیئے اور کتابوں کے انبار سے اُن کی جھکی ہوئی پیٹھ کو اور جھکا دیا۔

ان کی اس تعلیم سے پایا کسی نے جب فراغ

دردِ دل دردِ جگر درد بصر دردِ دماغ

اگر موجودہ جنگ میں فوج کو ہوائی لڑائی کی تمام باتیں نہ بتلائی جائیں مکمل ہتھیار نہ دیئے جائیں ہوائی حملوں سے بچنے کی تدابیر نہ سکھلائی جائیں، دشمن پر موقع پاکر قابو حاصل کرنا نہ معلوم ہو تو نتیجہ سوائے شکست کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارا اُستاد جو پورے سماج کی فوج کو تیار کر رہا ہے اگر ایک بچہ کو بھی غلط طریقہ سے تعلیم دیدے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہجائیگا

اور جس طرح ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے یہ بچہ پورے سماج کو گندہ کرے گا
معلم :- کلام قطع ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ نئی تعلیم اور نیا سماج استاد سے کیا توقع کرتا ہے اور اس پر کونسی پابندیاں عاید کرنا چاہتا ہے۔
پرنسپل :- نئی تعلیم اُستاد سے توقع کرتی ہے کہ وہ بچے کو اس کی نفسیات کے مطابق تعلیم دے بالفاظ دیگر استاد کے لئے علم النفس کی ابتدائی باتیں جاننا ضروری ہے۔ بچّہ کوئی ٹھوس چیز نہیں جو ہمیشہ ایک سی حالت میں رہے۔ عمر کے ساتھ اس کے خیالات اور رُجحانات میں تبدیلی ہوتی ہے استاد اپنا طریقہ تعلیم ان رُجحانات و میلانات کے مطابق ترتیب دے۔ استاد کو تعلیم کے نئے طریقوں سے واقف ہونا چاہیئے لیکن موقع اور ضرورت کے لحاظ سے اُسے خود اپنا ایک نیا طریقہ بنانا پڑے گا، ایک طریقہ بذاتِ خود خواہ کتنا اچھا ہو تمام بچوں کے لئے ہر موقعہ پر مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ اُستاد کا فرض ہے کہ وہ بچّوں کی فطرت کے خلاف کوئی کام نہ کرے۔
معلم :- بنیادی طریقہ اس سلسلہ میں استاد کی کہاں تک مدد کرسکتا ہے ؟
پرنسپل :- آپ کو یہ بات ڈائرکٹر صاحب سمجھائیں گے۔
ڈائرکٹر :- بنیادی طریقہ کوئی نیا طریقہ نہیں ہے۔ اس پر بیشتر مغربی ممالک میں عمل کیا جاچکا ہے۔ ہم نے ہندوستان کی ضرورتوں کے مطابق اِس میں تبدیلیاں کردی ہیں۔ یہ طریقہ صرف دماغی کام کرنے کے بجائے ہاتھ اور آنکھ سے کام کرنے پر بھی زور دیتا ہے۔ بچّہ کی اختراعی قوتوں کو اُبھارنا اس کا اوّلین مقصد ہے۔ بنیادی طریقہ بچہ میں فن کارانہ نظر (Artistic Sense) پیدا کرتا ہے۔ کارڈ بورڈ کاٹتے وقت، لکڑی کا کام کرتے وقت، سُوت کاتتے وقت، ڈیزائن بناتے وقت، رنگ بھرتے اور باغبانی کا کام کرتے وقت ان کا جذبۂ عمل بیدار ہوتا ہے اور کام میں کھیل کا لطف آنے لگتا ہے۔ بچّہ بغیر کسی دباؤ کے کام کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے اور اس کو گھر پر بھی جاری رکھنا چاہتا ہے۔ اِن عملی کاموں کے ذریعہ ہم اُسے ابتدائی حساب مادری زبان اور تاریخ وجغرافیہ کی تعلیم دیتے ہیں، ایک بے جان مضمون کی تعلیم نہیں بلکہ مربوط طریقہ پر جس میں روزمرہ کے واقعات اور زندگی کی حقیقتوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہم حرفہ سے بیشتر مضامین کا ربط قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ حرفے مختلف اقسام کے اور حسب ضرورت ان میں سے کوئی سا حرفہ انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے مدرسوں کو مدرسۂ عمل کہنا زیادہ موزوں ہوگا جہاں بچّہ ہر کام اپنے تجربہ کی بنا پر سیکھے گا۔

معلم:۔ بحث طویل ہوتی جاتی ہے، لیکن ایک بات اور دریافت کرونگا، بنیادی طریقہ پر تعلیم اس وقت دی جاسکتی ہے جب معلمین اس کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اُن کی کامیابی کا انھیں یقین ہو جائے۔ لیکن تمام معلمین کو کس طرح اس نئی تعلیم کے اصولوں سے واقف کرایا جائے؟ اس اسکیم کی کامیابی بغیر اس قسم کے استادوں کے مشکل ہے۔

ڈائرکٹر:۔ آپ کے صوبہ میں بیشتر معلمین جیسا آپ نے فرمایا بنیادی طریقۂ تعلیم سے واقف ہو چکے ہیں۔ کچھ معلمین اور ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ اس صوبہ کی تقلید اور دوسرے صوبوں کو بھی کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ کام بغیر حکومت کی مدد کے مشکل سے چل سکے گا۔

پرنسپل:۔ مجھے اس خیال سے اتفاق ہے۔ اگر حکومت نے ہماری اس سلسلہ میں مدد کی تو لازمی بنیادی تعلیم ۷ سال سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے ملک میں جاری ہو جائیگی، اور اس کا اثر آپ کو چند سال کے بعد معلوم ہو گا۔ ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جائے گی، اور اس طرح سے جہالت کی جڑ کٹ جائے گی۔

مہاتما:۔ ہمیں تعلیم بالغان کو بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔ اگر ان کو تعلیم نہ دی گئی تو خاطر خواہ کامیابی نہ ہو گی۔

ڈائرکٹر:۔ بنیادی تعلیم، تعلیم بالغان، صنعتی و حرفتی تعلیم اور اس کے ساتھ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی اعلیٰ تعلیم اس ملک میں نوجیون کا کام کرینگی۔ جمہوریتوں کی فتح کے ساتھ تعلیم کا مستقبل وابستہ ہے۔ کیونکہ آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کے نظام میں اس قسم کی تعلیم کے لئے کوئی گنجایش نہیں۔ ہندوستان میں بنیادی تعلیم کی یہ کوششیں بچے کو وہ آزادی دے رہی ہیں جو اس کا جائز اور فطری حق ہے۔

(پردہ)

اے جوانی!

(از حضرت الطاف مشہدی)

جوانی! مری کیف پرور جوانی — بہت مختصر ہے تری زندگانی
مگر اس میں بھی کام کرنا پڑے گا — وطن کی محبت میں مرنا پڑے گا
اگر تجھ کو اپنے مشاغل ہوں پیارے — ہوس، بیخودی، زمزمے، ماہ پارے
تو میری طرف سے اجازت ہے تجھکو — بڑھاپا کہیں تجھ سے بہتر ہے مجھ کو

جنم اشٹمی

(رائے زادہ گوبند پرشاد آفتاب بی۔ اے)

سمندروں کو بھی جس بوند کی تمنا تھی — جس ایک ضو کے لئے تھے نجوم چشم براہ!
جس ایک ذرّے کو مہر و مہ چاہتے تھے! — جس ایک لَو کا چراغانِ برق تھا دلخواہ!
جس ایک گل کی ہوا میں ریاضِ گیتی تھا — جس اوس کے لئے بیتاب تھا جہانِ گیاہ
جس ایک دُر کیلئے اضطرار نیساں میں تھا — جو ایک دانہ تھا سب خرمنوں کی زیرِ نگاہ!
نہالِ دہر تھے سرو شفتے جس ورق کے لئے — جس ایک رنگ کی تکتی تھی راہ چشمِ پگاہ!
جس ایک حُسن کے لئے مضطرب تھی جانِ جہاں — جس اک جھلک کیلئے شام ہو گئی تھی سیاہ!
جس ایک لمحہ کا تھا منتظر زمانِ ازل — جس ایک منظرِ دلکش پہ تھی ابد کی نگاہ!
جس ایک طوبیٰ کی آمد پہ صدقے تھا فردوس — لگائے کان تھے جس دُھن پہ سازِ جنت گاہ!
جس ایک مس کے لئے برق کو قرار نہ تھا — جس ایک جھونکے کی رہ دیکھتا تھا ابرِ سیاہ!
کھُلی زمانے کی تھی آنکھ جس ادا کے لئے — جس ایک جلوۂ مضطر پہ طور کی تھی نگاہ!

چمک کے برق تجلائے طور وہ آئی
سری کرشن کا سارا جہاں ہے مجرائی

ماتمِ ٹیگور

(از منشی تلوک چند محروم بی۔ اے)

(۱)

دل رو رہا تھا ماتمِ اقبال میں ابھی — چرکا لگا اِک اور، کہ ٹیگور بھی گیا!
دستِ قضا سے آج لُٹا کاروانِ ہند — شاعر، گورُو، محبِ وطن، فلسفی گیا!

(۲)

روشن تھا جس کے نام سے ہندوستاں کا نام — وہ ماہتابِ اوجِ درخشندگی گیا
جانے سے اس کے محفلِ ہستی اُجڑ گئی — کشافِ معنیٔ صُوَرِ زندگی گیا!

(۳)

اُٹھتی ہے آج ہُوک دلِ کائنات سے — لہرا رہے ہیں ماتمی نغمے فضاؤں میں
ساون کے گیت نوحوں میں تبدیل ہو گئے — طوفاں ہیں اشک و آہ کے کالی گھٹاؤں میں!

(۴)

تہذیب۔ شاعری۔ ادب۔ انسانیت کی جاں — وہ افتخارِ عصر، عدیم النظیر تھا
خلوت میں ایک زاہدِ مرتاض اور فقیر — جلوت میں پُرشکوہ، امیرِ کبیر تھا!

(۵)

محلوں میں اُس کا جسم بہ نازو نعم پلا — کھیتوں سے، وادیوں سے رہا ہمکنارِ دل
آسائشیں ہزار مقدر نے دیں اُسے — نوعِ بشر کے غم میں رہا بے قرارِ دل!

(۶)

محلوں کے رہنے والوں کے دل بھی طول ہیں — کھیتوں میں بسنے والے بھی ماتم نشیں ہیں آج
ٹیگورِ دل نواز ہوا آسماں نورد — صد گونہ پیچ و تاب میں اہلِ زمیں ہیں آج!

(۷)

ٹیگور، جس نے اپنی نواہائے تازہ سے — طرحِ جہانِ شعر و سخن کو بدل دیا
چشمِ جہاں سے آج نہاں ہو گیا۔ دریغ — روحِ بشر کو جس نے پیامِ ازل دیا!

(۸)

شعر و غزل کے ساغر و مینا سے جلوہ ریز — محفل میں اُس کی دَورِ سُرورِ دوام تھا
ہر گیت روئے شاہدِ اصلی کی اِک جھلک — افسانہ بھی لکھا تو حقیقت پیام تھا

(۹)

دنیا میں یوں تو گرم ہے بازار موت کا — قیمت جو آج ہے، سو ہے جنسِ حیات کی
یہ وہ زیاں ہے جس کی تلافی محال ہے — اے آہ! موت شاعرِ قدسی صفات کی

(۱۰)

سیر و سفر کو مشرق و مغرب میں دُور تک — وہ باعثِ وقارِ وطن بار ہا گیا
تعظیم نے قدم لئے، پہونچا جہاں جہاں — رونق وطن میں آگئی، جب واپس آگیا

(۱۱)

ٹوٹی ہے آہ! اب کے اُمیدِ مراجعت — ایسے سفر پہ رختِ سفر باندھ کر گیا
ہاں بحر و دشت و کوہ سے آئے گی یہ صدا — ٹیگور عالمِ گزراں سے گزر گیا!

شاعرِ اعظم ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور

مادرِ ہند نے گوسوامی تلسی داس کے بعد اگر کوئی ایسا فرزند پیدا کیا جو دلوں پر اپنا نقشِ محبت اور دائمی اثر ثبت کر جائے تو وہ شاعرِ اعظم ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کی ہستی تھی جنھوں نے ۷۔ اگست ۱۹۴۱ء کو کچھ اوپر اسّی سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد اپنے آبائی مکان واقع کلکتہ میں انتقال فرمایا۔ اور نہ صرف ہمیں بلکہ دنیا بھر کے قدر دانانِ علم و فضل کو ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئے۔ مرحوم علوم متداولہ اور فنونِ لطیفہ کے لحاظ سے تو یکتائے زمانہ تھے ہی لیکن روحانی اعتبار سے بھی وہ ایک مہرشی کے فرزندِ سعید تھے اور اُن کی روحانی عظمت کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر قائم تھا۔ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کے انتقال پُرملال سے دنیا کا ایک بہت بڑا شاعر، ایک زبردست ادیب، ایک پختہ مغز فلسفی، ایک سحر طراز موسیقی کار، ایک بے نظیر مصوّر، ایک بے مثال محبِّ وطن اور ایک بے مثل روحانی پیشوا اٹھ گیا ہے۔ جس کے انتقال پر نہ صرف تمام ہندوستان میں صفِ ماتم بچھ گئی، بلکہ بیرونی دنیا کے قدر دانانِ علم و فضل کو بھی ایک صدمۂ عظیم پہونچا۔

ابتدائی حالات | ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور خطۂ بنگال کے امیر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مہرشی دیویندرناتھ ٹیگور اور والدہ کا اسم مبارک شریمتی سارداد یوی تھا۔ آپ اپنے والدین کے چودھویں فرزند اور نویں بیٹے تھے۔ ٹیگور کا خاندان بنگال کا ایک بہت قدیم اور محترم خاندان ہے اور گذشتہ دو پشتوں کے اندر اس خاندان عالی کے ممبروں نے علوم و فنون میں وہ وہ کارنامے دکھائے ہیں گویا مادرِ وطن کی افسردہ روح کو از سرِ نو زندہ کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خاندان ٹیگور کو ہندوستان کی روح بیداری سمجھنا چاہیئے۔ مرحوم کے والد مہرشی دیویندر ناتھ ٹیگور اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم و فاضل اور روحانی پیشوا تھے۔ اس طرح ایک خلاق دماغ اور ایک فطرتِ سلیم جو رابندرا ناتھ کے خصوصیات میں داخل تھی وہ ان کا آبائی ورثہ تھا۔ یہ گویا شفیق باپ کا ہی طفیل تھا جس نے رابندرا ناتھ کو ایک لاجواب شاعر، ایک بے نظیر آرٹسٹ اور ایک عالی دماغ فلاسفر بنا دیا تھا۔

مرحوم کی ابتدائی تعلیم اورینٹل سیمینری Oriental Seminary سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد وہ نارمل اسکول میں داخل ہوگئے۔ اس کے بعد شفیق باپ نے سومیندر ناتھ، سیتا پرشاد گنگولی

رابندرا ناتھ تینوں صاحبزادوں کی تعلیم و تربیت ایک پرائیویٹ اتالیق کے سپرد کردی، اور اس طرح تینوں بھائیوں نے پرائیویٹ طور پر ہی ارتھمیٹک، جیومیٹری، ہسٹری، جغرافیہ، گرامر، اور بنگلہ، سنسکرت اور انگریزی زبانیں پڑھیں، اور ابتدائی سائینس میں بھی کچھ شد بد حاصل کرلی۔ لیکن ان علوم متداولہ سے زیادہ ان کی تعلیم موسیقی، جسمانی ورزش پر زور دیا گیا جس کے لئے ماہر فن استادوں کی خدمات حاصل کی گئیں یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کشتی بھی خوب لڑتے تھے۔ اپنے اس زمانہ کے حالات مرحوم نے اپنے مضمون "میرا بچپن" (My Boyhood Days) میں جو "وشوا بھارتی" نامی تماہی رسالہ میں شائع ہوا تھا، نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے تھے۔ اپنے مضمون میں مرحوم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ۱۸۶۸ء یعنی سات ہی برس کی عمر میں انھوں نے شعر و شاعری میں کس طرح قدم رکھا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فطری شاعر تھے۔ ۱۸۶۳ء میں مہرشی دیویندرا ناتھ نے موضع بولپور میں بیس بیگہ زمین خرید کر "شانتی نکیتن" کی بنیاد ڈال دی تھی۔ گیارہ برس کی عمر میں مرحوم بھی اپنے والد کے ساتھ وہاں گئے اور وہ فضا اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اسی چھوٹے سے اسکول کو دنیا کی ایک مشہور ترین یونیورسٹی بنادیا۔ ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے والد کے ساتھ شمالی ہند کی سیر کی۔ ایک مہینہ امرتسر اور چار مہینہ ڈلہوزی میں قیام کیا۔ اور اس دوران میں اپنے والد سے انگریزی زبان، گرامر اور علم نجوم سیکھتے رہے۔ ۱۸۷۳ء میں شمالی ہند کی سیر و سیاحت سے واپس آکر سینٹ زیویر اسکول میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے بارہ برس کی عمر میں اپنی ایک نظم "ابھلاشا" (خواہش) لکھی جو "تتو بودھنی پتریکا" میں شائع ہوئی۔ ۱۸۷۵ء تیرہ برس کی عمر میں آپ کے سر سے والدہ کا سایہ اٹھ گیا۔

ابتدائی شاعری | مرحوم کی جو نظمیں اب تک منظر عام پر آئی تھیں وہ سب گمنام تھیں۔ آپ کی پہلی نظم ۲۵۔ فروری ۱۸۷۵ء کے اخبار "امرت بازار پتریکا" میں شائع ہوئی جو اس وقت ایک اینگلو بنگالی ہفتہ وار اخبار تھا۔ یہ نظم ۱۱ فروری ۱۸۷۵ء کے "ہندو میلہ" کے لئے لکھی گئی تھی، جو قوم پرست حضرات کے اہتمام سے سالانہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ سرچشمۂ علم و فضل میں بھی روانی و طغیانی پیدا ہوتی گئی، اور مرحوم نے شیکسپیر کے مشہور ڈرامہ "میکبتھ" (Macbeth) کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا جس کا کچھ حصہ "بھارتی" نامی بنگالی میگزین نے اپنے سالنامہ ۱۸۸۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد "بھانو سنہا ٹھاکر" کے نام سے "بن پھول" نامی ایک طویل نظم لکھی۔ مرحوم کے بڑے بھائی دوجیندرا ناتھ ٹیگور نے "بھارتی" نامی ایک ماہوار رسالہ جاری کر رکھا تھا جس میں آپ اپنے مضامین نظمیں اور افسانے لکھا کرتے تھے اور کبھی کبھی دوسروں کی تصانیف پر تنقید عالیہ کی بھی داد دیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں لارڈ لٹن کے دہلی دربار والی نظم بھی

لکھی گئی۔ واضح ہو کہ اس سے پہلے ہندوستان میں ایک بہت زبردست قحط پڑ چکا تھا۔

سفر انگلستان ۲۰ ستمبر ۱۸۷۸ء کو مرحوم اپنے بھائی سیتا یندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ جو بعد میں انڈین سول سروس کے پہلے ہندوستانی ممبر ہوئے، تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان کو روانہ ہوئے۔ اسی زمانہ میں ان کی نظموں کا سب سے پہلا مجموعہ "کوئی کہانی" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ انگلستان جا کر مرحوم برائٹن کے مشہور پبلک اسکول میں داخل ہو گئے۔ لیکن کچھ دنوں بعد تارکنا تھ پلیٹ (جو بعد میں سر ہو گئے تھے) مرحوم کو لندن لے آئے اور ان کو یونیورسٹی کالج میں داخل کرا دیا۔ جہاں انھوں نے لارڈ مارلے کے بھائی پروفیسر ہنری مارلے کی شاگردی میں انگریزی لٹریچر کی خوب تعلیم حاصل کی۔ انگلینڈ میں بھی مرحوم کو زیادہ تر دلچسپی موسیقی اور برٹش میوزیم سے رہتی تھی۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ اس زمانہ کی نظموں میں سب سے زیادہ مشہور نظم "بھاگنا تاری" (کشتیِ شکستہ) اور ایک منظوم قصہ "ٹوٹے ہوئے دل" ہیں۔

واپسیِ وطن | ۱۸۸۰ء میں مرحوم انگلستان سے ہندوستان کو واپس آ گئے اور اپنے دو ڈرامے جن میں گانے ہی گانے ہیں شائع کئے۔ ایک کا نام "والمیک پرتبھا" (یعنی والمیک کی شاعرانہ قوت تخلیق) اور دوسرے کا نام "کلم جیہ" یعنی "مہلک چوٹ" ہے۔ دونوں ڈرامے اسٹیج پر کھیلے گئے جنھیں بنگال کے مایۂ ناز ناول نویس بنکم چندر چٹرجی نے بھی دیکھا تھا۔ ہمیں ۱۸۸۱ء میں ریورینڈ کرشن موہن بنرجی کے زیر صدارت بتھین سوسائٹی کا جلسہ ہوا جس میں مرحوم نے اپنی سب سے پہلی پبلک تقریر کی۔ ۱۸۸۲ء میں "ساندھیہ سانگیت" کے نام سے اپنے مختلف گانوں کا مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۰۰ء میں مرحوم نے مسٹر موجمدار کی مدد سے بنکم چندر کے مشہور میگزین "بنگہ درشن" کو از سر نو زندہ کیا۔ اور اس زمانہ کے مشہور اہل قلم حضرات کی علمی امداد و اعانت حاصل کر لی۔ اس رسالہ میں آپ نے برٹش امپیریلزم کی دست درازیوں کے خلاف ایک پر جوش مضمون لکھا تھا جس میں جنوبی افریقہ کے بوئروں کی تائید و حمایت کی گئی تھی۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں مرحوم نے اپنی خاندانی ریاست یعنی "ریاست ٹیگور" کی منیجری چھوڑ دی اور شانتی نکیتن میں آ کر رہنے لگے۔ جہاں آپ نے "بولپور برہمچریہ آشرم" نام سے ایک اسکول ہندوستان کے قدیم نمونہ پر جاری کیا۔ یہاں مرحوم طلبا کو خود تعلیم دیتے تھے۔ انھیں قصے کہانیاں سناتے تھے۔ ان کے ساتھ رہتے تھے اور اس طرح اپنا اخلاقی اثر ڈال کر ان کی زندگی مکمل کرتے تھے۔ اس زمانہ میں خاندان ٹیگور کی مالی حالت بھی خراب ہو گئی تھی۔ مگر باینہمہ مرحوم کے علمی، ادبی و سیاسی مشاغل بدستور جاری رہے۔ بدقسمتی سے اس زمانہ میں لارڈ کرزن نے کلکتہ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستانیوں کے

چال چلن پر سخت حملہ کیا تھا، جس کا جواب مرحوم نے اپنے قلم سے دیا۔ اور اس میں یورپوں کے خلاف برطانوی پروپیگنڈا کی دروغ گوئیوں کا پردہ فاش کیا۔ اور پان ایشیاٹک خیالات کا کھلم کھلا اظہار شروع کر دیا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں مرحوم کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا جو اپنے پسماندگان میں دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ گئیں۔ چھ مہینے بعد یعنی مئی سنہ ۱۹۰۳ء میں مرحوم کی صاحبزادی رینکا فوت ہو گئی۔ باایں ہمہ مرحوم کا قلم جاری رہا اور وہ "بنگہ درشن" میں اپنے ناول "ناؤ کا ڈوبی" (غرقاب کشتی) کے اقساط شائع کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں مرحوم نے "راج ٹلکمب" (خاندان شاہی) اور "گھورو گھوری" (اینٹ کا جواب پتھر) نے بڑے زبردست سیاسی مضامین لکھے۔

سیاسی زندگی۔ اسی زمانہ میں ہندوستان میں سودیشی کی تحریک جاری ہوئی جس سے مرحوم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اور تحریک مذکورہ کے متعلق ایک خاص جلسہ میں جو منروا تھیٹر کلکتہ میں زیر صدارت رامیش چندر دت، چیتنیہ لائبریری ایسوسی ایشن کے اہتمام سے سنہ ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا۔ مرحوم نے "سودیشی سماج" کے موضوع پر اپنا مشہور مضمون پڑھا، اور اس میں سماج کی از سر نو تنظیم و اصلاح کی صورت یہ بتائی کہ سوسائٹی کو انھیں مکتفی بالذات بنیادوں پر قائم کیا جائے جن پر پراچین بھارت کے دیہات قائم تھے۔ اور اسی کے ساتھ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں اور فرقہ وارانہ اتفاق و اتحاد کو زندہ کیا جائے۔ جب لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کے جواب میں بدیشی خصوصاً انگریزی مال کے بائیکاٹ کی تحریک جاری ہوئی تو مرحوم بھی اس میں سراپا غرق ہو گئے بلکہ تحریک کے زبردست لیڈر شمار کیے جانے لگے۔ لیکن سنہ ۱۹۰۷ء تک مرحوم کے سیاسی جوش میں ردِ عمل پیدا ہوا کیونکہ جن لائنوں پر سودیشی تحریک کو جاری کیا جا رہا تھا وہ مرحوم کو پسند نہیں تھیں۔ اس لئے وہ تمام باتوں سے دستکش ہو کر اپنے شانتی نکیتن میں گوشہ نشین ہو گئے۔

یہ گوشہ نشینی ہی گویا مرحوم کے آئندہ دماغی عروج کا پیش خیمہ تھی۔ گوشۂ عافیت میں جتنا زیادہ سکون ملا اتنی ہی مرحوم کے دل و دماغ نے ترقی کی، اور اسی کے بعد مرحوم کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا جس میں انھوں نے اپنے لافانی ادبی کارنامے انجام دئیے۔ مرحوم کا سب سے بڑا اور مشہور ناول "گورا" بالاقساط رسالہ "پرباسی" میں نکلنے لگا۔ اور اسی زمانہ میں مرحوم نے اپنا مشہور ڈرامہ "سورا دولت" لکھا جسے شانتی نکیتن کے طلبا اور اسٹاف نے اسٹیج پر کھیلا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی سوانح عمری "بنگ بھاسکر کا میکھک" لکھی اور "راجہ" نامی ایک تمثیلی ڈرامہ تصنیف کیا۔ اور انگریزی افسانوں کی طرف بھی توجہ کی۔ چنانچہ آپ کا پہلا انگریزی افسانہ "ماڈرن ریویو" بابت مئی سنہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں "جیون سمرتی" کے نام سے اپنے سوانح حیات لکھے جو رسالہ "پرباسی" میں شائع ہوئے۔

سیر و سیاحت ۱۹۱۲ء میں شاعر اعظم پھر انگلستان تشریف لے گئے جہاں آپ نے مشہور مصور سر ولیم راتھنسٹین سے ملاقات کی سر ولیم نے اپنے دولت خانہ پر منتخب لوگوں کے جلسہ کا اہتمام کیا جس میں مرحوم نے اپنی بہت سی نظمیں سنائیں اور لوگوں کے دلوں پر سکہ جما دیا۔ لندن میں مرحوم کی ملاقات برنارڈ شا، ایچ جی ویلس، اسٹیفورڈ بروک، جان میسفیلڈ، بوڈکنسن، برٹرانڈ رسل، وغیرہ وغیرہ مشہور عالم ادیبوں سے ہوئی اسی زمانہ میں آپ کو ادبیات کا "نوبل پرائز" بھی ملا۔ اور دنیا بھر سے مبارکباد کے خطوط اور تار برسنے لگے۔

اور گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ میں بنگال کے گورنر لارڈ کارمائیکل نے معززین کی ایک جماعت کثیر کے سامنے نوبل پرائز اور تمغہ آپ کی نذر کیا۔ اسی زمانہ میں آپ کو دنیا کی سیر و سیاحت کا شوق ہوا، اور یورپ، امریکہ، جاپان چین، مصر، ٹرکی، ایران اور بہت سے دوسرے ملکوں کی سیر کی اور ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے اور "ملک الشعراء ایشیا" کا خطاب پایا۔ ۱۹۳۰ء میں مرحوم ایک بار پھر سیر و سیاحت کو نکلے اور اس مرتبہ آپ روس بھی گئے۔ اس طرح مرحوم نے گیارہ بار سفر کئے۔

آخری ایام ہمارے شاعر اعظم پر دنیا بھر سے اکیڈمک اعزازات کی بارش ہوتی رہی۔ ۱۹۳۹ء میں شانتی نکیتن میں ایک "ہندی بھون" کھولا گیا جس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا۔ اور ۱۹۴۰ء میں مہاتما گاندھی نے بھی جاکر مرحوم سے نیاز حاصل کیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے شانتی نکیتن میں کانووکیشن کا ایک خاص جلسہ کر کے آپ کو "ڈاکٹر آف لٹریچر" کی ڈگری دی۔ مرحوم کو گورنمنٹ کی طرف سے بھی "سر" کا خطاب عطا ہوا جو بعد میں جلیانوالا باغ کے واقعہ سے متاثر ہو کر انھوں نے واپس کر دیا۔ ۱۹۴۱ء میں بھی جب وہ زندگی کی آخری منزل طے کر رہے تھے۔ ان کا ادبی شغل بدستور جاری رہا، اور انھوں نے اپنی سوانحعمری کی آخری قسط سے دنیا کو فیضیاب کیا۔ ان کو مرتے دم تک اپنی یونیورسٹی "وشو بھارتی" کا خیال رہا، اور چلتے چلتے بھی انھوں نے اپنی جائداد کا بہت بڑا حصہ اس کے نام وقف کر دیا۔ آہ ایسے آدمی دنیا میں کہاں پیدا ہوتے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اقوال زریں

زندگی بہار کا خوشنما اور حسین پھول ہے، اور موت خزاں کے زرد پتوں کے مانند ہے۔
ہم دنیا کا غلط مطالعہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہم کو دھوکا دیتی ہے۔
محبت شعور کی بیداری اور تکملۂ احساس کا دوسرا نام ہے۔
گفتگو کی دانائی وہ دولت ہے جو محبت کی شدت سے پیدا ہوتی ہے۔ (ٹیگور)

تنقید کتب

ساز و آہنگ

یہ مولانا سیماب اکبرآبادی کی دلکش نظموں کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے۔ مولانا ممدوح اردو شاعری کے ماہر کامل تسلیم کئے جاتے ہیں اور آپ کا حلقۂ تلامذہ بھی بہت وسیع ہے۔ اسلئے آپ کے کلام پر تنقید کرنا تحصیل حاصل ہے۔ البتہ اس کتاب کے مضامین سے ناظرین کو روشناس کر دینا ضروری ہے۔ اسمیں مولانا کی اکیہتر مختلف نظمیں ہیں جو بہ لحاظ موضوعات پانچ ابواب میں تقسیم کی گئی ہیں۔ پہلے باب میں قومیت، سیاست اور وطنیت کے متعلق نظمیں ہیں۔ دوسرے میں مذہب اخلاق اور معاشرت سے بحث کی گئی ہے۔ مذہبی معتقدات پر نظمیں علیحدہ درج ہیں اور ایک علیحدہ باب میں بچوں کے لئے خاص نظمیں ہیں یوں تو اس مجموعہ کی سبھی نظمیں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں لیکن تیسرے باب کی نظموں میں جو حکیمانہ تنقید کی گئی ہے۔ وہ خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ صوفیوں کے سلسلے میں مولانا سیماب نے حافظ شیرازی کے مشہور مصرعہ کی تضمین کی ہے۔ صوفی کہتا ہے ؎

شب کو اکثر مصرعۂ حافظ یہ تنہا ہیں پا کبند
"چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند"

اسی نظم کا ایک قابل قدر شعر یہ بھی ہے ؎

چیستان انسان کا انجام اور آغاز ہے
زندگی بھی اک معمہ، موت بھی اک راز ہو

بچوں کے لئے مولانا سیماب نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ بہت پیاری ہیں مگر ان نظموں میں بعض الفاظ ایسے آگئے ہیں جو کمسن بچوں کی سمجھ سے باہر ہیں، اگرچہ انہیں مولانا سیماب جیسے قادر الکلام شاعر ذرا سی فکر کے بعد زیادہ عام فہم لفظوں میں بدل سکتے تھے

پانچویں باب کے آخر میں "تاج محل" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اُسے کیا بلحاظ بلندی تخیل اور کیا بلحاظ منظر نگاری اور ترکیبوں کی شگفتگی اگر بیانیہ شاعری کا شاہکار سمجھا جائے تو بیجا نہ ہوگا بہر حال یہ مجموعہ اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں میں آپ اپنی نظیر ہے۔ اسکا حجم ۲۰۴ صفحات ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ قصر الادب، دفتر "شاعر" آگرہ۔

کلیات میر تقی میر

کارپردازان مطبع منشی نولکشور نے خدائے سخن "میر تقی میر" کے جملہ اصناف کلام کا ایک نفیس مجموعہ ترتیب جدید کے ساتھ خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں میر کے چھ دیوان غزلیات بترتیب حروف تہجی، مختلف اشعار، تضمین، مثلث، مخمس، رباعیات، مستزاد، قطعات، ترکیب بند، قصائد، مثنویاں، ہجویات، مرثیے، ساقی نامے، واسوخت سبھی تمام و کمال درج کر دیئے گئے ہیں۔ مختلف نسخوں کو ملا کر اسکی تصیح بھی کر دی گئی ہے۔ جہاں کہیں دوسرا نسخہ ملا وہ حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے۔ غزلیں اور دوسری چیزیں اس طرح درج کی گئی ہیں کہ ہر غزل اور ہر نظم کے چاروں طرف سرخ جدول کر دی گئی ہے جس سے ہر صفحہ میں رنگینی اور نظر فریبی پیدا ہو گئی ہے۔ شروع میں مولانا عبدالباری آسی نے جامع اور ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں مختلف ذرایع سے امداد لیکر میر کی زندگی کے خاص خاص واقعات پر بحث کی گئی ہے مولانا آسی نے اس مقدمے میں اکثر مقامات پر دلچسپ نکات پیدا کیے ہیں۔ میر کو ہوئے تقریباً ڈیڑھ سو سال گذر چکے ہیں، مگر اُن کی زبان اسقدر صاف اور سلیس ہے کہ آج بھی ہم اسے "ٹکسالی زبان" سمجھ سکتے ہیں۔ پھر بھی اتنے عرصہ میں بہت سے الفاظ محاورے متروک ہو گئے ہیں جو اب بولے نہیں جاتے، اور بہت سی ترکیبیں غیر مانوس ہو گئی ہیں۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ شامل کر دی گئی ہے جس میں ایسے ضروری لفظوں اور محاوروں کی تشریح کر دی گئی ہے۔ بہرحال اب تک میر کے کلام کے جتنے مجموعے شایع ہو چکے ہیں ان میں کلیات کا درجہ بہت ممتاز ہے اور اسکی اشاعت پر ہم نامور مطبع منشی نولکشور کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ اس مطبع نے اس مجموعے کو شایع کر کے اردو کی بڑی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ، جلد، سب اعلیٰ ہے اس مجموعہ کا حجم ایک ہزار صفحات ہے۔

ملنے کا پتہ: مینیجر صاحب نولکشور پریس لکھنؤ۔

خطوط غالب (جلد اوّل)

رقعات غالب کی بہت سی جلدیں مختلف ناموں سے شایع ہو چکی ہیں، ان میں عود ہندی اور اردوئے معلیٰ، بہت پرانی ہیں لیکن انمیں مرزا کے بہت سے خطوط نہیں ہیں جو انھوں نے اپنے شاگردوں اور احباب کے نام لکھے تھے۔ اس کے علاوہ ان کتابوں میں تحریف یا سہو کاتب ہونیسے اکثر اصلی عبارت مسخ ہو گئی ہے شکر ہے کہ مولوی مہیش پرشاد صاحب صدر شعبہ اردو و فارسی ہندو یونیورسٹی بنارس نے بڑی تلاش و تحقیق اور عرق ریزی سے سالہا سال کی محنت کے بعد خطوط غالب کے مختلف مجموعوں کی عبارتوں کا مقابلہ کر کے خطوط کی تصیح کی انھوں نے غالب کے دیگر خطوط بھی جو مطبوعہ کتب میں موجود

نہیں تھے مختلف ذرایع سے جمع کر کے جدید ترتیب کے ساتھ حتی الامکان تاریخوار اس کتاب میں درج کر دیئے ہیں بعض خطوط کے عکس بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں اب تک جو کسی مطبوعہ کتاب میں نہیں تھے اور جو خود مرزا غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مختلف بزرگوں کے ادبی خزانوں میں محفوظ تھے انھیں میں ایک خط وہ بھی ہے جو مرزا نے میر مہدی مجروح کے نام لکھا تھا۔

غالب کے خطوط اردو لٹریچر کا خزانہ ہیں۔ جسے جناب منشی مہیش پرشاد صاحب نے اس مجموعے میں محفوظ کر دیا ہے۔ شروع میں مولف کا دیباچہ بھی ہے جس میں ان خطوط کے متعلق تلاش و تجسس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی پروفیسر عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ غالب نے اصل میں کیا لکھا ہوگا اور کتابوں میں کیا چھپ گیا ہے۔ غرض ڈاکٹر صاحب کی توجہ سے یہ مجموعہ خاص طور پر قابل قدر ہو گیا ہے ہوا کا مہیش پرشاد صاحب نے بھی اس مجموعے کو مرتب کر کے اردو ادب کی ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے جس کے لیے قدرداں ان اردو کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ یہ مجموعہ اردو ٹائپ میں چھپا ہے اور چار سو صفحات سے زائد پر ہے۔ قیمت ساڑھے چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد۔

بیان غالب

کلام غالب پر متعدد شرحیں موجود ہیں۔ موجودہ شرح کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جناب آغا محمد باقر صاحب۔ ایم سے نے اختصار کے ساتھ ان تمام شرحوں کو یکجا کر دیا ہے جن اشعار پر شارحین میں اختلاف ہے ان کو بھی واضح کر دیا گیا ہے اسطرح پڑھنے والا آسانی سے یہ سمجھ جائے گا کہ اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں دیوان غالب کی یہ ایک عمدہ شرح ہے۔ جس نے دوسری شرحوں کی ضرورت کو کم کر دیا ہے۔ طالب علموں کے لئے اسکا مطالعہ ضروری ہے۔ شروع میں پوری غزل دیدی گئی ہے اسکے بعد ہر شعر کا مطلب درج ہے۔ قیمت مجلد ڈھائی روپیہ۔ غیر مجلد دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

مغل بادشاہوں کی ہندی

اس کتاب میں پنڈت چندربلی پانڈے نے یہ دکھایا ہے کہ اردو کب اور کیونکر پیدا ہوئی۔ پنڈت جی نے اپنے دعوے کی دلیل میں حسب ضرورت حوالے بھی دیئے ہیں جو قابل غور ہیں۔ میرے خیال میں اردو کے ہر بہی خواہ کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ کتاب ہندی میں ہے ملنے کا پتہ۔ ہندناگری پرچارنی سبھا کاشی۔ قیمت آٹھ آنہ ۸ ؍

لطفِ سخن

(حضرت آرزو لکھنوی)

یہ داستانِ دل ہے، کیا ہو ادا زباں سے
آنسو ٹپک رہے ہیں لفظیں ملیں کہاں سے

ہے ربط دو دلوں کو بے ربطیٔ بیاں سے
کچھ وہ کہیں نظر سے کچھ ہم کہیں زباں سے

یہ روتے روتے ہنسنا ترتیب ذکرِ غم ہے
آیا ہوں ابتدا پر چھیڑا تھا درمیاں سے

حاصل تو زندگی کا تھی زندگی یہیں کی
اب میں ہوں اک جنازہ اٹھوا دو آستاں سے

اس طولِ خامشی کا زور بیاں بھی دیکھا
تھی بات میرے دل کی نکلی تری زباں سے

جب حسنِ خود نما ہے اور عشقِ رخنہ افگن
اس کشمکش میں پردہ نکلے گا درمیاں سے

میدانِ امتحاں میں اسے بے غرض محبت
دل کی زمین تو نے ٹکرا دی آسماں سے

اے جذبِ شوقِ منزل ممنونِ غیر کیوں ہوں
خود راستہ بدل کر بچھڑا ہوں کارواں سے

ہر گام پر ٹھٹھکنا، ہر بار مڑ کے تکنا
او مسکرانے والے کیا لے چلا یہاں سے

آنکھوں سے ہے یا عنباں کی شعلے نکل رہے ہیں
تنکے دبائے منہ میں نکلا ہوں آشیاں سے

دل کا سکوں گنوا کر ہوں آرزو پشیماں
کچھ لیکے رکھ نہ چھوڑا کیوں جنسِ رائگاں سے

مسٹر تقی احمد خاں فاطمی، بی۔ اے، ارشاد

آہ اے ضعف! عجب زمزمہ پرداز ہوں میں
ساز میں مل کے جو رہ جائے وہ آواز ہوں میں

نالۂ دل تجھے اللہ سلامت رکھے
لے سے نکلے ہوئے نغمے کا ہم آواز ہوں میں

کیوں نہ گونج اٹھے تری محفلِ عشرت اے دوست
اک شکستِ طرب ساز کی آواز ہوں میں

نالۂ دل پہ فدا جس کے فغانِ بلبل
ہم صفیرو چمن سوز کا وہ ساز ہوں میں

دلِ پُرغم ہے کہ ہے مرکزِ اسرارِ وجود
ہستیِ کون و مکاں جس سے ہے وہ راز ہوں میں

منشی سکھدیو پرشاد سنہا بسملؔ الہ آبادی

یہ مجھ کو غم ہے کس لئے، یہ میں ہوں کیوں ملال میں　وہ آئے ہیں نہ آئیں گے کبھی مرے خیال میں
ادھر ہوں میں ملال میں اُدھر ہے دل ملال میں　کوئی نہیں خیال میں تو کچھ نہیں خیال میں
وہ اس طرف وہ اُس طرف وہ ہر کہیں وہ ہر جگہ　جو ہے کمی تو صرف ہے مری ہی دیکھ بھال میں
کرم کی شان اور ہے غضب کی شان اور ہے　کبھی کوئی جلال میں کبھی کوئی جمال میں
جواب کیا جواب تھا، جواب لاجواب تھا　کلیم اُلجھ کے رہ گئے سوال ہی سوال میں
مرے کہ تو جئیے مگر یہ کہہ دے بسملؔ ادا　کمی کرے نہ وہ چھری نہ آئے فرق چال میں

(پنڈت پرتھی ناتھ شوقؔ)

تارے اُتار لائی تخئیل آسماں سے　ذوقِ طلب کی رفعت پہونچی کہاں کہاں سے
دیر و حرم میں ہر سُو ڈھونڈھا نظر نہ آئے　جلوے دکھا رہے ہو پوشیدہ تم کہاں سے
فطرت میں ہو وہ پنہاں یا حُسن میں عیاں ہو　سوزِ تپش سے مطلب دل کو ملے جہاں سے
صیاد کچھ نہیں ہے صحنِ چمن میں اپنا　وابستہ اک خیالی دنیا ہے آشیاں سے
صورت ہی اُس کی حالِ ابتر کی ترجماں ہے　پھر شوقؔ کیا سنائے روداد غم زباں سے

(منشی تلوک چند محرومؔ بی۔ اے)

مایوس ہو کے میری بے ربطیٔ بیاں سے　مانوس ہو گیا دل ہنگامۂ فغاں سے
دیر و حرم کے جھگڑے سب دُور ہیں یہاں سے　دنیا الگ ہے اپنی دنیائے این و آں سے
دنیائے رنگ و بو میں عنقا ہے دلنوازی　بیگانہ گوشِ گُل ہے بلبل کی داستاں سے
جانِ جہاں وہ خود ہے اور جسم دہر فانی　قائم نظامِ عالم ہے ربطِ جسم و جاں سے
وہ بھی تری عنایت یہ بھی تری عنایت　باران و برق دونوں آتے ہیں آسماں سے
اس جلوہ گاہ میں ہیں مسحور دیدہ و دل　جاں ہے دوچار یارب اک سخت امتحاں سے
پائے طلب نہیں یہ وقفِ روش ہے لیکن　دستِ سوال میرا اُونچا ہے آسماں سے
کیا دوزخی نظارے دکھلائے ہیں فلک نے　انساں پہ آگ انساں برسائے آسماں سے
وحشت کے ہاتھ بک کر کیا کر رہا ہے انساں　ویرانہ بن رہے ہیں بازار کہکشاں سے
پاتے ہیں اہلِ دل بھی مضموں پسندِ خاطر　اہلِ زباں بھی خوش ہیں محرومؔ کی زباں سے

نوٹ: حضرت آرزوؔ، حضرت شوقؔ اور منشی تلوک چند صاحب محرومؔ کی غزلیں آل انڈیا مشاعرہ کانپور کے لئے جو ریڈ کراس فنڈ کے سلسلے میں ۲۷/۱۲/۱۹۴۱ء کو ہوا تھا لکھی گئی تھیں۔

چھوٹا ناگپور اُردو مرکز رانچی

اُردو اور ہندی کی ناگوار بحث عرصہ سے جاری ہے۔ یہ بحث اُن لوگوں کے لئے بیحد تکلیف دہ ہے جو ان دونوں زبانوں کو اپنی زبان سمجھتے ہیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو دونوں زبانوں کو اپنی زبان نہیں سمجھتے وہ ایک بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ گنگا اور جمنا ہندوستان کی دو نہریں ہیں، دونوں کی اپنی اپنی خصوصیتیں ہیں، اور اپنی جگہ مفید، یہ کہاں کی منطق ہے کہ گنگا کی ترائی میں بسنے والے اور اُسکی لہروں سے دلچسپی لینے والے یہ چاہیں کہ جمنا خشک ہو جائے، اُس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اُردو اور ہندی دونوں کا اپنا اپنا رنگ ہے، اُردو میں ایک خاص صفائی ہے اور ہندی میں ایک خاص گھلاوٹ اور رس ہے۔ اس لئے اصلی ضرورت تو اس بات کی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی معاون بنکر ترقی کریں۔ لیکن ملک کی بدنصیبی ہے کہ یہاں ہر بات پر ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اُردو ہندی کے مسئلے میں بھی یہی ہوا۔ ملک ان دوستوں نے بہت سا وقت اسی فضول جھگڑے میں خراب کر دیا۔ اگر یہ آپس کی جنگ میں وقت خراب کرنے کی جگہ تعمیری خدمت انجام دیتے تو آج ہماری یونیورسٹیوں میں اُردو اور ہندی زبان ہی میں تعلیم دی جا سکتی۔

بہرحال واقعات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کیجا سکتیں اور یہ واقعہ ہے کہ خیرخواہان ہندی نے اسکی اشاعت میں جس سرگرمی سے حصہ لیا اُس کا عشر عشیر بھی اُردو کے بہی خواہوں نے نہیں کیا۔ آج سارے ملک میں سیکڑوں ہندی ادارے ہندی کی اشاعت و ترقی میں مصروف ہیں۔ لیکن اُردو کے بہی خواہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں البتہ جب بیٹھے بیٹھے طبیعت اُکتا جاتی ہے تو کوئی کانفرنس کر لیتے ہیں یا کوئی مشاعرہ، اور سمجھتے یہ ہیں کہ اُردو کی زندگی کے لئے یہ کافی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو البتہ اُردو کے لئے خود کو وقف کر چکے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک وسیع پیمانہ پر جو کچھ تعمیری کام ہوا ہے اسی انجمن نے کیا ہے۔ اور جب سے انجمن کا صدر دفتر حیدرآباد سے دہلی آیا ہے وہ اُردو کی اشاعت میں آگے قدم بڑھاتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اب اس نے کتابوں کی اشاعت، جلسے اور کانفرنسوں کے علاوہ ایک اور کامیاب قدم آگے بڑھایا ہے جو زیادہ مفید اور مؤثر ہے۔

ہماری مراد چھوٹا ناگپور اُردو مرکز سے ہے۔ یہ مرکز رانچی میں اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ وہاں کے باشندوں میں منظم طور پر اُردو کی اشاعت کا کام کیا جا سکے۔ چھوٹا ناگپور میں قدیم اقوام آباد ہیں جو

اُردو سے بالکل ناواقف ہیں۔ گوان میں تعلیم بہت زیادہ ہے۔

چھوٹا ناگپور اُردو مرکز نے اب آدی باسیوں میں اُردو کی اشاعت کا کام باضابطہ طور پر شروع کر دیا ہے۔ اور جو اطلاعیں آئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکز اپنی عمر کے لحاظ سے اپنے مقصد میں خاصی کامیابی حاصل کر رہا ہے۔ اہل کا بان ملک نے اس کی امداد شروع کر دی ہے۔ چنانچہ نواب صدریار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن صاحب شروانی نے مرکز کو پچاس روپیے ماہوار کی امداد دینا منظور کیا ہے۔ ان کے علاوہ جناب شعیب قریشی مشیر المہام بھوپال اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی پروفیسر جامعۂ عثمانیہ نے پانچ روپیے ماہانہ کی رقم عنایت کی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ دوسرے حضرات بھی جو اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں اس مرکز کی امداد کی طرف جلد ہی توجہ فرمائیں گے۔ (اس ع)

ایڈیٹر صاحب کی آنکھوں میں جو تکلیف ہے اس کی اطلاع پچھلے پرچہ میں دی جا چکی ہے۔ مئی میں پٹنہ سے واپسی پر اُن کی داہنی آنکھ میں درد معلوم ہوا تھا جو خفیف علاج کے بعد فوراً اچھا بھی ہوگیا تھا لیکن جون میں جب وہ راجپور میں مقیم تھے تو یہ درد پھر اُٹھا، مگر باوجود تکلیف کے روزانہ مشاغل کے علاوہ لکھنے پڑھنے کا کام بھی اُسی رفتار سے جاری رہا۔ واپسی پر جب میڈیکل کالج لکھنؤ میں معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ پتلی کھسک گئی ہے (Detachment of retina) چنانچہ ۲۲۔ جولائی کو وہ کلکتہ تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں ڈاکٹر کا کوئی اُمید افزا جواب نہ ملنے پر ایک ہی ہفتہ میں واپس آنا پڑا۔ اسی اثنا میں بمبئی کے مشہور معالج چشم ڈاکٹر ٹی۔ پی۔ یا ماجی سے مشورہ لیا گیا جنھوں نے فوراً بمبئی آنے کی رائے دی چنانچہ ۱۳۔ اگست کو کامیابی کے ساتھ آپریشن ہوگیا اور ایک ہی ہفتہ کے بعد پٹی کھولتے پر کامیابی کی پوری اُمید نظر آئی۔ اُمید ہے کہ ستمبر کے پہلے ہفتہ تک اُن کو اسپتال سے باہر آنے کی اجازت مل جائے گی۔

جولائی کا پرچہ ایڈیٹر صاحب خود مرتب کر کے گئے تھے۔ موجودہ پرچہ کا بھی زیادہ حصہ انھیں نے مرتب کیا ہے بلکہ اس تکلیف کے زمانہ میں ستمبر کے لئے بھی چند مضامین کی وہ نظر ثانی کر گئے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہوں۔ آمین (بھوشن)

اس پرچہ کا آخری فارم پریس میں تھا کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی صاحب کے افسوسناک انتقال کی اطلاع ملی۔ عرصہ سے آپ تپ دق جیسے مہلک مرض میں مبتلا تھے۔ افسوس کہ ۲۰ اگست کو آپ نے انتقال فرمایا اور ہندوستان کا ایک بلند پایہ مزاح نگار عالم جوانی میں ضائع ہوگیا۔ افسوس ہے، ۲۷ اگست کو جناب فانی بدایونی کا حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔

زمانہ

مرتبہ دیانرائن نگم

جلد ۵۷ | ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء | نمبر ۳

فہرست

[illegible] سے شائع ہوا

What is Changchai?

چانگچائی کیا ہے

جو لوگ چینی زبان سے واقف نہیں ہیں ان کے نزدیک تو لفظ چانگچائی کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن بہت سے جنوبی صوبوں کے باشندوں کے نزدیک اس کے معنی بربادی کے ہیں۔ کیونکہ ہر سال ہزارہا چھوٹے بڑے اور جوان بچے اسکی وجہ سے معذور یا ہلاک ہو جاتے ہیں اور جتنے آدمی اس اکیلی بیماری سے ضایع ہوتے ہیں اتنے تمام متعدی بیماریوں سے ملا کر بھی ضایع نہیں ہوتے۔ چین کے باشندوں کی بھاری اکثریت یہ نہیں جانتی کہ یہ "چانگچائی" مرض کس وجہ سے ہو جاتا ہے اور وہ اس کے مختلف اسباب سمجھتے ہیں۔ مثلاً بعض مقامات میں یہ خیال تھا کہ یہ بیماری "بام مچھلی" کی ایک خاص قسم سے پیدا ہوتی ہے اور اسی وجہ سے وہ اس بیماری کو "بام انچیگ" کہتے ہیں۔ ایک ضلع کے مجسٹریٹ نے بہت سے لوگوں کو بام مچھلیاں پکڑ کر ہلاک کرنے کے لئے ملازم رکھا اور اسطرح انسداد مرض کی بے سود کوشش کی۔ کسی علاقہ میں اس بیماری کو "مینڈک چانگ" اور کسی علاقہ میں "تتلی چانگ" کہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اس بیماری کے اسباب مینڈک اور تتلیاں ہیں۔ بعض چینیوں کے نزدیک اس بیماری کے اسباب مختلف ہیں۔ مثلاً ٹھنڈا پانی اور صبح سویرے اٹھنا۔ بعض پھل۔ زہریلی ہواؤں میں سانس لینا وغیرہ وغیرہ۔ چین کو یکے بعد دیگرے بہت سی وبائیں تباہ کرتی ہیں اور وہ لوگ اس کے انسداد علاج کے لئے مختلف طریقے اور مختلف دعائیں کام میں لاتے رہتے ہیں۔ لیکن چین کے صوبجات یانان اور کیانگسی میں بعض چینی سائنسدانوں نے پچھلے دنوں مرض چانگچائی کی پوری طرح تحقیقات کی تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ بیماری ایک شدید قسم کا ملیریا ہے یعنی باری کا بخار۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مریضوں کو فوراً کونین استعمال کرائی جسکے حیرت انگیز نتائج نکلے۔ انہیں کونین کے ذریعے چانگچائی کے مریضوں کو بھی دم بھر میں اچھا کرنے میں کامیابی ہوئی۔ کونین کے طریقہ استعمال اور اسکی خوراک سے متعلق ہے لیگ اقوام کے ملیریا کمیشن نے ملیریا کے علاج پانچ سات یوم تک پندرہ بیس گرین کونین روزانہ کھلانا تجویز کیا ہے اور انسداد ملیریا کے لئے فصل بھر ۵ گرین کونین روزانہ کھانے کی سفارش کی ہے۔ کمیشن مذکور کی رپورٹ کے چوتھے ایڈیشن کے صفحہ ۱۲۳ پر یہ لکھا ہے کہ کونین ایسی بے ضرر چیز ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی کے بغیر بھی لوگ اس کا استعمال کر سکتے ہیں مگر دوسرے مرکبات کے استعمال میں ڈاکٹر کی نگرانی کی ضرورت ہے۔

بہر حال چانگچائی کی حقیقت پر اسرار کا جو پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اب اٹھ گیا ہے اور ہزاروں جانیں بچانے اور بیماری کی اذیت سے محفوظ رکھنے کے لئے کونین کو وسعت سے استعمال ہونا چاہیے۔

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید بے مثل کتابیں

انقلاب فرانس۔ فرانس کی تحریک آزادی اور وہاں کے انقلاب کی تاریخ میں ہمارے لئے بہت سے سبق ہیں جامعہ ملیہ کے ایک لائق فرزند مولوی عبدالقادر صاحب بی۔ اے نے انقلاب پر اس کتاب میں ایک غائر نظر ڈالی ہے۔ قیمت ... ... ایک روپیہ

دیوان غالب۔ دیوان غالب کا وہ مشہور و معروف نسخہ جو جرمنی میں خاص اہتمام سے چھپوایا گیا ہے بجنسہ دیوان [illegible]۔ مصنف کی سہ رنگی تصویر جو جرمن ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ نہایت نفیس جلد سنہرا کام۔ قیمت قسم اول ۸؍

معاہدۂ عمرانی۔ ژان ژاک روسو۔ مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ) ایم۔ اے پی ایچ ڈی (ہائیڈلبرگ) اس کتاب میں سیاست مدن کے دقیق مسائل باتوں باتوں میں سمجھائے گئے ہیں اس کی یہ کتاب جو معنوی حیثیت سے فلسفۂ سیاست کی اہم کتاب ہے زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے سب سے سہل ہے قیمت مجلد ۱؍

خیالستان۔ سید سجاد حیدر یلدرم۔ کے مختصر مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ابتک اس کے گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں اب بارہواں ایڈیشن خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے قیمت مجلد ...

دنیا کی کہانی۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں ہزاروں برس کی تاریخ اس انداز سے لکھی ہے کہ پڑھنے والا بادشاہوں کی لڑائیاں اور تاریخوں کے گورکھ دھندوں میں پڑے بغیر وہ سب کچھ پا جاتا ہے جو تاریخ کا اصل مفہوم ہے۔ لکھائی چھپائی وغیرہ عمدہ ... ... قیمت عہ

دیوان شیدا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ۔ یہ بھی دیوان غالب کی طرح نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہے اور بالکل ویسا خوبصورت اور خوشنما ہے جیسا دیوان غالب ہے قیمت مجلد ۱؍

یورپ کی حکومتیں۔ اس کتاب میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، سوئزرلینڈ اور جرمنی کے نظام حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت مجلد ۸؍

کلام جوہر حضرت مولانا محمد علی مرحوم کا مکمل مجموعہ کلام جسے مولانا عبدالماجد دریابادی نے خاص کاوش سے مرتب فرمایا ہے پڑھئے اور پاکیزہ مذاق کا لطف اٹھائیے قیمت صرف ۸؍

مرقع ادب۔ مرتبہ [illegible] اس میں ہندوستان کے مشہور انشاپرداز شعرا کے [illegible] ہیں جو انہوں نے [illegible] قیمت [illegible] دوم ۸؍

ملنے کا پتہ:- **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

محمد سراج الدین بہادر ظفر۔ خاتم سلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ از منشی محمد امیر احمد علوی بی اے اس کتاب میں غدر کے حالات بھی درج ہیں جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے قیمت ۲

میدان عمل۔ منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے اسمیں ملک کی موجودہ بیداری بے چین روح کی جیتی جاگتی تصویریں فطری عشق محبت کے سادہ اور دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے صفحات پانسو کتابت اعلیٰ، کاغذ نفیس، روشن طباعت، خوبصورت اور مضبوط جلد دیدہ زیب، ڈسٹ کور قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ ؏

مثنوی سحر یعنی شکنتلا اور دشینت کا اردو ترجمہ حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز، دوسرا اڈیشن جس کی مصنف نے نظر ثانی کی ہے قیمت ؍

نصائح جہانگیریہ یعنی نامور ہندجہانگیر کی مشہور و معروف وصیت کا ترجمہ از جناب پنڈت ہنمنت راؤ صاحب مددگار خزانہ سرکار عالی عامرہ گورنمنٹ نظام قیمت ؏ آنہ

قومی نیز سلنامہ۔ جس میں ۔۔۔ قالب ۔۔۔ نظم و نثر ۔۔۔ رنگین و سادہ ۔۔۔ نفاست ۔۔۔ لاجیت لال

ڈاکٹر سپرو ہمنبر نا تشدد ڈاکٹر اقبال کے خاص پیغامات اور بہت سے قابل قدر مضامین نظم و نثر شایع ہوئے ہیں۔ قیمت ایکروپیہ ؏

اثرستان۔ ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخان اثر لکھنوی کا دیوان جسکا ہر مصرع پرتاثیر اور ہر شعر تیر و نشتر ہے قیمت ؏

نوادر راہ۔ منشی پریم چند مرحوم کی ان کہانیوں کا مجموعہ جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھیں قیمت ایکروپیہ چار آنہ ؏

دنیائے تبسم۔ مشہور ظرافت نویس جناب شوکت تھانوی کے بہترین ظرافت آمیز افسانوں کا مجموعہ قیمت ؏ ایکروپیہ چار آنہ

مجنون کے افسانے۔ جناب مجنوں گورکھپوری اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں موجودہ کتاب اُن کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے قیمت بارہ آنے ۱۲

پس پردہ۔ جناب چندر بھوشن سنگھ کے سات افسانوں کا مجموعہ زبان، پلاٹ اور فلسفیانہ انداز بیان کے اعتبار سے ایک قابل قدر چیز ہے قیمت بارہ آنہ ۱۲

حیات بیوہ۔ جس میں مصنف نے بیوگان کی حالت زار کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور اُن کی جانکاہ مصیبتوں کا دل گداز سین پیش کیا ہے قیمت پانچ آنے ۵

دستیاب کی کتب بیچا چوک کانپور

زمانہ

جلد ۷۷ ستمبر ۱۹۴۱ء نمبر ۳

تعلیم کے نئے اصول

(۱) دیہاتی مدرسے

از مسٹر محمد بشّر علی صدیقی بدایونی، ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

اس زمانے میں تعلیم کا مفہوم وہ نہیں رہا ہے جو اُنیسویں صدی میں یا بیسویں صدی کے آغاز میں تھا۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ لیکن میرا مطلب اس سے ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس سے قبل کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اور کسی نئے اُصول کا طریقۂ تعلیم میں استعمال نہیں کیا گیا۔ روسو، پیسٹالوزی، فروبل ان سب نے تعلیم کے نظریوں میں خوشگوار تبدیلیاں پیدا کیں، اور تعلیم کی تاریخ میں ان کا نام عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔ تعلیم کوئی ایک جگہ رہنے والی چیز تو ہے نہیں کہ اس کے اُصولوں میں کوئی تبدیلی نہ ہو بلکہ وہ تو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے، نئے تجربات کئے جاتے ہیں، نئے نظریات قائم کئے جاتے ہیں، پُرانے اُصولوں کو جدید تحقیقات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے اور ملک کی ضرورت اور وقت کے مطابق ان میں ترمیم بھی کی جاتی ہے۔ "نئی تعلیم" New Education کی اصطلاح سے اب ہمارے کان تھوڑے بہت آشنا ہو چکے ہیں، اور نئی تعلیم کے وفد Delegation. نے ہندوستان کا چند سال ہوئے دورہ بھی کیا تھا۔ اس کے بعض اراکین نے اس موضوع پر الٰہ آباد، علی گڈھ، بنارس وغیرہ میں تقریریں بھی کی تھیں۔ نہایت افسوس ہے کہ ہمارے دیہاتی مدارس باوجود ٹرننگ حاصل کرنے کے اس کی اہمیت کو نہیں محسوس کرتے، اور ان میں سے بیشتر اُسی

پُرانے ڈھرے پر تعلیم دیتے ہیں (جسے کتابیں رٹانا کہنا زیادہ موزوں ہوگا) جس پر کہ بیس پچیس سال پیشتر ان کے پیشرو تعلیم دیتے تھے۔ مجھے کئی ایسے دیہاتی مدرسوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو باوجود کافی بحث و مباحثہ کے اسی بات پر قائم رہے کہ تعلیم کا جدید مفہوم تصوری ہے اور اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ ان اُستادوں کا سب سے زیادہ اصرار امتحان کی تیاری پر تھا غالباً وہ اس کو سب سے زیادہ اہم سمجھتے تھے تعلیم کا جدید مفہوم بچّہ کی انفرادیت کو قائم رکھنے اور اس کی صلاحیتوں کو اُبھارنے پر بہت زور دیتا ہے۔ وہ بچّہ کو سوسائٹی کا ایک کامیاب رُکن بنانا چاہتا ہے۔

تعلیم کا جدید نظریہ بچّہ کے نفسیاتی مطالعہ پر بہت زور دیتا ہے۔ علم النفس کے ابتدائی اصولوں کو جانے بغیر بچّوں کو تعلیم دینا دراصل اُن کی فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ جو استاد بچّہ کی جبلت کے خلاف اُسے تعلیم دیتا ہے وہ ایک سماجی جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ علم النفس کی جدید تحقیقات نے معلمین کے لئے نئی معلومات کا ایک ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ اور جدید اصولوں پر تعلیم دینے والے مدرس کا فرض ہے کہ وہ ان کے سمجھنے کی کوشش کرے۔ زندگی نئے نئے تجربات کا دوسرا نام ہے۔

تعلیم کا جدید نظریہ پُرانے ڈھرے پر پڑھانے والے اُستادوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور پڑھانے کے نئے طریقوں پر زور دیتا ہے۔ کتابیں رٹانا بچّوں کی اختراعی قوت کو سلب کرتا ہے۔ تعلیم کے نئے طریقے مثلاً منصوبی طریقہ (Project Method) ڈالٹن پلان منٹسوری طریقہ سب بچّہ کی صلاحیتوں کے اُبھارنے میں معاون ہوتے ہیں۔ آجکل کھیل اور تعلیم میں کچھ فرق نہیں سمجھا جاتا، بلکہ تعلیم میں کھیل اور کھیل میں تعلیم شامل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بچّہ کا احترام:۔ جدید نظریہ بچّہ کو ایک محکوم کی حیثیت سے پیش نہیں کرتا، وہ اس کا احترام کرتا ہے اور اس پر اچھے دائمی اثرات ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچپن میں جو عادتیں پڑ جاتی ہیں وہ زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ اُستاد اپنی لیاقت، اپنے طرزِ عمل اور ہمدردی سے بچّہ میں اچھی عادتیں پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

بچّہ کی شخصیت کی آرائش:۔ تمام بچّوں کو ایک لکڑی سے ہانکنا اصولی غلطی ہے ہر بچّہ اپنی مخصوص شخصیت کا مالک ہے۔ وہ سماج کا ضروری ایک رکن ہے۔ لیکن ہم اُس کی انفرادی ضرورتوں کو کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتے۔ یہ سچ ہے کہ بہت سی باتیں بچّوں میں یکساں

ہوتی ہیں، لیکن پھر بھی کوئی دو بچے بالکل ایک سے نہیں ہوتے۔ جدید نظریہ بچہ کی انفرادی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اُسے اپنے ماحول میں اچھی چیزیں اپنی ضرورتوں کے موافق منتخب کرنے کا پورا موقعہ دیتا ہے۔ اس طرح بچہ کو اپنی اختراعی قوتیں اُبھارنے میں مدد ملتی ہے

بچہ کی شخصیت اور اسکول:۔ جدید تعلیم بچہ کی شخصیت پر صرف اس صورت میں زور دیتی ہے جب وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کام کرے۔ جب بچہ کا تعلق دوسرے بچوں سے ہوگا تو اُس کی پوشیدہ قوتیں بیدار ہونگی اور وہ ان سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکے گا۔ اسکول میں ایسے مواقع فراہم کرنے چاہئیں جن سے بچے مل کر کام کرنا سیکھیں۔

اتحاد و اتفاق:۔ اسکول میں بچوں کی انجمنیں (Socities) بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اسکاؤٹ کیمپ، تقریر کرنے کی مجلسیں، فوٹو گرافی کی انجمن، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال کے کلب اور عجائب خانہ (Meuseum) ان کی تعلیمی اہمیت سے غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا۔ اگر کسی ہوشیار اور لائق مدرس کی سرپرستی حاصل ہو جائے تو بچوں کی یہ انجمنیں ایک چھوٹا سا خاندان معلوم ہونگی، جن میں ہر ایک بچہ اپنے جوش اور ولولہ، خود اعتمادی اور قوت فیصلہ کا اظہار کر سکے گا:۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ذہنی آزادی:۔ جدید تعلیم اس بات پر زور دیتی ہے کہ بچہ کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے کہ وہ ذہنی آزادی حاصل کر سکے۔ وہ چیزوں کے متعلق خود رائے قائم کرنا سیکھے اور اُن کے سمجھنے کی کوشش کرے۔ دوسروں کی بتائی ہوئی باتیں اور اُصول ممکن ہے کہ اچھے ہوں لیکن جب تک اُنھیں تجربہ کی کسوٹی پر نہ کسا جائے کوئی خوشگوار نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

انبساط و دلجمعی کے لئے تعلیم:۔ جدید تعلیم اس بات پر زور دیتی ہے کہ بچہ جتنی خوشی پڑھنا لکھنا سیکھے۔ جب کام "بیگار" کی شکل اختیار کر لیتا ہے اُس وقت اس کو چھوڑ دینا مناسب ہے ایسا کام کرنے سے بجائے فائدے کے اُلٹا نقصان ہونے کا احتمال ہے۔ اُستاد کو نئے طریقوں کا استعمال کرنا چاہیئے تاکہ بچوں کی دلچسپی برابر قائم رہے۔ اگر پڑھنے لکھنے میں کھیل کود کا لُطف آ جائے تو بہت اچھا ہے۔ حرفوں کے ذریعے جو تعلیم دی جاتی ہے اُس میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ بچے سوت کاتتے وقت تکلی چلاتے وقت باغبانی کرتے وقت یہ محسوس نہیں کرتے کہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں بلکہ ان کو تعلیم غیر شعوری طور پر خود ہی حاصل ہو جاتی ہے۔

مدرسۂ عمل :- جدید تعلیم "کتابی مدرسہ" کی بجائے "مدرسۂ عمل" پر زور دیتی ہے۔ مدرسۂ عمل میں بچے کتابوں کو محض حوالہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مدرسہ ایک قسم کی تجربہ گاہ ہو جاتا ہے اور ہر بچہ کو موقعہ ملتا ہے کہ وہ اپنے حسب ضرورت نئے نئے تجربے کرے۔ اپنے تجربہ سے وہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ کتابی معلومات سے کہیں زیادہ اثرات میں دیرپا ہوتا ہے۔ امریکہ کے مشہور فلسفی اور ماہر تعلیم جان ڈیوی نے شکاگو میں اسی غرض کے لئے بجائے ایک معمولی مدرسہ کے مدرسۂ عمل قائم کیا تھا۔ اور بچوں کو منہوبی طریقہ سے تعلیم دیتے تھے۔ اس میں ان کو اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ انھوں نے تعلیم کے متعلق خود اپنے نظریات قائم کئے اور دنیا کے صف اول کے ماہران تعلیم میں ان کا شمار ہونے لگا۔ آڈلف فیریر (Adolph Farrier.) نے اپنی مشہور کتاب "مدرسۂ عمل" میں اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ بچہ کی دماغی تربیت کے ساتھ ہاتھ اور آنکھ کی بھی تربیت ہونا ضروری ہے۔ مدرسۂ عمل میں بچہ بیکار نہیں رہتا کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔

جدید تعلیم کے ان نظریوں کے ماتحت اگر ہم اپنے یہاں کے دیہاتی مدرسوں کو دیکھیں اور ان کے طریقۂ تعلیم پر غور کریں تو شاید ان اصولوں کے متعلق ہمیں تھوڑی دیر کے لئے کہنا پڑے "ایں خیال است و محال است و جنوں"۔ بیشتر دیہاتی پرائمری مدارس میں صرف ایک یا دو معلّم ہوتے ہیں۔ زیادہ بچے ان کے سپرد کئے جاتے ہیں، اُن کی تنخواہیں قلیل ہوتی ہیں (۲۰ روپیہ ماہوار یقیناً ناکافی ہیں) اُن کو شہر کی سی سہولتیں بھی مہیا نہیں۔ ان کو تمام مضامین پڑھانا پڑتے ہیں اور اس طرح حالانکہ وہ جدید طریقوں سے واقف ہوتے ہیں لیکن ان کا استعمال نہیں کرتے۔ کئی مرتبہ میرے طالب علموں نے مجھ سے کہا کہ آپ کے بتائے ہوئے جدید اصول سر آنکھوں پر لیکن ان پر عمل کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ غالباً اس سے تو کوئی دیہاتی پرائمری اسکول کا مدرس انکار نہیں کر سکتا کہ سنٹرل یا نارمل اسکول چھوڑنے کے بعد تعلیم کے متعلق اُن کے خیالات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ طبیعت پر تھوڑا سا جبر کر کے ان اصولوں پر پڑھائیں تو گو شروع میں اُن کو دقتیں ضرور ہونگی لیکن بچوں کو اس سے بہت فائدہ پہونچے گا اور اُن کی اختراعی قوتیں اُبھر آئیں گی۔ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت قوم کی تعمیر ہے۔ ہمارے دیہاتی مدرس جغرافیہ پڑھانے میں بجائے لوہے اور شیشے کے گلوب کے کارڈ بورڈ کا گلوب استعمال کر سکتے ہیں ماڈل نرم اور چکنی مٹی کے اچھی طرح بنا سکتے ہیں۔ نقشے بھی بجائے دبیز کاغذ پر تیار کرنے کے معمولی کاغذ پر تیار کئے جا سکتے ہیں، اور اب بنیادی طریقۂ تعلیم (Basic Education.) کے رائج

ہوجانے سے ان کی یہ مشکلیں ایک حد تک خود بخود رفع ہوجاتی ہیں۔ وہ بچوں کو کاتنے، بُننے تکلی چلانے، باغبانی کا کام کرنے میں مشغول رکھ سکتے ہیں جب وہ شہر کسی اپنے کام سے آئیں تو بچوں کے حسب مذاق تصویریں اور نقشے خرید کرلے جا سکتے ہیں۔ اس تھوڑی سی رقم خرچ کرنے سے وہ بچوں کو ایک غیر فطری طریقۂ تعلیم سے بچالیں گے۔

دیہاتی مدرسوں کا معائنہ سال میں دو تین مرتبہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب تک معلموں کی ذہنیت نہ بدلے گی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر تیسرے سال دیہات کے معلموں کو تین ماہ کے لئے منٹرل یا نارمل اسکولوں میں پھر بھیجا جائے یا بہت سے سنٹرل اور نارمل اسکولوں میں پُرانے طلبا کا جو سالانہ اجتماع ہوتا ہے اس میں محکمہ ڈپٹی انسپکٹروں کے معرفت پوری تنخواہ پر چھٹی دے تاکہ وہ شامل ہوسکیں۔ اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور دوسرے اساتذہ تعلیمی نمائش اور اسی قسم کی دوسری چیزیں اس دوران میں کریں۔ پُرانے طلبا کے سامنے نمونے کے سبق نئے طلبا اور اُن کے اساتذہ پڑھائیں، تقریریں کریں اور اہم تعلیمی مباحث پر سیر حاصل بحث کی جائے۔ علاوہ ازیں پُرانے طلبا سے کسی تعلیمی موضوع پر مضامین لکھائے جائیں، اور اُن کی ہمت افزائی کے لئے اسکول تمغے یا کتابیں وغیرہ انعام میں دے۔ ایک دوسری کمی جو میں محسوس کرتا ہوں وہ نارمل اسکولوں میں مطبوعہ رسالوں کا نہ ہونا ہے۔ قلمی رسالے اس کمی کو پورا نہیں کرسکتے۔ اگر تمام اس قسم کے اسکولوں کے لئے محکمہ ششماہی یا سالانہ ایک رسالہ اُردو اور ہندی میں شائع کردیا کرے تو میرے خیال میں دیہاتی مدرسوں کو اس سے بہت فائدہ پہونچے گا۔ مضامین اساتذہ نئے طلبا اور پُرانے طلبا لکھیں گے اور اس طرح ہر دیہاتی مدرس کے ہاتھ میں سال کے آخر میں ایک کتاب ہوگی جو اُسے نئی تعلیمی تحریکوں سے واقف کرے گی۔ لیکن اس قسم کے رسالوں کا چندہ بہت کم رکھنا چاہیئے تاکہ ہر ایک مدرس خرید سکے۔

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ دیہاتوں میں ہے۔ اگر یہاں کے بچوں کی تعلیم صحیح اصولوں پر ہوگی تو ملک و قوم دونوں کے لئے فائدہ مند ہوگا۔ مدرسین کو خود اس میں دلچسپی لینا چاہیئے کیونکہ دنیا میں اکثر کام بغیر کسی مالی فائدہ کے صرف عوام کی بہبودی کے لئے بھی تو لوگ کردیا کرتے ہیں۔ دوسری طرف اگر محکمہ کے حکام نے "اونھ" کردی اور یہ بیچارے اسی طرح چیختے رہے تو بھی کسی خوشگوار نتیجہ کی اُمید نہ رکھنا چاہیئے۔

مثنوی کرشن سداماں

(منشی شیام موہن لال جگر بریلوی، بی۔اے)

اگلے وقتوں میں تھا برہمن ایک بھولا بھالا غریب بیکس نیک
ایک بیوی تھی خوشخصال اُس کی نیک و بد میں شریک حال اس کی
زن خوش خو کا تھا سوشیلا نام اور سداماں تھا اُس غریب کا نام
اُنس تھا اُس کو گوشہ گیری سے زہد و طاعت سے اور فقیری سے
رات دن اس کو ہر کے نام سے کام کچھ ہو دنیا میں اپنے کام سے کام
کچھ سروکار مال و زر سے نہ تھا کچھ تعلق کسی بشر سے نہ تھا
فکر کھانے کی تھی نہ پینے کی کوئی سُدھ بُدھ ہی تھی نہ جینے کی
رزق اگر پیٹ بھر نہیں ہے تو ہو تن پہ کپڑا اگر نہیں ہے نہ ہو
مل گیا کچھ تو کھا لیا اُس نے نہیں تو فاقہ ہی کیا اُس نے
بھوک لگتی تھی اُس کو اور نہ پیاس گرمی سردی کا تھا نہ کچھ احساس
لَو ہری نام سے لگائے تھا سارے سنسار کو بھلائے تھا
نورِ حق کی تھی جوت سینے میں ایک امرت تھا اُسکے جینے میں
قلب روشن تھا جان بھی روشن اُس کے دم سے جہان بھی روشن

(سداماں سے سوشیلا کی التجا)

ہے فقیری کو مال و زر سے بیر ہوتے ہیں مفلسی میں اپنے غیر
رفتہ رفتہ یہ اُن کا حال ہوا زندگی کاٹنا محال ہوا
پہونچی نوبت یہ تنگ حالی سے اُن کو فاقے پہ فاقے ہوتے تھے
کوئی ہمدرد و غمگسار نہ تھا وقت بگڑا تھا کوئی یار نہ تھا
اب سوشیلا سے صبر ہو نہ سکا جان پر اور جبر ہو نہ سکا
بولی یوں عاجزی سے اے مہراج اے مرے ناتھ ایک عرض ہے آج
اب تو یہ دکھ سہا نہیں جاتا چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا
آہ کیا ہو گیا تمہارا حال جسم پر رہ گئی ہے کھال ہی کھال
لکڑیاں ہو گئے ہیں ہات اور پاؤں گھُل کے تم رہ گئے ہو اپنی چھاؤں
مجھ کو اب تک نہ دکھ ستاتا تھا وقت کٹنے کو کٹ ہی جاتا تھا
چنی بھوسی میں کر رہی تھی بسر کچھ شکایت نہ لاتی تھی لب پر
ایک دانہ نہیں ہے اب گھر میں پھوس باقی نہیں ہے چھپر میں
جانکر مفلس اور خوار ہمیں کوئی دیتا نہیں اُدھار ہمیں
ٹوم چھلّا بھی میرے پاس نہیں گرو رکھ لاؤں کچھ یہ آس نہیں
دھجیوں کو کئے ہوئے دامن بیٹھی رہتی ہوں اپنا ڈھانکے تن
گھر میں مہماں کوئی اگر آئے کس کی مرجاد لاج بھی جائے
ننگ و ناموس پر بن آئی ہے ایسا جینا بھی بے حیائی ہے
یوں تو مجھ سے جیا نہیں جاتا خون اپنا کیا نہیں جاتا
ضبط اب تک بہت کیا ہم نے صبر کو آزما لیا ہم نے
دھرم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا حرف مرجاد پر نہ آنے دیا
کاٹے کٹتے نہیں ہیں اب ایام کھال تک بیچ دوں چلے گر کام
پڑ رہے جب ہوں جان کے لالے دھرم کو کوئی کس طرح پالے
کرشن بھگوان کے یہاں جاؤ حالِ زار اپنا جا کے دکھلاؤ
وہ ہی دُکھ درد میں ہمارے ہیں ساتھ کھیلے ہوئے تمہارے ہیں
بڑے فیاض ہیں سخی ہیں وہ بے نواؤں کی زندگی ہیں وہ
ساری دنیا کو پالتے ہیں وہی کام سب کے نکالتے ہیں وہی
اُن کی ہو جائے گر نگاہِ کرم چین سے زندگی گزاریں ہم

سداماں کا سوشیلا کو سمجھانا

جانتا ہوں میں اپنا سب احوال جانتا ہوں میں تم کو جو ہے ملال
دُکھ بہت سہتی ہو یہ جانتا ہوں کچھ نہیں کہتی ہو یہ جانتا ہوں
لاکھ سختی ہو سب برداشت کرتی ہو جان پر اپنی جبر کرتی ہو
ایک ڈھانچہ سا رہ گیا ہے بدن چیتھڑے ہیں بجائے پیراہن
ہے مگر بے سبب رنج و ملال رکھو اپنا ذرا بلند خیال
تم زر و مال کی ہوس نہ کرو میں جو کہتا ہوں اُس پہ دھیان دھرو
مال و زر کوئی اچھی چیز نہیں دھنی بھگوان کو عزیز نہیں
چور کا خوف ہے نہ جان کا ڈر پاؤں پھیلا کے سوتے ہیں بے زر
دھن سے باطن سیاہ ہوتا ہے دھن سے صدہا گناہ ہوتا ہے
دھن کی خواہش بخیل کرتی ہے آدمی کو ذلیل کرتی ہے
دھن کے پیچھے جو جان کھوتے ہیں بعد مرنے کے سانپ ہوتے ہیں
دھن سے ملتا ہے تن کو جب آرام نہیں آتا زباں پہ ہر کا نام
جو یہ دُکھ درد اور مصیبت ہے سچ تو یہ ہے بڑی سعادت ہے
یہ گھڑی امتحان کی سمجھو جو مصیبت پڑے خوشی سے سہو
آدمی غم کی آگ میں تپ کر نکھر آتا ہے جیسے خالص زر
چند روزہ ہیں یہ غم و آلام رنج و راحت نہیں کسی کو قیام
چند روزہ یہ زندگانی ہے چند روزہ جہانِ فانی ہے
جس طرح آج تک ہوئی ہے بسر یوں ہی کٹ جائیں گے یہ شام و سحر
جس نے پیدا کیا ہے پالے گا مرنا ہوگا مار ڈالے گا
چھوٹنے دو نہ صبر کا دامن کرشن بھگوان کا کرو سمرن
اپنا تن من جو اُن پہ وارے ہیں وہی سادھارمن کو پیارے ہیں
بادشاہی ہے بندگی اُن کی زندگی ہے تو زندگی اُن کی
بھجن میں جو دن گزاریں گے سیدھے سُرلوک کو سدھاریں گے
جانے کو تو میں جاؤں کرشن کے گھر آتا ہے یہ خیال رہ رہ کر
کرشن بھی اب وہ کرشن ہو گئے ہیں کہ نہیں اب وہ آسمان و زمیں
سمجھوں کس طرح میرے یار ہیں وہ میں گدا اور تاجدار ہیں وہ
مجھکو پہچان لیں وہ کیا معلوم دوست بھی مان لیں وہ کیا معلوم
گھی کے جلتے ہیں جنکے گھر میں چراغ ہوتے ہیں آسماں پہ اُنکے دماغ
جو جہاں میں عروج پاتے ہیں اپنے بچپن کو بھول جاتے ہیں
اور جوان باتوں کا نہیں ہے یقیں صاف سُن لو یہ مجھ سے ہوگا نہیں
کرشن سے جا کے عرضِ حال کروں اپنی خاطر کوئی سوال کروں
مانگنے سے ذلیل کام نہیں منگتے سے بُرا غلام نہیں
بہت اچھا ہے یوں ہی جئے جانا نہیں منظور ہاتھ پھیلانا
نہیں منظور مانگ کر کھانا اس سے بہتر ہے مجھ کو مر جانا

(سوشیلا کا جواب)

دھن کو سمجھے ہو تم بُرا اتنا کبھی اس بات پر بھی غور کیا
دھن سے قائم ہے خیر اور خیرات دھرم کی جان ہے دھنی کی ذات
دھن سے مندر ہیں اور شوالے ہیں جو دھنی ہیں وہ دھرم والے ہیں
ہے نہ دنیا نہ دین کا کنگال اُس سے ہوتا ہے کارِ خیر محال
حق ادا ہو نہ رشتہ داروں کا کام نکلے نہ کوئی یاروں کا
آبرو خاک نردھنی کی نہیں نردھنی کوئی آدمی ہی نہیں
بے زری اور دل کا اطمینان بے زروں کی عذاب میں ہے جان
بس میں بھوک کے کا من نہیں ہوتا بھوک میں ہر بھجن نہیں ہوتا
دھرم جب جائے ناتوانی سے فائدہ ایسی زندگانی سے
میں نے مانا جہان فانی ہے اور دو دن کی زندگانی ہے
یوں بُرے حال سے بھی جینا کیا فاقے کر کر کے خون پینا کیا
پھر یہ سوچو کرو گے کس سے سوال اُن سے جو جانتے ہیں سب کا حال
کب برہمن کو مانگنا ہے بُرا دان لینا تو کام ہے اُس کا
مانگنے ہی سے گر تمھیں ہے عار نہ بناؤ گداگری کو شعار
نہ کرو عرضِ حال ظاہر سے نہ کرو کچھ سوال ظاہر سے

مانگنا ہے بُرا بخیلوں سے مانگنا ہے بُرا ذلیلوں سے
اُس سے مانگو نہ تم جو ہو مغرور اہلِ نخوت کے سایہ سے رہو دُور
لیکن اہلِ کرم کی اور ہے بات اُن سے مانگے سے گھٹ نہ جائیگی ذات
کرشن بھگوان ہیں بڑے داتی کوئی اُن کا ہوا نہ ہے ثانی
ہیں دھنی اور شیام سندر اور ندیاں اور ہیں سمندر اور
بے نوا اور غنی زمانے کے ہیں گدا اُن کے آستانے کے
دردمندوں کے چارہ ساز ہیں وہ تم گدا ہو گدا نواز ہیں وہ
اور تمھارے تو یار غار بھی ہیں دل سے ہمدرد و غمگسار بھی ہیں
لب تک آتے نہ دیں گے حرفِ سوال تم گئے اور ہو کے آئے نہال

(سداماں کی مجبوری اور دوارکا پوری کو روانگی)

نہ چلا ضد کے سامنے کچھ زور ہوا تیار اُٹھا ئی لٹیا ڈور
بولا لے جانے کو ہے کچھ سوغات کرشن کے پاس جاؤں خالی ہات
سب کہیں گے کہ یاد آئے ہیں کوئی تحفہ ضرور لائے ہیں
کنکیاں چاولوں کی تھوڑی سی مانگ لائی پڑوس سے بیوی
پوٹلی باندھ کر بغل میں دبا ہات میں اپنے لیکے ایک عصا
سر جھکائے ہوئے خمیدہ کمر ایک کوپین باندھے ننگے سر
کچھ پریشاں سا اور حیراں سا اپنی حالت پہ کچھ پشیماں سا
دوارکا کی طرف وہ جاتا تھا اور یہ دل میں خیال لاتا تھا
میں سوشیلا کے ڈر سے چل تو دیا جا کے بھگوان سے کہونگا کیا؟
لب تک آنے نہ پائیگی کوئی بات میں کہاں اور کہاں وہ عالی ذات
ہے سوشیلا تو بے سمجھ نادان ہر دم اُس کو ہے مال و زر کا دھیان
اس کو کہئے بھی کیا کہ عورت ہے خواہشِ راحت اُسکی فطرت ہے
کس کو کہتے ہیں گیان کیا جانے پریم کی آن بان کیا جانے؟
اور مجھے احتیاج ہی کیا ہے غمِ دنیا نہ فکرِ عقبیٰ ہے
کوئی ارماں نہ آرزو ہے مجھے مُرلی والے کی جستجو ہے مجھے
ہے وہی اپنا مدعا دل میں نہیں اب کوئی دوسرا دل میں
کس کا جانا ہے کس کا آنا ہے اُس کے دیدار کا بہانا ہے
اُس کا دیدار ہو ہی جائیگا بخت بیدار ہو ہی جائیگا

(دوارکا پوری، سداماں اور کرشن بھگوان)

جب نظر دوارکا پوری آئی آنکھیں سی کھل گئیں سداماں کی
منظر اک سامنے تھا عالی شان اونچے اونچے تھے زر نگار ایوان
سونے چاندی کے تھے در و محراب چوندھیائے نظر وہ آب و تاب
لعل و گوہر جڑے چمکتے ہوئے پردے رنگیں پڑے جھمکتے ہوئے
جھالریں موتیوں کی لٹکی ہوئیں دھوپ چھاں سی نظر میں کرتی تھیں
فرشِ مخمل کے جا بجا تھے بچھے جھاڑ فانوس جگمگاتے تھے
لئے ہاتھوں میں گرز اور عصا پہرے پر پاسبان تھے ہر جا
سامنے باغ کی عجیب بہار پھل بوٹے شجر قطار قطار
گلِ خوشرنگ کیاریوں میں کھلے موتیا موگرا مہکتے تھے
حوضوں میں چھٹ رہے تھے فوارے گرتے تھے آسمان سے تارے
مست ہر سو پرند گانے میں محو کچھ نہر پر نہانے میں
کہیں کرتی تھیں قمریاں کوکو رقص میں مور تھے کہیں لبِ جُو
تھا جو حیران سا جھجک کے چلا سوئے در وہ ٹھٹھک ٹھٹھک کے چلا
بڑھکے دربان نے اُسے ٹوکا قدم اندر بڑھانے سے روکا
پوچھا ہو کون؟ اور کیا ہے نام کہاں جاتے ہو؟ اور کیا ہے کام
بولا وہ ہے میرا سداماں نام کرشن بھگوان سے مجھے ہے کام
میرے بچپن کے ساتھ کھیلے ہیں دونوں ہم اک گرو کے چیلے ہیں
سُن کے دربان مُسکرانے لگا ایک سے اک نظر ملانے لگا
ہاں مگر کچھ زیادہ کہہ نہ سکے اور کھڑے دیکھتے بھی رہ نہ سکے
ایک نے جاکے یوں محل میں کہا در پہ آیا ہے اک بھکاری سا
ہڈیوں پسلیوں کا ہے ڈھانچا سر پہ چھپّر ہے ایک بالوں کا

تن پہ کپڑا نہ سر پہ ٹوپی ہے   اور کمر میں پھٹی لنگوٹی ہے
قحط کا یا وبا کا مارا ہے   آدمی کا ہیکو بال سا ہے
میں تو سمجھا کہ جم کا دوت آیا   چھٹ کے مرگھٹ سے کوئی بھوت آیا
اپنا بتلاتا ہے سداماں نام   اور بھگوان سے بتاتا ہے کام
کہتا ہے میرے ساتھ کھیلے ہیں   دوست ہیں یار غار میرے ہیں
جب یہ بھگوان کو خبر پہونچی   در پہ آج آئے ہیں سداماں جی
سنتے ہی اٹھ کے دوڑتے آئے   لائے رنواس میں گلے مل کے
سونے کے تخت پر بٹھایا پھر   ہات اور پاؤں کو دھلایا پھر
بولے مجھ پر بڑا ہوا یہ کرم   آپ کے اس زمیں پہ آئے قدم
شکر ہے میرے بھاگ جاگے آج   کہئے کیسا مزاج ہے مہراج
بھابی اچھی ہیں آپ اچھے ہیں   کیا کیا حالات اور گھر کے ہیں
دی ہے بھابی نے کچھ نہ کچھ سوغات   نہیں آئے ہیں آپ خالی ہات
پوٹلی سی یہ کیا دبائے ہیں   کوئی تحفہ ضرور لائے ہیں
کہہ کے یہ پوٹلی کو کھینچ لیا   دانہ دانہ زمیں پہ پھیل گیا
چھلکے ایک ایک دانہ پھانک چلے   سب نے انگلی دبائی دانت تلے
دو ہی پھنکی میں دیئے دو لوک   رکمنی نے لیا پھر اُن کو روک
اور کہنے لگیں پکڑ کر ہات   سنئے سنئے ہماری بھی اک بات
سب تو دے ڈالے آسمان و زمیں   ہم کو بھی رہنے دیجئے گا کہیں
پھر لگائی نہ تیسری پھنکی   کھول دی وہ جو بند تھی مٹھی
تھال سونے کے پھر منگائے گئے   کھانے عمدہ لذیذ لائے گئے
خاص اپنی جو اک مسہری تھی   سونے کے واسطے وہ اُن کو دی
بڑی راحت میں دن گزرنے لگے   اب سداماں جی چین کرنے لگے
یوں ہی کچھ روز مہماں رہ کر   لیکے رخصت چلے سداماں گھر

کایا پلٹ

تھے سداماں تو کرشن کے مہماں   ہو گئے گھر پہ اور ہی ساماں
بحرِ رحمت جو جوش میں آیا   دم کے دم میں پلٹ گئی کایا
کلفتیں ساری ہو گئیں کافور   پھر گئے دن ہوئے دلدر دور
ایک ویران جھونپڑی تھی جہاں   سونے کا تھا محل بلند وہاں
اب سنہیلا تھی اور دھن ہی دھن   جہاں دیکھو برستا تھا کنچن
دولت اب اُس کے پاؤں چومتی تھی   سایہ سی ساتھ ساتھ گھومتی تھی
فکر روزی کی تھی نہ کوئی غم   ساری دنیا کی راحتیں تھیں بہم
دل کو حاصل ہوا جو اطمینان   اپنی نادانیوں کا آیا دھیان
تھا فراموش اُنکا حال اُسے   بس سداماں کا تھا خیال اُسے
ناحق کو میں نے کیوں کیا حیراں   اس قدر ہو گئی میں کیوں ناداں
کھائے جاتا تھا رات دن یہ ملال   نہیں معلوم کیا ہے اُن کا حال
کوئی نامہ نہیں پیام نہیں   کچھ تسلی کا انتظام نہیں
میں تو محلوں میں چین کرتی ہوں   آہ بنتی ہوں اور سنورتی ہوں
وہ نہ جنگل میں گم رہے ہوں کہیں   سیر جینے سے ہو نہ جان حزیں
دھوپ میں ہیں نہ جانے چھاؤں میں آہ   چبھ رہے ہوں نہ خار پاؤں میں آہ
فاقے دن رات انھیں ہوتے ہوں   خاک پر ہی کہیں سسکتے ہوں
تف ہے اب میرے ایسے جینے پر   تف ہے راحت کے سر قرینے پر
اُن کو جانے پہ کیوں کیا مجبور   آ گیا کیوں مری سمجھ میں فتور
کچھ نہ کی اُن کی آن بان کی قدر   اُن کی بھگتی کی اور گیان کی قدر
جیسے کچھ ہو رہی تھی اپنی گزر   ہو ہی جاتی دو روزہ عمر بسر
اک نہ اک دن تو مجھ کو مرنا تھا   اُن پر ایسا ستم نہ کرنا تھا
ہو رہی تھی نہ کوئی بد تر بھی   اُن سے کس واسطے میں اڑ بیٹھی
نہیں بھاتے مجھے جواہر و مال   گہنے زیور ہیں جی کا اک جنجال
گل ہیں نظروں میں خار اُنکے بغیر   گلستاں خارزار اُنکے بغیر
جان ہے بیقرار اُن کے بغیر   زندگی بے قرار اُن کے بغیر
یہ محل سونے کا ہے تو کیا ہے   جان جاتی ہوں کاٹے کھاتا ہے

راحتیں اور بھی ستائے ہیں　　سینے میں آگ سی لگائے ہیں
ہوک اٹھتی ہے جلتی ہے چھاتی　　پر جو ہوتے مرے تو اڑ جاتی
وہ یہاں تھے تو ایک جنت تھی　　جھونپڑی میں بھی کیسی راحت تھی
وہ اکیلے ہی تھے مگر کیا تھا　　گھر ہمارا بھرا بھرا سا تھا
اُن سے ویرانے میں بھی بستی تھی　　اُن کی ہستی بھی کیا ہی ہستی تھی
جھونپڑی لالہ زار تھی اُن سے　　زندگانی بہار تھی اُن سے
دل میں اک پیچ و تاب کھائے ہوئے　　اشک آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے
رات دن در پہ ہی جمائے نگاہ　　بیٹھی چپ دیکھتی تھی اُنکی راہ

(واپسی پر سدا ماں کی حیرانی و پریشانی)

جب سداماں جی گھر کے پاس آئے　　اِک طلسمات دیکھا گھبرائے
رنگ ہی اور تھا سماں ہی اور　　تھی زمیں اور آسماں ہی اور
شان ہی اور کاروبار ہی اور　　باغ ہی اور تھا بہار ہی اور
نہ وہ کوچہ نہ جھونپڑی ہی تھی　　اک حویلی کھڑی تھی کنچن کی
دھوپ میں وہ ستون اور بام　　جگمگاتے تھے آئینے سے تمام
سامنے ایک پر فضا گلزار　　پھول پھولے ہوئے تھے رشکِ بہار
داسیاں زرق برق پہنے لباس　　ٹکے تھے جن میں گوہر و الماس
لدی گہنوں میں سر سے تا بقدم　　کرتی پھرتیں ادھر اُدھر چھم چھم
سہم کر رہ گئے یہ دیکھ کے رنگ　　کچھ نہ آیا سمجھ میں عقل تھی دنگ
دور اک کونے میں کھڑے ہو کے　　کہتے تھے دل ہی دل میں رو رو کے
ہائے بھگوان ماجرا کیا ہے　　دو ہی دن میں یہ ہو گیا کیا ہے
کیسے بدلے میں آسمان و زمیں　　کچھ بھی میری سمجھ میں آتا نہیں
ہائے میں گھر سے کیوں نکل کے گیا　　پڑ گیا عقل پر مری پردا
میں نے عورت کی بات کیوں مانی　　ہو گئی مجھ سے کیسی نادانی
اور بھی اب تو ہو گیا میں تباہ　　لٹ گئی میری جھونپڑی بھی آہ
میرے پڑ رہنے کا وہ کونا آہ　　اور وہ پھوس کا بچھونا آہ

کس قدر دیتے تھے مجھے آرام　　کیسے ہی گرم و سرد ہوں ایام
اور وہ میرے درد و غم کی شریک　　جان کی پاسبان دم کی شریک
فقر و فاقہ میں غمگسار مری　　وہ سوشیلا وفا شعار مری
رنج پیری میں چارہ ساز مری　　راحتِ روح و دلنواز مری
کھا گئی کیا اُسے بھی آہ زمیں　　اب تو دنیا میں کوئی میرا نہیں
اے سوشیلا تجھے کہاں ڈھونڈھوں　　کس طرف آہ جانِ جاں ڈھونڈھوں
بیکس و پیر و ناتواں ہوں میں　　زار و بدحال خستہ جاں ہوں میں
کوئی مونس نہیں ہے یار نہیں　　کوئی تدبیر و چارہ کار نہیں
اب کہیں بھی مجھے پناہ نہیں　　موت پر اختیار آہ نہیں
کس قدر مجھ پہ تنگ ہے یہ جہاں　　جاؤں تو میں کہاں رہوں تو کہاں
آہ مارا ہوا نصیبوں کا　　ہائے میں اب کہیں کا بھی نہ رہا
ہوش غائب ہیں عقل ہے حیراں　　اب کہاں جاؤں کیا کروں بھگواں

سداماں اور داسی

تھے بڑے رنج میں سداماں جی　　اُن کے پاس آئی لتنے میں داسی
اور کی عرض ہات جوڑ کے یوں　　آپ ٹھٹکے یہاں کھڑے ہیں کیوں
آئیے آپ ہی کا ہے یہ محل　　دیوی جی درشنوں کو ہیں بیکل
چلئے وہ آپ کو بلاتی ہیں　　چلئے ورنہ وہ خود ہی آتی ہیں

(سداماں)

تو ہے کون؟ اور کام کیا مجھ سے　　کچھ نہیں میرا واسطہ تجھ سے
میرا ہو اور یہ قصرِ شاہانہ　　مجھ کو سمجھا ہے کوئی دیوانہ
مجھ سے اور دیوی جی سے کیا نسبت　　مجھ سے شاہنشہی سے کیا نسبت
کس لئے مجھ کو وہ بلانے لگیں　　کس لئے مجھ پہ رحم کھانے لگیں
ہاں میں سمجھا بلا رہی ہیں ضرور　　قید میں ہو گا ڈالنا منظور
چھل نہ کر مجھ سے کیا کہوں تجھ کو　　رہنے دے اپنے حال پر مجھکو
آہ ہے جس جگہ محل اونچا　　تھا یہیں ایک جھونپڑا میرا

اور اُسمیں تھی ایک دیوی بھی　جیسے مورت ہو پریم کی کوئی
دیکھئے آگے بخت کیا دکھلائے　کہاں لے جائے کس کا بندہ بنائے

(سداماں)

اب نہ وہ جھونپڑی نہ دیوی ہے　خانہ ویرانی ہے مراجی ہے
جس نے بے خانماں کیا مجھکو　یہ محل بھی اُسے مبارک ہو
جان کر بیکس اور غریب مجھے　ناتواں پیر و بدنصیب مجھے
کیوں چڑھاتی ہے کیوں ستاتی ہے　کیوں کٹے میں نمک لگاتی ہے

(داسی)

ایسی باتیں نہ کیجئے مہراج　بھاگ جاگے ہیں ہم سبھوں کے آج
ایک داسی ہوں میں یہ میری مجال　دل لگی کر سکوں کہاں ہے خیال
یہ محل اور یہ دھن سب آپکا ہے　یہ بہار اور چمن سب آپکا ہے
جھونپڑی کی جگہ حویلی ہے　کون دشوار یہ پہیلی ہے
کڑایاں جو آپ نے اُٹھائی ہیں　پھل وہ انجام کار لائی ہیں
ہے جو سونے کا سامنے یہ محل　آپ کی طاعتیں ہوئی ہیں سپھل
کرشن بھگوان کی یہ مایا ہے　اس میں حیرت ہی آپ کو کیا ہے
دین پر جب وہ آ اترتے ہیں　ذرّے کو آفتاب کرتے ہیں
ہے یہ جو کچھ کیا اُنھیں کا ہے　مال و زر سب دیا اُنھیں کا ہے
آپ کی استری ہیں دیوی جی　دیکھئے تو وہ جھانکتی ہیں کھڑی
رات دن در پہ ہی لگائے نگاہ　دیکھا کرتی ہیں کب سے آپ کی راہ
مجھسے گر کچھ خطا ہوئی انجان　کیجئے مجھکو معاف ہوں نادان
ہوئیں سب کی دعائیں بار آور　آگئے آپ باغ باغ ہے گھر
جیل کی اسمیں کوئی نہیں ہے بات　چلئے مہراج جوڑتی ہوں ہات

(سداماں)

تنگ ہوں میں تری ڈھٹائی سے　اچھا چلتا ہوں بے حیائی سے
جو دکھایا نصیب نے دیکھا　کیا نہ کچھ مجھ غریب نے دیکھا

(سداماں اور سوشیلا)

گھر میں آئے اُدھر سداماں جی　ہات جوڑے بڑھی سوشیلا بھی
تھی اُدھر حیرت اور استعجاب　تھے ادھر شوق و دیدۂ پرآب
ہوئی دو چار جب نظر سے نظر　آنکھوں آنکھوں میں کھل گئے دفتر
دونوں جانب نکل پڑے آنسو　اُمنڈ آئے اُبل پڑے آنسو
اور سوشیلا نے مضطرب ہو کر　رکھدیا اپنا اُس کے پانوں پہ سر
باہم احوال سب سنائے گئے　گیت رادھا رمن کے گائے گئے
پھر نئی سر سے زندگانی تھی　شادمانی ہی شادمانی تھی

(غزل)

مایلِ لطف مہ جبیں ہے آج　نگہ ناز دلنشیں ہے آج
اِس تصوّر پہ کیا نثار کروں　ہات میں زلفِ عنبریں ہے آج
کیف و مستی بکھیرتی پھرتی　نگہ چشم سُرمگیں ہے آج
آپ ہیں اور آپ کا جلوہ　میرے دل میں کوئی نہیں ہے آج
یہ تو موجیں سُرور کی سی ہیں　کہیں دل میں چسک نہیں ہے آج
روح کسکی جھلک سے وجد میں ہے　غمِ دل کیف آفریں ہے آج
رقص کرتے ہیں آسمان و زمیں　نغمہ زن کوئی مہ جبیں ہے آج
دور تھا جو قیاس سے بھی دُور　رگِ جاں کے وہی قریں ہے آج
کس کے گیسو کا پڑ گیا سایہ　خاکِ دل نکہت آفریں ہے آج
ناز کرتا ہوں اپنی قسمت پہ　آپ کے پانوں پر جبیں ہے آج
اپنی کملی میں تاجدار جہاں
جگرِ خستہ و حزیں ہے آج

زعمِ خودی

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔اے)

بڑے ناداں ہیں جو اس نیستِ انسانی پہ مرتے ہیں
وہ زندانی جو قیدِ سختِ زندانی پہ مرتے ہیں
پشیمانی ہماری ناپشیمانی سے بہتر ہے
پشیماں ہو کے بیٹھے ہیں پشیمانی پہ مرتے ہیں
پرستارِ خودی کس عکس پر حیران ہوتے ہیں
عدوئے بیخودی ہیں یا کہ حیرانی پہ مرتے ہیں
بہک جاتے ہیں جو کچھ اور بھی سمجھائے جانے پر
یہ پتلے عقل کے جو عقلِ انسانی پہ مرتے ہیں
سرورِ انبساطِ بیخودی سمجھے ہیں نشہ کو
بڑے ناداں ہیں جو اس اپنی نادانی پہ مرتے ہیں

ہماری خود پسندی ہی ہمیں مدہوش لے ڈوبی
مگر ہم ہیں کہ اس نخوت کی طغیانی پہ مرتے ہیں

شکریۂ کشمیر

از جناب الطاف مشہدی

کشمیر کی حسین بہاروں کا شکریہ
دل چھین لینے والے نظاروں کا شکریہ
ہوتے ہیں آسمانِ محبت سے جو طلوع
اُن برق در کنار ستاروں کا شکریہ
پھرتا ہے جن پہ حسن جوانی کی مے کے ساتھ
اُن سحر بار سبز کناروں کا شکریہ
لیتی ہے جن میں کروٹیں پُر کیف راگنی
اُن ننھی ننھی مست پھواروں کا شکریہ
جو سُرخ دامنوں سے اُلجھتے ہیں وقتِ سیر
اُن خوش نصیب پودوں کے خاروں کا شکریہ
بدمست انکھڑیوں سے ٹپکتی ہے جو شراب
اُس کے شباب خیز خماروں کا شکریہ
لے لے کے جن کو اٹھتی ہے محبوبہ نگاہ
اُن سبز، سُرخ، پیلے سہاروں کا شکریہ

الطاف جا رہا ہوں میں مجبورِ روزگار
اللہ پھر نصیب کرے یہ حسیں دیار

رائے چندر بھان برہمن

(از مسٹر رفیق احمد مارہروی)

رائے چندر بھان برہمن فارسی زبان کے بلند پایہ اور مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ان کی زندگی کے صحیح حالات قعر گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، ان تذکروں میں اس درجہ اختلاف ہے کہ صحیح حالات کا متلاشی اُن سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ موجودہ تذکروں میں اس بات کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے اور اُن کے اجداد کس ملک یا دیس سے وارد ہوئے، کوئی ان کا مولد و مسکن دہلی بتاتا ہے اور کوئی آگرہ[1]، کوئی لاہور[2] اور کوئی ان کو کشمیر کا رہنے والا بتاتا ہے[3]۔ لیکن جہاں تک میں مختلف و متعدد کتابوں کا مطالعہ کر سکا ہوں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ برہمن کے جد اعلیٰ سکندر کے زمانے میں کشمیر[4] سے روانہ ہوئے اور آگرہ میں قیام کیا۔ برہمن کے والد کا نام دھرم داس تھا جنھوں نے جلال الدین اکبر کے زمانہ میں سنسکرت کی تعلیم پوری کرنے کے بعد اسلامی لٹریچر میں بھی پوری دستگاہ پیدا کی اور شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ روز افزوں ترقی کر کے منصب دار سلطنت ہونے کا فخر حاصل کیا[5]۔

~~۹۷۲ھ~~ / ۱۵۷۵ء میں برہمن پیدا ہوئے۔ ان کی جائے ولادت کے باب میں بھی اختلاف ہے، زیادہ تحریریں لاہور کے متعلق ملتی ہیں، حالانکہ لاہور کے متعلق خود برہمن نے "انشا، چہار چمنی[6]" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

"این نیاز مند بہ دارالسلطنت لاہور بمقتضائے لطافت آب و ہوا و اقسام خوبیہائے کہ دم حالات

بہ قسمت اتحاد می زند رسید"۔

پنڈت چندر بھان شروع شروع میں عبدالکریم میر عمارات (جن کے اہتمام سے تاج محل تیار ہوا) کے پاس لاہور میں رہا کرتے تھے۔ انھیں کے ذریعہ افضل خاں شیرازی وزیر اعظم شاہجہاں تک رسائی ہوئی

---

[1] رسالہ اُردو ۔ جولائی اگست ۱۹۰۳ء

[2] تذکرہ بہار گلشن کشمیر جلد اول صفحہ ۱۱۲ و کتاب امرائے ہنود صفحہ ۱۹۳

[3] ریاست گوالیار کے سرکاری کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب "شاعران کشمیر" ہے اسمیں برہمن کو کشمیری قرار دیا ہے۔

[4] تذکرہ بہار گلشن کشمیر جلد اول صفحہ ۱۱۲

[5] بہار گلشن کشمیر جلد اول صفحہ ۶۶۳

[6] جو خانہ ریاست کپور تھلہ میں اس کتاب کا ایک قدیم ترین نسخہ موجود ہے۔ [7] امرائے ہنود صفحہ ۱۹۳

اور اپنی لیاقت و دانائی کی بنا پر وزیر مذکور کے یہاں دیوان مقرر ہو گئے۔ افضل خاں کی وفات (۱۰۴۸ھ) کے بعد جب بادشاہ لاہور پہونچے تو افضل خاں کے تمام متعلقین اور ملازمین کو پیش ہونے کا حکم ملا، اس تقریب سے چندربھان بھی پیش ہوئے، آدمی زیرک تھے ایک رباعی لکھکر لے گئے، بادشاہ کے حضور پیش کی، رباعی آپ بھی سُنیئے:۔

شاہے کہ مطیع او عالم گردد ہر جا کہ سریست او خم گردد
از لیکہ بدورش آدمی یافت شرف خواہد کہ شرف نیر اعظم گردد[1]

یہ رباعی معنوی اعتبار سے بہت دلپذیر ثابت ہوئی اور پنڈت نے اس کو اس قدر خوش خط لکھکر پیش کیا تھا کہ بادشاہ دیکھکر باغ باغ ہو گئے۔ نوازش شاہانہ سے برہمن کو سرفراز کیا۔ ملازمانِ اہل قلم میں اسی وقت منسلک کر دیے گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد شاہزادہ دارا شکوہ[2] کو برہمن کی شاعری، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی نے گرویدہ کر لیا، اس نے باپ سے برہمن کو مانگ لیا اور اپنے یہاں میر منشی کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ ۱۰۶۶ء میں جب سعد اللہ خاں وزیر سلطنت کا انتقال ہو گیا تو شاہجہاں نے برہمن کو پھر اپنے یہاں بلا لیا اور خطاب "رائے" سے مفتخر فرما کر دفتر شاہی کا میر منشی مقرر کر دیا۔ مؤلف بہارگلشن کشمیر کا قول ہے کہ شاہجہاں نے سعد اللہ کے انتقال کے بعد اُن کو اپنا وزیر مقرر کیا[3]۔ بہرحال کچھ بھی ہو یہ امر مسلمہ ہے کہ پنڈت چندربھان کسی نہ کسی طرح اورنگ زیب کے زمانہ سلطنت تک نوازشات شاہانہ سے فیضیاب ہوتے رہے۔ لیکن جب دارا شکوہ قتل کیا گیا تو اس شاعر مزاج برہمن کو اپنے خاص قدردان اور مربی کی جدائی بہت شاق گزری اور وہ اتنا متاثر ہوا کہ شاہی ملازمت سے مستعفی ہو کر بنارس چلا گیا اور باقی تمام عمر عبادت و ریاضت میں گزار دی۔ پنڈت چندربھان نے ۹۰ سال کی عمر پا کر ۱۰۷۳ھ[4] میں بنارس ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس نے اپنے زمانہ امارت میں آگرہ میں ایک وسیع تالاب اور ایک خوش نما باغ تعمیر کرایا تھا۔ اور باغ کے اندر ایک عمارت بنوائی تھی۔ افسوس آگرہ کی صدہا دوسری لاجواب عمارتوں کی طرح برہمن کا تالاب اور باغ کی عمارت بھی آج مفقود ہے۔ صرف باغ کی عمارت کا دروازہ اپنے بانی کی عظمت کے ثبوت میں اب تک برقرار ہے۔ ۱۸۵۵ء میں یہ باغ ایک انگریز کے قبضے میں تھا، اس نے آگرہ کے ایک ساہوکار لالہ سورج بھان ساکن محلہ بیلن گنج کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ لالہ سورج بھان نے نہ صرف باغ کے

---

[1] امرائے ہنود صفحہ ۱۰۳ پر نیر آدم لکھا گیا ہے۔ [2] تذکرہ بہار گلشن کشمیر میں بہ صفحہ ۱۱۲ جلد اول پر یہ روایت شاہزادہ خرم یعنی خود شاہجہاں سے وابستہ دکھائی گئی ہے۔ [3] بہار گلشن کشمیر جلد اول صفحہ ۱۱۲ [4] رسالہ اردوئے معلیٰ اگست ۱۹۱۰ء میں مولوی حامد حسن صاحب قادری نے تاریخ ادبیات اردو کے صفحہ ۲ پر برہمن کا سال ولادت ۱۰۹۳ھ لکھا ہے اور مؤلف امرائے ہنود نے ۱۰۷۳ھ صفحہ ۱۰۴

باقی ماندہ آثار ہی کو محفوظ رکھا بلکہ اُس کی تباہ حالت کی درستی میں بھی کافی دلچسپی لی۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے لالہ چندربھان مالک ہوئے، اُنھوں نے بھی باغ کے بانی کے نام کو برقرار رکھنے کے لیے اس کی پوری پوری نگہداشت کی۔ عجیب اتفاق ہے کہ زمانہ کے اُلٹ پھیر نے ایک ایسا موقع بھی پیدا کر دیا کہ باغ کے بانی اور موجودہ قابض میں نام کی یکسانیت و مناسبت کی صورتیں بھی پیدا ہوگئیں۔

پنڈت چندربھان نہ صرف ایک ہندو امیر کی حیثیت سے مشہور ہیں بلکہ شاعرانہ اعتبار سے بھی وہ پوری شان و شہرت کے مالک ہیں۔ وہ فارسی کے زبردست شاعر تھے جس کی بنا پر ان کا شمار اساتذہ میں ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے برہمن کے شاعرانہ کمالات کے اظہار کے ساتھ ہی ان کی ذات سے کچھ دلچسپ روایات بھی وابستہ کر دی ہیں۔ مگر ان سے کوئی خاص واقفیت حاصل نہیں ہوتی مثلاً ایک دفعہ شاہزادہ دارا شکوہ نے برسر دربار شاہجہاں سے عرض کیا کہ پنڈت چندربھان نے ایک عجیب شعر کہا ہے، اگر حکم عالی ہو تو انھیں بلا کر وہ شعر حضور کو بھی سنواؤں۔ بادشاہ نے اجازت دی چندربھان فوراً حاضر دربار ہوئے، دربار میں اور بھی متعدد کاملین موجود تھے۔ اُن کی موجودگی میں برہمن نے بادشاہ کو یہ شعر سنایا ؎

مرا دلے است بکفر آشنا کہ چندیں بار ... بہ کعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

شعر سُن کر بادشاہ کے چہرے پر برافروختگی کے آثار پیدا ہوئے۔ نواب سعد اللہ خاں نے اس بے لطفی کا احساس کر کے فوراً بادشاہ کے حضور عرض کیا کہ سعدی علیہ الرحمہ آج سے چار سو سال پہلے اس کا جواب فرما گئے ہیں، ملاحظہ ہو:-

خر عیسٰے اگر بہ مکہ رود ... چوں بیاید ہنوز خر باشد

یہ شعر سنتے ہی بادشاہ مسکرا دیئے۔ برہمن کے شعر سے مزاج میں جو تکدّر پیدا ہوگیا تھا رفع ہوگیا۔

دوسری ایک روایت ہے کہ عالمگیر نے اپنے عہد حکومت میں کسی مندر کو توڑنے اور اس کی جگہ مسجد بنانے کا حکم دیا۔ برہمن اُس وقت موجود تھے، اُنھوں نے برجستہ بادشاہ کو یہ شعر موزوں کر کے سنایا ؎

ببیں کرامتِ بت خانۂ مرا اے شیخ ... کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

جہاں تک شاعرانہ آزاد خیالی اور برجستگی کا تعلق ہے برہمن کے فارسی کلام میں اس سے زیادہ

---

[1] مولف امرائے ہنود لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ افضل خاں کے عہد وزارت کا ہے جب کہ انھیں کے یہاں بر سر مشاعرہ برہمن نے یہ شعر پڑھا، اس مشاعرے میں بادشاہ بھی شریک تھے ص ۱۸۵

بلند اور شوخ اشعار ملتے ہیں اور اُن کی برجستگی سے کوئی نہ کوئی حکایت تراشی جا سکتی ہے. لیکن اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو شاعرانہ خیال آرائیوں سے آگے اس قسم کے اشعار کی کوئی اصلیت نہیں. آخرالذکر روایت تو بالکل مہمل ہے، اورنگ زیب کے متعلق جو بعض تواریخ نے شہرت دے رکھی ہے اس سے متاثر ہو کر سیکڑوں غلط اور من گھڑت باتیں اس سے وابستہ کر دی گئی ہیں۔ برہمن دارا شکوہ کے قتل کے بعد فوراً بنارس چلے گئے تھے۔ اس وقت تک اورنگ زیب خود اپنی جڑ مضبوط نہ کر سکا تھا۔ اندرونی چیرہ دستیوں اور ریشہ دوانیوں سے ہی اُسے فرصت نہ تھی کہ وہ کسی مندر کو مسمار کرانے اور اس کے بجائے مسجد بنانے کی طرف متوجہ ہوتا اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بڑی حیرت کی بات ہے کہ وہ متعصب بادشاہ جو اپنی رعایا کی عبادت گاہ کو مسمار کر کے اپنی قوت و جبروت کا اُن کے دلوں پر سکہ بٹھا رہا تھا عین اُس وقت اتنا نرم کیونکر ہو گیا کہ برہمن نے اُس کے منہ پر اُس کے جابرانہ حکم کے خلاف ایسا شعر پڑھ دیا اور اُس نے پنڈت جی کو زندہ و سلامت چھوڑ دیا۔

پنڈت چندر بھان ایک ایسے زمانے کے شاعر ہیں جس زمانے کے بعض مسلمان شعرا اُردو شاعری کے اعتبار سے کافی مسالا چھوڑ گئے ہیں۔ برہمن فارسی کے شاعر تھے، لیکن ان کے زمانہ میں چونکہ اُردو زبان بھی عام طور سے شعرا کے منہ لگ چکی تھی اس لئے انھوں نے بھی اُردو میں کچھ اشعار کہے، پوری صحت کے ساتھ برہمن کی صرف ایک غزل ملتی ہے۔ اس غزل کی دستیابی سے یہ غور کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ برہمن نے اس سے زیادہ بھی اُردو اشعار کہے ہونگے، جو غالباً حوادث زمانہ کے نذر ہوئے۔ اس دَور کے محققین اس طرف توجہ فرمائیں تو ممکن ہے کہ پنڈت چندر بھان کی اُردو شاعری پر جو پردے پڑے ہوئے ہیں چاک ہو جائیں۔

مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں وَلی دکنی کو اُردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا تھا لیکن اس زمانہ کی تلاش و تحقیق نے ان کے نظریہ کو باطل کر دیا ہے۔ ولی سنہ ۱۰۷۹ھ میں پیدا ہوئے چندر بھان نے سنہ ۱۰۷۳ھ میں ۹۱ سال کی عمر پا کر وفات پائی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ برہمن وَلی کی پیدائش سے چھ سال قبل فوت ہو چکے تھے۔ وَلی ۳۴ سال کی عمر میں محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں (سنہ ۱۱۱۲ھ / ۱۷۰۰ء) دلی وارد ہوئے لیکن اس وقت شاعرانہ حیثیت سے شمالی ہند میں ان کی کوئی شہرت نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے پورے بیس سال بعد سنہ ۱۱۳۲ھ / ۱۷۲۱ء میں جب اُن کا دیوان دکن سے دہلی آیا تو لوگ اُن کی شاعری سے واقف ہوئے۔ وَلی کی عام شہرت شاعرانہ یا دلی کی آمد کے زمانے کے لحاظ سے اگر پنڈت چندر بھان کی شاعری کا بھی ایک زمانہ متعین کر لیا جائے تو وہ وَلی سے ستانوے ۹۷ سال پہلے کے شاعر

متصور قرار پاتے ہیں[1]۔ یہ آگے پیچھے کا بظاہر معمولی فرق ہے لیکن اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ برہمن جہاں ولی سے مقدم تھے وہیں اردو کے پہلے شاعر[2] بھی تھے:-

خدا جانے یہ کس شہر اندر ہمیں کو لا کے ڈالا ہے ۔۔۔ نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے پیالا[3]
پیا کے نام کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے ۔۔۔ نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
پیا کے نام عاشق کوں قتل باعجب دیکھے ہوں ۔۔۔ نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے
خوباں کی باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یاراں ۔۔۔ نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیاسیں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

افکارِ پریشاں

(از حضرت جگر بریلوی)

جو رات اتنی بھیانک تھی کیا سہانی ہے ۔۔۔ بڑے مزے کی کہانی تری کہانی ہے
مری زباں پہ یہ کس رنگ کی کہانی ہے ۔۔۔ شباب و عشق سے معمور زندگانی ہے
گزر گئی شبِ غم ہے نمودِ صبحِ نشاط ۔۔۔ نفس نفس میں جوانی ہے شادمانی ہے
چمک رہا ہے زمانے میں داغِ عشق مرا ۔۔۔ سیاہی شبِ دیجور پانی پانی ہے
یہ کس کے کوچے سے آ کر نسیم نے چھیڑا ۔۔۔ مری رگوں میں نئے خون کی روانی ہے
ٹھکانے لگتے دے مٹی بھی اب یہیں میری ۔۔۔ تمام عمر ترے در کی خاک چھانی ہے
جگا کے خاک کے پتلوں میں درد بھر دے گا ۔۔۔ ترا پیام ہے اور وہ مری زبانی ہے
اسی کی عمر گزرتی ہے تری قربت میں ۔۔۔ جسے ہراس یہ رہتا ہے موت آنی ہے
سناؤں گا تمھیں رودادِ زیست سوچ تو لو ۔۔۔ پرانی بات ہے بھولی ہوئی کہانی ہے
خطا معاف جو چھیڑا ہے تو سناتا ہوں ۔۔۔ نہ سن سکو گے مگر تم یہ وہ کہانی ہے
بہت کڑی ہے تری راہ اور منزل دور ۔۔۔ فگار پاؤں ہیں پیری ہے ناتوانی ہے
دلوں دلوں ہی میں ہوتے ہیں ان سے راز و نیاز ۔۔۔ بڑے مزے کی محبت کی زندگانی ہے
اٹھا رہا ہوں مزے تیرے لطفِ پنہاں کے ۔۔۔ عجیب چیز خموشی ہے بے زبانی ہے
حیات آپ کی، میں آپ کا، دل آپ کا ہے ۔۔۔ حضور، کس لئے پھر مجھ سے سرگرانی ہے
میں جانتا ہوں کہ دردِ فراق کیا شے ہے ۔۔۔ یہ یادگار تری ہے تری نشانی ہے
جگر کا نام مٹائے سے مٹ نہیں سکتا ۔۔۔ وہ اس جگہ ہے جہاں عمر جاودانی ہے

---

[1] مؤلف دکن میں اردو نے سنہ ولادت [illegible] لکھا ہے [2] تاریخ تنقید ادبیات اردو مؤلفہ حامد حسن قادری صفحہ ۱
[3] تذکرہ مخزن الشعرا مؤلفہ قاضی نورالدین میں یہ شعر گجرات کے ایک شاعر (جن کا تخلص باقی تھا) کے نمونۂ کلام میں دیا گیا ہے اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ یوں لکھا ہے، دیکھو ص۲۹ مطبوعہ انجمن ترقی اردو

خدایا کیسے ویرانے میں تو نے ہم کو ڈالا ہے ۔۔۔ نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

مطربِ ناشاد

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔ اے۔)

مطربِ ہستی مجھے کوئی نیا نغمہ سُنا		طرز ہو جس کی نئی، انداز ہو جس کا نیا
راگ ہو چھوٹا سا اور دھیمی تری آواز ہو		ساتھ اس آواز کے ہلکا سا بجتا ساز ہو
وہ سنا دے نغمہ جس سے روح میری شاد ہو		جس کو سُن کر قیدِ غم سے دل مرا آزاد ہو
جس کو سُن کر بھول جاؤں میں غمِ ایام کو		جس کو سُن کر چین آ جائے دلِ ناکام کو
جس کو سن کر خود فراموشی سی ہو جائے مجھے		محفلِ ہستی میں خاموشی نظر آئے مجھے
جس کی ہر ہر تان سے پیدا ہو مجھ میں بیخودی		جس کے ہر آہنگ سے طاری ہو مجھ پر بے ہُستی
جس کے سننے سے بدل جائے زمانے کی فضا		خود بخود آنے لگے دل کو حقیقت کا مزا
جس سے قلبِ مضطرب کی بے قراری دُور ہو		چشمِ پُرنم سے خیالِ اشکباری دُور ہو
جس کی لَے کے زیر و بم سے بیخبر ہو جاؤں میں		جس کو سنتے سُنتے اطمینان سے سو جاؤں میں
رُک گیا ہے کس لئے مطرب ابھی تو گائے جا		بند ہیں آنکھیں مگر میں ہوں ابھی تک جاگتا

گائے جا اے مطربِ ہستی ابھی تو گائے گا

پیغام

(از راجہ مہدی علی خاں)

اُس سے جا کر کوئی کہے ہمدم		تو نے تھا جس کو بے قرار کیا
اور جسے تو نے عمر بھر کے لئے		وقفِ اندوہِ انتظار کیا
اس نے چھوڑا نہ رشتۂ اُمید		ہر گھڑی تجھ پہ اعتبار کیا
لب پہ لایا نہ دل کی بات کبھی		لاکھ سوزِ دروں نے زار کیا
اس کا ایک ایک اشک تھا موتی		اُس نے جو صرفِ رہ گذار کیا
جس کو اک اک گھڑی تھی عمرِ طویل		عمر بھر اس نے انتظار کیا
اس کے انجام نے اگر تم کو		کبھی بھولے سے سوگوار کیا
تم نہ شرمانا، تم نہ پچھتانا		ہاں کبھی، قبر تک چلے آنا

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

(از سید اصغر علی سکندر آبادی)

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے نام کے ساتھ آنجہانی لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے۔ کسے خبر تھی کہ ان کی یہ طویل علالت جان لیوا ثابت ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی طبعی عمر کو پہونچ چکے تھے لیکن وہ قوم جس میں قحط الرجال ہو کس طرح اپنے ایک عظیم المرتبت فرزند کی موت پر (گو وہ فطری ہی کیوں نہ ہو) ماتم نہ کرے۔ ڈاکٹر ٹیگور کی وفات سے بنگال کا ایک زبردست شاعر اور ادیب، ہندوستان کا صادق محب وطن اور جاں نثار فرزند اور دنیا کی ایک جلیل القدر ہستی کی جگہ کم ہوگئی۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی وفات کلکتہ میں اپنے خاندانی مکان میں ۷۔ اگست ۱۹۴۱ء کو جمعرات کے دن اسّی سال تین ماہ کی عمر میں ۱۲ بجکر ۱۳ منٹ پر (کلکتہ کا مقامی وقت) واقع ہوئی۔ اسی دن شام کو دریائے گنگا کے کنارے نیم تولہ گھاٹ پر ان کے جسد خاکی کو نذر آتش کر دیا گیا۔

ڈاکٹر ٹیگور کی صحت ۱۹۳۷ء ہی سے خراب تھی۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں شانتی نکیتن میں وہ بہت زیادہ بیمار ہوگئے تھے۔ جب انھیں کچھ افاقہ ہوا تو مزید علاج کے لئے کلکتہ لائے گئے۔ تین سال بعد ستمبر ۱۹۴۰ء میں جب وہ کالمپونگ میں تھے تو انھیں یکایک درد گردہ کی شکایت ہوگئی اور یہی نامراد عارضہ ان کی موت کا باعث ہوا۔ اُنھیں کلکتہ لایا گیا ڈاکٹروں نے خیال کیا کہ آپریشن کی ضرورت نہیں ہے اور تقریباً ایک ماہ کے مسلسل علاج کے بعد اُن کی طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ اُسی وقت سے اُن کی تندرستی خراب ہوتی چلی گئی۔ جب حالت زیادہ خراب ہوگئی تو ۲۵۔ جولائی ۱۹۴۱ء کو اُن کو پھر کلکتہ لایا گیا اور ۳۰۔ جولائی کو آپریشن کیا گیا۔

آپریشن کامیاب رہا اور پہلے دو تین دن تک اُن کی حالت قابل اطمینان سمجھی گئی۔ آپریشن والے دن کی شام کو ڈاکٹر ٹیگور بہت خوش و خرم تھے اور اُنھوں نے بنگالی میں ایک نظم جس کا عنوان موت تھا بستر علالت پر سے لکھوائی۔ بنگالی ادب میں ڈاکٹر ٹیگور کی یہ آخری نظم ہے۔ اگلے دن جمعہ کو اُنھوں نے اپنی پرشوق تمنا کا اظہار کیا کہ بنگال کو مشہور مصور ڈاکٹر ابانندرا ناتھ ٹیگور کی ستّر سالہ سالگرہ منانی چاہیئے اور یہ آخری الفاظ ہیں جو انھوں نے ادا کئے

شاعر اعظم نے ۱۴۔ اپریل ۱۹۴۱ء کو (بیساکھ کی پہلی تاریخ بنگال کا نوروز) اپنی اسّی سالہ سالگرہ کے موقع پر جو شانتی نکیتن میں وشوا بھارتی والوں نے منائی تھی آخری تقریر کی۔ اس تقریر کا عنوان "انسانیت اور تمدن کا نازک مرحلہ"

تھا۔ پریس کے نام اُن کا آخری بیان وہ تھا جو اُنھوں نے مس۔ای۔ راتھبون ممبر پارلیمنٹ کے جواب میں دیا اور جو ہندوستان کی لڑائی میں شرکت سے متعلق تھا۔ اُن کی آخری تصنیف جس میں کچھ نظمیں اور بچوں کے لئے مختصر افسانے ہیں گزشتہ مئی میں شائع ہوئی۔

گزشتہ ۷۔ اگست ۱۹۴۰ء کو آکسفورڈ یونیورسٹی نے ڈاکٹر ٹیگور کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ اُس دن کسے معلوم تھا کہ عین آج ہی کے دن جبکہ ڈاکٹر ٹیگور کو اس اعزاز پر مبارکبادیاں دی جا رہی ہیں اگلے سال وہ اس دنیا میں موجود نہ ہونگے اور مبارکباد کی جگہ تعزیت کے پیغام آئیں گے۔

ڈاکٹر ٹیگور نے اپنی بیماری سے بہت قبل اپنے اعزا سے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اُن کے آخری رسوم شانتی نکیتن میں ادا کئے جائیں لیکن اپنی موجودہ بیماری میں اُنھوں نے رائے تبدیل کردی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ جہاں تک ان رسوم کا تعلق ہے لوگوں کی خواہش کا احترام کیا جائے۔ لہٰذا کلکتہ میں دریائے ہگلی کے کنارے نیم ٹولہ گھاٹ پر ان کی چتا کا انتظام کیا گیا جہاں کہ اُن کے آباؤ اجداد کو نذر آتش کیا گیا تھا۔

انتقال سے دس منٹ قبل ڈاکٹروں نے آکسیجن کا استعمال بند کردیا تھا کیونکہ ڈاکٹر ٹیگور اس کو برداشت نہ کرسکتے تھے۔ مسز پرتیما ٹیگور جو شاعر اعظم کی بہو ہیں شروع سے آخر تک ان کے بستر علالت کے قریب موجود رہیں۔ مکان سے باہر مضطرب و متفکر لوگوں کا ہجوم تھا جو دھوپ میں کھڑے تھے۔ ٹھیک ۱۲ بجکر ۱۳ منٹ گزرے تھے جب شاعر اعظم کے کمرہ سے ان کی موت کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد ان کا کمرہ کھول دیا گیا اور لوگ ڈاکٹر ٹیگور کے آخری درشن کرنے کے لئے اندر آنے لگے۔

ان کی موت کا اعلان ریڈیو سے نشر کیا گیا اور ہندوستانی اخبارات کے خاص ایڈیشن شائع ہوئے چونکہ تمام دفتر، کالج اور اسکول بند کردئے گئے تھے اس لئے مکان کے آگے لوگوں کا زبردست ہجوم ہوگیا تھا۔ لہٰذا پولیس کو مزید انتظامات کرنے پڑے۔ جو لوگ ڈاکٹر ٹیگور کی موت کے بعد اُنھیں دیکھنے آئے اُن میں بہت سے بودھ اور چینی بھی تھے۔

ان کی نعش نیچے لانے سے قبل وید کے اشلوک پڑھے گئے اور مسٹر رامانند چٹرجی نے ایک مختصر سا بھجن پڑھا۔ ان کی ارتھی آرام کرسی کی صورت میں خاص طور پر آراستہ کی گئی تھی۔ تین بجے سہ پہر کو نکلی اور اپر چیت پور روڈ دیویکانند روڈ، چترنجن ایونیو۔ کولوٹولہ اسٹریٹ، کالج اسٹریٹ، کارنوالس اسٹریٹ، گرے اسٹریٹ، بی۔ کے پال ایونیو اور اسٹرینڈ روڈ ہوتی ہوئی ۵ بجکر ۴۵ منٹ پر نیم ٹولہ گھاٹ پر پہونچی۔ جلوس نے دو گھنٹے میں پانچ میل کا سفر طے کیا۔ آخری رسوم آدھی رات کے قریب ختم ہوئے۔

رابندرناتھ ٹیگور، مئی ۱۸۶۱ء کو کلکتہ میں اپنے جدی مکان میں جو نمبر ۶ دوارکاناتھ ٹیگور لین پر واقع

پیدا ہوئے۔ وہ مہرشی دیبندر ناتھ ٹیگور اور شریمتی ساردھا دیوی کی چودھویں اولاد تھے۔ آٹھ نو سال کی عمر میں اُن کو ایک مشرقی درسگاہ میں داخل کردیا گیا۔ اس کے چند ماہ بعد وہ کلکتہ نارمل اسکول میں داخل ہوئے جب وہ اس اسکول میں تعلیم پارہے تھے تو کُشتی اور جمناسٹک میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اسی زمانہ میں جبکہ وہ اس اسکول کے طالب علم تھے اُنھوں نے پہلی نظم لکھی۔ اس کے بعد جب وہ تقریباً دس سال کے تھے انھیں بنگال اکیڈیمی میں جو ایک اینگلو انڈین اسکول ہے داخل کردیا گیا۔ لیکن یہ اسکول آپ کو پسند نہ آیا اس وجہ سے اسے چھوڑ دیا اور ان کے والد نے ان کی تعلیم کا گھر پر انتظام کردیا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ شانتی نیکتن دیکھنے گئے جو بولپور کے قریب چھ ایکڑ کی اراضی تھی اور جسے اُن کے والد نے آشرم بنانے کے لئے خریدی تھی۔ کچھ دن بعد اُنھوں نے اپنے والد کے ہمراہ شمالی ہندوستان کا سفر کیا۔ اسی سیاحت کے دوران میں آپ نے اپنے والد سے سنسکرت، انگریزی اور علم ہیئت کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۳ء میں واپسی میں کلکتہ آکر وہ سینٹ زیویر اسکول میں داخل ہوگئے اور گھر پر بھی استادوں سے پڑھتے رہے۔ اسی زمانہ میں آپ نے شیکسپیئر کے میکبتھ کا بنگالی میں ترجمہ کیا۔

۱۸۷۵ء سے جب اُن کی والدہ کا انتقال ہوا وہ بنگالی رسالوں میں مستقل طور پر مضامین لکھنے لگے۔ اس زمانہ میں وہ "بھانو سمہا ٹھاکر" کے فرضی نام سے لکھتے تھے اور انگریزی اخلاق، انگریز اور ان کا ادب، ڈانٹے اور اس کی محبوبہ جیسے مضامین اور دوشیزہ بھکارن جیسی نظموں سے ان کی قابلیت کا اندازہ ہونے لگا۔

جب وہ سترہ سال کے تھے تو کلکتہ سے اپنے بھائی ستیندر ناتھ کے پاس جو آئی۔سی۔ایس تھے احمد آباد چلے گئے۔ احمد آباد سے اپنے بھائی کے ہمراہ وہ یورپ گئے۔ انگلستان میں ان کا داخلہ برائٹن اسکول میں کرادیا گیا جہاں وہ اپنی بھاوج اور اُن کے بچوں کے ہمراہ رہتے تھے۔ بعد میں ان کا داخلہ یونیورسٹی کالج لندن میں ہوگیا جہاں اُنھوں نے پروفیسر مارلے سے انگریزی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ وہاں وہ دار العوام میں گئے، گلیڈسٹون اور برائٹ کی تقریریں سنیں اور اکثر برٹش میوزیم میں جاتے تھے اور بنگالی رسالوں کے لئے مضامین لکھتے رہے۔ اس زمانہ کی آپ کی سب سے مشہور تصانیف "یورپ کے مسافر کے خطوط" اور "بھگنا ہردے" ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں بغیر کوئی ڈگری حاصل کئے لیکن اپنے دماغ میں بہت سے نقوش لیکر جو بعد میں ان کی شاعری پر اثر انداز ہوئے وہ ہندوستان واپس آگئے۔ بیس سال کی عمر میں انھوں نے ایک تمثیل لکھی، جس نے اُنھیں بنگالی ادب میں روشناس کرایا۔

لیکن انھوں نے ڈرامہ نگاری ہی پر بس نہیں کی۔ آپ نے چین میں افیم کی تجارت پر جو اہل یورپ کرتے تھے تقریر کی اور کلکتہ میڈیکل کالج میں "موسیقی اور جذبات" پر ایک تقریر کرکے تہلکہ مچادیا۔ ان کے اہل خاندان ان کا یورپ سے بغیر کوئی ڈگری حاصل کئے واپس آجانا پسند نہ کرتے تھے اور اس عرصہ میں انھیں یورپ جانے پر آمادہ کررہے تھے۔ وہ جانے کے لئے رضامند ہوگئے اور کلکتہ سے ستیہ پرشاد گنگولی اور آشو توش چودھری

کے ہمراہ روانہ ہوگئے۔ لیکن مدراس جاکر اُن کے ارادہ میں تبدیلی واقع ہوئی اور اپنے بزرگوں کی مرضی کے خلاف وہ واپس آگئے۔ اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور متعدد کتابیں لکھیں۔

اِس زمانہ میں جبکہ ان کی عمر اکیس سال کی تھی وہ اپنی تصانیف میں صوفیانہ خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ ایک دن جب وہ اپنے مکان کے بالاخانہ پر کھڑے تھے اُنھوں نے ایک "خواب" دیکھا جس نے ان کے اپنے خیال میں "دنیا کو ایک نئی روشنی میں پیش کیا اور معمولی جگہوں کو اہم بنا دیا۔" اگلے سال اُنھوں نے کرھار کی سیاحت کی اور متعدد ڈرامے لکھے۔ اس سال کے اختتام پر آپ نے مرنیلینی دیوی سے شادی کی۔ اسی سال آپ کو اپنی بھاوج (جوتندرناتھ کی بیوی) کی وفات سے اپنی زندگی کا سب سے زبردست صدمہ پہونچا۔ اپنی تصنیفات کے علاوہ اُنھوں نے اس عرصہ میں مشہور انگریزی شعرا شیلے۔ ایلز بتھ۔ برٹ براؤننگ اور دیگر شعراء کی نظموں کا ترجمہ کیا اور بنکم چندر چٹرجی سے نئی ہندو تحریک پر تحریری مخالفت کی۔ وہ ڈرامے مضامین۔ مزاحیہ افسانے۔ مختصر افسانے اور نظمیں لکھتے رہے۔

۱۸۸۶ء میں آپ کا پہلا بچہ مادھوری لتا پیدا ہوا۔ اپنی تصنیفی زندگی کے دوران میں آپ کے خیالات سیاست کی طرف مبذول ہونے لگے۔ آپ نے انڈین نیشنل کانگریس کے دوسرے اجلاس میں جو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا اور جس کی صدارت دادا بھائی نوروجی نے کی تھی شرکت کی اور افتتاحی نظم پڑھی جو اسی موقعہ کے لئے لکھی گئی تھی۔ یہ نظم اِن الفاظ سے شروع ہوتی ہے "ہم یہاں آج اپنی ماتا کی طلبی پر جمع ہیں۔" اگلے سال آپ کے والد نے شانتی نکیتن کی جائداد آپ کے نام منتقل کردی۔ اسی سال آپ کے سب سے بڑے لڑکے راتھندرناتھ ٹیگور کی پیدائش ہوئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد آپ نے اپنی مشہور تمثیل "قربانی" مکمل کی اور اپنی خاندانی جائداد کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اسی سال آپ یورپ کی سیاحت کے لئے اپنے بھائی ستیندرناتھ کے ہمراہ پھر روانہ ہوگئے۔ اور اٹلی۔ فرانس اور انگلستان کا دورہ کیا۔ واپسی پر آپ شیلی داہ میں جو ان کے خاندان کی جائداد کا صدر مقام تھا مقیم ہوگئے۔ یہاں کے قیام کی وجہ سے آپ کو مزدوروں اور کسانوں سے رابطہ بڑھانے کا موقعہ ملا۔ اگلے سال آپ نے اپنے سیاحت یورپ کی ایک ڈائری اور متعدد مختصر نظموں کو شائع کیا۔ اس عرصہ میں آپ کی شاعری کی شہرت عام ہوگئی۔ اور آپ نے "سادھنا" نامی ایک بنگالی رسالہ جاری کیا۔ کچھ ہی عرصہ میں یہ بنگالی زبان کا ایک مستند رسالہ سمجھا جانے لگا۔ انھیں دنوں آپ نے ایک ڈرامہ "چترانگدا" لکھا جس کا انگریزی ترجمہ غیر معمولی طور پر مقبول ہوا۔ اسی ڈرامہ کو مصور کرکے ربیندرناتھ ٹیگور نے مصور کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۸ء تک آپ بہت مصروف رہے۔

اگلے سال آپ نے شملہ سے واپسی پر کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں قانون بغاوت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ایک مقالہ پڑھا اس کے بعد بہت سے سیاسی مضامین لکھے اور سب سے آخر میں بال گنگا دھر تلک کی گرفتاری پر حکومت کے رجعت پسندانہ طرز عمل پر احتجاج کیا۔ اس کے بعد بھی آپ سیاسیات میں حصّہ لیتے رہے اسی زمانہ میں آپ نے ڈھاکہ پراونشیل کانفرنس کے اجلاس میں کسانوں کے ساتھ زمینداروں کے رویّہ کی سخت نکتہ چینی کی۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں آپ نے متعدد نظمیں اور مقالات لکھکر ہندوستان کی سیاسی، معاشی اور تمدنی حالت سے بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے اپنے خاندان کے ہمراہ شانتی نکیتن میں رہنے کا فیصلہ کیا جیساکہ اوپر بیان ہوچکا ہے۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اپنے زمانۂ تعلیم میں اسکولوں کی فضا سے خوش نہ تھے۔ وہ ان تمام خیالات کو جو اساتذہ تعلیم کے سلسلہ میں رکھتے تھے پسند نہ کرتے تھے اور انھیں اپنا زمانۂ تعلیم بھی یاد تھا لیکن کیا بچوں کو اس طرح کی تعلیم نہیں دی جاسکتی کہ وہ اسے شوق اور دلچسپی سے حاصل کرسکیں؟ کیا ہندوستان کے پرانے آشرم کے تصوّر میں اس کا سامان موجود نہ تھا؟ اگر بچے شوق اور خوشی سے پڑھیں تو کیا وہ جلدی اور زیادہ محنت سے نہ پڑھیں گے؟ کیا اسکولوں کو بغیر محبت کے ہونا چاہیئے؟ یہی خیالات تھے جنھوں نے ٹیگور کو شانتی نکیتن اسکول جاری کرنے پر آمادہ کیا آپ خود وہاں تعلیم دیتے تھے۔ کچھ ہی عرصہ میں آپ کے گرد بہت سے اساتذہ جمع ہوگئے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں مالی مشکلات نے آن دبایا اور انھیں پوری میں اپنا مکان فروخت کرنا پڑا اور ان کی بیوی نے اپنے تمام زیور فروخت کردیئے۔ اس اسکول میں بچّوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کو جاری رکھنے کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی لیکن روپیہ کہاں سے آئے؟ اُنھوں نے اپنی کتابیں فروخت کیں، کتابوں کے حقوق اشاعت فروخت کئے، لیکن ناکامی سے دوچار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ آپ کے اس زمانہ کے جذبات گیتان جلی میں جابجا نظر آتے ہیں یہی وہ گیتان جلی ہے جس پر آپ کو نوبل پرائز ملا۔ اور جس نے آپ کو مغربی دنیا میں روشناس کرایا۔ اس سال آپ نے لارڈ کرزن کو مشرقی لوگوں کی نکتہ چینی کرنے پر مُنھ توڑ جواب دیا، اِسی سال آپ کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے موقعہ پر آپ نے پھر سیاست میں زبردست حصّہ لیا۔ اس سلسلہ میں آپ نے متعدد نظمیں اور مقالات لکھے اور متعدد جلسے منعقد کئے۔ اسی موقعہ پر آپ نے ایک جلسہ میں قومی فنڈ کی اپیل کی اور اُسی جگہ پچاس ہزار روپیہ جمع ہوگیا۔ آپ نے خاص طور سے طالب علموں کو اُکسایا، آپ نے کوآپریٹیو سوسائیٹیاں قائم کیں، دیہاتی کمیٹیاں قائم کیں، قومی خدمت کے لئے انجمنیں

قائم کیں اور قومی مدرسے جاری کئے کیونکہ وہ غیر ملکی حکومت کے احسان مند نہ ہونا چاہتے تھے سیاسی احتجاج سے جو بنگال میں نئی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا مخالفت کرتے ہوئے آپ یکایک اس سے علیحدہ ہوگئے جس پر لوگوں نے آپ کی بڑی مخالفت کی لیکن آپ نے اس کا کوئی اثر نہ لیا اور سیاست سے قطع تعلق کرنے کا ارادہ کر کے شانتی نکیتن چلے گئے۔

سیاست سے اس قطع تعلق کی بنا پر بنگالی ادب کو بڑا فائدہ پہونچا۔ اسی عرصہ میں آپ نے اپنی بہت سی مشہور تصنیفات مکمل کیں۔ آپ کی پچاس سالہ سالگرہ کے موقعہ پر کلکتہ کے ٹاؤن ہال نے آپ کو ایسا اعزاز بخشا جیسا کہ اس وقت تک کسی کو نہ بخشا گیا تھا۔ یہ واقعہ آپ کے نوبل پرائز حاصل کرنے سے قبل کا ہے۔ اسی زمانہ میں شانتی نکیتن قومی ادارہ ہوتا جا رہا تھا اور اسی وجہ سے حکومت کی نظروں میں گرتا جا رہا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں حکومت بنگال نے ایک حکم جاری کیا کہ شانتی نکیتن حکومت کے ملازمین کے بچوں کے پڑھنے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اس سال کے آخر میں آپ بیمار ہوگئے جس کی وجہ سے سفر یورپ کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

اگلے سال آپ اپنے لڑکے اور لڑکی کے ہمراہ یورپ گئے۔ لندن میں آپ روتھین اسٹائن سے ملے۔ روتھین اسٹائن کی وساطت سے آپ کی ملاقات ڈبلو۔ بی۔ ایٹس، عذرا پاؤنڈ۔ ایلس مینل ارنسٹ رہنبر، ہنری ٹیونس اور دیگر مشہور اشخاص سے ہوئی۔ وہاں آپ کے اخلاق اور قابلیت سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں انگلستان کے قریب قریب تمام مشہور ادیب شریک ہوئے انھیں دنوں میں آپ کی مشہور تصنیف گیتان جلی شائع ہوئی جو اس وقت دنیا کے ادبی شاہکاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ انگلستان سے امریکہ چلے گئے جہاں آپ نے شکاگو یونیورسٹی میں "ہندوستان کا قدیم تمدن" پر لکچر دیئے۔ آپ نے روچیسٹر کی بین الاقوامی کانفرنس میں بھی شرکت کی اور اقوام کی باہمی مخاصمت پر ایک مدلل تقریر کی، اس کے علاوہ آپ نے ہارورڈ یونیورسٹی میں بھی کئی لکچر دیئے جو بعد میں کتابی صورت میں سادھنا کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۱۳ء میں آپ انگلستان ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آ گئے جس کے بعد ہی ماہ نومبر ۱۹۱۳ء میں آپ کو نوبل پرائز ملا۔

۱۹۱۴ء میں بنگال کے گورنر نے حکومت کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کیا اور گاندھی جی نے کچھ لڑکے افریقہ سے شانتی نکیتن میں تعلیم کی غرض سے بھیجے۔ اس کے بعد ہی گاندھی جی معہ اپنی اہلیہ محترمہ شانتی نکیتن تشریف لائے۔ اسی سال آپ کو سر کا خطاب ملا اور امریکہ کی ایل یونیورسٹی نے آپ کو مسئلہ قومیت پر لکچر

دینے کے لئے مدعو کیا۔

آپ کا یہ دورہ یادگار رہیگا۔ واپسی پر آپ نے جاپان میں مسئلۂ چین پر تقریریں کیں جن کو سرکاری حلقوں میں پسند نہیں کیا گیا لیکن پبلک کی طرف سے آپ کا شاندار خیر مقدم ہوا۔ اسی طرح آپ نے امریکہ میں شہنشاہیت کے خلاف لکچر دیئے جن پر ہمدردان برطانیہ نے ناخوشی کا اظہار کیا۔ لیکن آپ نے اس کی کوئی پروانہ کی، اور عوام امریکہ نے آپ کی خوب آؤ بھگت کی، علمی حلقوں میں بھی آپ کی قدردانی ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں آپ نے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی جو کلکتہ میں مسز اینی بسنٹ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ آپ نے اس جلسہ میں اپنی ایک نظم "ہندوستان کی دعا" پڑھی۔ اسی سال اور آئندہ سال بھی آپ کی متعدد مشہور تصنیفات انگریزی زبان میں شائع ہوئیں۔ شاعر اعظم کی نظر میں یہ سال یادگار تھا کیونکہ اس سال آپ نے وشوا بھارتی کا سنگ بنیاد رکھا جو ایک بین الاقوامی جامعہ ہے۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں واقعہ جلیانوالہ سے آپ اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے حکومت کے خلاف کئی تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔ اور سر کا خطاب بھی واپس کر دیا۔ اس کے بعد جب آپ دوسرے سال سفر یورپ کے سلسلے میں انگلستان گئے تو وہاں کے لوگ آپ سے کسی قدر کشیدہ رہے۔ لیکن فرانس۔ ہالینڈ۔ بلجیم اور دیگر یورپی ممالک میں آپ کا نہایت شاندار خیر مقدم ہوا۔ فرانس میں آپ برگساں اور سلوین لیوی جیسی قابل قدر ہستیوں سے ملے۔ لیوی نے آپ سے ملنے کے بعد شانتی نکیتن میں کام کرنے کا ارادہ کیا۔

سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۲ء میں آپ نے ہندوستان کا دورہ کیا اور شہنشاہیت کے خلاف جمہوریت کا پیغام لوگوں کو پہونچایا۔ اس عرصہ میں آپ کی متعدد تصنیفات شائع ہوئیں جس کی آمدنی آپ نے وشوا بھارتی کو دے دی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں آپ چین اور جاپان گئے۔ وہاں سے واپس آکر آپ نے لارڈ لٹن کو اُن کی تقریر پر ایک خط لکھا جس میں اُنھوں نے بنگالی خواتین کے متعلق کچھ کہا تھا۔ اسی سال پیرو کی حکومت نے آپ کو اپنی آزادی کی صد سالہ سالگرہ کے جشن میں شرکت کے لئے مدعو کیا۔ راستہ میں آپ بیمار ہوگئے اور بیونس آیرز اُتر گئے۔ جنوبی امریکہ سے واپسی میں آپ اٹلی گئے۔ اگلے سال آپ پھر اس ملک میں گئے وہاں آپ مسولینی سے ملے۔ روم کے گورنر نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے وہاں فسطائیت کی تائید میں تقریر کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ حکومت کی طرف سے آپ سے اس کی درخواست کی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں آپ کو پہلی ہندوستانی فلاسوفیکل کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔

اگلے سال آپ نے شانتی نکیتن کی امداد حاصل کرنے کے لئے ملایا۔ کناڈا۔ جاپان اور ہند چینی کا دورہ کیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے آپ نے مصوری شروع کی۔ فرانس میں آپ کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔ آپ کی تصویروں میں تازگی اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ کو آکسفورڈ یونیورسٹی نے لکچر دینے کے لئے ہبرٹ میں مدعو کیا جس کا موضوع "انسانی مذہب" تھا۔ اسی اثنا میں آپ کو گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر ملی جس کی آپ نے منچسٹر گارجین میں علانیہ مذمت کی۔ انگلستان سے آپ جرمنی گئے جہاں وہ دنیا کے نامور ریاضی داں آئن اسٹائن سے ملے۔ اس کے بعد آپ روس گئے جہاں ملک کے متعدد لیڈروں نے آپ کا بڑے اعزاز سے استقبال کیا۔ وہاں آپ نے مختلف ادارے دیکھے۔ آپ کی ستروین سالگرہ کی یادگار میں ایک شاندار مجموعۂ مضامین شائع کرکے آپ کو پیش کیا گیا جس میں آئن اسٹائن۔ ہنرک مین۔ برٹرینڈ رسل اور دنیا کے دوسرے فاضل ناموروں کے مقالات تھے۔ روس سے آپ امریکہ ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آلے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں آپ ایران گئے جہاں شاہ ایران نے آپ کا خیر مقدم کیا۔

سنہ ۱۹۳۴ء کے بعد سے شاعر اعظم اکثر و بیشتر شانتی نکیتن میں مقیم رہے اور اسی مقام سے تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا۔ اور یہیں سے وقتاً فوقتاً ہندوستان اور دنیا کے واقعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ پچھلے عرصہ میں آپ سخت بیمار ہوگئے۔ اس علالت کا سلسلہ آخر تک قائم رہا۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ آپ نے دو ہزار سے زائد نظمیں لکھیں۔ آپ کی انگریزی میں بعض مشہور تصنیفات یہ ہیں:۔ گیتان جلی (سنہ ۱۹۱۲ء) باغباں، ماہ نو اور چترا (سنہ ۱۹۱۳ء) تاریک کمرہ کا راجہ۔ ڈاک خانہ اور سادھنا (سنہ ۱۹۱۴ء) کبیر کی نظمیں (سنہ ۱۹۱۵ء) خوشہ چینی۔ بھٹکے ہوئے پرندے اور بھوکے پتھر (سنہ ۱۹۱۶ء) قربانی اور دیگر تمثیلیں۔ گردش بہار اور محاضرات (سنہ ۱۹۱۷ء) تحفۂ عاشق۔ ماشی اور دیگر افسانے اور طوطے کی تربیت (سنہ ۱۹۱۸ء) شکستہ حال (سنہ ۱۹۲۱ء) گورا۔ سرخ پوٹلی (سنہ ۱۹۲۴ء) جگنو (سنہ ۱۹۲۵ء) ایک دوست کے نام خطوط (سنہ ۱۹۲۸ء) اور انسان کا مذہب (سنہ ۱۹۳۱ء)

نیرنگئ دنیا

(از قاضی خورشید الاسلام۔ ایم۔ اے)

شبنم گریاں ہے تو گل خنداں ہے   سبزہ پامال، صبا نازاں ہے
وائے نیرنگِ جہانِ فانی   چشم بینا ہے، جیسے حیراں ہے

گھٹا

سانٹ[1]

(از جناب شائق وارثی بریلوی)

مستی کی چھاگلیں لئے
سانولے دوش پر گھٹا
بالوں کو منتشر کئے
چھا رہی ہے بصد ادا

پھولوں کی یہ کٹوریاں
چاندی سی یہ چمک دمک
پتیوں پہ یہ بوندیاں
جیسے ستارے مشترک

سیمیں سے آبشار پر
دھندلی سی وہ صباحتیں
زریں سے کوہسار پر
دوڑی ہوئی ملاحتیں

مینھ کی ہلکی سی پھوار۔
آہ! گھٹا کی یہ بہار

اتحادِ نظر

کیا نہ یہ میرے لئے ہے سوزِ بختی کا مقام
کیا نہیں اس پر بھی خوش ہو عشقِ گریاں صبح و شام

کیا یہ تارے آسمانوں میں جو ہیں بکھرے ہوئے
ین کے کلیاں گلشنِ گردوں میں ہیں بکھرے ہوئے

جن کو دیکھا کرتی ہیں یہ رات بھر آنکھیں مری
شاید ان کی بھی حسیں نظریں ہیں ان کو دیکھتی

(بندھو لال شوق)

---

[1] مصنف کی زیرِ تصنیف کتاب "نغمے" کا ایک سانٹ

کالی گھٹا

(از پنڈت اندر جیت شرما ماچھرہ ضلع میرٹھ)

کیوں سیہ پوشی تجھے بھاتی ہے اے کالی گھٹا
کس کے غم میں بھر رہی ہے کاکلیں کھولے ہوئے
کس لئے بے چین ہے تو کیا ہے تیرا مدعا
ہے ہوا کے دوش پر اڑنے کو پر تولے ہوئے
کم نہیں ہوتی کسی پہلو پریشانی تری
لحظہ لحظہ بڑھتی ہی جاتی ہے حیرانی تری
مست ہے کس حال میں رہتی ہے کیوں محوِ خیال
بے خبر اتنی، نہیں کچھ تن بدن کی بھی خبر
راہ میں آتا ہے جو کرتی ہے اس کو پائمال
اڑ کے بھرتی ہے طرارے گھومتی ہے کوہ پر
اتنی سرگرداں ہے کس کے واسطے دیوانہ وار
قلبِ عاشق کی طرح آتا نہیں تجھکو قرار
گھور کر اٹھتی ہوئی اور چرخ پر چھاتی ہوئی
جھومتی ہے مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑ کر
برق کی چنگاریاں پہلو سے برساتی ہوئی
چیختی ہے شور کرتی ہے کلیجہ پھاڑ کر
بس نہیں چلتا تو رونے پر اتر آتی ہے تو
باتوں ہی باتوں میں پانی پانی ہوجاتی ہے تو

انتخاب دیوان غالب

از مسٹر "سلیم جعفر"

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ کائنات کے ہر فرد کی اصلیت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کی تہ تک پہونچنا کھیل نہیں۔ جگر خراشی اور سینہ کاوی کے بعد بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے

کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمہ را

اکثر تاریخی واقعات بھی اس کلیہ کی زد سے باہر نہیں ہیں۔ جب تک آنکھوں سے دیکھنے والے اُن پر سے پردہ نہ اُٹھائیں حقیقت رونما نہیں ہوتی اور وہ بحث و مباحثہ کی جولانگاہ بنے رہتے ہیں۔ "انتخاب دیوان غالب" اور "طباعت دیوان غالب" بھی دنیا کے اِسی قسم کے تاریخی واقعات ہیں۔

طباعتِ دیوان غالب کا مسئلہ حل کرنے کے لئے جناب مظفر حسین صاحب تمیم نے ایک ڈراما تصنیف فرمایا، جو آل انڈیا ریڈیو پرلنشر اور ہمایوں بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن اس قدر خراب چھپا کہ غالب تاب نہ لا سکے اور بے اختیار دل سے آہ نکل ہی گئی[۱]۔ میرے پاس دیوان غالب کا ایک نسخہ ہے جو غالباً اس کی تیسری دچوتھی اشاعت ہے، خاتمۃ الطبع ہدیۂ ناظرین ہے:-

"بخدمتِ اربابِ سخن عرض کرتا ہے امیدوار رحمت و غفران محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خان طیب اللہ ثراہ کہ اس سے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسد اللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن بہ سبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا۔ اس لئے جناب مجمع لطف بیکراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا، میں نے بافضال ایزدی مطابق اُس نسخہ کے شہر ذی حجہ ۱۲۷۸ھ ہجری مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستیِ کمال سے چھپایا۔ امید کہ جب ناظرین اس کے مطالعہ سے حلاوت سخن کی

---

[۱] دیوانِ بندہ را کہ ایمنا سواد کرد — تنہا درونہ شعر مجدد نوشتہ است
از نظم و نثر ہرچہ بہ طبعش خوش آمدہ — دیوانِ بندہ پُر ز خوشامد نوشتہ است
ہر جا کہ لفظ "بندہ" مثلاً دید در سخن — دستِ تصرفش ہمہ را "بد" نوشتہ است
اکنوں شریکِ مہتر دیوانِ بندہ است — زیرا کہ بیشتر سخن خود نوشتہ است

---

[۱] ہمکو افسوس ہے کہ یہ مضمون جنوری ۱۹۴۲ء میں وصول ہوا تھا۔ اتفاقی وجوہ کے اسقدر دیر بعد شائع ہو رہا

پائیں مہتمم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔"

خاتمۃ الطبع میں جن محمد حسین خاں صاحب کا ذکر ہے وہ غالب مرحوم کے گلے کا ہار معلوم ہوتے ہیں۔ غلط دیوان اُنھوں نے چھپوایا۔ تیسرا اڈیشن جس کا ذکر آگے آئیگا اُنھیں کی "دانائی" کا نتیجہ تھا۔ اور میرے پاس والے نسخہ کے محرک بھی آپ ہی تھے۔ حاصل کلام میرے پاس ایک دیوان غالب ہے جو اُس نسخے کی نقل ہے جسے خود غالب نے طباعت سے پہلے صحیح کیا ہے۔

لیکن اب تک میں جو کچھ لکھ آیا ہوں اُس کو نیرے نفس مضمون سے اگر کوئی لگاؤ ہے تو یہ کہ اس دیوان کے شروع میں ایک فارسی کا دیباچہ بھی ہے، اور یہ اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لئے قصّہ پاک کئے دیتا ہے کہ دیوان غالب کا انتخاب کس نے کیا۔ پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد کا یہ کہنا کہ :-

"مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے عدیل تھے، ایک زمانہ میں دہلی کی عدالت ضلع میں سررشتہ دار تھے۔ اُسی عہد میں مرزا خاں عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے، نظم ونثر فارسی اچھی لکھتے تھے غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر وسخن کے چرچے رہتے تھے۔ اُنھوں نے اکثر غزلوں کو سُنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا، اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا، دونوں صاحبوں نے دیکھکر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو ہم آج عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔"

غلط ہے۔ اگر کچھ صحیح ہے تو مولوی عبد الباری صاحب آسی لکھنوی کا یہ خیال کہ مرزا نے خود اپنے دیوان کا انتخاب کیا۔ آسی صاحب اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں :-

"خود میرے والد مرزا غالب کے دیکھنے والوں میں تھے، اُن کے کمال سخن کے پورے رازداں تھے وہ جب آزاد کا یہ آب حیات والا لطیفہ دیکھتے تھے کہ مرزا نے مولوی فضل حق سے انتخاب کرایا تو غصّے کے مارے سُرخ ہو جاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ کیا بہتان باندھا ہے۔"

اب اُس دیباچہ کا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین ہے جو اس نسخۂ دیوان غالب کے شروع میں ہے جو میرے پاس ہے اور جس کا اُوپر ذکر آ چکا ہے :-

"یزداں درون سخن افروز را سپاسم کہ شرارے ازاں آتش تابناک بخاکستر خویش نہفتہ بکاوبکا دسینہ شگافتہ ام واز نفس دمہ برآں برنہادہ۔ بو کہ در اندک مایہ روزگار آں مایہ فراہم

تواند آمد کہ حجرہ را فروغ روشنائی چراغ و رائحہ عود را بال شناسائی دماغ تواند بخشید۔ ہمانا نگارندہ این نامہ را آں در سر است کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بگرد آوردن سرمایۂ دیوان فارسی برخیزد۔ و با ستفاضۂ کمال این فر پور فن پس زانوئے خولیشتن نشیند۔ امید کہ سخن سرایان سخنور ستائی پراگندہ ابیاتے راکہ خارج اوراق یابند از آثار تراوش رگ کلک این نامہ سیاہ شناسند و چامہ گرد آورد را در ستایش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔ یارب این پوئے ہستی ناشنیدۂ از نیستی بہ پیدائی نارسیدۂ یعنی نقش بضمیر آمدۂ نقاش کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم، بمیرزا نوشہ معروف بہ غالب متخلص است چنانکہ اکبر آباد مولد و دہلوی مسکن ست فرجام کار بخفی مدفن نیز باد۔"

میرے نزدیک اس تحریر کے بعد جو بلاشبہ غالب کی اور تصنیف "آبحیات" سے پہلے کی ہے، آزاد مرحوم نے جو دعوی کیا ہے نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور اب اس کو ایک طے شدہ مسئلہ سمجھنا چاہیئے کہ اپنے دیوان کا انتخاب خود غالب مرحوم نے کیا۔ یہ عبارت اُن کے سوا کسی اور کی نہیں، اِس کا ثبوت یہ ہے کہ شروع شروع میں صیغے واحد متکلم استعمال کئے گئے ہیں۔

لیکن منطق کو عقل آرائی کی گنجایش باقی ہے کیونکہ میرے پاس جو نسخہ ہے وہ غالباً تیسرا ایڈیشن ہی ہے:" دیوان غالب کی طباعت" سے صاف صاف ظاہر ہے کہ پہلا ایڈیشن ناپید ہو چکا تھا۔ جب دوسرا ایڈیشن مولوی محمد حسین صاحب نے شاہدرہ میں چھپوایا، مگر نظم طباطبائی مرحوم کی شرح دیوان غالب سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایک نسخہ چھپا ہے جس کے ساتھ غالب کا اُردو کا دیباچہ شائع ہوا ہے، وہو ہذا :-

جو دیوان خود مصنف مرحوم کی تصیح سے چھپا ہے اس کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ:-

"وداد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اُردو تیسری بار چھاپا گیا ہے، مخلص و داد آئیں میر قمرالدین کی کار فرمائی اور خاں صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا، اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصیح ہوتی رہی ہے۔"

اور جناب نظامی بدایونی صاحب نے جو دیوان غالب مطبع نظامی بدایوں سے شایع کیا ہے، اُس کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:-

"اس سے پہلے چند در چند ایڈیشن دیوان غالب کے چھپ چکے ہیں جن میں تین نسخے ایسے ہیں

جو مرزائے مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئے ہیں اور ایک آدھ کی تصحیح بھی مرزا سے منسوب کی گئی ہے"

میرے پاس جو نسخہ ہے وہ متضاد شہادتوں کی وجہ سے بہت کچھ باعثِ حیرانی بن گیا ہے خاصکر اس سبب کہ دیباچہ سے صاف صاف ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے والے خود حضرت غالب ہیں خاتمۃ الطبع ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تصحیح خود حضرت مصنف نے کی ہے۔ اس معنی میں کہ یہ صحیح کئے ہوئے نسخہ کی نقل ہے، یہ اُن کے حیات میں چھپا ہے، کیونکہ بقول پروفیسر آزاد "آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء ۱۲۸۵ھ میں جہان فانی سے انتقال کیا۔" اور اس کا سالِ طباعت ۱۲۷۰ھ ہے۔

چونکہ اس دیوان غالب کے دیباچہ سے "انتخاب دیوان غالب" کا متنازعہ فیہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہوا جاتا ہے، اس لئے اگر کوئی صاحب مختلف نسخوں کو جمع کر کے جو رائے میں نے ظاہر کی ہے اس سے بہتر نتیجہ تحقیقات پیش فرمائیں تو دلدادگانِ کلام غالب پر احسان ہوگا۔

اس مختصر مجموعۂ کلام کے بعد نسخۂ حمیدیہ شائع ہو چکا ہے اور مولوی عبدالباری صاحب آسی بھی کلام غیر مطبوعہ مع شرح چھپوا چکے ہیں۔ گلہائے چمنستان غالب سے مشام جاں معطر کرنے والوں پر لطف و کرم ہے لیکن انھیں ذرا اس دست برداری پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔

"اُمید کہ سخن سرایان سخنور ستائے پراگندہ ابیاتے را کہ خارج اوراق پابند از آثار تراوشِ رگِ کلک ایں نامۂ سیاہ نشناسند و جامہ گرد آورد را در ستایش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔"

اسرارِ کتاب

علامہ اقبال مرحوم

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر　　کرتے ہیں خطاب آخر اُٹھتے ہیں حجاب آخر
احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا　　سوز و تب و تاب اول، سوز و تب و تاب آخر
میں تجھکو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے　　شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر
میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں　　لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر
کیا دبدبۂ نادر، کیا شوکتِ تیموری　　ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مے ناب آخر
خلوت کی گھڑی گزری، جلوت کی گھڑی آئی　　چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا　　کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

نظّارے

(از مسٹر خلیل الرحمن مستقیمی)

انھیں میں دیکھتا ہوں روز فطرت کے نظاروں میں
روپہلی چاندنی میں تلملاتے برق پاروں میں
وہی جلوہ فگن ہیں اُودے اُودے کوہساروں میں
سنہری وادیوں میں گنگناتے آبشاروں میں
اندھیری رات میں جب کوئی رادھا گیت گاتی ہے
تو اک ہلچل سی ہوتی ہے ربابِ دل کے تاروں میں
اُفق کی اوٹ سے جب چھُپ کے کوئی مسکراتا ہے
عجب مستی سی چھا جاتی ہے چمکیلے ستاروں میں
نسیمِ صبح جب اٹھکھیلیاں کرتی ہے غنچوں سے
تو اک جنبش سی ہوتی ہے محبت کے شراروں میں
تصور میں چمک اٹھتا ہے روئے دلنشیں اُن کا
کبھی جب برق گرتی ہے مہکتے لالہ زاروں میں
کوئی مالن بصد انداز جب آتی ہے گلشن سے
حسیں موجیں بھی شرماتی ہیں جیسے جوئباروں میں
بھری برسات میں جب موربن کے گیت گاتے ہیں
تو برساتے ہیں اِک صہبائے رنگیں مرغزاروں میں

گھنے جنگل میں کوئی جیسے اِک بنسی بجاتا ہے
صبا گاتی ہوئی آتی ہے گلشن کی بہاروں میں
کسی کی نوجوانی کا تصور دل میں کرتا ہوں
یکایک جب گزر ہوتا ہے پھولوں کی قطاروں میں
کہ جیسے یاد کرلیتا ہے کوئی بھول کر مجھکو
مجھے جب ہچکیاں آتی ہیں آموں کی بہاروں میں
"خلیلِ خستہ جاں" کہہ کر کوئی جیسے بلاتا ہے
کبھی جب غور سے سنتا ہوں ساون کی پھواروں میں

نوائے راز

(از ابوالفاضل راز چاندپوری)

نظارۂ بہار کئے جارہا ہوں میں
حُسنِ نظر نثار کئے جارہا ہوں میں
دل کو اُمیدوار کئے جارہا ہوں میں
گویا گناہگار کئے جارہا ہوں میں
سو بار کھا چکا ہوں فریبِ وفا، مگر
دنیا کا اعتبار کئے جارہا ہوں میں
جھوٹی تسلیوں سے تو تسکین ہو چکی
کیوں دل کو بیقرار کئے جارہا ہوں میں
انجامِ انتظار سے واقف ہوں میں۔ مگر
فردا کا انتظار کئے جارہا ہوں میں
تقدیر کی نوازشِ پیہم کو کیا کہوں
تدبیر بار بار کئے جارہا ہوں میں
دیوانہ کن تھی کشمکشِ جبر و اختیار
اب جبر اختیار کئے جارہا ہوں میں
رکھیں گے مجھکو یاد حریفانِ خوش نظر
فطرت کا رازدار کئے جارہا ہوں میں
اے راز تو کہاں، یہ شرابِ خودی کہاں
ہشیار، ہوشیار کئے جارہا ہوں میں

بلیک ہول

(از مسٹر ارشاد فاطمی، بی۔ اے آنرز)

عرصہ ہوا رسالہ "زمانہ" میں ایک مضمون جنگ پلاسی کے متعلق حضرت وصل بلگرامی مدظلہٗ کا شائع ہوا تھا حضرت ممدوح نے صرف جنگ اور اس کے بیان ہی پر اپنے مضمون کو تمام کیا تھا میں چاہتا ہوں کہ اس اہم تاریخی واقعہ پر مزید روشنی ڈالوں اور اس ضمن میں "بلیک ہول" کی مشہور من گڑھت کہانی کو چند تاریخی حوالوں سے اور زیادہ واضح کروں۔ میں چونکہ خود مرحوم نواب کے خاندان کا ایک رکن ہوں لہذا بہت سے واقعات ایسے جانتا ہوں جو صفحۂ تاریخ پر ہنوز روشن نہیں ہوئے ہیں۔ گھر کی بات گھر والے ہی بہتر جانتے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں اپنے مقصد کلام پر پہونچوں چاہتا ہوں کہ ایک مختصر تاریخی واقعہ اور بھی درج کردوں جو غیر متعلق نہ ہوگا جس وقت قیرن کے ناپاک ہاتھوں سے نواب کے قتل کی خبر عظیم آباد آئی راجہ رام نرائن موزوں نائب ناظم بہار اپنی دریا کنارے والی فرودگاہ میں مسندِ عدالت لگائے بیٹھے تھے۔ اس اندوہ ناک خبر کے پاتے ہی ایک سکتے میں آگئے، قلمدان اٹھا کر غرقِ آب کر دیا بار بار اٹھتے تھے اور ٹہلتے تھے اور رو رو کر یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک خط بنام نواب اسمٰعیل قلی خاں میں راجہ صاحب دوسرا شعر بھی لکھتے ہیں:۔

بلبل بیدرد کو نسبت ہے کیا پروانے سے
وصل میں مرجائے وہ یہ ہجر میں جیتی رہے

ظاہر ہے کہ نواب سراج الدولہ کا خون ایسا نہ تھا جو رنگ نہ لاتا یا ایسا نہیں جو سرخیِ شفق بنے اب جبکہ موجودہ کشمکشِ زمانہ نے ہماری آنکھوں سے غبار دھو دھو کر آنسو کی صورت میں نکال دیا ہے ہمارے دل اور دماغ دونوں صورتِ آئینہ صاف اور روشن ہیں۔ لہذا اپنا ماضی اپنے زمانہ حال میں اور زیادہ صاف نظر آتا ہے۔ اسی طرح جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اپنا دامنِ تخیل

بہت زیادہ کشادہ پاتے ہیں اور نگاہیں ہمیشہ حقیقت کی جانب اُٹھتی ہیں۔

ہم تو ہم اب جب غیر بھی ہماری تاریخ پڑھتے ہیں تو وہ تعصب اور کینے کو دل سے نکال کر ہمیشہ حقیقت اور اصل واقعات کی جانب اپنے ضمیر کو رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں جب آل انڈیا ہسٹوریکل سوسائٹی کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا مسٹر لٹل (Mr Little) نے واقعۂ بلیک ہول کا تذکرہ کرتے صاف لفظوں میں کہا :-

"The Black-Hole incident was a gigantic hook."

اب اسی بیان سے اِس مَن گھڑت قصّہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی اجلاس میں یہ سبجکٹ کافی گھنٹوں تک زیر بحث رہا۔ اس بحث میں اے۔ کے میتر آنجہانی بھی شامل تھے آپ نے اس واقعہ کے متعلق فرمایا کہ یہ محض بے بنیاد حکایت ہے۔ اول تو مسٹر ہال وِل جس بڑے کمرے کا تذکرہ کرتے ہیں اُس کا طول و عرض صاف صاف بتاتا ہے کہ اتنی سی مختصر جگہ میں ایک سو چھیالیس قیدی کسی طرح سما نہیں سکتے۔ دوسرے یہ کہ اس بے بنیاد حکایت کے راوی صرف مسٹر ہال ول ہیں اور اُنھیں کے نوشتے سے تمام مورخوں نے یہ روایت اخذ کی ہے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم کسی مصنّف کی تصنیف کے متعلق کچھ رائے قائم کریں سب سے پہلے لازم ہے کہ خود اُس کی پرائیویٹ لائف پر تنقیدی نظر ڈالیں۔ مسٹر جون ہال ول ایک لائق شخص ضرور تھے مگر عیّاری میں طاق تھے اور اس فن میں اپنے ہمعصروں میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ خود لارڈ کلائیو کا بیان ہے :-

"Mr. Holwell is an specious and sensible man and no doubt, but from what I have heard and observed myself, I cannot be persuaded if he will ever make use of his abilities.

ایک جگہ اور ۱۷۶۶ء میں لارڈ کلائیو اپنے خفیہ رپورٹ میں یوں لکھتے ہیں :-

Mr.... has talents but I fear once for all a heart, therefore unfit to preside, where integrity as well as capacity are equally essential

اب مسٹر ہال ول کے متعلق میرے بیان کی زیادہ ضرورت نہیں صرف لارڈ کلائیو ہی کی زبان کافی ہے

یہاں پر ایک واقعہ اور قابلِ غور ہے۔ لارڈ کلایو کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد مسٹر ہال ول نے میر جعفر کی شکایت کمپنی کے ڈائرکٹروں کے ہاں کی اور تحریر کیا کہ یہ نہایت ہی بے رحم شخص ہے اور اس نے کئی انگریزوں کو قتل کر ڈالا ہے چنانچہ اس ضمن میں کئی آدمیوں کے نام بھی لکھ بھیجے جو میر جعفر کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ۱۷۶۶ء میں جب کلایو ہندوستان واپس ہوا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ لوگ جن کے نام ہالول نے مقتولین کی فہرست میں گنائے تھے سب زندہ نکلے۔ تو بس اتنا کافی ہے کہ ایسے شخص کے لئے ایک بڑی سے بڑی کہانی اور ایک چھوٹی سے چھوٹی روایت کا گڑھ دینا محض آسان تھا۔ اسی بنا پر سراج الدولہ کے کیرکٹر کو بدنما دکھانے کے لئے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے بلیک ہول کی ہتیا تصنیف کی گئی۔

اور تو اور خود نواب کے ہمعصر ہندوستانی مورخین اس واقعہ کا کہیں بھی تذکرہ نہیں کرتے ہیں نواب غلام حسین خاں اپنی سیر المتاخرین میں سراج الدولہ کے عیوب پر بہت زیادہ روشنی ڈالتے ہیں مگر اس واقعہ کا تذکرہ کہیں بھی نہیں کرتے۔ خود منظفر نامہ کا مؤلف بھی خاموش ہے۔ اور دیگر آرمینیز تذکرے بھی ساکت ہیں۔ اگر سراج الدولہ سے میر جعفر کے گھر والوں کو مخاصمت تھی تو وہ ضرور بالضرور اس اہم ترین واقعہ پر زور دیتے، مگر اُن کے ہاں کی بھی کوئی چیز اس بات کی شہادت نہیں دیتی بس معلوم ہوا کہ اس روایت کے مصنف ہمارے ممدوح و کرم فرما مسٹر ہال ول ہی تھے۔ ان کی تصنیف ۱۷۶۵ء میں لندن میں چھپی اور پھر اس کے بعد یہ واقعہ عالمگیر ہو گیا

ہمارے بہت سے ہندوستانی اہلِ قلم یہ الزام نواب کے سر سے اُٹھا کر مانک چند کے سر عائد کرتے ہیں۔ مگر وہ کہاں تک حق بجانب ہیں خود انھیں بھی اس کی خبر نہیں۔ مانک چند بذاتِ خود ایک نیک نہاد اور باوفا شخص تھا، کجا وہ اور کجا یہ ظلم۔ وہ رفاہِ عام کا ہمیشہ جویا تھا۔ چنانچہ خود اُس کا بنوایا ہوا تالاب، جو مخلوقِ خدا کی راحت کے لئے کھدوایا گیا تھا اب تک پٹنہ میں (سر علی امام کی کوٹھی کے پشت پر) یادگار ہے۔

زمانہ جولائی ۱۹۴۱ء میں مضمون "اردو ہندی ہندوستانی" کے مصنف کا نام غلط درج ہو گیا ہے "حق پسند" کے بجائے "حق پرست" ہونا چاہیئے۔ اسی مضمون میں صفحہ ۳ آخری سطر پر اس عبارت "ہمارے اردو کو اختیار کرنے میں" "تہ" چھوٹ گیا ہے۔ اصل عبارت یوں ہونی چاہیئے "ہمارے اردو کو اختیار نہ کرنے ہی سے"۔

موت

(حضرت الطاف مشہدی)

ابھی تو کیف کی ندی بہائی ہے میں نے
ابھی تو بانسری منہ سے لگائی ہے میں نے

ابھی تو ایک جگر دوز انتظار کے بعد
نقاب چہرۂ گلگوں اُٹھائی ہے میں نے

ابھی تو سازِ جوانی کو میں نے چھیڑا ہے
ابھی تو شوق کی بستی بسائی ہے میں نے

ابھی تو کالی گھٹاؤں کی دیکھ کر مستی
کسی کی زلف کی سوگند کھائی ہے میں نے

ابھی تو حکم دیا ہے فلک کو سجدے کا
ابھی تو آنکھ زمیں کو دکھائی ہے میں نے

ابھی تو حُسن کی ایمن نواز کرنوں سے
جگر میں عشق کی دھونی رمائی ہے میں نے

ابھی تو کھیلنا سیکھا ہوں نرم پھولوں سے
شراب و شعر کی محفل جمائی ہے میں نے

ابھی تو حُسن کی مخمور سی شعاعوں پر
جگر کو تھام کے اِک چیز گائی ہے میں نے

ابھی تو کاکُلِ عنبر فشاں کی لپٹوں سے
تخیّلات کی دنیا سجائی ہے میں نے

ابھی تو شعر کی دنیا کو زندگی دی ہے
ابھی تو حدّتوں کی مے لنڈھائی ہے میں نے

ابھی تو میری جوانی نے آنکھ کھولی ہے
ابھی تو دولتِ احساس پائی ہے میں نے

ابھی تو نیند کے ماتوں کو میں نے چھیڑا ہے
ابھی تو ایک جھلک ہی دکھائی ہے میں نے

خدا کے واسطے اے موت مجھ کو جینے دے
شرابِ زیست کے پُرکیف جام پینے دے

دُکھی کی پکار

(از پروفیسر حامد حسن قادری، ایم - اے)

مَیں نے بعض ادبی تبرّکات کی جو گوشۂ گمنامی میں تھے یا یاد سے محو ہو گئے تھے "زمانہ" کے ذریعہ سے اُن کی یاد تازہ اور یادگار قائم کر دی ہے یعنی سنہ ۱۹۳۹ء اور سنہ ۱۹۴۰ء میں حضرت مضطر خیرآبادی، حضرت بیخود بدایونی، حضرت علوی ہاپوڑی اور حضرت اسیر بدایونی کی نثر و نظم میرے مختصر تعارف کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں، اسی نوع کی ایک قدیم نظم میرے پاس اور بھی تھی، اور اس کو اشاعت کے لئے "زمانہ" کو بھیجنے کا ارادہ تھا، لیکن بھول گیا اور اتنی دیر ہو گئی۔ اس غفلت سے بڑا نقصان یہ ہو گیا کہ اب مَیں نے اس نظم کو ڈھونڈھا تو معلوم ہوا کہ اُس کا آخری ورق غائب ہے، بڑا افسوس ہوا میرے اندازے میں نظم کے کم از کم بیس شعر اور ہونگے۔ اب اگرچہ ناتمام ہے، لیکن ممکن ہے اس قدر بھی اور کہیں نہ ملے۔

یہ مضطر خیرآبادی کی ایک نظم ہے جس کا نام اس مضمون کا عنوان ہے، میرے پاس اُن کا کُلیات نہیں ہے، اگر اُن کا تمام کلام چھپ گیا ہے تو اس میں یہ نظم بھی شامل ہونی چاہئیے۔ میرے پاس جو مطبوعہ نسخہ ہے وہ ۵۴ برس پہلے اکتوبر سنہ ۱۸۹۶ء کا چھپا ہوا ہے اور تیسری بار چھپا ہے۔ نظم اب سے کم از کم پچاس برس پہلے کی لکھی ہوئی ہوگی۔ یہ کتاب جیبی تقطیع ۱۶ صفحہ، ۱۲ اسطر مسطر پر مطبع مطلع العلوم مراد آباد میں چھپی ہے۔ سرورق پر جلی و خفی قلم سے کتاب و مصنف کا نام اور تعریف اس طرح سے مرتب کی گئی ہے۔

"یہ ایک دردمندانہ مناجات بحضور پروردگار ہے، اس لئے اس کا نام "دُکھی کی پکار" ہے اور یہ مجموعہ دارالضرب درہم داغ جگر مولوی منشی سید محمد افتخار حسین صاحب مضطر خیرآبادی برادر خرد حضرت بسمل کی طرف سے ہدیۂ یادگار ہے۔"

مضطر خیرآبادی نے یہ مناجات مولانا حالی کی "مناجات بیوہ" کی بحر میں اسی اسلوب و زبان میں لکھی ہے۔ مولانا حالی کے شاعرانہ کمالات میں یہ "کرامت" بھی شامل ہے کہ انھوں نے بعض ایسی دلکش بحریں استعمال کیں جن میں ان سے پہلے کوئی طویل و ممتاز نظم نہ لکھی گئی تھی۔ مسدس حالی اور مناجات بیوہ

کے اوزان اُردو میں بالکل جدید معلوم ہوتے ہیں۔ "مناجات" کی بحر میں صرف میر تقی میر کی ایک مثنوی اس سے پہلے موجود تھی، جس کا مطلب یہ ہے :-

ضبط کروں میں کب تک آہ اب   چل رے خامہ بسم اللہ اب

مولانا حالی نے "مسدس" و "مناجات" کے موضوع و مضمون کی مناسبت سے اُن کے لئے بحریں انتخاب کرنے میں بڑے ذوقِ سلیم کا ثبوت دیا ہے۔ موضوعِ مسدس کی روانی اور زور کے لئے اس کی بحر متقارب سالم (فعولن فعولن فعولن فعولن) نہایت موزوں ہے۔ اور مضمونِ مناجات کے لئے جس سوز و درد اور نرمی و آہستگی کی ضرورت تھی وہ اس کی بحر متدارک (فعلن فعلن فعلن فعلن) میں موجود ہے یہی ان نظموں کی کامیابی و مقبولیت کا ایک سبب ہے، اور مسدس حالی کے جواب میں جو بلا مبالغہ درجن بھر اتنے ہی بڑے مسدس لوگوں نے لکھدیئے، اس کی وجہ بھی بحر کی روانی و آسانی تھی۔

"مناجات بیوہ" کی تقلید میں حضرت مضطر خیر آبادی نے اپنی نظم "دُکھی کی پکار" لکھی ہے اس طرح کی اور کوئی طویل نظم میری نظر سے نہیں گذری۔ "مناجات بیوہ" میں مولانا حالی کا بڑا کمال اسلوب بیان و زبان کی موزونیت ہے۔ عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی کے الفاظ محاورے، کہاوتیں ایسی برمحل برتی ہیں کہ جادو کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ مضطر خیر آبادی نے بھی اپنی نظم میں وہی اثر پیدا کرنا چاہا ہے اور کثرت سے ہندی الفاظ لکھے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ حالی نے صرف لفظ و محاورہ پر بس کی ہے اور مضطر نے مصرعے کے مصرعے ہندی میں موزوں کر دیئے ہیں۔ حالی کا یہ اسلوب ہے :-

یہ برکھا اور پیا پردیسی   آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
سائیں بن جو چیز ہے گھر میں   خاک ہے سب عورت کی نظر میں
پڑی تھی جس بے وید کے پالے   ہوئی تھی جس بَیری کے حوالے
نام یہ دھونی اُس کے رماکر   آن کو رکھا جان گنوا کر
پیت نہ تھی جب پایا پیتم   جب ہوئی پیت گنوایا پیتم

مضطر نے اس طرز سے بڑھکر یہ انداز بھی جابجا اختیار کیا ہے :-

او ٹھکن ہارے بتیا کے (ٹھوکنے والے)   او روکن ہارے نیّا کے (روکنے والے)
او بیون کے ہاتھ گہیّا (بیوہ) (ہاتھ پکڑنے والے)   او دُکھین کے دُکھ پوچھیّا (دُکھی)

او پوچھتیا ہم جینین کے　　　او جگوتیا رات اور دن کے
(جیسوں کو)
جو بلیا، مطلب کا گرجی　　　مورے بھاگ، ہتیاری مرجی
(بلا، غرضی)　　　(میرے نصیب، تیری مرضی)
رین دنا توری آسا ہو　　　لورا ہاتھ، مورا کا سا ہو
(کاسہ)

جو مانگوں سو تو سے پاؤں　　　اور کہوں مانگن نا جاؤں

یہ فصیح اور شہری بھاشا نہیں ہے دیہاتی زبان ہے، لیکن دلچسپی اور دلکشی سے خالی نہیں اس میں بھی ایک خاص لطف وتاثیر ہے۔ مضطر نے ایک نیا انداز بھی پیدا کیا ہے یعنی مصرعوں کے ٹکڑے مقدم ومؤخر کر کے دوسرا شعر نکال لیا ہے۔ چھوٹی سی نظم میں بڑی کثرت سے ایسا کیا ہے۔ اِس "اُلٹ پھیر" میں بھی ایک جدّت پیدا ہو جاتی ہے لیکن کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی، دو چار شعر یہ ہیں:-

او سگری مایا کے مالک　　　او سگری کایا کے مالک

او مالک سگری کایا کے　　　او مالک سگری مایا کے

کایا کے مایا کے مالک　　　مایا کے کایا کے مالک

او مایا کایا کے مالک　　　او کایا مایا کے مالک

بے مایہ ہوں مایا دیدے　　　دھوپ کے بدلے سایا دیدے

سایہ دیدے دھوپ کے بدلے　　　روپ دکھا بہروپ کے بدلے

حضرت مضطر کی یہ نظم صرف شاعری نہیں ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کسی "دُکھی کی پکار" ہے۔ جیسا کہ خود مصنف نے نظم سے پہلے مختصر دیباچہ میں لکھا ہے۔ اول دیباچہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے

"میں اپنے پیدا کرنے والے پروردگار کا سپاس ادا کرتا ہوں، جس نے مجھکو پیدا کیا اور پیدا کر کے اس چھوٹی سی عمر میں کہ جس کا تیسواں سال تمام ہونے کو ہے، دنیا کی ناپائداریوں پر اور انقلابات عالم کی بدکرداریوں پر مجھکو ایک خاص تجربہ عنایت فرمایا۔ اور اس گزری ہوئی زندگانی اور بیتی ہوئی جوانی میں مختلف عیشوں اور مختلف مصیبتوں کا مزہ چکھایا۔ جلّ شانہٗ وجل جلالہٗ، ہونے کو میں کسی قابل نہیں ہوں، لیکن بمصداق فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ کسی نہ کسی خاص ضرورت سے بنا ہوں۔ اور کسی نہ کسی خاص کام کے لئے بنایا گیا ہوں۔ غالباً بگڑنے کو بنا ہوں اور بننے کو بگڑونگا یہ بننا بگڑنا ایک ایسا ضروری امر ہے کہ ہونا ہے اور پھر ہونا ہے، اگرچہ بظاہر ؎

نہ شگوفہ ام نہ برگم نہ ثمر نہ سایہ دارم　　　ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

لیکن آپ جانیں کہ خدا کی خدائی میں شئی من الاشیاء خالی از علت نہیں پیدا کی گئی ہے۔ جب یہ ہے

تو مجھکو اپنی ناکامی بھی ایک بڑے کام کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ میں اپنے اللہ کے بندوں میں ایک نکما اور مہا نکما بندہ ہوں اس لئے اپنے نہونے کے بعد اپنے دینی اور قومی بھائیوں کو کسی طرح یاد نہیں رہ سکتا، ناچار ایک مجموعۂ اشعار ناہموار کو جسکا نام "دُکھی کی پکار" ہے۔ اپنے معزز و قدردان ملک وقوم کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ وہ ان چند اوراق پریشاں کو میری یادگار نشانی سمجھکر اپنے پاس رکھیں، اور بہتر ہو جو اس کو بھی شریک وظائف نیم شبی داوراد سحری گردان کر اپنے ساتھ میرے حق میں بھی دعائے خیر کریں۔ اللہ بس باقی ہوس۔ وآخرُ دعوانا ان الحمدُ للہِ ربّ العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم و علیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

مضطر شوریدہ سر

مضطر کی مناجات کی طرح اس دیباچے میں بھی مایوسی کی جھلک ہے۔ گویا وہ اپنی زندگی سے بددل یا نااُمید ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو عمر دراز عطا فرمائی اور زندگی میں شادکامی عنایت کی۔ اس "پکار" کے لکھنے کے بعد تینتیس ۳۳ بتیس ۳۲ برس زندہ رہے، بڑے عہدے اور خطاب پائے۔ اپنی یادگار میں صرف یہ مناجات نہیں بلکہ کئی دیوان چھوڑے۔ بڑے زندہ دل آدمی خوش گو اور قادرالکلام شاعر تھے۔ اُن کی ایک غزل اس قدر مقبول و مشہور ہوئی کہ ہر کوچہ و بازار میں لوگ اس کو گاتے پھرتے تھے، اس کا مطلع یہ ہے:-

یہ کیسے بال ہیں بکھرے یہ صورت کیوں بنی غم کی — تمھارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

اس کا پہلا مصرع غلط مشہور ہوگیا تھا، تینتیس برس سے زیادہ ہو گئے ہونگے مضطر نے رسالہ "مخزن" لاہور میں اپنی غزل چھپوائی اور لکھا کہ اس کے بعض اشعار زبانِ عوام پر غلط چڑھ گئے ہیں، مطلع کا پہلا مصرع اس طرح درست کیا تھا:-

"یہ کیسے بال بکھرا ہے، یہ کیوں صورت بنی غم کی"

مضطر بڑے فراخ حوصلہ، سخن شناس اور قدر دان تھے، ایک واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ جنوری ۱۹۰۰ء میں نواب حامد علی خاں صاحب بہادر رئیس رامپور نے شاہانہ اہتمام کے ساتھ عظیم الشان مشاعرہ منعقد فرمایا تھا جو دو روز میں ختم ہوا تھا۔ تمام ہندوستان کے اساتذۂ شعر وسخن جمع ہوئے تھے دوسرے دن اُستادوں کے پڑھنے کی باری آئی، منشی حیات بخش رسا سکندرآبادی نے یہ مطلع پڑھا:-

ہاں ہاں، ضرور صدمے دشمن کی جان پر ہیں — جب اپنی جان پر ہیں، سارے جہان پر ہیں

مضطر اس کو سنکر فرطِ مسرت اور جوشِ تحسین سے مست و سرشار تھے۔ خود حضرت مضطر کی بھی ایسی

ہی قدر کی گئی۔ یہ لطیفہ شاید اپنی نوعیت کا ایک ہی ہوگا کہ غالباً ۱۹۱۵ء میں مضطر کی ایک غزل کسی پرچے میں شائع ہوئی۔ میں اُس زمانے میں ریاست بڑودہ کے کالج میں مدرس تھا۔
بڑودہ کے ایک سخن فہم رئیس کو یہ شعر بیحد پسند آیا:۔

وقت مجھ پر دو کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں　　آپ کے آنے سے پہلے آپ کے جانے کے بعد

اُن رئیس صاحب نے یہ قدردانی کی کہ مضطر کو تار کے ذریعہ سے اس کی داد دی۔ پورا شعر رومن حروف میں لکھا گیا اور ایک جملۂ ستائش کے ساتھ مضطر کو روانہ کیا گیا۔ وہ تار میں نے لکھا تھا۔

افتخار الشعراء، اعتبار الملک، افتخار جنگ، خان بہادر سید محمد افتخار حسین رضوی مضطر خیرآبادی ۱۸۶۵ء (۱۲۸۲ھ) میں پیدا ہوئے تھے۔ والد کا نام حافظ سید احمد حسین ہے رسوا تخلص تھا۔ مضطر کی والدہ مولانا فضل حق خیرآبادی کی صاحبزادی تھیں اور خود فاضلہ و شاعرہ تھیں۔ مضطر نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی اور شروع میں اپنے کلام پر اصلاح بھی انھیں سے لی۔ پھر حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ اختیار کیا۔ کئی دیوان ان سے یادگار ہیں۔ ایک پورا دیوان "حمد باری تعالیٰ" میں کہا اور اس کا نام "نذر خدا" رکھا۔ دوسرا نعتیہ دیوان "نذر مصطفےٰ" کے نام سے شائع کیا۔ مضطر کے بڑے بھائی حضرت بسمل خیرآبادی نواب صاحب بہادر ریاست ٹونک کے اُستاد تھے اُن کے بعد مضطر کو یہ شرف حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ ریاست میں ججی کے عہدہ پر فائز رہے۔

اب مضطر کی مناجات "دکھی کی پکار" پڑھئے:۔

دکھی کی پکار

اَمَّن یُّجِیبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ[۱]

او جگ داتا، داتا جگ کے　او پرکھن ہارے رگ رگ کے　اور رگ رگ کے پرکھن ہارے　او سگرے جگ کے داتا رے
او بن والی، سب کے والی　سب میں تو، سب تجھ سے خالی　سب تجھ سے خالی، تو سب میں　ڈھب سے باہر اور پھر ڈھب میں
او سچے جھوٹے کے مالک　او ٹوٹے پھوٹے کے مالک　او مالک سچے جھوٹے کے　او مالک ٹوٹے پھوٹے کے
سوکھے اور ہرے کے مالک　کھوٹے اور کھرے کے مالک　مالک کھوٹے اور کھرے کے　مالک سوکھے اور ہرے کے
چھوٹے اور بڑے کے وارث　بیٹھے اور کھڑے کے وارث　وارث بیٹھے اور کھڑے کے　وارث چھوٹے اور بڑے کے
او ایسے ویسے کے والی　او جیسے تیسے کے والی　او والی جیسے تیسے کے　او والی ایسے ویسے کے

[۱] جب کوئی مضطر و ناچار اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو وہ اُس کی سنتا ہے اور اُس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔

ایسے کو تو ویسا کر دے ‏ جیسا چاہے ویسا کر دے
او بے پروا پروا والے ‏ سب بے پر ہیں بازو والے
کیونکر کوئی تجھ سے بھاگے ‏ تو موجود ہے آگے آگے
چاہے جس جنجال میں رکھے ‏ مالک ہے جس حال میں رکھے
او اَندیکھے دیکھے بھالے ‏ اُو اَن بولے بولے چالے
او بولے چالے ان جانے ‏ دیکھے بھالے بن پہچانے
او بن بوجھے بوجھ میں آئے ‏ بے سمجھے سمجھے سمجھائے
او سمجھے سمجھائے سب کچھ ‏ او سیکھے سکھلائے سب کچھ
او بن جانے جان کے اندر ‏ پہچانے پہچان کے اندر
او مالی گلزار جہاں کے ‏ او گلچیں صحن بستاں کے
بروؤں کے جَل دینے والے ‏ پھولوں کے پھل دینے والے
دینے والے پھل پھولوں کو ‏ دینے والے جَل پھولوں کو
کانٹوں سے تو پھول نکالے ‏ پھولوں میں تو کانٹے ڈالے
سوکھی شاخ میں کوپل پھوڑے ‏ گیلی ڈال کے پتے توڑے
او کانھا گوکل والوں کے ‏ پچھن ہار بُرے حالوں کے
او والی ہم بے والن کے ‏ او رکھوالے سگری گوالن کے
او بن باپ کے او بن ماں کے ‏ مالک دل کے مالک جاں کے
بے کھٹکے مرنے جینے سے ‏ بے پروا کھانے پینے سے
تیرا کوئی نہیں تو سب کا ‏ سب تیرے تو سب کے ڈھب کا
تو سب کے ڈھب کا سب تیرے ‏ سب تجکو دن رات ہیں گھیرے
او بے گُن کی ناؤ کھویّا ‏ او بیڑے کے پار لگیّا
او منجدھار میں دکھ ہارے ‏ او بپتا کے دکھ ہارے
او دکھ ہارے بپتا کے ‏ او رو دکھ ہارے بپتا کے
او بیوگن کے بانہہ گہیّا ‏ او دکھیّن کے دکھ پوچھیّا
او پوچھیّا ہم جیسوں کے ‏ او جگویّا رات اور دن کے
میرا حال ہے تجھ پر روشن ‏ ہر جنجال ہے تجھ پر روشن
تو دانا ہے اور ہے بینا ‏ تیرے ہاتھ ہے مرنا جینا
آنسو ہوں ڈھل جانے والا ‏ پہلو ہوں جل جانے والا
جل جانے والا پہلو ہوں ‏ ڈھل جانے والا آنسو ہوں
دن ہوں لیکن رات سے بدتر ‏ موسم ہوں برسات سے بدتر
گھر ہوں لیکن کچھ اُجڑا سا ‏ کام ہوں لیکن کچھ بگڑا سا
محمل ہوں لیلےٰ سے خالی ‏ اپنی بات نہ ہونے والی
پھول ہوں لیکن رنگ نہیں ہے ‏ نرگس ہوں کچھ ڈھنگ نہیں ہے
مال وہ ہوں جو کام نہ آئے ‏ دل جس کو آرام نہ آئے
او فریاد کے سننے والے ‏ کانٹے دل سے چننے والے
او سجدہ کروانے والے ‏ او اللہ فرمانے والے
او عاشق طیبا والے کے ‏ او شیدا دیکھے بھالے کے
کون وہی محبوب اکرم ‏ صلے اللہ علیہ وسلم
صدقہ اُسکی زیبائی کا ‏ صدقہ اس کی رعنائی کا
صدقہ اُس کمل والے کا ‏ صدقہ اُس جنگل والے کا
اس یثرب والے کا صدقہ ‏ پیاری چھب والے کا صدقہ
صدقہ اُس صورت والے کا ‏ صدقہ اُس قامت والے کا
صدقہ اس کے نام کا صدقہ ‏ اُس کے دین اسلام کا صدقہ
اُس کے حسن پاک کا صدقہ ‏ اس کے در کی خاک کا صدقہ
صدقہ اُسکی لاج کا صدقہ ‏ اس شاہ معراج کا صدقہ
صدقہ اسکی چال کا صدقہ ‏ صدقہ اُس کی آل کا صدقہ
فاطمۂ زہرا کا صدقہ ‏ اُس کے نقش پا کا صدقہ
صدقہ اور حسنین کا صدقہ ‏ صدقہ او سبطین کا صدقہ
ان کی تشنہ لبی کا صدقہ ‏ اس آل عربی کا صدقہ
ان سب کے صدقوں کا صدقہ ‏ اپنے کل بندوں کا صدقہ

آس مرے دل کی پوری کر دور یہ مرحلہ دوری کر اپنے پاس بلالے داتا چین نہیں فرقت میں آتا

تیرا ہوں تو اپنا کرلے اپنے پاس بلاکر دھرلے دنیا میں کیا خاک دھرا ہے کوئی جیا ہے کوئی مرا ہے

تو باقی، باقی سب فانی کب ٹھہرا ہے بہتا پانی کوئی نہیں دنیا میں میرا یا معبود سہارا تیرا

جو ملیا مطلب کا گرجی مورے بھاگ تہاری مرجی کیسے باپ کہاں کے بھیّا کیسی بہنی، کس کی میّا

کیسی جورو کس کی جاتا سب سے سچا تیرا ناتا او میری سدھ لینے والے او بن مانگے دینے والے

او کرتار خدائی والے او ملیا بن بھائی والے او ہر پھول میں کھلنے والے او ہر رنگ میں ملنے والے

ملنے والے ہر ہر شے میں ہر ہر دھن میں ہر ہر لے میں ہر ہر تار کے اندر تو ہے کل سنسار کے اندر تو ہے

کوئی نہیں ساتھی بگڑی کا سر سو ہے تورے یہ ٹیکا بخشش کی کچھ آس نہیں ہے اچھی پونجی پاس نہیں ہے

کالے دفتر اعمالوں کے ڈھیر کے ڈھیر برے چالوں کے لچھن کوئی نیک نہیں ہے تلے نیکی ایک نہیں ہے

چھوڑ چکے سب ناتے والے بیٹھے ہے نفرت گھر گھالے یار خفا ہے دشمن ٹیڑھا ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا

او تصویر بنانے والے او تقدیر بنانے والے ایک مجھے سو دکھ میں گھیرے اس کے اس کے تیرے میرے

کچھ غم اپنی ویرانی کا کچھ غم چاک گریبانی کا کچھ غم گھر کی بربادی کا کچھ غم اپنی ناشادی کا

عیش کا میرے گھر لوٹا ہے رنج بہت ہیں دل چھوٹا ہے قسمت والا بدقسمت ہوں بدقسمت کی بگڑی مت ہو

حسن کو چاہا صدمے جھیلے خالی ہو لی پاپڑ بیلے معشوقوں سے چین نہ پایا جز حسرت کچھ ہاتھ نہ آیا

کچھ قدرِ سادات نہ جانی دمڑی کی اوقات نہ جانی ملتا چھوڑا میٹھا رہے گھر پاس رہے پردیس برابر

کوئی کسی کا ہوتا ہے کب دنیا ہے اور اپنا مطلب کوئی نہیں روتے کا ساتھی جو ہے وہ ہونے کا ساتھی

او باقی رہ جانے والے او ساقی رہ جانے والے پیاسا ہوں پانی پلوا دے تو ملجا سب کو ملوا دے

تیرا ملنا سب کا ملنا سب سے بہتر رب کا ملنا مل جا اور ملا دے یا رب بگڑا کام بنا دے یا رب

تیری یاد میں سب کو بھولوں بارہ ماس برابر پھولوں اپنوں کو بیگانہ جانوں غیروں کو دیوانہ جانوں

تورا دھیان ہو توری دھن ہو تورے گیان کا میکا گن ہو کوئی پاس نہ پھٹکے داتا من پہ لے کھٹو نہ بھٹکے داتا

بھٹکے بھی تو تیرے مارے مر جائے من میرے مارے ایک جگہ رہنا سہتا ہو اچھے بھاگ بھلا لہنا ہو

ٹاٹ کا ٹکڑا بستر ٹھہرے ہاتھ کے تکیے پر سر ٹھہرے من ہو اور استھان گرو کا دونوں آنکھیں لال بھبوکا

سارے تن پر راکھ ملی ہو اور ہی کچھ چتون بدلی ہو کمل میں خوشحال رہوں میں ہر دم لالوں لال رہوں میں

آس پاس بیلی ماٹی ہو چھوٹی سی سیتل پاٹی ہو رین دنا تمہری آسا ہو تورا ہاتھ مورا کاسا ہو

جو مانگوں سو تو سے پاؤں اور کہوں مانگن نا جاؤں او سگری مایا کے مالک او سگری کایا کے مالک

او مالک سگری کایا کے　او مالک سگری مایا کے　کایا کے مایا کے مالک　مایا کے کایا کے مالک
او مایا کایا کے مالک　او کایا مایا کے مالک　یا کے مالک دا کے مالک　جا کے مالک تا کے مالک
لے مایا ہوں مایا دیدے　دھوپ کے بدلے سایا دیدے　سایا دیدے دھوپ کے بدلے　روپ دکھا بہروپ کے بدلے
موت اب آئی کوئی دم میں　ہوں دن رات اسی کے غم میں　اک دن میری جان ہے جانی　پھر کس برتے تتا پانی
او مضطر کے سننے والے　او اُدھڑی کے بننے والے　او مضطر کے پیارے مالک　جگ بھر کے اُجیارے مالک
پیارے مالک دنیا بھر کے　او پیارے مالک مضطر کے　او مضطر کے پوچھن ہارے　او مضطر کے داتا پیارے
او داتا پیارے مضطر کے　او پوچھن ہارے مضطر کے　او دُکھیا مضطر کے وارث　او دُکھیا مضطر کے وارث
او وارث دُکھیا مضطر کے　او وارث دُکھیا مضطر کے　او اپنے بندوں کے آقا　او حاجتمندوں کے آقا
او آقا حاجتمندوں کے　او آقا اپنے بندوں کے　او مضطر کے سچے آقا　تو یکتا سب کچے آقا
او سب کے اَن دینے والے　آپ دھنی دھن دینے والے　او رزاق بھلے چنگوں کے　سائیں اپنے بھک منگوں کے

ناظرین زمانہ میں سے کسی کے پاس یہ نظم ہو تو باقی شعر پورے کر دیں کہ یادگار مکمل ہو جائے۔

دریا اور میں

(از حضرت جگر بریلوی، بی۔ اے)

اُف صبح جوانی شام ہوئی منزل کی تمنا اب کب تک　بیزار ہوں میں بیزار بہت بیزار ہی مجھکو رہنے دے
راحت کی اُمیدیں ختم ہوئیں ساحل کی تمنا اب کب تک　موجیں ہی اگر تقدیر میں ہیں موجوں کے تھپیڑے سہنے دے
اے دل دریا کے تلاطم میں اب بہنے دے ہاں بہنے دے

جب کشتی پر کچھ بس ہی نہ ہو کشتی کا ڈبونا ہی اچھا　موجیں ہی قدرت والی ہیں موجوں کا سہارا لینے دے
جب جی ہر سانس پہ جاتا ہو تو جی کا کھونا ہی اچھا　طوفان ہی گر تقدیر میں ہے طوفان ہی میں سر دینے دے
اے دل دریا کے تلاطم میں اب بہنے دے ہاں بہنے دے

کہنے کو تو آزاد ہوں میں اور ظاہر میں مختار ہوں میں　گردن میں کوئی طوق نہیں او پاؤں میں بھی زنجیر نہیں
رگ رگ میں ہے جس کی دام نہاں وہ صید زبوں و زار ہوں میں　مجبوری ہے مجبوری ہے چلتی کوئی تدبیر نہیں
اے دل دریا کے تلاطم میں اب بہنے دے ہاں بہنے دے

مآلِ تہذیب

(از حضرت اسد ملتانی)

چشمِ عبرت سے بلا انگیزیِ ایام دیکھ
بزمِ ہستی میں بپا اِک حشر لے ہنگام دیکھ

ہو رہا ہے بحر و بر میں ہر طرف ظاہر فساد
امن سوزی کے لئے فتنوں کو بے آرام دیکھ

خود زمیں سے ہے عذابِ آسمانی کا ظہور
بم بم سے بام و در کو لرزہ بر اندام دیکھ

ترکتازی کے عوض اب برق تازی پر ہے ناز
عصرِ حاضر کی نئی شمشیرِ خوں آشام دیکھ

توپ ہے طیارہ ہے غوّاصہ ہے دبّابہ ہے
اِن ہلاکت خیز ایجادوں کا فیضِ عام دیکھ

بن گئی ہے شامتِ اعمال اِک طوفانِ قہر
غرقِ خونِ آدمیت کشتیٔ اقوام دیکھ

کارفرما ہے جو قانونِ مکافاتِ عمل
صید کو آزاد، صیادوں کو زیرِ دام دیکھ

برق گرتی تھی جو کل کاشانۂ درویش پر
اُس کی زد میں آج امیروں کے بھی قصر و بام دیکھ

دیدنی ہے بادۂ باطل کی تیزی کا اثر
میکدے میں خود بخود ٹکرا رہے ہیں جام دیکھ

جن کی جرأت کر نہیں سکتا ضمیر افراد کا
ملتوں میں اُن جرائم کا فروغِ عام دیکھ

ظلم و عصیاں میں بھی استعمال کرتے ہیں اُسے
ہو گیا ہے کس قدر ارزاں خدا کا نام دیکھ

یہ بھی ہے ناپائدار اور وہ بھی ہے بے اعتبار
دوستی اور دشمنی میں شیوۂ اقوام دیکھ

پھر زمانے میں ہوائے نفس کی بنیاد پر
اِک نئی دنیا بنانے کا خیالِ خام دیکھ

تجرباتِ زندگی کے شعلہ ہائے تند سے
دودِ بیجاں کی طرح اڑتے ہوئے اوہام دیکھ

کس طرح مجبور ہو کر جھک رہی ہیں گردنیں
آستانِ کبریا پر سجدۂ اصنام دیکھ

باوجودِ حکمت و قوت قیامِ امن میں
عقلِ انسانی رہی ہے کس قدر ناکام دیکھ

جس نے لادینی پہ رکھی تھی اساسِ زندگی
اپنی آنکھوں سے اب اِس تہذیب کا انجام دیکھ

لہ آبدوز کشتی ۱۲ سلہ ٹینک یا فولادی گاڑی ۱۲

کلامِ مجذوب

(از خواجہ عزیز الحسن غوری بی اے)

(۱)

جذبِ دل بھی آرزوئے دل عجب مشکل میں ہے
بارہا یہ دل سے نکلی پھر بھی دل کی دل میں ہے

سب کا منظورِ نظر ہے جاگزیں ہر دل میں ہے
عشق بھی مجذوب کا اب حسن کی منزل میں ہے

آج تو ہر وار پر اک تازہ دم بسمل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

پار لگ کر بھی ہنوز اے ناخدا ڈر دل میں ہے
دیر سے ساحل پہ ہوں اور اب بھی تنگِ ساحل میں ہے

کیا کروں یارب کدھر جاؤں کشاکش دل میں ہے
اک کشش گرداب میں ہے اک کشش ساحل میں ہے

ہو بہو منظر نظر میں ہے تصور دل میں ہے
گو نہیں ہے پھر بھی مجذوب آپ کی محفل میں ہے

(۲)

اک مسلسل کیفِ ذوق و شوقِ منزل دل میں ہے
خیر یہ مقصد تو حاصل سعیِ لاحاصل میں ہے

یوں تو ہے اکثر دلوں میں آمد و رفت آپ کی
دیکھنا لیکن جو ہے وہ یہ کہ گھر کس دل میں ہے

ایک سے ہے ایک بڑھ کر گو تمنا دل فریب
کیا تمنا اب ہو جانِ ہر تمنا دل میں ہے

فطرتاً جاذب ہے برقِ حسن برقِ عشق کا
یہ جو میری آنکھ میں تل ہے سویدا دل میں ہے

غیر اور مجذوب کی بابت میں کر دوں فیصلہ
فرق بس اتنا ہی ہے جو زبان و دل میں ہے

کوئی مطرب رات دن پردے میں ہے مضرابِ زن
راز میری نغمگی کا اضطرابِ دل میں ہے

رقص میں تیغِ ادا ہے وجد میں تیرِ قضا
آج کس بسمل کی آمد کوچۂ قاتل میں ہے

وہ نہیں آتے نہ آئیں تابہ کے اب انتظار
آج کر ڈالیں گے ہم بھی جو ہمارے دل میں ہے

بس ارے بس روک اپنے جذب کو مجذوب روک
عشق بھی ہے کشمکش میں حسن بھی مشکل میں ہے

تنقید کتب

روحِ غالب[1]

جتنی شرحیں کلامِ غالب اور جتنی سوانحعمریاں مرزا موصوف کی لکھی جاچکی ہیں آتنی کسی اور اُردو شاعر اور ادیب کی نہیں لکھی گئیں، اور ابھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔ سب سے پہلے خواجہ الطاف حسین حالی نے "یادگارِ غالب" لکھکر مرزا غالب کی خوبصورت تصویر پبلک کے سامنے پیش کی اور حق شاگردی ادا کردیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنا مشہور مقدمہ لکھکر مرزا غالب کو نہ معلوم کہاں سے کہاں پہونچادیا۔ پھر تو دیوان غالب کے مختلف اڈیشنوں، دیوان کی شرحوں اور سوانحعمریوں کا تانتا لگ گیا۔ مولانا حالی کی یادگارِ غالب اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمہ کے علاوہ اس وقت تک غالب کی شرحیں اور سوانحعمریاں ایک درجن سے زیادہ منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ حال میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے "روحِ غالب" کے نام سے مرزا کے سوانح حیات لکھے ہیں اور تحقیق واقعات کی داد دی ہے۔ "روحِ غالب" میں ڈاکٹر صاحب نے ان کتابوں اور ان شرحوں کی بھی تفصیل دی ہے جو مرزا غالب اور اُن کے دیوان پر اب تک لکھی جاچکی ہیں۔ اس کے بعد غالب کے مستند واقعاتِ زندگی مختصراً درج کئے ہیں، اور اسی کے ساتھ مرزا کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایک علحدہ باب میں غالب کے ادبی کارنامے بیان کئے ہیں جس میں اُردو فارسی اور نظم و نثر دونوں قسم کی تصانیف آگئی ہیں۔ اس کے بعد غالب کے شاگردوں کا مختصر حال ہے۔ آخری باب میں جو سب سے اہم ہے غالب کے خطوط درج ہیں جو بجائے خود ایک شاندار لٹریچر ہے۔

زور صاحب کے قلم میں زور ہے، اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے مختصر مگر تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ شروع میں مرزا غالب کی پُرانی تصویر اور خود ڈاکٹر زور کا فوٹو بھی شامل ہیں۔

منتخبِ داغ[2]

جناب احسن مارہروی مرحوم نے اپنے اُستاد حضرت داغ کے کلام کا ایک گراں قدر انتخاب مرتب کیا تھا جس میں اُن کے تمام دیوانوں کا نچوڑ ردیف وار لے لیا گیا ہے۔ اس انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ایسے تمام شعر نظر انداز کردئیے ہیں جن میں فارسی عطف یا اضافت سے کام لیا گیا ہے، یعنی ٹھیٹ روزمرہ کے شعر چُن لئے گئے ہیں۔ اس

---

[1] لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ ضخامت پونے دوسو صفحات قیمت ڈھائی روپیہ ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اُردو۔ رفعت منزل خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

[2] صفحات بڑی تقطیع کے ۱۰۷ صفحات قیمت مجلد پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ مطبع انوار احمدی الہ آباد

انتخاب کو مطبع انوار احمدی کے اولوالعزم مالک سید جلال الدین احمد جعفری نے عمدہ لکھائی چھپائی کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ شروع میں جناب احسن کے فرزند رشید سعید صاحب نے اپنے والد گرامی کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں کا بھی اضافہ کردیا ہے۔

کلام داغ کا کیا کہنا، وہ فصیح اُردو کے بادشاہ تھے اور اُن کا یہ دعویٰ بالکل صحیح تھا:۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

یہ کتاب مطالعہ کرنے اور لائبریریوں میں رکھنے کے قابل ہے۔ شروع میں مرزا داغ اور احسن مرحوم کی تصویر بھی شامل ہیں۔ ہم اس کی طباعت اور اشاعت پر مولوی جلال الدین احمد صاحب مالک مطبع انوار احمدی کو مبارکباد دیتے ہیں۔

ادب اور زندگی[1]

اس کتاب میں مشہور نقاد سخن مجنوں گورکھپوری کے سات قابل قدر تنقیدی مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں جن میں ادبی اُصولوں پر مباحثوں کے علاوہ ہندوستانی ناٹک۔ نظیر اکبرآبادی اور مولانا حالی کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے مجنوں صاحب اُردو کے ترقی پسند ادیبوں میں ہیں اور آپکی کئی کتابیں شائع ہوکر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ اس مجموعہ کے مضامین بھی بہت قابل قدر اور غور طلب ہیں۔ لائق مصنف کی بعض رایوں کے متعلق اختلاف کی گنجایش ہوسکتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کافی غور و فکر کے بعد اظہار خیال کرتے ہیں۔ یہ مضامین چھوٹی تقطیع کے ۱۳۶ صفحات پر شائع ہوئے ہیں۔

جوہر عبدالحق نمبر[2]

جامعہ ملیہ دہلی کے طلباء کی طرف سے مولانا محمد علی مرحوم کی یادگار میں "جوہر" نامی ایک رسالہ شائع ہوتا ہے اس رسالہ کا ایک خاص نمبر ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی ادبی خدمات کی قدردانی میں "عبدالحق نمبر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب اُردو کے سچے بہی خواہ اور محسن ہیں۔ اس خاص نمبر کے آدھے مضامین میں مولانا موصوف کے واقعات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رسالہ کے دوسرے مضامین بھی مثلاً سودا کی شاعری، شیخ ناسخ اور اصلاح زبان، چکبست وغیرہ وغیرہ قابل دید ہیں۔

نئی کتاب

جامعہ ملیہ دہلی آئے دن بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں نئی نئی کتابیں شائع کرکے اُردو کی گراں قدر

[1] قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ایوان اشاعت گورکھپور۔
[2] لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ جلد انگریزی۔ بڑی تقطیع کے ۲۰۲ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی

خدمات انجام دے رہی ہے۔ اِن کتابوں میں بہت آسان زبان میں مفید باتیں درج رہتی ہیں۔ اُردو حروف شناسی کے متعلق بھی جامعہ کی طرف سے کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں "نئی کتاب" "مدرس کا قاعدہ نما" "آسان قاعدہ" اور بچوں کا قاعدہ" قابل ذکر ہیں۔ جن میں حروف کی آواز تصویروں کے ذریعہ سے سمجھانے کا طریقہ استعمال کیا گیا ہے جس سے بچے خود بخود حرف شناس ہو کر سبق نکالنے اور پڑھنے لگتے ہیں۔

"مدرس کا قاعدہ نما" میں صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب وزیر تعلیم بھوپال نے ٹیچروں کو بہت عمدگی سے بتایا ہے کہ وہ بچوں کو تعلیم دینے میں کون سے ڈھنگ اختیار کریں۔ کتابوں کی قیمت بھی بہت مناسب رکھی گئی ہیں۔ مدرس کا قاعدہ نما کی قیمت ۲ر بچوں کا قاعدہ ۴ر نئی کتاب ۲ر آسان قاعدہ ۴ر سب کتابیں مکتبۂ جامعہ دہلی، لاہور، لکھنؤ سے ملتی ہیں۔

دانہ و دام

یہ کتاب پنجاب کے مشہور اور کامیاب افسانہ نگار مسٹر راجندر سنگھ بیدی کے چودہ منتخب اور دلچسپ افسانوں کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے۔ بیدی صاحب ان معدودے چند حضرات میں سے ہیں جنھوں نے نفسیات انسانی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ آپ کا اسلوب بیان دلکش اور زبان بہت صاف اور سلیس ہوتی ہے۔ افسانوں کے پلاٹ میں عموماً "ریلزم Realism" یعنی حقیقت کی پرستاری کا اظہار ہوتا ہے۔ عبارت میں کہیں کہیں حکیمانہ و فلسفیانہ جملے خوبصورت نگینوں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں، اور کہیں کہیں ایسی خوبصورت منظر کشی کرتے ہیں کہ زبان سے بیساختہ واہ واہ نکل جاتی ہے۔ مثلاً اس کتاب کے دسویں افسانہ میں جس کا عنوان ہے "اس منٹ بارش میں" ایک سڑک کی نسبت لکھتے ہیں:-

"ابو بکر روڈ شام کے اندھیرے میں گم ہو رہی ہے، یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی کشادہ سا راستہ ایک کوئلے کی کان میں جا رہا ہے۔"

جہاں تک فن کا تعلق ہے، ان افسانوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ بیدی صاحب منشی پریم چند مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔ کتاب کے شروع میں مسٹر ہنسراج ایڈیٹر لاہور کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔

لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۰۴ صفحات ضخامت قیمت سوا روپیہ۔

ملنے کا پتہ:- مکتبۂ اُردو ۱۵۷ سرکلر روڈ۔ لاہور۔

رفتارِ زمانہ

روس وجرمنی ہٹلر کو روس پر حملہ کئے تقریباً ۳ ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس عرصہ میں دو ہزار میل لمبے محاذ پر جو کچھ کشت وخون ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ طرفین کی افواج دنیا کی بہترین مسلح افواج ہیں۔ روس کا کثیر حصہ جرمنوں کے قبضہ میں آچکا ہے اور طرفین کے نقصان جان ومال کا اندازہ کرتے ہوئے ہم لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔ روسیوں نے جو زمین چھوڑی اُسے پہلے نذرِ آتش کر دیا اور اسی پالیسی پر عملدرآمد جاری رکھا۔ جنگ روس کے دوسرے ماہ تک لڑائی مختلف محاذوں پر شروع ہو گئی یعنی شمال میں لینن گراڈ میں، وسط میں اسمولنسک کے شمال مشرق اور جنوب مشرق میں، یوکرین میں دریائے نیپر (River Dneiper) کے کنارے شمال میں کیف میں اور جنوب میں اڈیسہ میں۔ ماہ گذشتہ کے آخر سے اب تک نازی اور روسی فوجیں ایک دوسرے پر قیامت ڈھا رہی ہیں۔ اڈیسہ کی بندرگاہ کو جرمنی، رومانیہ اور ہنگری کی فوجوں نے گھیر لیا ہے لیکن ابھی تک بہادری سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ لینن گراڈ پر بمباری کا سلسلہ جاری ہے اور جرمنوں کا دعویٰ ہے کہ شہر پر قبضہ کر لینا چند روز کا معاملہ ہے۔ وسطی حصہ میں روسی فوجوں نے نو جرمن ڈویژن تباہ کر کے یلینا پر جو اسمولنسک سے پچاس میل جنوب مشرق پر واقع ہے پھر قبضہ حاصل کر لیا ہے اور مزید پیش قدمی جاری ہے۔ روسیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسمولنسک کے پھاٹک تک پہونچ گئے ہیں۔ یوکرین میں روسی فوجیں جانباز سے مقابلہ کر رہی ہیں مگر تازہ خبریں مظہر ہیں کہ روسی پسپا ہو رہے ہیں۔ کیف پر جرمنوں نے پچاس ڈویژن فوج ڈال کر قبضہ حاصل کر لیا گو کہ جرمنوں کے دس ڈویژن تباہ ہو گئے۔ جرمن فوجیں اب خارکف کی طرف جو ایک انڈسٹریل مرکز ہے بڑھ رہی ہیں دریائے نیپر کو بھی جرمنوں نے کئی جگہ پار کر لیا ہے اور بڑھتے بڑھتے نازی فوجیں ایک سمت خاکنائے پیرکوپ تک پہونچ چکی ہیں اور دوسری طرف وادی دریائے ڈان میں بڑھ رہی ہیں۔ اس کے بعد ہٹلر کاکیشیا کی طرف رُخ کریگا۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بحر اسود پر اقتدار حاصل کر لینا ضروری ہے۔ کریمیا اور بلغاریہ کے بندرگاہوں پر قابو حاصل کر لینے کی کارروائی اسی سلسلہ میں نیا اقدام ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جرمنی دردانیال اور باسفورس پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کریگا بیان کیا جاتا ہے کہ جرمنی نے ٹرکی کو الٹی میٹم دیدیا تھا کہ وہ آبناؤں کا کنٹرول جرمنی کو دیدے لیکن ٹرکی نے انکار کر دیا اب جرمنی بلغاریہ کو ترغیب دے رہا ہے کہ وہ ترکی تھریس پر حملہ کر دے اور وعدہ کیا ہے کہ کل تھریس مع استنبول بلغاریہ کو دیدیا جائیگا۔ تازہ ترین خبر مظہر ہے کہ ہٹلر اس وقت اپنی فوجیں بلغاریہ میں جمع کر رہا ہے، ٹرکی پر حملہ کرنے کے لئے یا روس پر (ہو سکتا ہے دونوں پر) اس نے سمجھ لیا ہے کہ سردیوں تک جنگ ختم نہیں ہو سکتی اس لئے

اس کی کوشش ہے کہ دسمبر سے پہلے پہلے روس پر ایسی ضرب کاری لگائے کہ اگلے سال جنگ کے لئے روس کے پاس کافی سامان جنگ نہ ہو۔ جرمنی اس وقت تک روس کی فوجی طاقت پر بھی بھاری ضرب لگا چکا ہے۔ کیف کے بعد صنعتی یوکرین کا مرکز خارکوف ہے اور سب سے بڑھکر کوہ قاف کا تیل کا علاقہ ہے، شمال میں ماسکو اور لینن گراڈ ہیں۔ ان صنعتی شہروں کے ہاتھ سے نکل جانے سے روس کو بھاری نقصان ہوگا۔ ہٹلر بہر حال چاہے اسے کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے سردیوں سے پہلے پہلے روس کے اقتصادی اور سیاسی مرکزوں پر قبضہ کرلینا چاہتا ہے۔ لینن گراڈ لے لینے کے بعد نازیوں کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ ماسکو پر چڑھائی کردیں۔

ایران ہٹلر مدت مدید سے مشرق وسطیٰ کے خواب دیکھ رہا ہے، کچھ تو وہاں کے تیل کے چشموں کے باعث اور کچھ اس کی اہم پوزیشن کی وجہ سے، جو نہر سویز اور کاکیشیا پر عقب سے عمل کے لئے موزوں ہے اور ہندوستان کی طرف بڑھنے کا بھی وہ بہترین میدان ہے۔ مشرق وسطیٰ میں ہٹلر کا اقدام شام کے ہوائی اڈوں پر قبضہ جما لینے سے شروع ہوا۔ اس کے بعد عراق میں رشید علی سے سازباز کرکے ہٹلر نے بغاوت شروع کرادی مگر برطانوی فوجوں نے آناً فاناً کارروائی کرکے جرمن منصوبے خاک میں ملا دیئے فوراً بعد ہی شام پر بھی برطانوی فوجوں نے فرانسیسی جنرل ڈی گال کی رفاقت میں حملہ کردیا اور اس طرح شام پر بھی برطانیہ کا اقتدار قائم ہوگیا اور بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل سے نازی خطرہ ناپید ہوگیا۔ ہٹلر کے پانچویں کالم کا ایک اور مضبوط اڈا ایران تھا جہاں کا صنعتی نظام جرمن ماہروں کے ہاتھ میں تھا۔ سنہ ۱۹۴۱ء کے موسم سرما میں بے شمار پانچویں کالمی جرمن سیاح بن کر ایران میں داخل ہوگئے۔ جرمنی کے روس پر حملہ کے بعد جرمنوں کا اتنی تعداد میں ایران میں ہونا اور صنعتی نظام پر قابو پائے رہنا خطرناک معلوم ہونے لگا، چنانچہ برطانیہ نے ایران سے اس معاملہ میں شکایت کی، مگر ایران کا جواب ٹال مٹول کا سا تھا اور اس ضمن میں اس کی کارروائی سست اور ڈھیلی سی رہی، چنانچہ برطانیہ نے برفاقت روس ایران پر ۲۵۔ اگست کو حملہ کردیا۔ روسی فوجیں جنوب کی طرف کاکیشیا سے بڑھیں اور برطانوی فوجوں نے ہندوستان سے جنرل سر آرچی بولڈ کے کمان میں خلیج فارس کے ساحل پر اتر کر تیل والے رقبہ کی طرف رخ کیا۔ ایران کی فوج اتنی قلیل تھی کہ معمولی مقابلہ کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔ برطانوی اور روسی فوجیں اہم مقامات پر قبضہ حاصل کرتی چلی گئیں اور پھر صلح کی شرائط منظور کرلیں جو درج ذیل ہیں:۔

(۱) جرمن، اطالوی، اور ہنگری اور رومانیہ کے لیگیشن (Legation) بند کردیئے جائیں اور جرمنوں کو برطانوی اور روسی فوجوں کے حوالے کردیا جائے۔

(۲) چند مخصوص رقبوں سے ایرانی فوجوں کا ہٹا لینا۔

ایرانی عوام جو سولہ برس سے زائد عرصہ سے شاہ ایران کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے اس بیکار خونریزی سے جو خواہ مخواہ شاہ ایران کے جرمنی کی حمایت کی پالیسی سے ہوئی برانگیختہ ہوگئے۔ بالآخر برطانیہ نے شاہ ایران کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے لڑکے ولیعہد کے حق میں سلطنت سے دست بردار ہوجائیں چنانچہ وہ دست بردار ہوچکے ہیں اور اب ایران کا بادشاہ

ان کا لڑکا ولیعہد ہے۔

اطلانتک کے لئے جنگ | جب سے امریکہ نے برطانیہ کو Lease & Lend Act کے رو سے سامان جنگ مہیا کرنے کا ذمہ لے لیا ہے اور سامان جنگ برطانیہ تک پہونچا دینے کی بھی ضمانت کردی ہے اس وقت سے بحر اطلانتک بھی ہٹلر کے لئے سیاسی سازشوں کا مرکز بن گیا ہے۔ اب اگر ہٹلر یہ برداشت کرے کہ امریکہ کے جہاز سامان جنگ برطانیہ لے جائیں تو گویا وہ اپنی موت کے حلفنامہ پر رضامندی کے دستخط ثبت کرتا ہے۔ اور اگر ان جہازوں پر حملہ کرتا ہے تو امریکہ کو جنگ کی دعوت دیتا ہے۔ بہرحال اُس نے مؤخرالذکر رویہ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو پہلی کارروائی اس نے کی وہ امریکہ کے تباہ کن جہاز Greer پر حملہ تھا جو اُس نے آئس لینڈ کے پایہ تخت Reqk Janik. سے دو سو بیس میل جنوب میں کیا۔ تارپیڈو چوک گیا لیکن اس واقعہ کے بعد جرمنی نے امریکہ کے جہاز Steel sea Farer کو بحرۂ قلزم میں غرق کردیا اور Sessa اور Pink Star کو جب وہ آئس لینڈ جا رہے تھے ڈبو دیا۔ امریکہ نے بھی اپنے جہازوں کو ہدایت کردی ہے کہ وہ امریکہ اور آئس لینڈ کے درمیان نازی آبدوز کشتیوں کو جو انھیں ملیں تباہ کردیں امریکہ کے اس رویہ سے برطانیہ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی ہے۔ اس موسم سرما کے آغاز سے لیکر جون ۱۹۴۲ء تک امریکہ کی طرف سے انگلستان کو دو کروڑ بیس لاکھ ٹن دودھ، آٹھ ہزار ٹن گوشت اور پچاس کروڑ انڈے بھیجے جائیں گے۔ تمام ممالک نے اتحادی کونسل کے دوسرے اجلاس میں اطلانتک چارٹر کی تائید کردی۔ چیکوسلواکیہ کے نمائندہ نے یہ کہا ہے کہ چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کی یہ خواہش ہے کہ کوئی ایسا بندوبست کرنا چاہیئے کہ جرمنی کی طرف سے تیسری جنگ کا آغاز نہ ہوسکے۔ اور ایسے ذرائع استعمال کرنا چاہیئے کہ جرمنی کی آئندہ تباہ کاریوں کا سدّباب ہو جائے۔

مشرق بعید | جب سے جاپان نے جنوبی انڈوچائنا پر قبضہ جمالیا ہے اس وقت سے جاپانی پریس یہ کہہ رہا ہے کہ برطانیہ کے منصوبے تھائی لینڈ پر ہیں۔ مگر کوئی کامیابی اس سلسلہ میں نہ ہوسکی، کیونکہ ان معاملات میں اس کا خفیہ رفیق ایسا ماہر نہیں تھا۔ لیکن تھائی لینڈ نے فوراً اس اتہام کی تردید کردی جو برطانیہ پر لگایا جاتا تھا۔ برطانیہ اور امریکہ نے بھی واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ جاپان کی نقل وحرکت جنوب کی طرف گوارا نہ کریں گے بشرطیکہ ایسا عمل ان کی رضامندی حاصل کرکے کیا جائے۔ چنانچہ برطانیہ نے پوری احتیاط برتی اور سنگاپور کے بحری اڈے کو خوب مضبوط کرلیا۔ جاپان نے پھر مُنہ کی کھائی کیونکہ امریکہ نے اس کے اعتراض پر کہ وہ روس کو سامان جنگ ولاڈی واسٹک کے راستے سے نہ بھیجے دندان شکن جواب دیا کہ وہ بحری آزادی کے اُصول کے خلاف کوئی اعتراض نہیں سُن سکتا۔ جاپان کے سفیر نے ایڈمیرل نونورا نے پریسیڈنٹ روزویلٹ کے نام پیغام دیا اس کا مضمون کیا تھا شائع نہیں ہوا مگر یہ پتہ چلا کہ جاپان نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ پرامن طریق پر گفت و شنید ہوجائے اور بحرالکاہل کے معاملہ کو سلجھا لیا جائے۔ جاپان کی شرط صرف یہ تھی کہ وہ چین کے معاملہ میں کوئی مداخلت پسند نہیں کرسکتا۔ شروع میں تو جاپانی پریس بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا تھا کہ اگر گفت وشنید کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو جاپان

فوری عمل پر مجبور ہوجائے گا۔ اور برطانیہ، امریکہ، چین اور ڈچ ایسٹ انڈیز سے جھگڑا ہو جائے گا۔ مگر ان ہٹلرانہ دھمکیوں کا امریکہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب تک جو خبریں واشنگٹن سے آ رہی ہیں وہ اس بات کی پُرزور تردید کر رہی ہیں کہ مشرق بعید میں میونخ والی داستان نہ دُہرائی جائے گی جس سے چین کو ذبح ہو جانے دیا جائے۔ امریکہ اس بات پر اڑا رہے گا کہ وہ چین اور روس کو سامان جنگ مہیا کرتا رہے اور بحری آزادی کو قائم رکھے۔ کامیابی کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ جاپان اپنے دل کی صفائی کے ثبوت میں پہلے اپنے تعلقات جرمنی سے منقطع کرلے مشرق بعید میں حالت بہت نازک ہے، معلوم نہیں کب جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھیں۔

ہندوستان

کچھ عرصہ سے ہندوستان کی سیاسیات میں جمود سا پیدا ہو گیا ہے، خصوصاً جب سے کانگریس پُرامن ستیہ گرہ پر عملدرآمد کی پالیسی پر قانع ہوگئی ہے۔ اس حالتِ جمود میں تھوڑی لہر اس وقت پیدا ہوئی جب وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں توسیع اور نیشنل ڈیفنس کونسل کے قائم کئے جانے کی بابت اعلان کیا گیا۔ توسیع کونسل گیارہ ممبروں پر مشتمل ہے جس میں آٹھ ہندوستانی ہیں۔ فائیننس، کمیونیکیشن اور ہوم تینوں پورٹ فولیو آئی۔سی۔ ایس افسران کے پاس بدستور سابق ہیں، بقیہ پورٹ فولیو ہندوستانی ممبران میں تقسیم کئے گئے ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) اطلاعات:۔ سر اکبر حیدری، (۲) قانون:۔ سر سلطان احمد، (۳) سمندر پار ہندوستانی: مسٹر ایم۔ ایس انے (۴) سول ڈیفنس:۔ ڈاکٹر ای۔ راگھویندر راؤ، (۵) سپلائی:۔ سر ہومی مودی، (۶) تعلیم:۔ مسٹر نلنی رنجن سرکار (۷) لیبر:۔ سر فیروز خاں نون، (۸) کامرس:۔ سر راما سوامی مدلیر۔

ڈیفنس کونسل میں بائیس ممبر برٹش انڈیا سے اور سات نمایندے ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے ہونگے یہ سات نمایندے راجاؤں مہاراجاؤں میں سے ہوں گے۔ اس نئی اسکیم کے ساتھ مسلم لیگ کے چند ممبروں نے تعاون کیا ہے۔ سر سلطان احمد نے بحیثیت ممبر قانون پنجاب، بنگال اور آسام کے وزراء اعظم، نواب چھتاری اور بیگم شاہنواز نے بحیثیت ممبران ڈیفنس کونسل۔ اس کارروائی نے مسٹر جناح کو برانگیختہ کردیا اور اُنھوں نے وائسرائے کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا کہ اُنھوں نے بلا توسط مسلم لیگ کی کمیٹی کارکن کے مسلم لیگ کے ممبران کو کیوں اِن کونسلوں میں شریک کرلیا۔ مسلم لیگ کی کمیٹی کارکن کا جلسہ ہوا جس میں مندرجہ بالا اصحاب پر عتاب ظاہر کیا گیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے ایک بیان شائع کیا جس میں یہ واضح کیا گیا کہ سر سکندر حیات خاں، مسٹر فضل الحق وغیرہ بحیثیت وزیر اعظم شریک کئے گئے ہیں۔ تینوں وزراء اعظم نے اس کارروائی سے یہ محسوس کیا کہ اب اُن کی پوزیشن محفوظ ہوگئی مگر مسٹر جناح نے وائسرائے کا ایک خط پیش کر کے اس اعلان کی تردید کردی۔ اس خط کا انھوں نے یہی مطلب نکالا

کہ تینوں وزرائے اعظم کو مسلمانوں کے نمایندوں کی حیثیت سے شریک کیا گیا ہے۔ مسٹر جناح کی اس دلیل سے سرسکندر حیات خاں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور اُنھوں نے اپنے کو مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ کے رحم وکرم کے حوالے کر دیا۔ تینوں اصحاب کو تین دن کا موقع دیا گیا تاکہ وہ بعد عوز ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ وزیر اعظم پنجاب اور وزیر اعظم آسام نے تو استعفےٰ دیدیا۔ نواب چھتاری مسلم لیگ کی کمیٹی عاملہ اور ڈیفنس کونسل دونوں سے مستعفی ہو گئے۔ مگر مسٹر فضل الحق نے پورے دس دن کے غور و تامل کے بعد ڈیفنس کونسل سے نیز مسلم لیگ سے استعفےٰ دیدیا۔ اور اعلان کر دیا کہ انھیں مسلم لیگ سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ جس نے صوبجاتی لیڈروں کے ساتھ ذرا بھی اخلاق نہ برتا۔ بنگال میں مسلم لیگ میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ کچھ لوگ مسٹر فضل الحق کے حق میں ہیں کچھ مسٹر جناح کے، طرفین میں خوب تُو تُو مَیں مَیں ہو رہی ہے۔ سر سلطان احمد اور بیگم شاہنواز نے ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہو جانے سے انکار کر دیا۔ سر سلطان احمد نے تو یہ کہا کہ وہ کونسل کے موسع حصہ میں شریک نہیں ہوئے بلکہ اس کے سابق وغیر موسع حصہ میں ہیں۔ بیگم شاہنواز نے یہ دلیل پیش کی کہ وہ مسلم لیگ کی نمایندگی نہیں کر رہی ہیں بلکہ کل نسوانی ہندوستان کی نمایندہ ہیں۔ دونوں کو پانچ سال کے لئے مسلم لیگ سے نکال دیا گیا ہے۔

مسٹر چرچل کے اس بیان سے جو اُنھوں نے دارالعوام میں اطلانٹک چارٹر کے متعلق ہندوستان کے سلسلہ میں دیدیا ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ ممدوح نے کہا کہ اس کا تعلق صرف یوروپین مملکتوں سے ہے جو کہ اس وقت نازیوں کے زیر حکومت ہیں۔ ہندوستان کے متعلق یہ کہا کہ ہندوستان نیز وہ ممالک جو برطانیہ کے زیر اطاعت ہیں ان پر ان فرمانوں کا اطلاق ہوگا جو وقتاً فوقتاً اُن ممالک کیلئے عائد ہوتے رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ جب نظام عالم دم توڑ رہا ہے اس وقت بھی تنگ نظری بدستور قائم ہے۔ مدہوش

ذاتیات | پچھلے پرچہ میں ایڈیٹر صاحب کی علالت کا مختصراً ذکر ہو چکا ہے۔ افسوس ہے کہ اس میں راقم کی ناواقفیت سے چند جزوی غلطیاں ہو گئی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کو آنکھ کی جو شکایت ہو گئی تھی اس میں درد وغیرہ مطلق نہیں ہوتا تھا اسی وجہ سے دو ماہ تک اس کی اصلیت سے بے خبری رہی۔ میڈیکل کالج لکھنؤ میں تشخیص مرض ہونے کے بعد کلکتہ اور بمبئی کے نامور ماہران چشم سے مشورہ کیا گیا۔ دونوں جگہ آپریشن کی رائے دی گئی (کلکتہ میں امید افزا جواب نہ ہونے کے متعلق پچھلے نوٹ کی اطلاع بھی راقم کی غلط فہمی پر مبنی تھی) بہرحال بمبئی میں آپریشن کرانا طے ہوا اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ۱۲ اگست کو آپریشن ہوا اور ۲۰ اگست کو پٹی کھولی گئی۔ پانچ ہفتے مزید قیام کے بعد اب ایڈیٹر صاحب بمبئی سے واپس آ گئے ہیں مگر ابھی دو ڈیڑھ مہینے تک کامل آرام اور سخت احتیاط کی ہدایت ہے۔ اس اثنا میں ہم لوگ جس صورت سے ممکن ہوگا رسالہ کے کام کو چلائیں گے امید ہے کہ اس کے بعد خود ایڈیٹر صاحب اپنا پورا کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ (بھوشن)

THE ZAMANA, OCTOBER 1941

زمانہ

مرتبہ:- دیانرائن نگم بی۔ اے

جلد ۷۷	اکتوبر ۱۹۴۱ء	نمبر ۴

فہرست

پرتاپ پریس کانپور سے شائع ہوا

زمانہ

جلد ۷۷ اکتوبر ۱۹۴۱ء نمبر ۴

اقبال اور غزل[1]

(از قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی)

اقبال کی شاعری کے متعلق یوں تو انفرادی اور مجموعی حیثیت سے اردو اور انگریزی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اُن کی غزل سرائی پر مستقل اظہار خیال نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اس مضمون میں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ غزل میں ان کا کیا رنگ تھا، اور یہ کہ وہ اس صنفِ سخن میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔

اقبال کے زمانۂ شعرگوئی کے اعتبار سے اُن کی شاعری کے تین دور قائم کئے گئے ہیں، جن میں سے ہر دور ترقیِ سخن کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ لیکن ان تینوں دوروں کے علاوہ میرے نزدیک بحیثیت شاعر اقبال کی تین حیثیتیں ہیں:-

۱۔ شاعر محض کی حیثیت،

۲۔ اسلامی اور قومی شاعر کی حیثیت،

۳۔ دنیا کے ایک شاعر اعظم کی حیثیت،

ان تینوں حیثیتوں کو ان کی شاعری کے ادوار ثلاثہ کے ساتھ جو نسبت معنوی ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اقبال ایک شاعر محض ہی نہیں بلکہ ہندوستان اور عالم اسلام کو چھوڑ کر تمام دنیا کے ایک شاعر اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کا ایک منفرد دوست اور نقاد سخن اس کو اس طرح خراج تحسین

[1] یہ مضمون یوم اقبال کے جلسہ میں صدارتی تقریر کی حیثیت سے پڑھا گیا۔

پیش کرتا ہے :

"اگر تخت [illegible] شعراء ان کے لئے باعثِ فخر ہے، اگر کوہ نور برطانوی تاج کے لئے موجب شان و شوکت ہے تو یقیناً اقبال دنیا کے ہر کسی ملک کے دربار شاعری کی زیب و زینت ہے۔"

اقبال کی شاعری بحیثیت مجموعی ایک عالمگیر شاعری ہے جو دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم کو متاثر کر سکتی ہے، لیکن انفرادی حیثیت سے عام شعراء کی طرح اقبال نے بھی اپنی شاعری غزل سے شروع کی۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے ان کو شعر گوئی کا شوق ہو گیا تھا جو زیادہ تر غزل کے دائرہ تک محدود رہا۔ ۱۹۰۰ء میں وہ پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں دیکھے گئے، جہاں ان کے چند ہم جماعت طلبہ اُن کو کھینچ لے گئے تھے، وہاں اُنھوں نے اپنی ایک غزل بھی پڑھی جو اپنی سادگی، بیساختگی اور شوخی کے لحاظ سے بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد سے وہ متعدد بار مشاعروں میں شریک ہوتے اور غزلیں پڑھتے رہے۔ لاہور کے ایک مشاعرہ میں اُنھوں نے اپنی ایک غزل پڑھی۔ اتفاق سے وہاں دلّی کے ایک مشہور شاعر مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی بھی موجود تھے، اُنھوں نے اقبال کے اس شعر کی بہت تعریف کی اور داد دی :-

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اقبال نے ابتدا مشق سخن میں خوش نصیبی سے استاد بھی ایسا پایا جو اردو شعراء میں بلحاظ غزل گوئی بڑی شہرت اور قبولیت رکھتا تھا۔ داغ مرحوم کے رنگ تغزل نے نوجوان اقبال کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اُنھوں نے غائبانہ تلمذ اختیار کر کے بذریعہ خط و کتابت اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ اُستاد نے بھی ہونہار شاگرد کی روانی طبیعت دیکھکر ہمت افزائی کی اور یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ جہاں اقبال کو ایسے نامور اُستاد کا شاگرد ہونے پر فخر تھا وہاں خود داغ مرحوم کو بھی اقبال ایسے طباع اور ذہین شاگرد پر ناز تھا، اور وہ اس پر فخر کرتے تھے۔

داغ کی شاگردی پر فخر کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں :-

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں　　مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں پر

داغ کی وفات پر اقبال نے ایک پُر درد مرثیہ لکھا ہے اور غزل گوئی میں داغ کی مہارتِ فن کا اس طرح اعتراف کیا ہے :-

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی　　سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

اُٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بت خانے سے　　مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت　　ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہوبہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟　　اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون!

ابتدا میں اُن کے کلام میں داغ کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ اشعار ذیل اس رنگ کا بہترین نمونہ ہیں:-

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی　　　مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا　　　خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

تأمّل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد　　　مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا　　　فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

داغ کی شوخی اور بے ساختگی بھی اقبال کی غزل میں پائی جاتی ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:-

امیدِ حُور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو　　　یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب　　　عداوت ہے اسے سارے جہاں سے

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں　　　لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی　　　کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو　　　کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا　　　وہی لن ترانی سُنا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی　　　بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر　　　کیا خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا

میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی　　　کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا

لیکن داغ کا یہ رنگ بہت دیر پا نہ رہا، صرف "تنگنائے غزل" کو اس اُبھرنے والے فلسفی شاعر نے اپنی فکر کی جولانگاہ بنانا پسند نہ کیا کیونکہ وہاں سوائے پیش پا اُفتادہ مضامین کی تکرار کے اور کیا رکھا تھا، جس سے ہمارے فلسفی شاعر کے دل کی پیاس بجھتی، اور اُس کی وسیع فکر و تخیل کے لئے کوئی نیا میدان ہاتھ آتا آخر کار غالب کے کلام کی کشش ان پر غالب آئی، اور غالب کا رنگِ سخن ان کی شاعری پر ایسا چڑھا کہ ان کی شاعرانہ زبان تمام تر غالب کی زبان قرار پا گئی۔ غزل ہو یا نظم، قطعہ ہو یا مسدس ان کے ہر کلام میں صوری اور معنوی اعتبار سے غالب کا رنگ اس قدر رچ گیا کہ اگر اظہارِ خیال کے چند جدید طریقوں اور خاص ترکیبوں سے قطع نظر کی جائے تو اقبال اور غالب کے کلام میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثال میں ہم اُن کے چند اشعار نقل کرتے ہیں:-

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

عذرِ آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھکو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

سکونِ دل سے سامانِ کشود کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے

چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
رہی بجلی کی بیتابی سو میرے آشیاں تک ہے

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

سعئ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزان ہے شمارِ سحر و شام ابھی

ابرِ نیساں یہ تنک بخشئ شبنم کب تک
میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

رفعتِ تخئیل، متانت و سنجیدگی، اور فلسفیانہ نکتہ سنجی کے لحاظ سے ان کا کلام غالب کے کلام سے ٹکر کھاتا ہے، فلسفہ اور تصوف کی چاشنی کے ساتھ وارداتِ قلبیہ اور جذباتِ عشقیہ کا اظہار اور وہ مخصوص طرزِ بیان اور اندازِ سخن جو غالب کے کلام کا امتیازی وصف ہے، اقبال کے کلام میں بکثرت موجود ہے، اور اس لحاظ سے جدید اردو شاعری کے مصنف کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ "اگر یہ مشقِ سخن جاری رہتی تو اُردو میں ایک دوسرا غالب پیدا ہو جاتا۔"

غزل گوئی نے اقبال کی شاعری کو فائدہ پہونچایا ہو یا نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اس صنفِ سخن پر قدرت حاصل کر کے اُنھوں نے غزل کی زبان کو اپنی مابعد کی شاعری کی زبان بنا دی۔ فارسی کے نامور شاعر نظامی گنجوی نے اپنی مثنویات میں اپنے زورِ تغزل کو وقف کر دیا اور غزل گوئی کے لئے کچھ باقی نہ رکھا۔ اسی طرح اقبال نے بھی اپنا سرمایۂ تغزل اپنی نظموں میں کھپا دیا۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اُنھوں نے غزل میں اپنا خاص انداز قائم رکھا ہے۔

اقبال کی ابتدائی غزلوں میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی، مگر مابعد کے کلام میں رفعتِ تخئیل، حسنِ بیان اور غلوِ جذبات کے ساتھ نشستِ الفاظ و چستئ بندش کے ساتھ ایک طرح کی پختگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے رسمی طور پر غزلیں بہت کم کہی ہیں جن کی تعداد ۲۷ سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اگر ضربِ کلیم کے وہ اشعار جن پر غزل کا عنوان پڑا ہوا ہے غزلیات کے تحت میں شمار کر لئے جائیں، نیز بالِ جبریل میں پہلے ایک سے سولہ نمبر اور

پھر ایک سے اکسٹھ نمبر تک جو اشعار مختلف ردیف و قوافی میں اقبال کے تخلص کے ساتھ یا بغیر تخلص کے چھپے ہیں، ان پر بھی غزل کا اطلاق کیا جائے تو یہ تعداد بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اگر نزاکت خیال اور حسن بیان لطافتِ جذبات کے ساتھ رنگین نوائی اور شیوا بیانی، تغزل کے ترکیبی عناصر ہیں تو یقیناً اقبال کی ہر نظم ایک غزل کا حکم رکھتی ہے۔ غزل کا پیرایہ تو پھر بھی محدود ہے، لیکن ان کی طویل نظموں میں اکثر و بیشتر شعر ایسے ہیں جو بجائے خود ایک مکمل غزل کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

اقبال کی غزل میں زبان و تخیل کے لحاظ سے داغ اور غالب کا رنگ نمودار ہے۔ لیکن خود اقبال نے بعض خصوصیتیں اپنے کلام میں ایسی پیدا کرلی ہیں جو ان دونوں کے ہاں نہیں یا بہت کم ہیں، مثلاً ایجاز و اختصار، حسن تشبیہ و استعارہ، تمثیلات و تلمیحات، خاص اسلوب بیان اور جدید طریقۂ اظہار خیال، بہترین اور حسین ترین الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال، یہ تمام خصوصیات ان کے کلام کا مجموعی حیثیت سے مطالعہ کرنے سے بخوبی معلوم ہونگے۔ ہم یہاں ان کے خاص رنگِ تغزل میں جو اشعار ہیں ان کو بطور نمونہ نقل کرتے ہیں:-

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ — ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ — دم دے نہ جائے ہستیِ ناپائدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں — تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے — پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا
حسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب — وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیونکر ہوا

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن — دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست — محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

میکش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں — ہوائے گل فراقِ ساقیِ نامہرباں تک ہے
چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل — یہاں کی زندگی پابندیِ رسمِ فغاں تک ہے

مقامِ عشق میں دل بھی یہ ساز ہے ایسا — جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے ناز کرے
تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل — جہاں میں وا نہ کوئی چشمِ امتیاز کرے

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
شوخی سی ہے سوالِ مکرّر میں اے کلیم — شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

یہ سرود قمری و بلبل فریبِ گوش ہے — باطنِ ہنگامہ آبادِ چمن خاموش ہے
دہر کے غم خانہ میں تیرا پتہ ملتا نہیں — جرم تھا کیا آفرینش بھی کہ تو روپوش ہے

طرب آشنائے خروش ہو تو نوائے محرم گوش ہو — وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں — نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

آخر میں اقبال کی غزلیہ شاعری کے سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غزل میں اس کی معنوی حیثیت کو بالکل بدل دیا ہے، یا یا لفاظ شاعرانہ مجاز کو حقیقت سے آشنا کر دیا ہے۔ لیکن اخیر میں جاکر یہ قیود اور بندشیں بھی اٹھا دی گئی ہیں۔ چنانچہ اُن کی آخری دور کے تغزل میں انھوں نے غزل کی صوری اور معنوی حیثیت کو خیرباد کہہ دیا ہے یعنی ایک طرف تو انھوں نے غزل میں سے ردیف اُڑا دی اور صرف قافیہ ہی رہنے دیا۔ اور دوسری طرف غزل کے مضامین کو اپنے پیغام اور واردات قلبیہ تک محدود کر دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی زبان بھی اپنی خاص زبان بنا دی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ میدان تغزل بہت وسیع ہے بشرطیکہ کہنے والے کا کوئی خاص مقصد اور کوئی خاص پیغام ہو۔ ہمارے اس نظریہ پر ان کی آخری غزلیں شاہد ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ — کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے — نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ
ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے — مری خاک پے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ

تیری متاعِ حیات علم و ہنر کا سُرور — میری متاعِ حیات ایک دلِ ناصبور
ایک زمانے سے ہے چاکِ گریباں مرا — تو ہے ابھی ہوش میں! میرے جنوں کا قصور
فیضِ نظر کے لئے ضبطِ سخن چاہیئے — حرفِ پریشاں نہ کہہ اہلِ نظر کے حضور

ملے گا منزلِ مقصود کا اُسی کو سُراغ — اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ
وہ بزمِ عیش ہے مہمان یک نفس دو نفس — چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ

دریا میں موتی اے موجِ بے باک — ساحل کی سوغات خار و خس و خاشاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں — مستی ہے جس کی بے منتِ تاک

"ٹیگور"

(از جناب شاہد صدیقی)

وہ بوڑھا فلسفی جس میں جوانی کی اُمنگیں تھیں
اَدب کا ولولہ تھا، زندگانی کی ترنگیں تھیں

وہ شاعر جس کے میٹھے بول تھے پیغامِ آزادی
نہ چھوٹی عمر بھر ہاتھوں سے جس کے جامِ آزادی

وہ میکش جو سدا میخانۂ فطرت کی پیتا تھا
گلوں کے ساتھ ہنستا تھا گلوں کے ساتھ جیتا تھا

وہ ساقی جس کی نظروں سے مئے عرفاں برستی تھی
وہ جس کے سامنے کوئی بلندی تھی نہ پستی تھی

وہ رہرو جس نے دنیائے ادب کی رہنمائی کی
جہانِ شعر پر جس کے تخیل نے خدائی کی

وہ رہبر جس نے دھندلے راستوں کو روشنی بخشی
نظر کو دل بنایا، دل کو روحِ زندگی بخشی

وہ اِک ملّاح، جو طوفان میں بھی مسکراتا تھا
مسلسل آندھیوں کے ساز پر نغمے سناتا تھا

وہ دیوانہ، سکھائے جس نے آدابِ خردمندی
اُٹھا ڈالا حجابِ روئے غمگینی و خورسندی

وہ فرزانہ، جسے دیوانگی سے آشنا کہیئے
سیاست کے اندھیروں میں خرد کا رہنما کہیئے

وہ فطرت کا پجاری جس نے تاروں کی زباں سمجھی
صباح و شام کے رنگیں نظاروں کی زباں سمجھی

وہ مالی جس نے اپنے باغ کا طرزِ کہن بدلا
شگوفوں کی ادا بدلی، ہواؤں کا چلن بدلا

وہ غواصِ معانی، جس نے سمجھایا کہ دل کیا ہے
سرورِ جاوداں کیا شے ہے، سوزِ مستقل کیا ہے

وہ دورِ حال و ماضی کی حقیقت جاننے والا
اس آئینے میں مستقبل کا رُخ پہچاننے والا

وہ اِک سچا پرستارِ وطن، سرشارِ آزادی
غلامی کی ہواؤں میں علمبردارِ آزادی

وہ نبّاضِ حقیقت، قوم کا دل دیکھنے والا
سوادِ راہ میں آثارِ منزل دیکھنے والا

وہ افسانہ طرازِ روح وہ فطرت کا شیدائی
وہ تبدیلی کا جویا وہ تغیر کا تمنائی

ابھی اس کی رسیلی راگنی کا دَور جاری ہے
وطن کی محفلوں میں سرخوشی کا دور جاری ہے

ابھی مہکے ہوئے ہیں پھول اس کی فکرِ رنگیں کے
چمن والوں کی بیتابی میں ہیں سامان تسکیں کے

ابھی اس کے تخیل کی لطافت کارفرما ہے
کہ باطل کی نگہ روحِ صداقت کارفرما ہے

ابھی اس کی شرابِ نو چھلکتی ہے پیالوں میں
اسی کی یاد اسی کا تذکرہ ہے پینے والوں میں

دلوں پر ثبت ہیں اس کے نقوشِ زندگی اب بھی
زمانہ اس سے لے سکتا ہے درسِ آگہی اب بھی

یقینِ مرگ کوئی اس کی نسبت کر نہیں سکتا
وہ ہم سے دُور ہو سکتا ہے لیکن مر نہیں سکتا

ماہِ نیم ماہ

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔ اے)

فلک پہ شمع ہے روشن کہ ہے یہ ماہِ تمام
شراب حُسن کا ہے یا کوئی بلوریں جام

عقیق وارِ یمِ نیل کی روانی میں
نگیں کوئی ہے یہ ضو پاش بندپانی میں

یہ جان ڈال کے خمیازۂ جوانی میں
حسین کوئی ہے ملبوسِ آسمانی میں

تجلیوں کا ملمع کیا ہوا جھومر
جھلک رہا ہے کسی خوبرو کے ماتھے پر

پے وصال یہ عالم ہے ماہ پاروں کا
بچھا دیا ہے سرِ عرش جال تاروں کا

نہاں ہیں لاکھ ستارے فلک کی چادر میں
شرارِ عشق ہوں مستور جیسے پتھر میں

کوئی چراغِ بکف کارواں ہے گرمِ سفر
اسی کی سمت ستاروں کی اُٹھ رہی ہے نظر

چلا جو چاند اُدھر چاندنی ادھر آئی
ملائی آنکھ تو شبنم کی آنکھ بھر آئی

حدِ کمالِ ثریا زوال پرور ہے
لرز لرز کے زمیں پر جمال گستر ہے

چمن کے رنگ کا ملتا ہے کچھ پتا اس سے
گزر رہی ہے نسیم سحر پہ کیا اس سے

بہت سنبھال کے رکھتی ہے گو قدم لیکن
رُکا ہوا ہے لبوں پہ ہزار دم لیکن

نقوشِ حُسن کو پھر بھی مٹائے جاتی ہے
بساطِ عشق کی شمعیں بجھائے جاتی ہے

مگر یہ رنگ بھی کچھ رنگِ استوار نہیں
تغیرات کو اِک حال میں قرار نہیں

نمودِ حُسن اِک اعجازِ آب و دانہ ہے
ہوائے شوق پہ مبنی یہ کارخانہ ہے

اِن مجازی اشارات سے علاحدہ نہیں رہ سکی ہیں۔ اُن کی شعری دنیا کی زینت میں بھی یہی چیزیں کام آتی رہی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ حکومت کے جو نظریئے قائم ہو چکے ہیں اُن سے اِن قوموں کو براہ راست کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ شہنشاہانہ، جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ یا پھر جمہوری و اشتراکی نظامات سے (ان الفاظ کے موجودہ اصطلاحی مفاہیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے) متاثر نہیں تھیں، اور نہ ہو سکتی تھیں کیونکہ "ریاست" کا عملی تخیل ارتقا کی یہ منزلیں طے نہیں کر سکا تھا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اقوام و ملل قطعی طور سے ایک ایسے اصطلاحاً غیر معین ریاستی نظام کے ماتحت زندگی بسر کر رہی تھیں جو نہ سرمایہ دارانہ تھا اور نہ جاگیردارانہ۔ میری مراد عرب قوم سے ہے، زمانۂ جاہلیت میں اُس کی یہی حالت تھی، اس قوم کا ہر فرد خاص قسم کی مساوات اور آزادی کا علمبردار تھا۔ کسی بادشاہ کی غلامی سے اُسے کوئی واسطہ نہیں تھا، اپنے طور طریقوں میں وہ بڑی حد تک آزاد تھی۔ خیالات کے اظہار میں اُس کی آزادی تو حیرت انگیز تھی، عریاں ترین حقیقتوں کے ظاہر کرنے میں اُسے کبھی ذرا سا پس و پیش نہیں ہوتا تھا۔ بیہودہ کی باتیں بھی وہ اشعار میں بے تکلفی کے ساتھ نظم کر دیتی تھی۔ ایسی حالت میں اُسے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے ان علامات و اشارات کی آڑ لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اصل یہ ہے کہ وہ اِن مجازی اسالیب بیان کو مفاہیم کے ادا کرنے اور اُن کے عام ذہنوں میں جما دینے کا کامیاب ذریعہ سمجھتی تھی، اسی لئے موقع موقع سے وہ اس سے کام لیتے تھے۔ اِن مجازی اشارات (symbols) کے متعلق اب تک کا جو کچھ تجربہ ہے اُسے دیکھتے ہوئے یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ آئندہ بھی ادب و شعر کے چمن میں یہ مجازی اشارے سبزۂ بیگانہ کے بجائے پھول ہی رہیں گے۔ اِن مجازی اشارات کی پیدائش کو کسی نظامِ حکومت سے وابستگی نہیں ہے۔ اُن کی پیدائش قریب قریب اُسی طریقہ سے ہوئی ہے جیسے ہر زبان میں حروفِ جارّہ و حروف عاطفہ و افعال و اسما کی پیدائش ہوئی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ یہ مجازی اشارے اپنی جذباتی حیثیت میں گھس پس کر پرانے ہو جاتے ہیں اور اُن میں ندرت نہیں رہتی۔ اُس وقت میں ایک کامیاب ادیب، ایک باکمال شاعر کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ نئے نئے اشارے جن میں ندرت ہو تازگی ہو استعمال کرے لیکن یہ تغیرات شخصی ہوتے ہیں نوعی نہیں ہوتے۔ یہ شخصی تغیرات ماحول یا سماج، تہذیب اور جغرافیائی حالات کے تغیر سے ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن انھیں نوعی تغیرات کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو مانا جا سکتا ہے کہ مخصوص قسم کی تشبیہیں مخصوص قسم کے استعارے مخصوص جماعتی حالات میں پیدا ہوں لیکن مطلقاً تشبیہ و استعارہ وغیرہ کو

وہ زبان اُردو ہی میں سہی جاگیردارانہ یا شہنشاہانہ نظام کا ممنون بتانا ان اسالیب بیان کی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

سطور بالا میں اسے واضح کیا جا چکا ہے کہ شعر ذاتی حیثیت سے کسی سیاسی نظریہ کے حصار میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں اتنا اضافہ اور ضروری ہے کہ شعر کو کسی مخصوص سیاسی نظریہ کی غلامی کی حیثیت سے اچھا یا بُرا سمجھنا رجعت پسندی ہی کی ایک شکل ہے

اب سے کچھ عرصہ پہلے سرسید نے مسلمانوں میں "اسلامی قومیت" کا افرنجی تخیلات سے دبکر جو نیا شعور پیدا کیا تھا اُس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا تھا کہ اس شعور میں امتیازی خصوصیتیں باقی نہیں رہ گئی تھیں اور وہ اُن چیزوں کو بھی اپنی زد میں لے لینا چاہتا تھا جو اُس کے حلقۂ اثر میں جائز طور سے نہیں آتی تھیں۔ "مسدس حالی" کی پڑھے لکھے مسلمانوں میں عام پسندیدگی اُسی شعور کی بے شعوری کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ مسدس حالی میں چونکہ مسلمانوں کے گذشتہ شاندار عروج کی داستانیں مزہ لے لے کر بیان کی گئی تھیں اور اس کا مقابلہ اُن کے موجودہ دور کی زبوں حالی سے کیا گیا تھا گویا اس عنوان سے اُنھیں پھر اپنے شاندار ماضی کی طرف غور کرنے کی دعوت دی گئی تھی، اور یہ چیز مسلمانوں کے اُس قومی مزاج کے بالکل موافق تھی جو سرسید نے پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے اس کا بلا لحاظ کئے ہوئے کہ نفس شاعری کی حیثیت سے وہ کس درجہ کی چیز ہے۔ فن کارانہ صناعی نے مولانا حالی کی اس "منظوم قومی داستان" میں شعریت کا رنگ کہاں تک بھرا ہے اُسے عام طور سے پسند کیا گیا۔

"شعری شعور" کی یہ بے شعوری مخصوص حالات میں ذرا بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔ کسی چیز میں شغف جب اعتدال سے متجاوز ہو جاتا ہے تو یہ بدمذاقیاں پیدا ہی ہو جاتی ہیں۔ کیا یہ برابر نہیں دیکھا جاتا کہ وہ لوگ جن میں مذہبیت "یبوست خیز تقشف" کی حد تک پہونچ چکی ہے اور جو تسبیح کے دانوں ہی پر دنیا کا سارا حساب کتاب چکانا چاہتے ہیں صرف اُسی شاعری کو پسند کرتے ہیں جس میں اس قسم کے اشعار ہوں:۔

نماز ایک جس شخص نے ترک کی — تو خوں اُس نے اپنا کیا بے چھری
اگر دو نمازوں کا تارک ہوا — تو گویا کہ خوں اِک نبی کا کیا
ہوئی تین وقتوں کی جس سے قضا — تو کعبہ کو اُس شخص نے ڈھا دیا

اِس قسم کی شاعری کو پسند کرنے والوں کے اُن جذبات کا احترام کرنے کے باوجود جو

شعر کے متعلق اس بے شعوری کا باعث بنے ہیں، ان اشعار کو فن شعر کا کوئی خاص کارنامہ قرار نہیں دیا جا سکتا یہی حالت وکیفیت اُن اشتراکیوں کی پسندیدگی کی ہے جو شاعری کو مارکسی فلسفہ کا غلام بنا دینا چاہتے ہیں " مارکسی نظام اشتراکیت" سے غیر معمولی شغف نے اُن میں یہ "شعری بے شعوری" پیدا کر دی ہے اور وہ "ہر مرض کی دوا ہے مارکسزم" کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ اشتراکی ادیب شاید اس تشبیہی مناسبت کو اپنے لئے پسند نہ کریں لیکن منطقی اسلوب نظر سے ہیں ان دونوں جماعتوں میں مشابہت تام دکھائی دیتی ہے۔ وہی پُرپیچ دلائل جو شاعری کو مارکسی فلسفہ کا حلقہ بگوش بنانے کے لئے تراشے جاتے ہیں شاعری کو مخصوص مذہبی نظریوں اور مختلف قومی تخیلات کا پابند بنا دینے کے وجوب کے لئے بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ مارکسی فلسفہ کے حلقہ بگوشوں کے نزدیک زندگی کی حقیقتیں کچھ اور ہیں۔ اُن کا مشاہدہ اُنھیں دوسرے نتائج تک لے جاتا ہے اور ان نتائج سے جو ہٹتا ہے وہ "فراریت" کا مرتکب ہوتا ہے۔ لیکن مذہب والے بھی تو اسی اساس پر اپنے شعور شاعری کے حق بجانب ہونے کی عمارت بلند کر سکتے ہیں۔ اُن کی نظر اُنھیں زندگی کی دوسری حقیقتوں تک پہونچاتی ہے جو مارکسی حقیقتوں سے مختلف ہیں۔ اُن کے خیال میں مادیت کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا زندگی کی اصل حقیقتوں سے "فرار و ہرب" کی حیثیت رکھتا ہے اور انسانیت کو آگے بڑھنے اور پنپنے سے روکتا ہے"۔

اب اس کا فیصلہ کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون؟ اگر آسانی سے ہو بھی سکے تو دوسرے میدانوں ہی میں ہو سکے گا۔ اس کے لئے فلسفہ علم کلام، اقتصادیات اور دوسرے علوم کی طرف مراجعہ کی ضرورت ہوگی۔ شعر کی لطافتیں اور نزاکتیں ان سنگلاخ میدانوں میں جولانیوں کی حریف نہیں بن سکتیں اور نہ یہاں یہ لڑائیاں لڑی جا سکتی ہیں۔ شاید نئے ادیبوں کی طرف سے ارباب مذاہب پر حقیقتوں سے چشم پوشی کی تہمت لگائی جائے اور ان کا مارکسی اشتراکیوں کے تمدنی واخلاقی اقدار" سے انحراف اُن کے نفاق کی نشانی بتایا جائے۔ لیکن یہ حربہ پلٹ کر بھی استعمال ہو سکتا ہے اور شاید زیادہ کامیابی سے۔

ظاہر ہے کہ "مارکسی اشتراکیت" کے ماتحت جو نئی اخلاقی قدریں بننا چاہیئے اُس کے لحاظ سے نفاق وخلوص خیانت ودیانت، دغابازی وایمانداری کے تصورات عملی دنیا میں کسی خاص اہمیت یا عدم اہمیت کے مالک نہیں ہو سکتے۔ ان تصورات میں سے جس وقت جس

کا دامن پکڑ لینا خودغرضی کے جذبات کی تسکین و تشفی کے لئے موزوں ہو مارکسی زاویۂ نگاہ سے اُس وقت وہی قابلِ احترام ہے۔ جبکہ مذہب کا قدم درمیان سے اُٹھا دیا گیا جو "اخلاقی قدروں" کے وجود پر زور دیتا تھا اور اُن کے سامنے انسانی پیشانیاں جھکانے کے لئے طرح طرح کے ترغیبات و تخویفات سے کام لیتا تھا تو پھر اب انسان کے پاس اِن اخلاقی قدروں پر عامل ہونے کے لئے کون سا واقعی سہارا رہ گیا۔ اُسے تو جس میں مادّی حفاظت محفوظ رکھتے ہوئے مادّی فائدہ نظر آئے گا وہی کام کرے گا۔ "مارکسی اختراکیت" آئندہ کے متعلق اشتمالیت (Communism) کی جس جنت کے خواب دیکھ رہی ہے اگر اُس کی تعمیر میں منطقی عناصر سے کام لیا جائے تو یہ قطعی ہے کہ مذہب و اخلاق کے آخری نشانوں کے غائب ہو جانے کے بعد صرف بہیمیت ہی کا دور دَورہ ہوگا۔ خودغرضی اپنی پُوری وسعتوں کے ساتھ عروج پر ہوگی اور اُس کے نتیجہ میں فواحش اعمال نمُ افعال کا انسانوں ہی کے عمل و فعل کی دنیا پر تسلط ہوگا۔ اجتماعیت کا شعور (جبکہ اُس کی تعمیر میں حکیمانہ معتدل مذہب کے مصالحہ سے کام نہیں لیا گیا ہے) لازمی طور سے آگے بڑھکر بہیمانہ رنگ میں رنگ جائیگا۔ آج جو اشتراکی ادیب اخلاقیت و انسانیت کا اپنے مقالات میں تذکرہ کرتے ہیں تو وہ (گستاخی معاف) یا تو ان مقامات پر مصلحتاً نفاق سے کام لے رہے ہیں یا پھر اُن کے دماغ کے غیر شعوری حصّوں میں مذہبیت پُورے طور سے موجود ہے، جو روکے اور دبائے جانے کے باوجود ان "ایثار آمیز" تصوّرات کی شکل میں کبھی کبھی نمودار ہو جاتی ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ زندگی نہایت ہی وسیع الذیل چیز ہے اُس کی حیثیت ایک قلزم زخّار کی ہے جس میں مختلف مظاہروں کی لہریں برابر اُٹھتی رہتی ہیں، اُن کے ادراک کے لئے ایسی نگاہِ مشاہدہ کی ضرورت ہے جو برابر مستعدی کے ساتھ حکیمانہ طور سے گرم تماشا رہے۔ زندگی کے دریائے بیتابی میں "کسان و مزدور" کی تھکی ہوئی عرق آلودہ مساعی صرف چند موجوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں کو زندگی کی کائنات سمجھ لینا انسانی تجربہ کی کوتہ چشمی ہے۔ ایسی حالت میں شاعری سی وسیع شئے کو زندگی کے ایک ہی پہلو سے مخصوص کر دینا دانشمندی نہیں ہے۔

شعریت کیا ہے اور کیا نہیں ہے: اسے وہ نئے ادیب بھی سمجھتے ہیں جن میں ابھی اس کی صلاحیت ہے کہ بیوقوفی کی حرکت کو غیر ادیبانہ تصور کر سکیں: اُن کے قلم سے خواہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر یہ فقرے نکلتے رہتے ہیں کہ "اس شعر میں شعریت ہے اس میں نہیں ہے"

شعر اور ترقی پسند ادب

(از سید اختر علی تلہری)

اس طرف کچھ عرصہ سے "ترقی پسند ادب، نئے ادب" کا تذکرہ نوجوان ادیبوں کی زبانِ قلم پر مختلف پیرایوں میں آرہا ہے۔ اس کی "کایا پلٹ شعبدہ گری" کی داستانیں بڑی بلند آہنگی کے ساتھ بیان کی جارہی ہیں۔ لیکن جب ترقی پسند ادب کے اُن مختلف مفہومات پر غور کیا جاتا ہے جو یہ نئے ادیب پیش کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان خیالات میں خطرناک قسم کا ابہام موجود ہے حقیقتوں کے ادراک کے لئے جس پہنائی نظر اور دقت نگاہ کی ضرورت ہے اُس سے وہ قریب قریب محروم ہیں۔ مارکس و فرائڈ کے مزعومات پر جذباتی حیثیت سے مذہبی قسم کا ایمان لا چکنے کے بعد شعر و شاعری کے بارہ میں وہ جس قدر چاہیں غیر ادیبانہ باتیں کہیں، لیکن اس حقیقت کو بدل نہیں سکتے کہ "مارکسی اشتراکیت" کے سانچہ میں شعر کو ڈھالنے کی سیاسی کوششیں اور اُس کے حسن و قبح کی جانچ پڑتال کے لئے نقد و انتقاد کے نئے نئے اُصول و قوانین اپنے مخصوص نظریوں کے ماتحت بنانا صرف "پروپیگنڈائی وقعت" ہی رکھ سکتا ہے۔ "شعریت" کے نقد سے اُسے کوئی نفس الامری تعلق نہیں ہے۔

ترقی پسند ادب کی ترجمانی کا ادعا کرنے والوں کی طرف سے غزلیہ شاعری پر یہ الزام بار بار عائد کیا جاتا ہے کہ اس ذخیرہ میں ہجر و وصال کی بار بار کی دُہرائی ہوئی داستانوں اور گل و بلبل کی وہی پرانی گھسی پسی حکایتوں کے سوا اور کیا ہے؟ نازِ حسن و نیازِ عشق کے افسانوں، درد و غم کے ترانوں میں اب کوئی ندرت نہیں، تازگی نہیں، جان نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اب تک نیا ادب جو شعری ذخیرہ پیدا کر سکا ہے اُس کی کائنات مزدور سرمایہ دار انقلاب، کسان، بغاوت وغیرہ چند "سطحی لفظوں" کو ایک جگہ اکٹھا کر دینے اور لہجہ میں ایک خاص قسم کی کرختگی اور خشونت پیدا کر لینے کے سوا اور کیا ہے؟ اگر ان نئے ادیبوں کا اپنے شاہکاروں میں فلسفہ کی چاشنی دینے کو بھی جی چاہا تو واعظ و زاہد کے بجائے خدا سے ٹھٹھول کر لیا گیا۔ مذہب کو "استہزا و طنز" کا نشانہ بنا دیا گیا یہ تو نئے "تخلیقی ادب" کی کائنات ہے لیکن جب کبھی اس سے ہٹ کر "ادبی نقد" کے جادہ پہ گام فرسائی کی گئی تو "مارکسی اشتراکیت" کا تخیل سامنے رکھکر یہ کہدیا گیا کہ اس نظم میں آزادی کا

تخیل غلط ہے۔ اس میں جاگیردارانہ نظام کی بو ہے۔ اس شعر میں اصلاح پسندی کا اثر ہے۔ انقلابی تصور سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ شعر ہی کارنامۂ زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس میں "فراریت" ہے، اس میں "تضادی کیفیت" ہے۔

مارکس واینگلز و فرائڈ سے دریوزہ گری کے طفیل چند اصطلاحات کے جو سوکھے ٹکڑے مل گئے ہیں انھیں برابر موقع بے موقع چباتے رہنا بھی کوئی خوشکن مشغلہ نہیں ہے: "ظرف تنگنائے غزل" اگر بقدر شوق نہیں اور بیان کی وسعت کے لئے نظم کے فراخ میدانوں میں قدم رکھا جا رہا ہے تو یہ تو نہ ہو کہ اس میں بھی "مارکسی اشتراکیت" کا محدود حصار بنا کر میدان کی فراخیوں کو اپنے لئے تنگ کر لیا جائے۔ جس نئے ادب اور جس نئی تنقید کے نمونے ہمارے سامنے آرہے ہیں اُن کی حالت کسی طرح پُرانی مطعون شاعری اور پُرانے عنوانِ نقد سے بہتر نہیں ہے۔ اُن سے بھی وسعتیں مفقود ہیں۔ ندرت و تازگی کا اُن میں بھی کچھ اثر نہیں ہے، اُن کے شعر و ادب کی "آستین" بھی پُرانے شعر و ادب ہی کی طرح "شکر آلود" ہے۔ پھر ایسی صورت میں اُس سے مگس رانی کی توقع کیونکر ہو سکتی ہے۔

یقیناً ادب و شعر جامد چیزیں نہیں ہیں، عالم کے تغیرات کا ان پر اثر پڑتا رہتا ہے۔ خیالات کی رَو بھی رُخ بدلتی رہتی ہے، اور بیان کے اسالیب میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ماحول، سماج، تمدن وغیرہ کی اُلٹ پلٹ سے شعر کی مزاجی کیفیت متغیر ہوتی رہتی ہے مگر اس تمام تغیر و تبدل کا تعلق جزئیات کی دنیا سے ہوتا ہے۔ عالم کلیات سے نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ نگاہیں جو ہر آن بدلنے والی جزئیات ہی میں گرفتار ہو کر رہ جاتی ہیں "مستقل کلی حقیقتوں" کا ادراک نہ کر سکیں لیکن جو نگاہیں جزئیات کی سطح سے بلند ہو سکتی ہیں وہ اس کا انکار نہیں کر سکتیں کہ اس ہر آن بدلنے والی کائنات میں تصورات و جذبات سے تعلق رکھنے والی کچھ ایسی حقیقتیں ہیں جنھیں مستقل کہا جا سکتا ہے مستقل حقیقتوں کا مطلب "ازلی و ابدی حقیقتوں" سے نہیں ہے۔ اس مقام پر مستقل حقائق سے مقصود وہ احساسات و جذبات و تصورات ہیں جن پر انسانی تجربہ استقرائی اصول ملحوظ رکھتے ہوئے یکسانی کی مہر لگا چکا ہے۔ یہ مسئلہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے شاید مزید تفصیل چاہتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ آغازِ آفرینش سے اب تک ہم جن حاسوں کے مالک رہے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے مخصوص ماحول د مخصوص جغرافیائی حالات میں جذبات و تصورات کی جو کیفیتیں طاری ہوتی رہتی ہیں اُن کی بہت سی شکلوں میں تجربہ یکسانی کا ثبوت فراہم کر سکتا ہے۔ جیسے

چنبیلی کی خوشبو سے ایشیا کے جغرافیائی ماحول میں قوت شامہ برابر فرحت حاصل کرتی ہے عنادل خوشنوا کے زمزمے سامعہ کے لئے نشاط ہی کا سامان بنتے ہیں۔

چونکہ اب تک اس ماحول میں موجودہ حاستوں کی موجودگی میں کچھ مخصوص حالات کے رونما ہونے پر مخصوص کیفیتیں برابر ظاہر ہوتی رہی ہیں اس لئے آیندہ کے لئے بھی یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ جب تک ہمارے موجودہ "نفسی وجسمی نظام" میں تغیر نہیں ہوتا مخصوص حالات کی موجودگی میں مخصوص کیفیتوں کا وجود بھی لازم ہے۔ غیر تغیر پذیر مستقل حقیقتوں سے اِسی قسم کے انسانی تجربے مراد ہوتے ہیں۔ اِن انسانی تجربوں کا دائرہ احساسات جذبات اور تصورات سب پر مشتمل ہے۔ مادی علل ومعلولات کے جس سلسلہ پر ہمارے ترقی پسند ادیب ایمان لائے ہوئے ہیں اور جس کی اساس پر "تاریخ کے مادی تصور" کے نظریہ کی اساس قائم ہے اُس کی بھی بعینہٖ یہی حیثیت ہے "مسئلۂ تعلیل" سے جس قدر مادی دنیا متاثر ہے اُسی قدر عقلی دنیا بھی۔

نئے ادب کے ترجمان آخر اس قضیۂ "ایک کی آزادی دوسرے کے لئے غلامی ہے" میں استقلال کے عناصر پاتے ہیں، ایسی حالت میں اگر اس نئے مذاق کے ماتحت بھی کچھ حقائق ومفاہیم کو مستقل مان لیا جائے تو کسی "منطقی گناہ" کا ارتکاب نہیں ہو جائے گا۔

حقیقت میں اسی قبیل کے غیر تغیر پذیر مفاہیم کو "حقائق مستقلہ اور کلیات مطلقہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ اپنے ذات ونفس کے لحاظ سے ایک حالت پر رہتے ہیں، البتہ ان کے مصادیق جنھیں یا جزئیات بھی کہا جاتا ہے بدلتے رہتے ہیں۔ جن اذہان کو "حکیمانہ تجرید" کا ملکہ نہیں ہے وہ ان جزئیات کی تغیراتی دنیا ہی کو اس کائنات کا سب کچھ سمجھ لیتے ہیں

ایک حقیقی شاعر کا کمال یہی ہے کہ وہ مختلف ذخیروں سے انھیں مستقل حقیقتوں کو چھانٹ کر شعری سانچوں میں ڈھال دے اور اثر وتاثیر کے حیرت انگیز آفاق گیر طلسم پیدا کردے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شعر اپنے فن کارانہ مقتضیات کے لحاظ سے ان حقیقتوں کے بیان کے لئے جو لہجہ اختیار کریگا وہ فلسفہ کے لہجہ سے مختلف ہوگا۔

ذیل میں ایک باکمال غزل گو کے چند شعر لکھے جاتے ہیں جن میں اسی قسم کی مستقل نفسی وجذباتی وعقلی حقیقتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ لہجہ میں شاعرانہ صناعی کی وہ لطیف خصوصیتیں موجود ہیں جو شعر کی حدیں فلسفہ سے الگ کردیتی ہیں۔

دنیا سے پوچھ دیکھ، کوئی ذرّہ دہر کا ترئین کائنات سے غافل نہیں رہا

کہتی ہے اہلِ ذوق سے بیتابیِ خیال ——— جس میں نہ اضطراب کی خو ہو بشر نہیں
جبتک اُجڑے ایک دنیا ایک دنیا بس گئی ——— جوشِ نیرنگِ تمنا سے یہ عالم دل کا ہے
ناداں کو انتظارِ قیامت ہے ورنہ یاں ——— پیدا عمل عمل سے ہے آواز صور کی
اک یوں چمن میں مہکے اک یوں قفس میں تڑپے ——— تو ہی خدائے گل ہے کیوں اے خدائے بلبل
پہلے پہل کسی نے جو پوچھا ہے دل کا حال ——— تصویر بن گیا ہوں میں بگڑے گواہ کی
لرزِ خیال کی دنیا کے انقلابوں سے ——— اُنھیں کا روپ ہیں نیرنگیاں زمانہ کی
بلا کا گھر تھا کبھی اب تو میری نظروں میں ——— قفس میں شان نکلتی ہے آشیانہ کی
بجلی کو خود نہیں ہے نہ گرنے پہ اختیار ——— الزام اُس نگاہ پہ کوئی لگائے کیوں
پھول ملتے ہیں ابھی کھیل تو انگاروں سے ——— نار سے خلد کا رستہ نظر آتا ہے مجھے

(بیخود موہانی مرحوم)

اشعار بالا کسی اشتراکی شاعر کے شعر نہیں ہیں، یہ ایک ایسے غزل گو کے نتائجِ افکار ہیں جس کی شاعری کا کالبد تمام تر پرانے ادبی مذاق ہی کی مٹی سے تعمیر ہوا ہے۔ لیکن چونکہ وہ شاعری کے بادۂ سرجوش کا حقیقی معنوں میں جرعہ کش ہے اس لئے اُس کے اشعار انسانی تجربوں اور مختلف النوع مستقل حقیقتوں کے آئینہ دار ہیں اور اسی لئے ان اشعار میں بقا و استقلال کی صلاحیت ہے۔ یہ خصوصیتیں جہاں کہیں ملیں گی عام انسانی برادری کو مخاطب کرنے کی اُن میں اہلیت پائی جائیگی اور اُن کی اپیل کا دائرہ پھیلتا چلا جائیگا۔

یہ سچ ہے کہ جو انسانی تجربے اِن اشعار میں بیان کئے گئے ہیں اُن میں نری کھری فلسفیانہ حقیقت نگاریوں سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ اُن مجازی اشارات سے کام لیا گیا ہے جو شاعری کی ہمیشہ سے جان رہے ہیں اور رہیں گے۔ اس مقام پر بعض ترقی پسند ادیبوں کی ایک اہم غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اُنھیں علم بیان کے بتائے ہوئے اُن اسالیب ادا میں جو مفاہیم کو مختلف لباس پہناتے ہیں جاگیردارانہ نظام کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ اس وقت تفصیل سے اس مسئلہ کے متعلق بحث منظور نہیں ہے البتہ اجمالاً اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ تشبیہ استعارہ کنایہ مجاز مرسل کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ سے لٹریچر کی آرائش کا سبب رہے ہیں۔

وہ قومیں جو اپنے حالات کے لحاظ سے جاگیردارانہ نظام سے وابستہ نہیں رہی ہیں بلکہ قبائلی آزادی" کے ماتحت زندگی بسر کرتی رہی ہیں اور اُنھیں ایک جمہوری قائد Democratic Dictator یعنی شیخ قبیلہ کی نگرانی میں مساویانہ آزادی کے ساتھ زندگی کی نعمتوں سے مستفید ہونے کا برابر موقع رہا ہے

بلا اس کا لحاظ کئے ہوئے کہ وہ اُن کے مزعومہ سماج کے کہاں تک ترجمان ہیں؟ پروفیسر احمد علی ترقی پسند ادیبوں میں ممتاز جگہ رکھتے ہیں۔ آپ نے جنوری و فروری ۱۹۴۱ء کے تازہ نیا ادب میں ایک مقالہ لکھتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے "چنانچہ شاہد لطیف بھی جو ادب کے سیاسی پروپیگنڈسٹ ہوگئے ہیں احمد علی پر رسالۂ اُردو کے ایک جدید پرچہ میں اعتراض جڑتے وقت احمد علی کو غلط سمجھے۔ وہ چاہتے تھے کہ احمد علی حقیقت کو خیرباد کہہ کر یہ چلّانے لگے۔

"اے مزدورو اور اے کسانو، تم بھوکے ہو تم ننگے ہو، تم ظلم سہہ رہے ہو، اُٹھو، اور انقلاب کرو وغیرہ وغیرہ، مگر میں اس قسم کی تصنیف کو ادب میں شمار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں اور نہ اس قسم کی تنقید کو ادبی تنقید سمجھتا ہوں"۔

پروفیسر احمد علی کا یہ پُرمغز ارشاد بہت کچھ ادبی و شعری حقیقت و ماہیت کا ترجمان ہے، لائق پروفیسر صاحب خواہ نئے ادب کے موعظت پسندانہ خشونتوں سے اپنے کو وابستہ رکھنے کی وجہ سے اقرار نہ کریں لیکن وہ شعریت کی اُس مابہ الامتیاز خصوصیت کے ادا شناس معلوم ہوتے ہیں جسے شاعرانہ زبان میں "خمارِ چشم ساقی" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اور جس کا حسنِ دلنواز اسالیب بیان کی ندرتوں کے ہلکے پردوں سے چھن چھن کر حساس دلوں میں کیف و نغمہ کی دنیا پیدا کرتا رہتا ہے۔ شاعری کی یہ مابہ الامتیاز خصوصیت حسنِ الفاظ و حسنِ تراکیب کے خلق کئے ہوئے نغمہ و ترنم کے تاروں پہ دوڑتی ہوئی دل و دماغ کی دنیا اُسی طرح زیروزبر کردیتی ہے جس طرح حسن و شباب کی مستیوں میں سرشار محبوب خوش ادا کی سرمہ آلود آنکھوں کے لال لال ڈورے حساس دلوں میں زلزلہ کا تلاطم برپا کردیتے ہیں۔ مست آنکھوں کی ان قیامت خیز کیفیتوں کو دیکھکر چشم زدن میں دل کی جو حالت ہوتی ہے اور جسے آغازِ آفرینش سے آج تک مختلف پیرایوں میں، مختلف دوروں میں مختلف زبانیں برابر ادا کرتی چلی آئی ہیں۔ وہی کیفیت شعروشاعری کے نغموں کی ہے کہ جہاں یہ کانوں کے پردوں سے ٹکرائے معاً ذوق رکھنے والے دلوں میں عجیب وغریب کیفیت پیدا ہوئی جسے مختلف عنوانوں سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کی جاتی ہے۔ جو نئے نقاد اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اشتراکیت و اشتمالیت کے قائم کردہ قوانین پہ اس شاعرانہ کیفیت کا تحلیل و تجربہ کرکے اُس کی "جذبی و نفسی کیفیت" کو مادّی شکل دے دیں وہ گلاب کی پنکھڑیوں کے رنگ و بُو کا اندازہ دشنہ و خنجر کی نوکوں سے کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح اپنے "جمالیاتی شعور" کی تہی دامانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سماج کے مختلف پہلوؤں کا تحلیل و تجزیہ فلسفۂ اجتماعیات وغیرہ ہی کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔ شاعری

کے ساز کو نرے کھرے "اشتراکی مضراب" سے نہیں چھیڑا جا سکتا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اجتماعیت کے اس خرمن سے بھی کچھ دانے جو شاعری کی کشت زار کے لئے موزوں ہوسکتے ہیں اور جو اس کی زمین پر برگ و بار لاسکتے ہیں چُن لے اور اُن میں بھی اپنی مسیحا نفسی سے تازہ جان ڈال دے۔ شاید اشتراکی ادیب شاعری کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کو اپنے "روٹی دال کے فلسفہ" سے ہم آہنگ نہ پاکر اسے جذباتی عیاشی قرار دیں۔ اور اُس میں "پروپیگنڈائی افادیت" پیدا کرنے کے لئے "مارکسی اشتراکیت" ہی کے محور پر اسے گھومتا رکھنا چاہیں، مگر یہ صرف اُن کی حد سے بڑھی ہوئی "مادّی خیرہ چشمی" ہوگی۔ جذباتی یا عقلی عیاشیوں سے بچا ہوا کون ہے؟ تاہم اگر شاعری اس مفہوم کے لحاظ سے "افادیت" سے خالی نظر آرہی ہے تو زیادہ ایمانداری کی بات یہ ہوگی کہ فارسی کے اس مقولہ "ماناں میخواہیم شعرنمی خواہیم" پر عمل کیا جائے۔ بہت سے حالات میں اس مقولہ پر عمل یقیناً ضروری ہوجاتا ہے کیونکہ زندگی کی اکثر منزلوں میں نان طلبی شعر خوانی پر مقدم ہو جاتی ہے۔

قدیم طرز تخئیل پر فرد قرارداد جرم عائد کرتے وقت اسے بھی مختلف لفظوں میں بار بار دُہرایا جاتا ہے۔ کہ "خیال بغیر مادّہ کے پیدا نہیں ہوسکتا"۔ اور اس لئے شاعری خلا میں پھل پھول نہیں سکتی، گویا اس عنوان سے ہمیں سمجھایا جاتا ہے کہ اُردو شاعری کی حقیقی بنیاد کچھ نہیں ہے۔ وہ اُس تخئیل پر قائم ہے جو خلا میں پھلتی پھولتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب خیال بغیر مادہ کے پیدا ہی نہیں ہوسکتا تو پھر پُرانی شاعری کے تخئیل کی گلکاریوں پر اعتراض کی صورت کیا ہے؟ جب خیال کے وجود کے لئے سابق میں مادّہ کا وجود ضروری تسلیم کرلیا گیا تو لازمی طور سے ایشیائی شاعری کے طلسماتی تخئیل کا رنگ و بو بھی مادّہ ہی کا رہین منت ہوگا۔ ایسی حالت میں اسے یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ پُرانی شاعری بھی خلا میں نہیں پھلی پھُولی ہے، بلکہ ٹھوس زمینوں ہی میں اس کے پودے نے جڑیں پکڑی ہیں اور اس کے ریشے یہیں سے غذا حاصل کرتے رہے ہیں اب یہ دوسری بات ہے کہ مادّہ پر قدم جما کر خیال "فن کارانہ نقطۂ نظر" سے کبھی صحیح رُخ پر پرواز کرتا رہا ہے اور کبھی غلط رُخ پر۔ اس کی ضرورت البتہ ہے کہ غلط پروازی کی روک تھام کی جائے اور صحیح رُخ پر پرواز کی عادت ڈالی جائے۔ اگر معترضین کا مطلب غلط پروازی کی روک تھام سے ہے تو بات اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ جو کچھ اختلاف ہوسکتا ہے وہ اس امر کی تعیین میں کہ پرواز تخئیل کے لئے غلط سمتیں کون ہیں اور صحیح سمتیں کون؟ لیکن اسی کے ساتھ اتنا ضرور کہا جائیگا کہ اس مطلب

کے ادا کرنے کے لئے جو عنوان و اسلوب اختیار کیا جاتا ہے وہ نہایت ہی غیر منطقیانہ اور مغالطہ خیز ہے۔

اِس مقام پر ضمنی طور سے اس کا واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہ کلیہ کہ خیال بغیر مادّہ کے پیدا نہیں ہوتا غالباً تھوڑی سی ترمیم کا محتاج ہے۔ فلسفہ کی نگاہ میں یہ تو صحیح ہے کہ ہمارے کام تمام علوم مادّہ ہی سے شروع ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب لینا کہ ہمارا تمام علم مادّہ سے پیدا ہوتا ہے قابلِ نظر ہے۔ مختلف واسطوں سے علم کی پیدائش کو مادّہ کی طرف منجر کرنا بیکار ہے کیونکہ اِس صورت میں مابعد الطبیعیاتی دلائل سے کام لینا ہوگا اور وہ اس نظریہ کے سراسر مخالف ہیں۔

اس سلسلہ میں کینٹ کے خیالات غور سے پڑھنے کے قابل ہیں:۔ اگرچہ اُس نے مادّہ کے بجائے تجربہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تاہم اس کا انطباق زیرِ بحث صورت پر بھی ہو سکتا ہے۔ کینٹ لکھتا ہے:۔

"اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہمارے تمام علوم تجربہ ہی سے شروع ہوتے ہیں، علم کے آلات انھیں اشیاء کے ذریعہ سے عمل پر اُبھارے جا سکتے ہیں جو ہمارے حواس کو متاثر بناتے ہوئے ہم میں خیالات کی تخلیق کرتے ہیں کچھ تو اپنے طور سے اور کچھ اس طور سے کہ ہمارے ادراک کو اس پر آمادہ کر دیتے ہیں کہ وہ ان خیالات کا آپس میں مقابلہ کریں یا پھر ایک دوسرے کو آپس میں ملائیں یا ایک کو دوسرے سے علحدہ کریں۔ یہ سب عمل اس لئے ہوتا ہے کہ ہمارے احساس پذیر تاثرات کا جو خام مصالحہ ہے اُس کو اشیا کے اُس علم میں منتقل کر دے جسے تجربہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اگرچہ ہمارا سارا علم تجربہ سے شروع ہوتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکالا جا سکتا کہ ہمارا علم تجربہ سے پیدا ہوتا ہے۔

آیا کوئی ایسا علم ہے جو تجربہ سے بالکل بے نیاز ہو اور صرف تجربہ ہی سے نہیں بلکہ حواس کے تمام تاثرات سے بھی۔ یہ سوال سرسری طور پر نہیں ٹالا جا سکتا بلکہ اس کا جواب بہت ہی بڑا احتیاط تحقیق کے بعد دیا جا سکتا ہے۔

اِس قسم کے علم کو (A p r i o r i) مستغنی عن التجربہ علم کہا جاتا ہے اور یہ "تجربی علم" سے بالکل الگ چیز ہے۔ A p r i o r i (مستغنی عن التجربہ علم سے ہماری مراد اُس علم سے نہیں ہے جو اس تجربہ یا اُس تجربہ سے بے نیاز ہو بلکہ اُس علم سے مراد ہے جو تجربہ سے مطلقاً مستغنی ہو"

آگے بڑھکر کینٹ نے اس مستغنی عن التجربہ علم Apriori کی شناخت کی قطعی علامتیں بیان کی ہیں۔ وہ کہتا ہے

تجربہ ہمیں یہ تو بتا سکتا ہے کہ یہ چیز ایسی ہے یا ویسی ہے لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ دوسری طرح کی نہیں ہو سکتی۔ تجربہ اپنے فیصلوں کو حقیقی اور سچی عالمگیری شان نہیں عطا کرتا بلکہ استقرا کے ذریعہ سے ایک مفروضہ اور اضافی قسم کی عالمگیریت بخشتا ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تجربہ یہ کہتا ہے کہ جہاں تک مشاہدہ ہو سکا ہے اس قاعدہ میں کوئی استثنائی صورت نظر نہیں پڑی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی فیصلہ آفاق گیری شان رکھتا ہے اور اس میں کسی استثنا کا امکان تجویز کیا جا سکتا تو یہ علم مستغنی عن التجربہ علم (Apriori) ہے۔"

اس کے بعد کینٹ نے یہ بتایا ہے کہ انسانی علم میں ایسے فیصلے ہیں جو حقیقت میں عالمگیری و آفاق گیری شان رکھتے ہیں اور اس لئے انھیں مستغنی عن التجربہ علم کہا جائیگا۔ ریاضیاتی مسائل اور دوسری چیزیں اس کی مثال میں پیش کی گئی ہیں۔

کینٹ کا اقتباس پیش کرنے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اُس کی زبردست فلسفیانہ حیثیت سے ذہنوں کو متاثر کیا جائے۔ اس قسم کی "فکری تقلید" کی حکمت و فلسفہ میں گنجائش نہیں ہے اس کے پیش کرنے سے صرف یہ اتنا مدعا ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ پہلو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ اور کینٹ نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اُسے نگاہ کے سامنے رکھا جائے۔ صرف یہ کہکر کہ کینٹ کا پورژوا فلسفی ہے اور اس لئے غیر قابلِ اعتنا ہے کسی تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے۔

درسِ عمل

(نتیجۂ فکر منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی)

جھیل آزار مگر درپئے آزار نہ بن — دیکھ چلتی ہوئی پھرتی ہوئی تلوار نہ بن
کاروبار اپنا بنا خلق میں بیکار نہ بن — اس کا مطلب یہ ہے گرتی ہوئی دیوار نہ بن
ہے مناسب کہ تماشا کو تماشا ہی سمجھ — رہ کے دنیا میں بھی دنیا کا خریدار نہ بن
کہہ گئیں گلشنِ عالم کی ہوائیں مجھ سے — پھول بننا ہو تو بن پھولوں میں تو خار نہ بن
نفع کم اور زمانے میں خسارہ ہے بہت — مان کہنا سببِ گرمیِ بازار نہ بن
ہم نے مانا وہ خطا پوش بہت ہے بسمل — پھر بھی ہے خیر اسی میں کہ گنہگار نہ بن

جذباتِ اثر

(از مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی، ایم۔ بی۔ ای وزیر ریاست کشمیر)

تیرے دہن کی بات چمن میں جو چل گئی
کلیاں چٹک رہی تھیں، صبا منہ مسل گئی

وہ نازِ دلبری ہے نہ سرگرمیِ نیاز
دنیائے حسن و عشق کی رُت ہی بدل گئی

کانوں پہ ہاتھ رکھتے قیامت کھڑی ہے دُور
شوخی ادا کے سانچے میں اس طرح ڈھل گئی

میں کہہ چلا تھا اُن سے محبت کا ماجرا
وہ تو کہو کہ بات ادھوری ہی ٹل گئی!

اُس آہ کو بھی کہتے ہیں بے درد بے اثر
اکثر جو بختِ خفتہ کی کروٹ بدل گئی

سہمی ہوئی تھی صبح کی پہلی کرن کی طرح
اُن کی طرف نگاہ جو پہلے پہل گئی

کچھ شرم، کچھ عتاب ہے کچھ سوچ ہے اُنھیں
کیا بات بیخودی میں زباں سے نکل گئی

ناوک ہزار بار قبول اُس نگاہ سے
جو دل میں کھُبتے کھُبتے یکایک مچل گئی

کہنے چلی ہے سوختہ جانوں کی داستاں
اے شمع کچھ خبر ہے زباں تیری جل گئی

کچھ اور بڑھ گئی ہیں پریشاں نگاہیاں
دم بھر جو تیرے غم سے طبیعت بہل گئی

دل ڈوبتا ہے آہ بھی کرنا محال ہے
کافر یہ کہہ رہا ہے طبیعت سنبھل گئی

مانوس میری یاد سے تیرا خیال ہے
یا شاخِ یاسمن کی شگوفوں سے پھل گئی

قطعہ

گویا کرن تھی چاند کی وہ شرمگیں نظر
آنکھوں سے جو اُترتے ہی دل میں پگھل گئی

دل سے پھر آئی آنکھوں میں اشکوں کے ساتھ ساتھ
اور پردے پردے میں دبے پاؤں نکل گئی

بیتابیاں جہاں تھیں سکون و قرار ہے
منظر بدل گیا، مری دنیا بدل گئی

تاریکیوں میں کھوئی ہوئی میری روح تھی
تم مسکرائے، نور کے سانچے میں ڈھل گئی

ہر سانس ایک تازہ سحر کا پیام ہے
مژدہ کہ معصیت کی شبِ تار ٹل گئی

کس منہ سے اتحاد کا دعویٰ کرے کوئی
اتنی دلوں میں کھوٹ ہے، بولی بدل گئی

پوچھو تو اُن سے جن کو جواہر میں ہے نظر
اِس طرح میں بھی طبعِ اثر لعل اُگل گئی

صلائے عام

(نتیجۂ فکر حضرت شائق ہندو)

بادہ نوشو آؤ سیرِ عالمِ بالا کریں — اِک ذرا چل کر مہ و خورشید کا سودا کریں
پھر سے زندہ کر دکھائیں اصطلاحِ جامِ جم — پھر سے رندی میں وہی حاصل یدِ طولیٰ کریں
پھر فروغِ سینۂ مینا سے ہو چشمک ذرا — پھر تماشائے نمودِ وادیِ سینا کریں
پھر ہے کچھ اس طرح ہو حق کہ دنیا جی اُٹھے — پھر جہاں میں عام اعجازِ دمِ عیسیٰ کریں
پھر شرار و شعلۂ ساغر سے کھیلیں اِک ذرا — پھر زمانہ میں نیا پیدا یدِ بیضا کریں
پھر بساطِ میکشی پر ہوں دو زانو قبلہ رو — پھر ادائے فرضِ شغلِ ساغر و مینا کریں
پھر امامت میں ہو چشمِ مستِ جاناں کی نماز — پھر خمِ محرابِ طاعت ابروئے سلمیٰ کریں
پھر قیامِ صد ادب ہو اور رکوعِ صد نیاز — پھر جھک جائے جبیں جس سے وہ اِک سجدا کریں

خلطِ مبحث سے تمیزِ کفر و ایماں ہے محال
آؤ معیارِ عبودیت نیا انشا کریں

قند پارسی

(غزل از مسٹر جلال الدین طالب)

ستم ار چہ رفت پیہم سرِ من بغایت از تو — نرسید گاہ لیکن بلبم شکایت از تو
چو رخِ ترا ببینم برود مرا ز خاطر — بدلم اگرچہ باشد گلہ بے نہایت از تو
بزمانہ ہر کسی را بطبیعت است ذوقے — تو فسانہ دوست داری دلِ من حکایت از تو
بنما بسوئے خود رہ کہ مرادِ دل بیابم — تو بملکِ دل بکن جا سزد ایں ولایت از تو
بکشم ترا چو خواہم شبِ وصل تنگ در بر — چہ کنم بہ آں نزاکت کہ کند حمایت از تو
بہزار سالہ طاعت نتواں بتو رسیدن — ز کرم و لطفِ خاص ار نشود ہدایت از تو
بکدام رو تو طالب بروی بہ پیشِ داور — ہمہ عمر شد نہ کارے بجز از جنایت از تو

فانی کا فلسفۂ حیات و مرگ

(از حضرت محشر بدایونی)

حضرت فانی بدایونی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں - موجودہ دور میں جبکہ حسرت جگر اور صفی جیسے اُستاذانِ فنِ شعر و ادب کے نام ہندوستان کی لامحدود فضاؤں میں گونج رہے ہیں فانی کا پایۂ شاعری بھی کسی سے نیچا نہ رہا۔ شاعر موصوف نے شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ کو نباہا۔ اور یہی اُن کی کامیابی کا بڑا راز ہے۔ کون سا افسوں ہے جو اس شاعرِ باکمال نے نہیں پھونکا، کونسا جادو ہے جو اس ساحر نے نہیں جگایا۔ حضرت فانی کے نام سے نہ صرف اہل بدایوں و اہل دکن متعارف تھے بلکہ ان کے نغمات سوز و گداز سے ہندوستان کے چپہ چپہ کی فضائیں گونج رہی تھیں - آج جبکہ موت کی میٹھی نیند نے اُن کو سکونِ ابدی بخش دیا ہے اُن کی صورت نگاہوں سے روپوش ہو چکی ہے، باوجود اس کے اُن کا نام ہمارے دلوں پر ہمیشہ ہمیشہ نقش رہیگا۔ ہم ان کے کلام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے بقول ساغر:-

کلیم کو خدشۂ فنا کیا، اگر ہے اس کا کلام باقی
کہ شعریت بن کے زندگی کی رہے گا شاعر کا نام باقی

اب اسی مضمون کو خود ان کی زبان سے سنیئے:-

ہیں ابھی ترے اشعار یاد ہیں فانی ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

فانی کا ہر شعر ایک چبھتا ہوا نشتر ہے جو دل کے پار ہو کر روح کو بیدار کرتا ہے۔ رگ رگ میں انقلاب برپا کر دیتا ہے اور سوئی ہوئی اُمنگوں کو بیدار کر دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فانی کے یہاں جگر کی سی سرمستیاں نہیں پائی جاتیں محض موت کا رونا ہے، سرور و سرمستی کا کام انسان کو سلا دینا ہے نہ کہ غفلت کی نیند سے بیدار کرنا، اور نشترِ غم کا کام سوئے ہوئے جذبات کو چونکا دینا ہے۔ جب انسان کے جذبات کا طوفان اُمنڈنے لگتا ہے تو نفس میں مردانگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہڈیوں میں تلاطم، رگ رگ میں اضطراب اور یہی اصل زندگی ہے۔ فانی کے مقابلہ میں کسی شاعرِ سرمست کو لانا دو متضاد چیزوں کا توازن کرنا ہے جو کچھ معنی نہیں رکھتا۔ فانی کو جس رنگ میں ملکہ حاصل ہوا وہ کسی دوسرے میں نہیں پایا جاتا۔ فانی نے خود کو ایک تصویرِ عبرت بنا کر عالم کو فلسفۂ زندگی کی تعبیر سے آگاہ کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

زندگی کی کشمکش پیہم سے گھبرا جانا بزدلی اور پست ہمتی کی دلیل ہے لیکن جس کی زندگی ہی موت ہو۔ وہ ایسی مرگ ساماں زندگی کو کیونکر قبول کر سکتا ہے۔ جس کو زندگیٔ ابدی کی تلاش ہے وہ زندگیٔ فانی کے دامِ غریب میں کیسے گرفتار رہ سکتا ہے۔ فانیؔ بھی بحرِ ہستی کو پار کر کے ساحلِ بقا کی راہ غم کی طوفان آشنا کشتی میں ڈھونڈھ رہے تھے

دارِ فانی میں یہ کیا ڈھونڈھ رہا ہے فانیؔ — زندگی بھی کہیں ملتی ہے فنا سے پہلے

یہاں اقبالؔ کے بھی دو شعر ملاحظہ ہوں۔ زندگی کے اس فلسفہ میں وہ بھی فانیؔ کے ہمزبان ہیں:-

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے — خواب کے پردے میں بیداری کا اِک پیغام ہے

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

اگر منظور ہے تجھکو خزاں نا آشنا ہونا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے (اقبالؔ)

فانیؔ کے چند شعر اور یاد آتے ہیں جو قریبًا ایک ہی مضمون کے حامل ہیں:-

ہے موت ہی اک زندگیِ دل کا سہارا — جینے کی جو ایسی ہی تمنا ہے تو مر جا

تعبیر اجل نے دی اِس خوابِ پریشاں کی — ہم مر کے تجھے سمجھے لے ہستیِ انسانی

جدائی اہلِ وطن سے جو اذیت فانیؔ کو پہونچی اس نے بھی اُن کی شاعری پر کافی اثر ڈالا مستقل طور سے وطن کا چھوٹ جانا بھی ایک محبِ وطن کے لئے قیامت سے کم نہیں۔ جا بجا ان کے اشعار میں وطن کی جدائی کا شکوہ ہے۔ ان کی زندگی کا غم میں مبتلا ہو جانے کا ایک یہ بھی سبب تھا جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے:-

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
نوبت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانیؔ دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم — ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دُور

ہمارے شاعر موصوف کی دُوربیں نگاہیں زندگی کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھیں، اُن کے نزدیک زندگی بجائے خود موت ہے اور زندگی کا ہر لمحہ غم کی جیتی جاگتی تصویر۔ ہر سانس ایک جنازہ ہے اور ہر لمحہ انسان کی موت ہے۔ یہاں چند اشعار جو ایک ہی مضمون کو لئے ہوئے ہیں قلمبند کرتا ہوں:-

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانیؔ — زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

نامرادی حد سے گزری حالِ فانیؔ کچھ نہ پوچھ — ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

اشعار مندرجہ بالا میں دوسرے شعر میں نفس کو "آہِ بے تاثیر" کے جنازے سے تعبیر کیا ہے۔ اسی قسم کا ایک شعر اور ہے:-

ہر نفس آہ اور انفاس پہ جینے کا مدار زندگی آہِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک جگہ فرماتے ہیں :-

ہر لمحہ حیات سے ہے بیگانۂ حیات فانی حیات ہی سے عبارت عدم نہ ہو

زندگی کی حقیقت پر اگر کچھ روشنی کوئی ڈال سکا ہے تو صرف اسی قدر کہ یہ ایک خواب ہے جس کی تعبیر
ت ہے۔ اس نظریہ کے تحت جناب فانی کی رائے بھی ملاحظہ ہو :-

تجلیات وہم ہیں مشاہداتِ آب و گِل کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

چکبست کا یہ شعر بھی فانی کے شعر کی تائید کرتا ہے ؎

یہ حیات عالمِ خواب ہے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے

وہی کفر و دیں میں خراب ہے جسے علم رازِ جہاں نہیں

اِس میں کوئی شک نہیں کہ فانی نے زندگی کی حقیقت کو آئینہ کر دکھایا - ایک جگہ وہ زندگی کے معمہ
عقدہ کشائی اس طرح کرتے ہیں :-

اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

یوں تو زندگی کو خواب سے بہت شاعروں نے تعبیر کیا ہے" لیکن دیوانے کے خواب" سے جو بات پیدا
ی وہ فانی ہی کا حصہ تھا۔ کچھ سخن فہم حضرات ہی اس چیز سے لطف اُٹھا سکتے ہیں
غم بے حد نے فانی کو اس درجہ بیگانہ بنا دیا کہ ان کو غم و راحت کی تمیز بھی نہیں رہی جیسا کہ وہ فرماتے ہیں

مشکلوں سے جو مقابل ہوئی ہمت میری قدر باقی نہ رہی عیش و تن آسانی کی

فانی ازل کے دن سے ایک حساس طبیعت اور شاعرانہ دل و دماغ لیکر آئے تھے۔ اردو شاعروں میں
ں کو جو بڑائی حاصل ہوئی وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مگر پھر بھی زمانے نے اُن کی اتنی قدر نہ کی جتنی کہ چاہیے تھی
ں چیز کو کچھ خود فانی ہی نے محسوس کیا اور بیساختہ اُن کو کہنا پڑا۔

افسانۂ دل یوں کوئی سنتا نہیں فانی اب موت کسی دن مجھے افسانہ بنا دے

س جگہ فرماتے ہیں :-

زمانہ برسرِ آزار تھا مگر فانی تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

فانی کی زندگی اس درجہ غم و آلام میں گزری کہ آخر اُن کو یہی کہنا پڑا :-

عمر سب نزع کے عالم ہی میں گزری فانی زندگی کا نہ ہوا موت پہ احساں کوئی

صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ شعر بھی کس قدر عبرتناک اور درد انگیز ہے۔

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے حسرت فانی　　زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہوجائے

ہمارے مبصر شاعر نے ہستی انسانی کے مشکل مسئلے کو کس آسانی سے حل کیا ہے ؎

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم　　میری ہستی ہے غیب کی آواز

یہاں غالب نے بھی ٹھوکر کھائی ہے، وہ اپنی ہستی کو محض "پردہ سازکی آواز شکست" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں اور بس! لیکن فانی نے ہستی کو "غیب کی آواز" کہہ کر وہ بات پیدا کی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ صرف غیب کی آواز ہی کی تشریح اگر کی جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہوجائیں۔ لیکن پھر بھی تشریح کے سیکڑوں پہلو باقی رہ جائیں، غالب کا شعر یہ ہے:۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

زندگی محض ایام گذاری کا نام نہیں بلکہ انسان کے تجربات ہی زندگی کے راز کے سمجھنے میں کسی حد تک مدد دیتے ہیں۔ ایک حقیقی شاعر وہی ہے جو اپنے زمانہ کا آئینہ دار ہو۔ فانی نے بھی اپنی غزلیات میں وہ وہ دقیقہ سنجیاں اور نکتہ آفرینیاں کی ہیں جن سے اُن کی زندگی کا مکمل جائزہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ اُن کی شاعری "شخصی عنصر" کی دولت سے مالا مال ہے۔ غزلیات کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی تڑپے ہوئے دل کی صدائیں ہیں، جو امتداد زمانہ کے باعث نالہ و شیون کا عادی ہوچکا ہے حسن والفت کی دنیا میں بھی اُن کو غم کے مراحل طے کرنا پڑتے ہیں اور انتظار کی گھڑیاں بے چینی سے گزارتے ہیں۔ اب انتظار ہی اُن کی زندگی کا واحد مشغلہ ہے جیسا کہ فرماتے ہیں:۔

فانی یقین وعدۂ فردا کو کیا کہوں　　اب زندگی ہے نام فقط انتظار کا

آخر کار فانی اس انتظار مسلسل سے تنگ آکر موت کا انتظار کرنے لگتے ہیں، مگر اس پر بھی:۔

"موت آتی ہے پر نہیں آتی"

غالب نے تو صرف اتنا ہی کہا تھا ؎

ہر چکیں غالب بلائیں سب تمام　　ایک مرگ ناگہانی اور ہے

مگر فانی پر تکلیفوں کی بوچھار ابھی جاری ہے۔ اُن کی زندگی ابھی مصائب کی تگ و دو میں مصروف ہے فرماتے ہیں:۔

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گزار دی　　اک مرگ ناگہاں کے غم انتظار میں

دنیا کے اس ہولناک اور تلاطم خیز سمندر میں جہاں مصائب کی پرزور موجیں اور عسرت کی تند آندھیاں انسان کو تنکے کی طرح بہالے جاتی ہیں، فانی کی کشتی حیات بھی ناخدا کی مدد سے بے نیاز خدا کے سہارے چ

"اُبھرتی بیٹھتی دبتی دباتی اور چکراتی" چلی جارہی ہے، ناخدا بار بار ڈبونے کی دھمکیاں دیتا ہے، مگر فانیؔ خدا پر کامل بھروسہ رکھتے ہوئے کڑک کر جواب دیتے ہیں:۔

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ — اِک تو ہی ناخدا نہیں ظالم، خدا بھی ہے

بالآخر زندگی کا خواب پورا ہو چکتا ہے اور وہ دن بھی آجاتا ہے جس کی پیشین گوئی اُنھوں نے بہت پہلے کی تھی:۔

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانیؔ — ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دُور نہیں

اور اب بقول غالب:۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

آخر میں ہماری زبان یہ کہے بغیر نہیں مانتی:۔

فانیؔ کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب! — موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیئے تھا

مرنے والے! تیری کن کن خصوصیات کا ذکر کروں۔ اتنا کچھ لکھنے کے باوجود بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ کچھ نہیں لکھا۔ تو اب ہم میں نہیں مگر تیری یاد تیرے اشعار کی بدولت ہمارے دلوں میں ہے اور ہمیشہ باقی رہیگی:

صفحۂ ہستی سے تیرا نام مِٹ سکتا نہیں

تیری زندگی غم کی زندگی تھی اور اب ع مدعائے زندگانی مرکے حاصل ہو گیا" ناممکن ہے کہ ہم تیری شاعرانہ خوبیوں پر نمایاں روشنی ڈال سکیں، اتنا کہنا کافی ہے کہ:۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

حسرتِ امروز

موڑ پر وادی ہی کی میں نے کیا تھا ہوشیار — لیکن اُس دم حیف! کیا مجھ پہ ہنستو طعنے نہ تھے
آج جب ہو ہو کے عریاں نقش ہر ظاہر ہوا — حسرتیں خود ہاتھ ملتی ہیں کہ کیوں مانے نہ تھے

گریۂ پیہم

مجھ سے کل اس گریہ و زاری پہ ہمدم نے کہا — بات کیا یاس ہر اک قبر کے روتے ہو تم
کیا سمجھتے ہو کہ ہیں مالک کی یہ قبریں سبھی — اور نہیں تو عجیب کیوں اشکوں سے بھر دیتے ہو تم
اس پہ مَیں بولا کہ تم واقف نہیں اس راز سے — اور یا پھر بن کے ناواقف سے سمجھاتے ہو تم!
غم کی اک ادنیٰ کھٹک زخموں پہ پچھلے ضرب ہے، — کرب سے بے چین ہوں کہتے ہو کیوں روتے ہو تم؛
میری خاطر تو یہ کل قبریں ہیں مالک کا مزار — چھوڑ دو مجھکو یہ کیوں صبر غلط دیتے ہو تم

(ماخوذ از عربی) — (بندھو لال فیروز)

بھادوں

(از حضرت کشور واحدی، کانپوری)

کوئل کی سُریلی تانوں پر تھم تھم کے پپیہا گاتا ہے　　حل ہو کے ہوا کی موجوں میں بھادوں کا مہینا آتا ہے
ٹھنڈی پُروا، کالا بادل، برسا تو برستا جاتا ہے　　بوندوں کی مسلسل چوٹوں سے پتّہ پتّہ تھرّاتا ہے

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا، بجلی، پانی، دل سینے میں لہراتا ہے

صحرا میں ہوا بل کھاتی ہے، بادل کو صبا سنکاتی ہے　　پانی سے زمیں ترماتی ہے، سبزوں سے فضا لہراتی ہے
رِم جھم رِم جھم تھم تھم تھم تھم بوندوں کی صدا جب آتی ہے　　ہر بوند سے دل کے تاروں پر اِک چوٹ سی پڑتی جاتی ہے

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا، بجلی، پانی، دل سینے میں لہراتا ہے

رنگیں گلشن، رنگیں صحرا، رنگیں دنیا، رنگیں باتیں　　ناچیں، کھیلیں، دوڑیں، بھاگیں، راتوں جاگیں نیندوں ماتیں
کیا قہر ہیں ظالم برساتیں، کیا قہر ہیں ظالم برساتیں　　بھیگی دنیا، بھیگی سانسیں، بھیگے ارماں، بھیگی راتیں

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا، بجلی، پانی، دل سینے میں لہراتا ہے

بدلی کے دنوں میخانوں میں صہبا کی روانی کیا کہنا　　راتوں کے شراب و شاہد سے پلکوں کی گرانی کیا کہنا
ہر وقت سُہانا کیا کہنا، ہر رات سُہانی کیا کہنا　　برسات کے بھیگے لمحوں میں شاداب جوانی کیا کہنا

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا، بجلی، پانی، دل سینے میں لہراتا ہے

بھادوں جو چڑھا پھر باغوں اور جھولوں کی باتیں ہوتی ہیں　　گلشن کی رنگیں سیروں میں کچھ رنگیں گھاتیں ہوتی ہیں
جب عہدِ جوانی کی ٹھنڈی برساتیں ہوتی ہیں　　متوالی عُمریں ہوتی ہیں، متوالی راتیں ہوتی ہیں

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا، بجلی، پانی، دل سینے میں لہراتا ہے

گرشاسپ نامہ

(از اقبال انصاری، ایم۔ اے ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی)

یہ اسدی طوسی کی تصنیف ہے، ڈاکٹر ایتھے اور پروفیسر براؤن کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اسدی دو گزرے ہیں جن میں ایک دوسرے سے باپ بیٹے کا تعلق تھا اور تخلص اسدی دونوں میں عام تھا۔ اسدی (کلاں) کا نام ابونصر احمد بن منصور طوسی ہے جو صاحب "مناظرہ" ہے۔ دوسرا اسدی (خرد) اس کا فرزند ہے جس کا نام علی بن احمد الاسدی الطوسی ہے اور "گرشاسپ نامہ" و "نعت الفرس" کا مصنف یہی ہے۔ آقائے نفیسی اسدی (کلاں) کے وجود سے منکر ہیں (مجلۂ شرق بابت صفر ۱۳۴۹ھ) اور یہی خیال پروفیسر محمود شیرانی کا بھی ہے (رسالہ اردو، اپریل ۱۹۲۳ء) لیکن وہ یورپین تحقیقات کی وجہ سے اس کے وجود کو مان لیتے ہیں۔

دونوں باپ بیٹے کا ایک ہی تخلص ہونے کی وجہ سے صاحبان تذکرہ کو مغالطہ ہوا اور دونوں کے حالات میں گڑبڑ کر دی گئی ہے۔ اسدی (خرد) کو جو فردوسی کے بعد پچاس سال تک زندہ رہا بعض نے فردوسی کا اُستاد مانا ہے اور وہ آخری چار ہزار بیت اُسی کی جانب منسوب کرتے ہیں دولت شاہ لکھتے ہیں "اورا بہ کرات تکلیف نظم شاہنامہ کردہ اند و استعفا خواستہ بہ پیری و ضعیفی را بہانہ ساختہ" صاحب مجالس المومنین کہتے ہیں "فردوسی را نظم شاہنامہ اشارت میکردہ" آذر فردوسی کی شاگردی کو مسلّم مانتے ہوئے لکھتے ہیں "چوں زمانِ وفات فردوسی نزدیک رسید اسدی را احضار کردہ گفت اے اُستاد قدرے از نظم شاہنامہ باقی ماندہ و می ترسم چوں ازیں عالم بروم کسے تواند بنظم آں بپردازد۔ اسدی (خرد) گفت اے فرزند غمیں مباش کہ اگر عمرش باقی باشد با تمامش رسانم۔ فردوسی گفت ایں امر مشکل از تو بظہور پیوندد۔ اسدی در دو روز چار ہزار بیت گفتہ بنظر فردوسی گذرانید۔ وصلہ و تحسین یافت۔"

مگر آذر کی یہ روایت کئی وجہ سے قابل قبول نہیں ہے۔ پہلی تو یہ کہ دو دن میں چار ہزار شعر کہنا محل نظر ہے۔ دوسرے یہ کہ گرشاسپ نامہ کی تفصیل خود ان باتوں کی تکذیب کرتی ہے۔ تیسرے یہ کہ فردوسی کی وفات بقول شبلی ۴۱۱ھ میں ہوئی اور صاحب گرشاسپ نامہ یعنی اسدی (خرد) ۴۶۵ھ

میں مرا۔ چوتھے یہ کہ شاہنامہ سنہ ۴۰۰ھ میں مکمل ہوا جیسا کہ خود فردوسی لکھتا ہے:-

کہ گفتم من این نامۂ شہریار ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار

اِن صورتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر فردوسی کی عمر اسّی برس بھی مان لیں تو سنہ ۴۰۰ھ میں اسدی محض طفل ہی رہا ہوگا اور شاہنامہ جیسی کتاب کی خدمت اُس کے سپرد کرنا اور بھی خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اب اِس اسدی (خرد) کے باپ اسدی (کلاں) کو لیجئے تو اُس پر بھی آذر کے بیان کردہ قول کی مطابقت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اسدی (کلاں) کی وفات سلطان مسعود حسین غزنوی کے عہد میں ہوئی۔ اگر یہ بھی فرض کر لیں کہ سلطان مسعود کی حکومت کے ابتدائی سال یعنی سنہ ۴۲۲ھ میں وہ اسّی برس کے سن میں مرا تو سنہ ولادت سنہ ۳۴۲ھ نکلتا ہے اور بقول پروفیسر نلدکہ فردوسی کی ولادت سنہ ۳۲۳ھ یا سنہ ۳۲۴ھ میں ہوئی اور اس صورت میں فردوسی اسدی (کلاں) سے بھی تقریباً ۲۰ سال بڑا ہوا۔ پس ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اِن دونوں اسدیوں میں سے کسی سے بھی اُس نے اکتسابِ کمال سخنوری کیا ہو۔ اس کے علاوہ اسدی (کلاں) کوئی غیر معمولی شاعر بھی نہیں اور نہ کوئی اسکی عظیم الشان تصنیف موجود ہے صرف چار مناظرات ہیں جن کا مجموعہ ۱۶۵ اشعار سے زیادہ نہیں ہے۔

بہرحال گرشاسپ نامہ اسدی (خرد) کی تصنیف ہے جس کے متعلق نور اللہ شوستری لکھتے ہیں "در رسالۂ فرہنگ گوید نامم علی ابن احمد الاسدی طوسی است و نسب من بپادشاہ عجم رسد۔" رشید یاسمی کے پاس لغت کا جو نسخہ (مطبوعہ) ہے اُس سے یہ نام نہیں معلوم ہوتا، اور مؤلف کی کنیت و نام حسب ذیل عبارت سے واضح ہو جاتی ہے:-

دیباچہ لغت "بدانکہ فخر مردم بر جانوران دیگر بسخن گفتن است و سخن را تمامی بمعنی است و آں دوگونہ آمدے، یکے گونہ نظم است و دیگرے نثر و اندر کتاب منطق آنچہ از بابت سخن گفتن باشد ہمہ گفتہ اند و غرض اندریں لغات پارسی است کہ دیدم شاعران را کہ فاضل بودند لیکن لغات پارسی کم میدانستند و قطران شاعر کتابے کرد و آں لغتہا بیشتر معروف بودند۔ پس فرزندم حکیم خلیل اوحد اردشیر بن دیلم سپار النجمی الشاعر ادام اللہ عزہ از من کہ ابو منصور بن علی بن احمد الطوسی ہستم لغت نامۂ خواست چنانکہ بر ہر لغتے گواہی بود از قول شاعر فاضل" لیکن ویانا لائبریری میں اسدی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی "کتاب الابنیہ عن الحقائق الادویہ" مصنفہ حکیم ابو منصور موفق بن علی ہروی موجود ہے اور اس میں اُس نے اپنا نام یوں لکھا ہے "علی بن احمد الاسدی الطوسی الشاعر" یہ نسخہ سنہ ۴۴۷ھ میں نقل ہوا۔

اسدی کے نام کو زندہ رکھنے والی چیز نہ اُس کا لغت مسمّٰی بہ "لغت الفرس" ہے اور نہ کتاب الابنیہ عن الحقائق الادویہ کی تنسیخ ہے بلکہ گرشاسپ نامہ ہی اس کو زندہ کئے ہوئے ہے۔ اسکی

تصنیف کے متعلق خود شاعر نظم میں بیان کرتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ سنہ ۴۵۶ھ میں نخجوان میں ابو دلف کرکری کے یہاں گیا۔ ایک روز بادشاہ کے وزیر محمد بن اسمٰعیل اور وزیر کے بھائی موسوم بہ ابراہیم نے اسدی کو اپنی صحبت میں بلایا۔ دوران گفتگو میں آثار شعرا اور کتب تواریخ کا بھی ذکر آیا، چنانچہ سب نے تعریف کی کہ شاہنامہ بہت ہی اچھی کتاب ہے۔ اس تعریف کا یہ مطلب تھا کہ اپنے ہموطن کی طرح وہ بھی کوئی قدیم واقعہ نظم کرے اور بہتر یہی ہے کہ چونکہ فردوسی نے گرشاسپ شاہ کے متعلق بہت کم لکھا ہے لہذا اُسی کی داستان لکھی جائے اور ایسی ہو کہ رُستم کو بھی گرد کردے۔ بادشاہ نے بھی وزیر کی تائید کی۔ پس اسدی نے گرشاسپ نامہ نظم کیا اور انتساب وزیر ہی کے نام پر کرنا چاہا لیکن بادشاہ نے اس کا انتساب اپنے نام سے کرایا۔

گرشاسپ نامہ کے واقعات نہایت سادہ ہیں۔ اس میں گرشاسپ نامہ کی چین و ہندوستان و روم کی جنگوں کے واقعات ہیں۔ یہ بھی شاہنامہ کی طرح بحر متقارب ہی میں لکھا گیا ہے۔ اور بعضوں نے اسے شاہنامہ سے بہتر سمجھا ہے لیکن تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے ہم اسے صحیح نہیں مان سکتے۔ فردوسی و اسدی میں بہت فرق ہے، یہ فرق دونوں شاعروں کی طبیعت و زمانہ کا سمجھنا چاہیئے اور اگرچہ بعض مقامات پر مضامین دونوں کے یہاں عام ہیں لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور بقول پروفیسر محمود شیرانی "فردوسی خدائے سخن ہے مبتدی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔"

اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ سامانیوں سے سلجوقیوں تک کا زمانہ ایسا تھا کہ جس میں دو ہی قسم کا ادب رواج پاسکتا تھا یعنی شجاعانہ اور مدحیہ۔ چنانچہ اس زمانہ کے شعرا کے قصیدوں سے ظاہر ہے کہ مدح میں وہ مناسب حدود سے باہر نکل گئے ہیں۔ دوسرا رزمیہ ادب ہے جس کی بنیاد رودکی، ابوشکور اور دقیقی جیسے معماران سخن نے ڈالی۔ فردوسی نے اسے بہت رفیع الشان بنایا۔ اسدی نے اس کی پیروی کرتے ہوئے ہلکے رنگوں میں بیل بوٹے اور نقش و نگار بنائے اور نظامی نے حسن و خوبی کو درجۂ کمال پر پہونچا دیا۔ نظامی اگرچہ فردوسی کی گرد قدم کو بھی نہیں پہونچتے جیسا کہ علامہ شبلی کے بیان سے ظاہر ہے لیکن پھر بھی یہ کہنا پڑیگا کہ سکندرنامہ بڑی حد تک گرشاسپ نامہ سے آگے بڑھ گیا ہے۔ مثلاً اس میں وہ تمہیدیں کہاں جو نظامی کے یہاں ہیں جیسے نظامی سے

علم برکشی اے آفتاب بلند   خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بیار اے ہوا قطرۂ ناب را   بگیر اے صدف دُر کن آں آب را
برائے گہر از قعر دریائے خویش   بتاج سر شاہ کن جائے خویش

نظامی کے یہاں استعارات میں جو ندرت ہے، تشبیہات میں جو لطافت ہے وہ گرشاسپ نامہ
میں معدوم ہے، مثلاً دارا جب زخم کھا کر گرا، اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

بہارِ فریدون و گلزارِ جم ... ببادِ خزاں گشتہ تاراج غم
نسب نامۂ دولتِ کیقباد ... ورق بر ورق ہر سوئے بُرد باد

نظامی کے یہاں ترکیبوں کی چستی، قافیوں کی بلندی اور الفاظ کے شکوہ کا وہ عالم ہے کہ
بعض مقامات پر فردوسی بھی ان سے پیچھے دکھائی دیتا ہے، مثلاً دارا سکندر سے خراج وصول
کرنے کے لئے قاصد بھیجتا ہے، سکندر یہ سنکر غصہ سے سرخ ہوجاتا ہے اور جواب دیتا ہے ؎

مگر شہ نداند کہ در روزِ جنگ ... چہ سرہا بریدم در اقصائے زنگ
بیک تاختن تا کجا تاختم ... چہ گردن کشاں را سر انداختم

یا مرتے وقت دارا نے سکندر سے جو کہا ہے وہ بھی شاہانہ عظمت کا پہلو لئے ہے ؎

زمیں را سپُم تاج تارک نشیں ... ملرزاں مرا تا نلرزد زمیں

ان تمام خوبیوں میں گرشاسپ نامہ، سکندر نامہ کے برابر بھی نہیں، اور اوصاف میں فردوسی
و دقیقی کی شاعری سے اس کا مقابلہ بیکار ہے، لیکن خود اسدی شاعرانہ تعلّی میں اپنی تصنیف کو
بہترین مانتا ہے ؎

ز گویندگانِ کسناں نیست جفت ... نخوشی جہاں داستاں کس نگفت

گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ کی تصنیف ہے جبکہ منوچہری کا رنگ شاعری پر غالب ہو چکا تھا، چنانچہ
اسدی اور قطران دونوں کی شاعری میں منوچہری کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ دونوں کے یہاں صنائع
و بدائع کا التزام اور تشبیہات و استعارات و خیالات کے اظہار میں غیر معمولی تکلف پایا جاتا ہے۔ اگرچہ
اسدی نے مناظر کشتی اور جذبات کشتی میں بھی کہیں کہیں اعجاز سے کام لیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ
شاعر کی توجہ اس مثنوی میں وعظ و نصیحت کی طرف زیادہ رہی ہے اور پند و نصائح ہی اس کا اصل
موضوع ہے۔ قصہ اور شاعرانہ توصیفات فروعی چیزیں ہیں لہٰذا گرشاسپ نامہ کی عظمت قصہ و مثنوی
کی حیثیت سے کم ہے۔ ہاں اخلاقی کتاب ہونے کے سبب یہ بہت ہی عظیم و گراں قدر تصنیف ہے۔
چند پند و نصائح گرشاسپ نامہ سے منتخب کر کے لکھے جاتے ہیں

نام

انوشہ کسے کو نکو نام مرد ... چو اید رتنش ماند نیکی ببرد

کہ مانند نکوکاری ایدر بجائے | بود با تو نیکی بدیگر سرائے
نکو نامی از گیتی آں را سزاست | کہ کردار او خوب و گفتار راست

کوشش

بخانہ نشستن بود کار زن | بروں کار مردان شمشیر زن
نشاید ہمی یافت بے رنج و بیم | کہ بے رنج نارد کس از سنگ سیم
بدریائے ژرف آنکہ جوید صدف | بیایدش جاں بر نہادن بکف
بزرگی یکے گوہر پر بہا ست | ورا جائے در کام نر اژدہاست

زن

زناں را ز ہر خوبی و دسترس | فزوں تر ہنر پارسائی است و بس
ہر آنکس نترسد ز دستانِ زن | از و دور جاں رائے دانش مزن
ز دستانِ زن ہر کہ نا ترسکار | رواں با خرد نیستش سازگار
کہ موید چنیں داستاں زد ز زن | کہ با زن درِ راز ہرگز مزن

انسان و طبیعت

اگر چند پنہاں کند مرد راز | پدید آردش روزگار دراز
ہر آنگہ کہ آمد زمانہ فراز | نگردد بمردی و اندیشہ باز
زمین است آما جگاہِ زماں | نشانہ تن ما و چرخش کماں
اگر چند پوئی و جوئی بسے | زگیتی بے اندہ نیابی کسے

غزل حضرت دلؔ شاہجہانپوری

روحِ نشاط، بادۂ اطہر کہیں جسے | کوثر کی موج گردشِ ساغر کہیں جسے
فردوسِ شوق، کوچۂ دلبر کہیں جسے | رعنائیِ خیال کا منظر کہیں جسے
اہلِ نگاہ حسن کا مظہر کہیں جسے | تیرا ہی عکسِ رخ ہے گلِ تر کہیں جسے
تا ساحلِ مراد پہونچتے ہیں تشنہ کام | موجِ فنا ہے جنبشِ خنجر کہیں جسے
لے جوشِ گریہ دامنِ رسوا سے بے نیاز | ایسا بھی کوئی اشک ہے گوہر کہیں جسے
کیف محیط اس کا ہر انداز بے حجاب | ایمانِ عشق چشمِ فسوں گر کہیں جسے
یہ کیف کشتگانِ محبت سے پوچھیے | اک قطرۂ حیات ہے خنجر کہیں جسے

نورجہاں کا مزار دیکھکر

(از جناب سید اعجاز حسین ایم-اے لکچرار الہ آباد یونیورسٹی)

یہ اداسی یہ بھیانک شام کیسا ہے سماں
اے دلِ ناعاقبت اندیش تو لایا کہاں

ہو کا عالم اور ویرانہ ہے کس کا مقبرہ
اُف یہ تاریکی کہ کوسوں روشنی ہے لاپتہ

بیکسی جاروب کش ہے کس مپرسی نوحہ خواں
گردشِ چرخِ کہن اعجاز اس کی پاسباں

سبزۂ بیگانہ ہے غمخوار اور کوئی نہیں
ساتھیوں میں ہیں در و دیوار اور کوئی نہیں

شمع و گل کا ذکر کیا اب سنگِ تربت بھی ہے دُور
اُف یہ منظر دیکھکر ہے شیشۂ دل چُور چُور

اللہ اللہ مرقدِ نورِ جہاں بے نور ہے
کیا یہی نیرنگیٔ عالم ترا دستور ہے؟

تجھ کو تو ہوگی خبر، یہ کون ہے نورِ جہاں
جس کو کہتا تھا جہانگیر ابن اکبر جانِ جاں

صاحبِ حُسن و ادا جانِ جہاں نورِ جہاں
صنعتِ قدرت کا نقشہ نازشِ ہندوستاں

جس نے در پردہ حکومت ہند پر کی مدتوں
آہ اُس کی قبر پر اے ہند شمع و گل نہ ہوں

اِس بساطِ ہند پر جس کی سیاست نقش ہے
قلبِ شاہی پر ابھی جس کی فراست نقش ہے

چاند بی بی رضیہ و جھانسی کی رانی تھیں، مگر
سلطنت کی ہند پر اس نے بہ اندازِ دگر

جس کے دم سے تھی جہانگیری کی تابانی یہاں
جس کی حُسنِ رائے سے ہوتی تھی سلطانی یہاں

حُسن کا پرتو ہوں جس کے یہ نشاطِ "شالامار"
ایک نقشِ بیکسی بےمہات ہو اُس کا مزار

تیرے دامن پر یہ اک دھبہ ہے اے ہندوستاں
عظمتوں کی صنفِ نازک کا نہیں تو قدرداں

کوہ و صحرا کو سجا کر جس نے جنت کر دیا
اُس کو ظالم آسماں دیتا ہے ٹوٹا مقبرا

سلطنت جس کے قدم پر سر جھکاتی تھی کبھی
آج اس کی انجمن اس طرح ہو اجڑی ہوئی

اللہ اللہ انقلابِ دہر یہ رنگینیاں
یہ ادائے دلبری گاہے چنیں گاہے چناں

کہہ رہی ہیں قبر کی خاموشیاں یہ دیر سے
"بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے"

اُف رگِ جاں کے لئے نشتر ہے یہ آواز بھی
سخت دل تھا رو دیا لیکن یہاں اعجاز بھی

شدتِ جذبات سے پیشانی اس کی جھک گئی
گریۂ خاموش ہے کیا دل کی حرکت رک گئی

چومتا ہے قبر کو دیوانگی کا جوش ہے
یہ پرستش یہ عقیدت آہ کیا بے ہوش ہے

ایک قلمی نادر کتب خانہ

(از مولوی منظور الحق کلیم)

شاہ محمد قاسم سلیمانی صاحب ایک خدا رسیدہ بزرگ گزرے ہیں۔ اکبر بادشاہ کے آخیر زمانہ میں ہندوستان آئے۔ جہانگیر کے وقت میں قلعہ چنار گڑھ میں نظربند ہوئے۔ بادشاہ نے انھیں شاہجہاں کا طرفدار سمجھا۔ ان کے خاندانی سلسلہ کے بزرگ کوہ سلیمان سے تشریف لائے تھے۔ اِس نسبت سے "سلیمانی" کہے جاتے ہیں۔ شاہجہاں آپ کا معتقد تھا۔ برسرِحکومت ہونے پر جاگیریں وغیرہ عطا کیں۔ مزار آپ کا چنار گڈھ میں ہے۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے، بڑے صاحبزادے کا نام شاہ کبیر عرف بالا پیر صاحب اور چھوٹے صاحبزادے کا نام محمد واصل صاحب تھا لیکن "بابا صاحب" کہے جاتے تھے۔ بابا صاحب کا مزار بھی چنار گڈھ میں ہے۔ بڑے صاحبزادہ شاہ کبیر صاحب جن کو لوگ "بالا پیر صاحب" کہتے تھے ان کا مزار ضلع قنوج میں ہے۔ نواب بہادر خانصاحب جنھوں نے شاہجہانپور کو آباد کیا تھا شاہجہاں کے درباریوں میں تھے جن کا منصب ہفت ہزاری تھا۔ نواب صاحب موصوف کی صاحبزادی بابا صاحب کو منسوب ہوئی تھیں بارہ موضع جہیز میں دیئے۔ ہر دو صاحبزادگان کی اولاد موجود ہے بڑے صاحبزادے شاہ کبیر صاحب عرف بالا پیر صاحب کی اولاد میں محمد محفوظ علی میاں صاحب ہیں، ان کے صاحبزادے محمد ارشاد علی میاں اس وقت ایک نادر کتب خانہ کے مالک ہیں جو انھیں اپنے نانا حکیم مولوی عبدالستار صاحب طبیب خاص مہاراجہ صاحب گوالیار کے ذریعہ سے ملا۔ حکیم صاحب کے نانا مولوی بہادر علی خانصاحب معززین ریاست ٹونک میں سے تھے۔ چنانچہ چند کتابوں پر اُن کے نام کی مہر حسب ذیل ثبت ہے "زیاباں احمد است بہادر علی سنہ ۱۲۵۱ھ" اس کے علاوہ حکیم صاحب نے بہت سی کتابیں بذات خود دیگر مقامات سے وقتاً فوقتاً حاصل کیں، نیز سفرِ حج کے سلسلہ میں بھی چند نسخے خرید فرمائے۔

اس کتب خانہ کی چند کتابوں کو جناب نواب کلب علی خاں صاحب خلد آشیاں والی ریاست رامپور نے پسند فرمایا اور اُن کے لئے کافی قیمت دینے پر تیار تھے۔ مگر حکیم صاحب موصوف نے ان کتابوں کو علحدہ کرنا پسند نہیں کیا۔ ان کتابوں میں گلستاں باتصویر، شاہنامہ باتصویر، اور مثنوی مولانا روم خاص طور پر قابل ذکر ہیں افسوس کہ یہ نادر چیزیں اب کتب خانہ میں باقی نہیں رہیں، کہا جاتا ہے کہ ایک جلد ساز کی عیاری کا شکار ہوگئیں شاہنامہ تو ریاست حیدرآباد پہونچا اور گلستاں لکھنؤ کے جلدساز کی نذر ہوئی جس کے چند اوراق مطلا و مذہب

بطور یادگار کتب خانہ میں موجود ہیں۔ مثنوی شریف کا دفتر چہارم مطلا و مذہب بخط ایران بطور یادگار موجود ہے
اس مختصر تعارف کے بعد اُن قلمی نسخوں پر اجمالی روشنی ڈالتا ہوں:۔

کتاب نمبر ۱ یہ ایک قلمی کلام پاک ہے جس کے بارہ میں مشہور ہے کہ یہ جہانگیر بادشاہ کی تلاوت میں تھا۔ کتاب کا سائز ۱۲×۸ انچ ہے صفحات کی تعداد ۱۰۱۳ ہے۔ یہ سات جلدوں پر مشتمل ہے، بین السطور ترجمہ اور حاشیہ پر تفسیر ہے، کاغذ نہایت عمدہ سفید جلد کاشمیری، تمام اوراق مطلا و مذہب، قلم جلی، حروف اتنے روشن و خوشخط کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی حال کی تحریر ہے، کاتب کا نام نظام الدین لکھا ہے، سنِ کتابت ۱۰۱۰ھ

کتاب نمبر ۲ یہ حمائل شریف ہے۔ سنِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بادشاہ اورنگ زیب غازی کے زمانہ میں مکمل ہوئی۔ اس پر تین مہریں ہیں لیکن خراب شدہ پڑھی نہیں جاتیں، قلم نہایت باریک مطلا و مذہب کاغذ باریک سفید عمدہ، سائز کتاب ۴½×۳ انچ صفحات ۸۴۷۔ کاتب کا نام الغنی ابن فرخ اللہ کلب علی عفی عنہ سنِ کتابت یوں لکھا ہے سنہ ۱۴۷ھ، اب اگر اس کو سنہ ۱۴۷ھ ایک سو سینتالیس پڑھا جائے تو کاغذ پر شبہ ہوتا ہے کہ ایسا کاغذ اُس وقت دستیاب ہوتا تھا یا نہیں۔ اگر اس کو سنہ ۱۰۴۷ھ پڑھا جائے تو اورنگ زیب کا زمانہ ہوتا ہے اور غالباً یہی صحیح ہے۔

کتاب نمبر ۳۔ یہ بھی ایک حمائل شریف ہے، اس کا سائز ۶×۳½ انچ ہے صفحات ۵۱۴ مطلا و مذہب ہے اس پر مضمون مہر (مختار الدولہ محمود خاں بہادر ثابت جنگ سنہ ۱۲۵۱ھ) یہ زمانہ محمد شاہ بادشاہ کا تھا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محمود خاں صاحب کوئی شاہی اعلیٰ عہدہ دار تھے اور حمائل شریف ہذا اُن کی تلاوت میں تھی۔

کتاب نمبر ۴ یہ دلائل الخیرات شریف کا نسخہ ہے۔ صفحات ۴۴۴، سائز کتاب ۸½×۵ انچ مطلا و مذہب یہ کتاب بھی مختار الدولہ محمود خاں بہادر ثابت جنگ کی تلاوت میں تھی، کیونکہ اس پر بھی مہر مطابق مذکورۂ بالا کے ہے۔ اس کتاب میں دو نقشے بھی ہیں، ایک مدینہ منورہ شریف اور دوسرا مکۂ معظمہ کا۔

کتاب نمبر ۶ اس رسالہ کا نام مغفرت الغفور ہے یہ کتاب شاہزادۂ معظم کی تالیف ہے اس میں مختلف دعائیں تحریر ہیں جو شاہزادہ کے درود وظیفہ میں تھیں، یہ کتاب بھی مطلا و مذہب ہے، صفحات ۱۶۷ اور سائز ۶½×۳½ انچ، سنہ کا پتہ نہیں، البتہ پشتِ کتاب پر بشکل مہر سنہری میں یہ تحریر ہے، نسخہ شریف مغفرت الغفور تالیف مرزا خجستہ اختر مرزا معظم بن اورنگ زیب بادشاہ غازی۔

کتاب نمبر ۸ یہ دیوان حافظ کا نسخہ مذہب و مطلا ہے۔ صفحات ۸۵۴، سائز ۷×۴ انچ۔ یہ کتاب محمد جعفر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ جلوس عالمگیری سنہ ۲۵ میں لکھکر تمام ہوئی غالباً یہ سنہ ۱۰۹۶ھ ہے

کتاب نمبر ۹۔ مثنوی شریف مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ بخط ایران۔ دفتر چہارم صفحات ۲۵۰ سائز ۱۰½×۶½

مطلاّ و مذہب ،حاشیہ سفید حوض پر رنگ حنائی۔ اس کتاب کو نواب صاحب رامپور نے بہت پسند فرمایا تھا۔

کتاب ۱۰ ۔ یہ بھی مولانا روم کی مثنوی ہے ۱۱۲۶ھ میں تحریر ہوئی، تعداد صفحات ۸۸۲ سائز ۱۱½ × ۷½ انچ مطلاّ و مذہب ،اس کتاب کی صحت کے متعلق یوں تحریر ہے کہ یہ کتاب ۱۰۲۲ھ میں سات مثنویوں سے مقابلہ کرکے لکھی گئی، پھر ۱۰۲۶ھ میں بمقام پولم کور، پھر سفر دکن، پھر ۱۰۳۰ھ میں، پھر برہان پور، پھر ۱۰۳۱ھ میں تقریباً بیس دیگر مثنویوں سے مقابلہ ہوا۔ اس کے کاتب عبداللطیف بن عبداللہ العباسی ہیں، اسکا مکمل دفتر موجود ہے

کتاب ۱۲ ۔ یہ بھی مثنوی شریف کا ایک نسخہ ہے، سن کتابت ۱۰۲۱ھ لکھا ہے جو کہ غالباً غلط ہے یہ ۱۰۰۲ھ ہوگا ،مطلاّ و مذہب ۔ یہ کتاب مختار الدولہ محمود خاں بہادر ثابت جنگ ۱۲۵۱ھ کے کتب خانہ کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کتاب پر اُن کی مہر ثبت ہے ۔کاتب مولانا عبدالعزیز قندھاری ۱۰۲۱ھ

کتاب ۱۳ ۔دبستان المذاہب، یہ کتاب بھی مطلاّ و مذہب ہے ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۰۳ء

کتاب ۱۴ ۔خلاصۃ الاخیار، اس میں بزرگانِ دین کے حالات ہیں ،صفحات ۱۱۰۶ ،سائز ۱۲½ × ۹½ انچ اس کے کاتب غیاث الدین ابن حسام الدین ہیں۔

کتاب ۱۵ طبقات الصوفیہ ۔ یہ بھی صوفیائے کرام کے تذکرہ میں ہے۔ صفحات ۱۶۵ ،سائز ۶½ × ۱۰ انچ سال کتابت ۱۰۰۳ھ

کتاب ۱۸ ،سلسلۃ الذہب ۔ یہ ایک مثنوی ہے مع تین دفاتر کے جو شامل جلد ہیں ،صفحات ۴۹۶ سائز ۶½ × ۱۱ انچ مطلاّ و مذہب سال کتابت ۱۰۰۵ھ

کتاب ۱۹ ۔کشکول حضرت کلیم اللہ جہان آبادی ۔ اس جلد میں سات رسالہ شامل ہیں جن کا تعلق تصوف سے ہے، کتابت ۱۲۶۷ھ

کتاب ۱۲۷ کشف المحجوب، محرر علی بن عثمان بن ابی جلالی غزنوی ہیں، کتابت ۱۰۹۱ھ کی ہے۔

کتاب ۱۳۰ ۔رسالہ خطوط شاہی ، سنہ تحریر پڑھا نہیں جاتا ، صرف ۲۳ معلوم ہوتا ہے ،خاتمہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عالمگیر کے خطوط ہیں۔

کتاب ۱۱۲ ۔شرح تلخیص المفتاح ۔ یہ کتاب ہرات میں لکھی گئی ۔ابتدا سن ۸۴۲ھ انتہا ۸۴۷ھ صفحات ایک ہزار ،سائز کتاب ۱۰½ × ۶½ انچ

کتاب ۱۱۰ ۔ یہ شرح تہذیب کا نسخہ ہے ،اس میں تین مہریں ہیں ،ایک مہر جو پڑھی نہیں جاتی ہے مضمون مہر محمود ابن قابل خاں ودک زئی ۱۱۴۵ھ ۔حاشیہ باوجود خوشخط ہونے کے اس قدر باریک لکھا ہے کہ بغیر خوردبین کے پڑھنا محال ہے۔

کتاب ۵۶ - یہ کتاب موسومہ بیاض جفر حضرت محمد غوث گوالیری ہے - یہ علم جفر میں ہے اس میں بھی بعض بعض مقام پر بغیر خورد بین کے پڑھنا دشوار ہے، کمیاب نسخہ ہے، اس پر ایک مہر بھی موجود ہے لیکن پڑھی نہیں جاتی

کتاب ۱۴۲ - فصوص الحکم - یہ کتاب حکیم ابن عربی کی تصنیف ہے، گو اب یہ طبع ہو گئی ہے مگر اس نسخہ میں اس کی تشریحات قابل ملاحظہ ہیں، سال کتابت ۱۲۲۵ھ -

کتاب ۲۴۴ - الجامع الصغیر الاسیوطی فی ملک الفقیر عمر بن محمد بن سلیم - یہ نسخہ کرم خوردہ ہے کاغذ سفید بانسی مطلا و مذہب، صفحات ۱۰۷، سائز کتاب ۱/۲ × ۵ انچہ عبارت خاتمہ، شیخنا الحافظ المحبۃ جلال الدین ابو الفضل عبدالرحمٰن الاسیوطی ۹۰۹ھ مہریں بظاہر دو نظر آتی ہیں لیکن خراب شدہ

کتاب ۲۴۷ - شرح گیلانی بر قرابادین - یہ نسخہ مکمل ہے مگر اس کا حاشیہ دیمک خوردہ ہے جس کو تراشکر چیٹ بندی سے حال میں درست کیا گیا ہے، مطلا و مذہب، کاغذ حاشیہ سفید درمیانی حوض برنگ حنائی، صفحات ۵۰۳ سائز کتاب ۱/۲ ۱۱ × ۱/۲ ، انچہ شروع و اخیر صفحہ پر مختلف ناموں کی مہریں، زمانہ شاہی و نوابین اودھ - مختصراً عبارت خاتمہ ملاحظہ ہو:" تحریر ہذا الکتاب ...... ہجرۃ النبی صلعم فی عہد بادشاہ الاسلام دین پناہ محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ۳۳ھ بدست خاکپائے بزرگان دین فقیر الحقیر راجی الی اللہ الغنی شیخ عبدالرسول القرشی ولد شیخ محمد ۱۱۰۰ھ

اس کتب خانہ میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ تقریباً دو سو کتابیں قلمی ہیں جن میں سے اکثر مطلا و مذہب ہیں۔[1]

غزل حضرت خلیق برہانپوری

مجھے ارباب دانش جانتے ہیں خوب میں کیا ہوں　　سمٹ جاؤں تو قطرہ ہوں اگر پھیلوں تو دریا ہوں
چمن میں جب نظر آتے ہیں پھولوں کے ورق سادہ　　میں اُن پر حسنِ فطرت کے نئے عنوان لکھتا ہوں
مری تخئیل کی موجوں میں پنہاں رازِ وحدت ہے　　فرشتوں کو نہیں معلوم میں جس رو میں بہتا ہوں
نظر کو اپنی دوں پھر کس لئے تکلیفِ نظارہ　　تماشا گاہِ عالم میں خود اپنا میں تماشا ہوں
نگاہِ دور بیں والے ادھر آئیں مجھے دیکھیں　　کسی کے حسن کا میں ایک آئینہ سراپا ہوں
تڑپتے ہیں مری نظروں میں جلوے آفرینش کے　　اگر چشم ضیا افروز کو جنبش میں لاتا ہوں

خلیق اتنے حقائق گو نمایاں ہو گئے مجھ پر
مگر پھر بھی نہ ظاہر ہو سکا میں کون ہوں کیا ہوں

---

[1] کتب خانہ کے مالک اس کو علٰحدہ کرنا چاہتے ہیں، شائقین اس پتہ سے خط و کتابت کریں:-
محمد محفوظ علی وارشاد علی میاں رئیس کگرا شاہجہانپور یو۔پی

میں اور تو

(از راجہ مہدی علی خاں)

دریچہ جب افق کا کوئی آ کر کھول جاتا ہے
نکل کر آسماں پر ماہِ سیمیں جگمگاتا ہے

لرز جاتی ہے گھبراتی ہے تھراتی ہے تاریکی
سمٹ جاتی ہے چھٹ جاتی ہے چھپ جاتی ہے تاریکی

ترستی ہے کہ روشن چاند کو میں چوم لوں جا کر
پلٹ جاتی ہے لیکن دیکھتے ہی اس کو گھبرا کر

نہیں ممکن کبھی وہ اس سے ہم آغوش ہو جائے
وہ تاریکی ہے کیسے نور کے طوفاں کے پاس آ جائے

ابد تک بھی وہ روشن چاند کے پاس آ نہیں سکتی
اور اس کے سیمگوں عارض کا بوسہ پا نہیں سکتی

رہیں گے عمر بھر یونہی جدا اک دوسرے سے ہم
کہ مل سکتے نہیں نور اور تاریکی کبھی باہم

مطربہ!

(حضرت الطاف مشہدی)

اے حسینہ مطربہ، وجہ قرار زندگی
تیرے ہر انداز سے پیدا ہے سحر سامری

بن کے دیپک جب جہانِ عشق پر چھاتی ہے تو
روح میں بیتابیوں کی آگ بھڑکاتی ہے تو

تیرے نغمے جب بکھرتے ہیں ہوا کے دوش پر
بجلیاں بن بن کے گرتے ہیں متاعِ ہوش پر

لے کے انگڑائی کبھی جب سامنے آتی ہے تو
دل میں میٹھی راگنی بن کر اتر جاتی ہے تو

تجھ سے بڑھ کر ہے کہیں تیری فسوں کاری کی شان
چاند کے اوصاف میں جیسے ضیا باری کی شان

رشک کرتا ہوں میں اس نغموں بھری تقدیر پر
ہے خجل زہرا بھی تجھ سے آسمانِ پیر پر

کیفِ غم

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

س قدر مرہونِ منت ہوں ترا اے کیفِ غم
مل رہی ہے تجھ سے کیا کیا لذتِ رنج و الم

ہو رہا ہے اک عجب احساس کا دل میں ظہور
یعنی ہو جس طرح صہبا کا خمار آگیں سرور

. خیال اُمید میں ہوتا ہے یا جو یاس میں
جذب ہو جاتا ہے وہ جا کر اسی احساس میں

جیسے دریا خوب دکھلاتا ہوا جوش و خروش
بحر سے ملتے ہی ہو جاتا ہے پھر یکسر خموش

جیسے نغمہ اُٹھ کے اپنی ہی بلند آواز میں
دل ہلا دیتا ہے اور ہوتا ہے گم پھر ساز میں

بس یہی حالت ہے میرے بھی نئے جذبات کی
اس بدلتے رہنے والے دہر کی ہر بات کی

جو مری رگ رگ میں پیدا کر کے ہلچل ایک بار
جلد ہی پاتی ہے محویت کے عالم میں قرار

کیسی محویت؟ وہ محویت کہ جس کے جوش میں
بیخودی کی سی ہے کیفیت دلِ مدہوش میں

کیسی محویت؟ جو خود اپنے ہی دم سے ہے بنی
جو سراپا شدتِ احساسِ غم سے ہے بنی

وہ غمِ بیحد کہ جس سے حال ہوتا ہے زبوں
جو پھر اپنی ہی گرانباری سے پاتا ہے سکوں

وہ سکوں جس میں مُخل پھر کوئی ہو سکتا نہیں
ہاں خوشی تو کیا، نہیں غم کی بھی گنجائش کہیں!

اُس سکوں نے یہ اثر اپنا ہویدا کر دیا
اِک توازن سا مرے باطن میں پیدا کر دیا

وہ توازن دل مرا جس کا تمنائی بنا
چھوڑ کر سب کچھ اُسی کا ہے وہ شیدائی بنا

بس مجھے اب ہر نفس اپنی ہی دھن سے کام ہے
اور ہے آرام اسی میں، گو عجب آرام ہے

شادمانی تو کبھی میں اس کو کہہ سکتا نہیں
آہ اب اُس کا نشاں بھی مجھ میں رہ سکتا نہیں

فرطِ شادی سے بھی آتے ہیں کبھی آنسو نکل
جس قدر ہوتا ہے اُن میں رنج کا مخفی عمل

میرے غم میں ہے خوشی کے بس نشانی اتنی ہی
یعنی ہے اس طرح مجھ میں شادمانی اتنی ہی

خیر جو کچھ ہے بہر حال اب غنیمت ہے وہی
بیش ہو یا کم مری تسکیں کی صورت ہے یہی

ہاں اُسی سے کرب کی حالت میں بھی آرام ہے
"کیفِ غم" اپنی زباں میں سحر اسی کا نام ہے

آگے جاؤ

افسانہ

(از ڈاکٹر اعظم کریوی)

ہربنجن پور کے مکھیا شبراتی میاں نوجوانی میں سید پور بہت جاتے تھے، اُن کے گاؤں سے سید پور ۲۰ بارہ میل تھا، جب اُنھیں کسی کام سے الہ آباد شہر جانا ہوتا تھا تو وہ سید پور کی طرف سے ضرور گزرتے اور اپنے ایک ہم عمر دلی دوست بخت اشرف عرف تجن میاں زمیندار کے یہاں دو ایک روز کے لئے ضرور ٹھہرتے یہ نا ممکن تھا کہ شبراتی میاں سید پور سے گزریں اور تجن میاں انھیں نہ روکیں۔ اور پھر لاسہ "گلی ڈنڈا" اور "پہاڑی پلو" ایسے دیہاتی کھیل نہ کھیلے جائیں۔ مگر "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا"۔ ادھر چالیس سال ہو گئے اور شبراتی میاں کو سید پور جانے کا اتفاق ہی نہ ہوا۔ پہلے اُن کے گاؤں کے قریب کوئی ریلوے اسٹیشن نہ تھا مگر اب وہ رام چورا روڈ اسٹیشن سے جو اُن کے گاؤں سے قریب ہی تھا سیدھے الہ آباد چلے جاتے تھے، سید پور کی طرف سے جانے میں تکلیف کے ساتھ زیادہ خرچ بھی پڑتا تھا۔

چالیس سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا، زمانے میں سیکڑوں انقلابات ہوئے، بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے، گاؤں اُجڑے اور شہر بس گئے۔ پرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب نے لی، اب شبراتی میاں کی ضعیفی کا زمانہ تھا۔ اب غیروں کا کیا ذکر اُنھیں کی اولاد اُن ہی کے سامنے کہا کرتی تھی کہ "بابا سٹھیا گئے ہیں" شبراتی میاں سب کچھ سنتے تھے دیکھتے تھے مگر دم بخود تھے۔ گو ساٹھ سے زیادہ ان کی عمر ہو چکی تھی پھر بھی ان میں موجودہ زمانے کے نوجوانوں سے زیادہ دم خم تھا۔ نہ تو وہ عینک لگاتے تھے اور نہ اُن کی سماعت میں کوئی فرق آیا تھا۔ دانتوں میں پائریا کا بھی روگ نہ تھا۔ مزے سے آسانی کے ساتھ چنا چبا چبا کر گاؤں کے نوجوان لڑکوں کی کمزوری پر لطیف پیرایہ میں مذاق اڑایا کرتے تھے۔ "آجکل کے لڑکن (لڑکوں) کا تو پھونک مار دیو تو ہوا میں اُڑ جائیں...... میں جب جوان رہوں (تھا)، تو بھینسہ کا ایک گھونسہ مار گرائے دیوں"[1] (میں گرا دیا تھا)

...... مجھی بڑی کشتی ملدوں رہا (داؤں تھا)...... تم ایسن کا تو میں اَبھو کافی ہوں...... (تمھارے جیسے نوجوانوں کیلئے تو میں اب بھی کافی ہوں)

[1] یہ واقعہ بھی [illegible] بخت جگر ستاپ احمر کی یاد میں [illegible] دو بائیسویں سال میں تھا اور اسال بی ۲۰ کا [illegible] میں مناتے ہوئے [illegible] کہ الله کو پیارا ہوگیا (اعظم کریوی)

نوجوان لڑکے شبراتی میاں کی باتیں سُن کر آپس میں کہا کرتے تھے کہ بڈھے کو اب ڈینگ مارنے اور گپ اُڑانے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ان کے گاؤں میں ایک لڑکا بی۔اے پاس کر چکا تھا وہ کہتا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے "وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا" اب جسمانی قوت نہیں بلکہ دماغی طاقت کی زیادہ ضرورت ہے، یہ بڈھے تو زمین کے لئے بوجھ ہو رہے ہیں، فوج میں جہاں کوئی گھوڑا پندرہ سال کا ہوا اور اُسے "ضعیف و ناکارہ" کہہ کر گولی مار دیا جاتا ہے، یہ کساد بازاری کا زمانہ ہے اقتصادیات کا تو یہی تقاضہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو گورنمنٹ اس قسم کا قانون بنا کر ضعیفوں اور ناکاروں سے دنیا کو صاف کر دے۔ گریجویٹ کی منطق گاؤں کے لڑکے نہ سمجھکر بھی ہاں میں ہاں ملا دیتے لیکن شبراتی میاں کا خیال تھا کہ آجکل کے نوجوان تو بس اس قابل ہیں کہ کھیت کھلیان کے بجائے گرہستی کا کام لیا جائے، یا ان سے چرخا کتایا جائے، ممکن ہے کہ وہ شہر جا کر کرسی پر بیٹھکر گِٹ پِٹ کریں، لیکن ہل چلانا اور کھیتی باڑی کا کام کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ نوجوانوں کے ساتھ بڈھے شبراتی میاں کی چھیڑ چھاڑ میں گاؤں والوں کو بہت مزہ آتا تھا۔ اس ضعیفی میں بھی شبراتی میاں گاؤں کے مکھیا ہوتے ہوئے بھی کھیتی باڑی کا کام خود کرتے تھے۔ ان کے بیٹے اور پوتے ان کاموں سے دُور بھاگتے تھے۔

شادی ہو یا غمی شبراتی میاں پیش پیش رہتے تھے، کسی کو ان کے مشورہ کی ضرورت ہو یا نہ ہو مگر شبراتی میاں ہمیشہ اپنا مشورہ دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ انھیں جو کچھ کہنا ہوتا تھا وہ بلا تکلف کہدیتے تھے کسی کو اچھا لگے یا بُرا اُن کی بلا جانے۔ اُن کے ہم عمر تو شبراتی میاں کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے لیکن گاؤں کے لڑکے ظاہر میں تو نہیں لیکن باطن میں ان کی باتوں کو بوڑھے کی بکواس سمجھتے تھے۔

(۲)

دن یوں ہی گزر رہے تھے کہ ایک مرتبہ اتفاق سے شبراتی میاں کا گزر سید پور کی طرف ہو گیا۔ پہلے ریلوے لائن سید پور سے گزرتی تھی لیکن اب وہاں ریلوے اسٹیشن بھی بن گیا تھا جب ٹرین سید پور میں رُکی اور قلی نے پکارا "سید پور اسٹیشن" تو شبراتی میاں اونگھتے ہوئے چونک پڑے، کیا دنیا بالکل بدل گئی، سید پور! وہی سید پور نہ! جہاں اُنھوں نے اپنی نوجوانی کا کافی زمانہ گزارا تھا، وہاں کے باغوں میں آم اور جامن کی بہاریں دیکھی تھیں، چالیس سال کے گزشتہ واقعات اُن کی آنکھوں کے سامنے گزرنے لگے اُن کے دلی دوست بخشن عرف نجن میاں یاد آ گئے، وہی نجن میاں جنھوں نے کبھی شبراتی میاں کو بغیر کھلائے پلائے اپنے گاؤں سے گزرنے نہیں دیا تھا۔ جب نجن میاں کو معلوم ہو گا کہ شبراتی میاں سید پور ہو کر بھی اُن سے ملے بغیر چلے گئے تو ان کو دلی قلق ہو گا۔ آج کی رات سید پور ہی میں کیوں نہ ٹھہر جائیں صبح کو گاڑی

سے چلے جائیں گے۔ وقت کم تھا زیادہ سوچنے کا موقع نہ تھا، چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹرین زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتی۔ سید پور اور وہاں کے قدیمی احباب کی محبت نے زور مارا اور شبراتی میاں نے بیٹھ پر اپنی چھوٹی سی گٹھری باندھی، ہاتھ میں ڈنڈا سنبھالا اور اسٹیشن پر اُتر پڑے۔

سورج ڈوب رہا تھا، گائیں اور بھینسیں چراگاہوں سے واپس آ رہی تھیں، کندھے پر لہ آبادی لوہبندی لاٹھی رکھے اپیر مولشیوں کے پیچھے "برہا" گاتے چلے آ رہے تھے۔ یہ گلی ڈنڈا کھیلنے کا وقت تھا مگر اس کے بجائے شبراتی میاں نے دیکھا کہ کچھ لڑکے قمیص اور نیکر پہنے ایک میدان میں فٹ بال کھیل رہے ہیں، دو تین لڑکے پتنگ بھی اُڑا رہے تھے۔ شبراتی میاں نے جس طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تو اُنھیں دنیا بدلی نظر آئی، ایک معمولی گاؤں کے بجائے اب سید پور ایک متمول قصبہ تھا۔ شبراتی میاں کو خیال گزرا کہ شاید وہ سید پور کے بجائے کسی اور قصبہ میں آ گئے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک قلی سے دریافت کیا "کاہو (کیوں) یہ سید پور ہے نہ؟ جہاں سید میاں کا مجار (مزار) ہے؟" قلی نے کہا "ہاں بڑے میاں! یہی سید پور ہے، وہ سامنے سید میاں کا مزار ہے، اور اس کے پاس وہ کنٹی ہے، کیا آپ یہاں پہلے کبھی نہیں آئے؟"

شبراتی میاں کو قلی کی باتیں اچھی نہ معلوم ہوئیں، جہاں اُنھوں نے اپنی جوانی کا کاتی وقت گزارا اُسی جگہ کے متعلق اُن پر اجنبیت کا الزام دینا اُنھیں ناگوار گزرا۔ اب شبراتی میاں اسٹیشن سے باہر نکلے اور اپنے دوست نجّن میاں سے ملنے کی خوشی میں اُن کے قدم جلد جلد آگے بڑھنے لگے، اُفوہ چالیس سال کے بعد آج ملاقات ہوگی، نجّن میاں اُن کو دیکھکر کتنا خوش ہونگے، اُن کی عمر بھی اب میری ہی ایسی ہوگی، شکایت تو کریں گے کہ اتنے دنوں تک ملاقات کیوں نہیں کی، تو بھی شکایت تو میں بھی اُن سے کر سکتا ہوں، پہلے تو اُن کے پاس ایک بھینس تھی اور ایک ہل کی کھیتی ہوتی تھی، اب تو کئی ہل کی کھیتی کرتے ہوں گے۔ اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے شبراتی میاں چلتے چلتے ایک دو منزلہ عالی شان مکان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ شبراتی میاں اپنے دوست کا مکان بھول جائیں، یہ پیپل کا درخت ہے، یہ کنواں بھی رہا، اسی کے پاس نجّن میاں کا تو کچا مکان تھا، مگر یہاں تو اب پکّے مکانوں کے سوا کچے مکان کم دکھائی دیتے ہیں، پہلے دروازوں پر ہر وقت چہل پہل رہتی تھی، ہر طرف زندگی کا ثبوت ملتا تھا، لیکن اب تو چاروں طرف سناٹا ہے۔

(۳)

گاؤں میں گھستے ہی شبراتی میاں نے ہر شخص سے "سلام علیکم" کہا، وہ سمجھتے تھے کہ پہلے کی طرح اس کے جواب میں لوگ اُن سے بغلگیر ہو جائیں گے، مگر دو آدمیوں نے کوئی جواب نہ دیا، بلکہ شبراتی میاں کی طرف

حقارت سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہاں عقیدوں نے شبراتی میاں کے سلام کا مزید جواب دیا کیا گاؤں کے ساتھ ہی گاؤں والوں کی ذہنیت بھی تبدیل ہو گئی۔ شبراتی میاں کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ شام کی تاریکی بڑھ رہی تھی، دن رات سے گلے مل رہا تھا اور شبراتی میاں کو اب تک نجن میاں کا مکان نہ ملا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے دوست نجن میاں کا مکان بہت جلد پالیں گے، ایسے قلبی دوست کے مکان کا کسی سے پتہ دریافت کرنا وہ اپنے تعلقات کی توہین سمجھتے تھے۔ ان کے خیال سے جہاں نجن میاں کا مکان ہونا چاہیئے وہاں اب ایک عالی شان حویلی تھی۔ بیٹھک میں کرسیاں، میز، پلنگ اور تخت تو نظر پڑے لیکن وہاں کوئی انسان نہ دکھائی دیا جس سے وہ نجن میاں کا پتہ دریافت کرتے۔ اب شبراتی میاں زیادہ دیر تک حویلی کے سامنے کھڑے نہ رہ سکے۔ اتفاق سے ایک نوجوان عینک لگائے حویلی کی بیٹھک میں آیا۔ اس کو دیکھ کر شبراتی میاں نے رکتے رکتے دریافت کیا "کا بٹیا نجن میاں کا کون گھر ہے؟" نوجوان نے ایک دفعہ شبراتی میاں کی ہیئت کذائی کو دیکھا اور کہا "آگے جاؤ" (کیوں بیٹا) شبراتی میاں کو یاد آیا کہ نجن میاں کا گھر تو گاؤں کے اسی سرے پر تھا اب آگے کہاں جاؤں، پھر سوچا کہ ممکن ہے اب ان کا گھر گاؤں کے اندر بن گیا ہو، چنانچہ وہ آگے بڑھے۔ تھوڑی دور چل کر وہ ایک دروازے کے سامنے پھر کھڑے ہو گئے، انھیں یاد آیا کہ یہیں کہیں پر تو مینڈو میاں کا بھی تو گھر تھا۔ مینڈو میاں سے بھی شبراتی میاں کی جان پہچان تھی۔ مگر مینڈو میاں کا بھی تو کچا مکان تھا، لیکن اب تو نہایت پختہ عمارت کھڑی تھی بیٹھک میں دو چار لڑکے بیٹھے تھے۔ شبراتی میاں کو خوشی ہوئی کہ ایسی بیٹھک تو ملی جو آباد ہے، گلی میں کھڑے ہو کر انھوں نے نجن میاں کا پتہ دریافت کیا جب کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو انھوں نے پھر بلند آواز سے مینڈو میاں اور نجن میاں کو پوچھا۔ ایک لڑکے نے شبراتی میاں کو جھڑک دیا "بابا! شور کیوں مچاتے ہو ہم بہرے نہیں ہیں، آگے جاؤ" شبراتی میاں کا جی تو چاہا کہ لڑکے کو گستاخی کا مزہ چکھا دیں مگر یہ سوچ کر کہ بچے ہیں خاموش ہو گئے۔ ان کو اس بات کا بہت تعجب تھا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے، کیا ان کے سب ملنے والے گاؤں کے اس سرے کو چھوڑ کر دوسرے سرے پر جا کر بس گئے ہیں۔

اب تاریکی کافی پھیل چکی تھی، اندر گھروں کے تو چراغ جلتے معلوم ہوئے لیکن دروازے یا بیٹھکیں بے چراغ تھیں۔ شبراتی میاں کے لئے یہ بالکل نئی بات تھی۔ چالیس سال پہلے بیٹھکوں میں لالٹین نہ سہی مگر بینڈی کے تیل کا دیا ضرور جلتا تھا۔ غریب ہو یا امیر مغرب کی اذان ہوئی اور عورتوں اور بڑھوں نے چلانا شروع کر دیا کہ جلدی چراغ جلاؤ جلدی جلاؤ، بیٹھک میں دیا جلا آؤ، مغرب کی اذان کے بعد [illegible] منحوس سمجھی جاتی تھی

سید پور پر بھوتوں نے قبضہ جمالیا ہے۔ شبراتی میاں کی عقل حیران تھی خیریت یہ ہوئی کہ شبراتی میاں کو اکا دکا کچے مکانوں کی بیٹھکوں میں چراغ جلتے نظر آگئے ورنہ وہ سید پور کو شہر خموشاں سمجھ لیتے۔ اگر یہ بات نہ ہو گئی ہوتی تو شاید شبراتی میاں اب بغیر کسی سے کچھ پوچھے اپنے گھر واپس ہونے کے لئے اسٹیشن چلے جاتے۔ لیکن ان کو اشتیاق تھا کہ جب سید پور آگئے ہیں تو اپنے دوستوں کا تو پتہ چلالیں۔ اتفاق سے انھوں نے جس دروازے پر جاکر دریافت کیا اُن کو یہی جواب ملا کہ "آگے جاؤ" شبراتی میاں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور پھرتے پھراتے گاؤں کے دوسرے سرے پر پہونچ گئے۔

گاؤں کے آخری سرے پر انھیں ایک کچا پکا مکان دکھائی دیا جس کے سامنے ایک بہت بڑا چبوترہ تھا اور وہاں کئی چارپائیاں بچھی تھیں اور کئی لڑکے خوش گپیاں اڑا رہے تھے۔ وہاں شبراتی میاں کو کچھ زندگی نظر آئی۔ لڑکوں سے باتیں کرنا یا اُن سے کچھ پوچھنا شبراتی میاں کو پسند نہ تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ رات ہو گئی تھی۔ گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آچکے تھے اس کے آگے اور کوئی مکان بھی نہ تھا۔ چبوترہ پر کوئی بڑھا بھی نہ تھا جس کو شبراتی میاں مخاطب کرتے۔ چنانچہ شبراتی میاں نے مجبوراً نوجوانوں کے قریب پہونچ کر دریافت کیا "کا ہو یہی نجن میاں کا دوار ہے؟" سب جگہ وہ دریافت کر آئے تھے، سب نے یہی کہا تھا کہ "آگے جاؤ" اور اب یہ گاؤں کا آخری مکان تھا نجن میاں کا یقیناً یہی مکان ہوگا۔ لیکن اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُن کے کانوں میں پھر یہی صدا گونجی کہ "آگے جاؤ" اب شبراتی میاں کے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ کیا سب گاؤں والوں نے ان کو بیوقوف سمجھ لیا ہے "آگے جاؤ" "آگے جاؤ" آخر اس کا کیا مطلب ہے۔ وہ آگے بڑھکر بلا تکلف ایک خالی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کمر سے اپنی گٹھری کھولی، ڈنڈا ایک طرف رکھ دیا، کندھے سے انگوچھا اُتار کر گردو راہ جھاڑی اور نوجوانوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

"آگے جاؤ! آگے جاؤ! اب ہم آگے نہ جاب" (جائیں گے)۔ جہاں جاؤ کوئی یہ نہیں کہت کہ ٹھہر جاؤ، سب یہی کہت ہیں کہ آگے جاؤ، گاؤں کے اخیر میں تو آئے گیوں اب کہاں جائی، آگے تو کربلا (قبرستان) ہے ہم اب آگے نہ جاب پہلے جب ہم یہ گاؤں میں آوت رہین تو کوؤ اپنے دوارے سے آگے نہیں جائے دیت رہا۔ تب کچے مکان رہن تو دلن ماں محبت رہی سب کے دوارے پہ سانجھ ہوتے دیا جلا جات رہے اب پکی حویلی تو بن گئیں مُردارو کے دوارے پہ دیا تک نہیں جلت ہائے اللہ میاں ... ہو گئیں۔ تم ہم کا تو فقیر سمجھے ہو ہم تمہار محتاج نہیں ہیں دیکھو ہم اپنا کھانا ... بھی ... کی ... بن۔ ہم ہوئیں اپنے گاؤں کے جمیندار ہین۔

نہیں تھا، تہجیب (تہذیب) دیکھ لیا۔ آگے چلو، آگے جاؤ، پڑھ لکھ کے تم دو کوڑی کے ہوگئے۔ اپنے بزرگن (بزرگوں) کو بھول گیئو۔ واہ ری تمھار پڑھائی۔ لانت (لعنت) ہے ایسی پڑھائی پر، ایسی پڑھائی پر پھٹکار ہو۔ ایسی تہجیب (تہذیب) پر۔ ہم تمھرے یہاں رہبے کو (رہنے کو) تھیں آئا۔ ہم تو اپنے دوست بخشن میاں کو پوچھت (آ پوچھتے) یہاں تک آگئن (آ گئے)۔

بیچارے شبراتی میاں کی دیہاتی تقریر کو سن کر نئی روشنی والے دم بخود رہ گئے۔ مالک مکان مہتو میاں تھے تو نوجوان مگر نہایت سلجھے ہوئے، پُرمذاق اور بزرگوں کی عزت کرنے والوں میں سے تھے نہایت بااخلاق اور ملنسار تھے۔ انھوں نے شبراتی میاں سے بہت معذرت کی اور کہا "معاف کیجیے ہم باتوں میں مشغول تھے، بخشن میاں کا تو عرصہ ہوا انتقال ہوگیا، اُن کا مکان گاؤں کے اُس سرے پر اسٹیشن کے قریب ہی ہے"۔

بخشن میاں کی وفات کی خبر سُن کر شبراتی میاں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُن کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ دعائے مغفرت کے لئے ان کے دونوں ہاتھ اُٹھ گئے۔ یہ دیکھتے ہی نئی روشنی والے وہاں سے ایک ایک کرکے کھسک گئے۔ لیکن چلتے چلتے کسی شوخ لڑکے نے یہ فقرہ چست ہی کر دیا۔ بھئی۔

"اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو"

جذباتِ سلیم

جمتا ہے رنگِ محفل سوزِ غمِ نہاں سے　　حال اپنا کہہ رہا ہوں میں شمع کی زباں سے
شاید مرے پر آیا افسانۂ محبت　　نیند آرہی ہے مجھکو خود اپنی داستاں سے
بجلی کہاں گری ہے پھونکا ہے کس کو یارب　　یہ کیا میں سن رہا ہوں صیاد کی زباں سے
قدموں سے میرے لپٹے جاتے ہیں دیر و کعبہ　　کیا جانے آرہا ہوں میں کس کے آستاں سے
میرے شکستِ دل کے انداز سب کو بھائے　　شاخوں سے گل بھی ٹوٹے تارے بھی آسماں سے
وہ پوچھتا نہیں کچھ میں کہہ رہا ہوں سب کچھ　　ایسا بھی اک فسانہ چھیڑا ہے نازداں سے
لذت کشِ جراحت دل بھی ہے اور جگر بھی　　فرصت نہیں کسی کو نظروں کے امتحاں سے
بوئے چمن پریشاں رنگِ چمن پریدہ　　دل سہما جا رہا ہے انجامِ گلستاں سے

آنسو مچل رہے ہیں دل بیٹھا جا رہا ہے
اٹھنے کو اٹھ رہا ہوں میں اُس کے آستاں سے

سلیم [illegible]

تنقید کتب

پسِ پردہ[1]

یہ اختر صاحب بریلوی کے دلچسپ کلام کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے جسے سید علمدار حسین کاظمی بریلوی نے اپنے انٹروڈکشن کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں سبھی طرح کی مختلف نظمیں ہیں۔ چنانچہ "رام گنگا" اور "سرمہ" جیسی رومان انگیز نظموں کے ساتھ ساتھ مولوی، چنگی، محرّم، خانقاہ، مشاعرے جیسی اصلاحی طنزیہ اور سبق آموز نظمیں بھی ہیں۔ گو یہ نظمیں بیانیہ طرز کی ہیں لیکن ان میں زور، ترنم اور برجستگی سب کچھ موجود ہے۔ اکثر نظمیں تنقیدی اور واقعاتی ہیں مگر شاعرانہ حیثیت سے "رام گنگا" اور "حافظ رحمت خاں" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بہرحال یہ چھوٹا سا مجموعہ دلچسپ اور قابلِ قدر ہے سماج اور اصلاح کا ذوق رکھنے والے اصحاب اس کا ضرور مطالعہ کریں۔

خواجہ معین الدین چشتی

یہ چھوٹا سا رسالہ اجمیر کے مشہور خواجہ غریب نواز کی مختصر سوانح عمری ہے، جس کو میر آحدی صاحب اجمیری نے مختلف اور مستند ذرائع سے مرتب کیا ہے، اور خواجہ صاحب کے متعلق غیر مسلم بزرگوں کی رائیں اور خیالات بھی درج کئے ہیں۔ آخر میں درگاہ شریف کا ایک مفصل نقشہ بھی دیدیا گیا ہے اور مختلف تعمیرات کے حالات مختصراً بیان کر دیئے گئے ہیں

میر صاحب نے اپنی چند نعتیہ، عشقیہ اور صوفیانہ غزلوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ بھی رشحات میر آحدی کے نام سے شائع کیا ہے، دونوں کتابیں چھ چھ پیسے کا ٹکٹ بھیجکر میر احدی صاحب، امراؤ علی ہاؤس اجمیر کے پتہ سے منگائی جا سکتی ہیں۔

غمِ احبابِ شاد

یہ چھوٹا سا رسالہ مہاراجہ بہادر سر کشن پرشاد شادؔ مرحوم کا سوگ نامہ ہے جس میں راجہ نرسنگھ بہادر خاؔلی نے بہت سی تاریخی رباعیاں اور نظمیں مہاراجہ شاد کے متعلق لکھکر اپنے دلی جذبات اور اخلاص و محبت کا اظہار کیا ہے

---

[1] کھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ، حجم تقریباً ۸۰ صفحات قیمت بارہ آنے، ملنے کا پتہ میزان الادب، ذخیرہ اسٹریٹ بریلی،

رسالہ کا نام بھی تاریخی ہے۔ جس سے مہاراجہ شاد مرحوم کا سن وفات ۱۳۵۹ھ نکلتا ہے۔ علی صاحب نے مہاراجہ صاحب مرحوم کے متعلق ایک پُردرد مرثیہ بھی لکھا ہے۔

بچوں کا تحفہ (حصہ دوم)

اس کتاب میں مولانا محمد شفیع صاحب نیّر استاد ماڈرن ہائی اسکول نئی دہلی نے بہت آسان اور سلیس زبان میں بچوں کے لئے مختلف عنوانات پر دلچسپ اور سبق آموز نظمیں لکھی ہیں۔ جگہ جگہ تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ کتاب ایسی ہے جو بچوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

ضخامت ۷۰ صفحات۔ قیمت ۵ ؍ ملنے کا پتہ:۔ مولوی محمد شفیع الدین نیّر کوچۂ تارا چند، دہلی

ہفتہ کی خبریں

حکومت یو۔پی نے جنگ کی صحیح خبریں پہونچانے کے لئے "ہفتہ کی خبریں" نام کا ایک اُردو ہفتہ وار اخبار جاری کیا ہے۔ حال ہی میں جنگ کی دوسری سالگرہ کے موقع پر اس اخبار نے اپنا "وی نمبر" نکالا ہے جو جنگ کے متعلق معلومات کا ایک گلدستہ ہے۔ اس نمبر کو تصویروں کارٹونوں اور مختلف طریقوں سے دیدہ زیب بنا یا گیا ہے۔ جگہ جگہ پر لڑائی کے متعلق تاریخی اہمیت رکھنے والی شخصیتوں کے خیالات بھی دے دئے گئے ہیں جب سے کنور جسبیر سنگھ صاحب نے اس محکمہ کا چارج اپنے ہاتھ میں لیا ہے پروپگنڈا کے کام میں ایک نئی روح پھونک دی گئی ہے۔ ہم اس نمبر کی کامیابی پر کنور صاحب اور دیگر کارکنان کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اس نئے نمبر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ضروری تصحیح

زمانہ اگست ۱۹۴۱ء میں صفحہ ۵۰ پر طالب صاحب کی غزل (قندپارسی) کے چوتھے شعر کا دوسرا مصرع غلط چھپ گیا ہے "طرّہ" کی جگہ "طرفہ" ہونا چاہیئے۔

زمانہ ستمبر ۱۹۴۱ء میں صفحہ ۱۵۲ کی آخری سطر میں بھی پوری ایک لائن چھپنے سے رہ گئی ہے۔ آخری سطر کی اصل عبارت یوں ہے:۔ "مضطر اُسکو سنکر نرجاست اور جوش تحسین سے بیقرار ہو گئے فوراً اٹھے اور حضرت صبا کو گلے لگا کر پیشانی چوم لی۔ اسکے بعد مجھے شعر سے زیادہ اس کیف تحسین سے مست و سرشار تھا، خود حضرت مضطر کی بھی ایسی ہی قدر کی گئی۔ اسی مقطع پہ شعر: یہ کیسے بال بکھرا ہے یہ کیوں صورت بنی غم کی" الخ۔ مضطر کا بتایا گیا ہے حالانکہ آغا شاعر دہلوی کا ہے۔ ناظرین درست فرمالیں۔

عرض حال

کاغذ کی بیحد گرانی کے علاوہ اس وقت سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اچھا کاغذ گراں قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہوتا ہے ہندوستانی ملوں کا کاغذ بھی کافی تعداد میں نہیں مل رہا ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں کے ایجنٹوں نے ہاتھ اٹھا لئے ہیں اور خردہ فروش دوگنی تگنی قیمت لینے پر بھی دو ایک ریم سے زیادہ دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ چنانچہ اس مہینہ بھی معمولی کاغذ پر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس وجہ سے ضخامت میں بھی کمی کرنی پڑی۔ ہماری مشکلات میں ایڈیٹر صاحب کی علالت نے اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو آئندہ دو ماہ تک لکھنے پڑھنے کی ممانعت ہے۔ اس اثنا میں ہم کو امید ہے کہ ناظرین انشا و چند دنوں موجودہ خامیوں کو نظر انداز کریں گے۔

ایڈیٹر صاحب زمانہ ان قدرشناس احباب کے تہ دل سے شکر گزار ہیں جنہوں نے اس علالت میں پرسش حالات کی۔ علالت کی وجہ سے بیشتر حضرات کے عنایت ناموں کا جواب دیا جا چکا ہے اگر اتفاقاً کسی صاحب کے خط کا جواب رہ گیا ہو تو اس فروگزاشت کے لئے ہم خواستگار معافی ہیں۔

منیجر زمانہ

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم

نمبر ۶	دسمبر ۱۹۲۱ء	جلد ۳۷

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

فی نمبر آٹھ آنے

محمد ... ... مہتمم

(جملہ حقوق محفوظ)



زمانہ

جلد ۷۷ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۶

محذوفاتِ شعر

(ازجناب جلالی شاہجہانپوری)

شعر اپنی اثرانگیزی کے لحاظ سے ازخود تیر و نشتر نہیں بن جاتا، بلکہ اُس کے لئے مختلف النوع صورتیں اختیار کرنی پڑتی ہیں، اس کے بعد جسم شعر میں جان پڑتی ہے۔ اُن میں سے ایک مشہور صورت حذف اجزار کی ہے۔ یہی چیز بعض صورتوں میں چمنِ شعر کی رنگینی میں سامانِ صدبہار پیدا کردیتی ہے۔ اور بعض جگہ اسی سے شعر کی ساری لطافت و رنگینی برباد ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ جو مضمون شعر میں بیان کیا جائے اُس کا اتنا حصّہ نہ چھوٹنے پائے جس سے شعر کا مفہوم متعین کرنے میں سامع کو ہفتخواں طے کرنا پڑے۔ کیونکہ عروس شعر کے حُسن میں صورت خرابی پیدا کردیتی ہے۔ بعض لوگ اس حذف کو اختصار لفظی سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بھلا اس اختصار سے کیا فائدہ جو فہم و خرد کی گرہ کشائی سے باہر ہو۔ شعر کی ادبی تعریف یہی ہے کہ "وہ کلام جس سے دل میں انبساط و ترنّم کی ایک رنگین لہر پیدا ہوجائے"۔ لیکن جب عقل و خرد کو موشگافیاں کرنی پڑیں تو لطف و انبساط کا تخیّل بھی موہوم، ایسے اختصار کو بلاغت کی اصطلاح میں ..ا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

نرگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

شاعر کا مدعا صرف یہ ہے کہ نرگس کا باغ میں آنا کسی طرح ٹھیک نہیں، کیونکہ یہ باغ میں آکر پھولوں

کا رس چُوسے گی نتیجہ میں اس سے شہد اور موم پیدا ہو گا موم سے شمع بنے گی، اور شمع پر پروانہ اپنی جان قربان کرے گا. گویا نگس کا باغ میں آنا حقیقت میں خونِ ناحق کا باعث ہے. شعر کے اندازِ بیان میں اس قدر پیچیدگی اور اُلجھاؤ ہے کہ محذوفہ اجزا تک رسائی ہر شخص کی قوتِ فہم کا کام نہیں۔

تا خاکِ کفِ پائے ترا نقش نہ بستند
اسباب تپ و لرزہ نداد ند قسم را

اِس کا مفہوم متعین کرنے کے لئے سب سے پہلے دو باتوں کا ذہن نشین کرنا ضروری ہے:۔

(۱) جھوٹی قسم سے تپ و لرزہ آجاتا ہے۔

(۲) ممدوح کے خاکِ پا کی لوگ قسم کھایا کرتے ہیں۔

اب شعر کا مطلب یہ ہوا کہ قسم میں یہ تاثیر کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھائے گا اُس کو تپ چڑھ آئے گی، اُس وقت سے پائی جاتی ہے جب سے ممدوح کے کفِ پا کا نقش زمین پر بنا، اب اگر کوئی ممدوح کے کفِ پا کی قسم کھا تا ہے تو اُس کو تپ آجاتی ہے، ورنہ پہلے جھوٹی قسم سے کچھ نہیں ہوتا تھا، اِس مضمون میں یہ حصہ کہ "جھوٹی قسم سے تپ و لرزہ آجاتا ہے" کہیں مذکور نہیں اور نہ شعر کے مذکورہ اجزا اس محذوفہ جز کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

عیش ایں باغ باندازۂ یک تنگ دل است
کاش گل غنچہ شود، تا دلِ ما بکشاید (قدسی)

شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا باغ ایک نہایت مختصر باغ ہے، اس میں صرف اس قدر وسعت ہے کہ ایک تنگ دل آدمی خوش ہو لے، اِس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ میرا دل بھی اس میں شگفتہ ہو اور پھول کی کلی بھی کھل سکے، بدیں وجہ شاعر آرزو کرتا ہے کہ کاش پھول کلی بن جائے اور میرے دل کی شگفتگی کے لئے بھی گنجائش نکل آئے. شعر کا یہ آخری حصہ فی بطن الشاعر ہے اور بظاہر کوئی قرینہ بھی موجود نہیں جو اس جزوِ محذوفہ کی طرف رہنمائی کر سکے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے (غالب)

شعر معنی آفرینی کے اعتبار سے اپنی جگہ پر بالکل مکمل ہے، لیکن اس کا آغاز اور تقریب کچھ اس طرح نظروں سے اوجھل ہے کہ شارحین نے اس کا حقیقی مفہوم سمجھنے میں بڑے بڑے مغالطے کھائے. مثلاً طباطبائی مرحوم لکھتے ہیں کہ "تجھ سے تو مجھے کوئی شکایت نہیں، لیکن نامہ بر کو میرا سلام شکایت آمیز پہنچا دینا"

مولانا حسرت موہانی رقم طراز ہیں کہ "نامہ بر سے میرا سلام کہیو، یعنی بطورِ طعن کے، کہ واہ کیا خوب ہمارا کام کیا"

دوسرے شارحین نے بھی اسی طرح کی قیاس آرائیاں کی ہیں جو حقیقت شعر تک کسی نوع نہیں پہونچتیں۔ چونکہ مصنف یہ سمجھتا تھا کہ آغاز اور تقریب کا سمجھنا دشوار ہے اس لئے اُس نے خود ہی شعر کا صحیح مفہوم سمجھانے کی کوشش کی، ملاحظہ ہو۔

"یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے، یعنی عاشق کو ایک قاصد کی ضرورت ہے، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے، ایک دوست اُس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اُس سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد الیہ ہے، میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر اُس کے ہاتھ خط بھیجا گیا قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا، قاصد مکتوب الیہ کو دیکھکر والہ و شیفتہ ہو گیا۔ کیسا خط، کیسا جواب، دیوانہ بن، کپڑے پھاڑ، جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس واقعہ کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے، کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر! اے ندیم! تجھ سے کچھ کلام نہیں، لیکن اگر نامہ بر کہیں ملے تو اُس کو میرا سلام کہیو، کہ کیوں صاحب! تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا۔"

اگر صرف الفاظ کی مدد سے اس شعر کا مطلب بیان کیا جائے تو محذوفہ اجزا تک رسائی بہت مشکل ہے کیونکہ اِن الفاظ میں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں، جو اِن اجزا تک ذہن کو پہونچا سکے۔

غم سے دل خون ہو، اور آنکھ میں صہبائے نشاط
یہ کہیں میرے ہی تخئیل کی پرواز نہ ہو

یہ شعر بھی مفہوم کے لحاظ سے دلکش ہے، لیکن بعض حصّے اس طرح فی بطن الشاعر ہیں کہ شعر ایک چیستان اور معمہ بنکر رہ گیا ہے۔ شعر کو بار بار پڑھیئے مگر اس کے تلمیحی مفہوم کی طرف عنانِ توجہ منعطف نہیں ہوتی۔ اور خصوصاً "یہ" کا مشارٌ الیہ تو صرف مصنف کے سمجھنے کی چیز ہے۔ مصنف کی زبانی شعر کا تلمیحی مفہوم سننے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ شاعر کو کسی وجہ سے یہ یقین ہو گیا کہ اُس کی محبوبہ اُس پر فریفتہ ہے لیکن مشکلات کے سربفلک پہاڑ حائل ہونے کی وجہ سے ملاقات کا تخیل...... محال و جنون، کاہشِ فراق نے اُس کے دل کا خون کر دیا ہے۔ حسنِ اتفاق کہیئے یا خوش نصیبی کہ ایک مرتبہ شاعر کو دیدار نصیب ہو گیا...... اور قریب سے، محبوبہ کی چشمانِ مست جوشِ نشاط سے چمک رہی تھیں، تبسم پیہم مسرتِ قلبی کا آئینہ دار تھا، رشکِ ماہتاب چہرہ پر شادمانی کی موجیں کھیل رہی تھیں، خوشی اور مسرت کا عالم دیکھکر شاعر کا حسرت زدہ اور اُمیدوں بھرا دل دھک سے ہو گیا، اُس کا خیال تھا کہ اندوہِ جدائی نے اُس کی محبوبہ کو غم سے نڈھال کر دیا ہوگا، آنکھوں سے حزن و ملال ٹپکتا ہوگا، مستی میں ڈوبے ہوئے چہرہ سے یاس و حسرت برستی ہوگی۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ اب اُسے خیال آیا کہ شاید میں خود فریبی میں مبتلا ہوں، شاید یہ محض میرے تخیل کی کارفرمائی ہے کہ میں نے اپنی محبوبہ کو اپنا والہ و شیدا خیال کر لیا ہے۔

اور یہ فرض کر لیا ہے کہ جس طرح غمِ جدائی اور اندوہِ فراق نے میری جان پر بنا دی ہے اُسی طرح اس نے بھی خون در جگر کر رکھا ہے۔ اگر غمِ الفت نے اُسے اِس درجہ غمزدہ بنایا ہوتا جتنا میں سمجھ رہا ہوں تو چہرہ پر آثار نشاط کا پایا جانا ممکن نہ تھا۔ دوسرے مصرع میں "یہ" سے شاعر کا مفروضہ مراد ہے کہ میری محبوبہ میری پرستار ہے اور غمِ الفت سے اُس کا دل بھی خون ہو گیا ہے۔"

جب تک سامع کا دماغ پوری طرح اس واقعہ سے واقف نہ ہو، اُس وقت تک اجزائے محذوفہ تک جو فی بطن الشاعر ہیں، ذہن کی رسائی ناممکن سی ہے۔ ایسے وسیع اور تلمیحی مفہوم کو شاعر کے موجودہ الفاظ پورے طور پر ادا نہیں کرتے اور نہ کوئی ایسا قرینہ موجود ہے جو صحیح مفہوم تک ذہن سامع کی رہنمائی کر سکے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مضمون کا اتنا حصہ صحیح طور سے محذوف مانا جا سکتا ہے جس سے معانی کے سمجھنے میں ناقابل فہم پیچیدگی اور ناقابل رسائی بُعد نہ پیدا ہو جائے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مضمون کے کسی جز کا چھوٹ جانا چمن شعر کی لطافت و تازگی میں سامانِ صد بہار پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اسی شرط کے ساتھ کہ شعر میں ایسے الفاظ یا جملے موجود ہوں جو ذہن کو جز محذوف تک آسانی سے پہونچا دیں۔ اگر ایسے الفاظ و اشارات موجود نہیں تو یقیناً کلام کی شگفتگی اور رنگینی میں کمی پیدا ہو جائے گی۔ مولانا حالی "مقدمۂ شعر و شاعری" میں لکھتے ہیں کہ "جو الفاظ حذف کئے گئے ہوں اگر وہ بغیر ذکر کے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں تو محسنات شعر میں شمار کئے جاتے ہیں۔"

حقیقت میں کلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ الفاظ مختصر سے ہوں اور مضمون وسیع۔ لیکن اس اختصار کے ساتھ مفہوم شعر میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہو۔ اسی چیز کے پیش نظر عربی ادب میں کلام خوب کی تعریف میں یہ مختصر سا مگر جامع جملہ کہا گیا ہے "خَیْرُ الْکَلَامِ مَا قَلَّ وَدَلَّ" یعنی بہترین کلام وہ ہے جس کے الفاظ قلیل ہوں مگر معنی کثیرہ پر دلالت کرتے ہوں۔ قلت الفاظ کے ساتھ معانی کثیرہ کی صحیح ترین مثال "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ" ہے، دنیا کے تمام نیک و بد اعمال گنا کر جزا و سزا کو بیان کرنا کتنا وسیع مضمون ہے لیکن صرف اس جملہ کے کہہ دینے سے معاً یہ تمام مضمون ذہن میں آ جاتا ہے کہ جو اعمال ہم یہاں کریں گے وہاں اُس کا ثمرہ ضرور ملے گا۔ دوسری مثال "کردنی خویش آمدنی پیش" ہے۔ الفاظ اتنے قلیل اور مختصر لیکن معانی میں کس قدر وسعت۔ اس ایجاز کی ایک قسم بلاغت کی اصطلاح میں ایجاز حذف کہلاتی ہے۔ جس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ کلام کا کوئی جز اس نہج سے محذوف ہو کہ جس کی طرف سامع کا دماغ کلام سنتے ہی منتقل ہو جائے۔ مثلاً:-

یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں اور یہ کیفیتیں
کون رہ سکتا ہے تیرؔ ایسے ساماں دیکھکر

...کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، عطر بیز اور فرحت آگیں ہوائیں چل رہی ہیں کیف و سرور کی بارش ہو رہی ہے، ہوا میں شراب کی سی مستی ہے۔ ایسے بہار بداماں اور میخانہ بدوش موسم میں ... کیسا کوتاہ قسمت ہوگا جو پینے اور پلانے کی آرزو نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ پینا اور پی کر بہک جانے کا سارا لطف اسی شراب پرور موسم میں ہے۔ شاعر نے اس آخری ٹکڑے کا شعر میں ذکر نہیں کیا۔ لیکن شعر کے اندازِ بیان اور اس کے سابق اجزا سے یہ محذوف جز ہر شخص کے دماغ میں آجاتا ہے اور اسی انداز نے شعر کے صہبائے حسن کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنا دیا ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیئے

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میں محبوب کے کاشانۂ دولت پر پہونچا تو پہلے خاموش رہا، پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا۔ لیکن جب شوقِ دیدار میں دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹنے لگا تو میں نے فرطِ شوق میں پاسبان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا، اس پابوسی سے وہ حقیقت واقعہ تک پہونچ گیا، اور اُس نے اس کے نتیجہ میں میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو اُس کو اس صورت میں کرنا چاہیئے تھا۔"

اس شعر سے نہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کہاں کا ہے اور نہ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ شوریدگیٔ عشق کی وجہ سے بیچارے عاشق کا کیا حال ہے، اور یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ پاسبان کے قدم لینے کا کیا نتیجہ ہوا۔ مگر "پاسبان" "گدا سمجھ کے" "مری جو شامت آئی" ایسے اجزا موجود ہیں جن سے اُن اجزاء کا بآسانی پتہ چل جاتا ہے جو بطنِ شاعر میں موجود ہیں۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

انسان جب گھر کی چار دیواری میں محصور رہتا ہے تو اُس کو دنیا و مافیہا کی مطلق خبر نہیں ہوتی، اور نہ دنیا کے ترقی و تنزل کے اسباب کی اس کو اطلاع ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر سوسائٹی کا کوئی فرد ترقی کے مدارج طے کرتا ہوتا ہے تو وہ بوجہ حسد اس کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن دوستی و مروت کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی قدر یہ بات اُس پر واضح ہوتی جاتی ہے کہ خود دنیا کی خوشحالی نتیجہ ہے صرف اُس کی محنت و کاوش اور تدبر و ذہانت کا۔ یہ تو جائے رشک بھی نہیں حسد کیا معنی۔ لہذا تم بھی وہی وسائل و ذرائع اختیار کرو تاکہ جن سے وہ بن آسودگی سے ہم آغوشی حاصل ہو سکے۔ اس شعر میں "اے مخاطب" کا ٹکڑا محذوف ہے اور گرمِ تماشا ہو اس پر قرینہ ہے۔

مجھ تک کب اُس کی بزم میں آیا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

شاعر کا بیان ہے کہ "مجھ کو بزمِ محبوب میں ہزاروں مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا، غیر نوازی تو ہمیشہ رہی لیکن میرے پاس کبھی جام نہ آیا، آج نہ معلوم ساقی اپنے دستور اور معمول کے خلاف یہ مہربانی کیوں کر رہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اُس نے شراب میں کچھ ملا دیا ہے، خواہ یہ ساقی کی شرارت ہو یا رقیب کی سازش" اِس شعر کا یہ حصّہ کہ "پھر آج دستور کے خلاف مجھ تک جام کیوں آیا" فی بطن الشاعر ہے، اور ذہن کی رسائی جزِ محذوف تک نہایت آسانی سے ہو جاتی ہے۔

دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے
ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا (حالی)

"اب دوستوں سے ملاقات نہ ہو سکے گی" اس جگہ محذوف ہے، اور مصرعِ اولیٰ کا اندازِ بیان اور الفاظ کی ترتیب اِس حذف پر قرینہ ہے۔

قاصد کو خط سمیت کیا پُرزے پُرزے ہائے
کیا جانئے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں

"اگر ایسا جانتا تو نہ لکھتا" اس جگہ محذوف ہے، قاصد کا خط سمیت پُرزے کیا جانا اور اندازِ تحریر پر اضطراب اس حذف پر قرینہ ہے۔

سخت شرمائے میں اتنا نہ سمجھتا تھا اُنھیں
چھیڑنا تھا تو کوئی شکوۂ بیجا کرتا

یعنی میں اپنے محبوب کو بہت سادہ مزاج خیال کرتا تھا، اِس لئے میں نے اُسے چھیڑنا چاہا تو سچی شکایتیں کیں کہ وہ اُن سے ناراض و شرمندہ نہ ہوگا، لیکن وہ سمجھ گیا اور بہت شرمایا، اب مجھکو افسوس ہے، اگر چھیڑ چھاڑ ہی مقصود تھی تو جھوٹی شکایتیں کرنی چاہیئے تھیں، اس صورت میں وہ شرمندہ بھی نہ ہوتا، اور چھیڑ چھاڑ کا لطف بھی قائم رہتا۔ اس مضمون کا یہ حصّہ کہ "میں نے اُس کو چھیڑا، اور سچی شکایتیں کیں" محذوف ہے، اور مضمون شعر کے بقیہ حصّے اُس کی جانب کھُلی رہنمائی کرتے ہیں۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

اس جگہ "لیکن" کے بعد "یہ بھی تم کو معلوم ہے" فی بطن الشاعر ہے، اور "لیکن" ہی اس جزوِ محذوف

پر قرینہ ہے

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا (میر)

مصرعۂ ثانی کے شروع میں "معلوم نہیں" محذوف ہے۔ اور شمع کا صبح تک سر دھننا اس پر دلیل ہے۔

خط لکھا اُس کو بہ اُمیدِ جواب
ہائے قسمت کا لکھا بھول گیا (نواب نصیر الدین خان خیال)

خط کا جواب "محال ست و جنوں" اس جگہ محذوف ہے اور مصرعِ ثانی اِس جزوِ محذوفہ کو صاف طور سے بتا رہا ہے۔

قندِ آمیختہ با گل نہ علاجِ دلِ ماست
بوسۂ چند بیامیز بدشنامے چند

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ "عاشق بیمار ہے، معشوق کو بھی معلوم ہوا کہ عاشق بیمار ہے اور دل کی بیماری ہے اس لئے وہ دوا کے طور پر گلقند لاتا ہے اور عاشق کو دیتا ہے، اب وہ محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ پھول جو قند کے ساتھ ملے ہوئے ہیں یعنی گلقند یہ میرے دل کا علاج نہیں ہے بلکہ اس کے لئے دوسرا ہی گلقند درکار ہے اور وہ یہ ہے کہ چند گالیوں میں چند بوسے ملا لو۔" اتنے وسیع مضمون کو دو مصرعوں میں ادا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں پر کلام کا ایک بڑا حصہ محذوف ہے، یعنی عاشق کا دل کی بیماری میں مبتلا ہونا اور معشوق کا اس سے واقف ہو کر گلقند لے جا کر دینا۔ لیکن کلام کی ترکیب ایسے منتخب الفاظ سے کی گئی ہے کہ ذہن فوراً غیر مذکور مضمون کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مثلاً "نہ علاجِ دلِ ماست" کا ٹکڑا صاف طور پر بتا رہا ہے کہ عاشق کو دل کی بیماری ہے۔ ورنہ علاج کی کیا ضرورت تھی۔

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اُس کے روبرو نہ گیا (میر)

مصرعۂ اول میں "کہنے کو" اور مصرعۂ ثانی میں "جب اُس کا سامنا ہوا" محذوف ہے اور دل میں مسودوں کا ہونا اور اُس کے روبرو پیش نہ جانا اِس حذف پر قرینہ ہے۔ اِسی مفہوم کو خود میر نے دوسرے انداز سے پیش کیا ہے لیکن وہ محذوفات جو طائرِ مضمون کو آسمانِ ہفتم پر پہونچا دیتے ہیں اس جگہ موجود نہیں اِس لئے شعر کے اثر میں کہ بائیت پیدا نہ ہو سکی۔

کہتے تھے اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے لیک
وہ آ گیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

اسی سے ملتا جلتا ایک اور شعر ہے:۔

کہتے تھے کہ یوں کہتے جو یار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

ان اشعار میں الفاظ کی بہتات کے بجائے اگر کچھ ایسے اجزاء محذوف ہوتے جو سامع کے دماغ کو اجزائے محذوفہ کی طرف منتقل کر دیتے تو ان اشعار میں بھی وہی اثر انگیزی اور کہربائیت پیدا ہو جاتی۔ اس سلسلہ میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ شعر کے محذوفات اسی وقت آسانی سے سمجھ میں آ سکتے ہیں جبکہ سلسلۂ مضامین سے صرف ایک سلسلہ حذف کیا جائے۔ اگر زیادہ سلسلے محذوف ہونگے تو ذہن کو اور اک شعر میں پریشانیاں اٹھانی پڑیں گی، کیونکہ اس صورت میں شعر کے معنی متعین کرنے میں پیچیدگی زیادہ ہو جاتی ہے اور ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا۔

اردو اور پرتگالی الفاظ

پرتگالیوں کو اپنے دوران اقتدار میں ہندوستانیوں سے تجارتی، مذہبی اور سیاسی حیثیت سے برابر سابقہ پڑتا رہا چنانچہ آج اردو زبان میں جو پرتگالی الفاظ مستعمل ہیں وہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ درحقیقت انگریزی کے بعد پرتگالی الفاظ کی تعداد اردو میں خاصی ہے۔ اردو نے اپنے دامن میں دیگر یورپین زبانوں کے الفاظ کو بھی جگہ دی۔ پرتگالی بعض پھلوں کے پودے یا بیج اپنے ساتھ لائے۔ ان کے پرتگالی نام کچھ تغیر کے ساتھ رائج ہو گئے اور آج بھی عام ہیں۔ مثلاً انناس (پرتگالی Anannas) سنترہ (پرتگالی Cintra) موسیمی (پرتگالی Mozambique) اکبر کی وفات کے بعد زراعت میں ایک نئی بات یہ پیدا ہوئی کہ تمباکو کی کاشت شروع ہو گئی جس کا علم ہندوستانیوں کو پرتگالیوں سے ہوا چنانچہ تمباکو اور ساگودانہ دونوں الفاظ پرتگالی ہیں۔ لباس کے متعلق بھی چند پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں داخل ہو گئے۔ مثلاً سایا (Saia) بٹن (Button) فیتہ (Fita) بعض چیزیں جو ہندوستانی گھروں میں ہوتی ہیں ان کے نام بھی پرتگالی ہیں مثلاً بالٹی (Baldi) بوتل (Bottle) الماری (Almario) میز (Meza)۔

ہماری زبان میں پرتگالی الفاظ کا تلفظ بہت کچھ بدل گیا ہے جس کی وجہ سے اب ہم ان کو اپنے الفاظ سمجھتے ہیں۔ مثلاً

اردو	پرتگالی	اردو	پرتگالی
مارتول	Martel	گنڈا	Gandaia
پادری	Padre	نیلام	Lelam
کارتوس	Cartouche	انگریز	Ingrez.

(عالمگیر)

میرے وطن

(از بابو اکرشن گوپال مغموم بی۔اے)

اے وطن! اے رشکِ جنّت! اے مرے ہندوستاں دولت و اقبال میں تھا تو کبھی فخرِ جہاں
وائے گردش! آج تو ہے کشتۂ تیغِ خزاں مدفنِ ویراں نظر آتا ہے تیرا بوستاں
پھر بھی اے میرے وطن! مجھکو محبت تجھ سے ہے[1]

صنعت و حرفت میں تھا لاریب اُستادِ زماں حکمت و علم و تصوّف میں تھا یکتائے جہاں
دورِ حاضر میں ہے کیا عبرت فزا تیرا سماں خوار تجھ سا اب نہیں کوئی ہے زیرِ آسماں
پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

آہ! وہ دن جب تو دستِ غیر سے آزاد تھا تیرا ہر فرزند عیش و حرّیت سے شاد تھا
راحتِ جاوید سے مسکن ترا آباد تھا لیکن اب بھولا ہوں جو رنگیں فسانہ یاد تھا
پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

قابلِ نظارہ تھی تیری بہارِ رنگ و بو خواب میں بھی غیر قوموں کو تھی تیری جستجو
بر سرِ بازار گو لُٹتی ہے تیری آبرو بہہ رہا ہے آج گو تیرے شہیدوں کا لہو
پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

ہند! تھا اِک دن مسلّم تیرے دہقاں کا وقار اُس کے بل بوتے پہ تھا تیری فضیلت کا مدار
داغِ عسرت سے ہے سینہ آج اُس کا داغدار گو نہیں دامن ترا بھارت اُسے جائے قرار
پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

وہ ترا مزدور، وہ اِک پیکرِ مہر و وفا جس کی ہمت سے ہوئی تعمیرِ ایوانِ بقا
آج ہے سرمایہ داری کے ستم میں مبتلا رو رہا ہے تو بھی اُس کے حال پر صبح و مسا
پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

چل رہی ہے ہر طرف جہل و تعصب کی ہوا ہو رہا ہے گل محبّت کا چراغِ پُر ضیا

---

[1] یہ مصرعہ میرے دوست مسٹر جگن ناتھ آزاد بی۔اے، خلف منشی تلوک چند صاحب محروم کا ہے۔ (مغموم)

ہندو و مسلم نے توڑا رشتۂ مہر و وفا — آشتی سے ہیں ترے فرزند نا آشنا
پھر بھی اے میرے وطن مجھ کو محبت تجھ سے ہے

خاک بر سر فکر روزی میں ہیں تیرے نوجواں — ہو کے بی۔اے، ایم۔اے بھی ملتی نہیں کوڑیاں
تنگ آکر تنگ دستی سے ہیں وہ آتش بجاں — آہ! اس پر بھی ستم کرتا ہے تجھ پر آسماں
پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

مفلسی گو کر چکی ہے بادۂ عشرت حرام — پی رہے ہیں روز و شب ہم تلخیٔ عسرت کے جام
جو تھے سلطانِ جہاں اب ہیں غلام ابنِ غلام — صبح ہے صبحِ الم اور شام ہے حسرت کی شام
پھر بھی اے میرے وطن مجھکو محبت تجھ سے ہے

قندِ پارسی

(از حضرت جلال الدین طالب)

لطف بر من کند و یا نکند — لطف باشد اگر جفا نکند
کن وفائے چو گفتمش گفتا — عمر ہرگز بکس وفا نکند
از تو اے گل دمے جدا باشم — پیشش ایں روز بد خدا نکند
ہر چہ خواہد بمن کند بختم — کاشش در عشق مبتلا نکند
آرزویم باں شود حاصل — بہر مرگم ازاں دوا نکند
آنچہ با من تو مہرباں کردی — آشنائی بہ آشنا نکند
دردِ عشقش دوائے دل باشد — دردِ مارا کسے دوا نکند
آں نگہ را حذر نگہ دارو — تیر از وے گہی خطا نکند
ہر کہ چشمش شدہ برویت باز — باز چشمش بما سوا نکند
اے صنم من زیادِ تو غافل — گاہ باشم دمے خدا نکند
در نہاں خانۂ دلم آید — از حیا گر بدیدہ جا نکند
کے پیامم برد باں بدخو — چوں ز کویش گذر صبا نکند
ما ز رسمِ وفا نمے گذریم — او وفائے اگر بما نکند
جانِ طالب بجو نمی ارزد — بہ تو آں را اگر فدا نکند

تین پتھر

(از رائے زادہ گوبند پرشاد صاحب آفتاب بی-اے، آئی)

کائناتِ عالم کی تکوین کا حال تو قدرت کی بے پایاں توانائیوں ہی کو معلوم ہوگا۔ لیکن کرۂ ارض کی ساخت میں اجزاء بانظم اور بے نظم کی زد جیہ تخلیق مشاطگی حُسن ازل کی رنگا رنگی پر دال ہے۔ اجزاء بے نظم کا تعارف عام طور پر جمادات کے نام سے ہوتا ہے جس کو علمی زبان میں ارضیات یا طبقات الارض بھی کہتے ہیں۔

طبقات الارض میں مٹی اور پتھر کے الفاظ سے کان ناآشنا نہیں ہیں۔ لیکن مٹی علمی نگاہ سے بے معنی ہے علم ارضیات پتھر ہی کے نام سے ہر چیز کو پکارتا ہے اور مٹی کو ایک عامیانہ لفظ سمجھ کر اس وجہ سے کہ وہ مرکب ہے اور ترکیبِ کلی میں ہمیشہ تنوع ہوتا ہے، اس لفظ کے استعمال سے کُلّی پرہیز کرتا ہے۔

اس علم میں پتھر سے مراد ہے عناصر کا ایک مجموعہ، خواہ اُس کی تجمیع کسی صورت سے کارخانۂ قدرت کے صناعوں نے کی ہو۔ لیکن پتھر بنظر علمی ہمیشہ مرکب شئے سمجھا جاتا ہے۔ اِلّا نہایت خاص حالتوں میں اور وہ بھی اس وجہ سے کہ کانوں میں صنّاع ازل نے اُس کی خالص تشکیل و تکوین کی زحمت برداشت کی ہے۔ چنانچہ اس معنی میں معدن اور پتھر ایک ہیں۔

لیکن عامیانہ زبان کی مرادوں سے ہم اپنے مضمون کا دامن خالی نہیں رکھنا چاہتے اس لئے زیر بحث تین پتھروں کے ذکر میں قارئین کرام کو اجازت دیتے ہیں کہ مفہوم لفظ پتھر میں تحجر قدرتی اور احساس سختی کا مفہوم فی الباطن اور مفہوم فی الخارج اپنے دماغوں میں مصوّر ہونے دیں۔

آسمان ارضیات کی یہ تین تجلّیاں قوت برقی کی طرح ہفت اقلیم پر اپنے اقتدار وسیع کی شعاعوں سے سحر کی بالعمل ہیں، اور بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوکر اپنی جلوہ گری سے انسانی نگاہوں کو خیرہ کرتی رہتی ہیں۔

یہ تین پتھر ہیں:- (۱) آہک (چونہ)

(۲) بلّور اور

(۳) کرن (کرنڈ)

اور ہم ان افراد ثلاثہ سنگین کو جُدا جُدا خلعتِ تحریر سے سرفراز کرنے کا ارادہ بطریق ذیل رکھتے ہیں:-

آہک:- آہک وہی زہر ہے جس کو ہندوستان کی کثرت آبادی اپنی آرایش جسمانی کے اہم جسزو

حسن افزا یعنی پان کے ساتھ روزانہ کھائی رہتی ہے۔ اور جو جدید علم التغذیہ کی رو سے صحتِ انسانی کے ایک بنیادی پتھر ہے جس کو خمیرۂ مروارید اور دوسری طبی ترکیبوں میں اطبا اسلامی دور کی مسلسل تار ام کا ہدایتوں سے پیمانۂ قوت کی ساقی گری کا جوہرِ خاص سمجھتے آئے ہیں اور جس کو برطانوی حکومت اور دورِ حاضرہ کے ارتقا پذیر علم ادویہ سازی میں کیلشیم کے پُرزور نام سے جامۂ ترکیب پہنایا جاتا ہے۔

یہی وہ واصل سخت و کرخت ہے جو دنیا کے سخت سے سخت افراد کو اس طرح وصل و پیوند کر دیتا ہے کہ وہ قیامت تک نہیں بچھڑتے۔ اور اس کے اس عمل وصل میں قضا و قدر کی حیرت انگیز صناعیوں نے یہ خاصیت ودیعت کی ہے کہ گُنگی و امتداد زمانہ اس کو بہت زور سے چمٹنے اور گرفت کو قوی کرنے کی سہولت امتیازی دیتا ہے۔ اس کا سوز دروں قوائے وصل کی گرمی کو تیزی بخشتا ہے اور اسی کے وسیلہ سے دورِ سابق کے تمدن و معاشرت کی یادگاریں دورِ حاضرہ کی پناہ میں آکر شرف میہمانی سے ممتاز ہوئی ہیں اور اسی کی گرم رفتاری اور آتش پائی سے شہریت کی عظیم الشان بنیادیں آسمان سے سرگوشیاں کرنے لگی ہیں۔

تعمیراتِ عالم میں چونہ اور چونہ کے مرکبات نے سلطنت بابل کے باغاتِ معلق اور دورِ عمرانی کے اہرام مصر سے لے کر فارس کے تختِ مرمر اور ہندوستان کے روضۂ تاج گنج تک حسنِ عالم کی مشاطگی میں حصۂ اکثر لیا ہے اور اب سائیڈ و اور آتش بافتہ حالت میں سیمنٹ بنکر نہر سوئز اور نہر پناما اور سوئزر لینڈ کی سُرنگ سے لیکر لندن نیویارک۔ ٹوکیو اور دوسرے دارالامارات کی تعمیر تک سیکڑوں آرائشوں اور ہزاروں زیبائشوں کے ساتھ چہرۂ عالم کو دلھن کی طرح آراستہ کیا ہے۔

اجزائے عاملہ آہک کی تحریک انسانیت پروری دنیائے نباتات پر بھی دست شفقت دراز کرتی ہے۔ چنانچہ فرشِ زمین پر قوائے نمو کے جو قالین میزبانِ فطرت نے بچھائے ہیں اُس کی آب و تاب کے انواع رنگ تدبیر آہک ہی کی سلسلہ جنبانی کا نتیجہ ہیں، اور تغذیۂ نباتی کے معدنی کھادوں میں آہک کو طرۂ امتیاز حاصل ہے۔

اس کے سوز دروں کی جزرومد افزائیاں عجائب خانۂ قدرت میں جاذبِ نظر ہیں۔ چنانچہ یہ کبھی (فائر اکسٹنگوئشر) (Fire Extinguisher) آلات نار کُش بنا کر دیدۂ اتفاقات سے نگاہِ قہر پڑا لیتا ہے۔ اور کبھی مصالحۂ نور افزا کاربائڈ (Carbide) کی ساخت سے محافلِ انسانی کو جلوۂ چراغانی اور ضیائے شادمانی بخشتا ہے کبھی نقش و نگار منوعہ کی حسین سجاوٹوں سے سطح سادہ و سطح روغنی میں رنگ بھرتا ہے۔ اور کبھی عمل ہائے مختلفہ کے ماتحت مصوری کے فنِ لطیف کی دستگیری و اعانت پر آمادہ ہوتا ہے۔

حالتِ خلوص میں آہک کے سنگِ آبدار، قوتِ خورد بینی کی افزائش سے نگاہِ تحقیق کا دامن تھام لیتے ہیں۔ اور اگر کہیں جم کر بیٹھ گئے تو مرمریں فرش کی آب و تاب کا جلوہ پیش نظر

کردینا۔

یہ اپنے ہم نشینوں کے اثرِ صحبت سے اگر متاثر نہ ہوں تو حسن رواداری مٹ جائے۔ چنانچہ تاثراتِ ہم نشینی سے فیضیاب ہوکر مختلف رنگ آفرینیوں سے نہ صرف اپنے آپ حُسن کی آرایش کرتے ہیں بلکہ حسینانِ عالم کے گلوئے خوش آواز میں ہار بن کر شائستگیِ زیور کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ اور آئینہائے حسن نما اور تصویر ہائے حیرت افزا کی ترفیع و تصفیع سے اور آرائشی اشیاء کے ارتقائے خوش نمائی سے بصارتِ حُسن کی سُرمہ کشی کرتے ہیں۔

آہک کا تنوّع آب و رنگ اور تجمّ جسم و سنگ آئینۂ فہرست ذیل سے عکس نما ہوگا:۔

آہک خالص	آہک آمیزشی
آئس لینڈ اسپار	ماربل
پرل اسپار	ہسلویائٹ
کیلسائٹ	لایم اسٹون
ایرد گونائٹ	لیتھو گرافک اسٹون
فائبرس اسپار	برائی لٹس
ماربل	جپسم
چاک	ٹوفیشیس لایم
	آرجیلیشیس لایم اسٹون

بلّور

جامِ بلّوریں میں ہے یوں کس شراب لالہ گوں   ہو جیسے کیفیت افزا نورِ سحر رنگِ شفق

حضرت شیخ محمد ابراہیم ذوق کے اِس جامِ شاعری کو جس آب و رنگ نے بھرا ہے وہی بلّور تو ہے جس کے چشمۂ فیض نے قارئین کرام کی پختہ نگاہیوں کو تجلّیات امدادی کے خلعتِ امتیازی سے سرفراز فرمایا ہے۔

آپ اس کو سنگِ بصری سمجھکر معالجۂ انسانی کے لئے مخصوص فرمائیں تو زیبا اور اگر عقیق یمنی تصوّر کرکے حلق عشاق کی تشنگی رفع کرنے کے لئے اُن کو لبِ یار کی خیالی تصویر پیش فرمائیں تو بجا یہی فادزہر اور زہر مہرہ بن کر تقویتِ قلب کا بنظرِ اطبّاء یونانی باعث ہے۔ اور یہی بنفشی شعاع کے معالجۂ جدید سے ڈاکٹروں کے زاویہ ہائے علاج کا مرکزِ انظار۔

اِسی نے ربعِ مسکوں کے اُن عظیم و وسیع صحراؤں کی تشکیل کی ہے جن کی ہواخواہی میں جادو کلام نسیم نے

یوں ٹپکا پڑتا ہے:۔

پانی کو پتا نہ تھا شجر کا فقط تھا نام جانور کا

اور اسی نے کثیر الوسعت اور عظیم الجسامت سمندروں کو آب بخشی ہے۔ جن کی آہستہ آہستہ سطح فرازی نے حضرت عیسیٰ نہیں بلکہ حضرت آدم کی آنکھیں دیکھنے والے زمانے کو پہاڑوں کی صنعت کا ازلی جلوہ اور آبی کرشمہ دکھایا ہے۔

اس بلور کی سخت طبعی کو صناع ازل نے اپنی آتش قہر کی حیرت کار فراوانیوں سے پگھلا پگھلا کر بہت نرم کرنا چاہا مگر اس کی سرکشیوں نے ندا کی طرح بازگشت کی اور مُلّا ظہوری کی ہم آواز ہو گئیں:۔

رود بوئے مشک و پرد رنگِ لعل نلکوری محال است تغیّرِ ما

پگھلانے کے بعد اس کے تحجّرِ سنگین کی سخت طبیعت کو دوبارہ مُلائم کرنے کی مساعی جمیلہ قضا و قدر کے قادر و توانا ہاتھوں میں زمین آسمان کے دو آسیائی پاٹ بناکر کارفرما ہوئیں اور آج تک بلور کی باریک سائیدگی میں مصروف ہیں۔ چنانچہ پردہ گیتی کی ہر مٹی اور ریت اسی راستے کی خاک ہے اور بحری ساحلوں کے اور پہاڑی دامنوں کے تمام سنگریزے اسی عمل ملایم سازی کے رہینِ منت ہیں۔ تاہم اندرونِ ارض کے قعر شیطانی میں مخفی تحجّرات بلور جو آج تک جابجا باندازِ سرکشانہ سطح زمین پر برآمد ہو رہے ہیں حضرت یاس کی بلند آہنگیوں سے اس طرح آواز ملا رہے ہیں کہ:۔

نہ چھپا پر نہ چھپا جوہر عالی نسبی یاس مٹنے پہ بھی سنگِ درِ جانانہ بنے

سختی طبع تو بلور کا عذر معشوقانہ تھا، ورنہ حُسنِ آب و رنگ کا جلوہٗ نمایاں دکھانے والی یہ عروسِ فطرت اپنے زیورِ طلائی کو پیرزال دنیا کے غارت گر ہاتھوں کو اُس وقت تک نہیں لٹانا چاہتی تھی جب تک اس بُڑھیا سے چکّی نہ پسوا لے۔

چنانچہ ہر کانِ طلا بلور کے حسن آب ورنگ سے جلوہ فرا نظر آنے لگی اور ہر جگہ ایک دنیا سونا برآمد کرنے کے لئے چکّی پیستی دکھائی دے گی۔

صناعِ ازل اور مصنوع افضل کے اس راز و نیاز کو نظر مشاہدہ نے دیکھکر دو اصول فطرت تحقیق فرمائے، جن سے صنعتِ انسانی کے شاندار مستقبل کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ صناع ازل سے سنگِ بلور کا پگھلانا سیکھا اور مصنوع افضل سے سخت طبعی اور حجر سازی میں سبق آموزی کی۔ چنانچہ چونا اور سیمنٹ کی آمیزش سے سائیدہ بلور جسے عرف عام میں ریت کہتے ہیں عمارات عالیہ اور ستونہائے تعریہ کی پائداری و استحکام کا باعث ہے۔ اور شیشہ سازی اور اعلیٰ درجہ کی کٹھالی میں پگھلنے کی خاصیت سے آلاتِ روشنی

ثروت اور سیکڑوں خدمات نمایاں انسان کی کر رہا ہے۔

اور اب جبکہ قدرتی رنگوں کے کیمیائی تجربہ سے دورِ حاضرہ کی ایجادات آب ورنگ نے نقلی جواہرات بنانے کی صنعت کو میزانہ فروغ بخشا ہے، حسن اور حسن افزائیوں کی خدمت گزاریوں میں بلور طرۂ امتیاز سے بہرہ ور ہے۔ اور ماہرینِ سائنس اس کی سخت طبعی کی افزائش میں دست گیری و اعانت پر آمادہ ہیں تاکہ اس کی جلائی استعداد میں ترقی ہو اور گھسائی کی قوتوں میں اضافہ۔

بلور کا تنوع آب ورنگ اور تجزٔ جسم و سنگ آئینۂ فہرست ذیل سے عکس نما ہو گا:۔

بلور خالص	بلور آمیز شئی
	کوارٹز
	چیلی ڈونی
راک کرسٹل	جاسپر
ایمی تھسٹ	پلیزما
	بلڈ اسٹون
	اگیٹ
کارنی لین	اوپل
نیچرل سلیکا	اونکس
کرسٹل کیٹس آئی	جیٹ
	سینڈ اسٹون
	سینڈ
	ارتھ
	ڈڈ فوسل

کرُن

کارخانۂ قدرت کی مصنوعات میں فلزات کی اہمیت کے بعد کرُن کی اہمیت کا درجہ ہے۔ اور قیمت مایہ سب فلزات پر فوقیت رکھتا ہے۔

اس کی سختی نو درجہ کی ہوتی ہے اور سوائے الماس کے کرُن کی سختی کا دنیا میں مقابلہ کرنے والا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے کرُن کو ہر ور کی دریوزہ گری کے لئے پیدا نہیں کیا ہے اور مقامات

خاص میں یہ بیش قیمت پتھر دستیاب ہوتا ہے۔

ہندوستان میں یہ جا بجا دستیاب ہوتا ہے، خصوصیت سے جونپور اور ریاست ریہن اور برہما میں اس کی کثرتِ وقوع نے نیلم اور یاقوت کی کھدانیں برآمد کی ہیں۔ جن سے لاکھوں روپیہ کی آمدنی ہو چکی ہے۔ حال میں ریاست کشمیر میں بھی اس کا پتہ چلا ہے اور نیلم کی کھدان بھی دستیاب ہوئی ہے۔

یہ پتھر ہر رنگ کا ہوتا ہے لیکن سُرخ رنگ یاقوت میں پہونچکر کھل جاتا ہے۔ اور نیلا رنگ نیلم میں جا کر تاج پہنتا ہے۔

اس کے سوا سفید، زرد اور سیاہ و سبز رنگ بھی شاذونادر ملتا ہے اور بڑی قیمت دلاتا ہے۔

کُرنڈ عموماً فسان بنانے کے کام آتا ہے اور جواہرات تراشنے اور جِلا دینے اور مختلف گھسائیوں میں مستعمل ہے۔

اب مختلف اقسام کی آریاں اور گھسائی کے کاغذ اور گھسائی کے آلات بھی اس سے بنائے جاتے ہیں

قندِ پارسی

(از مولانا جلال الدین صاحب طالبؔ)

دل برد از من طرفہ نگارے — در حُسن نورے در خوئے نارے
قدِ بلندش آزاد سروے — طرزِ خرامش موجِ بہارے
از روشِ نیکو مصحف بگردن — وز خال ہندو کافر دیارے
درجِ دہانش درجے ز گوہر — بر رو نوشتہ خطِ غبارے
برقِ درخشاں آں فرقِ روشن — زلفِ سیاہش بر دوشِ مارے
از خندہ روئے برغیر گلشن — وز شعلہ خوئے بر من شرارے
از لعلِ لبہا معجز نمائے — وز چشمِ جادو چوں سحر کارے

صبر و قرارے از وے چہ جوئی
طالبؔ ندارد صبر و قرارے

شاعر

(از پنڈت جیمنی سرشار، خیرپور سادات)

ہمنشیں! کیا پوچھتا ہے کیا بتاؤں کیا ہوں میں
درد کی تصویر ہوں، احساس کا پُتلا ہوں میں

دہر میں آیا ہوں، رنگ اپنا جمانے کے لئے
ذی خرد لوگوں کو دیوانہ بنانے کے لئے

وہ ملی توفیق، حاصل اِتنی قدرت ہے مجھے
جس کی بیحد وسعتوں پر خود بھی حیرت ہے مجھے

ہے عبث یہ بحث، کیا ممکن ہے کیا ممکن نہیں
مَیں اگر چاہوں تو کوئی بات ناممکن نہیں

خاک کے ذرّوں کو یوں تابندہ کر سکتا ہوں میں
انجمِ افلاک کو شرمندہ کر سکتا ہوں میں

قبضۂ قدرت میں میرے بات ہے یہ بیگماں
آسمانوں کو زمیں کر دوں، زمیں کو آسماں

دل جو پتھر ہو اُسے پانی بنا سکتا ہوں میں
چشمِ تر سے اس کو بہنا بھی سِکھا سکتا ہوں میں

مَیں جو چاہوں سادہ پانی کی بھی وہ تعظیم ہو
اس کا ہر قطرہ جوابِ کوثر و تسنیم ہو

موت تک کو خوابِ غفلت سے جگا سکتا ہوں میں
زندگی کی آگ سینوں میں لگا سکتا ہوں میں

کارفرمائی تخیّل کی مرے دوزخ بہشت
یہ تمیزِ نیک و بد، لپست و بلند و خوب و زشت

ساکنانِ فرش سے کیا عرش کی باتیں کروں
فرش پر بیٹھا ہوں جب تو فرش کی باتیں کروں

انجم و شمس و قمر تاباں ہیں جو افلاک پر
میرے دل کے داغ ہیں یہ میری آہوں کے شرر

شب کے سناٹے میں جا کر باغ میں روتا ہوں میں
شبنم آسا ہر گل و غنچہ کا منہ دھوتا ہوں میں

جام میں میرے بھری ہے وہ محبت کی شراب
بوڑھے چہروں پر بھی جس سے لَوٹ سکتا ہے شباب

مُردہ جسموں میں نئی جاں ڈالنے والا ہوں میں
خونِ دل سے حسرتوں کو پالنے والا ہوں میں

زندگی تخلیق ہوتی ہے مرے مضمون سے
کیونکہ لکھتا ہوں اِسے اپنے جگر کے خون سے

رقص کرتے ہیں فرشتے بھی مری آواز پر
مَیں بقا کے گیت گاتا ہوں فنا کے ساز پر

سننے والے! دل کے کانوں سے مری آواز سُن
تجھ سے کہتا ہوں مَیں اپنی زندگی کا راز سُن

باندھنے والا طلسم الفاظ کا، ساحر ہوں مَیں
تو اگر اب بھی نہیں سمجھا تو سُن "شاعر" ہوں مَیں

روس کا انقلابی اِنشاپرداز

از جناب مائل نقوی صدر انجمن ترقی اُردو و سکرٹیری اُردو کانفرنس بھوپال

جدید روسی اَدب کو جس کی طرف مفکرین عہد حاضر کی توجہ نہایت سرگرمی سے مبذول ہے عالم وجود میں آئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اُنیسویں صدی عیسوی کا ابتدائی حصّہ اسکی پیدائش کا زمانہ ہے جس طرح ہندوستان میں موجودہ اُردو انشاپردازی کی ایجاد کا سہرا سر سیّد علیہ الرحمۃ اوراُن کے رفقائے کار کے سر ہے اِسی طرح روس میں جن مصنفین نے "جدید روسی ادب" کی داغ بیل ڈالی اُن میں پشکن، لیمانتوف، اور گوگال خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کے خیالات میں اسقدر زور اور طبیعت میں وہ روانی نہ تھی کہ یورپ کے مشرقی حصّہ سے اُٹھ کر اسکے مغربی حصّہ تک پہونچ سکیں۔ اِسی لئے برّ اعظم کا مغربی خطہ ان کے کارناموں حتیٰ کہ ناموں سے بھی بالکل ناآشنا رہا۔ انگلستان کا مشہور مصنف میتھیو آرنلڈ جو اِن لوگوں کا ہمعصر تھا اپنی ایک تصنیف میں ایک جگہ لکھتا ہے " سرزمین روس میں ابھی تک کوئی نامور شاعر پیدا نہیں ہوا"۔ اِسی طرح اُنیسویں صدی کا مایۂ ناز ادیب کارلائل جسنے اپنے ملک کے اَدب میں بہت سی مفید راہیں نکالیں اپنی کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں رقمطراز ہے:۔

"روسی قوم اگرچہ یورپ کے بیشتر حصہ کو اپنے زیر اقتدار کئے ہوئے ہے لیکن ادب وانشا میں اس نے کوئی قابل قدر چیز اس وقت تک دنیا کے سامنے پیش نہیں کی"۔

آخر کار قدرت نے ٹالسٹائی اور آئیون ٹرگنیاف کی صورت میں دو ایسے ادیب پیدا کئے جنہوں نے اپنے زورِ قلم سے دیرینہ ادبی جمود میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور جنکی ولولہ انگیز تصانیف روسی ادب کو بیرونی دنیا سے روشناس کرا کے اسکے لئے خراج تحسین حاصل کیا۔ انھیں کے نقش قدم پر چل کر روس میں انشاپردازی کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جسنے "روسی اَدب" کے نام سے دنیائے اَدب میں ایک جدید اور شاندار باب کا اضافہ کیا۔

آئیون ٹرگنیاف ۱۸۱۸ء میں روس کے ایک متمول خاندان میں پیدا ہوا۔ ابھی صغر سنی ہی کی منزل میں تھا کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ لیکن گھر میں دولت کی کمی نہ تھی اسلئے اس حادثہ کا اسکی تعلیم و تربیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ وطن میں ابتدائی تعلیم دلانیکے بعد اسے ماسکو، سینٹ پیٹرزبرگ (موجودہ لنن گراڈ) اور برلن کی یونیورسٹیوں میں داخل کیا گیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد انگلستان اور فرانس کی سیاحت کرائی گئی۔ اعلیٰ تعلیم

اور مشاہدات نے اسکی معلومات میں وسعت، خیالات میں رفعت اور ذہنی قوتوں میں نمایاں ترقی پیدا کردی۔

۱۸۵۲ء میں گوگال کا انتقال ہوگیا۔ ترگنیاف پر اس سانحہ کا سخت اثر ہوا اور اُسنے گوگال کی مدح و ستائش میں ایک پُرجوش مضمون شائع کیا۔ اسکے بعض حصے سیاسی مصالح کے خلاف سمجھے گئے۔ لہذا بطور تنبیہ حکومت روس نے ترگنیاف کو دو سال کیلئے اُسکی ریاست سے جلاوطن کردیا۔ یہ جلاوطنی اگرچہ ایک خاص مدت کے لئے تھی مگر ترگنیاف نے وطن مالوف کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیا۔ زندگی کے بقیہ ایام جرمنی اور فرانس میں رہ کر گزارے اور ۱۸۸۳ء میں اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوگیا۔

ترگنیاف ادبی دُنیا میں ایک شاعر کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ لیکن بہت جلد اُسے معلوم ہوگیا کہ جو عظیم الشان مقصد اُسکے پیش نظر ہے اُس کی تکمیل کیلئے شاعری زیادہ مفید ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس احساس کے بعد ہی اُسنے شاعری ترک کردی اور نثر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔

ابتدا میں اُس نے روسی کاشتکاروں کی المناک زندگی پر متعدد افسانے لکھے۔ حکومت کی گرفت سے بچنے کے لئے وہ ان مضامین کو "ایک اسپورٹسمین کے تاثرات" کے عنوان سے لکھا کرتا تھا۔ یہ تحریریں اگرچہ محض وقتی تھیں لیکن مصنفین کا عام طور سے خیال ہے کہ یہ افسانے فنی نقطۂ نظر سے مکمل ہیں۔ ہر افسانہ میں ابتداءً کاشتکاروں کی زندگی میں سے کسی ایک پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔ پھر مصنف کی شاعرانہ قوت سے اُسمیں وہ دلچسپی پیدا ہوگئی ہے جسنے ہر ایک افسانہ کو غیرفانی زندگی عطا کردی ہے۔ ان افسانوں کی زبان شستہ، خیالات دلآویز اور انداز بیان جوش سے لبریز ہے۔ ان کے الفاظ میں جو رُوح پوشیدہ ہے پڑھنے والے پر اُسکا برابر اثر ہوتا رہتا ہے۔ اور جسوقت وہ ایک افسانہ ختم کرلیتا ہے اُسکا دل کاشتکاروں کی تباہ حالی سے متاثر ہوجاتا ہے۔ اور سینے میں اُنکے لئے ہمدردانہ جذبات اُمنڈنے لگتے ہیں۔ ان افسانوں کی اشاعت سے رُوسی حکومت اور سماج کی بہت سی خطرناک خامیاں منظر عام پر آگئیں اور اُن ظلموں کا راز بُری طرح فاش ہوا جو عدل و آئین کے بہمیں پردہ کے پیچھے کاشتکاروں اور مزدوروں پر ڈھائے جارہے تھے۔

ترگنیاف سے قبل رُوسی افسانے مناظر قدرت کے عنصر سے بالکل خالی ہوتے تھے۔ اسکے کئی سبب بیان کئے جاسکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ رُوسی اہل قلم فطرت کی رنگینیوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ براؤننگ کی طرح وہ رُوح انسانی کی گہرائیوں میں اتنے ڈوب جاتے تھے کہ مناظر قدرت کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ ترگنیاف پہلا روسی ادیب ہے جسنے اپنے ملک کے ادب میں اس کمی کو محسوس کیا اور اپنی تصانیف میں بہت بڑی حد تک اسے پورا کیا۔ اسنے انسانی افعال و کردار کے بیان میں مناظر قدرت کو بطور پس منظر کے استعمال کیا۔

مذکورۂ بالا کے علاوہ اور بہت سے افسانے جو وقتاً فوقتاً اُسکے قلم سے نکلا ادبی اعتبار سے بہت بلند درجہ رکھتے ہیں لیکن اُسکی شہرت کا خاص سبب وہ چھ ناول ہیں جو اُس نے اپنی زندگی کے آخری تیس سال میں تصنیف کئے تھے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں :۔

۱- ریوڈن

۲- اے ہاؤس آف جنٹل فوکس

۳- آن دی ایو

۴- فادرز اینڈ چلڈرن

۵- اسموک

۶- درجن سوائل۔

ان ناولوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ٹرگنیاف کی ادبی مشق درجۂ کمال پر پہنچ چکی تھی۔ ان میں اسکی طبیعت کی روانی، فکر کی رسائی، خیالات کی بلند پروازی اور فکر کی شوخی ہر جگہ ظاہر ہے۔ انکی عبارت سے روسی زندگی کے مختلف شعبے ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ انقلاب یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے آتے جاتے ہیں جن سے باشندگان روس کی ذہنیت اثر پذیر ہو رہی تھی۔ ان کے مطالعہ سے اِسبات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک قادر الکلام ادیب پُر آشوب سیاسی دَور میں بھی کسطرح پبلک کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کا حق ادا کرسکتا ہے۔ اور کس خوبی سے اُن تاثرات کو منظر عام پر لاسکتا ہے جو ملک کی آزاد ترقی کے لئے عوام کے دلوں میں موج زن ہو رہے ہوں۔

ٹرگنیاف نے اپنے پہلے ناول "ریوڈن" میں ایک ایسے شخص کا کردار پیش کیا ہے جسے گویائی پر پوری قدرت حاصل ہے، وہ زبان وبیان کا مالک ہے، ہر موضوع پر ولولہ انگیز تقریر کرسکتا ہے اور اپنے پُر اثر بیان سے گردوپیش کے لوگوں کا اعتماد بھی حاصل کرلیتا ہے۔ لیکن جب میدان عمل میں اُترنے کا وقت آتا ہے تو سب سے پہلے راہ فرار اختیار کرتا ہے یعنی اُس میں زبانی جمع خرچ کے سوا عمل کا شائبہ تک نہیں ہے۔

اس قصہ میں وسط روس کے ایک علاقہ کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں ایک شریف خاندان خاتون اپنے ملک کی جدید تحریکات سے خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ ایک دن اُسکے ملاقات کے کمرہ میں ریوڈن نامی ایک نوجوان داخل ہوتا ہے۔ روس کے سیاسی مسائل پر دونوں میں تبادلۂ خیالات ہوتا ہے۔ نوجوان، آزادی کی قدر وقیمت

ـــــــــــــــ

لے A house of Gentle Folks. - Rudun

Smoke. Father & Children. On the Eve.

Vergin Soil.

حصولِ آزادی کے وسائل اور مغربی یورپ میں تحریکِ آزادی پر ایسی آتش فشاں تقریر کرتا ہے کہ اُسکے ہر لفظ سے صداقت، اولوالعزمی اور بے پناہ جوش و خروش کے شعلے نکلتے معلوم ہوتے ہیں۔ خاندان کے نوجوان افراد اُس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ اسکے جذبات کا احترام پرستش کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میزبان خاتون کی دختر نتیشے" نوجوان کے دامِ محبت میں گرفتار ہوجاتی ہے اور جذبۂ محبت اس درجہ ترقی کرتا ہے کہ ماں کی محبت، عزیزوں کی مخالفت، خاندان کی عزت سب کو پس پشت ڈال کر نوجوان کیساتھ بھاگ چلنے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ اسوقت وہ نوجوان سے دریافت کرتی ہے۔

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے"؟

نوجوان اُن مشکلات کے اندیشہ سے جو پہلے ہی قدم پر پیش آنیوالی ہیں ہمت ہار دیتا ہے اور جواب دیتا ہے:۔

"تقدیر کے مخالف خطا کے سامنے سرِ تسلیم خم کردینا چاہیے"۔

یہی شخص ابھی صرف چند لمحہ پیشتر سخت سے سخت مشکلات کا مقابلہ کرنے پر دھواں دھار تقریر کر رہا تھا اور یہی پہلی مشکل کے محض اندیشہ سے سر ڈال کر الگ جا کھڑا ہوتا ہے۔

انیسویں صدی کے ابتدائی چالیس سالوں میں روس کے اندر مفکرین کا جو عنصر سب سے ممتاز سمجھا جاتا تھا اسکا تمام سرمایۂ کمال محض زبانی تھا۔ عمل کے جوہر سے یہ گروہ یکسر معرا تھا۔ ریوڈن عملی لحاظ سے اگرچہ بالکل تہی مایہ ثابت ہوا تاہم ترگنیاف اسکا کردار اس صورت سے پیش نہیں کرتا جسے پڑھکر ناظرین کے دلمیں اسکی طرف سے جذبات حقارت پیدا ہوں۔ ریوڈن سماجی زندگی میں بہر حال ایک ضروری فرض ادا کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ترقی کی راہ میں سوسائٹی کا رہنما نہیں بن سکتا۔ تاہم اپنی پرجوش تقریر کے ذریعہ سے سوسائٹی کو شاہراہ ترقی پر گامزن کرنے کے لئے آمادہ ضرور کرسکتا ہے۔

ترگنیاف کا دوسرا ناول لے ہاؤس آف جنٹل فوکس" ہے۔ یہ ناول شائع ہوتے ہی اسقدر مقبول ہوا کہ اسکی شہرت ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچ گئی۔ جیساکہ ناول کے نام سے ظاہر ہے اسمیں بجائے فردِ واحد کے مختلف اشخاص کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ یہی سبب تھا کہ کثیر المقدار افراد میں جنکے طبائع میں زمین و آسمان کا فرق تھا اسے بیحد قبولیت حاصل ہوئی۔ اس ناول کا ہیرو لیوٹسکی اپنی ازدواجی زندگی میں نہایت بدنصیب واقع ہوا ہے۔ شریکِ زندگی کی بدزبانی نے اُسکی زندگی تلخ کردی ہے۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں میں نااتفاقی ہوجاتی ہے۔ لیوٹسکی ایک نوعمر دوشیزہ لیزا نامی کو اپنے سلسلۂ عقد میں لاتا ہے۔ یہ لڑکی صورت اور سیرت میں خداداد خوبیوں کے لحاظ سے اس عہد کی شریف سوسائٹی کا بہترین نمونہ ہے۔ عرصہ تک یہ دونوں لطف و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیزا کو اپنے شوہر کے پہلے عقد کی بابت مطلق علم نہیں ہے۔ یکایک لیوٹسکی کی پہلی بیوی اُسکی طرف

رجوع کرتی ہے اور اپنی مذموم عادات کے باعث چند ہی روز میں گھر کو دوزخ کا نمونہ بنا دیتی ہے۔ لیزا کو ان واقعات سے سخت صدمہ پہونچتا ہے۔ وہ تارک الدنیا ہو کر ایک خانقاہ میں گوشہ نشین ہو جاتی ہے۔

پہلے ناول کے ہیرو رودِن کی ناکامی کا سبب اُسکی فطرت میں عزم راسخ کا فقدان تھا۔ برخلاف اس کے لیوِرتسکی کا ارادہ مضبوط اور فیصلہ اٹل ہے۔ وہ ایک ایسے رہنما کا بھیس اختیار نہیں کرتا جو کہ خود گمراہی میں مبتلا ہو۔ بلکہ برعکس اسکے عمل کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے مگر ماحول کی خرابیاں اور خانگی پریشانیاں اُسکی ترقی میں سدِّ راہ بن جاتی ہیں اور ناکامی کا باعث ہوتی ہیں۔

اس کا تیسرا ناول "آن دی ایو" ہے یہ خیالات کی گہرائیوں اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے ایک خاص امتیازی شان رکھتا ہے۔ سرسری طور پر مطالعہ کرنے سے یہ ناول ایک پُرسکون روسی گھرانے کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دراصل اُنیسویں صدی کے ابتدائی پچاس سالوں میں روسی سوسائٹی کی جو حالت تھی ناول کی صورت میں اس کا ایک مکمل مُرقع تیار کیا گیا ہے۔ نوجوان دوشیزہ 'ایلینا' ناول کی ہیروئن ہے۔ ارادہ کی پختگی اور غیر متزلزل خلوص میں تو وہ لیزا سے مشابہ ہے مگر اور تمام باتوں میں اُس سے بالکل مختلف۔ لیزا سکون پسند طبیعت کی لڑکی ہے لیکن ایلینا کی فطرت سیماب وش واقع ہوئی ہے۔ لیزا کا اُصول زندگی "نیک بننا" ہے لیکن اسکا نظریہ حیات "نیکی کرنا" ہے۔ ایلینا خاندان کے حدود میں گھر کر زندگی بسر کرنے سے تنگ آچکی ہے اور اپنی خداداد قوتوں کے اظہار کے لئے وسیع تر فضا کی متلاشی ہے۔ ایک جگہ وہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے "انسان کے لئے صرف نیک ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اُس کا خاص وصف دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔"

یہ واقعہ ہے کہ ایلینا کے خیالات کی وُسعت اپنے زمانہ کی حد سے کسی قدر آگے ہے اور اُسکی گرد و پیش کے لوگ اس بلند سطح تک پہونچنے سے معذور رہیں۔ والدین کی نگاہ میں اُسکی حیثیت ایک لاینحل معمہ بنکر رہ گئی ہے جسکے سمجھنے سے وہ قاصر ہیں۔ اس لڑکی کے تین خواستگار پیدا ہوتے ہیں۔ شوبین۔ برسنیف۔ انسروف۔

شوبین ایک صاحب کمال مصور ہے لیکن اسی کے ساتھ ناز پروردہ اور تنک مزاج نوجوان ہے۔ اُسکی مثال اُس حسین تیتری کی سی ہے جو اتنی نازک ہے کہ نسیم شوخ کی بھی تاب نہیں لاسکتی۔ ایلینا کے مقصدِ حیات کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا اسکے امکان سے قطعی باہر ہے۔

برسنیف معقولیت پسند بے غرض اور سنجیدہ شریفانہ طبیعت کا مالک ہے لیکن جوشِ عمل اور جرأت سے یکسر معرا ہے۔

انسروف بلگیریا کا باشندہ اور اپنے وطن کا دلدادہ ہے۔ اسکے دل میں مادرِ وطن کی آزادی کا جذبہ موجزن ہے۔ یہ زبانی باتیں بنانے کے بجائے میدانِ عمل میں قدم بڑھانے والا نوجوان ہے۔ عزم و استقلال کا مجسمہ اور

رجحانات طبیعت میں ایلینا کا پورا جواب ہے۔ لازمی طور پر ایلینا کی نگاہ انتخاب اسی پر پڑتی ہے۔

جس وقت مصنف ملازمین کی زبانی ایلینا کی ارادی قوت، پختہ فطرت، بلند خیالات اور عمیق جذبات کا ذکر کرتا ہے اور اُس غم و ہیجان کی تصویر کھینچتا ہے جو تاثرات محبت نے اُسکے مضطرب دل میں برپا کر رکھے ہیں اُس وقت قلم کی روانی کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے۔ اس ضمن وہ نہایت خوبی سے اُن جذبات کی تصویر کھینچتا جاتا ہے جو اُس زمانہ میں روس کے نوجوان طبقہ میں ملکی ترقی کیلئے نہایت تیزی سے نشو و نما پا رہے تھے۔

ایلینا اس طبقہ کی علمبردار خاتون ہے اور یہ ناول باشندگان روس کے سامنے اس بات کی اپیل ہے کہ وہ اپنے دیرینہ جمود کو توڑ کر اُس فرسودہ آئین حکومت کا خاتمہ کر دیں جو نکولس اول کے عہد میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اور جو بوجہ تبدیلی حالات اب ملک کیلئے مضر ثابت ہو رہا تھا۔ اس بنا پر ٹرگنیاف کا یہ ناول "جدید روس" کے حالات اور اُسکی انقلابی ذہنیت کا مرقع ہے۔

"آن دی ایو" کے بعد ٹرگنیاف کا وہ معرکۃ الآرا ناول شائع ہوا جسے اسکی تصانیف میں شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ اس ناول کا نام "فادرس اینڈ چلڈرن" ہے۔ اس ناول میں اس کا شاعرانہ تخیل درجہ کمال پر پہونچ گیا ہے۔ یہ کتاب پلاٹ کی دلآویزی، زبان کی پاکیزگی، بیان کی ندرت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی صحیح تصویر پیش کرنے میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔ عبارت میں شروع سے آخر تک یکساں روانی ہے۔ کسی جگہ تکلف اور آورد کا گمان تک نہیں ہوتا۔ غیر ضروری اُمور اور طوالت سے پاک ہے۔

منجملہ متعدد افراد کے جو اس کے ارکان کا مرتبہ رکھتے ہیں قصہ کا مرکز نہلسٹ خیالات کے علمبردار بزرنی نامی ایک نوجوان کی شخصیت ہے۔ یہ دُرشت طبیعت انسان ہے جو کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتا اور کسی طاقت کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ نہ کوئی قوت اسے اپنی جگہ سے ہٹا سکتی ہے نہ کوئی مشکل اس کی محبت کو کمزور بنا سکتی ہے۔ یہ نوجوان اپنے ملک کے قدیم و جدید حالات کے درمیان کھڑا ہوا دونوں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ قدیم رسوم و رواج کو بکلی منسوخ کر دینا چاہیئے۔ اسکی بصیرت صاف طور سے مشاہدہ کرتی ہے کہ علوم و فنون جدیدہ کی اشاعت دُنیا کے لئے نئے زمین و آسمان کی تخلیق کر رہی ہے۔ وہ اس کام کی تکمیل کے لئے اپنی کوششوں کو پورے استقلال کیساتھ وقف کر دینا چاہتا ہے لیکن ایک نئی دنیا کی تعمیر سے قبل اسباب کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ قدیم تہذیب کے کھنڈر کو بالکل مسمار کر دیا جائے۔ اسلئے وہ ایک نہلسٹ کے لباس میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسکا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اُن تمام چیزوں سے ترک تعلق کر دے جنہیں عوام بوجہ قدامت تقدس مآبی کا درجہ دئے ہوئے ہیں۔ نوجوان عزم مستقل کیساتھ کام کر دینا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس جوش کیساتھ کہ تکمیل مقصد کی راہ میں محبت یا

خاندانی تعلقات کا سنگِ راہ ہونا برداشت نہیں کرسکتا۔ قدرتاً اُسے اُن بزرگانِ قوم کا مدِمقابل بننا پڑتا ہے جو قدیم رواج کے حامی ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ اُسے اُن نزاعات کا فیصلہ بھی کرنا پڑتا ہے جو معمّر اور نوجوان طبقوں کے درمیان رونما ہیں۔ اسی نازک موقع پر مصنف کی غیر معمولی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُسکے سحر کار قلم نے ہر فریق کی وکالت کا حق انتہائی خوبی سے ادا کیا ہے۔ ہر مسئلہ زیرِ بحث کی موافقت و مخالفت میں پُرزور دلیلیں پیش کی ہیں۔ ہر دعویٰ کی تائید و تردید میں فلسفیانہ اُصول سے بحث کی ہے اور شگفتہ و سنجیدہ تنقیحات کے ذریعہ ناظرین کو اُس مقام تک پہونچا دیا ہے جہاں وہ قدیم خیالات کی لغویت اور جدید تحریکات کی معقولیت کی نسبت خود فیصلہ صادر کرسکیں۔

یہ ناول اُس عظیم الشان تحریک کی اہمیت کا ایک خاکہ تھا جس کا جذبہ روسی سوسائٹی میں اندر ہی اندر ترقی کر رہا تھا۔ تحریک مذکور کا مقصد اس درجہ بلند تھا کہ اسقدر زمانہ گزر جانے اور اتنی ارتقائی منزلیں طے کر لینے کے بعد بھی روس ابھی تک اس بلندی پر نہیں پہونچ سکا ہے۔

باوجودیکہ ناول میں تمام تر پبلک کے احساسات اور مختلف طبقوں کے رجحانات سے بحث کی گئی ہے، مصنف کا کمال یہ ہے کہ شروع سے آخر تک کتاب کی ادبی شان میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے۔ اگر کوئی شخص واقعات مذکورہ سے خالی الذہن ہوکر محض ادبی نقطۂ نگاہ سے اس کا مطالعہ کرے تو یہ کتاب ادب کا مکمل نمونہ نظر آئیگی۔

یہ ناول انسانی فطرت کی صحیح تصویر ہے۔ شریف الطبع والدین کا اپنے بیٹے کی آئندہ فلاح و بہبود کیلئے تردّد، ہیرو کے دل میں نامعلوم طور سے محبّت کی نشوونما، جذباتِ محبّت پر غلبہ حاصل کرنیکے لئے اُسکی مردانہ وار کوششیں ان تمام باتوں کی تشریح میں فطرت انسانی کی مُصوری کا کمال دکھایا گیا ہے۔ آخر میں ہیرو کی ناگہانی موت اور اُسکی زندگی کے عظیم الشان مقصد کا نامکمل رہ جانا ایسے واقعات ہیں جنھوں نے اس کتاب کو عبرتناک ٹریجڈی بنا دیا ہے۔ ہیرو پُرجوش اُمنگوں اور بے پناہ ارادوں کو اپنے دل میں لئے ہوئے قبل از وقت قبر کی تنگ و تاریک کوٹھری میں سو جاتا ہے۔ اور اُسکی تمام مفتوحہ کامیابیاں موت کے ظالم پنجہ سے مغلوب ہوکر رہ جاتی ہیں۔

ترگنیاف کے قلم سے اسکے بعد جو دوسرا ناول نکلا اُس کا نام "اسموک" ہے۔ اس ناول کو کسی خاص توجہ کا مستحق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ "فادرز اینڈ چلڈرن" کی اشاعت پر ترگنیاف کی جو مخالفت ہوئی اور اُسکے خیالات کی جو غلط تاویلیں کی گئیں اُنھوں نے اُسکے جذبات کو بہت صدمہ پہونچایا۔ اسکے علاوہ ملک کی سیاسی فضا میں کسی اصلاح کے قبول کرنے کی ذرہ برابر صلاحیت موجود نہ تھی۔ ان سب پر طرّہ یہ ہوا کہ الگزنڈر کے استبدادی احکام سے روس میں رجعت پسندی کا دَور دَورہ شروع ہوگیا۔ اس حادثہ نے ترگنیاف

کی تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ مذکورۂ بالا ناول اسی عالم مایوسی کی پیداوار ہے اور یہی سبب ہے کہ ٹرگنیاف کی جملہ تصانیف میں اس کتاب کا لب ولہجہ بہت زیادہ تلخ اور دلخراش ہوگیا ہے۔

ٹالسٹائی نے اس ناول کی بابت جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ بہت صحیح ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"اسموک میں کسی شے کے لئے محبت و ترحم کا جذبہ بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ اس میں اہل روس کی رجعت پرستی پر ماتم کیا گیا ہے۔ پوری کتاب میں شاعرانہ تخئیل کا عنصر اس قدر کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔"

ورجن سوائل ٹرگنیاف کا ادبی کارنامہ اور اُسکے سلسلۂ تصنیف کی آخری کڑی ہے۔ "فادرز اینڈ چلڈرن" میں نہلزم کے صرف فلسفیانہ رُخ کو پیش کیا گیا تھا اور نہایت احتیاط کیساتھ جذبات و روایات کے بیان سے احتراز کیا گیا تھا۔ کیونکہ یہی چیزیں ہیں جو کسی قوم کی ترقی میں خاص طور سے حائل ہوتی ہیں۔ اس انداز تحریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناول کی اشاعت کے چند ہی سال بعد نہلزم نے ایک پُرآشوب و جنگ آور تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ ورجن سوائل کے صفحات پر اسی تحریک کی ابتدائی رفتار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔
جو کردار اس ناول میں پیش کئے گئے ہیں اُن کا مطالعہ مصنف کے اس کمال کی طرف چشمک زن ہے کہ اُن کے ذریعہ اُس نے روسی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کس خوبی کیساتھ پیش کیا ہے۔

اس ناول کا ایک کردار نتھڈان ہے۔ یہ ایک شاعر اور نیم ملوکیت پسند شخص ہے۔ اُسکے دل میں اپنے ملک کی ترقی و بہبود کا جذبہ پورے طور پر موجود ہے۔ مگر مخالف ماحول سے متاثر ہوکر جس میں اُسکی نشوونما ہوئی ہے وہ اپنی بلند شخصیت کو اپنے ہموطنوں کے درمیان متعارف کرانے میں ناکامیاب رہتا ہے اور اُسکی کوششیں برباد ہوجاتی ہیں۔

اسپلیگن ایک دوسرا شخص ہے جو چرب زبانی اور نمایش میں کمال رکھتا ہے مگر عمل سے کوسوں دُور۔ وہ اس شہنشاہیت کا عقیدتمند نمائندہ ہے جسکے خلاف تحریک معرض وجود میں آتی ہے۔

فاوش اور فلینوش قدیم خیال کا ایک جوڑا ہے جو جدید تحریکات اور مکدر سیاسی فضا سے علیٰحدہ رہ کر سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے پر قانع ہے۔

میرینا ایک نوجوان دوشیزہ ہے۔ یہ نہلسٹ خیالات کی سرگرم پیروکار ہے۔ صنفِ نازک کے جوان العمر طبقہ کی پیشانی سے بیکاری کا داغ دُور کرنیکی غرض سے جنگ آزادی میں دلیرانہ شامل ہوجاتی ہے۔

اس طرح متضاد طبائع کے رجحانات و مباحث کے ذریعہ ٹرگنیاف نے اُس عظیم الاثر تحریک کے مخالف و موافق پہلوؤں کو ناظرین کے سامنے پیش کردیا ہے جسنے متعدد ناکامیوں کے بعد آخرالامر روس کو

اُس درجہ پر پہونچا دیا جہاں آج ہم اُسے دیکھ رہے ہیں۔

سطور بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ ٹرگنیاف کی تصانیف کیا تاریخی کیا ادبی ہر لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ اسکے ناول اُس اُسّی سالہ روسی زندگی کے مرقعے ہیں جبکہ روسی سوسائٹی عظیم الشان سیاسی انقلابات میں سے گزر رہی تھی۔ ٹرگنیاف کا دل تعصب سے بالکل پاک تھا۔ اس لئے اُسکا دماغ معقول اور جدید خیالات کو قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اُسکی دوررس نگاہ ہر شے کے جزئیات تک پہونچ جاتی تھی۔ اُسکے تمام ناول اُس دور کے خیالات اور تحریکات کے فوٹوگراف ہیں جنہیں وہ مصوّر کے قلم سے تیار کرتا ہے اور جن میں شاعرانہ اعجاز سے جان ڈالتا ہے۔

کروپٹکن لکھتا ہے کہ "جذبات کی مصوّری ادبی صنعت کاری اور لطافت بیان کے اعتبار سے ٹرگنیاف روس کا سب سے بڑا ناول نویس ہے"

اس کی شگفتہ تحریریں ادب کی خوبیاں اس طرح پنہاں ہیں کہ سرسری نظر سے انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ گویا وہ پانی کا ایک شفاف چشمہ ہے جسکی دلکش سطح کا حُسن ناظرین کی نگاہ کو اپنی طرف اس طرح متوجہ کرلیتا ہے کہ اندرونی خزانوں تک پہونچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

ٹرگنیاف کا پلاٹ عموماً نہایت سادہ ہوتا ہے۔ واقعات کا تسلسل غیر معمولی خوبی کیساتھ جاری رہتا ہے اور اُن میں جدید حالات کا اس طرح اضافہ ہوتا ہے کہ ناظرین کا انہماک بڑھتا جاتا ہے اور واقعات کے چہرہ سے پردے اُٹھتے جاتے ہیں۔ پھر یکایک منظر تبدیل ہوتا ہے اور ایک ہیبت ناک ٹریجڈی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مگر مصنف کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ناظرین کو اس وحشت ناک منزل میں چھوڑ کر نہیں چلا جاتا بلکہ قصہ آگے چلتا ہے جس سے اُن کا احساس غم آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

اُسکے ہر ناول میں خواہ وہ ضخیم ہو یا مختصر مختلف اجزا کے تناسب و ترتیب میں ایک خاص تنظیم مدّنظر رہتی ہے۔ جب وہ کسی قصہ کو مختلف منزلوں سے گزار کر اختتام پر پہونچاتا ہے اُسوقت اُس کا کمال دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

یہ وجوہ ہیں جنکی بنا پر ٹرگنیاف کے ناول فنی زاویہ نگاہ سے مکمل اور حد درجہ قابل ستائش تسلیم کئے گئے ہیں۔ جب وہ کسی کردار کی انفرادی خصوصیات پر بحث کرتا ہے یا بحیثیت کسی جماعت کے نمائندہ کے اپنی جماعت کے اخلاق و عادات کا نمونہ پیش کرتا ہے تو ان موقعوں پر وہ مصوّری کا فرض پورے طور سے ادا کرتا ہے۔ جین آسٹن کی طرح وہ افراد ناول کے خیالات کو مکالمہ کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے خیالات کے متعلق اپنی رائے کا بھی اظہار کرتا جاتا ہے۔ لیکن یہ رائے وہ اُن لوگوں کی زبان سے ادا کرتا ہے

جو افراد ناول کے متعلق باہم تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔

ایڈورڈ گارنٹ لکھتا ہے کہ "الفاظ کے ذریعہ مصوری کرنا، مختلف کرداروں کا معقولیت کیساتھ ایک جگہ جمع کرنا، متعدد اشخاص کے متضاد تاثرات کو ترتیب دینا ایسی باتیں ہیں جو ریبی مصنفیں پر ٹرگینیاف کی فضیلت ثابت کرتی ہیں"۔ مثال کے طور پر ہم "آن دی ایو" کی ہیروئن ایلینا کو لیتے ہیں جسے مختلف الطبع خوستگاروں میں سے ایک کے انتخاب کا فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ والد کے دل میں اپنی لڑکی سے نفرت، ماں کی والہانہ محبت، برسنف کا اختلاف مذاق، شوبین کی تنک مزاجانہ نکتہ چینی، انسروف کا جذبہ آزادی اور وطن پرستی اور انجام کار اسی کا انتخاب یہ تمام صورتیں ایلینا کی روحانی گہرائیوں اور عدیم النظیر خلوص پر روشنی ڈالنے کے لئے بہم پہونچائی گئی ہیں۔

المناک واقعات کے بیان میں ٹرگینیاف، ڈکنس کی طرح بیکار طول نہیں دیتا۔ حادثات مرگ کے بیان میں وہ ہمیشہ جذبات پر قابو رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کے موقعوں پر وہ کوئی بات ایسی نہیں لکھتا جو مصنوعی یا خلاف فطرت معلوم ہو۔ مشہور مصنف بریلٹ ریز کا قول ہے کہ اپنی تصنیف میں بالزک جس جگہ غیر ضروری جوش کا اظہار کرتا ہے اور آزبیک ارادتاً چپ سادھتا ہے اور ڈکنس طفلانہ طور سے جذبات کو برانگیختہ کرنیکی کوشش کرتا ہے اسوقت ناظرین کو قدرتاً الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ٹرگینیاف کے یہاں کمال ہوشیاری کیساتھ ان تمام چیزوں سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ٹرگینیاف فلسفی کا دماغ اور شاعر کا دل رکھتا تھا۔ اُس کا انداز یہ ہے کہ اپنے ناولوں میں وہ اولاً عملی زندگی کے کسی خاص پہلو کو لیتا ہے۔ اور فلسفیانہ اصول سے اُس پر بحث شروع کرتا ہے۔ پھر دفعتاً اُس کے شاعرانہ تخیل میں تموج پیدا ہوتا ہے اور اپنے ناظرین کو خشک ریگزار سے نکال کر فردوس بہار میں پہونچا دیتا ہے۔ وہی افراد جو ابھی ہم ہی جیسی مخلوق معلوم ہوتے تھے یکایک فضائے قدس میں پرواز کرنے لگتے ہیں اور اپنے جمال سے دیکھنے والوں کو محو حیرت بنا دیتے ہیں۔

ہارڈی کی طرح ٹرگینیاف کا رجحان طبع غم آگیں واقعات کی طرف زیادہ پایا جاتا ہے۔ صبح لطافت کی بہ نسبت شام مصیبت کا رنگ اُسکے یہاں زیادہ نمایاں ہے لیکن اسی تاریکی میں کبھی کبھی اُمید کی کرن بھی اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ مثلاً "فادرز اینڈ چلڈرن" میں جہاں وہ اس منظر کو پیش کرتا ہے کہ بزروف کے غم رسیدہ والدین اُسکی قبر پر روزانہ آکر خوشبودار پھولوں کے پودے لگاتے ہیں اور اُسکی مغفرت کے لئے خدا سے دعا کرتے ہیں وہیں یہ سوال بھی کرتا ہے کہ "کیا اُن کے آنسو اور تمام دعائیں بیکار جاتی ہیں؟ کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ سچی اور مقدس محبت اپنے اندر کوئی طاقت نہ رکھتی ہو؟"۔ پھر خود ہی جواب دیتا ہے "وہ دل جو لحد کے اندر دفن ہے گناہوں میں خواہ کتنا ہی آلودہ کیوں ہو مگر قبر پر اُگے ہوئے پھول جو اپنی معصومانہ دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں وہ اُسکے ابدی سکون و راحت کی اطلاع دیتے ہیں"۔

ٹرگنیاف کے بعد روسی مصنفین کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جس نے اپنے لئے ادب میں نئے راستے نکالے۔ اُن کے ادبی ہنگاموں کے سامنے ٹرگنیاف کی شہرت عارضی طور پر دب سی گئی تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب ٹالسٹائی یا ڈاسٹائیفسکی کے طوفان ادب سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو ٹرگنیاف کا ادب کسی قدر مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شاعرانہ کمال کے نمونے اور سیاسی جماعتوں کے اختلافی نظریہ اور گوناگوں جذبات کے پیش کرنے میں اُس کا رُتبہ بہت بلند ہے۔ جب کبھی ادب کو فطرت انسانی کا ترجمان تسلیم کیا جائے گا اُسوقت ٹرگنیاف کے ناول عدیم النظیر قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اُن اُمور کو ظاہر کرتے ہیں جو زندگی میں لطافت، خیالات میں بلندی اور اخلاق میں پاکیزگی پیدا کرتے ہیں۔

جذباتِ محمود

نواب محمود علی خاں محمود

محبت کی فضا ہوتی، عقیدت کی زمیں ہوتی
وہیں اک آستاں ہوتا، وہیں مری جبیں ہوتی

تمہارے مسکرانے سے فضا ہنستی چمن ہنستا
کہیں ایسا فلک ہوتا، کہیں ایسی زمیں ہوتی

اگر دیوانگی عشق ہوتی راہ منزل میں
قدم میرے جہاں رُکتے میری منزل وہیں ہوتی

جھکانا سر کا ہر پتھر پہ توہین عبادت ہے
جہاں وہ سنگِ در ہوتا وہیں میری جبیں ہوتی

جلا کر راکھ کر دیتی حیاتِ عشق کو میرے
اگر کچھ سوزِ غم کے ساتھ آہِ آتشیں ہوتی

غمِ فرقت ہی کیا ہے دل کی دنیا تک بدل جاتی
نگاہِ ناز اُنکی گر محبت آفریں ہوتی

نہیں معلوم کبتک روتی رہتی عشق کی دنیا
جو میرا اشک ہوتا اور اُنکی آستیں ہوتی

وہ ہوتے اور ہم ہوتے نہ کچھ بھی رنج و غم ہوتا
ہمارا آسماں ہوتا ہماری ہی زمیں ہوتی

مریضِ ہجر کی محمود بس اتنی تمنا ہے
اُنھیں جب دیکھ لیتا تب نگاہِ واپسیں ہوتی

"مالن"

(از خان علی احمد خاں صاحب شاد عارفی)

للعجب! نیرنگیٔ قدرت کی ہر کاریگری
شوخیاں کرتی ہے کیا کیا فطرتِ شوخی طراز
"صحبتِ ناجنس بیدا نجیر" پر خنداں گلاب
تھوہڑوں میں "توتیا" جلوہ دکھاتا ہے کبھی
تیل کے پودوں میں پوشیدہ گلِ عباس! واہ

جا بجا خاکی پُتلیوں میں جلوہ فرما اِک پری
ہنس کوّوں میں نظر آتا ہے اور چیلوں میں قاز
بن کے اندر ڈھاک میں نازک چنبیلی پر شباب
بنجروں پر کاسنی بھی پھوٹ آتی ہے کبھی
نرگسِ خود رَو کے چہرے پر "پَنّدر[1] یا گھاس" واہ

التماسِ شرحِ بالا طول بے حاصل نہیں
طبقۂ ادنیٰ کی صنفِ نیم نازک اور حُسن
پھول والی ماہ پارہ دیکھتا ہوں جس کو روز
نوبہارِ ناز۔ گلزارِ نمودِ صُبح میں
پھول چُنتی ہے کسی شاعر کی تخئیلِ حسیں
یاسمن بن آئی ہے دوشیزۂ طرفِ چمن
پڑ گئی ہے جان قمری کی صدائے مست میں
وہ لباسِ مست جو بے مائگی سے چاک چاک
پیرہن "گردِ کثافت خواہ" سے وارستہ حال
جس میں زریں کاریٔ سوزن کی آرائش نہیں
جا بجا خاکستری چادر پہ دھبے تیل کے
پارہ پارہ آستینیں، کُہنیوں سے بے نیاز
نذرِ فاقہ۔ قیمتِ تزئینِ زلفِ گندہ بُو
اور۔ کیا تفصیل، سینہ بندِ خام انجام کی

حُسن اور تخصیص قوم و ذات میں قائل نہیں
موقع و ماحول پر کرتا نہیں ہے غور حُسن
مالنوں کی طرح مالن ہے مگر گلشن فروز
انکشافِ راز۔ انوارِ ورودِ صُبح میں
یا کسی زاہد کی موضوعِ عبادت۔ حورِ عیں
یا کسی مندر کا خواب آلود و مستانہ بھجن
نغمۂ ناہید آیا ہے "لباسِ مست" میں
جس کی رنگت پر غریبی ڈال دے گلیوں کی خاک
اِک صدی پہلے کا جیسے عاشقِ آشفتہ حال
پردہ داری پاؤں پھیلائے تو گنجائش نہیں
مائلِ وسعت لکد کوبِ زمانہ جھیل کے
جیسے بوسیدہ غلافِ ساز۔ عرضِ شکلِ ساز
عہدِ موجودہ کا جیسے شاعرِ پیچیدہ مُو
جیسے "دوبیتی[2]" مصوّر حضرتِ خیام کی

[1] ایک قسم کی گھاس۔ [2] رباعی۔

اِس بُری حالت میں صافی رنگ" لہنگے کے پٹاؤ
جیسے انگلستان کے نقشے میں ساحل کے کٹاؤ

سر بسر اضداد کے اوجھل میں ہیں اسرارِ غیب
شعر کیا، دنیا میں ملتا ہے "شتر گربہ" کا عیب

روشنائی ہے جہاں تک دیدۂ ادراک میں
چھپ نہیں سکتی صباحت ملگجی پوشاک میں

جذباتِ اثر

(از حضرت اثر رحمانی رامپوری)

خوگرِ دردِ عشق بن، کیفِ مدام ہے یہی
زیست کو پُرسکوں بنا، عیشِ دوام ہے یہی

بہرِ دلِ ستم نصیب، قید دوام ہے یہی
جس کی سحر نہ ہو کبھی، آہ وہ شام ہے یہی

گردشِ چشمِ مست ہو، دَورِ مئے الست ہو
مستِ الست کے لئے" بادہ بہ جام ہے یہی

میں ہوں اور اُن کی یاد ہے، دل ہے اور اُن کا درد ہے
دونوں کو ہے اگر کوئی کام، تو کام ہے یہی

دیکھو جسے وہ شاکیِ جور و جفائے دوست ہے
کارگہِ مجاز میں، شورشِ عام ہے یہی

دل سی عزیز چیز پھر ڈھونڈھے نہ ہاتھ آئے گی
اتنا سمجھ لو تم، اگر مشقِ خرام ہے یہی

خونِ جگر سمجھ کے ہم پیتے ہیں جس کو ہجر میں
زہر سے ہے جو تلخ تر، آہ وہ جام ہے یہی

عشق کی اوّلیں نظر، جا نہ سکے جو بے اثر
حسنِ تمام کے لئے، جذبِ تمام ہے یہی

کہتی ہے اُس کی چال ڈھال، یہ بہ زبانِ حال اثر
فتنہ طراز ہے یہی، حشر خرام ہے یہی

نگاہوں میں یہ رقص کرتی محبت
اداؤں میں یہ آرزو کی حرارت

ہر اک گام پر گنگناتی ہے فطرت
ہر اک موڑ پر مسکراتی ہے جنت

مجھے اور خیالِ جناں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

(نیا ادب)

ہمارے افسانے

(از سید مظفر برنی، بی۔اے)

ادب زیر و بم زمانہ پر رقص کرتا ہے اور سازِ حیات پر مضراب زن ہوتا ہے، اس لئے ادب اثراتِ زمانہ سے بیگانہ اور مظاہرِ حیات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ آج دنیا جس دَور سے گذر رہی ہے اُسے دَورِ استحالہ Transition Period کہنا چاہیئے۔ یہ دَور ہر مکمل انقلاب کا پیشرو ہوتا ہے۔ سیاسی نظریے، معاشرتی معتقدات، اقتصادی لائحہ عمل سب میں ایک نمایاں تغیر رونما ہے۔ زندگی کی بنیادی قدریں بدل رہی ہیں۔ شعر و ادب کے مسلمات یکسر منقلب ہو گئے ہیں، سماجی بندھن ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اخلاقی قوانین کی گرفت نرم ہو چکی ہے، مذہب کی نبضیں چھوٹ چکی ہیں۔ نورِ وحدانیت کو مادیت کی گھنگھور گھٹائیں گھیر رہی ہیں۔ تجارت کا بازار گرم ہے، سیاست کا بول بالا ہے، سائنس کا دَور دَورہ ہے۔ بہیمیت کی آندھی چڑھتی چلی آ رہی ہے انسانیت پیچھے ہٹتی جا رہی ہے۔ عالمگیر جنگ نے انسان کو دھے کے ٹکڑوں سے حقیر کر دیا ہے، ظالم و مظلومیت، آمریت و جمہوریت ایک ہولناک کشمکش میں مبتلا ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ پرولتاری[۱] طبقہ کو کچل رہا ہے۔ ایک کرب و اضطراب ایک عجیب بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دنیا کسی ہولناک بھنور میں پھنس گئی ہے۔ سیاسی قیود، اقتصادی مشکلات، تعلیمی پستی، سماجی افراتفری، روحانی جمود، اخلاقی کمزوریاں، لغو رواج، فرضی ڈھکوسلے، توہم پرستی قدامت پسندی وغیرہ اس سمندِ ناز پر تازیانہ ہیں۔

ہمارے[۲] افسانے ایک ایسے ہی دَور کی پیداوار ہیں۔ ایک ایسی ہی حیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ جدید افسانہ نگاری پر تین اثرات نہایت نمایاں نظر آتے ہیں۔ اول اشتراکیت کا اثر ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد کے نظریۂ اشتراکیت نے روس میں عملی جامہ پہنا۔ یہ اشتراکی انقلاب فرانسیسی انقلاب کے بعد پہلا انقلاب تھا جس طرح فرانسیسی انقلاب نے اس زمانہ کے شعر و ادب پر نہایت گہرا اثر ڈالا تھا اُسی طرح اس اشتراکی انقلاب نے بھی دنیا کے ادب کو کافی حد تک متاثر کیا۔ سوویٹ[۳] ادب، افسانہ نگاری میں بالخصوص دوسری مغربی زبانوں کے

۱؎ Prolelariate

۲؎ ان سے مراد جدید ترقی پسند افسانوں سے ہے نہ کہ اُردو کے تمام افسانوں سے۔ اس لئے آپ کو ممتاز افسانہ نگار حضرات پریم چند سجاد حیدر ملیدرم، نیاز فتحپوری وغیرہ کا قطعاً ذکر نہ ملے گا۔

۳؎ Soviet

ادب سے نہایت ممتاز ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روسی افسانے دنیا کی تمام زبانوں میں منتقل ہونا شروع ہوئے۔ اُردو بھی اس سے محروم نہ رہی۔ اُردو میں ٹالسٹائی، گورکی، ٹرجنیف، چیخوف وغیرہ مشہور روسی افسانہ نگاروں کے تقریباً تمام مشہور افسانے ترجمہ ہو چکے ہیں۔ گو ایڈگر ایلن پو، ہاتھورن، او ہنری، موپاساں، سٹیونسن، الیف۔ اے ڈبلیو مین وغیرہ شہرہ آفاق افسانہ نگاروں کے شاہکاروں سے بھی اُردو کا دامن تہی نہیں۔ لیکن روسی افسانے ہمارے ادب میں رچ گئے ہیں۔ اس کی چند وجوہات ہیں۔ جغرافیائی اختلافات سے قطع نظر ہندوستان اور انقلاب سے پہلے کا روس بہت حد تک مشابہ تھے۔ بلکہ مغربی ممالک میں سے اگر کوئی ملک ہندوستان سے مشابہ دنیا میں کہا جا سکتا ہے تو وہ روس پیش از انقلاب ہے۔ دونوں کی سیاسی و تمدنی حالت یکساں تھی۔ غرض ہمارے افسانوں میں اشتراکیت کی روح جاری و ساری نظر آتی ہے۔ اشتراکیت نہ صرف ایک اقتصادی لائحہ عمل کا نام ہے بلکہ ایک مسلسل جہاد ہے ہر اُس چیز کے خلاف جس نے سرمایہ دارانہ نظام کو استحکام بخشا۔ اس میں مذہب۔ اخلاق ادب، سب کچھ آ جاتا ہے۔ لہٰذا بغاوت کا جذبہ اشتراکیت کا جزو بن گیا ہے۔ بغاوت سرمایہ داری سے، قدامت پرستی سے، پُرانے رسوم و رواج سے، مزمنہ اخلاقی قوانین سے، مذہب سے، مختصر یہ کہ مکمل بغاوت، تمام مسلّمات سے اسی بغاوت کی جھلک ہمارے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔

دوسرا اثر افادیت (*Pragmatism.*) کے تجارتی نظریہ کا ہے۔ اب دنیا ہر معاملہ میں تجارتی سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ ہر چیز کی قدر و قیمت اس کے فائدہ کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ ہر شئے نفع و نقصان کے کانٹے میں تولی جاتی ہے۔ ادب کا بھی یہی معیار ہے۔ اگر ادب ہماری زندگی میں ممد و معاون نہیں ہو سکتا تو اس کی کوئی وقعت نہیں۔ اگر ادب سے فرد و جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا تو وہ بیکار، لغو اور تباہ کن ہے۔" ادب برائے ادب" کی بجائے "ادب برائے زندگی" کا نظریہ مروّج ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اب کوئی افسانہ نگار محض کسی اچھوتے پلاٹ کی خاطر افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ کردار نگاری کے لئے کسی اعجوبۂ روزگار فرد کی تخلیق نہیں کرتا۔ بلکہ وہ افسانہ کسی مقصد کے تحت لکھتا ہے محض تفریح کے لئے نہیں۔ وہ کوئی بلند مقصد، کوئی اصلاحی اشارہ کوئی بامعنی حقیقت پیش کرتا ہے۔

تیسرا اثر مشہور عالم ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ کے نظریۂ تجزیۂ نفسی[لہ] کا ہے۔ اس نظریہ نے تمام ادبیات کو متاثر کیا ہے۔ آج ہمیں اپنے افسانوں میں افراد کی ظاہری شکل و صورت، خد و خال، حرکات و سکنات کے علاوہ ان کے کیرکٹر کا نفسیاتی تجزیہ بھی ملتا ہے۔ گویا افسانوں میں نفسیات نگاری مخصوص حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ از ایں ہمارے افسانے واقعیت و حقیقت کے لحاظ سے عکسی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔

لہ Psycho-analysis

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے افسانے زندگی کے کن کن مسائل کو حل کرتے ہیں؟ سماج کے کن کن نقائص کو اُبھار کر پیش کرتے ہیں؟ اور وہ کس حد تک ہماری زندگی سے قریب اور ہمارے لئے مفید ہیں؟

ہماری زندگی کا سب سے اہم مسئلہ "مسئلہ شکم پُری" ہے۔ ہمارے افسانے ہندوستان کی اقتصادی پستی کے منھ بولتے مرقعے ہیں۔ ان کے کردار لکڑی ڈھونے والے مزدور، سڑک کوٹنے والی عورتیں، صبح سے لے کر رات تک مغز سوزی کرنے والے زرورو کلرک، ملوں کے دو دو چار چار آنے پر اپنے پھیپھڑے سڑانے والے کارخانہ دار، روٹی کے سوکھے ٹکڑے پر لڑتے والے انسانی درندے۔ غرض وہ تمام بھوک کے ننگے مجبور بیکس بے نوا انسان ہیں جو ہم روز اپنے آس پاس صبح وشام ہر جگہ ہر وقت چلتے پھرتے دیکھتے ہیں۔ ان میں منظر کشی کے لئے جھلسی ہوئی جھونپڑیاں، تنگ وتار کوٹھریاں، ٹپکتے ہوئے چھپّر، پاس پاس بنے ہوئے تاریک مکان جن کے بسنے والے قدرت کی نعمتوں ہوا، دھوپ اور روشنی سے بھی محروم ہیں، گندی گلیاں، بدبودار محلّے منتخب کئے جاتے ہیں ان کا پلاٹ کہیں خستہ حال نادار انسانوں کی سسکتی رینگتی کراہتی زندگی کی عکاسی کرنا ہے کہیں متوسط طبقہ کی مجبور ومقہور زندگی کا نقشہ کھینچنا۔ کہیں دولت کی غیر مساوی تقسیم اور سماجی طبقاتی تقسیم کی بے انصافی کا احساس پیدا کرنا۔ کہیں یہ واضح کرنا کہ دولت انسانی خوبیوں کی بنا پر نہیں بلکہ حادثہ پیدایش کی وجہ سے ملتی ہے، کہیں سرمایہ دار طبقہ کی بے حسی اور جمود کا نقشہ کھینچنا، کہیں ادنیٰ طبقے کو ان تمام انسانی صفات کا مالک دکھانا، جو اعلیٰ طبقہ میں احساس برتری اور رعونت و دولتمندی سے مٹ چکی ہیں

ہمارے افسانے جنسی زندگی کو بھی پہلی مرتبہ روشنی میں لا رہے ہیں۔ جنسی جذبہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے سگمنڈ فرائیڈ اور ہیولاک ایلس وغیرہ ماہرین جنسیات نے ثابت کیا ہے کہ شہوت و اشتہا ہی وہ دو اساسی جذبے ہیں جن کی مدد سے انسان ترقی کرتا رہا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سائینس، ادب اور تمام فنونِ لطیفہ اسی جذبۂ جنسی کا مظہر ہیں۔ جیسے سگمنڈ فرائیڈ کے نظریہ کے مطابق گریز و اعراض کہتے ہیں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ انسان حیوانِ عاقل ہے، جہاں تک "حیوان" ہونے کا تعلق ہے وہ جذبہ سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ مشہور انگریزی ادیب ڈی۔ایچ۔ لارنس کا قول ہے کہ زندگی میں جنسی جذبہ اور عقل کا غیر متوازی توازن ہی ہماری بہت سی ذہنی ونفسی عوارض کا باعث ہے۔ ہمارے افسانے جذبۂ جنسی کی عکاسی صرف اعصابی ہیجان پیدا کرنے کے لئے نہیں کرتے بلکہ وہ یا تو اس کے عجیب وغریب مظاہرات کی تصویریں ہیں جیسے سعادت حسن منٹو کا افسانہ "دلال" یا پھر ارذل نفس پرستی کو اس مقصد سے پیش کرتے ہیں کہ اس کی اصلاح ہو سکے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً جنسی فاقہ کشی[1]، غلبۂ جنسیت[2] یا میلان ہم جنسی[3] وغیرہ۔ اول الذکر کی مثال کرشن چندر کا افسانہ "قبر" ہے۔ اس کا ایک فقرہ نقل کردوں جو اگرچہ

Sex starvation [1] Morbid sexuality [2] Digreassion [a] Hamo-sexuality. [3] Over-sexuality [a]

ایک تلخ حقیقت ہے تاہم حقیقت ہے۔ افسانہ کا ہیرو کہتا ہے:۔

"پچیس چھبیس سال کی جنسی فاقہ پرستی کے بعد اگر ہندوستانی نوجوان کی زندگی میں ایک عورت آجائے، کوئی عورت، کانی عورت، لنجی عورت، ایک عورت جو تمہارے پرنانے سے بھی حسین ہو، لیکن ہو عورت، تو وہ کیوں نہ چوم چوم کر اس کا حلیہ بگاڑ دیوے"

غلبۂ جنسیت کے لئے محترمہ سروج ماتھر کا افسانہ "بے سرا" مطبوعہ سالنامۂ ادب لطیف" سنہ ۱۹۴۰ء ملاحظہ ہو، ایک جوان عورت جس کا خاوند بڈھا ہے ایک چینی تصویر فروش نوجوان کو اپنے گھر میں بلاتی ہے اور اُسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ غریب کچھ نہیں سمجھتا، عورت ایک آہِ سرد بھرتی ہے اور پھر ڈپٹ کر اسے نکال دیتی ہے اس میں دونوں پہلو فاقہ کشی اور غلبۂ جنسی نظر آتے ہیں۔ یہاں قدیم و جدید افسانہ نگاری کا فرق بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ منشی پریم چند نے بھی اس موضوع پر (جوان عورت کی بڑھے مرد سے شادی کر دینا) افسانے لکھے ہیں، اور اسی موضوع پر ڈاکٹر ٹیگور کے افسانے بھی اُردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں لیکن قدیم و جدید افسانہ نگاروں کے طرز میں فرق ہے گو اصلاح دونوں کے مدنظر ہے۔ جدید افسانہ نگار اس سوشل مسئلہ کو جنسیت کی روشنی میں اُجاگر کرتا ہے۔ اسی طرح مختلف افسانے جن کی بیباکی اور کبھی کبھی عریانی پر بڑی لے ہوتی ہے۔ اسی قسم کے مفید اصلاحی نکات پیش کرتے ہیں۔ میلان ہم جنسی پر چودھری محمد علی کا افسانہ "ہم جنس" دنیا (مندرجہ سالنامہ ادب دکلیم) اپنی طرز کا پہلا افسانہ ہے۔

ہمارے افسانے نہ صرف معمولی بیانیہ داستانیں ہیں جو وقت گزارنے یا دلچسپی کے لئے لکھی اور پڑھی جاتی ہیں، بلکہ یہ ہمارے سماج پر بے لاگ تبصرے اور ہماری زندگی کی ہمدردانہ تنقیدیں بھی ہیں۔ ان میں طنز کے زہریلے نشتر بھی چھپے ہوتے ہیں اور اصلاح کے بامعنی نکتے بھی۔ اس وقت میرے سامنے ادب لطیف فروری سنہ ۱۹۴۱ء ہے اس میں پہلا افسانہ محترمہ عصمت چغتائی کا ہے عنوان ہے "سفر میں" یہ افسانہ چلتی ہوئی ریل کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے مناظر کے پہلو بہ پہلو زندگی کی مختلف جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں پیش کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حیات کے مختلف تاریک پہلوؤں پر گہری طنز بھی ہے۔

علاوہ ازیں ہمارے افسانوں میں مقامی رنگ "بہت گہرا نظر آتا ہے جس سے ان کی واقعیت بڑھ جاتی ہے، ہندوستان جیسے وسیع ملک کے باشندے اپنے دوسرے ہم وطنوں کے طرزِ معاشرت و عادات و اطوار وغیرہ سے ناواقف ہیں اس لئے اس قسم کے افسانے ہماری نگاہوں کے سامنے ملک کے مختلف حصوں کی امتیازی خصوصیات، وہاں کے بسنے والوں کے رہنے سہنے کے ڈھنگ، ان کی عجیب و غریب رسموں اور ریتوں ان کی مخصوص عادات و اطوار کی تصویر پیش کر دیتے ہیں جس سے ہم میں ایک قومی قربت اور وطنی احساس

Local colour

پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بیدی کا "چھوکری کی لوٹ" اُپندر ناتھ اشک کا "ڈاچی" کرشن چندر کا "زندگی کے موڑ پر" ملاحظہ ہوں۔ مزید براں یہ اس وبا کے ردّ عمل کا نتیجہ ہے جس کے زیر اثر ہر افسانہ نگار اپنے افسانہ کا منظر کسی رومان آفریں اجنبی سرزمین میں رکھتا تھا۔ جو بعض دفعہ ناواقفیت کی وجہ سے مضحکہ خیز ہو جاتے تھے۔ ایک لسان القوم" افسانہ نگار صاحب نے اپنے ایک نہایت مشہور افسانہ کے منظر کے لئے مصر کی سرزمین منتخب کی اور فطری مناظر کے سلسلہ میں وہاں آبشار کا بھی ذکر کیا۔ جن لوگوں نے ابتدائی جماعتوں کا جغرافیہ پڑھا ہے وہ لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ مصر میں آبشار کہاں۔ بہرکیف یہ رُجحان ہر لحاظ سے مستحسن کہا جا سکتا ہے

مولانا محوی لکھنوی نے "زمانہ" کی کسی گزشتہ اشاعت میں اسی عنوان کے ماتحت لکھا تھا کہ آج کل افسانوں میں نوجوان لڑکے اور لڑکی کی نہایت تخئیل آفریں رومان پرور محبّت کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ معمولی یا بتدی افسانہ نگاروں کے افسانے اس قسم کی سستی رومان پرستی سے معمور ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مستند اور اعلیٰ افسانہ نگاروں کا تعلق ہے وہ اس الزام سے بری ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر و بیشتر ازدواجی محبت کا ذکر ہوتا ہے یا کسی گہری حقیقت کو مؤثر بنانے کے لئے محبت پس منظر کے طور پر پیش کی جاتی ہے، یا پھر محبت حقیقت و واقعیت پر مبنی ہوتی ہے محض ایک تخئیلی دنیا ——— خوابوں کی سی حسین دنیا ——— بنانا اور رومان آفریں فضا پیدا کرنا ان کا مقصد نہیں۔ ان کے افسانوں میں سماج کا کرب و اضطراب اور زندگی کے دل کی دھڑکن بند ہے۔ ان میں گہری حقیقتیں اور بنیادی مسائل ملیں گے۔

ہمارے افسانوں کا مرکز سماج کی کوئی نہ کوئی بُرائی ہوتی ہے۔ اس قسم کے اصلاحی افسانے منشی پریم چند آنجہانی نے لکھنے شروع کئے تھے، آج بھی تقریباً تمام افسانے کسی خاص مقصد کو مدنظر رکھکر کوئی سبق سکھانے اور کسی نہ کسی افادی نقطۂ نظر سے لکھے جاتے ہیں۔ اکثر افسانوں میں کوئی خاص آئیڈیل، کوئی نہایت بلند نصب العین بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اب تک جن افسانوں کا ذکر ہوا وہ ایسے تھے جن کو پڑھکر آپ کہنے لگتے ہیں۔ "اگر ایسا ہی ہے تو کاش ایسا نہ ہوتا" اب ان افسانوں کا بھی مختصراً ذکر کرنا ضروری ہے جن کو پڑھکر آدمی کہہ اٹھتا ہے" کاش ایسا ہی ہو جائے تو کتنا اچھا ہو!" اگر طب کے طلباء کو صرف بیمار جسم کی تصویریں کھائی جائیں تو وہ صحت مند جسم کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس لئے خیالی نہایت ضروری ہے۔ اُردو کے خیالی افسانوں میں نیاز فتحپوری کے افسانہ "شہاب کی سرگزشت کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ جدید افسانوں میں بھی اکثر خیالی افسانے ملیں گے۔ مثال کے طور پر علی سردار جعفری کا افسانہ "منزل" حب الوطنی کا وہ اعلیٰ آئیڈیل پیش کرتا ہے جس کے حصول کی خواہش ہمارے ہر بھائی بہن کے دل میں ہونی چاہیئے۔ اسی طرح علی عباس حسینی

Idealistic ۵۲

کے افسانہ "ہمسائی" میں طوائف کا جو کیرکٹر پیش کیا گیا ہے وہ ایک "خیالی" چیز ہے۔

آخر میں نقادوں کی ایک جماعت کے اس خیال پر اظہار رائے کی جرأت کی جاتی ہے کہ ادب جدید بہت حد تک ایک وقتی چیز اور نعمتِ دوام سے محروم ہے۔ ادب کی مثال ایک درخت سے دی جاسکتی ہے۔ جس طرح درخت اپنی خوراک زمین سے حاصل کرتا ہے ادب اپنا سامانِ بقا وارداتِ حیاتِ بشری سے حاصل کرتا ہے جس طرح درخت سورج سے روشنی لیتا ہے ادب اپنا رنگ و آہنگ زمانہ سے اخذ کرتا ہے، جس طرح درخت ہوا میں پھلتا پھولتا ہے اُسی طرح ادب ماحول کے زیر اثر تشکیل پاتا ہے۔ جس طرح درخت زمین کے ذرات روشنی کے اجزاء، اور ہوا کے اثرات کو پھل پھول میں تبدیل کر دیتا ہے اُسی طرح ادب زندگی کے مسائل زمانہ کے حالات اور ماحول کے اثرات کے مطابق نہایت عجیب انداز سے حل کرتا ہے۔ ادب کو محض اسی وجہ سے عارضی نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے جس حیات کی عکاسی کی ہے وہ حد درجہ تاریک ہے' یا جس زمانہ میں تشکیل پائی ہے وہ حد درجہ پست ہے۔ گلاب کا پودا کوڑے پر بھی اُسی نکہت کا مالک ہوتا ہے جو باغ میں پائی جاتی ہے اگر چارلس ڈکنس کے ناولوں اور افسانوں پر مُہرِ دوام ثبت ہے تو ہمارے افسانوں کے حیات کا دامن بھی دامنِ ابد سے وابستہ ہے۔ اگرچہ چارلس ڈکنس نے جس سوسائٹی کی عکاسی کی ہے وہ کبھی کی مٹ چکی، اور بہت سے مسائلِ حیات جن کو حل کرنے کے لئے اُس نے جد و جہد کی تھی وہ بوجوہ احسن حل کر لئے گئے تاہم ان میں وہ عناصر ہیں جو انسانی فطرت کے اساسی جذبات رنج۔ غم۔ غصہ، رحم، محبت اور نفرت کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ اور کرتے رہیں گے۔ اور اس لئے انھیں صرصرِ فنا سے مامون و مصئون رکھیں گے۔ ہمارے افسانے محض اس وجہ سے وقتی نہیں کہے جاسکتے کہ وہ زندگی جس کی یہ ترجمانی کرتے ہیں، خود حد درجہ مکروہ ناخوشگوار اور پست ہے اور یہ دَور بدل جانے والا ہے۔ جب تک ان میں سازِ قلبِ انسانی کے تاروں کو مرتعش کرنے کی قوت ہے وہ زندہ رہیں گے۔ ان کی بقا زندگی اور سماج کی بقا سے وابستہ نہیں ہے بلکہ ان کی بقا کی کفیل انسانی جذبات و احساسات ہیں۔ جب تک انسان میں ایثار و قربانی کا جذبہ موجود ہے، جب تک بے لوث خدمتِ قوم و وطن کا کوئی قصہ ہمارے دلوں کو گرماتا رہے گا یہ ہرگز صفحۂ ہستی سے محو نہیں ہوسکتے۔ بیدی کا "کوارنٹین" اشک کا "گوماں" علی عباس حسینی کا "باسی پھول" ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جب تک ازدواجی محبت باقی ہے بیدی کا "گرم کوٹ" باقی رہے گا۔ جب تک انسان کسی کی غربت دیکھکر کُڑھ سکتا ہے، جب تک انسان اخلاقی پستی پر نفرت سے بھویں سکیڑ سکتا ہے، جب تک ہم میں احساس کی آنچ باقی ہے ہمارے افسانے باقی رہیں گے۔ جدید افسانے پڑھنے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ ہماری زندگی کتنی دردناک ہے، ہماری کمزوریاں اور مجبوریاں کتنی بڑھ گئی ہیں، ہمارے سماج کی ہوا کتنی گندی

ہو چکی ہے کہ سانس لیتے دم گھٹتا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ کسی آزاد اور کھلی فضا میں سانس لیں اس وقت آپ مسز حجاب امتیاز علی کی کسی رومان آفریں کہانی کے لئے ترسنے لگتے ہیں۔ ہمارے افسانوں کی یہ کتنی بڑی کامیابی ہے کہ انھوں نے ہمارے احساس کی بجھتی ہوئی چنگاریوں کو چمکا دیا ہے، ہمارے سرد دلوں میں دھیمی دھیمی آنچ سلگا دی ہے۔ منشی پریم چند کا قول ہے "شعر و ادب کا منشا ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرنا ہے"۔ مجھے یاد ہے کہ میری ایک بہن نے جن کی دنیاوی واقفیت صرف کتابوں اور رسالوں تک محدود ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کی کتاب "دانہ و دام" واپس کرتے ہوئے کس قدر سچے درد، کیسے مایوس لہجہ اور کتنے گہرے احساس کے ساتھ کہا تھا "کیا ہماری زندگی واقعی ایسی ہی دردناک ہو گئی ہے جیسی اس میں نظر آتی ہے"۔ اس کے بعد وہ کئی دن تک ملول رہیں۔ یہی ہمارے افسانوں کی بقا کا ثبوت ہے۔

جذباتِ سریر

(از مسٹر شیام نراین سریر)

کمالِ حسن ہے میری نظر میں جذبِ کامل سے
مہک پھولوں کی آتی ہے مجھے روحِ عنادل سے

ہزاروں میکدوں کی آبرو پر حرف لاتی ہے
صدا پیدا جو ہوتی ہے شکستِ شیشۂ دل سے

گراں تھا بارِ احساں ناخدا کا طبعِ نازک پر
ڈبو دی اپنی کشتی ہم نے خود ٹکرا کے ساحل سے

وہی رہرو ہے، منزل کا اسی نے راز سمجھا ہے
نہ منزل جس سے کھنچتی ہو نہ جو کھنچتا ہو منزل سے

مری جانِ حزیں کا حال، قصہ مختصر ہے یہ
رہی مشکل میں، ہے مشکل میں، اور نکلے گی مشکل سے

کہیں خاکسترِ پروانہ، پروانہ نہ بن جائے،
صدائے قُم نکلتی ہے سکوتِ شمعِ محفل سے

نظر ہو اک دہانِ زخمِ بسمل کی بھی جنبش پر
بہت قصے سُنے ہونگے زبانِ تیغِ قاتل سے

کہیں حد سے گزر جائے یہ کچھ باقی بھی رہتا ہے
مُسافر کا نشاں کیا خاک ہاتھ آئیگا منزل سے

یہ کیسا خونِ ناحق ہے، یہ کس کا خونِ ناحق ہے
ٹپکتا ہے لہو اب تک دہانِ زخمِ بسمل سے

بُرا لاکھوں میں ہے، پھر بھی بُروں سے لاکھ اچھا ہے
سریرِ خوش نظر کو کیوں نکالو اپنی محفل سے

افسردگی

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم -اے)

دنیا کی کسی چیز میں لذت ہی نہیں ہے ۔۔۔ یاں درخورِ رغبت کوئی نعمت ہی نہیں ہے
دل حُسن سے بہلاتے سو عنقا ہے یہاں حُسن ۔۔۔ مائل بہ نمود اپنی طبیعت ہی نہیں ہے
رنگت ہے مگر جذب سے ہر رنگ ہے محروم ۔۔۔ دل کھینچ لے وہ حُسنِ طبیعت ہی نہیں ہے
مرمر کے لگایا ہے پتہ ذوقِ فنا نے ۔۔۔ یاں بوئے وفا خوئے محبت ہی نہیں ہے
لچھ کچھ تو تکلف ہے کہیں وضعِ حسیناں ۔۔۔ ہے پر دلِ کمبخت کی قسمت ہی نہیں ہے
وہ اہلِ تکلف بھی نہیں ملتفت اس سے ۔۔۔ خود سلسلہ جُنباں ہو یہ جرأت ہی نہیں ہے
تعریف و تعارف کی بھی ہاں ٹھانتا یہ دل ۔۔۔ پر بہ شدّتِ غم دیتی اجازت ہی نہیں ہے
وہ ہے غمِ آفاق، کہ دل سرد ہوا ہے ۔۔۔ خوش ہو دلِ بے جاں میں یہ طاقت ہی نہیں ہے

ہم جیتے ہیں مدہوش کہ ہیں زندہ لحد میں
آگاہ ہوں خود جس سے وہ حالت ہی نہیں ہے

ذوقِ انانیت

دل میں اک اضطراب ہے سانس میں پیچ و تاب ہے ۔۔۔ نفسِ نفس گداز کی تند شرابِ ناب ہے
ذوقِ انانیت ترا موجبِ صد عذاب ہے ۔۔۔ دامنِ بیخودی پکڑ جس میں بھرا ثواب ہے
عقل و خِرَد کو کھو کے رہ مست و خراب ہو کے رہ ۔۔۔ پیرِ مغاں سے لے کے دیکھ ہوش رُبا شراب ہے
زندگی گو کہ خواب ہے، خواب یہ پُر عذاب ہے ۔۔۔ لطف تو خال خال ہے رنج تو بے حساب ہے
توڑ بھی دے طلسمِ خواب جو کہ ہے ظلمت و عذاب ۔۔۔ درکِ لطیف تر جگا کس لئے محوِ خواب ہے
حالتِ نیم خواب میں درکِ لطیف تر کہاں ۔۔۔ لہو و لعب کی زندگی حالتِ نیم خواب ہے
کھیل یہ کھیلنے ہیں کھیل پھر یہ عقوبتیں بھی جھیل ۔۔۔ دوش پہ میتیں اُٹھا ہاتھ میں گر شراب ہے

جنتِ زندگی کی بس کیفیتیں یہی تو ہیں
دُور سے اب سلام ہے لذّتوں سے جواب ہے

مدہوش

آخری شاہکار

(مسٹر رفیق علی خاں صابر)

سروجنی کی شادی کو ابھی تین مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ اُسے اِس بات کا احساس ہوا کہ نرینداُس سے کھچا کھچا سا رہتا ہے۔ سروجنی ایک تعلیم یافتہ اور آزاد خیال عورت تھی، مگر اس کے باوجود وہ ایک لونڈی کی طرح نریندر کی خدمت میں کوشاں رہتی۔ نریندر بھی تصویر کشی کے صلہ میں جو کچھ لاتا وہ سروجنی کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ نریندر کے گھر میں سروجنی اچھا کھاتی، اچھا پہنتی، مگر پھر بھی وہ اداس رہتی۔ نریندر کی بے التفاتی اُس کے لئے سوہانِ روح بن گئی، وہ نریندر سے صرف ایک چیز چاہتی تھی، یعنی محبت۔ مگر بظاہر وہ نریندر کی سرشت میں جذبۂ محبت شمّہ برابر بھی نہ پاتی۔ کبھی وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتی کہ ایک آرٹسٹ کو اپنا آرٹ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتا ہے، شاید آج کل کسی بڑے شاہکار کے بنانے میں منہمک ہوں۔ فرصت ملے گی تو اپنی سروجنی کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔

اِسی موہوم اُمید پر کہ نریندر ایک نہ ایک دن ضرور اُس کی طرف ملتفت ہوگا زمانہ گذر گیا۔ وہ ہرگز تیار نہ تھی کہ ایسے شخص کو جسے جذبۂ محبت چھوکر بھی نہ نکلا ہو، اپنے دل میں کوئی جگہ دے۔ محبت سے بھرے ہوئے ازدواجی زندگی کے خواب جو وہ شادی سے پہلے دیکھا کرتی تھی شادی کے پانچ چھ مہینے بعد ہی کافور ہوگئے۔ سروجنی کے رویہ میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہوگیا، گر وقت کا تقاضا ہی یہ تھا۔ اب وہ بات بات پر نریندر کو جھڑکتی۔ مگر نریندر اُس کی خفگی کا جواب ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے دیتا۔ سروجنی اُس کی مسکراہٹ کو نہ سمجھ سکتی۔ اِسی لئے وہ نریندر کی اس حرکت پر اور برہم ہوجاتی۔

ایک روز نریندر تین دن کے بعد واپس آیا، بجائے اس کے کہ اطمینان سے وہ کچھ دیر سروجنی کے پاس بیٹھے، دو دو باتیں کرکے اپنے کمرے میں جہاں تصویریں رکھی تھیں جانے لگا۔ سروجنی خلافِ معمول نہایت محبت آمیز الفاظ میں بولی۔

"نریندر! میں جانتی ہوں کہ تمھیں اپنا آرٹ بہت عزیز ہے، مگر تم اپنی سروجنی کو کیوں بھول گئے ہو؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو سروج!" نریندر نے اتنا کہا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔

سروجنی چاہتی تھی کہ کسی طرح اُسے نریندر سے پورا پورا چھٹکارا مل جائے، مگر پھر یکایک یہ

خیال کہ وہ ایک ہندو عورت ہے اُس کی تمام تمناؤں پر پانی پھیر دیتا، اُسے اپنی دلکش جوانی کا احساس تھا وہ اپنے حسن کی رعنائیوں کو گھنٹوں آئینہ میں دیکھا کرتی، مگر جب نریندر کی بے اعتنائیوں کو دیکھتی تو گمان ہوتا کہ وہ اپنی تمام رعنائیاں اور دلکشیاں کھو بیٹھی ہے۔ مگر اُس کا شیشۂ دل جو جوانی کی شراب سے لبریز تھا اس خیال کی تردید کرتا۔ اس کے کانوں میں ایک صدا گونجتی کہ سروجنی تو بہت حسین ہے نریندر ہی میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ تیرے حسن کی دل فریبیوں سے لطف اُٹھا سکے۔ وہ سوچتی کہ نریندر مایۂ ناز مصور ہے، ہوا کرے، مگر اُس کی مصوری کے پیچھے میں اپنی زندگی کیوں ناخوشگوار بنا لوں، وہ سمجھتی کہ اُس کے اور نریندر کے درمیان مصوری حائل ہے۔ اُسے نریندر کی مصوری سے رقابت سی ہو گئی۔ آخرکار اُس نے نریندر کی تمام تصویروں کو جلا کر اپنے دل کا بخار نکالا۔ نریندر تصویروں کی جلی ہوئی راکھ دیکھ کر دم بخود رہ گیا، اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"سروج! یہ تم نے کیا کیا؟" اِن چند لفظوں کے سوا نریندر نے کچھ نہ کہا۔

نریندر بازار سے واپس آ رہا تھا اُس کے ہاتھ میں کاغذ اور ایک رنگ کا ڈبہ تھا، جیسے جیسے گھر قریب آتا جاتا تھا، اُس کی رفتار میں کمی ہوتی جاتی، اُسے خیال آتا کہ سروجنی کاغذ اور رنگ کا ڈبہ دیکھ کر آگ بگولا ہو جائے گی۔ مگر پھر خیال آتا کہ وہ تو روز ہی چراغ پا ہوتی ہے کوئی نئی بات تو نہیں۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اُس نے آواز دی "سروجنی! سروجنی!!" مگر خلاف معمول کوئی جواب نہ ملا، اُس کا دل دھڑکنے لگا اسی درمیان میں اُس کی نگاہ ایک لفافہ پر پڑی، کھول کر پڑھا لکھا تھا:۔

"پران ناتھ!

میں جا رہی ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، آپ نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی، مگر آپ محبت کی تشنگی نہ بجھا سکے۔"

آپ کی سروجنی

نریندر جب خط پڑھ چکا تو اُس نے رنگ کا ڈبہ دُور پھینک دیا، زمانۂ ماضی کا تمام نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا ——— وہ دولھا بنا کھڑا ہے، سروجنی چمکتے ہوئے رنگین کپڑے پہنے نگاہیں نیچی کئے اُس کے سامنے کھڑی ہے، اُسے یاد آیا کہ میں نے سروجنی کی خاطر مکان کو سجا کر دُلھن بنا دیا تھا، آمدنی تھوڑی تھی مگر مجھے سروجنی کی آسایش کا بہت خیال تھا، روپیہ کمانے کے لئے میں زیادہ تعداد میں تصویریں بنانے لگا۔ لوگ کہتے تھے "نریندر! تمھاری تصویروں کا معیار بہت گرتا جا رہا ہے"۔ تو قدرے مایوسی ہوتی تھی، مگر جب بہت سے روپئے ملتے تو اس خیال سے مسرور ہو جاتا تھا کہ سروجنی کے لئے سامانِ آسایش زیادہ فراہم

ہو سکے گا۔ پھر بھی سروجنی ناخوش ہو کر چلی گئی۔ کیا یہ سب محبت کا کرشمہ نہ تھا۔

سروجنی نریندر سے روٹھ کر میکے چلی آئی، رفتہ رفتہ پشیمانی کا جذبہ اُس پر غالب آنے لگا طبیعت کی جولانی کے علاوہ جب ذرا فہم و ادراک نے اپنا نقشہ جمایا تو اُس نے محسوس کیا کہ نریندر کو اُس سے محبت نہ بھی پھر بھی اُس کو نریندر کی خدمت کرنی چاہیئے تھی، وہ اُس کے پتی تھے۔ کیا اپنے پتی کے لئے وہ ذرا سی قربانی بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہ سُن کر کہ نریندر ایک مہینہ سے سخت بیمار ہے وہ بیتاب ہو گئی اور سامانِ سفر تیار کرنے لگی ماں باپ کہتے رہے کہ جب وہ تیرا خیال نہیں کرتا تو پھر تو کیوں اُس کے پاس جا رہی ہے۔ سروجنی نے اس کا جواب یوں دیا " پتا جی! میں اب اُن فرائض سے سبکدوش ہونے جا رہی ہوں جو ایک ہندو استری پر عائد ہوتے ہیں۔"

بڑے بڑے ارمان لئے وہ اپنے پتی کے گھر میں داخل ہوئی۔ مگر اُس کے پہونچنے سے قبل بیچارہ نریندر اس دنیا کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ سروجنی نریندر کی موت کی خبر سُن کر پریشان تو ہوئی مگر آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرا۔ اس خیال نے کہ نریندر نے اُس سے کبھی پریم نہیں کیا اُس کے آنسو بند کر دیئے۔

سروجنی کو خیال آیا کہ اس عرصہ میں نریندر نے بہت سی تصویریں بنا ڈالی ہونگی۔ بڑی بیتابی سے وہ نریندر کے کمرہ میں داخل ہوئی — مگر وہاں کوئی تصویر نہ تھی۔ اُس نے الماری کھولی، الماری میں ایک رنگ کا کھلا ہوا ڈبہ رکھا ہوا تھا، اور ایک لپٹا ہوا کاغذ!

سروجنی نے کاغذ کھولا — وہ ایک تصویر تھی۔ نریندر کا بہترین اور آخری شاہکار — تصویر دیکھکر سروجنی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!!

سروجنی کو اب احساس ہوا کہ نریندر کو اُس سے بہت محبت تھی، کیونکہ وہ تصویر سروجنی ہی کی تصویر تھی اور نامکمل!!!

باقیاتِ فانی

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی
کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں اِک بے قرار تڑپا، اِک بے قرار رویا
جب ترا ذکر آگیا ہم دفعتاً چپ ہو گئے وہ چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا
مری اک عمرِ فانی نزع کے عالم میں گزری ہے محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں
موت اُن کا منہ ہی تکتی رہ گئی جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے

(بر ...)

مفلسی کاشتکار

ایک نوجوان طالب علم کا افسانہ

(از حضرت نشورؔ واحدی)

باشندہ مرے شہر کا اک دوست تھا میرا
ہموار جبیں، آنکھ بڑی، جسم چھریرا

اخلاق میں پاکیزہ طبیعت میں لطافت
سر بات سے جیسے کہ ٹپکتی تھی ذہانت

کالج میں وہ پٹنہ کے تھا تعلیم میں مشغول
ماں باپ کے گلزارِ تمنا میں کھلا پھول

والد بھی تھے اس کے اِسی اطراف میں نوکر
اور چاہتے تھے جیسے اسے جان سے بڑھکر

جب دوسرے سال "الف۔اے" میں اس کا قدم آیا
ناگاہ وبا آئی گیا باپ کا سایا

ماں صورتِ مغموم تھی، معصوم تھے بھائی
دیتی نہیں تھی شکل گزارے کی دکھائی

اور اُس پہ ستم خرچ تھا کالج کا مسلسل
تھی فیس کی فکر آج، کتابوں کا الم کل

"پیسہ ہے تو تعلیم ہے غربت میں کہاں ہے
محسوس ہوا اس کو کہ تعلیم گراں ہے

ہے شوق مگر ہاتھ میں رکھتا نہیں پیسے
تعلیم غریبوں کے لئے ہے نہیں جیسے"

مجبور ہوا، چھوڑ دی کالج کی پڑھائی
تھی فکر کہ ماں بیوہ ہے معصوم ہیں بھائی

روزی سے پریشان تھا تقدیر کا مارا
جینے کے لئے ایک تھا ٹیوشن کا سہارا

گو روح پہ افلاس کے آثار تھے طاری
تعلیم کا بھی سلسلۂ شوق تھا جاری

مَر جی کے کسی طرح سے "الف۔اے" جو کیا پاس
"بی۔اے" کے لئے روح میں بیتاب ہوئی آس

دو سال تک اور اُس نے مصیبت جو اُٹھائی
"بی۔اے" بھی ہوا پاس تمنا یہ بر آئی

جب پاس ہوا "بی۔اے" تو مادر ہوئی مسرور
شادی کے لئے ماں نے اُسے کر دیا مجبور

شادی سے ہوا خرچ جو فی الفور زیادہ
پھر فکرِ معاشش اس کو ہوئی اور زیادہ

عمروں کا تقاضا تھا کہ ہو ہیٹ بھی اور سوٹ
نیرنگی تقدیر سے ٹیوشن بھی گئے چھوٹ

مقدور نہیں تھا کہ زراعت بھی کرے وہ
سرمایہ نہیں تھا کہ تجارت بھی کرے وہ

درخواست اک اسکول میں دی اُس نے پھر آخر
لیکن نہ ہوا اس سے نتیجہ کوئی ظاہر

ہر محکمہ ہر شہر میں درخواست اُڑائی
لیکن نہیں اُمید کی صورت نظر آئی

سے خون اُمنگوں کا یہ افلاس بھی کمبخت
ارمان بھری زندگیاں ہوتی گئیں سخت

تعلیم کی نظروں میں ہے تہذیب بھی چھوٹی
تعلیم نہیں باندھنے دیتی ہے لنگوٹی

فکروں میں حواس اور بھی تھکنے لگے اُس کے
ہر سمت خیالات بھٹکنے لگے اُس کے

سوچا کہ اب اک راہ معیشت کی ہے چوری
لیکن میں کروں کیا کہ نہیں روح یہ چھوری

ڈاکہ جو میں ڈالوں تو غریبوں پہ ستم ہے
اور پھر مری فطرت کے لئے بارِ الم ہے

اور جا کے بغاوت کا جو گاتا ہوں ترانا
برباد ہوا جاتا ہے گھر اور گھرانا

عرصے تک اسی طرح پریشان رہا وہ
افکار میں ڈوبا تو خیالوں میں بہا وہ

کچھ روز میں ٹیوشن اُسے پھر مل گئے لیکن
غمگین تھی ہر رات المناک تھا ہر دن

تکلیف میں تھے بھائی تو افسوس میں مادر
بیوی کی جوانی پہ غم انگیز تھی چادر

صحت لگی اُس کی غمِ افکار سے گرنے
آنسو بھی لگے چشمِ گہر بار سے گرنے

جو جسم کو لگتی وہ غذا تھی نہ میسّر
اِک دُکھ سے بھری زندگی افلاس کا چکّر

گرمی کا زمانہ تھا کہ کھانسی اُسے آئی
اور تھوک کے ہمراہ دیا خون دکھائی

چھوٹا سا مکاں، اور وہ گرمی کا زمانا
قیمت نہ دوا کی، نہ غذاؤں کا ٹھکانا

افلاس کو افسوس جوانی بھی نہیں تھا
لب خشک تھے اور برف کا پانی بھی نہیں تھا

موت آ گئی نزدیک، بڑھی خون کی کھانسی
وہ نزع کا عالم تھا کہ افلاس کی پھانسی

کیا عرض کروں اُس کی شبِ مرگ کا عالم
خوں تھوک رہا تھا کہ وہیں ٹوٹ گیا دم

اس لاشِ جواں مرگ پہ رو رو دیے دشمن
ماں بیٹھ گئی اور گری لاش پہ دُولھن

افلاس کی شمشیر تھی اور خون تھا تازہ
تھرّانے لگا عرش جب اُٹھا وہ جنازہ

سب ختم ہوئی دل کی اُمنگوں کی کہانی
اور قبر کی آغوش میں سوئی تھی جوانی

تنقید کتب

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مضامین نہرو

کشمیر جنت نظیر زعفران زار ہی نہیں مردم خیز بھی ہے، نسیم۔ سرشار۔ آبر۔ در۔ سپرو۔ تہسکر۔ چکبست نہرو وغیرہ کے ناموں سے کون ہندوستانی واقف نہیں۔ لیکن ان مفکرین میں سے ایسے افراد کی وہ تحریریں اور علمی کاوشیں اب تک خالص اُردو داں طبقہ تک نہیں پہونچی تھیں جو انگریزی زبان میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی جوانوں کے قائد اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی اکثر تحریروں سے ہماری پبلک اب تک پورے طور پر آشنا نہیں۔

جامعہ ملیہ دہلی نے ضرور "میری کہانی" شائع کرکے بہت حد تک اس کمی کو پورا کر دیا تھا۔ پھر بھی سوانح حیات میں کسی ایک موضوع پر مصنف اپنے خیالات تفصیل و وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کا موقع نہ نکال سکتے تھے۔ یہ تو ان کی تاریخ عالم اور مختلف مضامین ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

خدا بھلا کرے پنڈت آنند نراین مُلّا کا کہ اُنھوں نے اس کمی کو محسوس کرکے پنڈت جی کے ان جواہر پاروں[1] کو اُردو میں منتقل کرنے کا بارِ عظیم اپنے سر لیا۔ اور سچ پوچھئے تو یہ کام اُنھیں کے کرنے کا تھا بھی۔ اس لئے کہ جس طرح سیاسی دنیا میں نہرو جی نئے ہندوستان کے مسلّم رہنما ہیں اُسی طرح مُلّا جی سرشار و آبر و چکبست کے صحیح جانشین، اور ادب کے نئے رجحانات کے نبّاض اور ترجمان ہیں۔ لیکن ان کو جو ترجمے میں دشواریاں ہوئی ہیں وہ یوں بیان کرتے ہیں:۔

> "محض میری بے بضاعتی ہی ترجمہ کی مشکلوں کی وجہ نہیں بلکہ ایک حد تک پنڈت جواہر لال نہرو کی طرز تحریر بھی اس کی ذمہ دار ہے۔۔۔۔۔ جس کسی نے پنڈت جی کے تھوڑے سے بھی انگریزی مضامین پڑھے ہونگے اُس کے دل پر ان کی طرز نگارش کی تین خصوصیتیں ضرور نقش ہو گئی ہونگی۔ سب میں پہلی خصوصیت اُن کی ذہنی رفعت ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹے سوال کو وہ ایک حکیمانہ انداز میں حل کرتے ہیں، اور اُسے جد و جہد انسانی کا پس منظر دے کر پیش کرتے ہیں۔ چونکہ انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہے اس لئے وہ زندگی اور سماج کے تمام مسائل کی پیچیدگیاں اور گہرائیاں اس خوبی اور آسانی سے بیان کرتے

[1] مطبوعہ انڈین پریس، الٰہ آباد۔ قیمت ۸؍

چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو تو اس کا حس نہیں ہوتا، لیکن ترجمہ کرنے والے کا دل جانتا ہے اور چونکہ اس میں اپنے مخاطب کے شکوک رفع کرنے ہوتے ہیں لہذا وہ قدم قدم پر دل و دماغ کا جائزہ لیتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ وہ خیال کی ان بلندیوں پر پہونچ جاتے ہیں جن کی ترجمانی کرتے وقت معمولی انسان کی زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ ان کی طرز نگارش کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ موضوع زیر بحث میں اپنے ذاتی تاثرات اس انداز سے شامل کر دیتے ہیں کہ ان کا ہر مضمون بجائے ایک خشک علمی مباحثہ کے ایک زندہ سوال بن کر سامنے آتا ہے اور پڑھنے والے کو مجبور کرتا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی جواب دے . . . . .

تیسری خصوصیت جس کا دراصل تعلق اُن کی ذات سے ہے وہ اُن کی حیرت انگیز "بشریت" ہے . . . . . .

اس "بشریت" نے اُن کی طرز تحریر میں ایک عجیب و غریب شگفتگی اور شوخی پیدا کر دی ہے جسے جیل خانے کی اونچی دیواریں بھی دبا نہیں سکیں اور جس کی ترجمانی کرنا میرے ایسے ترجمہ کرنے والے کے بس کی بات نہیں۔"

ظاہر ہے کہ اس طرح کے بلند مرتبہ، رفیع خیال، ندرت پسند اور صاحب طرز انشا پرداز کے مضامین کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہ پنڈت آنند نراین صاحب مُلّا ہی کا کام تھا کہ وہ اس ہفتخواں کو اس خوش اسلوبی سے طے کر سکے۔ اور ہم اسے بھی اُنھیں کی کامیابی سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے منزل تک پہونچنے کے لئے پروفیسر احتشام حسین کے سے ذی علم و باہمت ساتھی کا تعاون بھی حاصل کر لیا۔ ہم اپنے ان دونوں دوستوں کو اس خدمت ادب و علم پر صمیم قلب سے مبارکباد دیتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ہم پنڈت جی کی اس "بالنس کی کھچڑی" پر بھی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے جو اُنھوں نے ان جواہر پاروں کی ابتدا میں تعارف کے طور پر لگائی ہے۔ یہ تعارف جس اچھوتے انداز میں لکھا گیا ہے اور اس میں جس عنوان سے پنڈت جواہر لال نہرو کی طرز نگارش کی توضیح کی گئی ہے وہ اُردو میں ایک نئی طرح کی نقد کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اور اس لئے ہمارے ادب میں ایک مستقل اضافہ ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ مضامین نہرو کا یہ پہلا اُردو مجموعہ ہر اُردو دوست کی لائبریری میں جلد سے جلد جگہ پائیگا اور اسی احترام و عزت و مسرت کے ہاتھوں سے لیا جائیگا جس کا وہ ہر طرح مستحق ہے۔ اور علی حسین کاتب کی طرح ہمارا بھی تقاضا ہے کہ حضرت مترجم جلد سے جلد دوسرے حصّہ کی بھی تکمیل فرما دیں۔

سُریلے بول[1]

محمد عظمت اللہ خاں بی اے، مرحوم اُردو میں جدید نظموں اور بحروں کے موجد اور بانی ہیں۔ علاوہ انگریزی اور فارسی پر عبور رکھنے کے وہ ہندی اور سنسکرت سے بھی آشنا تھے اور اُن کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو شاعری صرف

---

[1] ملنے کا پتہ: ادبی صیدنہ آباد بک ڈپو حیدرآباد دکن قیمت ۱۲ آنے

عربی اور فارسی کی بحروں تک محدود نہ رہے بلکہ اس میں ہندی اور انگریزی کی بحریں بھی رائج کی جائیں۔ چنانچہ اس موضوع پر جو عالمانہ مضمون انھوں نے لکھا تھا وہ اس کتاب کے حصۂ نثر کا خاص جزو ہے۔ حصۂ نظم میں مرحوم کی تمام وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے اپنے نظریہ کے تحت میں کہی تھیں۔

جہاں تک خان مرحوم کے نظریہ کا تعلق ہے ہم اُن کے ہمنوا ہیں کہ ہماری شاعری کو محض فارسی بحروں کے کوزے میں بند رکھنا مستحسن نہیں۔

"کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے"

لیکن جہاں تک اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے میں اور اُسے مقبول عام و خاص بنانے میں اپنی شاعری کو نئی بحروں تک محدود کرنے کا سوال ہے ہمارا ذوق خانِ مرحوم کی تائید سے معذور ہے۔ جن لوگوں کے کان ہماری طرح پُرانی بحروں اور ردیف و قافیہ کے ترنم سے آشنا ہیں انھیں مصرعوں کا چھوٹا بڑا ہونا، یا ردیف و قافیہ سے بالکل آزاد ہونا کبھی نہیں بھاتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ پھر مغربی شاعری میں یہی بات کیوں نہیں کھٹکتی؟ تو ہم عرض کریں گے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ مغربی شاعری کا ہمارے اوپر ویسا دیرپا اور شدید اثر ہوتا ہی نہیں جیسا کہ خود اپنی زبان کی شاعری کا۔ دوسرے ہمیں اُردو شاعری بھی بالکل ویسی ہی معلوم ہونے لگتی ہے جیسا کہ اچھا خاصا کالا آدمی انگریزی ڈنر سوٹ میں! پھر ہمیں انگلستان کے مشہور ناقد وادیب چسٹرٹن کا یہ قول کبھی نہیں بھولتا کہ ہمارے اِن نئے شاعروں نے پُرانی پابندیوں کے توڑنے میں ایک نئی طرح کی پابندی اپنے اوپر عائد کرلی ہے، اور وہ یہی کہ اُن کے کلام میں خواہ شاعری کی موسیقیت اور موزونیت باقی رہے یا نہ رہے لیکن وہ پُرانی پابندیوں سے آزاد ضرور ہو! غالبًا یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے سب سے زیادہ کامیاب تجدد پسند شاعر حضرت جوش ملیح آبادی اِن پابندیوں سے اپنے کو آزاد نہ کرسکے، اور نہ علامۂ اقبال مرحوم نے ہی اپنے کو اس معاملے میں حقوق خاص کا مستحق سمجھا۔

عظمت اللہ خاں مرحوم کی شاعری میں بہت سی خوبیاں ہیں، اس کی زبان بہت ہی نرم و مناسب ہے، اس میں خاصی رفعت و بلندی ہے، اس میں ندرت اور کہیں کہیں کیف بھی ہے۔ لیکن وہ انگریزی سانچے میں ڈھال دی گئی ہے اور وہ ہمیں کچھ اسی طرح عجیب معلوم ہوتی ہے جس طرح کوئی ستار اور سارنگی پر "چوپن" کے گانے یا انگریزی بینڈ کے ساتھ "میاں کی ٹوڑی" سنائے۔ پھر بھی جہاں کہیں انھوں نے ہندوستانی چیزوں کو ہندی بحروں میں نظم کیا ہے، وہ جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔ مثال کے طور پر اُن کی "برکھا رُت" کے چند بند ملاحظہ فرمائیے:۔

بجلی چمکی انگارا سی آگ کی ناگن لہرائی   لہریا کاڑھا بیل بنائی

سحاب کے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی — اِدھر اُدھر تڑپی تڑپائی
بجلی چمکے بادل گرجے مینہ اور پون دھواں دھار — زور کا پانی وہ دھائیں دھائیں
بجلی ناچے تھاپ گرج کی مینہ نے چھیڑ دیا ستار — پون کا گانا وہ سائیں سائیں
دھیا دھیا مینہ بھی چھم چھم پون ملائم اتراتی — اٹھکھیلیاں کرتی اتراتی
چکنے چکنے پتوں پر سے موتی سی بوندیں ڈھلکاتی — کھیلتی آتی چھیڑتی جاتی
نیلا امبر ہنستا سورج رنگ میں ڈوبے ہوئے بادل — کھلی پھننگوں پر ہلکی دھوپ
دھوئی نہائی بھومی سندر سر پہ سنہری سا آنچل — قدرت کا ایک سہانا روپ

کتابت وطباعت دیدہ زیب ہے اور کتاب لائبریریوں میں رکھنے کے لائق ہے۔ حصۂ نظم مطالعہ کے قابل ہے اور حصۂ نثر ہر طرح غور و تفکر سے پڑھے جانے کا مستحق۔

مُسافر کی ڈائری[1]

خواجہ احمد عباس صاحب سب ایڈیٹر بمبئی کرانیکل نے موجودہ جنگ کے کچھ ہی ماہ پہلے امریکہ میں منعقد ہونے والی "نوجوان کانفرنس" کی شرکت کی غرض سے ایک طویل سفر اختیار کیا۔ اور شنگھائی۔ ٹوکیو، ہالی وُڈ۔ نیو یارک۔ پیرس۔ لندن۔ وائنا۔ استنبول اور بغداد پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے میں جو کچھ دیکھا اُسے اس ڈائری کی صورت میں قلمبند کر لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب ہر شئے کو ایک سیاسی نظریہ کے ماتحت دیکھنے کے عادی ہیں، اور وہ بہت کچھ وہی دیکھتے ہیں جس کے دیکھنے کا اور ایک خاص زاویہ سے دیکھنے کا وہ ارادہ کر چکے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اُن کا دل ہندوستان کی محبت سے لبریز ہے، اور وہ دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ وہ بعض وقت اس طرح کی چبھتی باتیں کہہ دیتے ہیں جن سے ہمارے تھکے ہوئے دماغوں کو ٹھیس لگتی ہے اور ہم خلافِ عادت سوچنے اور غور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک چینی ہم سفر تاجر سے گفتگو کا حال یوں بیان کرتے ہیں:-

"شنگھائی میں اس کا ایک سگریٹوں کا کارخانہ تھا جو جاپانی ہوائی جہازوں کا شکار ہو گیا، کہنے لگا:-

"لاکھوں سگریٹ تھے، جاپانی ہوائی جہاز نے ایک بم چھوڑا، سب ایک ساتھ ہی جلنے لگے!"

اور یہ کہہ کر خوب ہنسا! یہ ہے وہ اسپرٹ جس کے مقابلے میں جاپان کی توپیں بیکار ہیں!"

اسی ملک چین میں کیسا بین المذاہب اتحاد و اتفاق ہے، اُسے سُنیئے:-

"میرے ایک چینی دوست نے بتایا کہ وہ عیسائی ہے، اُس کا باپ بدھ مذہب کا پیرو۔ اس کا

[1] مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ قیمت ایک روپیہ عہ

عائی مذہب اور اُس کی عیسائی بہن نے ایک مسلمان سے شادی کی ہے۔ باوجود اس کے وہ سب ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، اور ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جاپان کی جارحانہ سامراجی اسپرٹ کے مذموم نتائج دیکھتے ہوئے جب خواجہ صاحب امریکہ پہونچے تو ان ڈالر کے پرستاروں میں ہندوستان سے بے خبری کا عجیب عالم پایا۔ ایک امریکی بچّے نے سوال کیا:۔

"کیا تم مہاراجہ ہو؟"

"نہیں!"

"پھر کیا تم سوامی ہو؟"

"نہیں، میں تو اخبار نویس ہوں"

"اچھا تو تمھارے ملک میں اخبار بھی ہوتے ہیں؟"

....

"اور تمھاری کتنی بیویاں ہیں؟"

"ایک بھی نہیں، ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔"

"عجیب بات ہے، میں تو سمجھتا تھا کہ بارہ برس کی عمر میں سب ہندوستانیوں کی شادی ہو جاتی ہے، اور اُن کی سات سات بیویاں ہوتی ہیں۔"

سرمایہ داروں کی اس عظیم الشان سلطنت کی صحیح اسپرٹ مصنف نے چند جملوں میں یوں پیش کی ہے:۔

"اس اشتہار بازی کے مرکز میں نہ صرف سینما اور تھیٹر اور صابون اور سگریٹ کے اشتہار دیکھے، بلکہ قبرستانوں اور گورکنوں کے بھی اشتہار دیکھے "ہمارے پُر بہار اور پُر فضا قبرستان میں اپنے عزیزوں کو دفن کیجئے۔"

امریکہ سے جہاز کے ذریعہ خواجہ صاحب پیرس آئے۔ پیتان اور لاوال کے اس شہر میں جو کچھ ہمارے مسافر نے دیکھا اُس کی تفصیل تو آپ کو کتاب میں ملے گی، لیکن مصنف نے دو جملوں میں پوری فرانسیسی ذہنیت بہت ہی لطف سے بیان کر دی ہے:۔

"شراب کھانے کے ساتھ مفت ملتی ہے مگر پانی مشکل سے ملتا ہے اور اکثر اُسکی قیمت دینا پڑتی ہے" "ننگا ناچ دیکھنا یا سڑک پر بیٹھکر شراب پینا عیب نہیں سمجھا جاتا مگر اتوار کو گرجا نہ جانا گناہ ہے۔"

اب لندن کی باری آئی، وہاں "چند ہی روز کے بعد اپنی کھال کے رنگ کا احساس شروع ہو گیا۔" اس لئے حاکموں کے اس دار السلطنت سے جلد ہی روانہ ہو کر تیز گام مسافر نے بیس۲۰ دن میں سات ملک لپیٹ ڈالے

ظاہر ہے کہ اس روا روی میں کیا دیکھا ہوگا لیکن پھر بھی ہر ملک کے حال میں ہندوستان کے لئے خواجہ صاحب نے ایک خاص سبق کا مسالہ فراہم کردیا ہے۔

اور جب اس طرح دنیا کی خاک چھان کر تھکا ماندہ مسافر اپنے محبوب وطن کی بندرگاہ پر اُترا تو "پولیس والوں نے پاسپورٹ کا معائنہ کیا، اسباب کی تلاشی لی، بہت سے سوال کئے ۔

"نام؟ باپ کا نام؟ پیشہ؟ کس غرض سے سفر کیا؟ کراچی میں تقریر تو نہیں کروگے؟ ......

اب کیا شبہ ہے کہ میں ہندوستان واپس پہونچ گیا!"

خواجہ صاحب کا انداز بیان بہت ہی محاکاتی ہے، ہر واقعہ اور ہر جگہ کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ قلم رواں ہے، اور زبان سلیس۔ طرز نگارش میں ایک ہلکا سا طنز بھی موجود ہے۔ غرض کتاب ہر طرح پڑھنے کے لائق ہے۔ کتابت و طباعت غالباً عجلت میں ہوئی ہے، اس لئے کہ جا بجا سے حروف اُڑ گئے ہیں، اُمید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں طباعت کی خامیاں بھی جاتی رہیں گی۔ اور یہ "ڈائری" اُردو کے سفرناموں کی صف اول میں جگہ پائے گی۔

ع.ع.ع

اِطلاع ضروری

جن صاحبان کی خریداری جنوری نمبر سے شروع ہوتی ہے اُن کا حساب اس نمبر سے ختم ہوگیا، اور اب آئندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہوگئی ہے۔ اس لئے ان سب صاحبان سے درخواست کی جاتی ہے کہ براہ کرم اس نمبر کے پہونچنے کے دس دن کے اندر "زمانہ" کا آئندہ سالانہ چندہ مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں ورنہ حسب دستور جنوری ۱۹۴۲ء کا پرچہ سالانہ قیمت کے لئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (.V.P.P) ارسال ہوگا اور اس صورت میں پانچ آنے زیادہ خرچ ہونگے۔

(۱) جن صاحبان کا حساب جولائی یا دوران سال کے کسی دوسرے مہینے سے شروع ہوتا ہے مگر کسی وجہ سے اُن کی قیمت وصول ہونے سے باقی رہ گئی ہے، وہ بھی براہ عنایت جلد سے جلد رقم واجب الوصول بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں، ورنہ اُن کی خدمت میں بھی جنوری ۱۹۴۲ء کا پرچہ سالانہ چندہ کے لئے وصول طلب پیکٹ (.V.P.P) سے روانہ ہوگا۔

نوٹ:- اگر کسی صاحب کو آئندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو تو وہ براہ کرم اس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً ہی دفتر کو اطلاع دیدیں تاکہ اُن کی خدمت میں جنوری ۱۹۴۲ء کا رسالہ نہ بھیجا جائے، اور وہ قیمت طلب پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر ٹکٹ ڈاک کے نقصان سے محفوظ رہے۔ باقی دار اصحاب جو آئندہ خریداری جاری نہ رکھنا چاہتے ہوں براہ خوش معاملگی اپنے ذمہ کی بقایا ادا فرماکر اپنے منشا سے مطلع فرمائیں۔

نوٹ:- منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن منی آرڈر پر اپنا پورا نام و پتہ مع نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں تاکہ رقم مرسلہ صحت کے ساتھ درج حساب ہو سکے۔

منیجر "زمانہ" کانپور

رفتارِ زمانہ

امریکہ اور برطانیہ کے خلاف جاپان کے اعلان جنگ کی وجہ سے موجودہ لڑائی نے واقعی عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کرلی ہے چنانچہ روس، افریقہ اور بحر اٹلانٹک کے علاوہ بحرالکاہل کا وسیع دامن بھی ایک زبردست میدان جنگ بن گیا ہے۔ ۔ دسمبر کو باضابطہ اعلان جنگ کے بغیر ہی جاپان نے مختلف مقامات پر اچانک حملے کرکے ابتدائی کامیابیاں حاصل کرلی ہیں

ہندچینی میں تو جاپان عرصہ سے اپنی فوجیں جمع کررہا تھا اس لئے ۔ دسمبر کو علی الصبح تقریباً دو بجے جاپانی فوج سرحد عبور کرکے سیام میں داخل ہوگئی سیامی سپاہیوں نے پہلے تو کچھ گھنٹے مقابلہ کیا لیکن ساڑھے سات بجے صبح تک انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور جاپان کو سیام کے علاقہ سے اپنی فوجیں گزرنے اور ہوائی اڈے استعمال کرنے کا اختیار دیدیا۔ اس کے بعد سیام اور جاپان میں ایک تازہ معاہدہ ہوگیا جس کے رو سے سیام جاپان کو اتحادیوں کے خلاف سیاسی فوجی اور اقتصادی ہر طرح کی مدد دیگا اور جاپان اور سیام ایک دوسرے سے صلاح و مشورہ کئے بغیر اتحادیوں سے کوئی صلح نہ کریں گے۔ یہ معاہدہ دس سال کے لئے ہوا ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ اب سیام مستقل اور قطعی طور پر جاپان کا ماتحت ہوگیا ہے۔ سیام کا قدیم ہندو تہذیب سے بہت کچھ تعلق ہے اس لئے ہندوستانیوں کو سیام کی آزادی سلب ہوجانے کا دلی افسوس ہے لیکن اس سے قطع نظر ہندوستان کی حفاظت کا مسئلہ بھی سیام کے رویہ سے بہت زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔

جاپان نے امریکہ کے ساتھ بھی دغا کی، اُس نے مصالحت کی گفتگو کرنے کے لئے اپنے خاص سفیر امریکہ روانہ کئے تھے اور ابھی امریکن اور جاپانی نمائندوں کے درمیان واشنگٹن میں گفت و شنید جاری ہی تھی کہ جاپان نے بلا کسی اعلان یا اطلاع کے امریکہ کے جزائر ہوائی، گوام، ویک، مڈوے اور فلپائن پر اچانک حملے کردیئے۔ چونکہ امریکہ ان حملوں کے لئے تیار نہ تھا اس لئے اسے ان حملوں میں بہت کچھ نقصان اُٹھانا پڑا مثلاً مجمع الجزائر ہوائی کے مقام پرل ہاربر پر جو بحرالکاہل میں امریکہ کا سب سے بڑا بحری مستقر تھا جاپانیوں نے ہوائی اور بحری حملے کرکے امریکہ کے چھ جنگی جہاز تین تباہ کن جہاز اور ایک سرنگیں بچھانے والا جہاز غرق کردیا۔ پرل ہاربر کے حملہ میں تقریباً تین چار ہزار امریکن بھی کام آگئے۔ جاپانیوں کی بھی تین آبدوز کشتیاں اور اکتالیس ہوائی جہاز ضائع ہوئے، مگر جاپانیوں نے صرف بحری ہوائی حملوں پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ انھوں نے بعض جزیروں میں اپنی فوجیں اُتار کر قبضہ کرلیا ہے۔ مثلاً جزائر گوام۔ ویک اور مڈوے پر بھی اس وقت جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ فلپائن کے سب سے بڑے جزیرہ لیوزان میں جہاں منیلا واقع ہے جاپانیوں نے فوجیں متعدد جگہ اُتار دی ہیں، ویگان اور اپاری میں بھی قبضہ کرلیا ہے اکثر مقامات میں سخت لڑائی ہورہی ہے۔ فلپائن کے دوسرے بڑے جزیرہ منڈاناؤ میں بھی جاپانی فوجیں اتر گئی ہیں اور جزیرہ کی راجدھانی ڈیواؤ میں گھمسان کی لڑائی ہورہی ہے جزیرہ ساراواکے ہوائی اڈہ پر بھی حملے کرکے نقصان پہونچایا گیا ہے۔ فلپائن کے متعلق آخری اطلاع یہ ہے کہ تقریباً ایک لاکھ جاپانی فوج وہاں پہونچ گئی ہے۔ ان اچانک و اندھا دھند حملوں کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کی بحری قوت کو فوری ضرب لگاکر اس کے بحری راستے کاٹ دیے جائیں کہ جزائر فلپائن یا ہانگ کانگ میں امریکن جہاز نہ پہونچ سکیں۔ اس وقت جاپان کو ضرور کسی حد تک مزید کامیابی حاصل ہوگئی ہے لیکن امریکہ کے

وسیع ذرائع بالآخر اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتے اس لئے جاپان کی ابتدائی کامیابیوں سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔

برطانوی جزائر جاپان نے ہانگ کانگ اور سنگاپور پر بھی اچانک حملے کئے ہیں۔ ہانگ کانگ میں تو شروع تک بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر ۲۵۔ دسمبر کو انگریزی فوجوں کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ہانگ کانگ کے سامنے کولون کو بھی جاپانیوں نے لے لیا۔ ہانگ کانگ پر جاپانی حملہ کا یہی مقصد ہے کہ جزائر جاپان اتحادیوں کے بحری حملے سے محفوظ ہو جائیں۔ جاپان خاص پر اتحادیوں کا بحری حملہ ہانگ کانگ کے راستے سے ہو سکتا ہے۔ ہانگ کانگ پر قبضہ حاصل ہونے سے جاپان کو ایک اور فائدہ پہونچ سکتا ہے کہ جاپان سے ہندچینی و سیام تک کا بحری راستہ صاف ہو جائے گا۔ اور بحرالکاہل کی سمت سے چین کو جنگی سامان بھی بھیجا نہ جا سکے گا۔

چونکہ شرق الہند کے جزائر اتحادیوں کے ساتھ ہیں اس لئے انکے ہوائی جہاز اور آبدوز کشتیاں بھی جاپانیوں کے خلاف کام کر رہی ہیں مگر جاپانیوں نے ابھی تک صرف بورنیو، ٹراکیہ اور ڈچ گنی کی طرف توجہ کی ہے یعنی جزیرۂ ٹراکیہ میں جو بورنیو اور ملایا کے درمیان واقع ہے جاپانی ہوائی جہازوں نے مرغن بستی اور بے پناہ لوگوں پر بمباری کی ہے۔ ابھی تک سماٹرا اور جاوا پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا ہے۔

مگر نئے میدان جنگ کے اہم ترین معرکے ملایا اور اس کے نواحی سمندروں میں ہو رہے ہیں۔ جاپانیوں نے خلیج سیام کی راہ اپنی فوجیں جہازوں میں لاکر ملایا کے مشرقی ساحل پر کوٹہ بھرو اور سانگورا میں اتاری ہیں جہاں برطانیہ کے ہوائی اڈے تھے، برطانوی بیڑے نے سنگاپور سے جاپان کے فوج بردار جہازوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی اور کئی جہاز ڈبو بھی دیئے لیکن اس کوشش میں خود برطانیہ کو بھی سخت نقصان اٹھانا پڑا اور دو بڑے جنگی جہاز "پرنس آف ویلز" اور "ریپلس" غرق ہو گئے۔ "پرنس آف ویلز" برطانیہ کا جدید ترین جنگی جہاز تھا جس کا وزن پینتیس ۳۵ ہزار ٹن تھا اور یہ سولہ انچ موٹی فولادی چادروں کا بنا ہوا تھا۔ چودہ ہزار ٹن کی زرہ پہنے تھا۔ ریپلس (Repulse) اگرچہ پرانا جنگی جہاز تھا لیکن اس کا وزن بھی بتیس ۳۲ ہزار ٹن تھا۔ جاپانی ہوائی جہازوں نے ان دونوں جہازوں پر سخت بمباری کی اور ہوائی تارپیڈو مارے جو نشانہ پر پڑ گئے اور یہ دونوں جہاز ڈوب گئے۔ اس طرح جنگ مشرق کے ابتدائی دور میں امریکہ و برطانیہ دونوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا جس سے ان کی مدافعتی کارروائیوں میں غیر معمولی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ ان مشکلات سے دشمن کو یقینی نفع پہونچا ہے اور شاید ابھی کچھ دنوں تک اور بھی نفع پہونچے۔ لیکن جلد یا دیر میں اور خدا چاہے گا تو دو ہی چار ماہ میں پوزیشن درست ہو جائے گی اور بقول فیلڈ مارشل اسمٹس آئندہ سال کے خاتمے سے پہلے ہی جاپان کو اپنی تعداد معلوم ہو جائے گی۔ اس وقت تو جاپانیوں نے اپنی فوجیں شانگور اور تو تہ بحر میں بھی اتار دی ہیں اور کثرت تعداد اور ہوائی فوقیت کی وجہ سے انھیں کامیابی پر کامیابی حاصل ہو رہی ہے اسی کی بدولت وہ اس وقت شمالی ملایا میں چلے گئے ہیں اور برما کے انتہائی جنوبی حصہ میں داخل ہو کر وکٹوریہ پوائنٹ کے برطانوی مستقر پر بھی انھوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ انگریزی فوج کو جزیرۂ پنانگ کو بھی جو بحر ہند کے مشرقی ساحل پر ایک مشہور جزیرہ ہے خالی کرنا پڑا۔ ان دونوں مقامات پر جاپانی قبضہ ہو جانے سے ہندوستان اور برما پر ہوائی حملوں کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس وقت تک رنگون پر دو ہوائی حملے ہو چکے ہیں۔ کلکتہ و مدراس و بمبئی وغیرہ بھی

ہوائی حملوں سے محفوظ نہیں رہے اور گو صاحب کمانڈر ان چیف آف انڈیا نے اطمینان دلایا ہے کہ فی الحال ہندوستان میں کسی قسم کے حملہ کا خوف نہیں ہے مگر بنگال اور آسام کے صوبے "ایر جنسی رقبے" قرار دیدیئے گئے ہیں اور کلکتہ خالی ہونا شروع ہو گیا ہے جس سے تمام ملک میں ایک طرح کی بےچینی پھیل رہی ہے۔ مگر برطانیہ، امریکہ اور چین کے مقابلہ میں کیا باعتبار آبادی اور کیا بلحاظ ذرائع اور مالی حالت جاپان کا پلہ بہت ہلکا ہے۔ اُسے آخر میں اتحادیوں کے ہاتھوں زک ہی اُٹھانا پڑے گی۔ اس وقت جاپان کے جنگ میں شامل ہو جانے سے جرمنی کو ضرور کچھ دنوں کے لئے ایک چھوٹا سا سہارا مل گیا ہے مگر تمام آثار سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ آئندہ ۱۹۴۲ء کا سال سخت آزمائش کا سال ہوگا لیکن اس کے ختم ہونے سے پہلے ہی اتحادیوں کا رنگ جمنے لگے گا اور ۱۹۴۳ء میں وہ یقیناً محوری طاقتوں کو زیر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اٹلی کا تو دیوالہ نکل ہی چکا ہے، حبش کا ملک آزاد ہو چکا ہے اور لیبیا میں اطالوی حکومت کا خاتمہ قریب ہے۔ جرمنی کو بھی روس میں سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس لئے اگر جاپان اس وقت جنگ میں شامل ہو کر یہ ابتدائی کامیابیاں نہ حاصل کر لیتا تو محوری طاقتوں کے لئے آئندہ جنگ جاری رکھنا سخت دشوار ہو جاتا لیکن جاپان کے ساتھ دینے سے ہٹلر کو اس وقت روسی محاذ اور برطانیہ کے خلاف اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کا اچھا موقع مل گیا ہے اس لئے آج کل جرمنی کا ہندوستانی پروپیگنڈا ہر روز برلن سے جاپانی فتوحات کے گُن گا رہا ہے۔ ان فتوحات کا سلسلہ ابھی کچھ عرصہ تک اور جاری رہیگا لیکن جیسے ہی امریکہ اور انگلستان کی مشترکہ طاقت عملی حیثیت سے اپنا زور دکھائیگی ویسے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ جائے گا اور جاپان کو لینے کے دینے پڑیں گے۔ دونوں ملکوں کی مشترکہ کوششوں کو یکجا کرنے کے لئے خود مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ کرسمس کے پہلے امریکہ گئے۔ وہاں پریسیڈنٹ روزویلٹ سے مفصل بات چیت کے بعد انگلستان اور امریکہ کا باہمی معاہدہ ہو گیا ہے جس کا اثر عنقریب ہی دیکھنے میں آئے گا۔

ہٹلر نے چند ہی ہفتوں میں روس کا کام تمام کر دینے کا تہیہ کیا تھا، لیکن سُرخ فوجوں کی پامردی سے چھ مہینے ہو گئے۔ ابھی تک ماسکو ہی پر جرمنی کا قبضہ ہو سکا اور نہ لیننگراڈ ہی پر جرمن فوج کو کوئی اقتدار حاصل ہوا۔ سباسٹاپول کا بندرگاہ بھی ابھی تک روسیوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ حال میں ہٹلر نے دو بڑی تقریریں کیں جن میں سے ایک میں تو اُس نے روس اور جرمنی کے جنگی نقصانات کی تفصیل بتائی۔ دوسری تقریر جرمن سپاہیوں کے نام تھی جو اُس نے فوجی کمان خود اپنے ہاتھ میں لینے کے موقع پر کی۔ ان دونوں تقریروں سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ہٹلر کو اپنے منصوبے جلد پُورے ہونے کی کوئی اُمید باقی نہیں ہے اور ڈاکٹر گوبلز بھی اب یہ کہنے لگے ہیں کہ برطانیہ اور امریکہ پر فتح حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہٹلر تو اب اپنے نئے نظام پر زور دینے کے بجائے جرمنی کی آزادی قائم رکھنے اور اُس کو آئندہ مصیبتوں سے بچانے کا ذکر کرنے لگا ہے۔ روسیوں نے جرمن نقصانات کی جو تفصیل شائع کی ہے اُس سے اور جرمن اعداد و شمار سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لیکن بیرونی لوگوں کا اندازہ ہے کہ معرکہ روس میں جرمنی اور اُس کے اتحادیوں کے کم سے کم پچاس لاکھ آدمی ضرور کام آئے یا بیکار ہو گئے۔ اس وقت روس میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے روسیوں نے بیشتر مقامات جرمن فوج سے لڑ بھڑ کر واپس لے لئے ہیں۔ جرمنوں کا بیان ہے کہ وہ اس وقت اپنے محاذ کو خود ہی مختصر کر رہے ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو اس وقت دو باتیں لازمی ہیں، اوّل یہ کہ اتنے دنوں کی سخت ہولناک جنگ کے بعد بھی روسی قوم اور

روسی فوج کا دم خم ابھی تک بجنسہ قائم ہے اور وہ کسی طرح جرمنی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ روس اور جرمنی کے درمیان جنگ قائم رہنے سے کم سے کم تیس چالیس لاکھ جرمن فوج روس میں ضرور پھنسی رہیگی، یہ خود ایسا زبردست مینساؤ ہے جس سے جرمنی کا صحیح و سلامت نکل آنا معجزے سے کم نہ ہوگا۔ روس نے بیشک جرمنی کا نہایت بہادرانہ مقابلہ کیا اور روس کی یہ بات بھی بہت قابل تعریف رہی کہ دوسرے یورپین ملکوں کی طرح روس کے کسی شخص کو ملک کے ساتھ غداری کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ لیکن ابھی تک یہ معمہ حل نہیں ہو سکا ہے کہ ہٹلر نے علاقہ اوکرائن پر فوجی قبضہ کرنے کے بعد راستوف (Rostov) کو کیوں نہیں لے لیا۔ بہرحال روسی اس وقت سنبھالا لے رہے ہیں اور امید ہے کہ اگر اتحادیوں کی مدد ان کے شامل حال رہی اور روس کو جس قدر فولادی گاڑیاں اور دوسرا سامان جنگ درکار ہے وہ اس کو امریکہ اور انگلستان سے مل سکا تو عجب نہ جانیے کہ روسیوں کا یہ دعویٰ کہ وہ جرمنوں کو روس ہی میں دفن کر دیں پورا ہو کر رہے۔

یہ خبر بھی گرم ہے اور قرائن سے بھی خیال ہوتا ہے کہ ہٹلر اپنی جنگی ساکھ قائم رکھنے کے لئے حتی الامکان جلد ہی کوئی خاص کارروائی کرنے والا ہے۔ یہ کارروائی یا تو خود برطانیہ پر حملہ ہو یا اسپین کو جنگ میں شامل کر کے جبرالٹر پر ضرب کاری لگایا جائے، یا ترکی پر حملہ کر کے ایران و عراق وغیرہ کی خبر لی جائے۔ اتنی دور بیٹھے ہوئے ہم خود کیا کہہ سکتے ہیں، لیکن گو برطانیہ کے ذمہ دار وزیروں نے پارلیمنٹ میں حملے کا ذکر اور مسٹر چرچل نے بھی امریکہ میں اسی خوف کا اظہار کیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ برطانیہ پر حملہ نہ ہوگا کیونکہ برطانیہ اس کے مقابلے کے لئے پورے طور پر تیار ہے اور جرمنوں کو سخت ناکامی کا منھ دیکھنا پڑے گا جس سے جرمنوں کا سارا غرور کرکرا ہو جائیگا۔ اس لئے امید نہیں کہ ہٹلر اس طرف زور آزمائی کرے۔ البتہ اگر جرمنی کو پٹرول کی کمی محسوس ہو رہی ہے تو وہ ترکی پر حملہ کر کے ایران اور عراق کی جانب جھکے گا۔ ورنہ جبرالٹر پر حملہ کر کے برطانیہ کی بحری طاقت کو زک پہونچانے میں جاپان کا ہاتھ بٹائے گا۔ اس وقت یہی ایک ذریعہ برطانیہ کو پریشان کرنے کا رہ گیا ہے۔

لیبیا کے معرکہ میں برطانیہ کو مسلسل فتوحات حاصل ہو رہی ہیں۔ برطانوی فوج نے اپنے نئے کمانڈر کی رہنمائی میں بن غازی پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے اور ہزارہا جرمن اور اطالین فوجی افسران اور سپاہی گرفتار ہو چکے ہیں۔ ادھر چھ ہفتوں سے اس صحرائی علاقہ میں انگریزی فوج کو دشمن کے سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے معرکوں میں سپلائی کی مشکلات کی بدولت انگریزی فوج کو ضروری ساز و سامان کی کمی رہتی تھی چنانچہ یونان، کریٹ، ہانگ کانگ وغیرہ سب جگہ ان کے پاس کافی ہوائی طاقت موجود نہ تھی مگر لیبیا کا موجودہ معرکہ مہینوں کی تیاری کے بعد شروع کیا گیا اور گو یہاں بھی انھیں خلاف توقع دشمن کے سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑا جسکی وجہ سے انکی کامیابی کی رفتار اتنی تیز نہیں رہی جتنی کہ امید کیجاتی تھی لیکن صحرائے لیبیا کی خونریز جنگ نے اس بات کو خوب ثابت کر دیا ہے کہ اگر ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی کافی تعداد موجود ہو تو برطانوی فوج جرمنی فوج کا بخوبی مقابلہ کر سکتی ہے علاقہ سائرینیکا میں دشمن کی ہر ساز و سامان سے آراستہ فوج کا شمار ڈیڑھ لاکھ بتایا جاتا ہے جسمیں کم سے کم ایک تہائی جرمنی سپاہ ہیں لیکن انگریزی فوج کو ان سب کے باوجود کامیابی پر کامیابی حاصل ہوئی اور اس وقت جنرل رومل کو جو جرمنی کا نامور سپہ سالار ہے اپنی سپاہ کی جان بچانا مشکل ہو رہا ہے بہرحال اس وقت انگریزی فوج جو بقول مسٹر چرچل فرانس کے ہتھیار ڈالنے کے وقت بہت کمزور اور ضروری ساز و سامان سے معرا تھی سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی اندر طبرق سے بن غازی تک سارے علاقے پر چھائی ہوئی ہے اور حلب اور شام کے تمام رقبے اور دریائے نیل کے ساحل تک اپنا اقتدار جمائے ہوئے ہے۔

ہندوستان

جنگ اب ہندوستان کے دروازے تک آپہونچی ہے لیکن سیاسی حیثیت سے ملکی حالات میں ابھی تک کوئی اہم اور اطمینان بخش تبدیلی نہیں ہوئی گورنمنٹ ہند نے ستیہ گرہ کے قیدیوں کو ضرور رہا کر دیا ہے جن میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جنکو ہائی کورٹ کے فیصلے کے مطابق ایک دن کے لئے بھی جیل جانے کی ضرورت نہ تھی۔ بہر حال رہا شدہ لوگوں میں پنڈت جواہرلال نہرو، اور مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس کے علاوہ بہت سے لیڈران کانگریس اور مختلف صوبوں کے اسپیکر صاحبان اور متعدد وزرا شامل ہیں، اور خود ان حضرات کو اپنی رہائی پسند ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عوام پر گورنمنٹ کے اس فیصلے کا بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ لیکن اس اثر کو دیرپا بنانے کے لئے ضروری ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ ہندوستانیوں کے ملکی جذبات کے ساتھ اپنی ہمدردی کا عملی اور فوری ثبوت دے۔ صاحب وزیر اعظم نے عموماً اور وزیر ہند نے خصوصاً اس وقت تک جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ بہت دلشکن ثابت ہوا ہے۔ رہائی کے بعد پنڈت جواہرلال نہرو اور بعض دوسرے ملکی لیڈروں نے جو بیانات شائع کئے اور جو تقریریں ارشاد کیں ان سے دو باتیں خاص طور پر واضح ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ ملک کے سبھی رہنما نازیوں کے سخت مخالف اور جمہوریتوں (خصوصاً روس اور چین) کے حامی اور ہمدرد ہیں۔ اس لئے اس جنگ میں وہ امریکہ اور برطانیہ کے طرفدار ہیں۔ دوسرے یہ کہ سبھی لیڈر ہندوستان کے متعلق برطانوی پالیسی سے یوں بیزار ہیں اسلئے انھوں نے تہیہ سا کر لیا ہے کہ جب تک اس پالیسی میں خاطر خواہ تبدیلی نہ ہوگی وہ اس جنگ میں کسی قسم کی دلچسپی نہ لیں گے۔

مسٹر جناح نے بھی حال میں جو اظہار خیالات کیا ہے اس میں کانگریس وغیرہ کی معمولی نکتہ چینی کے علاوہ اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستانیوں کو ملکی انتظام میں واقعی اختیارات دینے پر آمادہ نہیں ہے، بلکہ وہ صرف جنگی کوشش میں ان کی ہمنوائی چاہتی ہے۔ وائسرائے کی توسیع شدہ کونسل میں ہندوستانی اراکین حکومت کی تعداد غالب ضرور ہو گئی لیکن حال کے بعض اہم واقعات زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اصولی حیثیت سے اس توسیع سے نظام سلطنت میں رتی بھر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ اسی ماہ دسمبر میں گورنر صاحب سندھ نے اپنے وزرا کے اختیارات میں خواہ مخواہ مداخلت کر کے ایک نازک صورتِ حالات پیدا کر دی ہے۔ گورنمنٹ ہند ایکٹ ۱۹۳۵ء کی جس دفعہ کا سہارا لیکر گورنر سندھ نے بعض افسروں کے تقرر میں وزارت کے فیصلے کو بالائے طاق رکھکر خود اپنے من مانے افسر مقرر کئے ہیں اس سے ہرگز ان کو یہ حق نہیں پہونچتا ہے کہ وہ وزارت کو اس طرح مفلوج و معطل کر دیں۔ چنانچہ ہمارے بڑے بڑے قانون دان خان بہادر اللہ بخش کی پُرزور پروٹسٹ کی تائید کر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ایک حاکم صوبہ کی زبردستی سے صوبہ سندھ میں آئینی حکومت کا گلا گھونٹ دیا گیا۔

صوبہ آسام میں بھی گورنر کو آئینی حکومت ختم کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا پڑی۔ صوبہ بنگال کی طرح اس وقت صوبہ آسام بھی جنگ کی زد میں قرار دیدیا گیا ہے۔ شاید اس وجہ سے گورنر صاحب نے آئینی حکومت معطل کر کے کل اختیارات اپنے ہی قبضے میں رکھنے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ آسام کے کانگریسی ممبران قانونی اسمبلی اب جیل سے باہر آگئے ہیں۔ ممکن ہے یہ

گ موجودہ وزارت کو زیادہ دنوں تک نہ چلنے دیتے لیکن گورنر آسام کو کچھ دنوں تک واقعات کا انتظار کرنا ضروری تھا، مگر انہوں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا!

بہار میں تو عرصہ سے گورنری حکومت قائم ہے، مگر اس ماہ گورنر بہار نے بھاگلپور میں ہندو مہاسبھا کے اجلاس کی ممانعت کر کے ملک بھر میں خواہ مخواہ ایک ہیجانِ عظیم برپا کر دیا۔ تمام ملکی جماعتوں میں اس وقت ہندو مہاسبھا ہی علانیہ طور پر جنگی امداد دینے کا پرزور حمایت کر رہی ہے۔ لیکن اس کا اجلاس بھی بھاگلپور میں محض اس لئے ممنوع قرار دیا گیا کہ گورنمنٹ بہار اس وقت وہاں امن وامان قائم رکھنے کے لئے ضروری پولیس نہیں بھیج سکتی تھی! لیڈران ہندو مہاسبھا نے بقرعید کے لحاظ سے دو تین دن پہلے ہی اجلاس ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اس پر بھی گورنر بہار ٹس سے مس نہ ہوئے، اور اُن کے حکم سے مہاسبھا کا پنڈال اکھاڑ ڈالا گیا۔ اس کے خاص خاص منتظمین گرفتار کر لئے گئے جس کے بعد مسٹر ساورکر اور دوسرے لیڈران ہندو مہاسبھا کو اس حکم کی خلاف ورزی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا چنانچہ تمام ہندوستان کے تقریباً ہزار بارہ سو نامور لیڈران (مثلاً سر شیام پرشاد مکرجی وزیر بنگال، پریسیڈنٹ ساورکر، لالہ گوکل چند نارنگ، ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند، راجہ مہیشور دیال سیٹھ وغیرہ وغیرہ) گرفتار کر کے جیل بھیج دیئے گئے مگر ان گرفتاریوں کے باوجود ہندو مہاسبھا کا اجلاس بھاگلپور کے ایک دھرم سالہ میں منعقد ہوا اور ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں مجوزہ ریزولیوشن پاس کئے گئے ہم کو اس بات کی ضرور خوشی ہے کہ مہاسبھا کے لیڈران گورنمنٹ کے اس تشدد بیجا سے مرعوب نہیں ہوئے اور اُن کے باقیماندہ لوگوں نے ٹھنڈے دل سے مہاسبھا کے اجلاس کا مقررہ پروگرام پورا کیا اور اپنی کارروائی پر اس تشدد کا کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔

جن لوگوں کو ہندو مہاسبھا کی سیاسی پالیسی سے سخت اختلاف ہے ان کو بھی گورنمنٹ بہار کے اس تشدد سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی، بابو راجندر پرشاد، رائٹ آنریبل سر سرینواس شاستری، سر شیو سوامی آئر اور مہاراج سنگھ وغیرہ نے بھی اس حکم کو سراسر بیجا قرار دیا ہے۔

بنگال کی وزارت میں ابتک فرقہ وارانہ جذبات کا غلبہ تھا۔ سندھ اور صوبہ سرحد سے قطع نظر بنگال اور پنجاب ہی دو بڑے صوبے ایسے ہیں جہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ چنانچہ ابتک بنگال کے وزیر اعظم مسٹر فضل الحق مسٹر جناح کے دست راست اور مسلم لیگ کے زبردست مؤید سمجھے جاتے تھے لیکن چند دنوں سے بنگال کے معاملات کچھ ایسا پلٹا کھا رہے ہیں کہ حال میں ... نے دوسرے رفقا کے ساتھ وزارت سے استعفے دینا پڑا، گورنر بنگال نے استعفے کو منظور کر کے ... فضل الحق ... ہی سے ساتھ ایک نئی وزارت قائم کرنے کی استدعا کی۔ اسی اثنا میں بنگال کی قانونی اسمبلی کے مختلف پارٹیوں میں کچھ ایسا رد و بدل ہوا کہ مسٹر فضل الحق کو مسلم لیگ اور اس کی پالیسی سے کنارہ کش ہو کر ایک مشترکہ پارٹی کا قیام قبول کرنا پڑی، نواب صاحب ڈھاکہ نے بھی اس معاملے میں اُن کا ساتھ دیا۔ اور دونوں صاحبوں نے تمام پارٹیوں کے خاص لیڈروں کو اپنے ساتھ ملا کر مشترکہ ذمہ داری کے اصول پر ایک نئی وزارت مرتب کر لی ہے تمام ملک نے اس وزارت

کا خیر مقدم کیا ہے کیونکہ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو انہیں اصولوں پر ہندوستان میں اتحاد و اتفاق باہمی کی بنیاد رہ سکتی ہے۔ اور دوسرے صوبوں میں بھی اسی نمونہ پر قومی گورنمنٹیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ مگر نئی وزارت کے قائم ہونے سے [illegible] کے دعوے کو سخت دھکا لگا ہے۔ اور انھوں نے مسٹر فضل الحق اور نواب صاحب ڈھاکہ کے خلاف بہت کچھ سخت سست [illegible] لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اس وقت بنگال نے تمام ملک کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ پیش کر دیا ہے۔

مگر افسوس کہ اس وزارت کے قائم ہونے کے ساتھ ہی بنگال میں ایک ناخوشگوار واقعہ ہوا یعنی مسٹر سرت چندر بوس مشہور لیڈر فارورڈ بلاک جاپان کے ساتھ ہمدردانہ تعلقات رکھنے کے شبہ میں گرفتار کر لئے گئے۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوا ہوتا تو مسٹر [illegible] بھی یقیناً اپنے صوبے کی نئی وزارت کے ایک خاص رکن ہوتے۔ اس گرفتاری سے بھی گورنمنٹ ہند کے طرز عمل پر کوئی خوش [illegible] روشنی نہیں پڑتی ہے یہ بات خاص طور پر قابل نوٹ ہے کہ ذمہ دار وزارت بنگال کو اس گرفتاری کا کوئی علم نہ تھا، اور نہ اُن سے اس میں کوئی مشورہ ہوا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال مسٹر بوس کو نظربندی کی حالت میں بھی ایک دن کے لئے بنگال میں نہ روک سکے۔ ملک کو معلوم ہے کہ کس طرح وہ دوڑے ہوئے ہوڑہ اسٹیشن پر گئے مگر وہاں مسٹر بوس سے دو باتیں [illegible] نہ کر سکے۔ سنا جاتا ہے کہ گو پہلے مسٹر بوس نے نئی وزارت کے قیام کو پسند کیا تھا لیکن اب انھوں نے اپنے ممبروں سے اس سے کنارہ کش ہو جانے کی استدعا کی ہے ہم کو معلوم نہیں کہ مسٹر بوس کن واقعات کے ماتحت گرفتار کئے گئے ہیں اس لئے ہم اس پر مفصل رائے زنی نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن جو گورنمنٹ بنگال کے وزیر اعظم کو بھی گرفتاری کے اصلی وجوہات نہیں بتلا سکتی ہے وہ [illegible] ذمہ دار گورنمنٹ کہی جا سکتی ہے اور نہ جمہوری نظام کے ماتحت ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس واقعہ نے ہم کو ایک مرتبہ پھر بڑے زور سے اس بات کی یاد دلادی کہ حکومت ہند کا نظام ابھی تک حسب سابق سرتاپا مطلق العنان ہے۔ اور حال میں حضور والسرائے کی [illegible] کی جو توسیع ہوئی ہے اس سے اس کی نوعیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اس بات پر کیا تعجب کیا جائے کہ ملک اس نظام کی ماتحتی سے تنگ آگیا ہے اور اب جلد سے جلد اس میں اصولی تبدیلی دیکھنے کا خواہشمند و خواستگار ہے۔

انگلستان کے بعض بڑے بڑے مدبران بھی اس تبدیلی کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور اکثر برطانوی اخبارات نے اس تبدیلی کی پُرزور تائید کی ہے حالات حاضرہ اس تبدیلی کو صرف ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی قرار دے رہے ہیں۔ جنگ کے لحاظ سے یہ تبدیلی اشد ضروری ہے۔ دیکھئے برطانیہ کے ارباب حل و عقد کو اس اہم مسئلہ کی طرف کب متوجہ ہونے کی توفیق ہوتی ہے۔ خدا کرے نئے سال کے ساتھ ہی ایک نیا نظام حکومت لائے جس کے ماتحت ہندوستان اور اسکے باشندے دنیا کے [illegible] حکومت کا لگا گھونٹ [illegible]

نیا سال

بنگال کی طرح اسی [illegible]

[illegible] سال ہندوستان کی زندگی کا پالیسی ان سال شروع ہو [illegible] تمام دنیا کے لئے [illegible] ثابت ہوا اسی طرح زمانہ [illegible] [illegible] کے سامنے [illegible] مشکلات پیدا کر دیں۔ اس پر [illegible] حالات سے ہماری پریشانیاں [illegible] کا ہزار ہزار شکر ہے کہ زمانہ کی اشاعت میں کوئی فرق نہیں [illegible] زمانہ [illegible] کام کر سکنے کے قابل [illegible] کر دیا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ [illegible] سال [illegible] زمانہ کے مستقبل کے متعلق [illegible] زمانہ کی توسیع اشاعت میں پہلے سے زیادہ عملی دلچسپی لیں گے خدا کرے نیا سال زمانہ اور ناظرین زمانہ کو مبارک ہو۔